www.KitaboSunnat.com
فقہ السنۃ
محمد عاصم الحداد
حصہ اوّل، دوم

(حصّہ اوّل)

- كتاب الطہارت
- كتاب الصلوٰۃ
- كتاب الجنائز

محمد عاصم الحدادؒ

الفیصل
ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

فہرست مندرجات

حصہ اول

کتاب الطہارۃ

کتاب الصلوٰۃ:

اذان اور اقامت:

☆==============☆==============☆

کلمہ ناشر

"فقہ السُّنَّۃ" معروف عالم دین اور مفکر اسلام مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمتہ اللہ علیہ کے رفیق جناب محمد عاصم الحداد مرحوم کی تالیف فقہی مسائل میں ایک منفرد حیثیت کی حامل کتاب ہے۔ جس میں انہوں نے ہر مسئلہ میں ہر مسلک کے متعلق یہ کوشش کی ہے کہ نہ صرف قرآن اور حدیث سے اس کی بنیاد کا ذکر کیا جائے بلکہ یہ بھی بتایا جائے کہ اگر کسی دوسرے مسلک کی بنیاد کسی دوسری آیت یا حدیث پر ہے تو یہ اختلاف کیوں ہے اور دونوں قسم کی آیات اور احادیث کے متعلق ہر ایک کی رائے کیا ہے اور اس سلسلہ میں مؤلف کی وسعت نظر و قلب بھی واضح ہوتی ہے۔

مؤلف مرحوم نے انتقال سے کچھ عرصہ قبل کتاب پر نظرثانی فرمائی اور بعض مقامات پر ترامیم بھی کی تھیں اور ترمیم شدہ نسخہ مرحوم کے صاحبزادہ جناب سالم مسعود صاحب کے پاس محفوظ تھا۔ مولانا مسعود عبدہ' کے ہم ممنون ہیں جنہوں نے محنت سے کتاب کی پروف ریڈنگ فرمائی۔ اب اس کتاب کا تصحیح شدہ ساتواں ایڈیشن الفیصل پبلیشرز کمپیوٹر کی بہترین کمپوزنگ' اعلیٰ سفید کاغذ اور بہترین گیٹ اپ کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

امید ہے ہماری یہ کاوش پسند کی جائے گی اور حسب سابق اپنا تعاون جاری رکھیں گے۔

طالب دعا

محمد فیصل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدّمہ

ایک عرصہ سے دل میں یہ تمنا تھی کہ قرآن وحدیث کے ان احکام کا مطالعہ کیا جائے جن کا تعلق انسان کے عقائد سے زیادہ اعمال سے ہے اور جن کے مجموعہ کو اصطلاح میں فقہی احکام کہا جاتا ہے' اور وہ بھی اس طرح کہ ہر مسئلہ میں صحابہ اور ائمہ سلف کا مسلک اور اس کی دلیل معلوم کی جائے ۔ بارہا حدیث کی مختلف شرحوں کا الگ الگ مطالعہ کیا لیکن ذوق کی تسکین نہ ہوئی۔ بالآخر آج سے تقریباً تین سال پیشتر جب ادارۂ چراغ راہ نے مجھ سے اپنے اس ارادہ کا تذکرہ کیا کہ وہ فقہ کی ایک مختصر کتاب مرتب کرا کے شائع کرنا چاہتے ہیں تو میں نے اسے اپنی دلی تمنا کو بروئے کار لانے کا ایک موقع تصور کیا اور ذہنی نقشے کے مطابق کام شروع کر دیا چنانچہ آج اپنی زیر ترتیب کتاب 'فقہ السنہ' کا پہلا حصہ اس مُلک کے اردو دان طبقہ کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

یہ حصہ جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے' حدیث و فقہ کی کتابوں کی مروّجہ ترتیب کے مطابق عبادات کے مسائل سے شروع ہوتا ہے اور کتاب الطہارت اور کتاب الصلوٰۃ و کتاب الجنائز پر مشتمل ہے۔ اس سے اگلا حصہ انشاء اللہ کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصیام اور کتاب الحج والعمرہ کے مسائل پر مشتمل ہوگا۔

اس کتاب کی ترتیب جس طریق پر کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ :

ا۔ متن میں وہ مسائل دیئے گئے ہیں جن پر (۱) حنفیہ، (۲) مالکیہ، (۳) شافعیہ، (۴) حنابلہ اور جمہور اہل حدیث کا اتفاق ہے یا پھر کم از کم ان مذاہبِ خمسہ کی اکثریت کا اتفاق ہے ایک یا دو مذاہب کا اختلاف اگر کوئی ہے تو اسکی تفصیل حاشیہ میں دے دی گئی ہے۔ اس لحاظ سے گویا جو مسئلہ بلا حاشیہ صرف متن میں درج ہے۔ اُسے کم از کم ان پانچوں مذکورہ مسالک

کے مابین متفق علیہ تصور کرنا چاہئے۔ بعض ایسے مسائل کے متعلق جن میں ان پانچ مذاہب کا اتفاق ہے، یہ کوشش کی گئی ہے کہ اگر ان میں صحابہ یا ائمہ سلف میں سے کسی اور کا اختلاف ہے تو اسے حاشیہ پر دے دیا جائے لیکن ہر مسئلہ میں اس کا التزام نہیں کیا گیا ہے۔

۲۔ جن مسائل میں حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ، حنبلیہ اور اہل حدیث علماء کا مسلک الگ الگ ہے، ان کا ذکر متن میں نوٹ دے کر حاشیہ میں کیا گیا ہے۔

۳۔ جن مسائل کے متعلق مذکورہ بالا پانچ مذاہب میں سے کسی کے نزدیک کوئی ایسی تفصیل ہے، جو اگرچہ اختلاف کے تحت نہیں آتی، لیکن وہ دوسرے مذاہب میں نہیں پائی جاتی اور کتاب کا مطالعہ کرنے والے کے لئے اس کا جاننا ضروری یا مفید ہے تو اس کا بعض مواقع پر فائدہ، کے عنوان کے تحت متن ہی میں ذکر کر دیا گیا ہے اور بعض مواقع پر اس کا ذکر حاشیہ میں کیا گیا ہے۔

۴۔ ہر مسئلہ میں ہر مسلک کے متعلق یہ کوشش کی گئی ہے کہ نہ صرف یہ کہ قرآن اور حدیث سے اس کی بنیاد کا ذکر کیا جائے بلکہ یہ بھی بتایا جائے کہ اگر دوسرے مسلک والوں کی بنیاد کسی دوسری آیت یا حدیث پر ہے تو یہ اختلاف کیوں ہے اور دونوں قسم کی آیتوں یا حدیثوں کے متعلق ہر ایک کی کیا رائے ہے؟

۵۔ جن مسائل کے متعلق اللہ تعالیٰ کی کتاب یا نبی ﷺ کی سنت میں کوئی نص نہیں ہے، بلکہ ان کے متعلق تمام مسلکوں کی بنیاد اجتہاد پر ہے ان کا ذکر بھی متن میں نوٹ دے کر حاشیہ پر کیا گیا ہے، الاّ یہ کہ ایسے مسائل میں تمام ائمہ کا اتفاق (اجماع) ہو تو ان کا ذکر بھی متن ہی میں کیا گیا ہے کیونکہ کسی مسئلہ میں تمام ائمہ کا اتفاق بھی قرآن و حدیث کے بعد ہر شخص کے لئے حجت ہے۔

ہر مسئلہ میں تمام مذاہب کے نقل کرنے سے ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ لوگوں کو ان کے موجودہ مسلکوں سے ہٹا کر انھیں کسی خاص مسلک کی طرف دعوت دی جائے بلکہ اس سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے، خواہ وہ کسی مسلک سے تعلق رکھنے والے ہوں، جہاں اپنا مسلک اور اس کا ماخذ معلوم کریں، وہاں انھیں دوسرے مسالک اور ان کے ماخذ کا بھی علم ہو تاکہ اس طرح ان کے دلوں میں فراخی اور رواداری پیدا ہو۔ کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ بہت سے لوگوں میں جو جمود، تعصب اور تنگ نظری اس وقت پائی جاتی ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص صرف اپنے ہی مسلک کو جانتا اور سمجھتا

کچھ اسی کے دلائل سے واقفیت رکھتا ہے، اس لئے وہ غیر شعوری طور پر اپنے ماسوائے دیگر تمام فقہی مسلکوں کو بے بنیاد خیال کرتا اور بسا اوقات ان کے ماننے والوں کی نیتوں پر حملہ کر جاتا ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے نہیں دیتی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فقہ کے بہت سے مسائل میں سلف کے درمیان اختلافات پائے گئے ہیں، لیکن اول تو اس قسم کے مسائل کی تعداد، جیسا کہ آپ کو یہ کتاب پڑھ کر اندازہ ہوگا، ان مسائل کے مقابلے میں بہت تھوڑی ہے جن میں تمام یا اکثر ائمہ سلف کے درمیان اتفاق پایا جاتا ہے، پھر یہ اختلافات ہرگز اصولوں اور بنیادوں میں نہیں ہیں بلکہ فروع اور جزئیات میں ہیں، اور وہ بھی زیادہ تر ان جزئیات میں جن کی بنیادیں قرآن یا حدیث پر نہیں بلکہ ائمہ کے اجتہاد و قیاس پر ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے مسائل میں اختلاف کا پایا جانا نہ تعجب انگیز ہے اور نہ عقل یا فطرت کے خلاف۔ تمام ائمہ نہ ایک زمانہ میں تھے اور نہ ایک مقام پر کہ وہ تمام فروعی مسائل کا تصفیہ باہمی ملاقات اور تبادلہ خیال سے کرتے، یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ، تابعین اور ائمہ مجتہدین میں سے کوئی شخص اپنے کسی اجتہادی فیصلہ کو اللہ اور رسولؐ کے فیصلے کا درجہ نہ دیتا تھا بلکہ ان میں سے ہر شخص خواہ دین کے علم و فہم میں اس کا مقام کتنا ہی بلند ہو، جب کوئی اجتہادی مسئلہ بیان کرتا تو یہی کہتا کہ یہ میرا علم اور اجتہاد ہے اگر یہ صحیح ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اسی کے فضل کا نتیجہ ہے اور اگر یہ غلط ہے تو میری طرف سے ہے اور شیطان کی دراندازی سے محفوظ نہیں۔

باقی رہے ان مسائل کے اختلافات جن کی بنیاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث پر ہے تو ان کی وجہ اللہ نہ کرے یہ نہیں ہے کہ ائمہ کے درمیان حدیث کے حجت ہونے میں اختلاف تھا، بلکہ ان کی وجہ یا تو حدیث کی روایت میں یا اس سے استدلال میں اختلاف تھا، یا پھر ان کا باعث کسی مسئلہ میں دو طرح کی احادیث کا پایا جانا تھا بعض ائمہ ان میں سے ایک قسم کی احادیث کا حکم دوسری قسم کی احادیث سے منسوخ قرار دیتے تھے اور بعض ان میں سے کسی کو منسوخ قرار نہیں دیتے تھے بلکہ دونوں کے درمیان تطبیق دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ روایت اور استدلال میں تمام ائمہ کا علم یکساں نہ ہو سکتا تھا اور ایسا ہونا ناگزیر تھا کہ کوئی حدیث ایک کے نزدیک معتبر ہو اور دوسرے کے نزدیک اس کے راویوں سے ناواقفیت کی بنا پر معتبر نہ ہو۔ اسی طرح یہ بھی ممکن تھا کہ کسی حدیث کے صحیح اور معتبر ہونے کے باوجود کسی نے اس کا مطلب وہ نہ سمجھا ہو جو دوسرے نے سمجھا ہو۔ کسی حدیث کے صحیح ہونے کے باوجود ائمہ

کے درمیان جس طرح کے اختلافات پائے گئے ہیں اسی طرح کے اختلافات قرآن کی متعدد آیات کے معنی میں بھی پائے گئے، اور جس طرح احادیث کے متعلق ناسخ و منسوخ کا اختلاف پایا گیا ہے اسی طرح کا اختلاف قرآن کی متعدد آیات کے متعلق بھی پایا گیا ہے، حالانکہ قرآن کے قطعی، یقینی اور قابلِ حجت ہونے میں اختلاف کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی اصل طاقت اصولوں میں اتفاق و اتحاد اور فروعی مسائل میں رواداری اور وسعت میں ہے۔ فروعی مسائل کی دین میں ہرگز یہ حیثیت نہیں ہے کہ ان میں اختلاف کی بنا پر مسلمان آپس میں نفرت کریں، اختلاف کو مخالفت کی شکل دے کر ایک دوسرے کو بد نیت' فاسق اور گمراہ قرار دیں اور ایسے مستقل گروہوں اور فرقوں میں تقسیم ہو جائیں کہ انہیں اپنے متفق علیہ اصولوں کے بچاؤ اور ان کے قائم کرنے کا ہوش تک نہ رہے۔ ان فروعی اختلافات کے باوجود ائمہ سلف آپس میں جس قسم کا اتحاد و احترام اور حسنِ ظن رکھتے تھے، اس کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اختصار کے خیال سے ذیل میں ہم ان میں سے صرف چار مثالوں کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ جیسا کہ آپ کو اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوگا، امام مالکؒ نماز میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ بسم اللہ پڑھنے کے قائل نہ تھے، نہ سِرّی نماز میں اور نہ جہری میں۔ دوسری طرف امام ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ کے نزدیک نماز میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ بسم اللہ کا پڑھنا ضروری تھا لیکن اس اختلاف کے باوجود امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ مدینہ کے مالکی ائمہ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔

۲۔ ہارون الرشید نے ایک مرتبہ سینگی لگوائی اور پھر وضو کیے بغیر نماز پڑھائی وجہ یہ تھی کہ امام مالکؒ نے ہارون الرشید کو یہ فتویٰ دیا تھا کہ سینگی لگوانے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ امام ابو یوسفؒ نے اس کے پیچھے نماز پڑھی اور بعد میں اپنی نماز کا اعادہ نہ کیا، حالانکہ وہ سینگی سے وضو ٹوٹ جانے کے قائل تھے۔

۳۔ امام احمد بن حنبلؒ بھی نکسیر اور سینگی سے وضو ٹوٹ جانے کے قائل تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے ان سے دریافت کیا کہ اگر کسی شخص کے بدن سے خون نکلے اور پھر وضو کیے بغیر نماز پڑھائے، تو کیا آپ اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے؟ انھوں نے جواب دیا "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں امام مالکؒ اور سعید بن مسیبؒ کے پیچھے نماز نہ پڑھوں"۔؟

۴۔ امام ابو یوسفؒ نے ایک مرتبہ کسی حمام میں غسل فرمایا اور لوگوں کو جمعہ کی نماز

پڑھائی۔ جب نماز ہو چکی اور لوگ جا چکے تو معلوم ہوا کہ جس حمام میں امام ابو یوسفؒ نے غسل فرمایا، اس کے کنویں میں ایک مردہ چوہا پایا گیا ہے۔ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا "اچھا اگر یہ بات ہے تو ہم اپنے مدنی بھائیوں کے اس مسلک پر عمل کئے لیتے ہیں اگر پانی کی مقدار دو بڑے مٹکوں تک پہنچ جائے تو وہ ناپاک نہیں ہوتا"۔

اس کتاب کے شائع کرتے وقت ہم یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہماری یہ کتاب کوئی فتویٰ کی کتاب نہیں ہے اور نہ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے اس میں ہر مسلک کے تمام دلائل اور جزئیات کو پوری تفصیل سے بیان کر دیا ہے، اس قسم کی مختصر کتاب میں تمام دلائل اور جزئیات کا پوری تفصیل سے لانا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ ہم نے ہر مسلک کے بنیادی دلائل اور ضروری جزئیات کی طرف مختصر طور پر اشارہ کیا ہے۔ لہٰذا جو صاحب کسی مسلک کے کسی مسئلہ کے متعلق مفصل معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں وہ اس مسلک کی اپنی کتابوں یا اس کے علماء کی طرف رجوع کریں۔

اس کتاب کے پڑھنے والوں سے ہماری یہ بھی گذارش ہے کہ وہ اس کتاب کو مختلف مسالک کے درمیان محاکمہ کا ذریعہ نہ بنائیں۔ ایک مسلک کو دوسرے مسلک پر ترجیح دینے کے لئے جس تحقیقی اور تفصیلی مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اس کتاب سے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو صاحب اس کا ذوق رکھتے ہوں انھیں تمام مذاہب کی اپنی کتابوں کی طرف الگ الگ رجوع کرنا چاہئے اور پھر پوری تحقیق اور وسیع مطالعہ کے بعد کوئی رائے قائم کرنی چاہئے۔

آخری بات جس کا عرض کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس کتاب کے متعلق ہمارا یہ خیال ہرگز نہیں ہے کہ یہ ہر قسم کی غلطی سے پاک ہے، بلکہ یہ کتاب ایک ایسے شخص کی ناچیز کوشش ہے جسے اپنے علم کی کمی کا پوری طرح احساس ہے، ہم اپنے متعلق جو کچھ کہتے ہیں یا کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم نے پوری دیانت اور غیر جانبداری سے سلف کے مختلف مسالک کو یکجا جمع کر کے اردو زبان میں پیش کرنے کی کوشش ہے اور یہ کوشش ہمارے علم کی حد تک اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے، لہٰذا اس میں ہر قسم کی غلطی کا احتمال ہے۔ اہل علم حضرات سے التماس ہے کہ وہ اس کتاب کو دیکھتے ہوئے جہاں کہیں کوئی غلطی یا خامی محسوس کریں اس سے اس عاجز کو ضرور مطلع فرمائیں تاکہ کتاب کے اگلے ایڈیشن میں اس کا ازالہ کر دیا جائے، بلکہ اگر غلطی سخت قسم کی ہو تو طبع ثانی سے پیشتر ہی تصحیح

شائع کر دی جائے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے اور ہماری نیتوں میں شیطان کو دخل اندازنہ ہونے دے۔ والحمد للہ اولاً وآخراً

اچھرہ، لاہور

۳۔ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ

(۱۹اکتوبر ۱۹۵۸ء)

کتبہ' العاجز

محمد عاصم

كتاب الطّهارة

نجاست اور اُس کی قسمیں

نجاست سے مراد وہ گندگی ہے۔ جس سے پاک رہنا اور وہ اگر کپڑے یا بدن کو لگ جائے تو اس کا دھونا مسلمان کے لئے بہت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (اور اپنے کپڑوں کو پاک کیجئے یا رکھئے) نبی ﷺ کا ارشاد ہے، پاکیزگی آدھا ایمان ہے (بخاری و مسلم)

نجاست کی قسمیں

ا۔ مردار:

مردار سے مراد وہ جانور ہے جو اپنی موت آپ مرا ہو۔ وہ جانور جو گلا گھٹ کر، یا چوٹ کھا کر یا جو بلندی سے گر کر مرا ہو، یا جسے درندے نے پھاڑا ہو، یا جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو یا جسے ذبح کرتے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔

ان سب کا حکم بھی مردار ہی کا ہے۔ ان تمام کا ذکر قرآن کی ان دو آیتوں میں ہوا ہے:۔

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ۔ (البقرہ: ۱۷۳)

تم پر حرام کیا گیا ہے مردار جانور اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جسے ذبح کرتے وقت اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نام لیا جائے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ۔ (۵:۳)

تم پر حرام کیا گیا ہے مردار، خون، سور کا گوشت، وہ جانور جسے ذبح کرتے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا جائے، وہ جو گلا گھونٹ کر یا جو کسی ضرب سے یا جو بلندی سے گر کر مرے یا جو کسی کی ٹکر سے مر جائے

یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو۔ سوائے
اس کے جسے تم نے زندہ پاکر ذبح کر لیا
ہو۔ اور جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو۔

اگر زندہ جانور کے جسم سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ لیا جائے، جیسا کہ عرب اسلام سے پہلے کیا کرتے تھے تو وہ بھی مردار ہی کے حکم میں آتا ہے۔

حضرت ابو واقد لیثیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "زندہ جانور کے جسم سے جو گوشت کا ٹکڑا کاٹا جائیگا وہ بھی مردار ہے" (ابو داؤد، ترمذی)

اس بارے میں تمام علمائے سلف کا اجماع ہے (بدایۃ المجتہد ج ا۔ ص ٦١)

مردار کے حکم سے جو چیزیں مستثنیٰ ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں :۔

(ا) مردہ مچھلی، ٹڈی، مکھی (اور اس پر قیاس کرتے ہوئے) وہ تمام جانور جن کے جسم میں خون نہیں ہوتا جیسے چیونٹی، بھڑ، شہد کی مکھی وغیرہ۔ اس بارے میں بھی سوائے امام شافعیؒ (۱) کے سب کا اتفاق ہے (ابن المنذر)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "ہمارے لئے دو مردہ جانور اور دو خون حلال کئے گئے ہیں۔ دو مردہ جانور مچھلی اور ٹڈی ہیں اور دو خون جگر اور تلی" (احمد۔ شافعی۔ ابن ماجہ۔ بیہقی۔ دارقطنی)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کسی شخص کے پینے کی چیز میں مکھی گر جائے تو اُسے چاہئے کہ اسے ڈبو دے اور پھر اُسے پھینک دے، اس لئے کہ اس کے ایک پر میں شفا ہے اور دوسرے میں بیماری۔"

(بخاری۔ ابو داؤد۔ احمد۔ ابن ماجہ)

(ب) مردہ جانور کی وہ چیزیں جن میں جان نہیں ہوتی۔ دانت، ہڈی، بال اور اون، اس بارے میں اگرچہ نبی ﷺ سے کوئی چیز ثابت نہیں ہے لیکن امام زہریؒ فرماتے ہیں "میں نے

---

(۱) امام شافعیؒ کے نزدیک مکھی کے حکم میں یہ دوسرے جانور نہیں آتے کیونکہ مکھی کے متعلق تو نبی ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ اس کے ایک پَر میں شفاء ہے لیکن دوسرے جانوروں میں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ (بدایۃ المجتہد ج ا ص ٦٠) لیکن شافعیہ کے نزدیک ان چیزوں سے پانی وغیرہ صرف اس وقت ناپاک ہوتا ہے جب ان سے پانی کے مزہ، رنگ یا بو میں فرق آجائے یا کوئی شخص ان کو خود پانی میں ڈبوئے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

سلف میں بہت سے بزرگوں کو ہاتھی کی ہڈی سے کنگھی کرتے اور اس میں تیل رکھتے دیکھا ہے۔ وہ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے [۱]۔ (بخاری)

خون:

خون (جب کہ وہ بہہ رہا ہو [۲]) ناپاک ہے، جیسا کہ سورۂ انعام کی آیت ۱۴۵ میں اس کا ذکر ہوا ہے۔ البتہ تھوڑا خون معاف ہے: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں "ہم لوگ گوشت کھایا کرتے تھے اور ہنڈیا کے اوپر خون کے کچھ دھاریاں ہُوا کرتی تھیں"۔ امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں "صحابہؓ کرامؓ نماز پڑھا کرتے تھے، حالانکہ ان کے جسم زخمی ہوتے تھے" (بخاری) روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ پر حملہ کیا گیا آپ نماز پڑھاتے رہے اور خون آپ کے جسم پر بہہ رہا تھا [۳]" (بخاری)

---

(۱) امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ سب چیزیں پاک ہیں۔ امام شافعیؒ کے نزدیک ہڈی اور بال میں جان ہوتی ہے۔ اس لئے یہ ناپاک ہے۔ امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک ہڈی ناپاک ہے اور بال پاک کیونکہ ہڈی میں جان ہوتی ہے اور بال میں نہیں۔ (بدایۃ المجتہد ج ۱، ص ۶۰)

(۲) یہ جمہور (اکثریت سلف) کا مسلک ہے، امام مالک کے نزدیک ہر خون (خواہ وہ بہتا ہوا ہو یا جما ہوا) ناپاک ہے، (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۱۲۰) اس اختلاف کی وُجہ یہ ہے کہ اوپر قرآن کی جن آیات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ایک میں دَمًا مَّسْفُوحًا (بہتا ہوا خون کا ذکر ہے) اور دوسری میں بغیر کسی قید کے صرف دمًا (خون) کا۔ امام مالکؒ غیر مقید آیت کا حکم مقید پر لگاتے ہیں اور دوسرے مقید کا غیر مقید پر (بدایۃ المجتہد ج ۱، ص ۶۰)

(۳) یہ جمہور (جن میں ائمہ اربعہ بھی شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ سلف میں بعض کے نزدیک تھوڑے یا زیادہ خون کا ایک ہی حکم ہے۔ (بدایۃ المجتہد ج ۱، ص ۶۰) مذاہب اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ شہید کا خون اور وہ خون جو ذبح کرنے کے بعد جانور کے گوشت کے ساتھ یا اس کی رگوں میں بچ رہے۔ پاک ہے، مچھلی، جوں، اور مچھر کا خون بھی پاک۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۱۲) مذاہب اربعہ میں (خون پر قیاس کرتے ہوئے) پیپ اور زخم سے نکلا ہوا پانی ناپاک ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ایضاً) لیکن امام ابن تیمیہؒ ان دونوں سے کپڑے کو دھونا ضروری قرار نہیں دیتے کیونکہ ان کے ناپاک ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ (یعنی ان کے ناپاک ہونے کا قرآن یا حدیث میں ذکر نہیں۔)

۳۔ سؤر :

سؤر کے گوشت کے ناپاک ہونے پر اجماع ہے، جیسا کہ اوپر قرآن کی دونوں آیتوں میں اس کا ذکر آیا ہے۔ (بدایۃ المجتہد ج ۱، ص ۵۹)۔ سؤر، اس کے جسم اور دوسری تمام چیزوں کے ناپاک ہونے پر بھی امام مالکؒ کے سوا سب کا اتفاق ہے ۱۔

۴۔ کتا :

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا منہ ڈال جائے تو اسے چاہئے کہ اپنے برتن کو سات مرتبہ دھوئے (بخاری۔ مسلم۔ احمد)

اس حدیث کی بنا پر جمہور کے نزدیک کتے کا نہ صرف لعاب بلکہ اس کا بدن اور ہر چیز ناپاک ہے ۲۔ (نیل الاوطار ج ۱، ص ۳۱)

۵۔ قے :

قے کی ناپاکی پر اجماع ہے، نبی ﷺ نے حضرت عمارؓ کو اس سے کپڑا دھونے کا حکم دیا ۳۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۱۴)

۱۔ امام مالکؒ کے نزدیک سؤر کا صرف گوشت ناپاک ہے، دوسرے چیزیں ناپاک نہیں۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی آیت "اَوْلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ فَاِنَّہٗ رِجْسٌ" کی ضمیر امام مالک کے نزدیک لَحْم (گوشت) کیلئے ہے اور دوسروں کے نزدیک خِنْزِیْر (سور) کے لئے۔

۲۔ حنفیہ کے نزدیک کتے کا صرف لعاب ناپاک ہے (کیوں کہ اسی کی وجہ سے برتن کو دھونے کا حکم دیا گیا ہے) اس کا جسم ناپاک نہیں ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۱۱)

امام عکرمہؒ اور ایک روایت میں امام مالک کے نزدیک کتے کا لعاب بھی ناپاک نہیں ہے انکا استدلال قرآن کی آیت فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ (تم کھاؤ وہ شکار کئے ہوئے جانور جنھیں یہ شکاری جانور پکڑیں) کیونکہ جب کتے شکار کو پکڑیں گے تو اسے ان کا لعاب بھی لگ جائے گا تو اسکی رخصت ہے۔ اوپر کی حدیث سے اس آیت کا تصادم نہیں ہوتا (نیل الاوطار ایضا) اوپر کی حدیث کے متعلق امام مالک کا کہنا یہ ہے کہ اس میں صرف کراہت دور کرنے کے لئے برتن دھونے کا حکم دیا گیا ہے (الفتح الربانی ج ۱-۳۲۱)

۳۔ حنفیہ کے نزدیک قے اگر منہ بھر سے کم ہو تو وہ نجاستِ خفیفہ ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۱۴)

۶۔انسان کا پیشاب و پاخانہ :

ان کے ناپاک ہونے پر اجماع ہے (بدایۃ المجتہد ج ۱، ص ۵۹) البتہ اگر بچہ (لڑکا) دودھ پیتا ہو، ابھی غذا کھانے نہ لگا ہو تو اس کے پیشاب کے بارے میں سختی نہیں ہے۔ اس کے پیشاب پر چھینٹے دے لینا کافی ہیں۔ حضرت ام قیسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے پاس وہ اپنا ایک بچہ (لڑکا) لے کر آئیں، جو ابھی غذا کھانے نہیں لگا تھا۔ اس نے نبی ﷺ کی گود میں پیشاب کر دیا تو حضورؐ نے پانی منگوایا اور اس سے اپنے کپڑے پر چھینٹے دے لئے اور اسے دھویا نہیں "نَضَحَهُ وَ لَمْ يَغْسِلْهُ" (بخاری، مسلم۔ ترمذی۔ ابوداوُد۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "لڑکے کے پیشاب پر چھینٹے دیئے جائیں گے اور لڑکی کے پیشاب کو دھویا جائے گا"۔ يُنْضَحُ وَلَا يُغْسَلُ (مسند امام احمد ۱)

۷۔مذی اور ودی ۲ :

ان کے ناپاک ہونے پر اجماع ہے البتہ ان سے غسل ضروری نہیں، صرف وضو ضروری ہے۔ جیسا کہ پیشاب کے بعد ضروری ہے (فتح الباری، بدایۃ المجتہد)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ مجھے بہت مذی آیا کرتی تھی اور میں اس کے متعلق نبی ﷺ سے سوال کرنے سے شرماتا تھا۔ میں نے ایک آدمیؓ سے کہا اس کے متعلق نبی ﷺ سے دریافت کرو۔ آپؐ نے فرمایا "وضو کرو اور اپنی شرم گاہ کو دھو لو۔ (بخاری)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں "منی میں غسل ضروری ہے اور مذی اور ودی میں پوری

۱۔ اکثر علمائے سلف کا مسلک یہی ہے، امام نخعیؒ، امام سفیان ثوریؒ، امام ابو حنیفہؒ آپ کے اصحاب اور کوفہ کے دوسرے فقہا اور مالکیہ کے نزدیک چھوٹے بچے کا پیشاب دھونا بھی اس طرح ضروری ہے جس طرح بڑے آدمی کے پیشاب کا (الفتح الربانی ج ۱ ص ۲۴۵) اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اوپر کی حدیث میں نضح کا لفظ آیا ہے جس کے معنی لغت میں چھینٹے دینا اور دھونا دونوں ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ (اور دوسرے جن کے نزدیک بچہ کے پیشاب کا دھونا ضروری ہے) اس کے معنی دھونے کے اور لم یغسلہ کے معنی دھونے میں مبالغہ نہ کیا" کے لیتے ہیں (موطا امام محمد)

۲۔ مذی سے مراد وہ گاڑھا پانی ہے جو ملاعبت وغیرہ کی وجہ سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ ودی سے مراد وہ گاڑھا مادہ ہے جو بعض لوگوں کو پیشاب کے بعد آ جاتا ہے۔

طرح وضو۔"(بخاری)

حضرت سہل بن حنیف سے روایت ہے کہ میں مذی کی وجہ سے تنگ آکر بار بار غسل کرتا تھا۔ میں نے اپنی یہ کیفیت نبی ﷺ سے بیان کی آپ نے فرمایا" تمہارے لئے وضو کر لینا کافی ہے"۔ میں نے عرض کیا" اے اللہ کے رسول ﷺ! جو کپڑے سے لگ جائے اسے کیا کروں؟" فرمایا" ایک چلو پانی لے لو اور جہاں تمہارا خیال ہے کہ مذی لگی ہے وہاں چھینٹے دے لو (احمد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ)

۸۔ منی:

منی کے متعلق دو طرح کی احادیث ہیں بعض میں اسے دھونے کا ذکر ہے اور بعض میں اسے رگڑ لینے کا۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نبی ﷺ کے کپڑے سے منی رگڑ کر صاف کیا کرتی تھی اگر وہ خشک ہوتی، اور اسے دھویا کرتی تھی اگر وہ تر ہوتی (احمد۔ دارقطنی۔ بزار۔ ابو عوانہ)

حضرت عائشہؓ ہی کے متعلق روایت ہے کہ وہ نبی ﷺ کے کپڑے سے منی کو دھویا کرتی تھیں (مسند احمد)

ان احادیث کی بنا پر سلف میں بعض کے نزدیک منی پاک ہے اور بعض کے نزدیک ناپاک (۱) (ترمذی)

۱۔ امام سفیان ثوریؒ، احمدؒ، اسحاقؒ، شافعیؒ اور عام محدثین کے نزدیک منی پاک ہے کیونکہ اگر یہ ناپاک ہوتی تو اس کا رگڑ کر صاف کر لینا کافی نہ ہوتا، البتہ اس کا دھونا مستحب ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اور مالکؒ کے نزدیک منی ناپاک ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک اس کا ہر حال میں دھونا ضروری ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس میں سختی نہیں ہے۔ اگر وہ خشک ہو تو اس کا رگڑ لینا کافی ہے اور اگر تر ہو تو اس کا دھونا ضروری ہے۔ (جیسا کہ اوپر والی حدیث میں حضرت عائشہؓ کا عمل بیان ہوا ہے۔ نیل الاوطار میں قاضی شوکانیؒ نے اسی مسلک کو صحیح قرار دیا ہے)۔ (الفتح الربانی ج ۱، ص ۵۲، ۲۵۱) واضح رہے کہ حنفیہ کے نزدیک منی کا خشک ہونے کی صورت میں کپڑے سے رگڑنا کافی ہے نہ کہ بدن سے بھی۔ بدن سے اس کا دھونا بہر حال ضروری ہے (الکوکب الدری ج ۱)

۹۔ حرام جانوروں کا گوشت و پیشاب و پاخانہ :

حرام جانوروں کا گوشت اور پاخانہ ناپاک ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ فتح خیبر کے دن ہمیں گدھوں کا بہت سا گوشت ملا۔ اتنے میں نبی ﷺ کی طرف سے منادی کرنے والا آیا اور اس نے اعلان کیا "اللہ اور اس کا رسول تمہیں گدھوں کا گوشت کھانے سے منع کرتے ہیں، اس لئے کہ یہ ناپاک ہے"۔ (بخاری و مسلم)

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ رفعِ حاجت کے لئے نکلے اور مجھے حکم دیا کہ آپ کے لئے تین پتھر ڈھونڈ کر لاؤں۔ مجھے دو پتھر مل گئے، تیسرا پتھر نہ ملا۔ میں لید اٹھا کر لے گیا۔ حضور ﷺ نے دونوں پتھر لے لئے اور لید کو پھینک دیا اور فرمایا "یہ ناپاک ہے"۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "یہ گدھے کی لید ہے" (بخاری۔ ابن ماجہ۔ ابن خزیمہ)

لیکن حلال جانوروں کا پیشاب و پاخانہ ناپاک نہیں ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ عکل اور عرنیہ (عرب کے دو قبیلے) کے چند لوگ مدینہ آئے اور وہاں آب و ہوا سے بیمار ہو گئے۔ نبی ﷺ نے انھیں حکم دیا کہ اونٹ کا دودھ اور پیشاب پئیں [۱]۔ (بخاری۔ مسلم)

۱۰۔ شراب :

اس کی ناپاکی قرآن سے ثابت ہے۔ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے :

---

[۱] یہ امام مالکؒ، احمدؒ، ابراہیم نخعیؒ، زہریؒ (حنفیہ میں سے) امام محمدؒ، زفرؒ (شافعیہ میں سے) امام ابن منذرؒ اور دوسروں کا مسلک ہے (عام اہل حدیث علماء کا بھی یہی مسلک ہے) امام شافعیؒ کے نزدیک حلال جانوروں کا پیشاب و پاخانہ بھی ناپاک ہے۔ اوپر کی حدیث میں عکل اور عرنیہ کے لوگوں کو نبی ﷺ نے اونٹوں کا پیشاب پینے کی اجازت دی تھی وہ انہی کے ساتھ خاص تھی (نیل الاوطار۔ الفتح الربانی ج ا۔ ص ۲۴۶) امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حلال جانوروں اور پرندوں کا پیشاب و پاخانہ نجاست خفیفہ ہے۔ کیونکہ مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حلال جانوروں کا پیشاب پاک ہے۔ اور دوسری حدیث میں ہے کہ "ہر پیشاب سے پاکیزگی حاصل کرو" (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا۔ ص ۲۶) \
نجاست خفیفہ کی تعریف اور حکم کے لئے دیکھیے حاشیہ صفحہ ۳۸۔

إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ ‌ شراب اور جوا ناپاک ہیں۔
رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ (المائدہ: ۹۰) ‌ یہ شیطان کے کام ہیں۔

۱۔ شراب کی ناپاکی پر سلف کا تقریباً اجماع ہے۔ البتہ بعض علماء اس آیت میں ناپاکی کو اخلاقی ناپاکی پر محمول کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے نزدیک شراب ناپاک نہیں ہے۔ (بدایۃ المجتہد)

نجاست دور کرنے کی صورتیں

مختلف چیزوں کی نجاست مختلف طریقوں سے دور ہوتی ہے۔

۱۔ بدن یا کپڑا:

اگر بدن یا کپڑا ناپاک ہو جائے تو اس کا دھونا ضروری ہے، یہاں تک کہ نجاست زائل ہو جائے:

حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی اور دریافت کیا "ہم میں سے اگر کسی کے کپڑے کو حیض کا خون لگ جائے تو وہ کیا کرے؟" فرمایا "اسے کھرچے، اس پر پانی ڈالے (یعنی دھوئے) اور پھر اس کے ساتھ نماز پڑھے۔" (بخاری و مسلم) (۱)

۱۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے البتہ انسان کی مختلف مجبوریوں کو سامنے رکھتے ہوئے حنفیہ کے نزدیک ایک درہم (یا انگریزی روپیہ) کے برابر نجاست معاف ہے یعنی اگر وہ گاڑھی ہے تو اس کا وزن ایک مثقال (۳/۱-۴ ماشہ) سے زیادہ نہ ہو اور اگر پتلی ہے تو اس کا پھیلاؤ ہتھیلی کی گہرائی سے زیادہ نہ ہو۔ قابل معافی سے مراد یہ ہے کہ اس قدر نجاست سے نماز اصل میں صحیح ہے۔ یہ مراد نہیں کہ وہ مکروہ بھی نہیں بلکہ مقدار معینہ کا دور کرنا واجب ہے۔ اگر دور نہ کیا جائے گا تو نماز مکروہ تحریمی ہو گی اور اس مقدار سے کم کا دور کرنا سنت ہے اور دور نہ کرنا مکروہ تنزیہی ہے۔ یہی حکم نجاست خفیفہ کا ہے (در مختار) حنفیہ کے نزدیک نجاست کی دو قسمیں ہیں: ایک نجاست غلیظہ اور دوسری نجاست خفیفہ نجاست غلیظہ وہ ہے جو کسی ایسے نص (قرآن کی آیت یا نبی ﷺ کی حدیث) سے ثابت ہو جو کسی دوسرے نص سے متعارض نہ ہوتا ہو۔ نجاست خفیفہ وہ ہے جو کسی ایسے نص سے ثابت ہو جس کا کسی دوسرے نص سے تعارض ہوتا ہو، جیسے حلال جانوروں کا پیشاب و پاخانہ مالکیہ کے نزدیک پیشاب یا پاخانہ اگر خود ٹپک جائے تو اس کا بدن یا کپڑے یا جگہ (جب کہ اس کے سوا دوسری جگہ نہ ہو) سے دھونا ضروری نہیں (یعنی اگر اس کے ساتھ نماز پڑھ لی جائے تو نماز ہو جائے گی)۔ شافعیہ کے نزدیک صرف وہ نجاست قابل معافی ہے جو آنکھ سے دیکھی نہ جا سکتی ہو۔ حنابلہ کے نزدیک صرف وہ پیشاب قابل معافی ہے جو پوری کوشش کے باوجود ٹپک جائے۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج۱، ص ۲۵-۳۰)

۲۔ زمین :

زمین اگر ناپاک ہو جائے تو پانی بہادینے سے وہ پاک ہو جاتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی آیا اور مسجد کے صحن میں بیٹھ کر پیشاب کرنے لگا۔ صحابہ اسے پکڑنے اور روکنے کے لئے دوڑے۔ نبی ﷺ نے فرمایا "اسے پیشاب کرنے دو اور اس کے پیشاب پر پانی کا ایک ڈول بہادو۔ اس لئے کہ تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو۔ سختی کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ا؎۔" (بخاری۔ احمد۔ ابو داوٗد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

۳۔ گھی، تیل یا اسی قسم کی دوسری چیزیں :

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت میمونہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سے کسی نے دریافت کیا کہ اگر گھی میں چوہا گر جائے تو کیا کیا جائے؟" آپ نے فرمایا "اس کے ارد گرد جو گھی ہو۔ اسے پھینک دو اور اپنا گھی کھاؤ"۔ (بخاری) یعنی اگر گھی جما ہوا ہے تو اتنا گھی پھینک دینا

ا؎ پانی بہانے سے زمین کے پاک ہو جانے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ حنفیہ کے نزدیک زمین کا کھودنا اور اس پر تین مرتبہ پانی بہانا یا ایک ہی مرتبہ خوب پانی بہانا ضروری ہے (ان کا استدلال یہ ہے کہ ابو داوٗد، دار قطنی، اور طحاوی کی دوسری روایتوں میں ہے کہ جب دیہاتی نے پیشاب کر دیا تو نبی ﷺ نے زمین کے کھودنے اور اس پر پانی بہانے کا حکم دیا۔ دوسروں کے ہاں یہ روایتیں مرسل یا ضعیف ہونے کی وجہ سے قابل حجت نہیں ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ حنفیہ کے نزدیک زمین کا کھودنا صرف اس وقت ہے جبکہ زمین پکی اور ایسی سخت ہو کہ وہ پانی کو جذب نہ کر سکتی ہو، اور اگر وہ پانی کو جذب کر سکتی ہو تو اسکا کھودنا ضروری نہیں ہے۔ (امام عینی فی شرح صحیح البخاری)

حنفیہ کے نزدیک صرف ہوا اور دھوپ میں خشک ہو جانے اور گندگی کا اثر زائل ہو جانے سے بھی زمین پاک ہو جاتی ہے، اگرچہ اس صورت میں اس پر صرف نماز پڑھی جاسکتی ہے، اس سے تیمم نہیں کیا جا سکتا (شرح وقایہ)۔ اس بارے میں حنفیہ کا استدلال یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں کنوارا اور جوان ہوتا تھا اور مسجد میں سویا کرتا تھا۔ کتے آتے اور مسجد میں پیشاب کرتے اور ادھر سے ادھر چکر لگاتے تو اس کی وجہ سے مسجد دھوئی نہ جاتی تھی۔" (ابو داوٗد) نیز یہ کہ مسند امام ابن ابی شیبہ میں روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "زمین کی پاکیزگی اس کا خشک ہو جانا ہے"۔ نیز یہ کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں "زمین کی پاکیزگی اسکا خشک ہو جانا ہے" یہی مذہب بعض شافعیہ کا بھی ہے۔ یہ روایات دوسرں کے نزدیک سند کے لحاظ سے کمزور اور نا قابل حجت ہیں۔ اس لئے ان کے نزدیک صرف دھوپ اور ہوا سے زمین پاک نہیں ہوتی۔

(تحفۃ الاحوذی ج ۱، ص ۱۳۹)

چاہیئے، جس کے متعلق خیال ہو کہ یہاں تک گندگی کا اثر پہنچا ہوگا۔ پگھلے ہوئے گھی یا تیل میں نجاست گر جائے تو جمہور (اکثریت سلف) کا مسلک یہ ہے کہ وہ سارا ناپاک ہو جاتا ہے۔(۱)

۴۔ مردہ جانور کی کھال :

مُردہ جانور کی کھال دباغت (داغ دینے) سے پاک ہو جاتی ہے اور اسے ہر قسم کے استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "دباغت سے کھال پاک ہو جاتی ہے۔" (۲)(بخاری و مسلم)

۵۔ آئینہ، تلوار یا اسی طرح کی وہ چیزیں جن کے مسام نہیں ہوتے :

اس قسم کی چیزوں کو اگر نجاست لگ جائے تو ان کا پونچھنا کافی ہے، یہاں تک کہ نجاست کا نشان دور ہو جائے۔ صحابہ کرام تلواروں کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے۔ انہیں جو خون لگ جاتا تھا، اسے پونچھ لیتے تھے اور اسی کو کافی سمجھتے تھے۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

---

(۱) مالکیہ کے نزدیک دباغت سے کھال کا صرف باہر کا حصہ پاک ہوتا ہے' اندر کا نہیں حنابلہ کے نزدیک دباغت سے کھال کا کوئی حصہ پاک نہیں ہوتا۔ صحابہ میں سے حضرت عمرؓ' عبداللہ بن عمرؓ اور عائشہؓ کا بھی یہی مسلک ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ دباغت سے کھال کے پاک ہو جانے کا حکم پہلے تو تھا لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا کیونکہ حضرت عبداللہ بن حکیمؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ نے (اپنی وفات سے ایک ماہ پہلے) فرمایا مردہ کی کھال اور آنتوں کو استعمال میں نہ لاؤ۔ لیکن دوسرے اس حدیث سے اوپر کی احادیث کو منسوخ نہیں مانتے کیونکہ اس حدیث کی روایت میں اضطراب (جھول) ہے۔ (نیل الاوطار ج ۱' ص ۵۴)

(۲) امام زہریؒ اور اوزاعیؒ کے نزدیک تمام بہنے والی چیزوں کا وہی حکم ہے جو پانی کا ہے' یعنی جب تک گندگی کی وجہ سے ان کا رنگ' بو یا مزہ نہ بدل جائے' وہ پاک ہیں۔ حضرت عباسؓ' ابن مسعودؓ اور امام بخاریؒ کا بھی یہی مسلک ہے (نیل الاوطار ج ۱' ص ۳۶) حنفیہ کے نزدیک اگر تیل یا گھی پر تین مرتبہ پانی ڈال کر گرا دیا جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے۔ یا اس کے پاک کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک ایسا برتن لیا جائے جس کے پیندے میں سوراخ ہو۔ سوراخ کو کسی چیز سے بند کر دیا جائے۔ پھر اس میں گھی یا تیل ڈال کر اوپر سے پانی ڈال دیا جائے۔ جب تیل یا گھی اوپر آ جائے۔ اور پانی نیچے رہ جائے تو پیندے سے پانی نکال دیا جائے۔

(الفقہ المذاہب الاربعہ ج ۱' ص ۲۲)

۶۔ جوتا:

جوتے کو اگر نجاست لگ جائے اور خشک ہو تو زمین پر رگڑ لینے سے وہ پاک ہو جاتا ہے۔
حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اگر تم میں سے کسی کے جوتے کو نجاست لگ جائے تو مٹی اسے پاک کرنے والی چیز ہے۔ (ابوداؤد)
حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نماز پڑھا رہے تھے کہ آپؐ نے اپنے جوتے اتار دیے، صحابہؓ نے بھی اپنے جوتے اتار دیئے۔ جب نماز سے فارغ ہوئے۔ تو آپ نے لوگوں سے پوچھا' تم نے اپنے جوتے کیوں اتار دیئے؟
صحابہؓ نے عرض کیا "ہم نے آپؐ کو جوتے اتارتے دیکھا تو ہم نے بھی اپنے جوتے اتار دیئے، فرمایا "میرے پاس جبرائیل آئے اور بتایا کہ میرے جوتوں کے نیچے گندگی لگی ہوئی ہے لہٰذا تم میں سے جب کوئی شخص مسجد میں آئے تو اُسے اپنے جوتوں کو پلٹ کر دیکھ لینا چاہیے۔ اگر انھیں گندگی لگی ہو تو اُنھیں زمین سے رگڑ لے اور پھر ان میں نماز پڑھے"۔ (مسند احمد) اس بارے میں اور بھی بہت سی روایات ہیں جن کی سند میں اگرچہ کلام کیا گیا ہے، لیکن وہ سب مل کر قابلِ حجت ہو جاتی ہیں (نیل الاوطار[۱])

---

[۱]- یہ امام ابو حنیفہؒ، ابو یوسفؒ، ابو ثورؒ، اسحاقؒ اور احمد بن حنبلؒ اور ظاہریہ کا مسلک ہے۔ ایک روایت میں امام شافعیؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ دوسری روایت میں امام شافعیؒ اور حنفیہ میں سے امام محمدؒ کے نزدیک صرف رگڑ لینے سے جوتے کی ناپاکی دور نہیں ہوتی۔ (الفتح الربانی ج ۱، ص ۲۲۸)

پانی کے احکام

مطلق پانی سب کے نزدیک پاک (طاہر و مطہر-۱-) ہے اس سے مراد عام پانی ہے خواہ وہ زمین سے نکلے یا آسمان سے برسے۔ مختلف صورتوں کے لحاظ سے پانی کی پانچ قسمیں ہو سکتی ہیں۔ پاک یا ناپاک ہونے کے لحاظ سے ہم ان کا حکم ذیل میں بیان کرتے ہیں :

۱۔ سمندر اور دریا کا پانی :

• اس پانی کا حکم بھی مطلق پانی ہی کا ہے، اس لئے یہ پاک (طاہر و مطہر) ہے :
حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے دریافت کیا "اے اللہ کے رسول! ہم لوگ سمندر کا سفر کرتے ہیں اور ہمارے پاس تھوڑا سا پانی ہوتا ہے، جسے اگر ہم وضو کے لئے استعمال کریں تو پیاسے رہ جائیں۔ کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں" ؟ فرمایا "وہ پاک ہے اور اس کا مردہ (مچھلی) حلال ہے ۲-"۔

(احمد۔ ابو داؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ)

• اسی طرح جو پانی دیر تک کسی جگہ ٹھہرا رہے اور اس میں گندگی نہ پڑے۔ محض درختوں کے پتوں یا مٹی وغیرہ سے اس میں کچھ تبدیلی آجائے، وہ بھی پاک ہے ۱-

۲۔ وہ پانی جس میں کوئی پاک چیز (جیسے آٹا۔ صابن) وغیرہ مل جائے :

جب تک اس کے رنگ، بو اور مزے میں سے کوئی چیز نہ بدلے وہ پاک (طاہر و

۱-طاہر سے مراد وہ پانی ہے جو خود تو پاک ہو لیکن اس سے دوسری چیزوں کو پاک نہ کیا جا سکتا ہو۔ مطہر سے مراد وہ پانی ہے جو خود بھی پاک ہو اور اس سے دوسری چیزوں کو بھی پاک کیا جا سکتا ہو۔ وضو اور غسل کیلئے صرف مطہر پانی استعمال کیا جاتا ہے۔ طاہر نہیں۔

۲-سمندر کے پانی کے پاک (طاہر و مطہر) ہونے پر اجماع ہے۔ البتہ بعض صحابہؓ جیسے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عمروؓ کے متعلق روایت ہے کہ وہ سمندر کے پانی کو وضو اور غسل کے لئے صحیح نہ سمجھتے تھے"
(نیل الاوطار)۔

۱-اس پر سوائے امام محمد بن سیرینؒ (مشہور تابعی) کے تمام علمائے سلف کا اتفاق ہے (بدایۃ المجتہد ج ۱، ص ۱۸)

مطہر) ہے۔

حضرت امّ ہانیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اور حضرت میمونہؓ نے ایک ایسے برتن سے غسل کیا جس میں گوندھے ہوئے آٹے کا اثر تھا ۱؎ (احمد۔ نسائی۔ ابن خزیمہ) اور اگر اس کے رنگ، بو یا مزے میں سے کوئی چیز بدل جائے تو یہ سب کے نزدیک طاہر تو ہے لیکن اس کے مطہر ہونے میں اختلاف ہے۔ ۲؎

۳۔ وہ پانی جس میں کوئی نجاست گر جائے:

اس پانی کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ نجاست سے اس کے رنگ، بو یا مزے میں سے کوئی چیز بدل جائے اس صورت میں اس کے ناپاک ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ (بدایۃ المجتہد ج۱، ص ۱۸) نیل الاوطار ج۱، ص ۲۶)

دوسرے یہ کہ نجاست سے اس کے رنگ، بو یا مزے میں سے کوئی چیز تبدیل نہ ہو۔ اس صورت میں اگر یہ کم ہے تو ناپاک ہے اور اگر زیادہ ہے تو پاک (طاہر و مطہر) کم پانی وہ ہے جو بڑے مٹکوں (اڑھائی مشک) سے کم ہو اور زیادہ وہ ہے جو دو بڑے مٹکے یا ان سے زیادہ ہو:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اگر پانی ہجر (عرب کی ایک جگہ جس کے مٹکے مشہور تھے) کے دو مٹکے ہو تو نجاست نہیں اٹھاتا (مسند۔ امام احمد، ترمذی۔ نسائی) ۳؎"

۱؎ یہ جمہور (جن میں ائمہ اربعہ شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ امام زہریؒ کے نزدیک یہ پانی طاہر ہے: مطہر نہیں یعنی اسے وضو اور غسل کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ (المغنی ج۱، ص ۱۵)

۲؎ امام مالکؒ، شافعیؒ اور اسحاقؒ کے نزدیک اس سے وضو نہیں ہو سکتا۔ امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے شاگردوں کے نزدیک وضو ہو سکتا ہے الا یہ کہ پکنے سے اس میں کوئی تبدیلی آجائے۔ امام احمدؒ سے دونوں روایتیں ہیں۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آیا ایسے پانی پر لفظ پانی کا اطلاق ہوتا ہے کہ نہیں۔ (المغنی ایضاً۔ بدایۃ المجتہد جلد ۱، ص ۲۱)

۳؎ یہ امام شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور اسحاقؒ کا مسلک ہے (ترمذی)۔ اکثر اہلحدیث علماء نے اوپر کی دو مٹکوں والی حدیث کو صحیح اور قابل حجت قرار دیتے ہوئے اسی مسلک کو اختیار کیا۔ امام مالکؒ اور ظاہریہ کے نزدیک نجاست پڑنے سے اگر پانی کے رنگ، بو یا مزے میں سے کوئی چیز نہیں بدلی تو وہ پاک (طاہر و مطہر) ہے، خواہ اس کی مقدار کم ہو یا زیادہ۔ ان کے نزدیک اوپر کی دو مٹکوں والی حدیث مضطرب (بقیہ اگلے صفحہ پر)

۴۔ مستعمل پانی :

مستعمل پانی سے مراد وہ پانی ہے جو ایک مرتبہ وضو یا غسل میں استعمال ہو چکا ہو۔ یہ پانی طاہر ہے، مطہر نہیں ہے یعنی اسے برتن اور کپڑے وغیرہ دھونے میں استعمال کیا جاسکتا ہے، وضو اور غسل کے لئے استعمال نہیں کیا جاسکتا :

حضرت جابر سے روایت ہے کہ میں بیمار تھا اور کوئی بات نہ سمجھتا تھا۔ نبی ﷺ میری عیادت کے لئے تشریف لائے۔ آپ نے وضو فرمایا اور اپنے وضو کا پانی مجھ پر ڈالا۔"
(بخاری و مسلم)

(جس کی سند یا متن دونوں میں مجہول ہو) ہونے کی وجہ سے قابلِ حجت نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں ان کا استدلال حضرت ابو سعید خدریؓ کی اس روایت سے ہے کہ نبی ﷺ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ ہم بضاعہ کے کنویں (جس میں سیلاب کے وقت چیتھڑے اور دوسری گندی چیزیں گر جایا کرتی تھیں) سے وضو کر سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا "(ہاں) پانی پاک ہے، اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی" (احمدؒ۔ نسائی۔ ابو داوٗدؒ۔ ترمذیؒ۔ شافعیؒ) نیز یہ کہ جب ایک دیہاتی نے مسجد میں پیشاب کر دیا۔ تو نبی ﷺ نے حکم کہ اس کے پیشاب کی جگہ پانی کا ایک ڈول بہا دیا جائے (بخاری۔ احمد۔ ابو داوٗد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

یہ دونوں حدیثیں امام شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور دوسرے محدثین کے نزدیک صحیح ہیں لیکن ان میں سے پہلی حدیث میں نبی ﷺ کا ارشاد کہ "پانی پاک ہے۔ اور اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی" مطلق ہے جس کی حد دو ۲ مٹکوں والی حدیث سے ہوتی ہے دوسری حدیث اور مٹکوں والی حدیث میں امام شافعیؒ (اور دوسرے) یوں تطبیق دیتے ہیں کہ اگر پانی نجاست میں گرے، تو وہ پاک رہتا ہے خواہ وہ دو مٹکوں سے کم ہی ہو اور اگر نجاست پانی پر گرے، تو وہ پاک نہیں رہتا الا یہ کہ وہ دو مٹکوں سے زیادہ ہو۔ (نیل الاوطار۔ بدایۃ المجتہد وغیرہ) امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب بھی دو مٹکوں والی حدیث کو ناقابلِ حجت قرار دیتے ہیں۔ ان کا مسلک قیاس پر ہے اور یہ کہ اگر کسی پانی میں نجاست گر جائے گمان غالب یہ ہو کہ نجاست کا اثر پانی میں پھیل چکا ہو گا تو وہ پانی ناپاک ہو جائے گا، خواہ اس سے اس کے رنگ، بُو اور مزے میں سے کوئی چیز تبدیل نہ ہو کیونکہ اس پانی کو استعمال کرنے کا مطلب ہو گا نجاست کو استعمال کیا جائے، حالانکہ نجاست سے بچنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ (التعلیق الصبیح ج ۱، ص ۲۳۱)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وضو میں استعمال ہو جانے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا لیکن بعض دوسری احادیث میں نبی ﷺ نے منع فرمایا کہ جس پانی سے غسل یا وضو کر لیا جائے اس سے دوبارہ غسل یا وضو نہ کیا جائے۔ لہٰذا یہ پانی خود تو طاہر ہے۔ لیکن مطہر نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص جنابت کی حالت میں کھڑے ہوئے پانی میں غسل نہ کرے" (جب حضرت ابو ہریرہؓ یہ حدیث بیان کر رہے تھے تو) لوگوں نے پوچھا "اے ابو ہریرہؓ! پھر وہ کیا کرے؟ ابو ہریرہؓ نے کہا " اسے ہاتھ سے لے لے کر نہائے۔" (مسلم ابن ماجہ) ابو داؤد کی روایت میں نبی ﷺ کے الفاظ یوں ہیں "تم میں سے کوئی شخص کھڑے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کرے اور نہ ہی جنابت کی حالت میں اس سے نہائے ا۔"

۵۔ جھوٹا پانی :

(ل) انسان کا جھوٹا پانی : یہ پاک (طاہر و مطہر) ہے خواہ انسان مسلمان ہو یا کافر۔ جنبی اور حائضہ کا چکھا ہوا پانی بھی پاک ہے۔ قرآن کی آیت اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ (مشرک ناپاک ہیں) میں ان کے عقیدے اور عمل کی نجاست بیان کی ہے، بدن کی نجاست بیان نہیں کی گئی۔

ا۔ یہ حنفیہ، شافعیہ، حنبلیہ اور اہل حدیث علماء کا مسلک ہے۔ مالکیہ اور ظاہریہ کے نزدیک مستعمل پانی پاک (بمعنی طاہر و مطہر) ہے، البتہ مالکیہ کے نزدیک دوسرے پانی کے ہوتے ہوئے اس سے وضو یا غسل کرنا مکروہ ہے۔ ان کے نزدیک اوپر حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں نبی ﷺ نے جنابت کی حالت میں کھڑے پانی میں نہانے سے اس لئے منع نہیں فرمایا کہ اس سے پانی کی پاکیزگی میں کوئی فرق آتا ہے۔ بلکہ اس لئے منع فرمایا کہ اس سے جسم کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

امام حسن بصریؒ، زہریؒ اور ابراہیم نخعیؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔

حنفیہ کا عام مسلک وہی ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ لیکن امام ابو یوسفؒ کا مسلک یہ ہے کہ مستعمل پانی ہلکا ناپاک ہے۔ ان کا استدلال حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث اور اسی معنی کی بعض دوسری احادیث سے ہے۔ باقی رہی حضرت جابرؓ کی حدیث تو ان کا کہنا یہ ہے کہ اس میں نبی ﷺ کا عمل بیان ہوا ہے جو آپ ہی کے لئے خاص تھا (نیل الاوطار۔ بدایۃ المجتہد۔ الفقہ علی المذاہب الاربعہ ہدایہ ج ا ص ۱۰)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں حیض کی حالت میں ہوتی تھی۔ پانی پی کر نبی ﷺ کی خدمت میں پیش کرتی، تو آپ برتن کو اُسی جگہ منہ لگا کر پانی پیتے جہاں میں نے منہ لگا کر پانی پیا ہوتا۔" [1] (مسلم)

(ب) حلال جانوروں کا جھوٹا پانی: اس کے پاک (طاہر و مطہّر) ہونے پر سب کا اتفاق ہے، کیونکہ جس جانور کا گوشت کھانا جائز ہے اس کا لعاب بھی پاک ہے (المغنی ج ۱، ۴۲)

(ج) خچر، گدھے اور شکاری پرندوں کا جھوٹا پانی: یہ پانی بھی پاک (طاہر و مطہّر) ہے:

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے دریافت کیا "کیا ہم گدھوں کے بچے ہوئے پانی سے وضو کرلیں"؟ فرمایا "ہاں اور تمام جنگلی جانوروں کے بچے ہوئے پانی سے"۔ (مسند امام شافعی، دار قطنی، بیہقی)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ایک سفر میں جا رہے تھے تو راستے میں ایک آدمی کو ایک بڑے حوض پر بیٹھے ہوئے پایا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے دریافت کیا "کیا رات کے وقت جنگلی جانوروں نے تمھارے حوض میں منہ ڈالا ہے" نبی ﷺ نے اس شخص سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا "اے حوض والے! یہ (یعنی حضرت عمرؓ) بلا وجہ تکلف کر رہے ہیں۔ ان کے سوال کا جواب نہ دو۔ جنگلی جانور اپنے پیٹوں میں جو پانی لے گئے وہ ان کا تھا اور جو بچ گیا وہ ہمارا ہے۔ پینے کا پانی ہے۔ اور پاک ہے۔" (دار قطنی)

حضورؐ نے حوض والے کو یہ بتانے سے کہ اس پر جنگلی جانور آئے ہیں کہ نہیں، اس لئے منع فرمایا کہ اس کا بتانا اور نہ بتانا برابر تھا، کیونکہ وہ پانی بہر حال پاک تھا خواہ اس پر جنگلی جانور آئے ہوں یا نہ آئے ہوں [2]

---

[1] یہ حنفیہ کا عام مسلک ہے۔ البتہ امام نخعیؒ حائضہ کے جھوٹے پانی سے وضو اور غسل ناپسند کرتے تھے اور جابر بن زیدؒ اس سے وضو نہ کرتے تھے (المغنی ج ۱، ص ۴۳)

[2] یہ امام مالکؒ اور شافعیؒ کا مسلک ہے۔ امام بصریؒ، ابن سیرینؒ، شعبیؒ، اوزاعیؒ، حماد اور اسحاقؒ کے نزدیک بھی جنگلی جانوروں کا جھوٹا پانی پاک (طاہر و مطہّر) لیکن مکروہ ہے۔ امام ابو حنیفہؒ، احمد بن حنبلؒ اور سفیان ثوریؒ کے نزدیک جنگلی جانوروں کا جھوٹا پانی ناپاک ہے اگر صرف یہی پانی ہو تو وضو نہیں کیا جائیگا بلکہ تیمم کر کے نماز پڑھی جائے گی۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اوپر حضرت جابرؓ کی حدیث میں نبی ﷺ نے جنگلی جانوروں کے جھوٹے پانی کو جو پاک قرار دیا ہے وہ صرف اس وقت ہے جب کہ یہ پانی زیادہ ہو (پانی کی کم اور زیادہ کی بحث کے لئے دیکھیے صفحہ ۴۶) رہی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث، (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(د) بلی کا جھوٹا پانی: یہ بھی پاک (طاہر و مطہر) ہے:

حضرت کبشہ بنت کعبؓ_____________جو حضرت ابو قتادہؓ کی بیوی تھیں۔ سے روایت ہے کہ ایک دن ابو قتادہؓ میرے پاس آئے میں نے انھیں وضو کے برتن میں پانی دیا۔ اتنے میں ایک بلی آگئی اور برتن میں سے پانی پینے لگی۔ ابو قتادہ نے اس کیلئے برتن ٹیڑھا کر دیا، یہاں تک کہ اس نے پانی پی لیا۔ ابو قتادہؓ نے جب دیکھا کہ میں ان کی طرف تعجب سے دیکھ رہی ہوں تو بولے کیا تمھیں تعجب ہو رہا ہے؟ میں نے جواب دیا جی ہاں کہنے لگے "نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ یہ۔ یعنی بلی ناپاک نہیں ہے۔ یہ ان خادم مردوں اور عورتوں میں سے ہے جو ہر وقت تمھارے پاس آتے جاتے رہتے ہیں ا۔" (مسند احمد۔ ابو داؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

(ہ) کتے کا جھوٹا پانی: یہ ناپاک ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا منہ ڈال جائے، تو اسے چاہئے کہ اسے سات مرتبہ دھوئے، پہلی بار مٹی سے دھوئے (اور باقی چھ بار پانی سے) (بخاری۔ مسلم۔ مسند امام احمد) ۲۔

تو اس میں بھی زیادہ پانی کا ہی حکم بتایا گیا ہے نبی ﷺ نے حوض والے کو جو یہ بتانے سے منع فرمایا کہ اس کے حوض پر جنگلی جانور آئے ہیں کہ نہیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر وہ بتا دیتا تو مشکل پیش آجاتی کیونکہ یہ جان لینے کے بعد کہ جنگلی جانوروں نے اس کے حوض کا پانی پیا ہے، ناپاک پانی سے وضو کرنا جائز نہ رہتا حالانکہ اس وقت حضورؐ کے پاس کوئی دوسرا پانی نہ تھا۔ لہذا اس صورت میں بہتر یہی تھا کہ معلوم کرنے کی کوشش ہی نہ کی جاتی کہ پانی پاک ہے یا ناپاک (المغنی ج ا، ۴۳ التعلیق الصبیح ج ا، ص ۲۲۶)

ا۔ امام ابو حنیفہؒ بلی کو جنگلی جانوروں میں شمار کرتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "بلی درندہ ہے" (احمد۔ حاکم۔ دارقطنی) لیکن دوسرے جنگلی جانوروں کی نسبت اس کے بچے ہوئے پانی کے حکم میں نرمی برتتے ہوئے اسے مکروہ کہتے ہیں، ناپاک نہیں کہتے۔ (نیل الاوطار ج ا، ص ۳۲

۲۔ امام زہریؒ، مالکؒ، اوزاعیؒ اور داؤدؒ ظاہری کے نزدیک کتے کا جھوٹا پانی پاک ہے اگرچہ مکروہ ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں نبی ﷺ نے برتن کو دھونے کا حکم کراہت دور کرنے کے لئے دیا ہے (نہ کہ نجاست کو دور کرنے کے لئے) (المغنی ج ا، ص ۴۱)

رفعِ حاجت

رفع حاجت کے مندرجہ ذیل آداب حدیث سے ثابت ہیں :

۱۔ رفع حاجت کے لئے ایسی جگہ تلاش کرنی چاہیے جہاں بیٹھ کر انسان نظر نہ آئے گھر میں بیت الخلا باپردہ ہونا چاہیے اور اگر کھلے میدان میں ہو تو اسے چاہیے کہ دور نکل جائے ۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ رفع حاجت کے وقت دور تشریف لے جاتے، یہاں تک کہ کوئی شخص آپ کو نہ دیکھ سکتا" (ابو داؤد۔)

۲۔ رفع حاجت کے وقت اپنے پاس کوئی ایسی چیز نہیں رکھنی چاہیے ، جس پر اللہ تعالیٰ کا نام لکھا ہو۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اپنی انگوٹھی جب بیت الخلا جاتے تو اسے اتار دیتے" (ابو داؤد۔ ترمذی۔۔ نسائی)

بیع روایات میں ہے کہ آپ کی انگوٹھی پر محمد رسول اللہ کندہ تھا (المنتقیٰ)

۳۔ رفعِ حاجت کے لیے بیت الخلا میں داخل ہوتے وقت پہلے بایاں پاؤں پھر دایاں۔ اس کے بعد یہ دعا پڑھنی چاہیے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ — اے اللہ! میں نر اور مادہ ناپاک وحوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

(بخاری۔ مسلم۔ ابو داؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

۴۔ بیت الخلا میں نہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہیے اور نہ کسی اور قسم کی بات کرنی چاہیے۔ کوئی سلام کہے تو اس کا جواب بھی نہیں دینا چاہیے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے سنا "دو آدمیوں کو رفع حاجت کے لئے اس طرح نہ نکلنا چاہئے کہ جب وہ اپنی شرم گاہیں کھولیں تو آپس میں بات چیت کریں۔ اس لئے کہ یہ چیز اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے"۔ (مسند احمد۔ ابو داؤد۔ ابن ماجہ)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ پیشاب کر رہے تھے۔ایک آدمی آپ کے پاس سے گذرا۔اور آپ کو سلام کیا لیکن آپ نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا" (مسلم۔ترمذی۔ابو داؤد۔نسائی۔ابن ماجہ)

۵۔ رفع حاجت کے وقت انسان کو نہ قبلہ کی طرف رُخ کرنا چاہیے اور نہ پیٹھ (جب کہ وہ کھلے میدان میں ہو) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا" تم میں سے جب کوئی شخص رفع حاجت کے لئے بیٹھے تو وہ نہ قبلہ کی طرف رخ کرے اور نہ پیٹھ" (مسلم۔مسند امام احمد)

لیکن گھروں میں ایسا کرنا جائز ہے : حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ " ایک روز میں (اپنی بہن) حضرت حفصہؓ کے مکان پر چڑھا تو دیکھا کہ نبی ﷺ شام کی طرف رُخ اور کعبہ کی طرف پیٹھ کئے ہوئے رفع حاجت فرما رہے تھے"۔(بخاری۔ مسلم۔احمد۔ابو داؤد ۔ترمذی۔نسائی۔ابن ماجہ ۱ ؎)

۶۔ رفع حاجت کے لئے نرم اور پست زمین تلاش کرنی چاہئے تاکہ پیشاب کے چھینٹے کپڑوں پر نہ پڑ سکیں۔ حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ایک دیوار کے قریب آئے اور نرم جگہ دیکھ کر پیشاب کیا بعد میں فرمایا" جب تم میں سے کوئی شخص پیشاب کرے تو نرم زمین تلاش کرے"۔ (مسند امام احمد، ابو داؤد)

۷۔ کسی جانور کے بل میں پیشاب نہ کرنا چاہئے۔ حضرت عبداللہ بن سرجسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ کسی جانور کے بل میں پیشاب کیا جائے"۔
(مسند امام احمد، ابو داؤد، نسائی، حاکم، بیہقی، ابن خزیمہ)

۸۔ ایسی جگہ رفع حاجت نہ کرنی چاہئے جہاں لوگ بیٹھتے یا گزرتے ہوں۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا" دو لعنت کرنے والی چیزوں سے بچو" صحابہؓ نے عرض

---

۱ ؎ مالکیہ، شافعیہ اور حنبلیہ (اور عام محدثین) کا یہی مسلک ہے۔ حنفیہ کے نزدیک رفع حاجت کے لئے ہر حال میں قبلہ رخ ہونا یا قبلہ کی طرف پیٹھ کرنا ناجائز ہے۔کیونکہ نبی ﷺ نے جس حدیث میں قبلہ کی طرف رخ یا پیٹھ کرنے سے منع فرمایا ہے۔اس کا حکم عام ہے۔ ممکن ہے کہ کسی عذر کی بنا پر نبی ﷺ نے قبلہ کی طرف پیٹھ فرمائی ہو، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے (الکوکب الدری ج ۱، ص ۱۶)۔ اہلحدیث علماء میں سے قاضی شوکانیؒ اور مولانا عبدالرحمنؒ مبارکپوریؒ نے اسی مسلک کو ترجیح دی ہے (تحفۃ الاحوذی ج ۱، ص ۲۰ ۔ نیل الاوطار)

کیا "یارسول اللہ! دو لعنت کرنے والی چیزیں کون سی ہیں"؟ فرمایا وہ جو لوگوں کے (۱) بیٹھنے یا (۲) گزرنے کی جگہ میں رفع حاجت کرتا ہے"۔ (مسلم، مسند امام احمد، ابو داؤد)

۹- غسل خانہ میں پیشاب نہ کرنا چاہئے۔ حضرت عبداللہ بن مُغفلؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص اپنے غسل خانہ میں پیشاب نہ کرے"۔ (احمد، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، نسائی) لیکن اگر غسل خانہ کا فرش پختہ ہو تو اس میں پیشاب کرنے میں ہرج نہیں ہے جبکہ اوپر سے پانی بہا دیا جائے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے۔

۱۰- بہتے یا ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب نہیں کرنا چاہئے۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے بہتے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے"۔ حضرت جابرؓ ہی سے دوسری روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے"۔ (مسلم، احمد، نسائی، ابن ماجہ)

۱۱- کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس سے بدن پر چھینٹوں کے پڑنے کا بھی اندیشہ ہے۔ لیکن جہاں مجبوری ہو اور چھینٹوں کے پڑنے کا اندیشہ نہ ہو وہاں کھڑے ہو کر پیشاب کرنا جائز ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جو شخص تمہیں یہ بتاتا ہے کہ نبی ﷺ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا، اس کی بات نہ مانو۔ آپ ﷺ صرف بیٹھ کر ہی پیشاب کیا کرتے تھے"۔ (احمد، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، نسائی)

لیکن یہ چیز حضرت عائشہؓ نے اپنے علم اور مشاہدے کی بناء پر بیان فرمائی ہے۔ حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کوڑا کرکٹ کے ایک ڈھیر کے پاس گئے اور کھڑے ہو کر پیشاب کیا"۔ (بخاری، مسلم، ابو داؤد، احمد، ترمذی، ابن ماجہ، نسائی)

۱۲- استنجاء صرف پانی سے بھی جائز ہے صرف پتھر (یا جس سخت اور پاک چیز سے گندگی دور ہو سکتی ہو) سے بھی اور دونوں سے ایک ساتھ بھی۔ یہ سب صورتیں نبی ﷺ سے ثابت ہیں۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اگر تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کے لئے جائے تو اسے چاہئے کہ تین پتھروں سے استنجا کرے۔ اس لئے کہ یہ کافی ہیں"۔ (احمد، ابو داؤد، نسائی، دارقطنی) حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ بیت الخلاء میں داخل ہوتے تھے تو میں اور ایک دوسرا لڑکا ایک لوٹا اور ایک نیزہ اٹھا کر لے جاتے اور آپؐ پانی سے استنجا فرماتے"۔ (بخاری، مسلم)

البتہ بہتر یہ ہے کہ پانی اور پتھروں دونوں سے استنجا کیا جائے اور اگر دونوں [illegible] سے ایک

پر اکتفا کرنا ہو تو پانی سے استنجا کرنا بہتر ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "یہ آیت اہل قبا کے بارے میں نازل ہوئی ہے "فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ" (اس میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو پاک ہونا پسند کرتے ہیں اور اللہ پاکی چاہنے والوں کو پسند کرتا ہے)۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ پانی سے استنجا کیا کرتے تھے۔ اسی لئے یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی۔ (ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ) حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی ﷺ نے اہل قبا سے دریافت فرمایا۔ انہوں نے بتایا کہ ہم استنجا میں پہلے پتھر استعمال کرتے ہیں اور اس کے بعد پانی"۔ (بزار[1]) اگرچہ یہ روایت سند کے لحاظ سے ضعیف ہے۔

۱۲۔ استنجا کے لئے دایاں ہاتھ استعمال نہ کرنا چاہئے۔ حضرت سلمان فارسیؓ سے بعض مشرکین نے مذاق کرتے ہوئے کہا "تمہارے نبی ﷺ نے تمہیں ہر چیز سکھادی ہے حتیٰ کہ پیشاب و پاخانہ کرنا بھی"۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے جواب دیا "ہاں! ہمارے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ ہم پیشاب و پاخانہ کرتے وقت قبلہ کی طرف رخ یا پیٹھ کریں اور یہ کہ ہم دائیں ہاتھ سے استنجا کریں اور یہ کہ ہم میں سے کوئی شخص تین سے کم پتھروں سے نجاست دور کرے[2]، اور یہ کہ لید یا ہڈی سے استنجا کرے"۔ (مسلم، ابو داؤد، ترمذی)

---

(۱) یہ سلف کا عام مسلک ہے۔ امام عینیؒ فرماتے ہیں "جمہور سلف و خلف کا مسلک جس پر تمام ملکوں کے اہل فتویٰ حضرات کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ پانی اور پتھر دونوں کا استعمال بہتر ہے۔ پہلے پتھر استعمال کیا جائے اور پھر پانی، اس سے نجاست کم ہو کر ہاتھ کو بھی کم لگے گی اور صفائی زیادہ ہو گی۔ اگر دونوں میں سے صرف ایک پر اکتفا کرنا ہو تو پانی استعمال کرنا بہتر ہے اس لئے کہ اس سے گندگی اور اس کا نشان دونوں زائل ہو جاتے ہیں اور پتھر سے گندگی تو دور ہوتی ہے لیکن اس کا نشان رہ جاتا ہے۔ اگرچہ یہ معاف ہے اور اس کے ساتھ نماز ہو جاتی ہے"۔ (نقلاً عن تحفۃ الاحوذی ج ۱، ص ۳۱)

امام مالکؒ اس چیز کو نہیں مانتے کہ نبی ﷺ نے پانی سے استنجا کیا ہو لیکن بعض مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ پتھر سے نجاست دور کرنا اس وقت صحیح ہے جبکہ پانی نہ ملے۔ (نیل الاوطار ج ۱، ص ۸۸)

(۲) بعض دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تین پتھروں کی تعداد ضروری نہیں، بہتر ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو شخص پتھر استعمال کرے اسے چاہئے کہ طاق پتھر استعمال کرے جو شخص ایسا کرے بہتر ہے اور جو نہ کرے تو کوئی حرج نہیں"۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

۱۴- استنجا کے بعد اپنا ہاتھ زمین پر ملنا چاہئے۔(یا صابون وغیرہ سے دھونا چاہئے) تاکہ اس کی بدبو دور ہو جائے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب نبی ﷺ بیت الخلاء جاتے تھے میں پیتل کے ایک برتن میں آپ کے پاس پانی لاتا۔ آپ استنجا فرماتے اور پھر زمین پر ہاتھ ملتے"۔ (سکتہ عنہ ابوداؤد المنذری، نسائی، بیہقی، ابن ماجہ)

۱۵- پیشاب کے بعد اپنے پاجامے پر شرم گاہ کی جگہ چھینٹے دینے چاہئیں تاکہ نفس کا وسوسہ اور شک دور ہو۔ حضرت زید بن حارثہؓ سے روایت ہے کہ جب پہلے پہل حضرت جبرئیل نبی ﷺ کے پاس وحی لائے اور آپ کو وضو اور نماز کا طریقہ سکھایا تو وضو سے فارغ ہونے کے بعد حضور ﷺ نے پانی کا ایک چلو لیا اور اس سے اپنی شرم گاہ پر چھینٹے دیئے"۔

(احمد، دارقطنی)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس قدر چھینٹے دیتے کہ آپ کا پاجامہ تر ہو جاتا۔

۱۶- بیت الخلاء سے نکلتے وقت دایاں پاؤں پہلے باہر رکھنا چاہئے اور بایاں بعد میں۔اس کے بعد یہ دعا پڑھنی چاہئے "غفرانک" (اے اللہ! میں تیری بخشش چاہتا ہوں) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب نبی ﷺ بیت الخلاء سے باہر تشریف لاتے تو فرماتے "غفرانک"۔ (احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت الخلاء سے نکلنے کے بعد نبی ﷺ یہ دعا پڑھا کرتے تھے "الحمد للہ الذی اذھب عنی الاذی وعافانی (تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے مجھ سے گندگی دور کی اور اس نے مجھے عافیت بخشی) اگرچہ اس حدیث کی سند کمزور ہے۔

(احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ) شافعیہ تین سے کم پتھر استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتے۔ تین سے زیادہ پتھر استعمال ہو سکتے ہیں جبکہ تین سے نجاست دور نہ ہو۔ امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تین کی تعداد ضروری نہیں۔ اصل چیز طاق تعداد معتبر ہے۔(نیل الاوطار ج ۱، ص ۸۴)

وضو

۱- وضو کی فرضیت

وضو کی فرضیت قرآن، سنت اور اجماع امت تینوں سے ثابت ہے- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ (المائدہ ۶)	اے ایمان والو! جب تم نماز کے لئے اٹھو تو چاہئے کہ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھولو- سر پر مسح کر لو اور پاؤں ٹخنوں تک دھولو-

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کسی کا وضو ٹوٹ جائے (یا وضو نہ ہو) تو اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہیں کرتا تاوقتیکہ وہ وضو نہ کر لے"- (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

۲- وضو کی فضیلت

وضو کی فضیلت میں نبی ﷺ سے متعدد احادیث ثابت ہیں- اختصار کے خیال سے ہم ان میں سے صرف ایک حدیث کا ذکر کرتے ہیں:-

حضرت عبداللہ بن صنابحیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا بندہ جب وضو کرتے ہوئے کلی کرتا ہے تو اس کے منہ سے گناہ نکل جاتے ہیں جب وہ ناک میں پانی دے کر سنکتا ہے تو اس کی ناک سے گناہ نکل جاتے ہیں جب وہ چہرہ دھوتا ہے تو اس کے چہرے سے گناہ نکل جاتے ہیں- یہاں تک کہ اس کی آنکھوں کی پلکوں سے گناہ نکلتے ہیں جب وہ بازو دھوتا ہے تو اس کے بازوؤں سے گناہ نکل جاتے ہیں، یہاں تک کہ اس کے ناخنوں کے اندر سے گناہ گرتے ہیں- جب وہ سر کا مسح کرتا ہے تو اس کے سر سے گناہ جھڑتے ہیں، یہاں تک کہ اس

کے کانوں سے گناہ گرتے ہیں جب وہ اپنے پاؤں دھوتا ہے تو اس کے پاؤں کی انگلیوں سے گناہ گرتے ہیں۔ اس کے بعد اس کا مسجد کی طرف جانا اور نماز پڑھنا تطوع (فرض سے زائد چیز جو اپنی مرضی سے کی جائے) ہوتا ہے"۔ (موطا امام مالکؒ، نسائی، ابن ماجہ، حاکم)

۳- وضو کی نیت

وضو کے لئے نیت ضروری ہے (یعنی اگر یہ نہ کی جائے تو وضو نہیں ہو گا) کیونکہ تمام شرعی کاموں کے لئے نیت ضروری ہے۔ [1]

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اعمال نیتوں ہی کے ساتھ ہیں"۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، احمد)

۴- وضو کا طریقہ

نبی ﷺ کے وضو کا طریقہ متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم صرف ایک حدیث نقل کرتے ہیں۔

حضرت عثمانؓ نے وضو کے لئے پانی منگوایا پہلے آپ نے تین مرتبہ اپنے ہاتھوں پر پانی ڈالا اور انہیں دھویا پھر برتن میں ہاتھ ڈالے اور تین مرتبہ کلی کی۔ ناک سنکی اور چہرہ دھویا۔ پھر تین مرتبہ کہنیوں تک دونوں بازو دھوئے، پھر سر (اور کانوں) کا مسح کیا۔ پھر تین تین مرتبہ ٹخنوں تک دونوں پاؤں دھوئے۔ پھر فرمایا "میں نے نبی ﷺ کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا ہے"۔ (بخاری و مسلم)

وضو میں بعض چیزیں فرض ہیں اور بعض سنت۔ اب ہم ان سب کا الگ الگ ذکر کریں گے۔

۵- وضو کے فرائض [2]

۱- چہرے کا دھونا: اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وضو میں چہرے کا دھونا فرض

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک نیت مقاصد کے لئے ضروری ہے وسائل کے لئے ضروری نہیں۔ وضو نماز کے لئے بطور وسیلہ کے ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک وضو کے لئے نیت شرط یا فرض نہیں ہے، سنت ہے۔ یعنی اگر رہ جائے تو وضو ہو جائے گا اگرچہ سنت کے خلاف ہو گا۔

(۲) فرض سے مراد وہ چیزیں ہیں جو اگر رہ جائیں تو وضو نہ ہو گا۔ وضو کے ان فرائض کا قرآن پاک کی مذکورہ بالا آیت میں ذکر ہوا ہے۔

ہے ا ۔

۲- بازوؤں کا دھونا: قرآن کا مذکورہ بالا آیت میں الی المرافق (کہنیوں تک) کا مطلب یہ ہے کہ کہنیاں بھی وضو میں شامل ہیں ۲ ۔ بازوؤں کا بھی ایک مرتبہ دھونا فرض اور دو یا تین مرتبہ دھونا سنت ہے۔

۳- سر کا مسح: سر کا مسح بھی سب کے نزدیک فرض ہے۔ اختلاف اس بارے میں ہے کہ سر کے کتنے حصے کا مسح فرض ہے۔ ۳ ۔

مسح کے بارے میں نبی ﷺ سے تین چیزیں ثابت ہیں۔

(ا) پورے سر کا مسح: حضرت عبداللہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سر کا مسح کیا پہلے آپ دونوں ہاتھوں کو آگے سے گردن کی طرف لے گئے اور پھر پیچھے سے آگے لائے۔ جہاں سے شروع کیا تھا"۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

(ب) سر کے ابتدائی حصے اور پگڑی پر مسح: حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے سر کے ابتدائی حصے اور پگڑی اور موزوں پر مسح فرمایا"۔

(مسلم' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)

سر پر پگڑی کے ہوتے ہوئے اگرچہ سر کے ابتدائی حصے اور پگڑی پر مسح کرنا صحیح ہے جیسا کہ اوپر کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے لیکن تمام علمائے سلف کا اس پر اتفاق ہے کہ پورے سر کا مسح کرنا بہتر ہے۔ (نووی)

(ج) صرف پگڑی پر مسح: حضرت عمروؓ بن امیہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو اپنی

---

(۱) امام احمدؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، اسحاقؒ اور ابن ابی لیلیٰؒ کے نزدیک منہ اور ناک کے اندر کا حصہ بھی چہرے میں شامل ہے اس لئے کلی کرنا اور ناک میں پانی دینا بھی ان کے نزدیک وضو کے فرائض میں داخل ہے۔

(المغنی ج ا ص ۱۰۲)

(۲) اس پر تمام علمائے سلف کا اتفاق ہے۔ صرف امام داؤد ظاہریؒ کے بیٹے ابوبکرؒ اور حنفیہ میں سے امام زفرؒ کے نزدیک کہنیوں تک سے مراد یہ ہے کہ کہنیاں وضو میں شامل نہیں ہیں۔ (نیل الاوطار ج ا' ص ۱۴۲)

(۳) مذاہب اربعہ میں سے مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک پورے سر کا مسح فرض ہے۔ حنفیہ کے نزدیک چوتھائی سر کا اور شافعیہ کے نزدیک سر کے اتنے حصے کا جس پر چار انگلیاں آسکیں۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ص ۵۶، ۵۷)

پگڑی اور موزوں پر مسح کرتے دیکھا"۔ (بخاری، احمد، ابن ماجہ) اس صورت کے صحیح ہونے یا نہ ہونے میں ائمہ سلف کے درمیان اختلاف ہے۔ ا؎

۴۔ پاؤں کا ٹخنوں تک دھونا: یہ چیز نبی ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ آپ وضو میں پاؤں دھویا کرتے تھے اور مسح نہ فرماتے تھے:

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ ایک سفر میں نبی ﷺ ہم سے پیچھے رہ گئے جس کی وجہ سے ہمیں عصر کی نماز میں دیر ہو گئی۔ ہم وضو کرتے ہوئے پاؤں پر مسح کرنے لگے، نبی ﷺ نے بلند آواز سے دو یا تین مرتبہ فرمایا۔ ایڑیوں کو آگ سے تباہی ہو (یعنی ایڑیوں کو دھوؤ، مسح نہ کرو)۔ (بخاری و مسلم)

وضو میں پاؤں کے دھونے پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے۔ (ابن ابی لیلیٰ) صحابہؓ میں سے صرف حضرت علیؓ، ابن عباسؓ اور انسؓ کے متعلق پاؤں دھونے کے بجائے ان پر مسح کرنے کی روایات ملتی ہیں لیکن ان سے بھی رجوع ثابت ہے۔ (فتح الباری)

(نوٹ: امام احمد بن حنبلؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا، چہرہ دھوتے وقت کلی کرنا اور ناک میں پانی دینا، امام شافعیؒ، احمدؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک وضو میں ترتیب، امام مالکؒ اور احمدؒ کے نزدیک وضو میں موالات (اعضاء کا یکے بعد دیگرے پے در پے دھونا) اور امام مالکؒ کے نزدیک وضو میں اعضاء کا ملنا امام احمدؒ اور اسحاق بن راہویہؒ کے نزدیک کانوں کا مسح بھی فرض ہے۔ یہ سب چیزیں چونکہ اکثریت سلف کے نزدیک سنت ہیں

---

(۱) امام اوزاعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور عام اہل حدیث علماء کے نزدیک صرف پگڑی پر مسح ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ حدیث کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔ صحابہؓ میں سے حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، انسؓ، ابو امامہؓ، سعد بن مالکؓ، ابو درداءؓ اور بعض دوسروں کے نزدیک، تابعین میں سے عمر بن عبدالعزیزؒ، قتادہؒ مکحولؒ اور بعض دوسروں کے نزدیک صرف پگڑی پر مسح نہیں ہو سکتا۔ الا یہ کہ اس کے ساتھ سر پر بھی مسح کیا جائے صحابہؓ میں سے بھی بہت سوں کی یہی رائے ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ مسح سر پر فرض کیا گیا ہے۔ رہیں وہ احادیث جن میں صرف پگڑی پر مسح کا ذکر ہے تو ان کے متعلق یہ احتمال ہے کہ ان میں پگڑی کے ساتھ سر پر مسح کا ذکر رہ گیا ہے۔ اس لئے کہ جو چیز یقینی ہو اسے چھوڑ کر اس چیز کو اختیار نہیں کیا جا سکتا جس میں احتمال ہو۔ (ترمذی، نیل الاوطار ج ۱، ص ۱۴۴)

اس لئے ہم ان کا وضو کی سنتوں میں ذکر کریں گے)

۶- وضو کی سنتیں (مؤکدہ) اور مستحبات (غیر مؤکدہ) [۱]

۱- بسم اللہ کا پڑھنا: وضو کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنے کے متعلق متعدد احادیث آئی ہیں- ایک حدیث میں ہے"- جس نے بسم اللہ نہیں پڑھی اس کا وضو نہیں لیکن چونکہ ان احادیث میں سے کوئی حدیث بھی سند کے لحاظ سے قوی نہیں ہے اس لئے اکثریت سلف کے نزدیک وضو کے شروع میں بسم اللہ فرض تو نہیں لیکن سنت ہے پھر بسم اللہ کا ہر کام کے شروع میں پڑھنا بہر حال مسنون ہے- (نیل الاوطار وغیرہ) [۲]

۲- مسواک: مسواک کی تاکید اور فضیلت میں متعدد احادیث آئی ہیں:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اگر میری امت پر دشوار نہ گزرتا تو میں ہر وضو کے وقت انہیں مسواک کرنے کا حکم دیتا- (مالکؒ، شافعیؒ، حاکمؒ، بیہقیؒ)

۳- تین مرتبہ ہاتھوں کا کلائیوں تک دھونا: حضرت اوس بن اوس ثقفیؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے وضو کرتے وقت تین مرتبہ اپنے ہاتھوں کو دھویا"- (احمد، نسائی)

۴- تین مرتبہ کلی کرنا: حضرت لقیط بن صبرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم وضو کرو تو کلی کرو"- (ابو داؤد، بیہقی [۳])

---

(۱) سنت سے مراد ہر وہ کام ہے جو نبی ﷺ کا معمول اور طرز عمل رہا ہو (حنفیہ اور حنبلیہ اسے سنتِ مؤکدہ کہتے ہیں اور دوسرے صرف سنت)

(۲) سنت (یا سنتِ مؤکدہ) اگرچہ فرض کی طرح لازم نہیں ہے لیکن اس کا چھوڑنا ناپسندیدہ، ثواب سے محرومی اور نبی ﷺ کی محبت کے منافی ہے- اس کا مستقل تارک قابلِ ملامت ہے- حنفیہ کے نزدیک سنتِ مؤکدہ قریب قریب واجب کے ہم معنی ہے- (واجب کی تعریف کے لئے دیکھئے حاشیہ صفحہ ۱۵۲) مستحب سے مراد وہ کام ہے جو اگرچہ نبی ﷺ کا معمول اور طرز عمل نہ رہا ہو لیکن آپ نے اسے پسند فرمایا اور اسے بہتر قرار دیا ہو (حنفیہ اور حنبلیہ اسے سنتِ غیر مؤکدہ بھی کہتے ہیں اور دوسرے صرف مستحب) مستحب (یا سنتِ غیر مؤکدہ) کا کرنا بہتر اور باعث ثواب ہے اگرچہ چھوڑنا گناہ یا قابلِ ملامت نہیں- (ملاحظہ ہو الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۷۹ وغیرہ)

(۳) ان ہی احادیث کی بناء پر امام حسن بصریؒ، اسحاقؒ اور ایک روایت میں امام احمدؒ کے نزدیک وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا فرض ہے یعنی اگر یہ نہ پڑھی جائے گی تو وضو نہ ہو گا- (المغنی ج ۱، ص ۱۲۰)

۵- تین مرتبہ ناک میں پانی دے کر سنکنا: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص وضو کرے تو اپنی ناک میں پانی لے اور اسے سنکے"- (بخاری، مسلم، ابو داؤد)

سنت یہ ہے کہ ناک میں پانی دائیں ہاتھ سے لیا جائے اور ناک بائیں ہاتھ سے سنکی جائے: حضرت علیؓ نے اپنے لئے وضو کا پانی منگوایا- پھر کلی کی، پھر ناک میں دائیں ہاتھ سے پانی لیا اور بائیں ہاتھ سے ناک سنکی- اس طرح آپ نے تین مرتبہ کرنے کے بعد فرمایا "یہ ہے اللہ کے نبی ﷺ کا وضو، (احمد، نسائی)

کلی اور ناک کے لئے الگ الگ پانی بھی لیا جا سکتا ہے اور ایک ساتھ بھی، الگ الگ پانی لینے کا ذکر حضرت علیؓ کی مذکورہ حدیث میں ہو چکا ہے- ایک ساتھ پانی لینے کے متعلق حضرت عبداللہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک ہی چلو سے منہ اور ناک میں پانی لیا- ایسا آپ نے تین مرتبہ فرمایا"- (بخاری و مسلم) [1]

جو شخص روزے سے نہ ہو اس کے لئے ناک میں خوب اچھی طرح پانی لینا مستحب ہے، حضرت لقیطؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کی خدمت میں عرض کیا- "اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے وضو کے متعلق کچھ ارشاد فرمائیے" فرمایا پورا وضو کرو- انگلیوں کے درمیان خلال کرو اور ناک میں خوب پانی دو، اِلّا یہ کہ تم روزے سے ہو- (احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

۶- ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کا خلال کرنا: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب وضو کرو تو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کے درمیان خلال کرو"- (احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

۷- داڑھی کا خلال کرنا: حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ داڑھی کا خلال فرمایا کرتے تھے"- (ترمذی، ابن ماجہ)

۸- تمام اعضاء کا تین تین مرتبہ دھونا: نبی ﷺ کا عام معمول یہی تھا کہ آپ وضو

---

(۱) حضرت عبداللہ بن زیدؓ کی یہ روایت چونکہ سند کے لحاظ سے حضرت علیؓ کی روایت سے زیادہ قوی ہے اس لئے امام شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور عام محدثین کے نزدیک کلی اور ناک کے لئے ایک ساتھ پانی لینا افضل ہے- امام ابو حنیفہؒ اور مالکؒ کے نزدیک کلی اور ناک کے لئے الگ الگ پانی لینا بہتر ہے- (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۱ ص ۶۳) (تحفۃ الاحوذی ج ۱، ص ۴۴)

میں تمام اعضاء کو تین تین مرتبہ دھویا کرتے تھے، بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے وضو کرتے ہوئے تمام اعضاء کو ایک ایک مرتبہ یا دو دو مرتبہ دھویا ان میں صرف جواز بیان کیا گیا ہے۔ تین مرتبہ سے زیادہ اعضاء کو (وضو کی نیت سے) دھونا صحیح نہیں۔

عمرو بن شعیبؒ اپنے والد کے ذریعے (اپنے یا ان کے) دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک بدو نے آکر آپ سے وضو کا طریقہ دریافت کیا۔ آپ نے تمام اعضاء کو تین تین مرتبہ دھو کر فرمایا "یہ ہے وضو (کا طریقہ) جس نے اس پر زیادتی کی اس نے ظلم کیا اور تعدی کی"۔ (احمد، نسائی، ابن ماجہ) لیکن سر اور کانوں کا مسح ایک ہی مرتبہ ہے۔ [1]

۹- تیامن: یعنی وضو میں جو اعضاء دو دو ہیں ان میں سے پہلے دایاں اور پھر بایاں عضو دھویا جائے حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جوتا پہنے، کنگھی کرنے، وضو کرنے اور اپنے دوسرے تمام کاموں میں دائیں طرف سے شروع کرنا پسند فرماتے تھے۔

(بخاری و مسلم)

۱۰- تمام اعضاء کو مل کر دھونا: حضرت عبداللہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے پاس دو تہائی مد (تقریباً آدھ سیر) پانی لایا گیا تو آپ نے وضو فرمایا اور اپنے بازوؤں کو مل کر دھونے لگے"۔ (مسند امام احمد) [2]

۱۱- موالات: یعنی سارا وضو ایک ساتھ کرنا اور ایک عضو کو دوسرے کے بعد فوراً دھونا: نبی ﷺ کی سنت یہی ہے اور اسی پر اب تک مسلمانوں کا عمل ہے۔ [3]

---

(۱) اس پر امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ کا اتفاق ہے۔ ایک روایت میں امام شافعیؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ (ترمذی) لیکن دوسری روایت میں امام شافعیؒ، صحیح مسلم کی روایت کہ "نبی ﷺ نے تمام چیزیں تین تین مرتبہ کیں" کی وجہ سے سر کا مسح بھی تین مرتبہ کرنا مستحب مانتے ہیں۔ دوسرے ائمہ اس حدیث میں تین تین مرتبہ" کے لفظ کو سر کے علاوہ دوسرے اعضاء کے لئے لیتے ہیں۔
(نیل الاوطار، المغنی التعلیق الصبیح ج ۱ ص ۲۱۲)

(۲) مالکیہ کے نزدیک وضو میں اعضاء کا مل کر دھونا فرض ہے، دوسروں کے نزدیک سنت ہے۔
(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۵۸ ۔ الفتح الربانی ج ۱ ص ۳۱)

(۳) مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک تسلسل فرض ہے اور دوسروں کے نزدیک سنت۔
(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۵۵، ۵۴)

۱۲۔ ترتیب : یعنی وضو اس ترتیب سے کیا جائے جس ترتیب سے قرآن پاک کی مذکورہ آیت میں اس کا ذکر ہوا ہے۔ نبی ﷺ کے عمل سے بھی یہی ثابت ہے کہ آپ نے کبھی اس ترتیب کے خلاف وضو نہیں کیا"۔ (بدایۃ المجتہد ج ا ص ۱۳ ا ۔)

۱۳۔ کانوں کا مسح ۔ : جمہور کا مسلک یہی ہے کہ کانوں کو دھویا نہیں جائے گا۔ بلکہ سر کی طرح ان پر بھی مسح کیا جائے گا، کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے "کان سر کا حصہ ہیں" (ابو داؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ) یہ حدیث اگرچہ کمزور ہے لیکن اس کی اتنی روایتیں ہیں کہ سب مل کر قابل حجت ہو جاتی ہیں۔ (نیل الاوطار ج ا، ص ۱۴۰)

کان اگرچہ سر ہی کا حصہ ہیں اور ان پر سر ہی طرح مسح کیا جائے گا۔ لیکن ان کا مسح سر کی طرح فرض نہیں ہے، سنت ہے۔ ۲ ۔

کانوں کے لئے الگ پانی بھی لیا جا سکتا ہے، لیکن سنت یہ ہے کہ سر اور کانوں کا ایک ہی پانی سے مسح کیا جائے، یعنی سر کے مسح کے بعد جو پانی بچ جائے اسی سے کانوں کا مسح کیا جائے۔ اندر کی طرف انگوٹھوں کے ساتھ والی انگلی سے مسح کیا جائے اور باہر کی طرف انگوٹھوں سے :

حضرت ابن عباسؓ نبی ﷺ کے وضو کا طریقہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے اپنے سر کا اور کانوں کا ایک (پانی سے) مسح فرمایا (احمد۔ ابو داؤد) ۳ ۔

---

(۱) امام ابو حنیفہؒ، سفیان ثوریؒ، داؤد ظاہری اور متاخرین مالکیہ کے نزدیک وضو میں ترتیب سنت ہے، فرض نہیں ہے۔ امام شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور ابو عبیدؒ کے نزدیک یہ فرض ہے۔ اس اختلاف کی ایک وجہ یہ اختلاف ہے آیا قرآن کی آیت میں "و (اور)" سے وضو کی ترتیب فرض قرار پاتی ہے کہ نہیں ؟ دوسری وجہ یہ کہ آیا نبی ﷺ کے عمل سے فرض قرار پاتی ہے یا سنت (بدایۃ المجتہد ج ا، ص ۱۳۔)

(۲) یہ امام احمدؒ اور اسحاق بن راھویہؒ کے سوا سب کا مسلک ہے۔ امام احمدؒ اور اسحاق بن راھویہؒ کے نزدیک ان کا مسح بھی سر ہی طرح فرض ہے۔ (نیل الاوطار)

(۳) یہ امام ابو حنیفہؒ، سفیان ثوریؒ اور عام محدثین کا مسلک ہے۔ امام ابن قیم فرماتے ہیں کانوں کے لئے الگ پانی لینا نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ایسا کرنا ثابت ہے (زاد المعاد) امام مالک، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ، اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک کانوں کے لئے (سر کے مسح سے بچے ہوئے پانی کے علاوہ) الگ پانی لیا جائے گا۔ صحابہ اور تابعین میں سے بہت سوں کا یہی مسلک ہے۔ ان کا استدلال بعض دوسری روایات سے ہے جن میں سے ایک یہ ہے : (بقیہ اگلے صفحہ پر)

۱۴: گردن کا مسح: نبی ﷺ سے گردن کا مسح کرنا ثابت نہیں ہے۔ البتہ بعض صحابہؓ سے اس کا ثبوت ملتا ہے سلف میں بعض اس کے مستحب ہونے کے قائل ہیں، لیکن اکثریت اس کے بدعت ہونے کے قائل ہیں (نیل الاوطار ج اص ۱۴۲ اـ)

۱۵۔ پانی کے استعمال میں: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ایک صاع ۲۔ (۳/۴ ۲ سیر) ایک مُد (۱/۴ ۳ سیر) تک پانی سے غسل اور ایک مُد (۱۱ چھٹانک) پانی سے وضو فرمایا کرتے تھے۔ (بخاری، مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت سعدؓ وضو کر رہے تھے کہ ان کے پاس سے نبی ﷺ گذرے۔ فرمایا اے سعد! یہ کیا فضول خرچی ہو رہی ہے؟

حضرت سعدؓ نے عرض کیا "کیا پانی میں بھی کوئی فضول خرچی ہے؟ فرمایا "ہاں" اگرچہ تم بہتے ہوئے دریا پر بیٹھے وضو کیوں نہ کر رہے ہو"۔ (احمد۔ ابن ماجہ)

۱۶۔ وضو کے بعد اپنی شرم گاہ کی جگہ کپڑے پر چھینٹے دینا مستحب ہے۔

حضرت زید بن حارثہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ پر وحی آنا شروع ہوئی، تو ایک روز حضرت جبرئیل نبی ﷺ کے پاس آئے اور آپ کو وضو کرنا اور نماز پڑھنا سکھایا۔ جب وضو سے فارغ ہوئے تو ایک چلو میں پانی لیا اور اس سے اپنی شرمگاہ (کی جگہ) چھینٹے دیئے"۔ (مسند امام احمد)

اس بارے میں اور بھی بہت سی احادیث آئی ہیں جن میں اگرچہ سند کے لحاظ سے کلام ہے۔ لیکن ان کی مجموعی تعداد سے بہر حال چھینٹوں کا مستحب ہونا معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ وہ اتنے چھینٹے دیتے کہ ان کا پاجامہ تر ہو جاتا۔

حضرت عبداللہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ "نبی ﷺ نے وضو فرماتے ہوئے کانوں کے مسح کے لئے سر سے بچے ہوئے پانی کے علاوہ پانی لیا"۔ (حاکم) لیکن اوپر کی روایات ان روایات کے مقابلے میں سند کے لحاظ سے زیادہ قوی ہیں۔

(۱) مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک یہ مکروہ ہے۔ شافعیہ میں سے بعض کے نزدیک یہ مکروہ ہے۔ اور بعض کے نزدیک سنت، حنفیہ کے نزدیک اگر سر اور کانوں کے بعد اور پانی نہ لیا جائے تو یہ سنت ہے۔
(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۷۸)

(۲) حنفیہ کے نزدیک ایک صاع ۳/۴ ۳ سیر اور ایک مد ۵ اچھٹانک کا ہے۔

(مفصل بحث کے لئے دیکھئے حصہ دوم ۲۲۸۔)

۱۷۔ وضو کے بعد دعا مستحب ہے: حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:۔ تم میں سے جو شخص وضو کر کے دعا پڑھے گا، اس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جائے گئے، وہ جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔

أَشْهَدُ أَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيكَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ	میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں (ترمذی. مسلم)

ترمذی کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَ اجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ	اے اللہ! مجھے توبہ کرنے والوں اور پاک ہونے والوں میں سے بنا دے

۱۸۔ وضو کے بعد کم از کم دو رکعت نماز پڑھنا مستحب ہے: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے حضرتِ بلالؓ سے فرمایا "اے بلال! مجھے بتاؤ تم نے مسلمان ہو کر سب سے زیادہ نیکی کا کام کون سا کیا ہے، کیونکہ میں نے تمھارے جوتوں کی آواز اپنے سامنے جنت میں سنی؟ حضرتِ بلالؓ نے عرض کیا۔ "میں نے ایسا کام نہیں کیا جو میرے نزدیک اس سے زیادہ نیکی کا ہو کہ میں دن اور رات کی کسی گھڑی میں جب بھی پاک ہوا (یعنی غسل یا وضو کیا) تو جتنی نماز مجھ سے ہو سکی۔ میں نے پڑھی. (بخاری و مسلم)

فائدہ: حنفیہ کے نزدیک وضو کے چند آداب ہیں جن میں سے بعض کا ہم حاشیہ میں ذکر کرتے ہیں[1]:

۷۔ وہ چیزیں جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے:

ہر وہ چیز جو پیشاب اور پاخانہ کی جگہ سے نکلے اس کے تحت ذیل کی چیزیں آتی ہیں:

---

[1] یہ آداب مندرجہ ذیل ہیں: (۱) بلند جگہ پر بیٹھنا (۲) قبلہ رُخ ہونا (۳) لوٹے کا مٹی کا ہونا۔ (۴) لوٹے کا بائیں طرف رکھنا (۵) ہر عضو دھوتے وقت بسم اللہ پڑھنا اور نیت کرنا (۶) وضو کے دوران اللہ کے ذکر کے سوا کوئی بات نہ کرنا (۷) آخر میں قبلہ رخ ہو کر وضو کا بچا ہوا پانی پینا۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۷۱)

(ا) پیشاب (ب) پاخانہ :

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اَوْ جَاءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ۔ (النساء : ۴۳) یا یہ کہ تم میں سے کوئی رفع حاجت کر کے آئے (تو وضو کرے)

(ج) ہوا : حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کسی کا وضو ٹوٹ جائے ، تو اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہیں کرتا ، تاوقتیکہ وہ وضو نہ کرے"۔ حضر موت سے آئے ہوئے ایک شخص نے حضرت ابو ہریرہؓ سے دریافت کیا 'وضو ٹوٹنے سے کیا مراد ہے ؟ ' فرمایا "پیچھے سے آواز کے ساتھ یا آواز کے بغیر ہوا کا خارج ہونا" (بخاری و مسلم)۔

لیکن اس بارے میں خواہ مخواہ شک صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "تم میں سے اگر کوئی شخص اپنے پیٹ میں کوئی چیز پائے۔ اور اس کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو جائے کہ آیا اس کے پیٹ سے کوئی چیز نکلی ہے یا نہیں ، تو اسے مسجد سے اس وقت تک نہیں نکلنا چاہیئے جب تک وہ آواز نہ سنے یا بو نہ پائے (یعنی اسے یقین نہ ہو جائے کہ اس کے پیٹ سے کوئی چیز خارج ہوئی ہے) ' (مسلم)

(د) منی (ر) مذی : حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں "منی سے غسل ہے اور مذی سے اپنی شرمگاہ کا دھونا اور وضو کرنا ہے"۔ (بیہقی) مرفوع حدیث کے لئے دیکھئے ص ۳۰۶)

(۲) نیند : حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا " آنکھ ہوا خارج ہونے کی جگہ کا ڈھکنا ہے' اس لئے جب تم میں سے کوئی سو جائے تو وضو کرے (احمد۔ ابو داؤد۔ ابن ماجہ)

لیکن اس سے مراد وہ گہری نیند ہے جس میں انسان بے قابو ہو جائے اور وہ زمین پر بیٹھا نہ رہ سکے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے صحابہؓ عشاء کی نماز کا انتظار کیا کرتے تھے ، یہاں تک کہ (بیٹھے بیٹھے) ان کے سر جھوم جاتے۔ پھر وہ اٹھتے اور وضو کئے بغیر نماز پڑھتے۔ ۱۔ (مسلم۔ شافعی۔ ابو داؤد۔ ترمذی)

---

(۱) نیند کے بارے میں حنفیہ کا مسلک تفصیلاً یہ ہے کہ اگر انسان نماز میں یا نماز کی سی حالت میں سو جائے (جیسے رکوع، سجدہ وغیرہ) تو اس کا وضو نہیں ٹوٹتا، خواہ وہ نماز پڑھ رہا ہو یا نہ پڑھ رہا ہو۔ اگر وہ بیٹھا ہوا اس طرح سو جائے کہ وہ اپنی جگہ بیٹھا رہے اور گرے نہیں ، تو بھی اس کا وضو نہیں ٹوٹتا۔ نیند کی حالت میں وضو صرف اس وقت ٹوٹتا ہے جبکہ انسان اپنے ایک پہلو پر لیٹا ہو یا چت لیٹا ہو یا صرف ایک چوتڑ پر بیٹھا ہو۔ حنابلہ۔ شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک تھوڑی نیند سے وضو نہیں ٹوٹتا، گہری نیند سے ٹوٹ جاتا ہے ، خواہ انسان بیٹھا ہو یا لیٹا ہو۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۷۶)

۳۔ بے ہوشی: خواہ یہ بے ہوشی جنون سے ہو یا غشی سے یا نشہ سے یا دوا سے خواہ کم ہو یا زیادہ۔ خواہ انسان زمین پر بیٹھا رہ سکتا ہو یا نہ رہ سکتا ہو اس سے وضو بہر حال ٹوٹ جائے گا کیونکہ بے ہوشی میں انسان کو اپنے جسم سے کسی چیز کے نکلنے یا نہ نکلنے کا پتہ نہیں چل سکتا ۔اس پر سب کا اتفاق ہے (المغنی ج ۱، ص ۱۶۴)

۴۔ شرمگاہ کا چھونا: اگر شرم گاہ کو اس طرح چھوا جائے کہ درمیان میں کوئی چیز حائل نہ ہو تو وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ حضرت بسرہ بنت صفوانؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنی شرمگاہ کو چھوئے تو وہ نماز نہ پڑھے تاوقتیکہ وضو نہ کرے" (مسند امام احمد۔ ابو داؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ) امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں "اس بارے میں یہ سب سے صحیح حدیث ہے اس حدیث کو امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور دوسرے ائمہ نے بھی روایت کیا ہے ۱۔

۵۔ نکسیر اور قے: ان دونوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے:

حضرت ابن ابی الدرداءؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے قے کی، تو وضو کیا۔ (ترمذی ۲)

۱۔ امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب امام سفیان ثوری اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک شرم گاہ کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا، اگرچہ ہاتھ کا دھونا مستحب ہے۔ ان کا استدلال ذیل کی حدیث سے ہے۔ حضرت طلقؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ جو شخص اپنی شرمگاہ کو چھوئے، کیا اس پر وضو ہے؟ فرمایا "نہیں وہ تمہارے جسم کا ایک حصہ ہی تو ہے" (احمد۔ ابو داؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ) صحابہ میں سے حضرت علیؓ، عمار بن یاسرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، حذیفہؓ، عمران بن حصینؓ اور ابو درداءؓ کا یہی مسلک ہے۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے نزدیک شرم گاہ کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے ان کے نزدیک حضرت بسرہؓ کی روایت حضرت طلقؓ کی روایت سے زیادہ صحیح ہے اور جن لوگوں کے نزدیک شرمگاہ کو چھونے سے وضو ضروری نہیں ہے، ان کے نزدیک حضرت طلقؓ کی روایت حضرت بسرہؓ کی روایت سے زیادہ صحیح ہے۔ (المغنی ج ۱، ص ۱۷۰ رد المختار ج ۱، ص ۱۵۴)

۲۔ یہ امام زہریؒ، علقمہؒ، اسودؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، احمد بن حنبلؒ، سفیان ثوریؒ، اسحاقؒ بعض دوسرے ائمہ کا مسلک ہے (تحفۃ الاحوذی ج ۱، ص ۸۹) امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے اصحاب کے نزدیک بھی قے اور نکسیر سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، لیکن اگر قے منہ بھر سے کم ہو، تو نہیں ٹوٹتا (موطا امام محمد)۔ امام سعید بن مسیب، مکحولؒ، شافعیؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک قے اور نکسیر سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اوپر کی حدیث سے جو چیز معلوم ہوتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ نبی ﷺ نے قے کی اور پھر وضو کیا ضروری نہیں کہ آپ نے قے کی وجہ سے ہی وضو کیا ہو۔ (نیل الاوطار۔ تحفۃ الاحوذی ایضاً) صحابہ کرامؓ میں سے بھی بعض کے نزدیک نکسیر اور قے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور بعض کے نزدیک نہیں ٹوٹتا۔ (ترمذی)۔

۸۔ وہ چیزیں جن سے وضو نہیں ٹوٹتا :

ذیل میں ہم ان چیزوں کا ذکر کرتے ہیں جن کے متعلق بظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ ان سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، حالانکہ وہ ناقض وضو نہیں ہیں :

۱۔ عورت کا چھونا : حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ان کا بوسہ لیا حالانکہ آپ روزہ سے تھے اور فرمایا "بوسہ سے وضو نہیں ٹوٹتا اور نہ روزہ ٹوٹتا ہے" (اسحاق بن راہویہ۔ بزارؒ)

حضرت عائشہؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے سامنے سوئی ہوتی تھی اور میرے پاؤں آپ کے قبلہ کی طرف ہوتے تھے۔ جب آپ سجدہ میں جاتے تو مجھے (ہاتھ سے) ہٹا دیتے اور میں اپنے پاؤں سکیڑ لیتی" (بخاری و مسلم ۱ے)

۲۔ قہقہہ: ہنسنے سے وضو نہ ٹوٹنے پر سوائے حنفیہ کے سب کا اتفاق ہے۔
(بدایۃ المجتہد ج ۱، ص ۳۱، ۲ے)

۹۔ وہ چیزیں جن کے لئے وضو کرنا ضروری ہے :

۱۔ نماز : نماز خواہ فرض ہو یا سنت یا نفل، اس کے لئے وضو کرنا سب کے نزدیک

ا ے امام شافعیؒ کے نزدیک عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور امام زہریؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ بعض روایات سے حضرتِ عمرؓ کی بھی یہی رائے معلوم ہوتی ہے ان حضرات کے نزدیک قرآن کی آیت اَوْلٰمَسْتُمُ النِّسَاءَ میں ملامست (چھونے) میں عورت کا مطلق چھونا بھی شامل ہے (المغنی جلد ۱، ص ۱۸۵) حنابلہ اور مالکیہ کے نزدیک عورت کا چھونا اگر شہوت سے ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا ورنہ نہیں۔ (نیل الاوطار ج ۱، ۱۷۲)

(۱) حنفیہ کے نزدیک اگر انسان نماز میں اس طرح ہنسے کہ اس کے نزدیک کھڑے ہونے والے کو اس کی آواز سنائی دے تو اس کا وضو ٹوٹ جاتا ہے، لیکن اگر دوسرے کو اس کی آواز سنائی نہ دے تو وضو نہیں ٹوٹتا، صرف نماز باطل ہو جاتی ہے۔ اس بارے میں حضرت ابو موسٰیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک نابینا آدمی مسجد میں داخل ہوا اور ایک گڑھے میں گر گیا۔ اس پر نمازیوں میں سے بہت سے لوگ ہنس پڑے۔ جو لوگ ہنسے تھے ان کو نبی ﷺ نے حکم دیا کہ وہ دوبارہ وضو کریں اور دوبارہ نماز پڑھیں" (طبرانی، شرح، موطا امام محمدؒ ردالمختار) اس حدیث کی سند مرسل ہے۔ حنفیہ کے نزدیک یہ قابل حجت ہے، دوسروں کے نزدیک قابل حجت نہیں ہے۔ (بدایۃ المجتہد ایضا)

ضروری ہے :

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ پاکیزگی (وضو) کے بغیر کوئی نماز قبول نہیں کرتا، اور نہ ہی صدقہ کو قبول کرتا ہے جو مال غنیمت سے چوری کر کے دیا گیا"۔ (مسلم۔ احمد۔ داؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

۲۔ **قرآن پاک کا چھونا :** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ" (اس قرآن کو نہ چھوئیں مگر پاک لوگ یعنی باوضو۔ ۱ے)

نوٹ : طواف کعبہ کے لئے وضو کرنے کے ضروری ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف ہے، جس کا ذکر ہم دوسرے حصہ میں کتاب الحج میں کریں گے (انشاء اللہ)

۱۰۔ وہ چیزیں جن کے لئے وضو کرنا مستحب ہے :

۱۔ **قرآن پڑھتے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے وقت :** حضرت مہاجر بن قنفذؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ وضو فرما رہے تھے، میں نے سلام کیا تو آپ نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ یہاں تک کہ آپ نے وضو مکمل کیا اور پھر سلام کا جواب دیا اور فرمایا "میں نے تمہارے سلام کا جواب اس لئے نہیں دیا کہ مجھے یہ بات پسند نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر پاکیزگی کے بغیر کروں" (احمد، نسائی۔ ابو داؤد۔ ابن خزیمہ)

اللہ تعالیٰ کا ذکر پاکیزگی کی حالت میں کرنا مستحب ہے۔ یوں ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا جائز ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ کہ اللہ تعالیٰ کو تمام اوقات میں یاد فرمایا کرتے تھے ۲ے۔ (احمد۔ ابو داؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ)

۲۔ **سونے سے پہلے :** حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم سونے لگو تو وضو کرو جیسا کہ تم نماز کے لئے وضو کرتے ہو، پھر دائیں کروٹ پر لیٹ کر یہ دعا پڑھو :

---

(۱) اس پر سوائے ظاہریہ کے سب کا اتفاق ہے۔ ظاہریہ کے نزدیک جنابت کی حالت میں قرآن کا چھونا جائز ہے۔ مفصل بحث آگے غسل کے باب میں آئے گی۔

(۲) جمہور سلف (جن میں ائمہ اربعہ شامل ہیں) کا یہی مسلک ہے۔ سلف میں بعض کے نزدیک پہلی حدیث منسوخ ہے، اس لئے ان کے نزدیک وضو کے بغیر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا مکروہ بھی نہیں ہے۔ (بدایۃ المجتہد)

اَللّٰھُمَّ اَسْلَمْتُ نَفْسِیْ اِلَیْکَ وَوَجَّھْتُ وَجْھِیْ اِلَیْکَ وَ فَوَّضْتُ اَمْرِیْ اِلَیْکَ وَاَلْجَاتُ ظَھْرِیْ اِلَیْکَ رَغْبَۃً وَّ رَھْبَۃً اِلَیْکَ لَا مَلْجَاءَ وَلَامَنْجیٰ مِنْکَ اِلَّا اِلَیْکَ اَللّٰھُمَّ اٰمَنْتُ بِکِتَابِکَ الَّذِیْ اَنْزَلْتَ وَنَبِیِّکَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ۔

اے اللہ میں نے اپنی جان تیرے حوالے کردی اپنے چہرے کو تیری طرف پھیر دیا ۔اپنے معاملہ کو تیرے حوالے کر دیا۔ تیری محبت اور خوف کے ساتھ تجھ ہی پر ٹیک لگائی۔ تجھ سے بھاگ کر صرف تیرے ہی پاس پناہ اور نجات کی جگہ ہے ۔اے اللہ تو نے جو کتاب اتاری میں اس پر ایمان لایا اور تو نے جو نبی بھیجا میں اس پر ایمان لایا۔

اگر تم رات کو مر جاؤ، تو فطرت پر مرو گے۔اس دعا کے بعد کوئی بات نہ کرو"۔(بخاری۔ احمد۔ترمذی)

۳۔ جنابت کی حالت میں : حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب نبی ﷺ جنابت کی حالت میں ہوتے اور کھانا یا سونا چاہتے تو وضو فرما لیتے، جیسا کہ آپ نماز کے لئے وضو فرماتے تھے"۔(بخاری۔ مسلم۔ابو داؤد۔ترمذی۔ نسائی۔ابن ماجہ۔احمد)

۴۔ غسل سے پیشتر : حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب جنابت سے غسل فرماتے تو سب سے پہلے اپنے ہاتھ دھوتے، پھر دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈال کر اپنی شرم گاہ دھوتے، پھر وضو فرماتے جیسا کہ آپ نماز کے لئے وضو فرمایا کرتے تھے"

(بخاری۔ مسلم۔احمد۔ابو داؤد۔ابن ماجہ۔ نسائی)

۵۔ ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرنا: حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ہر نماز کے لئے تازہ وضو فرمایا کرتے تھے۔ فتح مکہ کے روز آپ نے وضو کرتے ہوئے موزوں پر مسح فرمایا اور پھر پانچوں نمازیں ایک ہی وضو میں ادا فرمائیں۔ حضرت عمرؓ نے آپ کی خدمت میں عرض کیا"یا رسول اللہ! پہلے تو آپ ایسا نہیں کرتے تھے"۔ فرمایا"اے عمر! میں نے ایسا قصداً کیا ہے"۔(احمد۔ مسلم)۔

عمرو بن طاہر انصاریؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت انس بن مالکؓ کہا کرتے تھے۔"نبی ﷺ ہر نماز کے وقت تازہ وضو فرمایا کرتے تھے"میں نے کہا"اور آپ لوگ کیا کرتے تھے ؟" کہنے لگے"ہمارا جب تک وضو رہتا ہم تمام نمازیں ایک وضو سے پڑھتے تھے۔(بخاری۔احمد

موزوں اور جرابوں کا مسح

موزوں پر مسح کا جواز:

موزوں پر مسح کرنا نبی ﷺ سے ثابت ہے۔ شیعہ اور خوارج کے سوا اس کے جواز پر پوری اُمت کا اجماع ہے ا۔ حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ محدثین کی ایک جماعت نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ نبی ﷺ سے موزوں پر مسح کرنا تواتر سے ثابت ہے۔ بعض محدثین نے اس کے راویوں کی تعداد اسی ۸۰ لکھی ہے جن میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔ اس بارے میں سب سے صحیح حدیث حضرت جریرؓ کی ہے کہ انھوں نے پیشاب کرنے کے بعد وضو کیا اور موزوں پر مسح کیا۔ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ "آپ ایسا کرتے ہیں؟" فرمایا "ہاں. میں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے پیشاب کرنے کے بعد وضو فرمایا اور اپنے موزوں پر مسح کیا" چونکہ حضرت جریرؓ سورۂ مائدہ (جس میں وضو کا حکم نازل ہوا تھا) کے بعد اسلام لائے تھے، اس لئے لوگ ان کی روایت کو زیادہ معتبر مانتے تھے۔"

(بخاری و مسلم)

۲۔ جرابوں پر مسح کا جواز:

جرابوں پر مسح کرنا متعدد جلیل القدر صحابہ (جن کی تعداد تیرہ تک پہنچی ہے) سے ثابت ہوا ہے، اور جن صحابہؓ سے یہ ثابت نہیں ہے، ان میں سے کسی سے اس کی مخالفت بھی ثابت نہیں ہے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے وضو فرمایا اور اپنی جرابوں اور جوتوں ۲ے پر مسح کیا۔ (ابو داؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ)۔

ا ے حنابلہ موزے اتار کر پاؤں دھونے کی نسبت موزوں پر مسح کرنا افضل مانتے ہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس چیز کو پسند کرتا ہے کہ اپنے دین میں اس نے جو آسانیاں رکھی ہیں۔ لوگ انھیں قبول کریں۔ بعض حنفیہ کا بھی اس پر اتفاق ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا، ص ۱۳۵)

۲ ے امام مالکؒ کے نزدیک صرف چمڑے کے موزوں پر مسح کرنا جائز ہے۔ جرابوں میں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اگر موزوں اور جرابوں میں کچھ سوراخ ہوں، لیکن وہ عموماً پہنی جاتی ہوں تو ان پر مسح کرنا جائز ہے۔ امام سفیان ثوری لکھتے ہیں "مہاجرین وانصار کے موزے بھی عام لوگوں کی طرح سوراخوں سے بچے نہیں ہوتے تھے۔ اگر سوراخ والے موزوں پر مسح ناجائز ہوتا تو روایتوں میں اس کا ذکر آتا۔ ا۔

۴۔ موزوں اور جرابوں پر مسح کرنے کی شرط :

موزوں اور جرابوں پر مسح اس حال میں جائز ہے کہ انسان انہیں پہنے تو وہ باوضو ہو۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ ایک رات میں نبی ﷺ کے ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے ایک برتن سے آپ (کے ہاتھوں) پر پانی ڈالا۔ آپ نے اپنا چہرہ مبارک اور بازو دھوئے اور سر کا مسح فرمایا۔ پھر میں آپ کے موزے اتارنے کے لئے جھکا۔ آپ نے فرمایا" انہیں رہنے دو۔ میں نے ان کو پاک داخل کیا تھا۔ ۲۔ (بخاری۔ مسلم۔ احمد)

جائز نہیں ہے۔ امام شافعی صرف جوتوں کے ساتھ جرابوں پر مسح کرنا جائز قرار دیتے ہیں۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ صرف موٹی جرابوں پر مسح کرنا جائز قرار دیتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ جرابوں پر مسح کرنا جائز نہ سمجھتے تھے۔ لیکن اپنی وفات سے تین روز پیشتر وہ بھی اس کے جواز کے قائل ہو گئے تھے۔

(معالم السنن الخطابی ج ا ص ۱۲۱۔)

ا۔ شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک اگر موزوں اور جرابوں میں سوراخ ہوں تو، ان پر مسح جائز نہیں ہے مالکیہ کے نزدیک اگر موزے میں سوراخ ایک تہائی قدم سے زیادہ ہوں، اس پر مسح ناجائز ہے۔ ورنہ جائز ہے۔ حنفیہ کے نزدیک اگر موزے یا جراب میں سوراخ تین چھوٹی انگلیوں سے زیادہ ہو، تو اس پر مسح ناجائز ہے ورنہ جائز۔ اگر ایک موزے یا جراب میں مختلف جگہ سوراخ ہوں اور وہ مل کر تین چھوٹی انگلیوں سے زیادہ ہوں، تو اس پر مسح جائز نہیں ہوگا۔ لیکن دونوں موزوں یا جرابوں کے سوراخوں کو ملا کر جمع نہیں کیا جائے گا۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا ص ۱۲۸ ہدایہ ج ا ص ۱۹)

۲۔ مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کا یہی مسلک ہے۔ حنفیہ کے نزدیک یہ کافی ہے کہ جب انسان موزے یا جرابیں پہنے تو اس کے پاؤں پاک اور دھلے ہوئے ہوں، خود اس کا باوضو ہونا ضروری نہیں (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا ص ۱۳۹، ردالمحتار ج ا ص ۲۷۹) اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اوپر کی حدیث میں "میں نے ان کو پاک داخل کیا تھا، سے دو مطلب لئے جا سکتے ہیں۔

۴۔ مسح موزے کے کس حصے پر کیا جائے :

مسح موزے کے اوپر کے حصے پر کرنا چاہیے، حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ اگر دین کا انحصار رائے (قیاس) پر ہوتا تو اوپر کی نسبت پاؤں کے نچلے حصے پر مسح ہونا چاہیے تھا، لیکن میں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے موزوں کے اوپر کے حصے پر مسح فرمایا۔ ا۔

(ابو داؤد۔ دار قطنی)

۵۔ مسح کی مدت :

موزوں اور جرابوں پر مسح کی مدت مقیم کے لئے ایک دن اور ایک رات ہے اور مسافر کے لئے تین دن اور تین رات۔ حضرت صفوان بن عسالؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم نے موزوں کو پاکیزگی کی حالت میں پہنا ہو تو سفر میں ان پر تین دن اور تین رات مسح کریں اور گھر پر ایک دن اور ایک رات اور یہ کہ سوائے جنابت کے کسی اور وجہ سے انھیں نہ اتاریں ۲۔ (شافعی۔ احمد، ابن خزیمہ۔ ترمذی۔ نسائی)

۶۔ وہ چیزیں جن سے مسح ختم ہو جاتا ہے :

اس باب میں جو احادیث بیان ہوئی ہیں ان کی بنا پر مندرجہ ذیل صورتوں میں مسح ختم ہو جاتا ہے ۳۔:

(ا) مسح کی مدت ختم ہو جائے (ب) جنابت کی حالت میں یعنی جب انسان پر غسل واجب ہو جائے (ج) جب انسان موزے یا جرابیں اتارے اور اس کا وضو نہ ہو۔

ا۔ امام زہریؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، مالکؒ اور شافعیؒ کے نزدیک پاؤں کے اوپر کے حصے کے علاوہ نچلے حصہ پر بھی مسح کیا جائے گا (اور اسی قسم کی روایات حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ سے ملتی ہیں) اگرچہ امام مالکؒ اور شافعیؒ کے نزدیک اگر صرف اوپر کے ہی حصے پر مسح کر لیا جائے تو کافی ہے (الفتح الربانی ج ا، ص ۷۰)

۲۔ امام مالکؒ اور لیثؒ کے نزدیک مسح پر مدت کی کوئی قید نہیں ہے۔ جب تک انسان موزے پہنے رہے، ان پر مسح کر سکتا ہے۔ البتہ مستحب یہ ہے کہ جمعہ کی نماز کے لئے ہر ہفتہ اتار کر پاؤں دھولے۔ اسی مسلک کی روایت حضرت عمرؓ، عقبہ بن عامرؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور امام حسن بصری سے ملتی ہے۔ ان کا استدلال حضرت میمونہؓ کی اس روایت سے ہے کہ نبی ﷺ سے دریافت کیا "کیا انسان موزوں کو اتارے بغیر ہر وقت مسح کر سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا "ہاں" (مسند امام احمد) لیکن جمہور محدثین نے اس روایت کی سند کو کمزور قرار دیا ہے (الفتح الربانی ج ا، ص ۶۸)

۳۔ اس بارے میں جو اختلاف ہے وہ وہی ہے جو اوپر کے مسائل میں بیان ہو چکا ہے۔

غسل

غسل کا حکم قرآن پاک میں واضح طور پر آیا ہے :
وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَا طَّهَّرُوْا (المائدہ : ٦) اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو غسل کر کے پاک ہو جاؤ۔

ا۔وہ چیزیں جن سے غسل واجب ہے :

ا۔مرد یا عورت کی منی کا نیند یا بیداری کی حالت میں نکلنا : حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا "پانی پانی سے ہے" (مسلم)۔ یعنی جب منی خارج ہو تو غسل ضروری ہے۔اس بارے میں مختلف صورتیں پیش آسکتی ہیں جنہیں اختصار کے ساتھ ذیل میں درج کرتے ہیں :

(ا) اگر منی لذّت سے نہیں بلکہ بیماری یا سردی کی وجہ سے نکل جائے تو غسل ضروری نہیں، حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا" جب تمھارا پانی تیزی سے (یعنی لذّت سے) نکلے تو غسل کرو" (ابوداؤد)

مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد۔ مسجد میں حلقہ بنائے بیٹھے تھے اور حضرت ابن عباسؓ نماز پڑھ رہے تھے۔اتنے میں ایک آدمی آیا اور ہمارے پاس کھڑا ہو کر کہنے لگا "کوئی مفتی ہے"؟ ہم نے کہا "دریافت کرو" اس نے کہا کہ میں جب پیشاب کرتا ہوں تو بعد میں منی ٹپک پڑتی ہے ہم نے کہا "تو تم پر غسل کرنا ضروری ہے"۔وہ آدمی پلٹ گیا، لیکن اس کا اطمینان نہ ہوا اور وہ بار بار اپنا سوال دہرا رہا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے جلدی سے اپنی نماز ختم کی اور عکرمہؒ سے فرمایا "اس آدمی کو میرے پاس بلا کر لاؤ"۔اور ہم سے فرمایا "کہ تم نے اس آدمی کو کیا فتویٰ دیا ہے ؟ کیا اللہ کی کتاب سے فتویٰ دیا ہے ؟" ہم نے کہا "نہیں" فرمایا "کیا رسول اللہ علیہ السلام (کی سُنّت) سے فتویٰ دیا ہے ؟ ہم نے کہا نہیں" فرمایا "کیا اللہ کے رسول علیہ السلام کے صحابہ سے فتویٰ دیا ہے ؟" ہم نے کہا "نہیں" فرمایا "تو آخر کس چیز سے تم نے فتویٰ دیا ہے" ہم نے عرض کیا "اپنی رائے اور قیاس سے" فرمایا: "اس لئے تو نبی

ﷺ کا ارشاد ہے کہ ایک عالم شیطان پر ہزار عابدوں سے بھاری ہے" اتنے میں وہ آدمی آگیا اور حضرت ابن عباسؓ نے اس سے دریافت کیا، کیا جب ایسا ہوتا ہے تو تم اپنے اگلے حصے میں لذت پاتے ہو؟ اس نے کہا نہیں، پھر اس سے دریافت کیا "کیا تم اپنے جسم میں کوئی جھرجھراہٹ محسوس کرتے ہو"؟ اس نے کہا "نہیں" فرمایا "یہ صرف پانی کا بہہ نکلنا ہے، تمھارے لئے وضو کافی ہے [1]"۔

(ب) جب انسان کو بدخوابی ہو مگر وہ منی نہ پائے تو اس پر غسل ضروری نہیں۔ حضرت ام سلیمؓ نے نبی ﷺ سے دریافت کیا" یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ حق بیان کرنے سے نہیں شرماتا۔ کیا جب عورت کو بدخوابی ہو تو وہ غسل کرے؟ فرمایا" ہاں جب وہ پانی (منی) [2] پائے"۔ (بخاری، مسلم)

(ج) اگر انسان نیند سے بیدار ہو اور تری پائے تو اس پر غسل کرنا ضروری ہے خواہ اسے بدخوابی یاد ہو یا نہ ہو۔ اگر تری منی سے نہیں بلکہ پیشاب وغیرہ کی وجہ سے ہے تو غسل ضروری نہیں۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سے سوال کیا گیا آدمی تری پاتا ہے، مگر بدخوابی اسے یاد نہیں" فرمایا" وہ غسل کرے گا پوچھا گیا" آدمی سمجھتا ہے یہ اسے بدخوابی ہوئی ہے مگر وہ تری نہیں پاتا"۔ فرمایا" وہ غسل نہیں کرے گا"

(احمد۔ ابوداؤد۔ ابن ماجہ)

۲۔ مرد اور عورت کے ختان کا آپس میں مل جانا: یعنی یہ کہ آدمی کا حشفہ عورت کی شرمگاہ میں داخل ہو جائے خواہ انزال ہو یا نہ ہو۔ امام سعید بن مسیّب بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا میں آپ سے ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے آپ سے شرم آتی ہے"۔ حضرت عائشہؓ نے کہا" دریافت فرمایئے۔ میں آپ کی ماں ہوں" پوچھا آدمی عورت کو ڈھانپ لیتا ہے، مگر انزال نہیں ہوتا" حضرت عائشہؓ نے کہا" جب دونوں ختان مل جائیں تو غسل ضروری ہوتا ہے" (مسند امام احمد۔ موطا امام مالکؒ)

اگر دونوں ختان آپس میں نہ ملیں اور نہ انزال ہو تو مرد اور عورت میں سے کسی پر غسل

۱۔ شافعیہ کے نزدیک منی کے نکلنے سے بہر حال غسل ضروری ہو جاتا ہے، خواہ وہ لذت سے نکلے یا بیماری کی وجہ سے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۱۰۷) ہدایہ ج ۱، ص ۷)

۲۔ حنابلہ کے نزدیک غسل کے ضروری ہونے کے لئے اصل چیز منی کا لذت کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کرنا ہے، نکلنا ضروری نہیں (الفقہ علی المذاہب ج ۱ ص ۱۰۸)

ضروری نہیں۔اس پر سب کا اتفاق ہے۔

۳۔ حیض اور نفاس کے بعد : اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوْهُنَّ (حیض میں عورتوں کے قریب نہ جاؤ، جب تک وہ پاک صاف نہ ہو لیں۔پھر جب وہ پاک صاف ہو لیں تو ان کے قریب جاؤ)۔ حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش ؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا" جتنے روز تمہیں پہلے حیض آیا کرتا تھا۔اتنے روز نماز چھوڑ دو۔ پھر غسل کر کے نماز پڑھو"۔(بخاری و مسلم)

یہاں اگرچہ حیض کا حکم بیان ہوا ہے لیکن صحابہ کرام کا اس پر اجماع ہے کہ نفاس کا حکم بھی وہی ہے، جو حیض کا ہے۔

۲۔وہ چیزیں جن کا جنابت کی حالت میں کرنا ناجائز ہے :

ا۔ نماز: جنابت کی حالت میں فرض، یا نفل کوئی نماز نہیں پڑھی جا سکتی۔اس باب میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

۲۔ قرآن پاک کا چھونا : جنابت کی حالت میں قرآن کا چھونا ناجائز ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ "(اس قرآن کو نہ چھوئیں مگر پاک لوگ یعنی باوضو)۔ نبی ﷺ نے حضرت جابرؓ کو یمن کی طرف جو خط ارسال فرمایا تھا اس میں آپ نے انہیں ہدایت فرمائی تھی "قرآن کو صرف پاک آدمی ہی چھوئے"۔(نسائی۔دار قطنی۔بیہقی۔) یہ روایت متواتر کے مشابہ ہے(ابن عبدالبر)

اس بارے میں سوائے ظاہریہ کے سب کا اتفاق ہے۔[1]

۳۔ قرآن کی تلاوت : جمہور کا مسلک یہ ہے کہ جنابت کی حالت میں قرآن کا پڑھنا جائز نہیں ہے۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے وضو فرمایا۔ پھر قرآن پاک کی چند آیات پڑھیں اور فرمایا"جو شخص جنابت کی حالت میں نہ ہو اس کے لئے ایسا ہی ہے۔ لیکن جو جنابت کی حالت میں ہو، وہ ایک بھی آیت نہ پڑھے "(احمد۔ابو یعلی۔)

---

[1] ظاہریہ کے نزدیک جنابت کی حالت میں قرآن کا چھونا جائز ہے۔ان کا استدلال یہ ہے کہ نبی ﷺ نے ہرقل کے پاس جو خط بھیجا تھا اس میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور قرآن کی یہ آیت لکھی تھی "يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ.... "اس کا جواب جمہور یہ دیتے ہیں کہ قرآن کا چھونا اور چیز ہے اور کسی ایسی کتاب یا خط کا چھونا دوسری چیز جس میں قرآن کی کوئی آیت آگئی ہو۔(نیل الاوطار)

اس روایت کے راویوں کو ھیثمیؒ نے ثقہ قرار دیا ہے۔[1]

۴۔ مسجد میں ٹھہرنا: اگر انسان جنابت کی حالت میں ہو تو اس کے لئے مسجد میں بیٹھنا یا ٹھہرنا جائز نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے (اور وہاں آپ نے مسجد تعمیر فرمائی) تو بعض صحابہؓ کے گھر مسجد کی طرف کھلتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا "ان گھروں کا رخ مسجد سے دوسری طرف کرلو"۔ پھر ایک مرتبہ نبی ﷺ نے دیکھا، لوگوں نے اپنے گھروں کا رخ نہیں بدلا، اس خیال سے کہ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بارے میں کوئی رخصت آجائے تو حضورؐ نے فرمایا "ان گھروں کا رخ دوسری طرف کرلو، اس لئے کہ میں جنبی اور حائضہ کے لئے مسجد کو جائز نہیں کرتا"۔ (ابوداؤد)

مسجد میں بیٹھنا یا ٹھہرنا ناجائز ہے۔ گذرنا معاف[2] ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَاۤ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِىْ سَبِيْلٍ (النساء ۴۳)

اے ایمان والو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ. نماز اس وقت پڑھنی چاہئے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔ اس طرح جنابت کی حالت میں بھی نماز کے قریب نہ جاؤ، الا یہ کہ راستے سے گزرتے ہو۔

---

[1] امام بخاریؒ، امام طبریؒ، امام داوٗد ظاہریؒ اور امام ابن حزمؒ کے نزدیک جنابت کی حالت میں قرآن پڑھنا جائز ہے۔ امام بخاری لکھتے ہیں ابراھیم نخعیؒ نے کہا کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ حائضہ قرآن کی آیت تلاوت کرے۔ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک جنابت کی حالت میں قرآن پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ نبی ﷺ تمام اوقات میں اللہ تعالیٰ کا ذکر فرمایا کرتے تھے"۔ ________ امام بخاریؒ حضرت علیؓ کی اوپر والی روایت کو صحیح اور معتبر نہیں مانتے (ابن حجرؒ) شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک جنابت کی حالت میں قرآن کا پڑھنا کسی حال میں جائز نہیں۔ حنفیہ کے نزدیک صرف دو صورتوں میں جائز ہے: ایک کسی اہم کام کو شروع کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا اور دوسرے کسی کے لئے دعا کرتے ہوئے کوئی مختصر آیت پڑھ لینا مالکیہ کے نزدیک بھی دو صورتوں میں جنبی کے لئے قرآن کا پڑھنا جائز ہے۔ ایک یہ کہ دشمن سے محفوظ رہنے کے لئے کوئی آیت پڑھ لی جائے یا کسی شرعی مسئلہ میں استدلال کے لئے قرآن کی کسی آیت کو پیش کیا جائے۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا ص ۱۲۱)

[2] حنفیہ کے نزدیک جنابت کی حالت میں مسجد سے گذرنے سے پہلے تیمم کرنا ضروری ہے۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا، ص ۱۲۲)

۳۔ وہ چیزیں جن کے لئے غسل کرنا مسنون یا مستحب ہے :

۱۔ جمعہ کے روز : جمعہ کے روز غسل کرنے کی نبی ﷺ نے سخت تاکید فرمائی ہے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص جمعہ کی طرف آئے تو غسل کرے"۔ (بخاری)

اس حدیث میں اگرچہ نبی ﷺ نے جمعہ کے روز غسل کرنے کا حکم دیا ہے۔ بلکہ بخاری و مسلم کی حدیث میں نبی ﷺ کے یہ الفاظ ہیں "جمعہ کا غسل ہر بالغ آدمی کے لئے ضروری ہے"۔ لیکن دوسری احادیث کی روشنی میں اس واجب کو سنت قرار دیا جائے گا۔ حضرت سمرۃؓ بن جندب سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس نے جمعہ کے لئے وضو کیا تو اس نے بہت اچھا کیا اور جس نے غسل کیا تو اس نے اور اچھا کیا"۔ (احمد ابو داؤد۔ ترمذی۔ نسائی)۔ حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس نے وضو کیا اور اچھی طرح وضو کیا، پھر وہ جمعہ کے لئے آیا اور خاموش رہ کر (خطبہ) سنتا رہا تو اس کے دونوں جمعوں کے درمیان اور تین مزید دنوں کے گناہ معاف کر دئے گئے"۔[۱] (مسلم)

۲۔ عید کے روز : عید کے روز غسل کرنا مستحب ہے۔ اگرچہ اس بارے میں جو احادیث آئی ہیں، ان میں سے صحیح حدیث کوئی نہیں ہے، لیکن صحابہ کرام سے عید کے روز غسل کی روایات ملتی ہیں۔[۲] (نیل الاوطار)

۳۔ میت کو غسل دینے کے بعد : جو شخص میت کو غسل دے، اس کے لئے غسل کرنا مستحب ہے۔ حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو شخص میت کو غسل دے اُسے غسل کرنا چاہیے اور جو شخص اسے اٹھائے، اسے وضو کرنا چاہیے۔ (احمد۔ ابو داؤد۔ نسائی۔ ترمذی)

---

(۱) بعض صحابہ (مثلاً حضرت ابو ہریرۃؓ اور حضرت عمارؓ)، تمام ظاہریہ اور امام حسن بصری کے نزدیک جمعہ کا غسل واجب ہے (نیل الاوطار ج ۱، ص ۲۰۲) ائمہ اربعہ کے نزدیک جمعہ کا غسل سنت موکدہ ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۱۱۸) اہلحدیث علما میں سے امام شوکانیؒ اور مولانا عبیداللہ رحمانیؒ اسے واجب مانتے ہیں۔ (نیل الاوطار ج ۱، ص ۲۳۳) (مرعاۃ المفاتیح ج ۱، ص ۳۵۳)

(۲) ائمہ اربعہ کے نزدیک عید کا غسل سنت موکدہ ہے (الفقہ ۔۔۔۔ ایضاً)۔ اہلحدیث علما کے نزدیک یہ مستحب ہے (نیل الاوطار)

نبی علیہ السلام کے حکم کو استحباب پر معمول کیا جائے گا، کیونکہ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ میت کو نہلاتے تھے۔ ہم میں سے بعض لوگ وضو کر لیتے اور بعض نہیں کرتے تھے"۔ (الخطیب) حضرت ابو بکر صدیقؓ کا جب انتقال ہوا تو آپ کی بیوی حضرت اسماء بنت عمیسؓ نے آپ کو غسل دیا۔ غسل کے بعد وہ باہر آئیں اور جو مہاجرین (صحابہ) وہاں موجود تھے، ان سے دریافت کیا "آج سخت سردی ہے اور میرا روزہ بھی ہے، کیا میرے لئے غسل کرنا ضروری ہے؟ انہوں نے کہا "نہیں"۔[1] (مؤطا امام مالکؒ)

۴۔ احرام باندھتے وقت: حج کے لئے احرام باندھتے وقت غسل کرنا سب کے نزدیک مستحب ہے۔ حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے نبی علیہ السلام کو دیکھا کہ آپ نے احرام باندھنے کے لئے کپڑے اتارے اور غسل فرمایا" (دارقطنی۔ بیہقی۔ ترمذی)

۵۔ مکہ معظمہ میں داخل ہوتے وقت: جو شخص مکہ معظمہ میں داخل ہونا چاہے اس کے لئے غسل کرنا سب کے نزدیک مستحب ہے۔ حضرت ابن عمرؓ جب بھی مکہ معظمہ تشریف لاتے تو ذی طویٰ میں رات گذارتے اور صبح کے وقت غسل فرماتے اور مکہ معظمہ میں داخل ہوتے۔ اور نبی علیہ السلام کے متعلق بھی بتاتے کہ آپؐ نے ایسا ہی کیا۔"[2] (بخاری و مسلم)

۶۔ وقوفِ عرفات کے وقت: جو شخص حج کے لئے عرفات میں وقوف کرے۔ اس کے لئے غسل کرنا مستحب ہے۔ حضرت نافعؒ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ احرام باندھنے سے پہلے، مکہ معظمہ میں داخل ہونے اور عرفات کی شام کو وقوف کرنے کے لئے غسل فرمایا کرتے تھے۔" (مؤطا امام مالکؒ)

۴۔ غسل کے فرائض:

غسل کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں:

---

[1] صحابہؓ میں سے حضرت علیؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کے نزدیک میت کو غسل دینے کے بعد غسل کرنا ضروری ہے۔ امام لیثؒ اور ابو حنیفہؒ اور آپ کے اصحاب کے نزدیک میت کو غسل دینے کے بعد غسل نہ واجب ہے اور نہ مستحب بلکہ صرف جائز ہے۔ ان کا استدلال امام دارقطنی کی اس حدیث سے ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا "میت کو غسل دینے سے کوئی غسل نہیں ہے"۔ امام مالکؒ، شافعیؒ اور دوسروں نے تمام احادیث میں تطبیق دیتے ہوئے اسے مستحب قرار دیا ہے (الفتح الربانی ج ۲، ص ۱۴۷)

[2] ائمہ اربعہ کے نزدیک مدینہ منورہ میں داخل ہوتے وقت بھی غسل کرنا مستحب ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۱۱۸)

۱۔ نیت : کیونکہ تمام عبادات اور شرعی کاموں کے لئے نیت بہر حال ضروری ہے
ا ۔(دیکھئے صفحہ ۶۱)

۲۔ تمام اعضاء کا دھونا : حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے سنا' جس نے جنابت سے (غسل کرتے ہوئے) ایک بال کے برابر بھی کوئی جگہ خشک رہنے دی. اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ایسا اور ایسا کرے گا''۔ (احمد۔ابوداؤد)

غسل کی سنتیں :

۱۔ تین مرتبہ ہاتھوں کا دھونا۔

۲۔ شرمگاہ کا دھونا

۳۔ وضو کرنا ۲۔ وضو میں پاؤں غسل کے بعد بھی دھوئے جا سکتے ہیں، اگر زمین صاف نہ ہو یا انسان ٹب وغیرہ میں غسل کر رہا ہو۔

۴۔ سر پر تین مرتبہ پانی ڈالنا اور سر کے بالوں کا خلال کرنا تاکہ پانی بالوں کی جڑ تک پہنچ جائے۔

۵۔ پھر پورے بدن پر پانی ڈالنا : پہلے دائیں اعضاء دھونا اور بعد میں بائیں اور جہاں ممکن ہو سکے اعضاء کا ملنا۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب جنابت سے غسل فرماتے تو پہلے اپنے ہاتھ دھوتے، پھر دائیں ہاتھ سے بائیں پر پانی ڈال کر اپنی شرمگاہ دھوتے پھر وضو فرماتے جیسا کہ آپ نماز کے لئے وضو فرمایا کرتے، پھر پانی لیتے اور اپنے بالوں کی جڑوں میں انگلیاں ڈالتے۔ جب محسوس فرماتے کہ پانی بالوں کی جڑ تک پہنچ گیا تو اپنے سر پر پانی کے تین چلو ڈالتے، پھر پورے بدن پر پانی ڈالتے''۔ (بخاری و مسلم)

حضرت میمونہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کے غسل کے لئے پانی رکھا۔ آپؐ نے پہلے اپنے ہاتھوں پر پانی ڈال کر دویا تین مرتبہ انہیں دھویا۔ پھر دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈال کر اپنی شرمگاہ دھوئی۔ پھر اپنے ہاتھ کو زمین پر ملا پھر کلی کی اور ناک میں پانی دیا۔

ا ۔ حنفیہ کے نزدیک غسل کی نیت فرض نہیں، سنت مؤکدہ ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۱۱۶)

۲ ۔ حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک کلی کرنا اور ناک میں پانی دینا غسل کے فرائض میں داخل ہے۔ کیونکہ منہ اور ناک کا اندر کا حصہ بدن کا حصہ ہے اور غسل میں پورا بدن دھونا ضروری ہے (الفقہ ۔۔ج ۱، ص ۱۱۲)

پھر چہرہ اور بازو دھوئے۔ پھر تین مرتبہ سر دھویا۔ پھر پورے بدن پر پانی ڈالا۔ پھر اپنی جگہ سے ہٹ کر پاؤں دھوئے۔ (بخاری و مسلم)

۶۔ عورت کا جنابت کی وجہ سے غسل :

عورت کا غسل بھی مرد ہی کی طرح ہے۔ لیکن عورت کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ چٹیا بھی کھولے ۔۔۔۔۔ حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ سے عرض کیا "یا رسول اللہ میں اپنے سر کی چٹیا کس کر باندھتی ہوں، کیا جنابت کے غسل میں اسے کھولوں؟ فرمایا "نہیں، تمہارے لئے یہ کافی ہے کہ اپنے سر پر تین چلو پانی ڈالو، پھر اپنے پورے بدن پر پانی ڈالو تو اس طرح تم پاک ہو جاؤ گی [1]۔

(احمد۔ مسلم۔ ترمذی۔ ابو داؤد، نسائی۔ ابن ماجہ)۔

۷۔ غسل کے متعلق بعض دوسرے ضروری مسائل :

۱۔ حیض اور جنابت، جمعہ اور عید یا جمعہ اور جنابت دونوں کے لئے ایک غسل کافی ہے، جبکہ اس کی نیت ہو۔

۲۔ جنابت کے غسل کے بعد اگر انسان وضو نہ کرے تو غسل ہی وضو کا قائم مقام ہوگا یعنی جب تک اسے کوئی ایسی صورت پیش نہ آئے جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، وہ باوضو ہوگا۔ حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ غسل کے بعد وضو نہیں فرماتے تھے"۔

۱۔ائمہ اربعہ کے نزدیک اگر چٹیا کس کر باندھی ہوئی ہو اور اس سے بالوں کی جڑ تک پانی نہیں پہنچ سکتا تو کھولنا ضروری نہیں۔البتہ بالوں کی جڑ تک پانی پہنچانا ضروری ہے۔(الفقہ ......ج ۱، ص ۱۱۵)

تیمّم

تیمّم کے معنی قصد وارادہ کے ہیں۔ شریعت میں تیمّم ہاتھوں کو مٹی پر مار کر منہ اور بازوؤں پر پھیرنے کو کہتے ہیں۔

تیمّم کا جواز :

تیمّم کا جواز قرآن، سنت اور اجماع امت تینوں سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰىٓ اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْجَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْلٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا۔ (النساء ۴۳)

اگر تم بیمار یا سفر کی حالت میں ہو تو تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو اور پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمّم کر لیا کرو۔ اس پر ہاتھ مار کر اپنے منہ اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو۔

حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "پوری زمین میرے لئے اور امت کے لئے مسجد اور پاکیزہ چیز بنا دی گئی ہے۔ میری امت میں سے کسی شخص کو جہاں بھی نماز پالے (یعنی نماز کا وقت ہو جائے) تو اس کے پاس اس کے پاک ہونے کی چیز موجود ہے۔" (مسند امام احمد)

پوری امت کا اس پر اتفاق ہے کے خاص حالات میں وضو اور غسل کی جگہ تیمّم کرنا جائز ہے۔

وہ صورتیں جن میں تیمّم کرنا جائز ہے :

۱۔ جب کہ انسان پانی نہ پائے یا اتنا پانی پائے جو وضو یا غسل کے لئے کافی نہ ہو[۱] :

۱۔ شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک اگر پانی کافی نہ ہو تو انسان اس سے کچھ اعضاء دھو لے اور باقی کے لئے تیمّم کر لے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۱۵۳)۔

حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ ہم ایک سفر میں نبی ﷺ کے ساتھ تھے آپ نے نماز پڑھائی تو دیکھا کہ ایک آدمی کونے میں الگ کھڑا ہے، پوچھا "تم نے نماز کیوں نہیں پڑھی ؟" کہنے لگا میں جنابت کی حالت میں ہوں اور پانی نہیں مل رہا"۔ "فرمایا مٹی سے کام لو وہ تمھارے لئے کافی ہے" (بخاری و مسلم)

حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص دس سال تک بھی پانی نہ پائے، مٹی اس کے لئے پاکیزگی ہے" (ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) لیکن تیمم کرنے سے پہلے پانی کا اپنے ساتھیوں کے پاس اور ارد گرد تلاش کرنا ضروری ہے۔ جب یقین ہو جائے کہ پانی نہیں ہے یا وہ دور ہے تو پھر تیمم کرنا چاہیے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے۔ البتہ مسافت کی مقدار مختلف ائمہ کے نزدیک مختلف ہے۔ ا۔

جب انسان بیمار ہو یا اس کے جسم پر کوئی زخم ہو اور پانی کے استعمال سے اسے بیماری کے بڑھ جانے یا دیر سے صحت یاب ہونے کا اندیشہ ہو : حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ہم چند آدمی ایک سفر پر نکلے۔ ہم میں ایک آدمی کو پتھر لگا اور اس کے سر پر زخم ہو گیا۔ پھر بد خوابی ہو گئی۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا "کیا میرے لئے تیمم کی گنجائش ہے "؟ انھوں نے جواب دیا" چونکہ تمھارے پاس پانی ہے اس لئے تمھارے لئے کوئی گنجائش ہم نہیں پاتے"۔ اس نے غسل کیا اور مر گیا۔ جب نبی ﷺ کی خدمت میں واپس آئے اور آپ کو اس واقعہ کی خبر ملی تو فرمایا "ان لوگوں نے اسے مار ڈالا، اللہ انہیں مارے۔ جب انہیں معلوم نہیں تھا، تو انھوں نے دریافت کیوں نہ کر لیا، اس لئے کہ جہالت کی شفا دریافت کر لینے میں ہے اس شخص کے لئے اتنا کافی تھا کہ تیمم کر لیتا اور اپنے زخم پر کپڑا باندھ کر مسح کر لیتا اور باقی جسم دھو لیتا۔" (ابو داؤد۔ ابن ماجہ۔ دار قطنی)

ا۔ حنفیہ کے نزدیک اگر انسان بستی میں ہے تو اسے پانی تلاش کرنا چاہیے خواہ اسے پانی کے قریب ہونے کا گمان ہو یا نہ ہو۔ سفر میں اگر اس کا خیال ہو کہ پانی ایک میل یا اس سے دور ہے اس کے لئے تیمم کرنا جائز ہے اور اگر اسکا خیال ہو کہ ایک میل کے اندر اندر ہے اور راستے میں کوئی خطرہ بھی نہیں ہے تو اسے پانی تلاش کرنا چاہیے اگرچہ اس کے لئے تلاش کرنے کا وقت نہ ہو۔ شافعیہ کے نزدیک یہ مسافت ڈیڑھ میل ہے اور حنبلیہ کے نزدیک اتنی جتنی عرف عام میں دوری کہا جاتا ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۱۵۶)

۳۔ اگر پانی بہت ٹھنڈا ہو اور گمان غالب یہ ہو کہ اس سے وضو یا غسل کرنے میں بیمار ہو جانے کا اندیشہ ہے اسے گرم کرنے یا کرانے کی بھی طاقت نہ ہو اور کہیں سے گرم پانی بھی مل نہ سکتا ہو تو تیمم کر لینا جائز ہے [۱]۔ حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ غزوہ ذات السلاسل میں بھیجے گئے۔ ایک رات جب کہ سردی سخت تھی، مجھے غسل کی ضرورت پیش آگئی۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں نہایا تو مر جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے تیمم کیا اور لوگوں کو صبح کی نماز پڑھائی۔ جب ہم مدینہ واپس آئے تو لوگوں نے نبی ﷺ سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا "اے عمرو! تم نے جنابت کی حالت میں لوگوں کو نماز پڑھائی؟" میں نے عرض کی "مجھے قرآن پاک کی یہ آیت یاد آگئی تھی وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا"۔ (اور اپنے آپکو ہلاک نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرنے والا ہے) اس لئے میں نے تیمم کر کے نماز پڑھ لی۔ رسول اللہ ﷺ ہنس دیئے اور مزید کچھ نہ فرمایا [۲]

(احمد۔ ابو داؤد۔ حاکم۔ دار قطنی۔ ابن حبان)

۴۔ پانی قریب تو ہو، لیکن اس کے لانے میں اپنی جان، مال یا آبرو کو نقصان پہنچے۔ یا ساتھیوں کے چھوٹ جانے کا اندیشہ ہو، یا راستے میں دشمن حائل ہو، یا قید کی حالت ہو یا کنوئیں سے پانی نکالنے کی کوئی چیز موجود نہ ہو ان تمام صورتوں میں تیمم کرنا جائز ہے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کیونکہ ان صورتوں میں پانی کا ہونا، نہ ہونے کے برابر ہے۔

۵۔ پانی تو ہو، مگر اس کی فوراً یا بعد میں پینے، کھانا پکانے، ناپاکی دور کرنے یا اسی طرح دوسری چیزوں کے لئے ضرورت پیش آسکتی ہو اور پھر پانی کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں بھی تیمم کرنا جائز ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں "بہت سے صحابہ نے تیمم کیا اور پانی کو اپنے پینے کے لئے محفوظ رکھا" اس بارے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

(المغنی ج ا ص ۲۶۷)

---

[۱] حنفیہ کے نزدیک اس صورت میں بھی وضو کرنا ضروری ہے اِلّا یہ کہ اس سے بیمار ہو جانے کا یقین ہو حدث اکبر (یعنی جبکہ غسل کرنا ضروری ہوتا ہے) سے گمان غالب کی بنا پر بھی تیمم ہو سکتا ہے۔ شافعیہ کے نزدیک اس صورت میں بعد میں نماز کا دہرانا ضروری ہے (الفقہ.... ج ا ص ۱۵۴)

[۲] امام احمدؒ کا (اور ایک روایت میں امام شافعیؒ کا بھی) مسلک یہ ہے کہ محض ڈر کی وجہ سے پانی ہوتے ہوئے تیمم کرنا جائز نہیں ہے۔ (الفتح الربانی ۲ ص ۱۹۲)

۳۔ وہ مٹی جس سے تیمّم کرنا جائز ہے :

پاک مٹی یا ہر اس چیز سے تیمم کرنا جائز ہے، جو مٹی کی جنس سے ہو جیسے ریت، پتھر، کنکری، سیمنٹ وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا (تو تم پاک صعید سے تیمّم کرو) اہل زبان کا اس پر اجماع ہے کہ صعید سے مراد روئے زمین ہے، خواہ وہ مٹی ہو یا کوئی اور چیز ۱؎۔

تیمّم کا طریقہ :

تیمم کرنے کے لئے سب سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنی چاہیے پھر دونوں ہتھیلیوں کو زمین پر مارنا اور ان پر پھونک مار کر چہرے اور کلائی تک دونوں ہاتھوں پر پھیر لینا چاہیے۔ اس بارے میں سب سے واضح اور صحیح حدیث حضرت عمارؓ کی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے غسل کی حاجت ہو گئی اور مجھے پانی نہ ملا۔ میں نے چند پلٹے کھائے اور پھر نماز پڑھی۔ بعد میں اس کا ذکر جب میں نے نبی ﷺ سے کیا، تو آپ نے فرمایا" تمہارے لئے یوں کر لینا کافی تھا" اس کے بعد نبی ﷺ نے اپنی دونوں ہتھیلیاں زمین پر ماریں، پھر دونوں کو پھونک مار کر جھاڑا، پھر انہیں اپنے چہرے اور دونوں ہتھیلیوں پر پھیر لیا ۲؎"۔ (بخاری و مسلم)

۱؎ مالکیہ کے نزدیک پہاڑوں کی برف سے بھی تیمم کرنا جائز ہے (الفقہ.... ج ۱، ص ۱۶۰)

۲؎ صحابہ میں سے حضرت علیؓ، عمارؓ، ابن عباسؓ اور ائمہ میں سے عطاء شعبیؒ، مکحولؒ، اوزاعی، احمد بن حنبلؒ، اسحاق، صادقؒ اور عام محدثین کا یہی مسلک ہے۔ تیمم کے متعلق امام ابو حنیفہؒ، امام مالک، امام شافعی، سفیان ثوریؒ اور صحابہ و تابعین میں سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ، سالم بنؒ عبداللہ اور حسن بصریؒ کا مسلک یہ ہے کہ ایک مرتبہ دونوں ہاتھوں کو مٹی پر مار کر چہرے پر پھیر لیا جائے پھر دوسری مرتبہ دونوں ہاتھوں کو مٹی پر مار کر کہنیوں تک پھیر لیا جائے۔ حضرت ابن عمرؓ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ تیمم دو مرتبہ ہاتھوں کو زمین پر مارنا ہے۔ ایک مرتبہ چہرے کے لئے اور دوسری مرتبہ کہنیوں تک بازوؤں کے لئے (دارقطنی۔ حاکم۔ بیہقی)۔ اس بارے میں اور بھی کئی احادیث ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تیمم میں ہاتھوں کو دو مرتبہ زمین پر مارنا چاہیے۔ محدثین نے ان تمام احادیث کو سند کے لحاظ سے کمزور قرار دیا ہے اور جو لوگ دو مرتبہ کے قائل ہیں وہ عمار کی روایت کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اس میں نبی ﷺ نے انہیں زمین پر ہاتھ مارنے کا طریقہ بتایا ہے نہ کہ پورا تیمم سکھایا ہے۔ امام خطابیؒ لکھتے ہیں کہ روایت کے لحاظ سے "ایک مرتبہ" والوں کا مسلک زیادہ صحیح ہے اور قیاس کے لحاظ سے "دو مرتبہ" والوں کا (معالم السنن ج ۱، ص ۲۰۲)

۴۔وہ کام جن کا تیمم کے بعد کرنا جائز ہے:

تیمم چونکہ وضو اور غسل کا قائم مقام ہے، اس لئے اس کے بعد وہ تمام کام جائز ہیں جو وضو اور غسل کے بعد کئے جا سکتے ہیں۔ حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "مٹی مسلمان کی پاکیزگی ہے، اگرچہ وہ دس سال تک پانی نہ پائے۔ اور جب وہ پانی پالے تو اسے اپنے جسم کے ساتھ لگانا چاہیے (یعنی وضو یا غسل کرنا چاہیے)۔ اس لئے کہ یہ بہتر ہے"۔ (احمد۔ترمذی)

۵۔وہ کام جن سے تیمم ختم ہو جاتا ہے:

جن کاموں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، ان سے تیمم بھی ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ اسی کا قائم مقام ہے۔ اسی طرح جس شخص نے پہلے پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمم کیا ہو، پانی مل جانے سے اس کا تیمم ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی نے بیماری یا کسی دوسرے عذر کی بنا پر تیمم کیا ہو، جب اس کا عذر ختم ہو جائے اس کا تیمم بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اگر کسی نے تیمم سے نماز پڑھ لی، پھر اسے پانی مل گیا یا نماز ختم کر لینے کے بعد وہ اپنے آپ کو وضو کرنے کے قابل پاتا ہے تو اس پر نماز کا دہرانا ضروری نہیں بہتر ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ دو آدمی سفر پر روانہ ہوئے جب نماز کا وقت ہوا تو دونوں کے پاس پانی نہیں تھا۔ دونوں نے پاک مٹی سے تیمم کیا اور نماز پڑھ لی۔ پھر نماز کا وقت گزرنے سے پہلے پہلے انہیں پانی مل گیا۔ ایک نے دوبارہ وضو کر کے نماز پڑھ لی اور دوسرے نے ایسا نہیں کیا۔ پھر جب دونوں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے اس واقعہ کا تذکرہ کیا۔ جس شخص نے نماز نہیں دہرائی تھی۔ اس سے نبی ﷺ نے فرمایا "تم نے سنت کے مطابق عمل کیا، تمہاری نماز ہو گئی" اور دوسرے سے فرمایا "تمہارے لئے دوہرا اجر ہے"۔ (ابوداؤد، نسائی)

لیکن جو شخص پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمم کر کے نماز پڑھ رہا ہو، اگر دوران نماز میں اسے پانی میسر آجائے تو اس کا تیمم ختم ہو جائے گا۔ اسے نماز توڑ کر وضو کرنا چاہیے اور پھر نماز پڑھنی چاہیے۔ جیسا کہ حضرت ابوذرؓ کی گذشتہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے[1]۔

---

[1] مالکیہ کے نزدیک اگر نماز کا وقت اتنا تنگ ہو کہ نماز ختم کرنے کے بعد ایک رکعت کا وقت نہ ہو تو اسے نماز جاری رکھنی چاہیے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا، ص ۱۶۵)

حیض۔ نفاس اور استحاضہ

۱۔ حیض آنے کی عمر :

حدیث میں حیض آنے کی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ عمر کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ائمہ کے درمیان اس بارے اختلاف ہے۔ ۱

۲۔ حیض کی مدت :

حیض کی مدت مختلف طبیعتوں کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہے نبی ﷺ سے اس بارے کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں ہے۔ ائمہ کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے ۲۔

۱۔ حنفیہ کے نزدیک حیض آنے کی کم سے کم عمر ۹ سال اور زیادہ سے زیادہ ۵۵ سال ہے اس عمر کے بعد اگر خون آئے تو بیماری وغیرہ کی وجہ سے ہوگا، جس میں نماز کا چھوڑنا جائز نہیں، الّا یہ کہ وہ طبعی رفتار سے آئے، تو حیض ہی کا خون شمار ہوگا۔ مالکیہ کے نزدیک ۹ سال سے ۱۳ سال کی درمیانی عمر میں یا ۵۰ سال کے بعد اگر خون آئے تو اس کے متعلق ماہر طبیب سے مشورہ کیا جائے لیکن ۱۳ سال سے ۵۰ سال تک کی عمر میں جو خون آئے گا وہ حیض ہی کا خون شمار ہوگا۔۔۔ شافعیہ کے نزدیک حیض کی کم سے کم عمر ۹ سال اور زیادہ سے زیادہ عمر کی کوئی قید نہیں۔۔۔۔۔ حنبلیہ کے نزدیک حیض کی کم سے کم عمر ۹ سال اور زیادہ سے زیادہ عمر ۵۰ سال ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۱۲۵)

۲۔ امام مالکؒ کے نزدیک حیض کی کم سے کم مدت کچھ نہیں، زیادہ سے زیادہ مدت ۷ یا ۱۸ روز ہے امام شافعیؒ اور احمدؒ کے نزدیک حیض کی کم سے کم مدت ایک دن اور ایک رات اور زیادہ سے زیادہ مدت ایک روایت میں ۱۵ روز اور دوسری روایت میں ۱۷ روز ہے۔ یہ روایت حضرت علیؓ سے بھی ملتی ہے۔ نبی ﷺ سے ایک روایت میں حیض کی کم سے کم مدت ایک دن اور ایک رات اور زیادہ سے زیادہ مدت ۱۵ دن ہونے کا ذکر ہے۔ لیکن یہ روایت نہایت کمزور ہے (تحفۃ الاحوذی ج ۱، ص ۱۲۱)۔۔۔۔۔ امام ابو حنیفہؒ، ابو یوسفؒ اور محمدؒ، سفیان ثوریؒ اور عبداللہ بن مبارکؒ کے نزدیک حیض کی کم سے کم مدت تین روز اور زیادہ سے زیادہ مدت دس روز ہے۔ اس کی ایک روایت حضرت انسؓ سے بھی ملتی ہے۔ نبی ﷺ سے بھی ایک روایت میں حیض کی کم سے کم مدت تین روز اور زیادہ سے زیادہ مدت دس روز ہونے کا ذکر ہے، (بقیہ اگلے صفحہ پر)

۳۔ نفاس اور اس کی مدت :

نفاس سے مراد وہ خون ہے جو بچہ پیدا ہونے یا ساقط ہو جانے کی وجہ سے عورت کو آتا ہے۔ اس کی کم از کم مدت کوئی نہیں جب بھی خون آنا بند ہو جائے، نفاس کی مدت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس روز ہے۔

حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے زمانہ میں عورت نفاس کے لئے چالیس روز تک بیٹھتی تھی"۔ (احمد۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ)۔

امام ترمذیؒ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں "صحابہ اور تابعین میں سے تمام اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ عورت نفاس میں چالیس روز تک نماز چھوڑے گی، الا یہ کہ اس کا خون پہلے ہی بند ہو جائے۔ اس صورت میں وہ غسل کر کے نماز پڑھنا شروع کر دے گی۔ اگر چالیس دن کے بعد بھی خون آتا رہے تو اکثر اہل علم کا کہنا ہے کہ وہ نماز نہیں چھوڑے گی[۱]۔

۴۔ وہ کام جن کا حیض اور نفاس کی حالت میں کرنا ناجائز ہے :

حیض و نفاس کی حالت میں ان تمام کاموں کا کرنا ناجائز ہے جن کا جنابت کی حالت میں کرنا ناجائز ہے۔ ۲۔ ب (دیکھیے ۸۸)

اس کے علاوہ حیض و نفاس کی حالت میں مندرجہ ذیل کام کرنا بھی سب کے نزدیک

لیکن یہ روایت ضعیف ہونے کی وجہ سے کسی کے نزدیک معتبر نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا اصل استدلال حضرت انسؓ کی روایت سے ہے (المغنی ج ا، ص ۳۲۰۔ بدایۃ المجتہد ج ا، ص ۳) حنفیہ کا ایک استدلال یہ بھی ہے کہ حدیث میں حیض کے دنوں کیلئے ایام اور لیالی کا لفظ آیا ہے اور یہ لفظ تین سے دس دنوں تک ہی بولا جا سکتا ہے جب کہ تین دن سے کم کے لئے یوم اور یومان کا لفظ بولا جاتا ہے اور دس دن کے لئے یوماً (جیسے أحد عشرَ یوماً۔ خمستہ عشر یوماً وغیرہ) کا ____ (اوجز المسالک، ج ا، ص ۱۵۴)

۱۔ حنفیہ اور حنابلہ کا یہی مسلک ہے۔ مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت ساٹھ روز ہے (الفقہ علی المذاہب ج ا، ص ۱۲۸)

۲۔ البتہ حائضہ کے مسجد میں داخل ہونے کے متعلق اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ اور احمدؒ کے نزدیک حائضہ مسجد میں داخل نہیں ہو سکتی، لیکن گزر سکتی ہے جیسا کہ جنابت کی حالت میں مسجد سے گذرنا جائز ہے۔ ظاہریہ کے نزدیک حائضہ مسجد میں داخل بھی ہو سکتی ہے اور اس میں ٹھہر بھی سکتی ہے جبکہ اسے مسجد کے گندے ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ ان کا استدلال حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ناجائز ہیں (بدایۃ المجتہد ج ا، ص ۴۳)

ا۔ روزہ: حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ عید الاضحیٰ یا عید الفطر کے روز نبی علیہ السلام عید گاہ تشریف لے گئے (مردوں کو خطبہ دینے کے بعد) آپ عورتوں کی طرف تشریف لے گئے اور فرمایا "اے عورتو! صدقہ کرو، اس لئے کہ میں نے جہنم میں تمہاری اکثریت دیکھی ہے" عورتوں نے دریافت کیا "اے اللہ کے رسول ﷺ! ایسا کیوں؟ فرمایا تم لعنت بہت کرتی ہو اور اپنے خاوندوں کی ناشکری کرتی ہو۔ میں نے تم سے بڑھ کر کم عقل اور کم دین کے ساتھ ایک عقلمند مرد کو بے وقوف بنا دینے والی کسی کو نہیں دیکھا ۔" عورتوں نے دریافت کیا "اے اللہ کے رسول! ہماری عقل اور ہمارے دین کی کمی کیا ہے؟ فرمایا "کیا عورت کی گواہی مرد سے آدھی نہیں ہے؟ کہنے لگیں جی ہاں فرمایا "یہ ہے کہ عورت کی عقل کی کمی، پھر جب عورت حیض کی حالت میں ہوتی ہے، تو کیا ایسا نہیں ہوتا کہ وہ نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے"؟ کہنے لگیں جی ہاں۔ (بخاری و مسلم)

۲۔ جماع: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ یہودیوں کے ہاں جب عورت حیض کی حالت میں ہوتی تھی، تو وہ نہ اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور نہ اس کے ساتھ گھر میں اکٹھے رہتے، اس کے متعلق صحابہ کرام نے نبی ﷺ سے دریافت کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ، قُلْ هُوَاَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ......

یہ لوگ آپ سے حیض کے متعلق دریافت کرتے ہیں آپ ان سے کہہ دیجئے کہ وہ ناپاکی ہے۔ لہٰذا حیض کے دنوں میں تم عورتوں سے الگ رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ (یعنی جماع نہ کرو) یہاں تک کہ وہ پاک صاف ہو جائیں۔ ا۔

کہ نبی ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ مجھے مسجد سے اوڑھنی دے دو" (مسند امام احمد)۔ امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ اور عام محدثین کے نزدیک حائضہ نہ مسجد میں داخل ہو سکتی ہے نہ اس میں ٹھہر سکتی ہے اور نہ اس سے گذر سکتی ہے کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے "میں مسجد کو حائضہ اور جنبی کے لئے جائز نہیں رکھتا (ابو داؤد)۔ قرآن کی آیت میں گذرنے کی اجازت صرف جنبی کے لئے ہے، حائضہ کیلئے نہیں ہے۔ باقی رہی حضرت عائشہؓ کی روایت، تو اس کے الفاظ دوسری قوی تر روایت میں یوں ہیں کہ نبی ﷺ نے مجھے مسجد سے فرمایا کہ مجھے اوڑھنی دے دو" (الفتح الربانی ج ۲، ص ۱۶۵)

ا۔ ان الفاظ کی بنا پر سلف میں اختلاف ہے کہ آیا عورت سے جماع اس وقت جائز ہے کہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس پر نبی ﷺ نے فرمایا "سوائے جماع کے ہر چیز کر سکتے ہو" (مسلم ۔ احمد ۔ ابو داؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

۵۔ استحاضہ اور اس کی مختلف صورتیں:

جب بیماری یا کسی اور وجہ سے خون بے وقت آئے یا حیض کے دن گذر جانے کے بعد بھی خون جاری رہے تو اسے استحاضہ کہتے ہیں۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں:

ا۔ جبکہ عورت صرف عادت والی ہو یعنی اسے حیض کی مدت تو معلوم ہو لیکن رنگ سے اپنے حیض کے خون کو نہ پہچان سکتی ہو۔ اس صورت میں وہ اس مدت کو حیض کی مدت شمار کرے اور باقی کو استحاضہ:

حضرت ام سلمہؓ کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ سے ایک ایسی عورت کے متعلق سوال کیا جس کو (اپنی متعینہ مدت کے بعد بھی) خون آرہا تھا آپ نے فرمایا "مہینے میں جتنے روز اسے پہلے حیض آیا کرتا تھا، اُسے چاہیے کہ ان کا اندازہ کر کے نماز چھوڑ دے۔ اس کے بعد وہ نہائے اور اپنی شرم گاہ پر کپڑا باندھے اور نماز پڑھے۔ ا۔

نہیں جب کہ اس کے حیض کا خون بند ہو چکا ہو لیکن وہ ابھی نہائی نہ ہو؟ امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے صحابہ کے نزدیک یہ جائز ہے جبکہ عورت اپنے حیض کے زیادہ سے زیادہ (دس دن) گذار چکی ہو۔ امام اوزاعیؒ اور ابن حزم کے نزدیک بھی یہ جائز ہے۔ جبکہ عورت نے اپنی شرمگاہ کو دھولیا ہو۔ دوسرے ائمہ کے نزدیک عورت سے جماع اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک اس نے حیض بند ہو جانے کے بعد غسل نہ کر لیا ہو۔

(بدایۃ المجتہد ج ۱، صفحہ ۴۴۔ ج ۱، ص ۱۹)

ا۔ امام ابو حنیفہؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور عام محدثین کا یہی مسلک ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک عادت والی عورت اپنی عادت کے دنوں میں تین دن میں مزید شمار کرے گی اور بعد میں استحاضہ کے، جبکہ اس طرح کل دن پندرہ سے زیادہ نہ ہو جاتے ہوں اور اگر وہ پندرہ سے زیادہ ہو جاتے ہوں تو تین دن مزید شامل نہ کرے گی ــــــ عادت والی عورت کو جتنے روز حیض کا خون آتا ہے، اگر کسی مرتبہ اسے اس سے زیادہ دن خون آئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی عادت بدل گئی۔ حنفیہ مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک صرف ایک مرتبہ تبدیلی ہو جانے سے عادت بدل جاتی ہے۔ حنبلیہ کے نزدیک کم از کم دو یا تین مرتبہ تبدیلی سے عادت بدلتی ہے (اوجز المسالک ج ۱)

یہ بڑی پیچیدہ بحث ہے۔ ذیل میں ہم صرف حنفیہ کا مسلک تفصیل سے بیان کرتے ہیں: (اگلے صفحہ پر)

(مئوطاامام مالکؒ-ابوداؤد،دارمی)

۲۔جب کہ عورت صرف پہچان (تمیز) والی ہو یعنی وہ رنگ یا بو وغیرہ کی وجہ سے اپنے حیض کے خون کو پہچانتی ہو لیکن اس کے حیض کے دن مقرر نہ ہوں، تو اس صورت میں وہ اپنی پہچان کے مطابق حیض کے دن شمار کرے گی اور اس کے بعد بقیہ دن استحاضہ کے ہوں گے :

حضرت فاطمہؓ بنت ابی حبیشؓ سے نبی ﷺ نے فرمایا جب تک خون حیض کا ہوتا ہے وہ سیاہ ہوتا ہے اور پہچان لیا جاتا ہے۔جب تک ایسا ہو تو نماز سے رُکی رہو اور وہ اگر دوسری طرح کا ہو تو تم وضو کرو اور نماز پڑھو،اس لئے کہ یہ رگ ہے (جو پھٹ گئی ہے اسے)"۔

(ابوداؤد، نسائی،ابن ماجہ،ابن حبان،دارقطنی)

اگر کسی عورت کی عادت پانچ دن تک حیض آنے کی تھی، لیکن کسی مرتبہ اسے چھ دن خون آیا۔یا اس کی عادت سات دن تک حیض آنے کی تھی، لیکن کبھی اسے آٹھ یا نو یا دس دن خون آیا تو گویا اسکی عادت بدل گی۔یہ عادت دس دن تک جا سکتی ہے، دس دن سے کم تک اسے جتنے دن بھی خون آئیگا وہ اسے حیض ہی کا خون شمار کرے گی۔لیکن اگر کبھی دس دن سے زیادہ (مثلاً گیارہ یا بارہ دن) خون آئے تو جتنے دن اس کی عادت سے زیادہ خون آئے گا وہ اسے استحاضہ کا شمار کرے گی۔مثلاً اگر کسی کی عادت سات دن تک حیض آنے کی تھی (خواہ اس کی مستقل عادت تھی یا کبھی سات دن تک خون آنے سے اس کی عادت بن گئی) لیکن کبھی اسے گیارہ دن تک خون آیا تو وہ سات دن حیض کے اور چار دن استحاضہ کے شمار کرے گی۔

(اوجز ص ۱۰۰، عالمگیری۔الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۱۴۴)

ا۔امام مالکؒ، شافعیؒ اور عام محدثین کا یہی مسلک ہے۔حنفیہ کے نزدیک خون کی پہچان معتبر نہیں عادت (دنوں کی گنتی) معتبر ہے۔ان کا استدلال یہ ہے کہ اوپر کی حدیث میں جن صحابیہ (فاطمہ بنت ابی حبیشؓ) کا واقعہ بیان ہوا ہے، وہ پہچان والی نہ تھیں۔بلکہ عادت والی تھیں جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں انہیں نبی ﷺ کے یہ الفاظ ہیں "یہ ایک رگ ہے، حیض نہیں ہے۔جب حیض آنا شروع ہو تو نماز چھوڑ دو، اور جب اسکی مقدار ختم ہو جائے تو اپنے آپ سے خون صاف کرو.... (مؤطا امام مالکؒ وغیرہ)۔ دوسرا استدلال یہ بھی ہے کہ حضرت ام سلمہؓ کی روایت کے متعلق سب کا اتفاق ہے کہ اس میں عادت والی عورت کا حکم بیان ہوا ہے۔

اس بارے میں بعض اور روایات بھی ہیں جن سے حنفیہ کا استدلال یہ ہے کہ حضرت فاطمہ بنت ابی حبیشؓ عادت والی تھیں اور دوسرے یہ استدلال کرتے ہیں کہ وہ پہچان والی تھیں۔امام احمدؒ کا مسلک ایک روایت میں امام مالکؒ و شافعیؒ کے مطابق ہے اور دوسری میں امام ابو حنیفہؒ کے مطابق۔

(وجزالمسالک ج ۱۔المغنی ج ۱ ص ۳۲۴)

۳۔ جب کہ عورت عادت والی بھی ہو اور پہچان والی بھی : اس صورت کا حدیث میں ذکر نہیں ہے۔ ائمہ کا اس بارے میں اختلاف ہے۔[1]

۴۔ جب کہ عورت نہ عادت والی ہو اور نہ پہچان والی ہو، یعنی وہ اپنی عادت بھی بھول گئی ہو اور پہچان بھی، تو اس صورت میں وہ اپنے اجتہاد اور ظن غالب اور اپنی ہم عمر اور ہم عادت عورتوں کی عادت پر عمل کرے گی۔

حضرت حمنہ بنت جحشؓ سے روایت ہے کہ مجھے بہت زیادہ حیض آتا تھا۔ ایک دن میں نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپؐ میری بہن زینبؓ بنت جحشؓ (ام المومنین) کے گھر تشریف فرما تھے۔ میں نے عرض کیا "اے اللہ کے رسولؐ مجھے بہت زیادہ حیض آتا ہے۔ اس کی وجہ سے میں نماز اور روزے نہیں کر سکتی- اب میرے بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے فرمایا؟ "روئی استعمال کرو، اس سے خون بند ہو جائے گا" میں نے عرض کیا وہ اس سے کہیں زیادہ ہے "فرمایا" کپڑا باندھ لو "میں نے پھر عرض کیا" وہ بہت بہتا ہے"۔ فرمایا" تو میں تمہیں دو صورتوں کا حکم دیتا ہوں۔ تم ان میں سے ایک کر لو، وہ تمہارے لئے کافی ہے اور اگر دونوں کر سکو تو تم خود دیکھ لو۔ یہ دراصل شیطان کا ایک چوکا ہے۔ (ایک صورت یہ ہے کہ) تم اللہ کے علم میں چھ سے سات دنوں تک شمار کر لو۔ پھر غسل کر لو، یہاں تک کہ جب تم دیکھو کہ پاک صاف ہو گئی ہو، تو تئیس یا چوبیس دن (ہر نماز کے لئے تازہ وضو کر کے[2]) نماز پڑھو اور روزے رکھو۔ یہ (صورت) تمہیں کافی ہے۔ جیسا کہ عموماً عورتوں کو ہر ماہ مقررہ مدت میں حیض آتا ہے اور پھر نہاتی اور پاک صاف ہوتی ہیں، اسی طرح تم بھی کرو۔ اور اگر تم میں یہ طاقت (اور یہ دوسری صورت ہے)۔ کہ ظہر کو موخر اور عصر کو مقدم کرو، تو ایک غسل کر کے دونوں نمازیں ایک ساتھ پڑھ لو۔ پھر مغرب کو موخر اور عشاء کو مقدم کرو اور

۱۔ اگر عادت اور پہچان آپس میں ایک دوسرے کے مطابق ہیں تو کوئی اشکال نہیں۔ لیکن اگر دونوں میں اختلاف ہے، تو حنفیہ کے نزدیک عادت کا اعتبار کیا جائے گا، پہچان کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ مالکیہ کے نزدیک پہچان کا اعتبار کیا جائے گا، عادت کا نہیں۔ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ سے دونوں مسلکوں کی روایات ہیں، لیکن صحیح تر روایت میں امام شافعیؒ کا مسلک امام مالکؒ کے اور امام احمد کا مسلک امام ابو حنیفہ کے مطابق ہے۔ (اوجز المسالک ج ۱، ص ۱۴۷)

۲۔ یہ الفاظ اس حدیث میں نہیں ہیں لیکن دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ استحاضہ میں عورت ہر نماز کے لئے وضو کرے گی، جیسا کہ آئندہ "استحاضہ کے احکام" میں بیان ہوگا۔

دونوں نمازیں ایک ساتھ پڑھ لو۔ پھر صبح غسل کر کے فجر کی نماز پڑھو۔ اسی طرح تم روزے رکھو اور نماز پڑھو۔ اگر تم ایسا (یعنی دوسری صورت پر عمل) کر سکو تو یہ میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔ ا ۔" (احمد، ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

۶۔ استحاضہ کے احکام:

ا۔ جمہور (اکثریتِ سلف) کے نزدیک استحاضہ میں عورت پر صرف ایک غسل ضروری ہے اور وہ اس وقت جبکہ اس کے حیض کے دن ختم ہوں اور استحاضہ کے دن شروع ہوں، البتہ ہر نماز کے لئے وضو ضروری ہے: حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت فاطمہ بنت حبیشؓ سے فرمایا 'حیض کے دنوں میں نماز سے رُکی رہو، پھر (یعنی جب حیض کے دن ختم ہوں اور استحاضہ کے دن شروع ہوں)' فَاغْتَسِلِيْ وَ تَوَضَّئِيْ لِكُلِّ صَلٰوةٍ" تو غسل کرو ۲۔ اور ہر نماز کیلئے وضو کرو ۳۔"۔

(احمد۔ ابن ماجہ۔ ترمذی۔ ابوداؤد۔ نسائی)

ا۔ استحاضہ کا یہ حکم اس وقت ہے جب کہ عورت کو پہلے حیض آتا رہا ہو اور بعد میں کسی وقت وہ اپنی عادت اور پہچان بھول گئی ہو۔ اس صورت میں عام اہلحدیث اور حنفی علماء کا (تفصیلات کو چھوڑ کر تقریبا) یہی مسلک ہے (شامی۔ الکوکب الدری ا، ص ۸۷۔ تحفۃ الاحوذی ج ا، ص ۱۲۱)

استحاضہ میں عادت اور پہچان دونوں سے ناواقفیت کی ایک صورت یہ ہے کہ عورت نوعمر ہو اور اسے حیض ابھی آنا شروع ہی ہوا ہو۔ اس صورت میں حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک وہ حیض کی زیادہ سے زیادہ مدت (حنفیہ کے نزدیک دس روز اور مالکیہ کے نزدیک پندرہ روز) گزار کر استحاضہ کے دن شمار کرے گی (اوجز المسالک ج ا، ص ۱۳۸) امام احمد کے نزدیک دوسری عورتوں کی عادت کے مطابق چھ یا سات دن (یا کم و بیش) حیض کے شمار کرے گی اور بقیہ استحاضہ کے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک وہ پندرہ دن انتظار کرے گی۔ اگر پندرہ دن سے پہلے پہلے خون بند ہو جائے تو وہ سارا حیض ہی کا خون ہوگا اور اگر پندرہ دن کے بعد بھی جاری رہے تو وہ حیض کا صرف ایک دن اور ایک رات شمار کرے گی اور بقیہ دن استحاضہ کے شمار کر کے چودہ دن کی نمازیں قضا کرے گی۔ (تحفۃ الاحوذی ج ا، ص ۱۲۱)

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ کے نزدیک (اور ایک روایت میں حضرت علیؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کے نزدیک بھی) استحاضہ میں ہر نماز کے وقت غسل ضروری ہے۔ حضرت عائشہؓ، سعید بن مسیبؒ اور حسن بصریؒ کے نزدیک دن رات میں ایک غسل ضروری ہے۔

۳۔ امام مالکؒ کے نزدیک استحاضہ میں معذوری کی وجہ سے ہر نماز کے لئے وضو ضروری نہیں، بہتر ہے۔ ان کے نزدیک حدیث میں نبی ﷺ کا حکم وجوب کے لئے نہیں بلکہ استحباب کے لئے ہے۔ (اگلے صفحہ پر)

۲۔ استحاضہ کی حالت میں عورت وہ تمام کام (نماز، روزہ، قرآن کی تلاوت، جماع وغیرہ) کر سکتی ہے، جن کا حیض کی حالت میں کرنا ناجائز ہے۔ دوسری تمام چیزوں پر سب کا اتفاق ہے، البتہ جماع کے متعلق اختلاف ہے۔ جمہور کے نزدیک یہ بھی جائز ہے۔ ا ۔ (اوجز المسالک ج ا، ص ۱۵۵)

دوسرے تمام ائمہ کے نزدیک وضو ضروری ہے! البتہ حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک وضو نماز کے لئے نہیں بلکہ نماز کے وقت کے لئے ضروری ہے۔ اس اختلاف کا اثر یہ پڑتا ہے کہ حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک ایک وضو کے ساتھ ایک سے زائد فرض نمازیں (ادا اور قضا) پڑھی جا سکتی ہیں اور دوسروں کے نزدیک صرف ایک فرض نماز پڑھی جا سکتی ہے
(الکوکب الدری ج ا ص ۷۵۔ تحفۃ الاحوذی ج ا، ص ۱۱۸۔ المغنی ج ا، ص ۳۵۵)

ا ۔ امام نخعیؒ اور ابن سیرینؒ کے نزدیک استحاضہ میں جماع حرام ہے۔ امام احمدؒ نے بھی اس سے منع فرمایا ہے۔
(نیل الاوطار ج ا، ص ۲۴۶)۔

کتاب الصلوٰۃ

نماز کے متعلق عام احکام

۱۔ نماز کی اہمیت :

نماز اسلام کے ارکان میں سے سب سے پہلا اور اہم رکن ہے۔ یہ اسلام کا وہ ستون ہے ، جس کے بغیر وہ قائم نہیں رہ سکتا۔ قیامت کے روز بندوں کے اعمال میں سب سے پہلے نماز ہی کے متعلق باز پرس ہوگی ، حضرت عبداللہؓ بن قرطؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا" سب سے پہلی چیز جس کے متعلق بندے سے قیامت کے روز باز پرس ہوگی وہ نماز ہے ، اگر وہ درست ہوگی تو اس کے بقیہ اعمال درست ہوں گے اور اگر وہ غلط ہوگی تو اس کے تمام بقیہ اعمال غلط ہوں گے"۔ (طبرانی)۔ دنیا سے رخصت ہوتے وقت نبی ﷺ نے سب سے آخر میں نماز ہی کی وصیت فرمائی۔ حضورؐ اپنے آخری سانس لے رہے تھے اور فرما رہے تھے" نماز ، نماز اور تمہارے لونڈی اور غلام"۔

قرآن میں جگہ جگہ نماز قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی پاک کتاب میں تقریباً ہر چیز کا حکم دیتے وقت اس کے ساتھ نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ اسلام نے نماز کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ سفر و حضر ، امن و خوف ہر حال میں اس کو فرض رکھا ہے ، اور جو لوگ اس سے غفلت برتتے ہیں انہیں سخت وعید بتائی ہے۔ گذشتہ قوموں کی تباہی کا سب سے بڑا سبب قرآن نے یہی بتایا ہے کہ انہوں نے نماز کو ضائع کر دیا تھا۔

اس چیز پر پوری امت کا اجماع ہے کہ نماز کی فرضیت کا انکار کرنا اسلام سے خروج ہے۔

۲۔ نماز کن پر فرض ہے ؟

ہر عاقل و بالغ مسلمان پر نماز فرض ہے اور اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے-(بدایہ المجتہد ج ۱، ص ۹۰)۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا" تین اشخاص مرفوع القلم ہیں۔ ایک سویا ہوا آدمی یہاں تک کہ وہ بیدار ہو جائے۔ دوسرا بچہ یہاں تک کہ وہ

بالغ ہو جائے تیسرا پاگل یہاں تک کہ وہ باہوش ہو جائے"۔(احمد۔ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، حاکم) ۔

بچے پر اگر چہ نماز فرض نہیں ہے۔ لیکن اس کے والدین یا بڑوں کو چاہیے کہ جب وہ سات سال کا ہو جائے تو اسے نماز کا حکم دیں۔ جب دس سال کا ہو جائے تو مار سے کام لیں اور دوسرے موثر طریقے استعمال کریں۔ حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور پھر دادا کے ذریعے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا" تمہارے بچے جب سات سال کے ہو جائیں تو انہیں ۔۔۔۔ نماز کا حکم دو، جب دس سال کے ہو جائیں تو انہیں مارو اور ان کے سونے کی جگہ اپنے سے الگ کر دو"(احمد۔ابو داؤد۔حاکم)

۳۔ فرض نمازوں کی تعداد :

فرض نمازوں کی تعداد پانچ ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ معراج کی رات نبی ﷺ پر پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔ پھر انہیں کم کر کے پانچ کر دیا گیا۔ پھر آواز آئی"اے محمدؐ! میرا قول اٹل ہے۔ آپ کے لئے ان پانچ نمازوں میں پچاس نمازوں کا ثواب ہے"۔(احمد۔نسائی۔ترمذی)

حضرت طلحہؓ سے روایت ہے کہ گاؤں کا ایک آدمی بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا" یارسول اللہ! مجھے بتایئے۔ اللہ نے مجھ پر کتنی نمازیں فرض کی ہیں ؟" فرمایا" پانچ نمازیں، الا یہ کہ تم اپنی مرضی سے مزید (سنتیں اور نفل) پڑھو، ا ۔"(بخاری و مسلم)

۴۔ نماز کے اوقات :

قرآن کی مندرجہ ذیل آیات میں نماز کے اوقات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :

۱۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ وَزُلَفاً مِّنَ الَّیْلِ ۔۔۔۔(ھود ۱۱۴) اور نماز قائم کرو دن کے دونوں کناروں پر (فجر اور مغرب) اور کچھ رات گذرنے پر (یعنی عشاء)

ا ۔ حنفیہ کے نزدیک پانچ فرض نمازوں کے علاوہ نماز وتر واجب ہے۔ دوسروں کے نزدیک یہ سنت ہے ۔ مفصل بحث وتر کے بیان میں آئے گی۔

۲۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ (الاسراء ۷۸)

نماز قائم کرو سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک (ظہر، عصر، مغرب اور عشاء) اور قرآن پڑھنا فجر کا (نماز فجر)

۳۔ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّکَ تَرْضٰی (طٰہٰ ۱۳۰)

اور پڑھتا رہ خوبیاں اپنے رب کی، سورج نکلنے سے پہلے (فجر) اور اس کے ڈوبنے سے پہلے (عصر) اور کچھ گھڑیوں میں رات کی (عشاء) اور دن کی حدوں پر (صبح، ظہر اور مغرب) شاید کہ تو راضی ہو گا۔

حضرت جابر رضی اللہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے پاس جبرائیل آئے اور آپ سے کہا "اٹھیے نماز پڑھیے"۔ ظہر کی نماز آپ نے اس وقت پڑھی جب سورج کا زوال ہو گیا۔ پھر عصر کے وقت آئے اور آپؐ سے کہا "اٹھیے نماز پڑھیے" عصر کی نماز آپ نے اس وقت پڑھی جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو گیا۔ پھر مغرب کے وقت آئے اور کہا "اٹھیے نماز پڑھیے" مغرب کی نماز آپؐ نے اس وقت پڑھی جب سورج غروب ہو گیا۔ پھر عشاء کے وقت پھر آئے اور کہا "اٹھیے نماز پڑھیے" عشاء کی نماز آپؐ نے اس وقت پڑھی جب شفق غائب ہو گئی۔ پھر صبح کے وقت آئے اور کہا اٹھیے نماز پڑھیے" آپؐ نے فجر کی نماز اس وقت پڑھی جبکہ فجر ہو گئی پھر دوسرے روز ظہر کے وقت آئے اور کہا "اٹھیے نماز پڑھیے" ظہر کی نماز آپ نے اس وقت پڑھی جب ہر چیز کا سایہ اسکے برابر ہو گیا۔ پھر عصر کے وقت آئے اور کہا "اٹھیے نماز پڑھیے"۔ عصر کی نماز آپ ﷺ نے اس وقت پڑھی جب ہر چیز کا سایہ اس سے دوگنا ہو گیا۔ پھر مغرب کے وقت اسی وقت آئے جب پہلے روز آئے تھے پھر عشاء کے وقت آئے اور اس وقت نماز پڑھی جب نصف یا تہائی رات گذر گئی۔ پھر جب صبح کی روشنی خوب پھیل گئی، اس وقت آئے اور کہا "اٹھیے نماز پڑھیے" اور فجر کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد جبرائیل نے کہا "نماز کا وقت ان دونوں (وقتوں) کے درمیان ہے" (احمد۔ نسائی۔ ترمذی)

اس حدیث کے متعلق امام بخاریؒ فرماتے ہیں "نماز کے اوقات کے متعلق یہ سب سے زیادہ صحیح روایت ہے"۔

ذیل میں ہم تمام نمازوں کے اوقات الگ الگ ذکر کرتے ہیں:

۱۔ فجر: فجر کا وقت صبح صادق کے طلوع ہونے سے لے کر سورج کے طلوع ہونے تک ہے۔ جیسا کہ اوپر حضرت جبرائیلؑ والی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

صبح کی نماز کا اوّل وقت غلس (اندھیرے) میں پڑھنا افضل ہے [۱]۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ مسلمان عورتیں صبح کی نماز نبی ﷺ کے پیچھے مسجد میں پڑھا کرتی تھیں۔ پھر جب وہ واپس ہوتی تھیں تو اندھیرے کی وجہ سے پہچانی نہ جاتی تھیں"۔

۲۔ ظہر: ظہر کی نماز کا وقت سورج کے زوال کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے [۲] اور اس وقت تک رہتا ہے جبکہ ہر چیز کا سایہ اس کے برابر (ایک مثل) ہو جائے جیسا کہ حضرت جبرائیلؑ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ [۳]

۱۔ یہ امام مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور تمام محدثین کا مسلک ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام سفیان ثوریؒ کے نزدیک صبح کے آغاز کا اسفار (جبکہ روشنی پھیل جائے پڑھنا افضل ہے۔ یعنی طلوع آفتاب سے اتنا پہلے کہ اگر کسی وجہ سے نماز دوبارہ پڑھنی پڑ جائے، تو مسنون طریقہ پر وضو کرنے اور اطمینان سے نماز پڑھنے کا وقت باقی ہو۔ ان کا استدلال حضرت رافع بن خدیجؓ کی اس روایت سے ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "صبح کی نماز کے ساتھ اسفار کیا کرو، اس لئے کہ اس میں اجر زیادہ ہے"۔ (ابو داؤد۔ احمد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)
دوسرے ائمہ جو غلس میں فجر کی نماز کو افضل مانتے ہیں، ان کے نزدیک حضرت رافع بن خدیجؓ کی اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ نماز اتنی لمبی پڑھی جائے کہ غلس میں شروع ہو اور اسفار میں ختم ہو اس لئے کہ لمبی نماز کا اجر زیادہ ہے۔ (معالم السنن ج ۱، ص ۲۴۴۔ الفقہ علی المذاہب الاربعہ بدایہ ج ۱، ص ۲۴)

۲۔ جمعہ کی نماز کے متعلق اختلاف ہے جس کا ذکر جمعہ کا باب میں آئے گا۔ ظہر کی نماز کا زوال کے بعد شروع ہونے پر سوائے حضرت ابن عباسؓ کے کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ (بدایۃ المجتہد ج ۱، ص ۷۲)

۳۔ یہ امام مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور عام محدثین کا مسلک ہے اور یہی امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ کا مسلک ہے۔ اس کی ایک روایت امام ابو حنیفہؒ سے بھی ہے، لیکن مشہور روایت میں امام صاحبؒ کا مسلک یہ ہے کہ ظہر کا وقت اس وقت تک ہے جب تک ہر چیز کا سایہ اس سے دوگنا (دو مثل) نہ ہو جائے۔ الکوکب الدری ج ۱، ص ۹۰۔۹۱) ان کا استدلال حضرت انسؓ اور حضرت ابو ذرؓ کی ان روایات سے ہے جن میں یہ بیان ہوا ہے کہ "جب گرمی ہوتی تو نبی ﷺ نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھتے تھے (بخاری و مسلم، بذل المجہود) ان روایات کا آگے ذکر آرہا ہے۔ مولانا محمد زکریا صاحب فرماتے ہیں۔ احتیاط یہ ہے کہ ظہر کو ایک مثل سے پہلے پہلے پڑھ لیا جائے۔ (الکوکب حوالہ مذکورہ)

وقت معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی کھلی اور ہموار زمین میں زوال سے پہلے ایک لکڑی گاڑدی جائے۔ اس لکڑی کا سایہ آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہو جائے گا، یہاں تک کہ زوال کے وقت کم سے کم رہ جائے گا۔ اس سائے کو ناپ لیا جائے۔ جب یہ سایہ بڑھنا شروع ہو تو وہ اس بات کی علامت ہو گا کہ زوال ہو گیا۔ پھر جب یہ سایہ اس قدر بڑھ جائے کہ لکڑی کے برابر ہو جائے (زوال کے وقت لکڑی کا اپنا سایہ اس سے وضع کرنے کے بعد) تو ایک مثل وقت ہو جائے گا اور جب دوگنا ہو جائے تو دو مثل وقت ہو جائے گا۔

اگرچہ نماز کا اوّل وقت پڑھنا افضل ہے جیسا کہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "سب سے افضل کام یہ ہے کہ نماز کو اول وقت میں پڑھا جائے۔" لیکن گرمی کے موسم میں جب گرمی سخت ہو، تو ظہر کی نماز کا اول وقت سے مؤخر کر کے پڑھنا افضل ہے:

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب سردی ہوتی تو نبی ﷺ نماز جلدی پڑھتے اور جب گرمی ہوتی، تو نماز کو ٹھنڈا کر کے (یعنی اوّل وقت سے مؤخر کر کے) پڑھتے (بخاری)

حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ ایک سفر میں نبی ﷺ کے ساتھ تھے۔ موذن نے اذان دینا چاہی، تو نبی ﷺ نے فرمایا "ٹھنڈا کرو (یعنی گرمی کم ہونے دو)"۔ پھر موذن نے اذان دینا چاہی تو حضورؐ نے فرمایا "ٹھنڈا کرو"۔ ایسا آپ نے دو یا تین مرتبہ فرمایا، یہاں تک کہ ہم نے دیکھا کہ ٹیلوں کا سایہ ہو گیا۔ پھر آپؐ نے فرمایا "گرمی کی شدت جہنم کی بھاپ سے ہے جب گرمی سخت ہو تو نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھو"۔ (بخاری و مسلم۔ ابو داؤد۔ ترمذی)

۳۔ عصر: عصر کی نماز کا وقت اس وقت شروع ہو جاتا ہے جبکہ ہر چیز کا سایہ اس کے برابر (یعنی اس کا اپنا سایہ وضع کرنے کے بعد) ہو جائے، جیسا کہ حضرت جبرائیل والی حدیث سے معلوم ہوتا ہے [1]۔ اور سورج کے غروب ہونے تک باقی رہتا ہے:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے سورج غروب ہونے سے پہلے عصر کی ایک رکعت پالی اس نے عصر کو پالیا" (بخاری۔ مسلم۔ ابو داؤد۔ نسائی۔

---

[1] یہ امام مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور عام محدثین کا مسلک ہے اور یہی مسلک امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ کا بھی ہے۔ ایک روایت میں امام ابو حنیفہؒ کا بھی یہی مسلک ہے، لیکن مشہور روایت میں امام صاحب کا مسلک یہ ہے کہ عصر کا وقت اس وقت شروع ہوتا ہے جب ہر چیز کا سایہ دوگنا ہو جائے۔ (الکوکب الدری ج ۱، ص ۹۰)

احمد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ)

عصر کا اوّل وقت (یعنی دو مثل سے پہلے) پڑھنا افضل ہے۔ا؎۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ عصر کی نماز پڑھا کرتے تھے، حالانکہ سورج ابھی بلند اور چمکتا ہوا ہوتا تھا۔ جانے والا شہر سے باہر چڑھائی کی جگہوں تک جاتا اور ان کے پاس واپس آجاتا حالانکہ اس وقت تک سورج بلندی ہی پر ہوتا۔ بعض جگہیں شہر سے چار میل دور تک ہوتی تھیں"۔ (بخاری و مسلم)

کسی عذر کے بغیر عصر کا مغرب کے قریب تک مؤخر کرنا مکروہ ہے:

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ یہ منافق کی نماز ہے۔ وہ بیٹھا سورج (کے غروب ہونے) کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان ہوتا ہے تو کھڑا ہو کر چار ٹھونگیں لگا لیتا ہے اور وہ اللہ کو بہت کم یاد کرتا ہے"(مسلم۔ احمد۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی)

۴۔ مغرب: مغرب کی نماز کا وقت سورج کے غروب ہونے سے شروع ہو کر شفق ۲؎ کے غائب ہونے تک باقی رہتا ہے:

ا؎ حنفیہ کے نزدیک عصر کا موخر کر کے (دو مثل کے بعد) پڑھنا افضل ہے۔ امام محمد فرماتے ہیں "عصر کا مؤخر کر کے پڑھنا ہمارے نزدیک اس سے افضل ہے کہ نماز اس وقت پڑھی جائے جب سورج بہت چمکدار ہو اس میں زردی نہ آئی ہو، کیونکہ عام آثار (یعنی صحابہ کے آثار) اسی طرح آئے ہیں اور یہی امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے (موطا امام محمدؒ) مولانا زکریاؒ فرماتے ہیں کہ اس میں احتیاط ہے (کوکب ج ۱ص ۹۱)

حنفیہ کا استدلال بعض دوسری احادیث سے ہے۔ مثلاً حضرت شیبانؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ مدینہ آئے تو حضورؐ عصر کی نماز مؤخر کرتے جب تک سورج سفید اور چمکدار ہوا رہتا"۔ (ابو داؤد)

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ ظہر تمھاری نسبت پہلے اور عصر تمھاری نسبت بعد میں پڑھتے تھے۔" (ترمذی۔ عمدۃ القاری)

حنفیہ ان احادیث سے عصر کا مؤخر کرنا مستحب قرار دیتے ہیں لیکن دوسرے ان میں سے بعض احادیث کو کمزور قرار دیتے ہیں اور بعض سے عصر کا مؤخر کرنے کے بجائے مقدم کرنا مستحب قرار دیتے ہیں (تحفۃ الاحوذی ج ۱، ص ۱۴۹)

۲؎ شفق کی تعریف میں اختلاف ہے۔ حنفیہ کے نزدیک شفق اس سفیدی کا نام ہے جو مغرب کی طرف سرخی کے غائب ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہے، اس لئے ان کے نزدیک مغرب کا وقت سرخی غائب ہو جانے تک ہے۔ مالکیہ شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک شفق سرخی کا نام ہے، اس لئے ان کے نزدیک مغرب کا وقت سرخی غائب ہونے تک ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۱۸۴)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "مغرب کی نماز کا وقت سورج کے غروب ہونے سے لے کر اس وقت تک ہے جب تک شفق کی سرخی غائب نہ ہو جائے"۔ (مسلم)

لیکن مغرب کی نماز کا اوّل وقت پڑھنا مستحب ہے اور اس کا بلا وجہ مؤخر کرنا مکروہ ہے جیسا کہ حضرت جبرائیل والی حدیث ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کو دونوں دن مغرب کی نماز اوّل وقت میں پڑھائی۔ نیز حضرت رافع بن خدیجؓ سے روایت ہے کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھتے تھے۔ پھر ہم میں سے کوئی شخص پلٹتا تھا، تو اپنے تیر کے گرنے کی جگہ کو دیکھ سکتا تھا۔ (مسلم)

حضرت سائب بن یزیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "میری امت کے لوگ اس وقت تک فطرت پر رہیں گے جب تک کہ وہ ستاروں کے نکلنے سے پہلے مغرب کی نماز پڑھیں گے"۔ (احمد۔ طبرانی)

یہ دونوں احادیث تمام ائمہ کے نزدیک استحباب اور فضیلت کو بیان کرتی ہیں (بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۷۳)

۵۔ عشاء: عشاء کا وقت شفق کی سرخی غائب ہونے سے شروع ہو کر تہائی یا آدھی رات[1] تک باقی رہتا ہے جیسا کہ حضرت جبرائیل والی حدیث سے معلوم ہوتا ہے، لیکن مجبوری اور عذر کی حالت میں طلوع فجر تک عشاء کی نماز پڑھی جا سکتی ہے:

حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "نیند میں تفریط نہیں۔ تفریط اس شخص پر ہے جس نے (جاگتے ہوئے جان بوجھ کر) نماز نہیں پڑھی" یہاں تک کہ اگلی نماز کا وقت ہو گیا"۔ (مسلم)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز کا وقت اگلی نماز کا وقت شروع ہو جانے تک باقی رہتا ہے، البتہ صبح کی نماز کا وقت سورج نکلنے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں سب کا اتفاق ہے۔ (بدایۃ المجتہد)

عشاء کی نماز کا ایک تہائی یا آدھی رات تک مؤخر کرنا افضل ہے:

---

[1] ؎ حدیث میں تہائی رات اور آدھی رات دونوں لفظ آئے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ، عبداللہ بن مبارکؒ سفیان ثوریؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک عشاء کا وقت آدھی رات تک ہے امام مالکؒ، احمد بن حنبلؒ اور شافعیؒ کے نزدیک تہائی رات تک یعنی بلا کراہت (المغنی ج ۱، ص ۳۹۴۔ تحفۃ الاحوذی ج ۱، ص ۱۵۴)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اگر میری امت پر دشوار نہ گذرتا تو میں انہیں حکم دیتا کہ عشاء کو تہائی یا آدھی رات تک مؤخر کر کے پڑھیں۔ (احمد۔ ابن ماجہ۔ ترمذی)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ صحابہ کرامؓ عشاء کی نماز شفق کی سرخی غائب ہونے سے لے کر تہائی رات تک پڑھا کرتے تھے"۔ (بخاری) حضورؐ عشاء کی نماز سے پہلے سونے اور بعد میں باتیں کرنے کو ناپسند فرماتے تھے:

حضرت ابوبرزہ اسلمیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ عشاء کی نماز کو مؤخر کرنا پسند فرماتے تھے اور عشاء کی نماز سے پہلے سونے اور بعد میں باتیں کرنے کو ناپسند فرماتے تھے" (بخاری۔ مسلم۔ احمد۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ۔ نسائی)۔

لیکن اگر گفتگو مفید قسم کی ہو اور صبح کی نماز سے پہلے اٹھ جانے کا اہتمام ہو تو عشاء کے بعد گفتگو کرنا جائز ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ حضرت ابوبکرؓ کے پاس رات کے وقت گفتگو فرمایا کرتے تھے اور میں ان کے پاس ہوتا تھا اور یہ گفتگو مسلمانوں کے معاملات کے متعلق ہوا کرتی تھی"۔ (احمد۔ ترمذی)

۵۔ وہ اوقات جن میں نماز پڑھنا ممنوع ہے:

پانچ اوقات میں نبی ﷺ نے نماز سے منع فرمایا ہے:

(۱۔۲) حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "عصر کی نماز کے بعد کوئی نماز نہیں، یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے اور فجر کی نماز کے بعد کوئی نماز نہیں، یہاں تک کہ سورج طلوع ہو کر بلند ہو جائے"۔ (بخاری و مسلم)

(۳۔۴۔۵) حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ہمیں تین اوقات میں نماز پڑھنے اور میت کو دفن کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔ ایک جب سورج طلوع ہو رہا ہو، یہاں تک کہ وہ بلند ہو جائے۔ دوسرے جبکہ وہ نصف النہار پر ہو یہاں تک کہ وہ جھک جائے اور تیسرے جب کہ وہ غروب ہونے کے لئے جھکے، یہاں تک کہ غروب ہو جائے"۔ (مسلم۔ ابوداؤد۔ احمد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

ان پانچ اوقات میں نماز جمہور کے نزدیک مکروہ ہے۔[1]

یہ عام حکم ہے جس سے مندرجہ ذیل صورتیں مستثنیٰ ہیں:

۱۔ جمہور کے نزدیک جس شخص نے سورج طلوع ہونے سے پہلے نماز فجر اور سورج غروب ہونے سے پہلے عصر کی ایک رکعت (اس کے رکوع و سجود کے ساتھ) پالی، اس نے وہ نماز پالی۔ وہ اسے پوری کر سکتا ہے:

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "تم میں سے اگر کوئی شخص سورج غروب ہونے سے پہلے عصر کی نماز کا ایک سجدہ۔۔ یعنی رکعت۔۔ پالے اسے اپنی نماز پوری کر لینی چاہئے۔ اور جو شخص سورج طلوع ہونے سے پہلے فجر کی نماز کا ایک سجدہ۔۔۔ یعنی رکعت۔۔۔ پالے، اسے اپنی نماز پوری کر لینی [2] چاہئے"۔ (بخاری، ترمذی)

۲۔ جو شخص سو جائے یا بھول جائے وہ ان تمام اوقات میں اپنی فرض (ادا یا قضا) نماز پڑھ سکتا ہے:

حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "۔ نیند میں کوئی تفریط نہیں۔ تفریط بیداری میں ہے۔ لہٰذا جب تم میں سے کوئی شخص اپنی نماز بھول جائے یا سو جائے تو جب اسے یاد آئے، اسے پڑھ لے۔[3]" (ترمذی۔ نسائی)

---

[1] ظاہریہ کے نزدیک ممانعت کی یہ احادیث منسوخ ہیں، اس لئے ان کے نزدیک ان تمام اوقات میں نماز کا پڑھنا جائز ہے۔ (نیل الاوطار وغیرہ)

[2] حنفیہ کے نزدیک طلوع شمس سے فجر کی نماز فاسد ہو جاتی ہے، لیکن غروب آفتاب سے (اس روز کی) عصر کی نماز فاسد نہیں ہوتی۔ امام ابو یوسفؒ کا ایک قول یہی ہے کہ طلوع شمس سے بھی فجر کی نماز فاسد نہیں ہوتی (العرف الشذی)

[3] یہ امام مالکؒ، شافعی، احمد بن حنبلؒ اور اسحاقؒ کا مسلک ہے اور اس کی روایت حضرت علیؓ سے بھی ملتی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور کوفہ کے دوسرے فقہاء کے نزدیک سونے یا بھولنے والا اگر ان اوقات میں جاگے یا اسے اپنی نماز یاد آئے، تو وہ ان کے علاوہ دوسرے اوقات میں اپنی نماز (ادا یا قضا) پڑھے گا۔ اوپر کی حدیث کے متعلق امام عینیؒ لکھتے ہیں کہ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سونے والا جونہی جاگے یا بھولنے والے کو جونہی اپنی نماز یاد آئے وہ فوراً نماز پڑھ لے۔ اس سے جو چیز معلوم ہوتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ ایسے شخص پر نماز کی قضا واجب ہے۔ لہٰذا اگر وہ اپنی نماز کو مؤخر کر کے ایسے وقت میں پڑھے جبکہ نماز کی ممانعت نہیں ہے تو وہ (اس حدیث پر) عمل کر لے گا۔" (تحفۃ الاحوذی ج ۱، ص ۱۵۸)

۳۔ جمعہ کے روز نصف النہار کے وقت نوافل کا پڑھنا جائز ہے:

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ہمیں نصف النہار کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔ مگر جمعہ کے روز" (بیہقی)۔ ابو داؤد میں حضرت ابو قتادہ سے بھی اسی مضمون کی ایک روایت آئی ہے۔ ان روایات میں اگرچہ سند کے لحاظ سے کلام ہے لیکن صحابہ کرامؓ کے عمل سے ان کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ وہ جمعہ کے روز نصف النہار کے وقت نوافل پڑھا کرتے تھے۔[1]

فائدہ (۱) حنفیہ کے نزدیک ان اوقات میں نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے (جبکہ جنازہ اسی وقت میں آئے)۔ قرآن مجید کی تلاوت کرتے اگر سجدہ آجائے تو وہ بھی ان اوقات میں کیا جا سکتا ہے۔

(۲) شافعیہ کے نزدیک ان اوقات میں ہر وہ نماز (فرض، سنت، نفل) پڑھی جاسکتی ہے جس کا کوئی سبب ہو۔ مثلاً صبح کی سنتیں اگر جماعت سے پہلے رہ جائیں تو جماعت کے بعد انہیں پڑھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ظہر یا عصر کی سنتیں اگر رہ جائیں تو انہیں عصر کی نماز کے بعد پڑھا جا سکتا ہے۔ ان کا استدلال بعض ان احادیث سے ہے جن میں یہ بیان ہوا ہے کہ نبی ﷺ عصر کی نماز کے بعد گھر پر دو رکعت نماز پڑھا کرتے تھے۔ دوسروں کے نزدیک عصر کے بعد سنتوں کا پڑھنا منسوخ ہے یا یہ صرف نبی ﷺ ہی کے ساتھ خاص تھیں۔
(صبح کی سنتوں کے متعلق مفصل بحث "سنن مؤکدہ" کے باب میں آئے گی)

۶۔ فرض نمازوں کی قضا:

اگر کوئی شخص بھول جائے یا سو جائے اور اس طرح فرض نماز کا وقت گزر جائے، تو بعد میں اس کی قضا ضروری ہے۔ اس پر تمام امت کا اتفاق ہے۔ (بدایۃ المجتہد ج ۱، ص ۱۴۲)
نبی ﷺ کا ارشاد ہے "نیند میں کوئی کوتاہی نہیں ہے۔ کوتاہی صرف بیداری میں ہے

---

[1] یہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا مسلک ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک اہل مدینہ کے عمل کی وجہ سے باقی دنوں میں بھی نصف النہار کے وقت نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک جمعہ کے روز نصف النہار کے وقت صرف تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں پڑھی جاسکتی ہیں۔ جب کہ امام اس وقت خطبہ دے رہا ہو عام نوافل نہیں پڑھے جاسکتے۔ حنفیہ میں سے امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جمعہ کے روز نصف النہار کے وقت نوافل کا پڑھنا جائز ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے دوسرے اصحاب کے نزدیک ناجائز۔

،۔ لہٰذا تم میں اگر کوئی شخص کسی نماز سے سو جائے یا اسے بھول جائے، تو جب اسے یاد آئے وہ اسے پڑھ لے"۔

اگر کوئی شخص قصداً اپنی نمازیں چھوڑ دے، تو جمہور (جن میں ائمہ اربعہ شامل ہیں) کے نزدیک وہ گنہگار بھی ہوگا اور بعد میں اس پر قضا بھی ضروری ہے[1]۔

فرض نماز کے علاوہ وتر، سنتوں اور نوافل کی قضا کے متعلق بحث کتاب کے آئندہ صفحات میں ہر نماز کے اپنے باب میں آئے گی۔

۷۔ نماز کے اوقات کے متعلق بعض ضروری مسائل:

۱۔ اکثریتِ سلف کے نزدیک صبح کی اذان اور فرض نماز کے درمیان سوائے دو رکعت سنتوں کے کوئی نماز نہیں ہے:

حضرت یسارؒ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابن عمرؓ نے مجھے صبح کی اذان کے بعد نماز پڑھتے دیکھا تو فرمایا ایک مرتبہ ہم لوگ اسی وقت نماز پڑھ رہے تھے کہ نبی ﷺ تشریف لائے۔ ہمیں دیکھ کر فرمایا "تمہارا شاہد تمہارے غائب کو یہ بات پہنچادے کہ صبح ہو جانے کے بعد سوائے دو رکعت (سنتوں) کے کوئی نماز نہیں ہے۔ (احمد۔ ابوداؤد)

اس روایت میں اگرچہ سند کے لحاظ سے کلام ہے لیکن دوسری روایات کے ملنے سے قوی ہو جاتی ہے[2]۔

۲۔ جماعت کھڑی ہو جائے تو نوافل اور سنتوں کا پڑھنا جائز نہیں:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب جماعت کھڑی ہو جائے تو سوائے فرض نماز کے کوئی نماز نہیں"۔ (مسلم۔ احمد۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ ترمذی۔ ابوداؤد[3])

۱۔ امام ابن حزمؒ اور دوسرے ظاہریہ کے نزدیک ایسا شخص گنہگار تو ہوگا، لیکن اس پر قضا ضروری نہیں ہے، کیونکہ یہ ناممکن ہے ایسے شخص کو چاہیے کہ وہ مختلف نیک کاموں کے ذریعے توبہ و استغفار کرتا رہے۔ (بدایۃ المجتہد ج ۱، ص ۱۴۲)

۲۔ امام شافعیؒ حسن بصریؒ اور ابن حزم کے نزدیک (اس روایت کے معتبر نہ ہونے کی وجہ سے) صبح کی اذان اور فرض نماز کے درمیان نوافل کا پڑھنا جائز ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک اگر کسی عذر کی بنا پر وتر رہ جائیں تو فجر کے بعد انہیں پڑھا جا سکتا ہے۔ (نیل الاوطار)

۳۔ حنفیہ کے نزدیک صبح کی سنتیں جماعت کے کھڑے ہونے کے باوجود دور فاصلہ پر پڑھی جا سکتی ہیں، جب کہ جماعت کے ختم ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ مفصل بحث "سنن موکدہ" کے باب میں آئے گی۔

اذان اور اقامت

ا۔اذان کا وجوب اور فضیلت :

اذان اور مؤذن کی فضیلت میں متعدد احادیث آئی ہیں جن میں سے ہم صرف دو کو بیان کرتے ہیں :

ا۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اگر لوگوں کو معلوم ہو تا کہ اذان اور پہلی صف میں کیا۔۔۔ ثواب۔۔۔ہے تو پھر وہ قرعہ ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہ پاتے تو قرعہ ڈالا کرتے۔ اور اگر انہیں معلوم ہو تا کہ ظہر کی نماز کے لئے جلدی جانے میں کیا۔۔ ثواب۔۔ ہے، تو وہ اس کی طرف آنے میں مسابقت کرتے۔ اور اگر انھیں معلوم ہو تا کہ عشاء اور صبح کی نماز میں کیا۔۔۔ ثواب۔۔۔ ہے، اور پھر اگر انہیں رینگ کر بھی آنا پڑ تا تو وہ ضرور آتے" (بخاری)

۲۔ حضرت ابو درداؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا" جو تین آدمی اذان کہہ کر جماعت سے نماز نہیں پڑھتے، شیطان ان پر غالب آچکا ہو تا ہے"۔ (مسند امام احمد)

۲۔اذان کے کلمات :

حدیث میں اذان کا ذکر تین طریقوں سے آیا ہے :

ا۔ اللہ اکبر چار مرتبہ اور سوائے آخر میں لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللہُ کے باقی کلمات دو دو مرتبہ۔ حضرت عبداللہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ جب نبی ﷺ نے نماز کے لئے لوگوں کو سنکھ کے ذریعہ جمع کرنے کا حکم دیا تو ایک رات میں سو رہا تھا کہ خواب میں ایک آدمی آکر میرے گرد گھومنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سنکھ تھا۔

میں نے اس سے پوچھا اے اللہ کے بندے! کیا تم یہ سنکھ بیچو گے ؟ اس نے پوچھا "تم اس سے کیا کرو گے "؟ میں نے کہا" ہم اس سے لوگوں کو نماز کی طرف بلائیں گے" کہنے لگا"

کیا میں تمھیں اس سے بہتر طریقہ نہ بتاؤں"؟ میں نے کہا ضرور بتاؤ" کہنے لگا تم یہ کہو:

اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ۔ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ، اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ، حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ، حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ۔ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ۔

اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب بڑا ہے اللہ سب بڑا ہے، اللہ سب بڑا ہے، میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں، میں شہادت دیتا ہوں محمد اللہ کے رسول ہیں میں شہادت دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، آؤ نماز کی طرف آؤ نماز کی طرف۔ آؤ کامیابی کی طرف، آؤ کامیابی کی طرف۔ اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں

وہ شخص ذرا پیچھے ہٹا اور پھر کہنے لگا" جب نماز کھڑی ہو تو یوں کہو (یعنی اقامت کے لئے):

اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ، اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ، حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ۔ قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ۔۔۔

اللہ سب بڑا ہے، اللہ سب بڑا ہے میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی الہٰ نہیں، میں شہادت دیتا ہوں محمد اللہ کے رسول ہیں، آؤ نماز کی طرف۔ آؤ کامیابی کی طرف، نماز کھڑی ہو گئی۔ نماز کھڑی ہو گئی، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں،

جب صبح ہوئی تو میں نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا یہ خواب بیان کیا۔ آپ نے فرمایا" انشاء اللہ یہ سچا خواب ہے۔ بلالؓ کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور جو الفاظ تم نے خواب میں سنے ہیں انہیں کہتے رہو تاکہ وہ اذان دیں، اس لئے کہ ان کی آواز تم سے بلند ہے" میں حضرت بلالؓ کے ساتھ کھڑا ہوا اور انہیں کہتا رہا اور وہ اذان دیتے رہے" حضرت عمرؓ نے جب یہ آواز سنی تو وہ اپنے گھر میں تھے۔ اپنی چادر گھسیٹتے ہوئے آئے اور فرمانے لگے" اللہ کے

رسول! مجھے اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا ہے" اس پر نبی ﷺ نے فرمایا "فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ" (مسند امام احمدؒ)

۲۔ اللہ اکبر کو چار مرتبہ کہنا اور اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ اور اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللہِ کو ترجیع (دوہرانا) کے ساتھ کہنا۔ یعنی پہلے ایک مرتبہ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ ، اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ ۔اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللہِ ۔اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللہِ کو پست آواز سے کہنا، پھر انھیں بلند آواز سے دہرانا۔ حضرت ابو محذورہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے انھیں اذان کے ۱۹ کلمات (یعنی ترجیع کے ساتھ سکھائے ۱"۔ (احمد۔ ابو داؤد۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

۳۔ اللہ اکبر کو صرف دو مرتبہ اور پھر اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ اور اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللہِ کو ترجیع کے ساتھ کہنا۔ حضرت ابو محذورہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے انھیں یوں اذان سکھائی: "اَللہُ اَکْبَرُ، اَللہُ اَکْبَرُ ۔اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ ۲۔" (مسلم)

صبح کی اذان میں حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ، حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ کے بعد اور اللہ اکبر، اللہ اکبر سے پہلے دو مرتبہ اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، (نماز نیند سے بہتر ہے) کہنا چاہیے۔ حضرت ابو محذورہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ کی خدمت میں عرض کیا، یارسول اللہ! مجھے اذان کی سنت سکھایئے"۔ تو آپؐ نے انھیں اذان سکھائی اور فرمایا "اگر صبح کی نماز ہو تو یوں کہو "اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ" مِّنَ النَّوْمِ، اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ" مِّنَ النَّوْمِ۔ اَللہُ اَکْبَرُ، اَللہُ اَکْبَرُ۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ (احمد۔ ابو داؤد)

۴۔ اقامت کے کلمات:

اقامت کے کلمات کا ذکر حدیث میں دو طریقوں سے آیا ہے:

۱۔ اللہ اکبر کو چار مرتبہ اور آخری لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کے سوا باقی تمام کلمات کو دو دو بار کہنا:
حضرت ابو محذورہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے انھیں اقامت کے سترہ کلمات سکھائے

۱۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور جمہور محدثین ترجیع کو مستحب مانتے ہیں۔ حضرت عبداللہ کی وجہ سے حنفیہ اور حنابلہ ترجیع کو مستحب نہیں مانتے (المغنی ...... ج ۱، ص ۴۱۲۔ نیل الاوطار ج ۲، ص ۳۲)

۲۔ امام مالکؒ کا اسی حدیث پر عمل ہے (سبل السلام ج ۱، ص ۱۸۴)

اَللّٰہ اَکْبَرُ، چار مرتبہ، اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دو مرتبہ، اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ دو مرتبہ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ دو مرتبہ قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ دو مرتبہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ دو مرتبہ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ایک مرتبہ ا؎"۔ (احمد۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)۔

۲۔ شروع اور آخر میں اَللّٰہُ اَکْبَرُ کو اور قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃ، کو دو دو مرتبہ کہنا اور باقی کلمات کو ایک ایک مرتبہ، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن زیدؓ کی مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے نیز:

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضرت بلالؓ کو حکم دیا گیا اذان دوہری اور اقامت اکہری کہیں، سوائے قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃ کے۔ (بخاری۔ مسلم۔ احمد۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

۴۔ اذان کا جواب:

جو شخص اذان سنے، اس کے لئے مؤذن کے ساتھ اذان کے کلمات کا دوہرانا اور جب مؤذن حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ یا حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ کہے، تو لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ، کہنا مستحب ہے:

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے سچے دل سے ایسا کیا وہ جنت میں داخل ہو گیا"۔ (مسلم ابوداؤد)۔

صبح کی اذان میں اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ" مِّنَ النَّوْمِ کے جواب میں کسی الفاظ کے کہنے کا حدیث میں ذکر نہیں ہے ۲؎۔ (سبل السلام۔ تحفۃ الاحوذی ج ا، ص ۱۸۳)

۵۔ اذان کے بعد دعا:

اذان کے ختم ہونے کے بعد نبی ﷺ پر درود بھیجنا اور اللہ تعالیٰ سے آپ کے لئے وسیلہ

ا۔ امام ابو حنیفہؒ، امام سفیان ثوریؒ، ابن المبارکؒ اور کوفہ کے دوسرے فقہاء کا اسی پر عمل ہے (سبل السلام ج ا، ص ۱۸۵)

ا۔ امام شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور عام محدثین کا عمل اسی کے مطابق ہے۔ امام مالک کے نزدیک اہل مدینہ کے عمل کی وجہ سے قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ بھی ایک ہی مرتبہ ہے
(نیل الاوطار ج ا، ص ۴۴) (الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

۲۔ حنفیہ، حنبلیہ اور شافعیہ کے نزدیک صبح کی اذان میں اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ" مِّنَ النَّوْمِ کے جواب میں صَدَقْتَ وَبَرِرْتَ (تو نے سچ کہا اور نیکی کا کام بتایا) کہنا مستحب ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا، ص ۲۷۳)

طلب کرنا چاہئے۔ حضرت جابرؓ سے روایت کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو شخص اذان سن کر یہ دعا پڑھتا ہے قیامت کے روز اس کے لئے میری شفاعت ضروری ہو جاتی ہے :

اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَ	اے اللہ! اے اس مکمل پکار اور کھڑی
الصَّلٰوةِ الْقَائِمَةِ اٰتِ مُحَمَّدَنِ الْوَسِيْلَةَ	ہونے والی نماز کے رب! محمد (ﷺ) کو
وَالْفَضِيْلَةَ وَ ابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَ	وسیلہ[1] اور فضیلت عطا فرما اور انہیں
نِ الَّذِيْ وَعَدْتَّهٗ (بخاری)	مقام محمود کی طرف اٹھا جس کا تو نے وعدہ کیا ہے"

۶۔ اذان اور اقامت کے درمیان دعا کی فضیلت :

اذان اور اقامت کے درمیانی وقت میں دعا جلد قبول ہوتی ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اذان اور اقامت کے درمیان دعا رد نہیں کی جاتی (احمد۔ ابو داؤد۔ نسائی۔ ترمذی) ترمذی کی روایت میں (جو کتاب الدعوات میں ہے) یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ حضرت انسؓ نے پوچھا "یا رسول اللہ! تو ہم کیا دعا کریں؟ فرمایا "اللہ تعالیٰ سے دنیا و آخرت میں معافی اور عافیت طلب کرو"۔

۷۔ اقامت کا جواب :

جو شخص اقامت سنے، اس کے لئے مستحب ہے کہ وہ بھی اقامت کے کلمات دہرائے حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ اور حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کے وقت لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ[1] اور قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوةِ کے وقت اَقَامَهَا اللّٰهُ وَ اَدَامَهَا (اللہ اسے قائم رکھے اور ہمیشہ رکھے) کہے۔ حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ حضرت بلالؓ اقامت کہنے لگے اور جب وہ قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوةِ پر پہنچے تو نبی ﷺ نے فرمایا "اَقَامَهَا اللّٰهُ وَاَدَامَهَا" اور باقی اقامت کے وقت آپ نے وہی الفاظ کہے جو اذان کے وقت کہے جاتے ہیں"۔ (ابو داؤد)

اگرچہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی مجہول ہے (نیل الاوطار ج ۲، ص ۵۴)

---

[1] امام مالکؒ کے نزدیک حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ اور حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کے وقت بھی یہی الفاظ دوہرائے جائیں گے (دیکھئے حاشیہ صفحہ گذشتہ)

۸ مؤذن کی صفات :

مؤذن کیلئے مندرجہ ذیل امور مستحب ہیں :

۱۔ اُجرت نہ لینا : حضرت عثمان بن ابی العاصؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے اپنی قوم کا امام بنا دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا "تم اس کے امام ہو۔ تم کمزور کا خیال رکھو اور ایسا مؤذن مقرر کرو جو اپنی اذان پر اجرت نہ لے" (ابو داؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ۔ نسائی)

صحابہ اور اکثر اہل علم نے اذان پر اجرت لینے کو ناپسند کیا ہے۔[۱] (ترمذی)

۲۔ باوضو ہونا : حضرت مہاجر بن قنفذؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "مجھے کسی چیز نے اس کے سلام کا جواب دینے سے نہیں روکا، مگر میں نے یہ ناپسند کیا کہ بغیر پاکی کے اللہ تعالیٰ کا ذکر کروں (احمد۔ ابو داؤد۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

۳۔ قبلہ رخ کھڑا ہونا : اس چیز پر سب کا اتفاق ہے کہ اذان کے لئے قبلہ رخ کھڑا ہونا سنت ہے، کیونکہ نبی ﷺ کے دونوں مؤذن ہمیشہ اذان کے لئے قبلہ رخ کھڑے ہوا کرتے تھے۔

۴۔ حَيَّ عَلَى الصَّلٰوة اور حَيَّ عَلَى الْفَلَاح کہتے وقت، سر گردن اور سینے کو دائیں اور بائیں طرف گھمانا : حضرت ابو جحیفہؓ فرماتے ہیں حضرت بلالؓ نے اذان کہی۔ میں ان کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ انہوں نے حَيَّ عَلَى الصَّلٰوة اور حَيَّ عَلَى الْفَلَاح کہتے ہوئے اپنے چہرے کو دائیں اور بائیں طرف گھمایا۔ (احمد۔ بخاری۔ مسلم)

۵۔ دونوں کانوں میں انگلیاں لینا : حضرت بلالؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی دونوں انگلیاں اپنے کانوں میں لے لیں اور اذان کہی" (ابو داؤد۔ ابن حبان) امام ترمذی لکھتے ہیں کہ اہل علم نے اس چیز کو پسند کیا ہے کہ مؤذن اذان کے وقت اپنی دو انگلیاں کانوں میں لے"۔

۶۔ بلند آواز سے اذان کہنا خواہ انسان تنہا ہو : حضرت ابو سعید خدریؓ نے حضرت ابو صعصعہؓ سے فرمایا"۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں بکریوں اور جنگل سے بہت محبت ہے۔ جب تم اپنی بکریوں کے ساتھ جنگل میں ہو تو بلند آواز سے اذان کہو اس لئے کہ جہاں تک مؤذن کی

۱۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اذان پر اجرت کی شرط کرنا حرام ہے، امام مالک کے نزدیک اجرت لینے میں کوئی حرج نہیں (نیل الاوطار ج ۲، ص ۴۹)

آواز پہنچتی ہے وہاں تک جو جن اور انسان اس کی اذان سنتا ہے وہ قیامت کے روز اس کے لئے شہادت دے گا۔ میں نے نبی ﷺ کو خود ایسا ہی فرماتے سنا ہے"۔ (بخاری۔ احمد۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

۷۔ اذان کا ٹھہر ٹھہر کر کہنا: متعدد احادیث سے اس کا مستحب ہونا ثابت ہے۔

۸۔ بلند مقام پر اذان دینا: حضرت عروہ بن زبیرؓ بنی نجار کی ایک عورت سے روایت کرتے ہیں کہ "میرا گھر مسجد کے ارد گرد تمام گھروں سے اونچا تھا۔ حضرت بلالؓ اس پر کھڑے ہو کر فجر کی اذان کہا کرتے تھے"۔ (ابوداؤد)

۹۔ اذان اور اقامت کے درمیان وقفہ:

احادیث سے اذان اور اقامت کے درمیان وقفہ کی کوئی معین مقدار ثابت نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن مغفل مزنیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہر اذان اور نماز کے درمیان نماز ہے، ایسا آپ نے تین مرتبہ فرمایا" (بخاری)

حضرت جابر بن سمرةؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے مؤذن اذان کے بعد ٹھہر جایا کرتے تھے اور اس وقت تک اقامت نہ کہتے تھے جب تک وہ نبی ﷺ کو باہر آتے نہ دیکھ لیتے۔ جب وہ آپؐ کو دیکھ لیتے تو اقامت کہتے۔" (احمد۔ مسلم۔ ابوداؤد، ترمذی)

لیکن ان احادیث سے اور بعض دوسری احادیث سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہر اذان اور اقامت کے درمیان اتنا وقفہ ضرور ہونا چاہئے کہ نمازی استنجا اور وضو وغیرہ سے فارغ ہو لیں۔[1]

۱۰۔ اقامت اور نماز کے درمیان وقفہ:

اقامت اور نماز کے درمیان بات کرنا جائز ہے۔ اس کے بعد دوبارہ اقامت نہیں کہی جائے گی۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک دن اقامت کہی گئی اور نبی ﷺ مسجد کے ایک کونے میں ایک شخص سے گفتگو فرما رہے تھے۔ آپؐ اپنی جگہ سے نماز کے لئے نہیں اُٹھے

---

[1] حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک مغرب کی اذان اور اقامت کے درمیان صرف اتنا وقفہ ہونا چاہئے کہ قرآن پاک کی تین آیتیں تلاوت ہو سکیں۔ باقی نمازوں میں نمازیوں کے آنے کا انتظار کر لینا چاہئے۔
(الفقہ..... ج ا، ص ۳۲۴)

یہاں تک کہ لوگوں کو نیند آنے لگی (بخاری)۔ دوسری روایت میں ہے کہ ایک روز اقامت ہو چکی تھی کہ نبی ﷺ کو یاد آیا کہ آپ کو غسل کرنا ہے۔ آپؐ نے گھر جا کر غسل فرمایا، پھر واپس آکر بغیر اقامت کے نماز پڑھائی۔" (بخاری)

۱۱۔ اذان کے بعد مسجد سے نکلنا :

اذان کے بعد بغیر عذر کے یا دوبارہ نہ آنے کے ارادے سے مسجد سے نکلنا ممنوع ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ہمیں حکم دیا جب تم مسجد میں موجود ہو اور اذان ہو جائے تو تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھے بغیر مسجد سے نہ نکلے"۔ (احمد)

۱۲۔ ایک ہی شخص کا اذان اور اقامت کہنا :

حضرت زیاد بن حارث صدائیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مجھے اذان کہنے کا حکم دیا۔ میں نے اس وقت جب صبح کی روشنی ہو چکی تھی، اذان کہی جب نبی ﷺ وضو فرما چکے تھے تو نماز کے لئے کھڑے ہوئے۔ حضرت بلالؓ نے اقامت کہنا چاہی تو نبی ﷺ نے فرمایا زیاد اقامت کہے گا، اس لئے جو شخص اذان کہے اقامت بھی وہی کہے گا، (احمد۔ ابو داؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ۔ نسائی)

یہ حدیث اگرچہ کمزور ہے لیکن امام ترمذیؒ فرماتے ہیں اس پر اکثر اہل علم کا عمل ہے۔ لیکن ایسا کرنا بہتر ہے، ضروری نہیں۔ اگر مؤذن کے بجائے کوئی دوسرا شخص اقامت کہہ دے تو تمام ائمہ کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہے (بدایۃ المجتہد ج۱، ص ۱۰۱)

نماز کی شرائط[1]

نماز کی مندرجہ ذیل شرائط ہیں :

ا۔وقت :

چونکہ کوئی نماز اپنے وقت سے پہلے نہیں پڑھی جاسکتی ، اس لئے یہ معلوم کر لیناضروری ہے کہ نماز کاوقت ہو چکاہے کہ نہیں۔اللہ تعالیٰ کاارشاد ہے :

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتَابًا مَّوۡقُوۡتًا۔ (نساء-۱۰۳) نماز کو اہل ایمان پر پابندی وقت کے ساتھ فرض کیا گیاہے

۲۔وضو :

اللہ تعالیٰ کاارشاد ہے :

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَاقُمۡتُمۡ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغۡسِلُوۡاوُجُوۡھَکُمۡ...... اے ایمان لانے والو! جب تم نماز کے لیے کھڑے ہونے لگو تو اپنے چہرے دھولیاکرو. (یعنی وضو کرلیاکرو)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا"اللہ تعالیٰ کوئی نماز بغیر پاکی (وضو)اور کوئی صدقہ مالِ غنیمت کی چوری سے قبول نہیں کرتا"۔(بخاری۔ مسلم۔احمد ۔ابوداؤد۔ترمذی۔ نسائی۔ابن ماجہ)

۳۔بدن، کپڑے اور زمین کاپاک ہونا :

جس زمین پر انسان نماز پڑھے ،اگر وہ ناپاک ہو یااس کے بدن یاکپڑے کو نجاست لگی ، ہو تواس کی نماز نہیں ہوگی۔

---

[1] نماز کی شرائط سے مراد وہ چیزیں ہیں جو نماز کے لئے ضروری ہیں اوران کے بغیر نماز نہیں ہوسکتی فرض اور شرائط میں فرق یہ ہے کہ فرض نماز کاجز ہوتا ہے اور شرط اس کاجز نہیں ہوتی۔

یہ حدیث پہلے گذر چکی ہے کہ ایک بدو نے مسجد میں پیشاب کر دیا تو نبی ﷺ نے اس کے پیشاب کی جگہ پانی بہانے کا حکم دیا (دیکھئے صفحہ ۴۴)

نیز حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "پیشاب سے (یعنی اس کے چھینٹوں کے جسم یا کپڑے پر پڑ جانے سے) صفائی اختیار کرو۔ اس لئے کہ قبر کا عذاب عموماً اسی وجہ سے ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (اور اپنے کپڑوں کو پاک کرو)۔ حضرت جابر بن سمرۃؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ سے دریافت کیا "کیا میں ان ہی کپڑوں میں نماز پڑھ لوں جن میں اپنی بیوی کے پاس جاتا ہوں؟"۔ فرمایا "ہاں إلاّ یہ کہ تم ان میں کوئی نجاست پاؤ تو اسے پاک کرلو"۔ (احمد۔ ابن ماجہ)

۴۔ ستر:

اس پر تمام ائمہ سلف کا اتفاق ہے کہ نماز میں مرد اور عورت دونوں کا اپنی شرم گاہ کا ڈھانپنا ضروری ہے۔ (بدایۃ المجتہد ج ۱، ص ۸۹):

حضرت سلمہ بن اکوعؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا "کیا میں (صرف) اپنے کرتے میں نماز پڑھ لوں"؟ فرمایا "اس کو بٹن لگالو، خواہ ایک کانٹے ہی کے ساتھ (یعنی اپنی شرم گاہ کو بہر حال چھپالو)" (ابو داؤد)

آدمی کے لئے ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ شرم گاہ میں داخل ہے اور نماز میں اس حصہ کا ڈھانپنا ضروری ہے:

حضرت جرہدؓ سے روایت ہے کہ میں ایک چادر اوڑھے بیٹھا تھا اور میری رانیں ننگی تھیں۔ اتنے میں نبی ﷺ میرے پاس سے گذرے اور مجھ سے فرمایا "اپنی رانوں کو ڈھانپ لو، اس لئے کہ رانیں شرم گاہ کا حصہ ہیں[۱]"۔

۱۔ امام شافعیؒ ابن حزمؒ اور بعض دوسرے آئمہ سلف کے نزدیک آدمی کی ناف، ران اور گھٹنا شرم گاہ میں داخل نہیں ہیں ان کا استدلال حضرت انسؓ کی روایت سے ہے کہ خیبر کے روز نبیؐ نے اپنی ران کھولی، یہاں تک کہ گویا میں اب بھی آپ کی ران کی سپیدی کو دیکھ رہا ہوں (بخاری۔ احمد) دوسروں کے نزدیک اس موقع پر نبیؐ کے ران کھولنے کی وجہ کوئی نہ کوئی عذر یا ضرورت تھی اور ضرورت کے وقت ران، ناف اور گھٹنوں کا کھولنا جائز ہے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں حضرت انسؓ کی روایت (اگرچہ) سند کے لحاظ سے زیادہ قوی ہے لیکن حضرت جرہدؓ کی روایت میں زیادہ احتیاط ہے۔"

(احمد۔ ابو داؤد۔ ترمذی۔ مالک۔ تعلیقات امام بخاریؒ)

ہاتھوں اور چہرے کے علاوہ عورت کا سارا جسم شرم گاہ ہے۔ اس لئے عورت کے لئے نماز میں چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ سارے جسم کا ڈھانپنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلاَ یُبْدِیْنَ زِیْنَتَھُنَّ اِلاَّ مَا ظَھَرَ مِنْھَا عورتوں کو اپنی زینت ظاہر نہ کرنی چاہیئے مگر وہ جو ظاہر ہو جائے۔ ا؎

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کسی بالغ عورت کی نماز دوپٹے کے بغیر (یعنی ننگے سر) قبول نہیں فرماتا"۔ (احمد۔ ابو داؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ)

آدمی کے لئے صرف ایک کپڑے میں نماز پڑھنا جائز ہے، جیسا کہ اوپر حضرت سلمہ بن اَکْوَعْ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے لیکن دو یا دو سے زیادہ کپڑوں میں نماز کا پڑھنا بہتر ہے ۲؎۔ جہاں تک ہو سکے، نماز کے وقت زینت اختیار کرنی چاہیے:

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھے تو اسے دو کپڑوں میں نماز پڑھنی چاہیئے اور اگر اس کے پاس دو کپڑے نہ ہوں، تو

ا؎ یہ اکثر علمائے سلف (جن میں امام مالکؒ اور شافعیؒ شامل ہیں) کا یہی مسلک ہے اور اسی کی روایت حضرت عباسؓ، ابنِ عمرؓ اور عائشہؓ سے آئی ہے۔ ان کا استدلال یہ کہ اوپر کی آیت میں "مَاظَھَرَ" سے مراد چہرہ اور دونوں ہاتھ ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک چہرہ اور ہاتھوں کے علاوہ عورت کے لئے پاؤں کا اوپر کا حصہ بھی کھولنے کی اجازت ہے، اس لئے کہ یہ بھی عام طور پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک چہرے کے سوا عورت کا سارا جسم شرمگاہ ہے ــــــــ سلف میں بعض کے نزدیک عورت کا پورا جسم شرمگاہ ہے۔ ان کا استدلال نبی ﷺ اس حدیث سے ہے کہ آپ نے فرمایا عورت شرمگاہ ہے۔ امام احمدؒ اس سے صرف چہرے کو امام مالکؒ اور شافعیؒ ہاتھوں اور چہرے کو امام ابو حنیفہؒ چہرے، ہاتھوں اور پاؤں کے اوپر کے حصے کو مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ (المغنی ج ا، ص ۷ ۶۳۔ بدایۃ المجتہد ج ا، ص ۸۹)

لیکن واضح رہے کہ حنفیہ کے نزدیک ہاتھوں کی ہتھیلیاں اور پاؤں کے نیچے کا حصہ شرمگاہ میں شامل ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا، ص ۱۸۹)

۲؎ امام احمد کے نزدیک اگر دو کپڑے موجود ہوں تو ایک کپڑے میں نماز جائز نہیں ہے۔ (نیل الاوطار ج ۲، ص ۵۶)

اسے چاہیئے کہ اپنے کپڑے کا تہبند بنا لے اور اسے نماز میں یہودیوں کی طرح جسم پر کپڑا نہیں لپیٹ نہ لینا چاہیئے۔"(طبرانی، بیہقی)۔

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر انسان ایک کپڑے میں نماز پڑھے تو اس کے کندھوں پر کپڑے کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہونا چاہیئے:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "تم میں کوئی شخص ایک کپڑے میں اس طرح نماز نہ پڑھے کہ اس کے مونڈھوں پر اس کپڑے کا کوئی حصہ نہ ہو" (بخاری و مسلم) لیکن جمہور کے نزدیک یہ ممانعت تنزیہی ہے، مونڈھوں پر کپڑے کا ہونا بہتر ہے، ضروری نہیں ا ۔ ا۔ الفتح الربانی ج ۳ ص ۹۵)

فائدہ: مذاہب اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ ستر پوشی کے لئے کپڑا موٹا ہونا چاہیئے۔ ایسا کپڑا جس سے جلد کا رنگ نظر آئے، اس سے ستر پوشی نہیں ہوتی۔
(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا ص ۱۶۵)

۵۔ استقبال قبلہ:

نماز کے لئے قبلہ رُخ ہونا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (بقرہ)

تو تم مسجد حرام کی طرف اپنا رُخ پھیر لو اور جہاں کہیں تم ہو، اسی کی طرف منہ (کر کے نماز پڑھا) کرو۔

جو شخص کعبہ کے سامنے ہو اور اسے دیکھ رہا ہو، اس کے لئے عین کعبہ کی طرف رُخ کرنا ضروری ہے ۲۔، لیکن جو شخص کعبہ کے سامنے نہ ہو اور اسے دیکھ نہ رہا ہو، اس کے لئے کعبہ کی سمت رُخ کرنا ضروری ہے، عین کعبہ کی طرف رُخ ضروری نہیں:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا مشرق و مغرب کے مابین قبلہ ہے"۔ (ترمذی۔ ابن ماجہ)

ا۔ امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ اور شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک مونڈھے کا ڈھانپنا شرم گاہ کی طرح ضروری ہے، البتہ اگر کپڑا بہت چھوٹا ہو اس سے شرم گاہ کو ڈھانپ کر ننگے مونڈھے نماز پڑھی جا سکتی ہے۔
(المغنی ج ا ص ۶۱۸)

۲۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے (بدایۃ المجتہد ج ا ص ۸۶)

[یہ حکم مدینہ منورہ کے محلِ وقوع کے لحاظ سے ہے۔ ہمارے ملک کے لحاظ سے اسے یوں کہا جائے گا کہ شمال و جنوب کے مابین قبلہ ہے]

اگر انسان ایسی جگہ ہو جہاں اسے بادل یا اندھیرے کی وجہ سے قبلہ معلوم نہ ہو سکتا ہو اور نہ کوئی شخص اسے بتانے والا موجود ہو، تو اسے اپنے گمانِ غالب کے مطابق نماز پڑھ لینی چاہئے۔ اگر بعد میں اسے معلوم ہو اس نے غلط سمت نماز پڑھی تو اس پر نماز کا دُہرانا ضروری نہیں:

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ ہم نے نبی ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں بادلوں کے روز غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھ لی۔ جب نماز ختم ہوئی اور دھوپ نکلی، تو ہم نے نبی ﷺ سے عرض کیا کہ ہم نے غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھ لی۔ آپ نے فرمایا تمہاری نماز اپنے حق کے ساتھ اللہ کی طرف اٹھالی گئی۔" (طبرانی)

اسی معنی کی ایک روایت ترمذی میں بھی ہے جو اگرچہ سنداً کمزور ہے۔ ا۔

اگر نماز کے درمیان صحیح سمت معلوم ہو جائے، تو اسی حالت میں قبلہ کی طرف رُخ کر لینا چاہئے:

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ لوگ قبا میں صبح کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص نے آکر خبر دی کہ نبی ﷺ پر قرآن نازل ہوا ہے اور آپ کو کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی وقت تمام لوگوں نے کعبہ کی طرف رُخ کر لیا۔ اس وقت وہ شام کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ رہے تھے۔" (بخاری و مسلم)

استقبالِ قبلہ کا وجوب دو صورتوں میں ساقط ہو جاتا ہے:

۱۔ سفر میں گھوڑے یا اونٹ وغیرہ پر سوار ہونے کی حالت میں غیر فرض نماز پڑھنے کے وقت ۲۔ حضرت عامر بن ربیعہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ جس رُخ

۱۔ اکثر ائمہ سلف کا یہی مسلک ہے اور یہی مسلک حنفیہ کا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک یہ حدیث قابل حجت نہیں، اس لئے اگر کوئی شخص غلطی سے غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھ لے تو بعد میں وہ اپنی نماز دہرائے گا، کیونکہ قبلہ کی طرف نماز پڑھنا ضروری ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۱ ص ۲۸۰) امام مالکؒ کے نزدیک نماز کا دہرانا مستحب ہے (بدایۃ المجتہد ج ۱، ص ۷۸ فتح القدیر ج ۱، ص ۱۱)

۲۔ امام نوویؒ وغیرہ نے اس بارے میں سلف کا اجماع نقل کیا ہے لیکن حضرت انسؓ کی ایک دوسری حدیث جس میں ہے کہ جب نبی ﷺ اپنی سواری پر نماز پڑھنے کا ارادہ کرتے تو قبلہ رُخ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

آپ کی سواری جاتی تھی، آپ اسی طرف نماز پڑھتے تھے"۔ (بخاری و مسلم) بخاری کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں آپ اپنے سر سے اشارہ کرتے تھے لیکن فرض نماز میں آپ ایسا نہ کرتے تھے"۔

البتہ فرض نماز کا کسی مجبوری کے بغیر نہ سواری پر (گھوڑا اور اونٹ وغیرہ) پڑھنا جائز ہے اور نہ قبلہ کے علاوہ کسی دوسری سمت ا۔

۲۔ خوف اور مجبوری کی حالت میں : نبی ﷺ کا ارشاد ہے "جب میں تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو جتنا تم اسے کرنے کی طاقت رکھتے ہو، کرو"۔ اللہ کا ارشاد ہے

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالاً اَوْ رُکْبَاناً ۔ اگر تم خوف کی حالت میں ہو تو پیدل یا سوار جس طرح ہو سکے نماز پڑھو"۔

حضرت ابن عمرؓ اس آیت کی تفسیر یوں بیان فرماتے ہیں "خواہ تم قبلہ رُخ ہو یا نہ ہو۔ (بخاری)

ہو کر نماز کے لئے تکبیر کہتے، پھر اپنی سواری کو چھوڑ دیتے اور جس رُخ وہ ہوتی، اسی رُخ پڑھتے رہتے"۔ (بروایت احمدؒ) کی بنا پر امام شافعیؒ کے نزدیک تکبیرِ اولیٰ کے وقت قبلہ رُخ ہونا ضروری ہے۔ دوسروں کے نزدیک یہ ضروری نہیں، بہتر ہے۔ (الفتح الربانی ۳ ص ۱۲۵)

ا۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (الفتح الربانی ۳ ص ۱۲۶)

نماز کی کیفیت

یعنی نماز کی ترتیب اور طریقہ

(۱) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا اور اس نے نماز پڑھی۔ پھر وہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام کیا۔ آپ نے اس کے سلام کا جواب دیا اور فرمایا "واپس جاؤ اور نماز پڑھو، اس لئے کہ تم نے نماز نہیں پڑھی"۔ وہ شخص واپس گیا اور پھر نماز پڑھ کر آیا۔ آپ نے پھر اسے نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ اس طرح وہ شخص تین مرتبہ گیا اور تینوں مرتبہ آپؐ نے اسے نماز دوبارہ پڑھنے کا حکم دیا۔ آخر میں اس شخص نے کہا "مجھے اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں اس سے اچھی نماز نہیں پڑھ سکتا۔ آپؐ مجھے سکھا دیجیے" فرمایا "جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو اللہ اکبر کہو۔ پھر قرآن میں سے جو حصہ تمہارے لئے آسان ہو پڑھو ______ اور دوسری روایت میں ہے: "پھر سورۃ فاتحہ پڑھو" ______ پھر رکوع کرو یہاں تک کہ تم اطمینان سے رکوع کر لو۔ پھر سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ پھر سجدہ کرو یہاں تک کہ تم اطمینان سے سجدہ کرو۔ پھر اٹھو، یہاں تک کہ تم اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ پھر سجدہ کرو یہاں تک کہ تم اطمینان سے سجدہ کر لو۔ پھر پوری نماز میں یونہی کرو" (بخاری۔ مسلم۔ احمد)

(۲) حضرت ابو حمید ساعدیؓ نے نبی ﷺ کے دس صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں جن میں حضرت ابو قتادہؓ بھی تھے، یہ کہا "میں نبی ﷺ کی نماز کو آپ سب سے زیادہ جانتا ہوں"۔ انھوں نے کہا "نہ نبی ﷺ کے ساتھ آپ کی صحبت ہم سے قدیم تھی اور نہ آپ کا آپؐ کے پاس ہم سے زیادہ آنا جانا تھا" انھوں نے جواب دیا کیوں نہیں؟ انھوں نے کہا اچھا، تو نبی ﷺ کی نماز کا طریقہ بیان کیجئے" کہا "نبی ﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو سب سے پہلے سیدھے کھڑے ہو جاتے اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر کندھوں کے برابر لاتے۔ پھر اللہ اکبر کہتے۔ پھر جب آپ رکوع کرنا چاہتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر کندھوں کے برابر لاتے اور اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں چلے جاتے۔ آپ رکوع میں بالکل سیدھے ہوتے۔ نہ آپ کا جسم اوپر کو اٹھا ہوتا اور نہ نیچے کو جھکا ہوا ______ اور آپ کے ہاتھ گھٹنوں پر

ہوتے۔ پھر سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَہٗ کہتے ہوئے اٹھتے اور ہاتھوں کو اٹھاتے ہوئے سیدھے کھڑے ہو جاتے یہاں تک کہ جسم کی ہر ہڈی اپنی جگہ پر آجاتی۔ پھر آپ زمین کی طرف جھکتے اور سجدہ کرتے، پھر (دونوں سجدوں کے بعد) آپ اللہ اکبر کہتے اور اپنے ایک پاؤں کو بچھاتے اور اس پر بیٹھتے، یہاں تک کہ ہر ہڈی اپنی جگہ آجاتی۔ پھر آپ (دوسری رکعت کے لئے) اٹھتے۔ پھر دوسری رکعت میں بھی یوں ہی کرتے۔ یہاں تک کہ جب آپ دو رکعتوں کے بعد تیسری رکعت کے لئے اٹھتے تو اللہ اکبر کہتے اور اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھاتے، جیسا کہ آپ نے نماز شروع کرتے وقت کیا تھا۔ یہاں تک کہ جب آپ آخری رکعت میں ہوتے تو اپنے بائیں پاؤں کو پیچھے کرتے (یعنی اس کو پھیلا کر دائیں ٹانگ کے نیچے رکھتے اور دائیں پاؤں کو سیدھا کھڑا رکھتے) اور اپنے پہلو کو زمین پر رکھ کر اس پر بیٹھتے۔ اس کے بعد سلام پھیرتے "۔ دوسرے صحابہؓ نے کہا" آپ نے ٹھیک بیان کیا۔ نبی ﷺ کی نماز اسی طرح ہوا کرتی تھی۔ ۱؎ (احمد۔ ابو داؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ) یہ حدیث صحیح بخاری میں بھی اختصار کے ساتھ آئی ہے۔

(۳) حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا "تم سب مرد، عورتیں اور بچے یکجا جمع ہو جاؤ، میں تمہیں نبی ﷺ کی نماز کا طریقہ بتاؤں گا جب سب جمع ہو چکے، تو آپ نے وضو کر کے دکھایا۔ جب زوال ہو گیا اور سایہ ڈھل گیا تو آپ نے کھڑے ہو کر اذان کہی، سب سے اگلی صف میں مرد تھے، ان کے پیچھے بچے اور ان کے پیچھے عورتیں۔ پھر اقامت کہی اور آگے بڑھے۔ اس کے بعد اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھایا اور اللہ اکبر کہا۔ اس کے بعد آہستہ آواز سے سورہ فاتحہ اور اس کے ساتھ ایک دوسری سورت پڑھی۔ پھر اللہ اکبر کہتے ہوئے رکوع میں چلے گئے اور تین مرتبہ سبحان اللہ وبحمدہ کہا۔ پھر سمع اللہ لمن حمدہ کہتے ہوئے رکوع سے اٹھے اور سیدھے کھڑے ہو گئے۔ پھر اللہ اکبر کہا اور سجدہ میں چلے گئے۔ پھر اللہ اکبر کہا اور سجدہ سے اپنا سر اٹھایا۔ پھر اللہ اکبر کہا اور دوسرا سجدہ کیا۔ پھر اللہ اکبر کہا اور سجدہ سے اپنا سر اٹھایا۔ ــــــ پھر اللہ اکبر کہا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔
اس طرح پہلی رکعت میں آپ نے چھ مرتبہ اللہ اکبر کہا۔ جب آپ تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوئے، اس وقت آپ نے اللہ اکبر کہا۔ جب پوری نماز (یعنی چار رکعتیں) پڑھ چکے،

۱؎ شافعیہ، حنبلیہ اور عام محدثین کا عمل اسی حدیث کے مطابق ہے۔ حنفیہ اور متاخرین مالکیہ کا عمل اگلی حدیث کے مطابق ہے۔ مفصل بحث اگلے باب میں آئے گی۔

تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا "سیکھ لو اور یاد کر لو کہ میں نے کیسے اللہ اکبر کہا ہے اور کس طرح رکوع اور سجدے کئے ہیں، اس لئے کہ اس وقت (یعنی ظہر کے وقت) نبی ﷺ ہمیں اسی طرح نماز پڑھایا کرتے تھے [1]۔" (مسند امام احمد)

ان اور بعض دوسری احادیث میں نبی ﷺ کی نماز کا طریقہ بیان ہوا ہے۔ نماز میں بعض چیزیں فرض ہیں اور بعض سنت۔ آئندہ دو ابواب میں ہم ان کا الگ الگ ذکر کریں گے۔

---

[1] حنفیہ اور متاخرین، مالکیہ کا عمل اسی حدیث کے مطابق ہے۔ شافعیہ، حنبلیہ اور عام محدثین کا عمل اوپر کی حدیث کے مطابق ہے۔ مفصل بحث اگلے باب میں آئے گی۔

نماز کے فرائض

نماز کے چند فرائض (یا واجبات) ہیں جن میں سے اگر ایک بھی رہ جائے (خواہ قصداً یا سہواً) تو نماز نہیں ہوگی۔[1]

۱۔ نیت:

ہر شرعی کام کے لئے نیت ضروری ہے۔ جیسا کہ ہم وضواور تیمم کے ابواب میں بیان کر چکے ہیں۔[2]

۲۔ تکبیر تحریمہ (یعنی نماز شروع کرتے وقت) اللہ اکبر کہنا:

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "نماز کی کنجی پاکیزگی ہے، اس کی تحریم (باندھنا) اللہ اکبر کہنا ہے اور اس کی تحلیل (کھولنا) سلام پھیرنا ہے۔[3]" (شافعی، احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی)

۳۔ فرض نماز کا کھڑے ہو کر پڑھنا:

جو شخص کھڑا ہو سکتا ہو اس کے لئے فرض نماز میں کھڑا ہونا فرض ہے۔ اس پر اجماع

۱۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک فرض اور واجب میں فرق ہے، دوسروں کے نزدیک فرض اور واجب دونوں ہم معنی لفظ ہیں۔ اس باب میں ہم جن فرائض کا ذکر کر رہے ہیں، حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک ان میں سے بعض فرض ہیں اور بعض واجب (ہم نے ہر جگہ اس کی توضیح کر دی ہے) ان کے نزدیک اگر فرض رہ جائے (سہواً یا قصداً) تو نماز نہیں ہوگی اگر فرض میں سہواً تاخیر ہو جائے تو اس کی بھی سجدہ سہو سے تلافی ہو جائے گی لیکن اگر واجب بھی قصداً رہ جائے تو پھر بھی نماز نہیں ہوگی۔ (عالمگیری)

۲۔ حنفیہ کے نزدیک نیت نماز کی شرائط میں داخل ہے۔ فرائض میں نہیں (واضح رہے کہ فرض اور شرط میں عملاً کوئی فرق نہیں، صرف نظری فرق ہے، نیت کا زبان سے بول کر ادا کرنا کسی کے نزدیک ضروری نہیں بلکہ بدعت ہے۔ فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۳، ص ۲۱۸

۳۔ حنفیہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ نماز کی شرط ہے، فرض نہیں (واضح رہے کہ فرض اور شرط عملاً ایک ہی چیز ہیں)۔ "نیز حنفیہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ کے لئے لفظ اللہ اکبر، کہنا فرض نہیں، واجب ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۲۲۰)

ہے۔(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۱۸۶) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ (البقرہ: ۲۳۸)
نمازوں کی محافظت کرو اور (خصوصاً) درمیانی نماز کی اور اللہ کے لئے خشوع و خضوع کے ساتھ کھڑے ہو۔

حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ مجھے بواسیر کا مرض تھا۔ میں نے نبی ﷺ سے نماز کے متعلق دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا "کھڑے ہو کر نماز ادا کرو۔ اگر کھڑے نہ ہو سکتے ہو تو بیٹھ کر پڑھو اور اگر بیٹھ نہ سکتے ہو تو لیٹ کر پہلو پر نماز پڑھو"۔

فرض کے علاوہ دوسری نمازوں میں طاقت ہونے کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے، البتہ اس کا ثواب کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی نسبت آدھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں "مجھ سے یہ حدیث بیان کی گئی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا بیٹھ کر نماز پڑھنے کا ثواب آدھی نماز کے برابر ہے۔[1] (بخاری)

جو شخص کسی عذر کی وجہ سے فرض نماز بیٹھ کر ادا کرتا ہے اس کے ثواب میں کمی نہیں ہوتی : حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب آدمی بیمار ہو جائے یا وہ سفر میں ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے وہی عمل لکھتا ہے جو وہ صحت اور قیام کی حالت میں کرتا تھا"۔ (بخاری)

۴۔ ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا:[2]

نماز کی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا فرض ہے (۳) حضرت عبادہ بن صامتؓ سے

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک وتروں، صبح کی سنتوں اور نذر مانی ہوئی نماز میں بھی کھڑا ہونا فرض ہے۔ (الفقہ......ج ۱ ص ۲۲۷)

(۲) یعنی اس شخص کے لئے جو تنہا نماز پڑھ رہا ہو، جماعت میں مقتدی کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھنے یا نہ پڑھنے میں اختلاف ہے، جس کا ذکر ہم نماز باجماعت کے باب میں کریں گے۔ (دیکھئے صفحہ ۲۱۲)

(۳) حنفیہ کے نزدیک سورۂ فاتحہ کا نماز میں پڑھنا فرض نہیں ہے، واجب ہے۔ نیز یہ بھی واجب ہے کہ سورہ فاتحہ کو پہلے اور کسی دوسری سورت کو بعد میں پڑھا جائے۔ اگر یہ ترتیب الٹ دی جائے تو واجب ترک ہو جائے گا۔ نماز میں اصل فرض قرآن کے کسی حصے کا پڑھنا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ" (قرآن میں سے جو حصہ تمہارے لئے آسان ہو اسے پڑھو) جو شخص بار بار غلط نماز پڑھ رہا تھا، اسے بھی نبی ﷺ نے یہی فرمایا تھا "قرآن میں سے جو حصہ تمہارے لئے آسان ہو اسے پڑھو" (باقی اگلے صفحہ پر)

روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے فاتحہ نہیں پڑھی اس کی کوئی نماز نہیں"۔
(بخاری، مسلم، احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

نبی ﷺ سے کسی موقع پر کسی فرض یا نفل نماز کا سورہ فاتحہ کے بغیر پڑھنا ثابت نہیں ہے۔
"بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم" کے متعلق اختلاف ہے کہ سورہ فاتحہ کا حصہ ہے یا نہیں؟ اس بارے میں بعض صحابہ کا مذہب یہ ہے کہ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم سورہ فاتحہ ہی کا حصہ ہے، اور اسے سری اور جہری نماز میں اسی طرح پڑھا جائے گا جس طرح خود سورہ فاتحہ کو:

نعیم المجمر سے روایت ہے کہ میں نے حضرت ابو ہریرہؓ کے پیچھے نماز پڑھی تو آپ نے پہلے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پڑھی اور پھر سورہ فاتحہ (نسائی، ابن خزیمہ، ابن حبان)

اور بعض صحابہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ سورہ فاتحہ کا جزو نہیں ہے بلکہ ایک مستقل آیت ہے جو برکت اور دو سورتوں کے درمیان فصل ظاہر کرنے کے لئے اتاری گئی ہے اس کا سورہ فاتحہ کے ساتھ پڑھنا جائز بلکہ مستحب تو ہے لیکن اسے جہراً پڑھنا مسنون نہیں ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ حضرت ابو بکرؓ، اور عمرؓ اور عثمانؓ کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ یہ سب بسم اللّٰہ کو "جہراً نہ" پڑھا کرتے تھے"۔
(نسائی، ابن حبان، طحاوی)

نبی ﷺ مختلف صحابہ اور تابعین سے دونوں طریقوں پر عمل کرنے کے آثار ملتے ہیں۔
امام ابن قیم لکھتے ہیں "نبی ﷺ کبھی بسم اللہ کو جہراً پڑھا کرتے تھے اور زیادہ تر سراً پڑھا کرتے تھے"۔ [1]

نیز حنفیہ کے نزدیک قرآن کا پڑھنا بھی فرض نماز کی صرف دو رکعتوں میں فرض ہے۔ اگر نماز کی کل رکعتیں چار ہوں تو پہلی اور دوسری رکعتوں کو قرآن کے لئے متعین کرنا واجب ہے۔ وتروں، سنتوں اور نفلوں کی ہر رکعت میں قرآن کا پڑھنا واجب ہے۔ فرض قرآءت کی مقدار تین چھوٹی آیتیں یا ایک لمبی آیت ہے۔
(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۲۲۸) حنفیہ کے نزدیک سورہ فاتحہ کے ساتھ کسی دوسری سورہ یا قرآن کے کسی حصے کا ملانا بھی واجب ہے۔ دوسروں کے نزدیک یہ سنت ہے۔ تفصیل اگلے باب میں آرہی ہے۔
(۱) شافعیہ کے نزدیک سورہ فاتحہ کے ساتھ بسم اللّٰہ کا پڑھنا فرض ہے۔ حنفیہ کے اور حنبلیہ کے نزدیک سنت ہے اور مالکیہ کے نزدیک فرض نماز میں مکروہ ہے اور دوسری نمازوں میں جائز، کیونکہ اہل مدینہ کا عمل اسی کے مطابق تھا۔ شافعیہ کے نزدیک چونکہ بسم اللّٰہ سورہ فاتحہ کا جز ہے۔ اس لئے جہری نماز میں اس کا فاتحہ کی طرح جہراً پڑھنا فرض ہے۔ حنفیہ اور حنبلیہ کے نزدیک جہری نماز میں بسم اللّٰہ سراً ہی پڑھی جائے گی۔ (الفقہ ـــ ج ۱ ص ۲۵۷)

۵۔رکوع:

رکوع کے فرض ہونے پر اجماع ہے (المغنی ج ۱ ص ۵۴۷)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے
يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا ...... (اے ایمان لانے والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو......)۔
رکوع میں اطمینان ضروری ہے جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا "پھر رکوع کرو یہاں تک کہ اطمینان سے رکوع کر لو" (دیکھئے صفحہ ۴۲) حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "سب سے برا چور وہ ہے جو اپنی نماز کی چوری کرتا ہے" صحابہ نے عرض کیا "یارسول اللہ! کوئی شخص اپنی نماز کی چوری کیسے کرتا ہے"؟ فرمایا "اس کے رکوع اور سجود پورے نہیں کرتا" دوسری حدیث میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "وہ رکوع اور سجدوں میں اپنی کمر سیدھی نہیں کرتا"۔ (احمد۔ طبرانی۔ حاکم۔ ابن خزیمہ)

۶۔قومہ (رکوع سے اٹھ کر سیدھا کھڑا ہونا):

حضرت ابو حمیدؓ بیان کرتے ہیں کہ "نبی ﷺ جب رکوع سے اٹھتے تو سیدھے کھڑے ہو جاتے یہاں تک کہ پیٹھ کی ہڈی اپنی جگہ واپس آجاتی" (بخاری و مسلم)
حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ اس آدمی کی نماز کی طرف نہیں دیکھتا جو اپنے رکوع اور سجدے کے درمیان کمر سیدھی نہیں کرتا"[۱]۔ (احمد)

۷۔دو سجدے اور ان کے درمیان بیٹھنا:

ہر رکعت میں دو سجدے کرنا اور ان کے درمیان بیٹھنا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے
يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا (اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو۔)
جو شخص غلط نماز پڑھ رہا تھا اسے نماز کا طریقہ بتاتے ہوئے نبی ﷺ نے فرمایا تھا "...... پھر سجدہ کرو یہاں تک کہ اطمینان سے سجدہ کر لو' پھر اٹھو یہاں تک کہ اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ پھر سجدہ کرو یہاں تک کہ اطمینان سے سجدہ کر لو[۲]" (بخاری' مسلم' احمد)
سجدہ کا سات اعضاء پر کرنا ضروری ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کو حکم دیا گیا کہ سات اعضاء پر سجدہ کریں اور یہ کہ اپنے بالوں اور کپڑے کو (زمین پر لگنے سے) نہ روکیں۔ سات اعضاء پیشانی' دونوں ہاتھ' دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں ہیں۔

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک قومہ واجب ہے' فرض نہیں (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱' ص ۲۵۸)
(۲) حنفیہ کے نزدیک دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا فرض نہیں ہے بعض کے نزدیک واجب ہے اور بعض کے نزدیک سنت موکدہ (الفقہ......ج ۱' ص ۲۳۸)

(بخاری و مسلم)

اگرچہ صرف پیشانی کو زمین پر رکھنے سے فرض ادا ہو جاتا ہے، لیکن پیشانی کے ساتھ ناک کا بھی زمین پر رکھنا مسنون ہے۔ حضرت ابو حمیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب سجدہ فرماتے تو اپنی پیشانی اور ناک کو زمین پر رکھتے[1]۔ (ابو داوٗد۔ ترمذی)

۸۔ دوسری اور آخری رکعت میں بیٹھنا اور تشہد (التحیات) پڑھنا[2]۔

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" جب تم ہر دوسری رکعت میں بیٹھو تو یہ کہو اَلتَّحِيَّاتُ ......وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ پھر جو دُعا تمہیں سب سے زیادہ پسند ہو وہ اللہ سے کرو"۔ (احمد۔ نسائی)

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ تشہد فرض ہونے سے پہلے ہم یوں کہا کرتے تھے" اَلسَّلَامُ عَلَى اللهِ مِن قَبْلَ عِبَادِهِ، اَلسَّلَامُ عَلٰى جِبْرَئِيل، وَالسَّلَامُ عَلٰى مِيكَائِيلَ (اللہ کے بندوں کی طرف سے اس پر سلام ہو، جبرائیلؑ پر سلام ہو، میکائیلؑ پر سلام ہو) نبی ﷺ نے ہمیں فرمایا "اَلسَّلَامُ عَلَى اللهِ نہ کہو بلکہ یوں کہو"

۱۔ امام احمدؒ، اوزاعیؒ اور اسحاقؒ کے نزدیک پیشانی کے ساتھ ناک کا بھی زمین پر رکھنا فرض ہے۔ مالکیہ کے نزدیک اگرچہ پیشانی کے ساتھ ناک کا زمین پر رکھنا مستحب ہی ہے، لیکن اگر ناک نہ رکھی جائے اور نماز کا وقت باقی ہو تو نماز دہرائی جائے گی۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر صرف ناک پر ہی سجدہ کیا جائے تو سجدہ ہو جائے گا کیونکہ اوپر والی حدیث بخاری و مسلم کی دوسری روایت میں یوں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا" مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سات اعضاء پر سجدہ کروں : پیشانی... اور آپ نے اپنی ناک کی طرف اشارہ فرمایا۔ دونوں ہاتھوں..... "لیکن حنفیہ کا راجح مسلک یہ ہے کہ تنہا ناک پر سجدہ کرنا عذر کی حالت میں کافی ہے (نیل الاوطار ج ۲، ص ۲۱۷۔ الفقہ...... ج۱، ص ۲۳۲)

۲۔ حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک دوسری رکعت میں بیٹھنا اور تشہد پڑھنا فرض نہیں، واجب ہے۔ مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک یہ دونوں سنت ہیں (الفقہ .. ج۱، ص ۲۴۰۔ ۲۴۳)۔ آخری رکعت میں بیٹھنا ائمہ اربعہ کے نزدیک فرض ہے۔ اس میں تشہد پڑھنا شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک فرض ہے، حنفیہ کے نزدیک واجب ہے اور مالکیہ کے نزدیک سنت (الفقہ ... ج ۱، ص ۲۳۵-۲۳۶) جمہور محدثین کے نزدیک دوسری اور آخری رکعت میں بیٹھنا بھی واجب- (بمعنی فرض) ہے اور تشہد پڑھنا بھی (شرح مسلم النووی ج ۱، ص ۱۷۳)

اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ ....." (دار قطنی)

تشہد کی حدیث مختلف الفاظ کے ساتھ متعدد صحابہؓ سے آئی ہے، لیکن سب سے صحیح حدیث جس کی صحت پر سب کا اجماع ہے، وہ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَ الصَّلَوٰاتُ وَ الطَّیِّبَاتُ اَلسَّلاَمُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَ بَرَکَاتُہٗ اَلسَّلاَمُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ اَشْھَدُ اَنْ لاَّ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ۔(بخاری و مسلم)	ہماری سلامیاں، نمازیں اور ساری پاکیزہ باتیں اللہ کے لئے ہیں۔اے نبی آپ پر سلام اور اللہ کی ساری رحمتیں اور برکتیں ہوں۔ سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے سب نیک بندوں پر میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

اس کے بعد سب سے صحیح روایت حضرت ابن عباسؓ کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں [1]

اَلتَّحِیَّاتُ الْمُبَارَکَاتُ، اَلصَّلَوٰاتُ الطَّیِّبَاتُ لِلّٰہِ، اَلسَّلاَمُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ وَ بَرَکَاتُہٗ اَلسَّلاَمُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ اَشْھَدُ اَنْ لاَّ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُ اللّٰہِ (مسلم۔شافعی۔ابوداؤد۔نسائی)	بابرکت، سلامیاں، نمازیں اور ساری پاکیزہ باتیں، اللہ کے لئے ہیں اے نبی ﷺ آپ پر سلام اور اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں۔ سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور رسول اللہ ہیں۔

دوسری رکعت میں اگر تشہد رہ جائے تو نماز کے آخر میں سجدۂ سہو سے اسکی تلافی ہو جاتی ہے۔(تفصیل کے لئے دیکھئے ص ۲۱۹)

---

[1] امام شافعیؒ حضرت ابن عباسؓ کے تشہد کو سب سے زیادہ پسند فرماتے تھے۔جب آپ سے اس کی وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا کہ یہ چونکہ وسیع اور حضرت ابن عباسؓ سے صحیح طریق سے مروی ہے،اس لئے میں نے اس کو اختیار کر لیا۔ یہ میرے نزدیک سب سے جامع ہے اور اس کے الفاظ زیادہ ہیں۔ لیکن جو شخص کسی دوسرے صحیح طریق سے روایت شدہ تشہد کو اختیار کرتا ہے میں اس پر سختی نہیں کرتا۔"(فتح الباری)

۹۔ سلام :

سلام کی فرضیت نبی ﷺ کے اس ارشاد سے ثابت ہوتی ہے "نماز کی کنجی پاکیزگی ہے، اس کی تحریم اللہ اکبر کہنا ہے اور اس کی تحلیل سلام پھیرنا ہے" (احمد۔ شافعی۔ ابو داؤد۔ ابن ماجہ۔ ترمذی)

متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ سلام دائیں اور بائیں دونوں طرف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ دائیں اور بائیں دونوں طرف ان الفاظ کے ساتھ سلام پھیرا کرتے تھے۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ ا"۔ (احمد۔ ابو داؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

بعض احادیث میں دائیں طرف سلام کرتے وقت اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ کے بعد وَبَرَكَاتُهٗ کا اضافہ ہے۔ حضرت وائل بن حجرؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی۔ آپؐ نے اپنی داہنی طرف سلام پھیرتے وقت اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهٗ اور بائیں طرف سلام پھیرتے وقت " اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ" کے الفاظ فرمایا کرتے تھے"۔ (ابو داؤد)

۱۰۔ ترتیب :

نماز کا اسی ترتیب سے پڑھنا فرض ہے (۱)۔ جس ترتیب سے نبی ﷺ نے اس کی تعلیم دی ہے۔

۱۱۔ اعتدال و اطمینان :

نماز کا اعتدال اور اطمینان سے پڑھنا فرض ہے کیونکہ جو شخص غلط نماز پڑھ رہا تھا، حضور ﷺ نے اسے ہر موقع پر اطمینان سے ادائیگی ارکان کا حکم دیا اگر نماز اطمینان سے

ا۔ حنفیہ کے نزدیک لفظ السلام علیکم فرض نہیں ہے، واجب ہے یعنی لفظ السلام علیکم کا چھوڑنا اگرچہ گناہ ہے، لیکن نماز ختم ہونے کے لئے یہی لفظ ضروری نہیں۔ ہر ایسے کام سے نماز ختم ہو جاتی ہے جو نماز کے منافی ہو جیسے وضو کا ٹوٹ جانا۔ دوسروں کے نزدیک لفظ السلام علیکم فرض ہے یعنی اگر رہ جائے تو نماز نہیں ہوتی (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۲۳۷)

۲۔ حنفیہ کے نزدیک ترتیب شرط ہے اور دوسروں کے نزدیک فرض، لیکن فرض اور شرط میں عملاً کوئی فرق نہیں۔ صرف نظری فرق ہے۔

نہیں پڑھی جائے گی تو وہ باطل ہو گی (۱)۔

فائدہ: اس باب میں جن فرائض کا ذکر ہوا ہے، ان کے علاوہ:

حنفیہ کے نزدیک نوافل اور وتر کی تمام رکعتوں اور فرض نماز کی پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے ساتھ کسی دوسری سورت یا قرآن کے کسی حصے کا ملانا واجب ہے۔

حنابلہ کے نزدیک تکبیراتِ انتقال، رکوع میں ایک مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْم اور سجدے میں ایک مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى کہنا، رکوع سے اٹھتے وقت سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ اور رکوع سے اٹھ کر قومہ میں رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ کہنا، دونوں سجدوں کے درمیان ایک مرتبہ رَبِّ اغْفِرْلِيْ کہنا واجب اور آخری رکعت میں درود فرض ہے۔

شافعیہ کے نزدیک بھی آخری رکعت میں درود فرض ہے۔

یہ سب چیزیں چونکہ دوسروں کے نزدیک سنت ہیں، اس لئے ان کا ذکر ہم اگلے باب، نماز کی سنتیں، میں کریں گے۔

۱۔ حنفیہ کے نزدیک نماز میں اعتدال اور اطمینان فرض نہیں، واجب ہے یعنی اگر نماز سکون و اطمینان سے نہ پڑھی جائے گی، تو اگرچہ نماز ہو جائے گی لیکن واجب کو ترک کرنے کا گناہ ہو گا۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا ص ۲۳۴)

نماز کی سنتیں

۱- رفع الیدین (دونوں ہاتھوں کا اٹھانا)

چار صورتوں میں رفع الیدین سنت(۱) ہے: ۱- تکبیر اولیٰ کے وقت: اس میں کسی کا اختلاف نہیں- حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ نماز کے شروع میں رفع الیدین کی روایت پچاس صحابہؓ سے آئی ہے جن میں عشرہ مبشرہ بھی ہیں"-(فتح الباری)-امام حاکمؒ لکھتے ہیں اس سنت کے سوا ہمیں کسی ایسی سنت کا علم نہیں ہے جس کی روایت پر خلفائے اربعہ، عشرہ مبشرہ اور

---

(۱) یہ شافعیہ اور حنابلہ اور عام محدثین کا مسلک ہے- امام ابو حنیفہؒ، آپ کے اصحاب اور کوفہ کے تمام فقہاء کے نزدیک رفع الیدین صرف ایک مرتبہ یعنی تکبیر اولیٰ ہی کے وقت مسنون ہے-امام مالکؒ سے دونوں قسم کی روایتیں ہیں لیکن متاخرین مالکیہ کا مسلک حنفیہ کے مطابق ہے- حنفیہ کے نزدیک اوپر کی روایات صحیح ہیں لیکن ان کا کہنا یہ ہے کہ رفع اور عدم رفع نبی ﷺ کے مختلف اوقات کے دو عمل ہیں لیکن بعد میں رفع منسوخ ہو گیا اور عدم رفع باقی رہ گیا- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں تمہیں نبی ﷺ کی نماز پڑھ کر دکھاتا ہوں"- پھر انہوں نے نماز پڑھی اور سوائے شروع میں ایک مرتبہ کے رفع الیدین نہیں کیا"(ابو داؤد، احمد، ترمذی، طحاوی، موطا امام محمد)

دوسری روایت میں وہ فرماتے ہیں میں نے نبی ﷺ، ابو بکرؓ، اور عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی، وہ صرف تکبیر اولیٰ کے وقت رفع الیدین کیا کرتے تھے- (دارقطنی، بیہقی)

اسی طرح کی روایات حضرت علیؓ، ابن عمرؓ، براء بن عازبؓ، ابو سعید خدریؓ، ابن عباسؓ اور ابن زبیرؓ وغیرہ سے بھی ملتی ہیں- حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں- نبی ﷺ رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع الیدین کیا کرتے تھے- پھر آپ صرف شروع میں رفع الیدین کرنے لگے اور بعد میں رفع الیدین کرنا ترک کر دیا"- (شرح اردو مسند امام ابو حنیفہ ص ۱۴۶) اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ یہ روایات حنفیہ کے نزدیک معتبر اور قابل حجت ہیں، لیکن شافعیہ، حنابلہ اور عام محدثین ان کو قابل حجت تسلیم نہیں کرتے کیونکہ ان کے نزدیک ان سب کی سند کمزور ہے-ان میں سب سے قوی حدیث حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ہے جسے امام ترمذی نے حسنؒ اور ابن حزم نے صحیح قرار دیا ہے لیکن دوسرے محدثین نے اسے بھی کمزور قرار دیا ہے۔

کثیر تعداد میں دوسرے صحابہؓ مختلف ممالک میں پھیل جانے کے باوجود متفق ہوں"۔(بیہقی)

(۲، ۳) رکوع کو جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت: ان دو موقعوں پر رفع الیدین کی روایت متعدد صحابہؓ سے ثابت ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو اپنے کندھوں کے برابر رفع الیدین کرتے پھر تکبیر کہتے، جب آپ رکوع کرنا چاہتے تو اسی طرح رفع الیدین کرتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو اسی طرح رفع الیدین کرتے اور سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ، رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ کہتے"۔ (بخاری، مسلم، بیہقی)۔ بخاری میں یہ الفاظ زیادہ ہیں "اور جب آپ سجدہ میں جاتے اور سجدہ سے اٹھتے، ایسا نہ کرتے"۔ بیہقی میں یہ الفاظ زیادہ ہیں "اسی طرح آپ کی نماز رہی یہاں تک کہ آپ اللہ سے جا ملے"۔

(۴) دوسری رکعت سے اٹھ کر تیسری رکعت کے شروع میں: نافعؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ جب دوسری رکعت سے اٹھتے تو تیسری رکعت کے شروع میں رفع الیدین کرتے اور انہوں نے ہمیں بتایا کہ نبی ﷺ بھی ایسا ہی کرتے تھے"۔

(بخاری، ابو داؤد، نسائی)

رفع الیدین کا طریقہ حدیث میں دو طرح سے ثابت ہے (۱) ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اٹھانا جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ کی اوپر والی حدیث میں مذکور ہے۔ (۲) ہاتھوں کو کانوں کے برابر اٹھانا، جیسا کہ حضرت مالکؓ بن حویرث سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب اللہ اکبر کہتے تو کانوں تک ہاتھ اٹھاتے"۔ (۱) (مسلم، احمد)

رفع الیدین کے وقت ہاتھوں کو پھیلانا چاہیے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک اللہ اکبر، کے وقت ہاتھ اٹھائے جائیں گے، مرد انگلیوں کو پھیلا کر کانوں تک ہاتھ اٹھائے گا اور عورت کندھوں تک، مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک اللہ اکبر کے وقت انگلیوں کو پھیلا کر کندھوں تک ہاتھ اٹھائے جائیں گے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱) امام شافعیؒ نے اوپر کی دونوں قسم کی روایت کو یوں جمع کیا ہے کہ ہاتھوں کو اس طرح اٹھایا جائے کہ ہتھیلیاں کندھوں کے برابر ہوں، انگوٹھے کانوں کی لو کے برابر اور انگلیاں کانوں کے برابر، اسی کو اکثر محدثین نے اختیار کیا ہے۔

نبی ﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر اٹھاتے (۱)
(احمد ابو داؤد، ترمذی، نسائی)

تکبیرِ اولیٰ میں ہاتھوں کو اللہ اکبر کہنے سے پہلے بھی اٹھایا جا سکتا ہے، اللہ اکبر کہنے کے ساتھ بھی اور بعد میں بھی انہیں اٹھانے کا ذکر حضرت ابن عمرؓ کی اوپر والی حدیث میں آیا ہے، اللہ اکبر کے ساتھ اٹھانے کا ذکر حضرت ابن عمرؓ ہی کی ایک دوسری روایت میں ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ جب اللہ اکبر کہتے تو اپنے ہاتھ اٹھاتے"۔ (مسند احمد)

بعد میں اٹھانے کا ذکر حضرت مالک بن حویرثؓ کی اس حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے اللہ اکبر کہا اور اپنے ہاتھ اٹھائے"۔ (مسلم) لیکن حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو اللہ اکبر سے پہلے ہاتھ اٹھانے کا قائل ہو۔ (۲)

۲۔ دائیں بازو کا بائیں بازو پر رکھنا:

نماز میں دائیں بازو کو بائیں بازو پر رکھنا مسنون ہے' اس بارے میں اٹھارہؓ صحابہ اور تابعین سے دس احادیث ثابت ہیں:

حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ لوگوں کو۔ یعنی صحابہؓ کرام کو۔ یہ حکم دیا جاتا تھا کہ انسان نماز میں اپنا دایاں ہاتھ بائیں بازو پر رکھے"۔ (بخاری و احمد)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ایک آدمی کے قریب سے گذرے جو اپنے بائیں بازو کو دائیں بازو پر رکھے نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ نے اس کے بائیں بازو کو کھینچا اور دائیں کو بائیں ہاتھ پر رکھ دیا"۔ (۳) (احمد)

---

(۱) حنفیہ شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک ہاتھوں کو پھیلا کر ان کی ہتھیلیاں قبلہ کی طرف اور مالکیہ کے نزدیک آسمان کی طرف کرنا مسنون ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۲۱۲)

(۲) مذاہبِ اربعہ میں ہاتھوں کا تکبیر کے ساتھ ہی اٹھانے کا ذکر ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۲۰۱)

(۳) مالکیہ کے سوا باقی سب کا یہی مسلک ہے۔ مالکیہ میں سے بھی بعض کا یہی مسلک ہے، لیکن اکثر مالکیہ کا مسلک ارسال کا ہے (یعنی نماز میں ہاتھوں کو سینے یا ناف پر رکھنے کے بجائے قومہ کی طرح سیدھا چھوڑ دینے) لیکن جمہور مالکیہ کی روایت ارسال ہی کی ہے۔ ان کا استدلال حضرت جابرؓ کی اس حدیث سے ہے۔ کہ نبی ﷺ نے فرمایا "کیا بات ہے کہ میں تمہیں ہاتھ اٹھائے دیکھتا ہوں گویا کہ وہ بھرے ہوئے گھوڑوں کی دمیں ہیں؟" (ایسا نہ کرو بلکہ) نماز میں سکون اختیار کرو"۔ (ابو داؤد، مسلم) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہاتھ کہاں رکھے جائیں اس بارے میں سلف کے تین مسلک ہیں:

۱- سینے پر ہاتھ رکھنا۔

۲- ناف سے اوپر ہاتھ رکھنا۔

۳- ناف کے نیچے ہاتھ رکھنا۔

دراصل جہاں تک ہاتھ کا بائیں بازو پر رکھنے کا تعلق ہے وہ متعدد صحیح احادیث سے ثابت ہے، باقی رہی یہ چیز کہ ہاتھ سینے پر رکھے جائیں یا ناف سے اوپر یا ناف کے نیچے، اس بارے میں کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں ہے۔ ہر حدیث میں کسی نہ کسی پہلو سے کوئی نہ کوئی وجہ علت پائی جاتی ہے اور اسی لئے سلف کے نزدیک ان میں سے ہر ایک کی گنجائش تھی جیسا کہ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں۔ ذیل میں ہم ان تینوں قسم کی احادیث میں سے ایک ایک حدیث بیان کرتے ہیں:

۱- حضرت ہلب طائیؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کے جوڑ (کلائی) کے اوپر سینے پر ہاتھ رکھے ہوئے دیکھا (احمد، ترمذی)

امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

۲- حضرت ابو جحیفہؓ سے روایت ہے کہ حضرتِ علیؓ نے فرمایا سنت یہ ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھا جائے"۔ (ابو داؤد، احمد، ابن ابی شیبہ، دارقطنی، بیہقی)

اس حدیث کے راویوں میں ایک راوی عبد الرحمن بن اسحاق واسطی ہیں جن کا مرتبہ روایت حدیث کے بارے میں کمزور ہے۔

۳- جریر الضبی سے روایت ہے کہ میں نے حضرتِ علیؓ کو ناف سے اوپر ہاتھ باندھے ہوئے دیکھا"۔ (ابو داؤد)۔ اس حدیث کی سند اگرچہ صحیح یا حسن ہے، لیکن یہ صرف

لیکن دوسرے لوگ اس حدیث کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ نبی ﷺ نے لوگوں کو سینے یا ناف پر ہاتھ رکھنے سے منع نہیں فرمایا بلکہ آپ کے اس فرمان کا سبب دوسرا ہے جو حضرت جابرؓ ہی کی ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ "جب ہم نبی ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے تو ہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ: السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہتے ہوئے ہاتھوں سے دونوں طرف اشارہ کیا کرتے تھے۔ نبی ﷺ نے ہم سے فرمایا کیا بات ہے کہ میں تمہیں--" (مسلم، نیل الاوطار)

حضرت علیؓ کا فعل ہے۔ (۱)

۳۔ دعائے استفتاح یا ثناء یعنی سورہ فاتحہ سے پہلے کی دعاء:

اس بارے میں نبی ﷺ سے بارہ دعائیں ثابت ہیں۔ اختصار کے خیال سے ذیل میں ہم ان میں سے صرف تین دعائیں درج کرتے ہیں۔

۱۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نماز میں جب اللہ اکبر کہتے تو قرائت شروع کرنے سے پہلے کچھ دیر خاموش رہتے۔ ایک دن میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، تکبیر اور قراءت کے درمیان آپ خاموش رہتے ہیں، مجھے بتایئے کہ اس وقت آپ کون سی دعاء پڑھتے ہیں فرمایا "میں یہ دعا پڑھتا ہوں":

اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اَللّٰهُمَّ نَقِّنِيْ مِنْ خَطَايَايَ كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْاَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ۔ اَللّٰهُمَّ اغْسِلْنِيْ مِنْ خَطَايَايَ بِالثَّلْجِ وَالْمَاءِ وَالْبَرَدِ

(بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ)

اے اللہ! میرے اور میرے گناہوں کے درمیان دوری ڈال دے جیسا کہ تو نے مشرق اور مغرب کے درمیان دوری ڈال دی ہے۔ اے اللہ! مجھے میرے گناہوں سے پاک کردے جیسا کہ سفید کپڑا میل سے صاف کیا جاتا ہے۔ اے اللہ! میرے گناہوں کو برف، پانی اور اولوں سے دھو دے۔

۲۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو۔ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہتے اور (۲) یہ دعا پڑھتے:

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک مرد ناف کے نیچے ہاتھ باندھے گا اور عورت سینے پر، حنابلہ کے نزدیک مرد اور عورت دونوں ناف کے نیچے ہاتھ باندھیں گے۔ شافعیہ کے نزدیک مرد اور عورت سینے کے نیچے اوپر ناف کے اور کچھ بائیں جانب باندھیں گے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ) اہل حدیث علماء سینے پر ہاتھ رکھنے کی روایت کو مرفوع ہونے کی وجہ سے دوسری روایات پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس لئے ان کے نزدیک سینے پر ہاتھ رکھنا افضل ہے۔ (تحفۃ الاحوذی وغیرہ)

(۲) یہ الفاظ صرف ابو داؤد نسائی' مسند احمد میں زیادہ ہیں۔ دوسری کتابوں میں چونکہ یہ الفاظ نہیں ہیں اس لئے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ وجہت وجھی ---کی دعا نماز شروع کرنے سے پہلے کی ہے، لیکن ابو داؤد' مسند احمد اور نسائی کے الفاظ سے یہ شبہ دور ہو جاتا ہے۔

وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ - اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ بِذٰالِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ - اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْمَلِكُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ، اَنْتَ رَبِّيْ وَ اَنَا عَبْدُكَ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِيْ فَاغْفِرْلِيْ ذُنُوْبِيْ جَمِيْعًا اِنَّهٗ لَا يَغْفِرُالذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ، وَاهْدِنِيْ لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا يَهْدِيْ لِاَحْسَنِهَا اِلَّا اَنْتَ وَاصْرِفْ عَنِّيْ سَيِّـئَهَا - لَا يَصْرِفُ عَنِّيْ سَيِّـئَهَا اِلَّا اَنْتَ - لَبَّيْكَ وَ سَعْدَيْكَ - وَالْخَيْرُ كُلُّهٗ فِيْ يَدَيْكَ وَالشَّرُّ لَيْسَ اِلَيْكَ وَاَنَا بِكَ وَ اِلَيْكَ - تَبَارَكْتَ وَتَعَالَيْتَ - اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ - (احمد، مسلم، ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ)	میں نے یکسو ہو کر اس ذات کی طرف اپنا رخ کر لیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں- میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور مرنا سب جہانوں کے پروردگار اللہ کے لئے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں- مجھے اسی چیز کا حکم ملا ہے اور میں مسلمانوں میں سے پہلا ہوں- اے اللہ! تو ہی بادشاہ ہے- تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو میرا رب اور میں تیرا بندہ ہوں- میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے- میں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا- لہذا تو میرے سب گناہ معاف کر دے، تیرے سوا کوئی دوسری ہستی گناہوں کو معاف نہیں کر سکتی- مجھے بہترین اخلاق کی ہدایت دے- تیرے سوا بہترین اخلاق کی ہدایت کوئی نہیں دے سکتا مجھ سے برے اخلاق کو پھیر دے- تیرے سوا کوئی برے اخلاق کو مجھ سے نہیں پھیر سکتا- میں تیری پکار پر لبیک کہتا ہوں- ساری کی ساری بھلائی تیرے ہی ہاتھوں میں ہے- برائی کی تیری طرف نسبت نہیں کی جا سکتی- میں تیرے ہی قریب آنا چاہتا ہوں تو پاک ہے تو بلند ہے، میں تجھ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتا ہوں اور تیرے حضور توبہ کرتا ہوں-

۳- حضرت عمرؓ اللہ اکبر کہنے کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

سُبْحَانَكَ اَللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ (مسلم- دار قطنی- ترمذی)	اے اللہ! تو پاک ہے اور میں تیری حمد و ثنا کرتا ہوں تیرا نام بابرکت ہے- تیری عظمت و بزرگی بلند ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں-

امام ابن قیم لکھتے ہیں، یہ ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ نبی ﷺ کی جگہ پر اپنی نماز میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ اسے بلند آواز سے پڑھتے اور لوگوں کو سکھایا کرتے تھے۔ اس وجہ سے یہ مرفوع حدیث کے حکم میں آتی ہے(۱)"

۴۔ تعوذ یعنی اعوذ باللہ پڑھنا

دعائے استفتاح کے بعد اعوذ باللہ پڑھنا مستحب ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ۔ (النحل: ۹۸)

جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لیا کرو۔

حضرت نافع بن جبیر بن مطعمؓ سے روایت ہے کہ (دعائے استفتاح کے بعد) نبی ﷺ نے اَللّٰھُمَّ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ پڑھا"۔ (احمد، ابو داؤد، ابن ماجہ، ابن حبان) اس بارے میں اختلاف ہے کہ نماز میں اعوذ باللہ کا پڑھنا صرف پہلی رکعت میں ہے یا ہر رکعت میں۔ اوپر کی آیت کی روشنی میں اسے ہر رکعت کے شروع میں پڑھا جا سکتا ہے لیکن حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب دوسری رکعت میں اٹھتے تو "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" سے قراءت شروع فرماتے اور خاموش نہ رہتے۔ (۲) (مسلم)

---

(۱) مالکیہ کے نزدیک تکبیر اور سورہ فاتحہ کے درمیان دعا مکروہ ہے، ان کا کہنا ہے کہ اس بارے میں بہت سے صحابہؓ کا عمل یہ تھا کہ وہ دعا نہیں پڑھا کرتے تھے بعض مالکیہ کے نزدیک یہ دعا مستحب ہے "سبحنک اللھم و بحمدک --- و جھت و جھی --" حنبلیہ اور حنفیہ کے نزدیک سورۃ فاتحہ سے پہلے کی دعا یہ ہے: "سبحنک اللھم ---" شافعیہ کے نزدیک سورۃ فاتحہ سے پہلے کی دعا یہ ہے: "وجھت ---" (الفقہ: ج اص ۲۲۵)

(۲) مالکیہ کے نزدیک فرض نماز میں اعوذ باللہ کا پڑھنا مکروہ ہے اور نفل نماز میں جائز، حنبلیہ اور حنفیہ کے نزدیک صرف پہلی رکعت میں اعوذ باللہ کا پڑھنا سنت ہے۔ شافعیہ کے نزدیک ہر رکعت میں اعوذ باللہ کا پڑھنا سنت ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

قاضی شوکانی لکھتے ہیں احتیاط یہی ہے کہ جو چیز سنت سے ثابت ہے اسی پر اکتفا کیا جائے یعنی یہ کہ اعوذ باللہ کو صرف پہلی رکعت میں پڑھا جائے۔ (نیل الاوطار)

۵- آمین

ہر نمازی کے لئے --- خواہ وہ تنہا نماز پڑھ رہا ہو یا جماعت سے، امام ہو یا مقتدی --- مسنون ہے کہ سورہ فاتحہ کے ختم ہونے پر لفظ آمین (اے اللہ قبول فرما) کہے اگر نماز سری ہے تو آمین پست آواز سے کہی جائے گی اور اگر جہری ہے تو بلند آواز سے (۱)

نعیم المجمر بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوہریرہؓ کے پیچھے نماز پڑھی تو پہلے انہوں نے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھی اور پھر سورۃ فاتحہ- جب آپ وَلَا الضَّالِّيْنَ پر پہنچے تو آپ نے آمین کہی اور لوگوں نے آمین کہی- سلام کے بعد حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میری نماز تم سب کی نسبت نبی ﷺ کی نماز سے زیادہ مشابہ ہے- (بخاری فی التعلیقات) نسائی، ابن خزیمہ، ابن حبان، ابن شہاب-

---

(۱) آمین کے کہنے پر کوئی اختلاف نہیں ہے- اختلاف صرف اس کے بلند یا پست آواز سے افضل ہونے پر ہے- شافعیہ، حنابلہ اور عام اہل حدیث علماء کا وہی مسلک ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے مالکیہ کے نزدیک جہری نماز میں امام آہستہ آواز سے آمین کہے گا اور مقتدی بلند آواز سے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۲۵۰) حنفیہ کے نزدیک آمین ہر حال میں پست آواز ہی سے کہی جائے گی- اس بارے میں ان کا استدلال یہ ہے کہ متعدد آیات اور احادیث میں اللہ تعالیٰ کو آہستہ پکارنے اور آہستہ آواز سے اس کا ذکر کرنے کی فضیلت آئی ہے- (التعلیق الصبیح- الفتح الربانی ج ۳، ص ۲۰۶) نیز ان کا استدلال وائل کی اس حدیث سے بھی ہے کہ حضرت عمرؓ اور علیؓ بسم اللہ، اعوذباللہ اور آمین بلند آواز سے نہ کہا کرتے تھے" (طحاوی، نیز ترمذی میں شعبہؒ، وائل بن حجرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے آمین کہی و خفض بها صوته (اور اپنی آواز کو پست رکھا)-

اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ محدثین کے نزدیک وائلؒ اور شعبہؒ کی مذکورہ دونوں روایات سند کے لحاظ سے کمزور ہیں- وائل بن حجرؓ کی حدیث کو دوسرے راوی نے نقل کیا ہے اور اس میں خفض بها صوته (اپنی آواز کو پست رکھا) کے بجائے مد بها صوته (اپنی آواز کو لمبا کیا) کے الفاظ ہیں (ترمذی) عام محدثین اس دوسری روایت کو شعبہ کی روایت کی نسبت زیادہ صحیح قرار دیتے ہیں اور اس میں مد (لمبا کرنے) کے معنی بلند کرنے کے لیتے ہیں اور حنفیہ دونوں روایتوں کو جمع کرتے ہوئے اس روایت میں بھی مد (لمبا کرنے) کا مطلب پست کرنے کے لیتے ہیں- (تحفۃ الاحوذی الکوکب الدری ج ۱ ص ۱۲۷)

عطاءؒ فرماتے ہیں "میں نے اسی مسجد میں دو سو صحابہ کو پایا ہے جب امام ولا الضالین کہتا تو میں ان کی 'آمین' کی گونج سنتا"۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "یہودیوں نے تم سے جتنا حسد سلام کہنے اور امام کے پیچھے آمین کہنے پر کیا ہے اتنا کسی دوسری چیز پر نہیں کیا"۔ (احمد، ابن ماجہ)

مستحب یہ ہے کہ آمین امام کے ساتھ کہی جائے، نہ پہلے اور نہ بعد میں:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب امام آمین کہے تو تم (بھی) آمین کہو، اس لئے کہ جس شخص کی آمین فرشتوں کی آمین سے مل گئی، اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے" (بخاری، مسلم، احمد، ابو داؤد، ترمذی نسائی، ابن ماجہ)

۶۔ سورۃ فاتحہ کے بعد قرآن کا کچھ حصہ پڑھنا

فجر اور جمعہ کی دونوں رکعتوں میں ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی صرف پہلی اور دوسری رکعتوں میں اور سنتوں اور نوافل کی تمام رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے بعد کسی سورت یا قرآن کے کسی حصے کا پڑھنا مسنون ہے۔ اس بارے میں متعدد احادیث ثابت ہیں:

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم سورۃ فاتحہ پڑھیں اور اس کے ساتھ قرآن کا جو حصہ ہمارے لئے آسان ہو" (ابو داؤد) حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور دو سورتیں پڑھا کرتے تھے اور آخری دو رکعتوں میں (صرف) سورۃ فاتحہ اور بعض اوقات ہمیں کوئی سورہ سنا دیتے تھے۔ آپ پہلی رکعت کو دوسری کی نسبت لمبی پڑھا کرتے تھے۔ اسی طرح عصر اور فجر کی نماز میں بھی آپ پہلی رکعت کو دوسری کی نسبت لمبی پڑھا کرتے تھے"(۱) (بخاری، مسلم، ابو داؤد)

---

(۱) حنفیہ کے علاوہ دوسروں کے نزدیک سورۃ فاتحہ کے بعد قرآن کا کوئی حصہ پڑھنا سنت ہے۔ حنفیہ کے نزدیک واجب ہے۔ (کبیری، شامی) ان کا استدلال اوپر کی احادیث سے بھی ہے اور حضرت ابو سعید کی اس حدیث سے بھی کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اس شخص کی کوئی نماز نہیں جس نے ہر رکعت میں فاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی دوسری سورت نہیں پڑھی" (ابن ماجہ) یہ روایت سند کے لحاظ سے قوی نہیں ہے اس لئے دوسروں کے نزدیک معتبر نہیں ہے اور یہی اختلاف کی وجہ ہے۔

قراءت کے متعلق چند مسائل:

(ا) سورۃ فاتحہ کے بعد قراءت کے متعلق حافظ ابن قیم نے اپنی کتاب "زاد المعاد" میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس کا خلاصہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

صبح کی نماز میں نبی ﷺ عموماً ساٹھ سے سو آیتوں تک تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ آپ کبھی سورہ "ق" پڑھتے، کبھی "اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ" کبھی اِذَا زُلْزِلَتْ (دونوں رکعتوں میں)۔ ایک مرتبہ سفر میں آپ نے صبح کی نماز میں مُعَوِّذَتین (قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ) بھی پڑھیں۔ ایک مرتبہ آپ نے سورہ "المومنون" سے نماز شروع کی، جب حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کا ذکر آیا تو آپ ﷺ کو کھانسی آئی اور آپ ﷺ نے رکوع فرمادیا۔ جمعہ کے روز صبح کی نماز میں آپ سورہ سجدہ اور سورہ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَان پڑھا کرتے تھے۔

ظہر کے وقت بعض اوقات آپؐ لمبی قرآءت فرماتے۔ حضرت ابو سعیدؓ بیان کرتے ہیں کہ ظہر کی نماز کھڑی ہوتی تو جانے والا بقیع جاتا، رفع حاجت کے بعد گھر آکر وضو کرتا اور پھر آکر نبی ﷺ کے ساتھ پہلی رکعت میں شامل ہو جاتا کیونکہ آپ کی قرآءت لمبی ہوتی تھی" (مسلم) ظہر کی نماز میں کبھی آپ 'آلم تنزیل' کے برابر، کبھی سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى" کے برابر اور کبھی وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى' کے برابر قرآت فرماتے اور کبھی وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ اور کبھی وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ پڑھتے۔

آپؐ کی عصر کی نماز عموماً ظہر سے آدھی ہوتی تھی (جبکہ آپؐ کی ظہر لمبی ہوتی) ورنہ اس کے برابر۔

مغرب کی نماز میں حضورؐ کا طریقہ آج سے مختلف تھا، اس لئے کہ کبھی آپ ﷺ نے مغرب کی دو رکعتوں میں سورہ الاعراف پڑھی ہے، کبھی "الطور" اور کبھی "المرسلات"۔

علامہ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں۔ نبی ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے مغرب کی نماز میں سورہ الاعراف پڑھی، سورہ الصافات پڑھی، سورہ حمٓ الدخان پڑھی، سورۃ سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھی، سورہ المرسلات پڑھی، یہ بھی ثابت ہے کہ آپ مغرب کی نماز میں چھوٹی سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ یہ تمام چیزیں نبی ﷺ سے صحیح احادیث میں ثابت ہیں"۔ لیکن مغرب کی نماز

میں ہمیشہ چھوٹی سورتیں ہی پڑھتے رہنا یا بڑی سورتوں میں سے ایک یا دو آیتیں پڑھ لینا، خلاف سنت ہے جس کو مَروانؒ بن حکم نے رواج دیا۔

عشاء کی نماز میں حضور ﷺ نے وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ پڑھی اور حضرت معاذؓ کو بتایا کہ عشاء کی قرآت کا وقت سورہ وَالشَّمْسِ وَضُحٰھَا، سورہ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی اور وَاللَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی وغیرہ کے برابر ہے۔

سوائے جمعہ اور عید کے نبی ﷺ عام فرض نمازوں میں کوئی ایک یا چند متعین سورتیں نہیں پڑھا کرتے تھے۔ عمرو بن شعیب اپنے والد اور پھر دادا کے واسطے سے روایت کرتے ہیں بڑی یا چھوٹی کوئی سورت ایسی نہیں جسے میں نے نبی ﷺ کو فرض نمازوں میں پڑھتے نہ سنا ہو"۔ (ابوداؤد)

نبی ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ پوری سورت پڑھا کرتے تھے۔ بعض اوقات ایک ہی سورت کو دو رکعتوں میں پڑھتے۔ بعض اوقات کسی سورت کا ابتدائی حصہ پڑھتے، رہا سورتوں کے آخر یا درمیان سے چند آیتیں لے کر پڑھ لینا تو نبی ﷺ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔

نماز میں آپ کی پہلی رکعت دوسری سے لمبی ہوا کرتی تھی۔ آپ کی فجر کی نماز تمام نمازوں سے لمبی ہوا کرتی تھی کیونکہ صبح کا وقت اطمینان کا ہوتا ہے اور اس میں صبح اور شام کے فرشتے بھی آتے ہیں جیسا کہ متعدد احادیث سے ثابت ہے۔

"حضور ﷺ ہر آیت کو ٹھہر ٹھہر کر بلند آواز کے ساتھ اور الفاظ کو لمبا کر کے قرآت فرمایا کرتے تھے"۔ (مختصر زاد المعاد)

(ب) وہ چیزیں جو قرآت کے دوران مستحب ہیں: نماز میں قرآن کا خوش الحانی سے پڑھنا مستحب ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے قرآن پڑھتے ہوئے اپنی آوازوں کو خوبصورت بناؤ"۔ ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا" وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو قرآن کے ساتھ نہیں گاتا (یعنی قرآن کو خوش الحانی سے نہیں پڑھتا)" ایک تیسری حدیث میں آپ نے فرمایا" قرآن کے پڑھنے میں سب سے اچھی آواز اس شخص کی ہے کہ جب تم اسے سنو تو سمجھو کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے"۔

نفلی نمازوں میں قرآن پڑھتے ہوئے جہاں رحمت کی آیت آئے وہاں اللہ تعالیٰ کا فضل طلب کرنا، جہاں عذاب کی آیت آئے وہاں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنا اور جہاں اللہ تعالیٰ کی

بزرگی وبرتری کا ذکر آئے وہاں سبحان اللہ، یا تبارک اللہ رب العٰلمین کہنا مسنون ہے۔

(المغنی ج ص ۵۸۷)

حضرت حذیفہ بن یمانؓ سے روایت ہے کہ ایک رات میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی' آپ ﷺ نے سورۃ بقرہ شروع کی، میں سمجھا کہ سو آیتوں پر رکوع فرمائیں گے لیکن آپ پڑھتے رہے، میں سمجھا کہ سورت ختم کرنے کے بعد رکوع فرمائیں گے، لیکن آپ نے اس کے بعد سورۃ آل عمران شروع کر دی۔ پوری سورت ختم کرنے کے بعد آپ ﷺ نے سورہ نساء شروع کر دی۔ آپ ﷺ اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھتے تھے، جہاں کوئی تسبیح کی آیت آتی آپ ﷺ سبحان اللہ کہتے، جہاں کوئی التجا کرنے کی آیت آتی، آپ التجا کرتے اور جہاں پناہ مانگنے کی آیت آتی، آپ ﷺ پناہ مانگتے"۔

(مسلم)

یہ تسبیح التجا اور پناہ کا مانگنا ہر شخص کے لئے مستحب ہے خواہ وہ تنہا نماز پڑھ رہا ہو یا جماعت کے ساتھ مقتدی ہو یا امام۔

جو شخص "اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحَاکِمِیْنَ" (کیا اللہ حاکموں کا حاکم نہیں ہے ؟) پڑھے یا سنے، اس کے لئے "بَلٰی وَ اَنَا عَلٰی ذَالِکَ لَمِنَ الشّٰھِدِیْنَ" (کیوں نہیں، اور میں اس کی گواہی دینے والوں میں سے ہوں) کہنا مستحب ہے اور جو شخص "اَلَیْسَ اللّٰہُ بِقَادِرٍ عَلٰی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی" (کیا اللہ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے ؟) پڑھے یا سنے، اس کے لئے "بَلٰی اَشْھَدُ" (کیوں نہیں میں اس کی گواہی دیتا ہوں) کہنا مستحب ہے، جو شخص "فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ" (آخر یہ لوگ اس قرآن کے بعد کس دوسرے کلام پر ایمان لائیں گے ؟) پڑھے یا سنے، اس کے لئے "اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ" (میں اللہ پر ایمان لایا) کہنا مستحب ہے اور جو شخص "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی" (اپنے بلند وبرتر پروردگار کی تسبیح کرو) پڑھے یا سنے، اس کے لئے "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی" (میرا بلند وبرتر رب پاک ہے) کہنا مستحب ہے، خواہ وہ نماز میں ہو یا نہ ہو۔ (۱)

۱۔ یہ حنفیہ، مالکیہ اور حنبلیہ کا مسلک ہے، شافعیہ اور اہل حدیث علماء کے نزدیک نفل نمازوں کے علاوہ فرض نمازوں کی قراءت کے دوران بھی دعا کا مانگنا مستحب ہے۔

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ شافعیہ اور اہل حدیث علماء اوپر کی احادیث کو فرض (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(ج) جہری اور سری قراءت کے مواقع: فجر اور جمعہ کی دونوں رکعتوں اور مغرب اور عشاء کی پہلی دو رکعتوں میں قراءت جہری اور ظہر و عصر کی تمام رکعتوں اور مغرب کی تیسری اور عشاء کی تیسری اور چوتھی رکعتوں میں قراءت سری ہو گی۔ عام نوافل میں دن کے وقت قراءت سری ہو گی اور رات کے وقت جہری بھی ہو سکتی ہے اور سری بھی، البتہ افضل یہ ہے کہ آواز درمیانی رکھی جائے۔ تفصیل "تہجد" کے باب میں آئے گی۔ (نوٹ: مقتدی کی امام کے پیچھے قراءت کے متعلق دیکھئے)۔

۷- سورۂ فاتحہ اور پوری قراءت کے بعد سکتہ

سورۂ فاتحہ کے بعد دوسری سورت شروع کرنے سے پیشتر اور پوری قراءت ختم کرنے کے بعد رکوع کے لئے "اللہ اکبر" کہنے سے پیشتر کچھ دیر رکنا اور خاموش رہنا مستحب ہے۔

حضرت سمرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ دو جگہ سکتہ (خاموشی) فرمایا کرتے تھے۔ ایک جب آپ ﷺ نماز شروع فرماتے اور دوسرے جب آپ ﷺ پوری قراءت سے فارغ ہو جاتے۔ دوسری روایت میں ہے "ایک سکتہ جب آپ ﷺ اللہ اکبر فرماتے اور دوسرا جب آپ ﷺ "غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّالِّیْنَ فرماتے" (۱) (ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

۸- تکبیراتِ انتقال

نماز میں ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہوتے وقت اللہ اکبر کہنا مسنون

اور نفل دونوں نمازوں کے لئے مانتے ہیں اور حنفیہ، مالکیہ اور حنبلیہ ان کو صرف نفلی نمازوں کے لئے مانتے ہیں کیونکہ کسی حدیث میں یہ ذکر نہیں آتا کہ نبی ﷺ نے فرض نماز میں بھی دعا مانگی ہو، جتنی روایتوں میں بھی اس کا ذکر آتا ہے وہ سب نفلی نماز کے متعلق ہیں۔ (المغنی ج ۱ ص ۵۸۷) (اوجز المسالک ج ۱ ص ۲۲۱)

(۱) مالکیہ اور حنفیہ کے نزدیک دوسرا سکتہ (یعنی سورہ فاتحہ اور پوری قراءت کے بعد) مکروہ ہے۔ (الفتح الربانی ۳ ص ۱۷۹) حنفیہ کا (اور غالباً مالکیہ کا بھی) استدلال یہ ہے کہ دوسرے سکتہ کے متعلق روایات میں اضطراب ہے اور اس کا ولا الضالین کے بعد نہ ہونے کی تصریح صرف حضرت سمرہؓ کی روایت میں ہے، بذل المجہود ص ۳۰۵، ج ۲)

ہے- البتہ رکوع سے اٹھتے وقت اللہ اکبر کے بجائے سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ کہنا مسنون ہے- حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے، پھر جب رکوع میں جاتے تو اللہ اکبر کہتے، پھر جب رکوع سے اٹھتے تو سمع اللہ لمن حمدہ (اللہ نے اس شخص کی پکار سنی جس نے اس کی حمد کی) کہتے- پھر جب قومہ میں ہوتے تو رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ (اے ہمارے پروردگار تیرے ہی لئے حمد ہے) کہتے پھر جب سجدہ میں جاتے تو اللہ اکبر کہتے- پھر جب سجدہ سے اٹھ کر بیٹھتے تو اللہ اکبر کہتے- جب دوسری رکعت سے اٹھتے تو اللہ اکبر کہتے- پھر تمام رکعتوں میں یونہی کرتے- یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو جاتے- یہی آپ ﷺ کی نماز رہی تا آنکہ آپ دنیا سے رخصت ہو گئے-(۱) (بخاری، مسلم، احمد، ابو داؤد)

۹- رکوع کی ہیئت اور دعاء

رکوع میں جھکنے اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھنے اور رکوع میں کمر کو سیدھا رکھنے سے فرض ادا ہو جاتا ہے لیکن سنت یہ ہے، گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنیوں کو بدن سے دور رکھا جائے اور گھٹنوں پر ہاتھوں کی انگلیوں کو کھول کر رکھا جائے- حضرتِ عقبہ بن عمروؓ نے نماز پڑھی تو اپنی کہنیوں کو بدن سے دور رکھا، ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھا اور انگلیوں کو پھیلایا اور پھر فرمایا "میں نے نبی ﷺ کو اسی طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے"- (احمد، ابو داؤد، نسائی)

حضرتِ ابو حمیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب رکوع فرماتے تو سیدھے ہوتے، سر کو نہ اوپر کی طرف اٹھائے ہوئے ہوتے اور نہ نیچے کی طرف جھکائے ہوئے اور آپ ﷺ اپنے ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھتے"- (نسائی)

رکوع میں "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ" (میرا بزرگ اور عظمت والا پروردگار پاک ہے) کہنا مسنون ہے-(۲) حضرتِ عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ "جب آیت "فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ" نازل ہوئی تو نبی ﷺ نے فرمایا "اسے اپنے رکوع کے لئے بنالو" تو

(۱) حنابلہ کے نزدیک تکبیراتِ انتقال واجب ہیں-(الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

(۲) امام احمد اور اسحاق اور ابن خزیمہ کے نزدیک رکوع میں ایک مرتبہ تسبیح سبحان ربی العظیم یہ واجب ہے یعنی اگر قصداً چھوڑ دی جائے تو نماز باطل ہو جاتی ہے اور اگر بھول سے رہ جائے تو باطل نہیں ہوتی لیکن سجدہ سہو لازم آتا ہے- جمہور محدثین اور فقہاء کے نزدیک یہ سنت ہے- (نیل الاوطار ج ۲ ص ۲۰۵ الفقہ ---)

بار، دس بار اور گیارہ بار بھی کہی جا سکتی ہے۔ اس دعا کے علاوہ رکوع میں بعض دوسری دعاؤں کا پڑھنا بھی مسنون ہے جن کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

۱۔ حضرتِ علیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب رکوع میں جاتے تو یہ دعا پڑھتے:

اَللّٰھُمَّ لَکَ رَکَعْتُ وَ بِکَ اٰمَنْتُ وَلَکَ اَسْلَمْتُ۔ وَعَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ اَنْتَ رَبِّیْ۔ خَشَعَ سَمْعِیْ وَ بَصَرِیْ وَ مُخِّیْ وَ عَظْمِیْ وَ عَصَبِیْ وَ مَا اسْتَقَلَّتْ بِہٖ قَدَمِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (احمد، مسلم، ابوداؤد)

اے اللہ! میں نے تیرے لئے رکوع کیا میں تجھ پر ایمان لایا اپنے آپ کو تیرے حوالے کر دیا اور میں نے تجھ پر بھروسا کیا تو میرا پروردگار ہے۔ میرے کان، میری آنکھیں، میری گدی، میری ہڈی، میرے پٹھے اور وہ تمام چیزیں جو میرے پاؤں میں ہیں، جہانوں کے رب کے لئے جھک گئیں۔

۲۔ حضرتِ عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اپنے رکوع اور سجدہ میں یہ پڑھا کرتے تھے:

سُبْحٰنَکَ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَ بِحَمْدِکَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ (احمد، مسلم، ابوداؤد)

اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! تو پاک ہے، اور ہم تیری حمد بیان کرتے ہیں۔ اے اللہ! مجھے بخش دے۔

۳۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اپنے رکوع اور سجدہ میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

سُبْحَانَ ذِی الْجَبَرُوْتِ وَ الْمَلَکُوْتِ وَ الْکِبْرِیَاءِ وَالْعَظْمَۃِ (ابوداؤد)

اے اللہ! تو پاک ہے، ہر عیب اور نقص سے بری ہے، فرشتوں اور جبر کل کا رب ہے۔

۱۰۔ قومہ کی دعا

رکوع سے اٹھتے وقت سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ اور سیدھے کھڑے ہو کر رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ کہنا مسنون ہے۔(۱)

اگر نماز پڑھنے والا تنہا ہو تو وہ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ رکوع سے اٹھتے وقت ربنا

---

(۱) حنابلہ کے نزدیک یہ دونوں چیزیں واجب ہیں اور دوسروں کے نزدیک سنت (الفقہ ---ج ۱ ص ۲۰)

لک الحمد یا رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ یا اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَ لَکَ الْحَمْدُ سیدھا کھڑا ہو کر کہے گا-باجماعت نماز کی صورت میں امام سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ اور رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ دونوں کہے گا اور مقتدی صرف رَبَّنَا وَ لَکَ الْحَمْدُ- حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب رکوع سے کمر اٹھاتے تو فرماتے "سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ اور جب کھڑے ہو جاتے تو فرماتے "رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ"(۱) (بخاری، مسلم، احمد)

قومہ میں بعض اور دعائیں بھی ثابت ہیں جن سے بعض کا ہم ذیل میں ذکر کرتے ہیں-

۱- رفاعہ بن رافعؓ سے روایت ہے کہ ایک دن ہم نبی ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے، جب آپ نے رکوع سے سر اٹھایا اور سمع اللہ لمن حمدہ کہا تو پیچھے سے ایک آدمی نے یوں دعا پڑھی:

رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدَ حَمْدًا کَثِیْرًا طَیِّبًا مُبَارَکًا فِیْہِ اے رب! تیرے ہی لئے حمد ہے، بہت زیادہ، پاکیزہ اور بابرکت-

جب نبی ﷺ نے سلام پھیرا تو دریافت فرمایا "ابھی کون شخص بولا تھا؟" اس آدمی نے عرض کیا "میں تھا یا رسول اللہ ﷺ! نبی ﷺ نے فرمایا "ابھی میں نے تیس سے کچھ اوپر فرشتوں کو اس دعا کی طرف لپکتے دیکھا کہ کون اسے سب سے پہلے لکھتا ہے"-

(احمد، بخاری، مالک، ابوداؤد)

---

(۱) یہ جمہور کا مسلک ہے اور یہی امام احمدؒ، ابو یوسفؒ اور محمدؒ کا مسلک ہے-امام شافعی کا بھی یہی مسلک ہے لیکن ان کے نزدیک امام کی طرح مقتدیوں کے لئے بھی سمع اللہ لمن حمدہ کہنا مسنون ہے 'امام ابو حنیفہؒ اور امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ امام صرف سمع اللہ لمن حمدہ کہے اور مقتدی صرف ربنا لک الحمد- حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللھم ربنا و لک الحمد کہو"-(بخاری) اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ اس چیز کے قائل ہیں کہ امام سمع اللہ لمن حمدہ اور اللھم ربنا لک الحمد دونوں کہے گا، ان کے نزدیک حضرت انسؓ کی اس حدیث سے یہ لازم نہیں آتا کہ امام سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کے بعد اللھم ربنا لک الحمد نہ کہے کیونکہ یہ حدیث اس حدیث سے مشابہ ہے جس میں نبی ﷺ نے فرمایا کہ جب امام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو لہذا جس طرح ولا الضالین کے بعد امام کے لئے آمین کہنا مستحب ہے اسی طرح سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد اللھم ربنا لک الحمد کہنا بھی مستحب ہے- (نیل الاوطار ج ۲، ص ۲۰۹)

۲- حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب رکوع سے سر اٹھاتے تو یہ دعا پڑھتے:

رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ مِلْأَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمِلْأَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ (احمد، مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

اے رب! تیرے ہی لئے حمد ہے، آسمانوں بھر، زمین بھر اور جو ان دونوں کے مابین ہے اور جو چیز تو اس کے بعد چاہے، اس کے برابر

۳- حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب رکوع سے سر اٹھاتے تو یہ دعا پڑھتے:

اَللّٰهُمَّ لَکَ الْحَمْدُ مِلْأَ السَّمَاءِ وَمِلْأَ الْأَرْضِ وَمِلْأَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ اَللّٰهُمَّ طَهِّرْنِيْ بِالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَالْمَاءِ الْبَارِدِ- اَللّٰهُمَّ طَهِّرْنِيْ مِنَ الذُّنُوْبِ وَنَقِّنِيْ مِنْهَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ (احمد، مسلم)

اے اللہ! تیرے ہی لئے حمد ہے آسمان بھر، زمین بھر اور ہر اس چیز بھر جو تو اس کے بعد چاہے، اے اللہ! مجھے گناہوں سے پاک کر دے اور اس طرح پاک صاف، کر دے جس طرح سفید کپڑا میل سے پاک صاف کیا جاتا ہے-

۴- حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تو یہ دعا پڑھتے:

اللھم ربنا لک الحمد ملا السموات وملا الارض وملا ما شئت من شی بعد اہل الثناء والمجد- احق ما قال العبد وکلنا لک عبد- لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذالجد منک الجد- (احمد، مسلم، ابوداؤد)

اے اللہ! ہمارے پروردگار! تیرے ہی لئے حمد ہے آسمانوں بھر، زمین بھر، ہر اس چیز بھر جسے تو اس کے بعد چاہے- اے ثنا اور بزرگی کے مالک! ایک چیز ہے جس کا کہنا بندے پر سب سے زیادہ حق ہے اور ہم میں سے ہر ایک تیرا بندہ ہے اور جس چیز کو تو روکے اسے دینے والا کوئی نہیں اور جسے تو دے اسے روکنے والا کوئی نہیں اور کسی بڑائی والے کو تیرے پاس اس کی بڑائی کام نہیں دے سکتی-

۱۱- سجدہ میں جانے اور سجدہ سے اٹھنے کی ہیئت

سجدہ میں جاتے وقت پہلے گھٹنے زمین پر رکھے جائیں اور پھر ہاتھ، سجدہ سے اٹھتے

وقت پہلے ہاتھ زمین سے اٹھائے جائیں اور پھر گھٹنے۔

حضرت وائل بن حجرؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ ﷺ سجدہ کرتے، تو اپنے ہاتھوں سے پہلے اپنے گھٹنے زمین پر رکھتے اور جب سجدہ سے اٹھتے تو اپنے گھٹنوں سے پہلے اپنے ہاتھ اٹھاتے"(۱) (ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

۱۲- سجدہ کی ہیئت

سجدہ میں مندرجہ ذیل چیزیں مسنون ہیں:-

حضرت عبداللہ بن بحینہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب سجدہ فرماتے تو اپنے دونوں بازو اپنے پہلوؤں سے دور رکھتے، یہاں تک کہ آپ کی بغلیں ظاہر ہو جاتیں"۔ (بخاری و مسلم)

حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم سجدہ کرو تو اپنے ہاتھوں کو زمین پر رکھو اور کہنیوں کو اوپر اٹھاؤ"۔ (مسلم)

---

(۱) یہ حضرت عمرؓ، امام نخعیؒ، امام ابو حنیفہؒ، سفیان ثوریؒ، احمد بن حنبلؒ اور جمہور کا مسلک ہے اور اسی کو امام خطابیؒ، ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ نے اختیار کیا ہے۔ اس بارے میں امام مالکؒ، اوزاعیؒ، ابن حزمؒ اور عام محدثین کا مسلک یہ ہے کہ سجدہ میں جاتے وقت پہلے ہاتھ زمین پر رکھے جائیں اور پھر گھٹنے، اٹھتے وقت پہلے گھٹنے زمین سے اٹھائے جائیں اور پھر ہاتھ۔ ان کا استدلال حضرت ابو ہریرہؓ کی اس روایت سے ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص سجدہ کرے تو اسے اونٹ کی طرح نہیں بیٹھنا چاہئے۔ اسے چاہئے کہ پہلے اپنے ہاتھ (زمین پر) رکھے اور پھر گھٹنے"۔ (احمد، ابو داؤد، نسائی)

اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ جمہور کے نزدیک حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت منسوخ ہے۔ دوسری طرف امام مالکؒ اور عام محدثین نہ صرف حضرتِ ابو ہریرہؓ کی روایت منسوخ نہیں مانتے بلکہ وہ اسے حضرتِ وائلؓ کی روایت پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ حضرتِ ابو ہریرہؓ کی روایت میں نبی ﷺ کا حکم بیان ہوا ہے اور حضرتِ وائل کی روایت میں حضور کا عمل۔ امام شافعیؒ کا مسلک ان دونوں مسلکوں کے بین بین ہے، اور وہ یہ کہ سجدہ میں جاتے وقت پہلے ہاتھ رکھے جائیں اور بعد میں گھٹنے اور اٹھتے وقت پہلے ہاتھ اٹھائے جائیں اور بعد میں گھٹنے۔ (نیل الاوطار ج ۲ ص ۲۱۲۔ معالم السنن ج ۱)

لیکن اس بارے میں اعتدال بھی ضروری ہے، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "سجدہ میں اعتدال کرو اور تم میں سے کوئی شخص کتے کی طرح اپنے بازوؤں کو نہ پھیلائے"۔ (بخاری، مسلم، ابو داؤد)

۲- ہاتھوں کی انگلیوں کا آپس میں ملانا، حاکم اور ابن حبان کی روایت ہے کہ نبی ﷺ جب رکوع فرماتے تو ہاتھوں کی انگلیوں کو کھلا رکھتے، اور جب سجدہ فرماتے تو انھیں آپس میں ملا لیتے"۔

۳- دونوں ہاتھوں کا کندھوں یا کانوں کے برابر رکھنا، اس بارے میں دونوں طرح کی احادیث موجود ہیں۔(۱)

۴- ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کا قبلہ رخ رکھنا، حضرت ابو حمیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب سجدہ فرماتے تو اپنے بازوؤں کو نہ زمین پر بچھائے ہوئے رکھتے اور نہ کھینچے ہوئے۔ آپ ﷺ اپنے دونوں پاؤں کی انگلیوں کو قبلہ رخ رکھتے۔(بخاری)

۵- پیٹ کا رانوں سے دور رکھنا، حضرت ابو حمیدؓ ہی سے روایت ہے کہ جب نبی ﷺ سجدہ فرماتے تو اپنی دونوں رانوں کو پھیلا لیتے، اس طرح کہ آپ کا پیٹ رانوں کے کسی حصہ پر نہ ہوتا"۔(۲) (ابو داؤد)

۱۴- سجدہ کی دعا

سجدہ میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى (میرا بلند و برتر رب پاک ہے) کہنا مسنون ہے۔(۳) اس بارے میں متعدد احادیث ہیں جن میں ایک حدیث حضرت عقبہ بن عامرؓ کی

---

(۱) شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک سجدہ میں دونوں ہاتھ مونڈھوں کے برابر، مالکیہ کے نزدیک کانوں کے برابر اور حنفیہ کے نزدیک (مونڈھوں اور کانوں کے درمیان) چہرے کے برابر رکھے جائیں گے۔

(الفقہ، ج ا ص ۲۶۱)

(۲) ائمہ اربعہ کے نزدیک یہ تمام امور اس وقت ہیں جبکہ ان سے دوسرے نمازی کو تکلیف نہ ہو۔ اگر ان سے دوسروں کو تکلیف ہو تو یہ جائز نہیں ہیں۔ حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک عورت کے لئے سجدہ میں اپنے پیٹ کو رانوں سے ملانا مسنون ہے کیونکہ اس سے اس کے ستر کی حفاظت ہوتی ہے۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا ص ۲۶۲)

(۳) حنابلہ کے نزدیک ایک مرتبہ واجب ہے اور اس سے زیادہ مرتبہ مسنون (الفقہ ج ا ص ۳۰۰)

ہے کہ جب سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی" نازل ہوئی، تو ہم سے نبی ﷺ نے فرمایا اسے اپنے سجدوں کے لئے کر لو" (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، حاکم)

اگرچہ رکوع اور سجدہ میں ایک ایک مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِیْم اور سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰی کہنے سے اطمینان کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تسبیح کم سے کم تین مرتبہ ہونی چاہئے اور اس سے زیادہ پانچ، سات، نو دس اور گیارہ مرتبہ بھی ہو سکتی ہے بلکہ اگر انسان تنہا نماز پڑھ رہا ہو تو اسے زیادہ سے زیادہ تعداد میں تسبیح کہنی چاہئے۔

تسبیح کے علاوہ سجدہ میں متعدد دعائیں احادیث سے ثابت ہیں جن میں سے ہم چند کا ذیل میں ذکر کرتے ہیں:

۱۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سجدے میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ لَکَ سَجَدْتُ وَبِکَ اٰمَنْتُ وَلَکَ اَسْلَمْتُ سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ خَلَقَهٗ فَصَوَّرَهٗ فَاَحْسَنَ صُوَرَهٗ فَشَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ، فَتَبَارَکَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔ (مسلم۔احمد)

اے اللہ! میں نے تجھے سجدہ کیا، تجھ پر ایمان لایا اور اپنے آپ کو تیرے حوالے کر دیا۔ میرے چہرے نے اس ذات پاک کو سجدہ کیا جس نے اسے پیدا کیا اور اس کی بہترین صورت بنائی، اس نے اسے کان اور آنکھیں دیں۔ لہذا بابرکت ہو اللہ تعالیٰ جو بہترین خالق ہے۔

۲۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ تہجد کی نماز کے وقت سجدہ میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ قَلْبِيْ نُوْرًا وَّفِيْ سَمْعِيْ نُوْرًا وَّفِيْ بَصَرِيْ نُوْرًا وَّعَنْ يَّمِيْنِيْ نُوْرًا وَّعَنْ يَسَارِيْ نُوْرًا وَّاَمَامِيْ نُوْرًا وَّخَلْفِيْ نُوْرًا وَّفَوْقِيْ نُوْرًا وَّتَحْتِيْ نُوْرًا وَّاجْعَلْنِيْ نُوْرًا۔ (احمد، مسلم)

اے اللہ! میرے دل میں نور کر دے، میرے کانوں میں نور کر دے، میری ساعت میں نور کر دے، میری بائیں طرف نور کر دے، میری دائیں طرف نور کر دے، میرے آگے نور کر دے، میرے پیچھے نور کر دے، میرے اوپر نور کر دے، میرے نیچے نور کر دے اور خود مجھے نور کر دے۔

۳- حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک رات نبی ﷺ کو بستر میں نہ پایا- ہاتھ سے ٹٹولا، تو آپ نماز پڑھ رہے تھے اور سجدہ میں یہ دعا پڑھ رہے تھے:

رَبِّ اَعْطِ نَفْسِیْ تَقْوَاهَا وَ زَکِّهَا اَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَکَّاهَا، اَنْتَ وَلِیُّهَا وَمَوْلَاهَا (احمد)	اے میرے پروردگار میرے نفس کو اس کا تقویٰ عطا کر- تو ہی اسے سب سے زیادہ پاک وصاف کر سکتا ہے- تو ہی اس کا آقا اور کارساز ہے-

۴- حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سجدہ میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ کُلَّهٗ، دِقَّهٗ وَ جِلَّهٗ، اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ، وَعَلَانِیَتَهٗ، وَسِرَّهٗ (مسلم، ابوداؤد)	اے اللہ! میرے سارے گناہ معاف کر دے، چھوٹے، بڑے، اگلے، پچھلے، ظاہر اور پوشیدہ

۵- حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک رات انہوں نے نبی ﷺ کو نہ پایا- دیکھا کہ آپ مسجد میں ہیں اور سجدہ میں یہ دعا پڑھ رہے ہیں-

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِرِضَاکَ مِنْ سَخَطِکَ وَ اَعُوْذُبِکَ بِمُعَافَاتِکَ مِنْ عُقُوْبَتِکَ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْکَ، لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ، اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ (مسلم، ابوداؤد، ترمذی)	اے اللہ! میں تیری ناراضگی سے تیری رضا مندی کی پناہ مانگتا ہوں اور تیرے عفو و درگزر کی تیری سزا سے پناہ مانگتا ہوں- میں تجھ سے تیری ہی پناہ مانگتا ہوں- میں تیری حمد وثناء شمار نہیں کر سکتا تو ایسا ہی ہے جیسا کہ خود تو نے اپنی حمد وثنا کی-

۶- حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک رات نبی ﷺ کو نہ پایا- دیکھا کہ آپ رکوع یا سجدہ میں ہیں اور یہ دعا پڑھ رہے ہیں-

سُبْحَانَکَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِکَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ (احمد، مسلم، نسائی)	اے اللہ! تو پاک ہے اور تیری حمد کرتا ہوں- تیرے سوا کوئی معبود نہیں-

۷- نبی ﷺ سجدے میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے-

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ خَطِیْئَتِیْ وَ جَهْلِیْ وَاِسْرَافِیْ فِیْ اَمْرِیْ، وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّیْ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ جِدِّیْ وَهَزْلِیْ وَخَطَئِیْ وَ عَمَدِیْ وَ کُلُّ ذَالِکَ عِنْدِیْ- اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ اَنْتَ اِلٰهِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ

اے اللہ! میری غلطی اور لاعلمی کو معاف فرما مجھ سے جو زیادتی ہوئی ہے اسے معاف فرما اور جو چیز تو مجھ سے زیادہ میرے اندر جانتا ہے اسے معاف فرما- اے اللہ میری سنجیدگی، میری غیر سنجیدگی، میری غلطی سے یا قصداً کی ہوئی باتوں کو معاف فرما- یہ سب چیزیں میرے اندر ہیں- اے اللہ میں نے جو گناہ پہلے کئے ہیں یا آگے کئے ہیں، چھپ کر کئے ہیں یا کھلم کھلا کئے ہیں سب کو معاف فرما تو ہی میرا اللہ ہے- تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں-

سجدہ میں دعا بہت جلد قبول ہوتی ہے نبی ﷺ کا ارشاد ہے "تم میں سے کوئی شخص اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے، لہٰذا تم اس میں بہت دعا کیا کرو"-

سجدہ اور رکوع میں قرآن کا پڑھنا ناجائز ہے- نبی ﷺ نے فرمایا "مجھے رکوع اور سجدہ میں قرآن پڑھنے سے منع کر دیا گیا ہے"- (احمد، مسلم)

۱۴- دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنے کی ہیئت اور دعا

دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنے کی مسنون اور افضل شکل یہ ہے کہ بائیں پاؤں کو بچھا کر اس پر بیٹھا جائے اور دائیں پاؤں کو سیدھا کھڑا کیا جائے، اس طرح کہ اس کی انگلیاں کعبہ کے رخ ہوں- حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ بائیں پاؤں کو بچھاتے اور دائیں پاؤں کو سیدھا کھڑا رکھتے تھے"- (بخاری و مسلم)

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں "نماز کی سنت یہ ہے کہ دائیں پاؤں کو سیدھا کھڑا کر کے اس کی انگلیوں کو کعبہ کی طرف رکھا جائے اور بائیں پاؤں پر بیٹھا جائے (۱)"- (نسائی)

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک مرد کے بیٹھنے کی شکل یہی ہے لیکن عورت کے بیٹھنے کی شکل یہ ہے کہ وہ زمین پر بیٹھے اور اپنی دونوں رانوں کو ملا کر بائیں پاؤں کو دائیں ران کے نیچے رکھے- مالکیہ کے نزدیک دائیں پاؤں کو زمین کے بجائے بائیں پاؤں پر رکھنا مستحب ہے- (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۲۶۴)

بیٹھنے کی ایک شکل وہ ہے جسے اقعاء کہا جاتا ہے اس کی دو صورتیں ہیں۔

۱۔ دونوں پاؤں کو کھڑا کر کے زمین پر یا ایڑیوں پر بیٹھا جائے۔

۲۔ دونوں پاؤں کو بچھا کر ان پر بیٹھا جائے۔

یہ دونوں صورتیں جمہور سلف (جن میں ائمہ اربعہ شامل ہیں) کے نزدیک مکروہ ہیں (المغنی ج ۱ ص ۵۶۴) کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے (نماز کے دوران مجھے) تین چیزوں سے منع فرمایا ہے، ایک مرغے کی طرح ٹھونگیں مارنے سے (یعنی جلدی جلدی سجدے کرنے سے) دوسرے کتے کی طرح اقعاء سے اور تیسرے لومڑی کی طرح ادھر ادھر جھانکنے سے (۱)" (احمد، بیہقی، طبرانی)

دونوں سجدوں کے درمیان مندرجہ ذیل دو دعائیں حدیث میں مذکور ہیں۔

(۱) رَبِّ اغْفِرْلِيْ، رَبِّ اغْفِرْلِيْ اے اللہ! مجھے بخش دے' اے اللہ! مجھے بخش دے۔
(نسائی، ابن ماجہ)

(۲) حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ دونوں سجدوں کے درمیان یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَارْحَمْنِيْ وَ عَافِنِيْ وَاهْدِنِيْ وَارْزُقْنِيْ اے اللہ! مجھے بخش دے' مجھ پر رحم فرما، مجھے عافیت و ہدایت اور رزق عطا فرما۔

(ابو داؤد، ابن ماجہ، حاکم، ترمذی)

یہ دونوں روایتیں سند کے لحاظ سے حسن (اوسط درجہ کی) ہیں۔لہٰذا دونوں سجدوں کے

---

(۱) اکثر اہل حدیث علماء کے نزدیک ان دونوں صورتوں میں سے پہلی تو مکروہ ہے کیونکہ کتے کے بیٹھنے کی شکل یہی ہے لیکن دوسری صورت جائز ہے کیونکہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔"اقعاء نبی ﷺ کی سنت ہے"۔ (مسلم)، طاؤس فرماتے ہیں "میں نے اللہ کے تینوں بندوں عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کو اقعاء کرتے دیکھا۔

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اہل حدیث علماء اقعاء کے متعلق دونوں قسم کی احادیث میں تطبیق دیتے ہیں اور ائمہ اربعہ ان میں تطبیق دینے کے بجائے جواز کی تمام احادیث کو حضرت ابو ہریرہؓ کی مندرجہ بالا حدیث سے منسوخ قرار دیتے ہیں۔(تحفۃ الاحوذی ج ۱ ص ۲۳۶)

درمیان دعا کے مستحب ہونے میں اختلاف ہے۔ (۱)

۱۵- جلسۂ استراحت

اس سے مراد یہ ہے کہ پہلی اور تیسری رکعت میں دونوں سجدے پورے کر لینے کے بعد دوسری اور چوتھی رکعت کے لئے کچھ دیر بیٹھ کر اٹھ جائے۔

حضرت مالک بن حویرثؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا، جب آپ طاق رکعت میں ہوتے تو اس وقت تک (اگلی رکعت کے لئے) نہ اٹھتے، جب تک سیدھے بیٹھ نہ جاتے (۲)"۔ (بخاری، احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی)

۱۶- آخری تشہد میں بیٹھنے اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کرنے کی ہیئت

تشہد میں بیٹھنا اور شہادت (اشہد ان لا الہ الا اللہ) کے وقت انگوٹھے سے قریب والی انگلی کو ہلانا---اور اس سے سجدہ کی جگہ کی طرف اشارہ کرنا مسنون ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب تشہد کے لئے بیٹھتے تو دائیں ہاتھ کو دائیں ران پر اور بائیں ہاتھ کو بائیں ران پر رکھتے۔(دائیں ہاتھ کی) تمام انگلیوں کو اکٹھا کر لیتے اور انگوٹھے سے قریب والی انگلی سے اشارہ فرماتے۔(مسلم)

حضرت وائل بن حجرؓ سے روایت ہے "پھر آپ نے اپنی انگلی اٹھائی اور میں نے دیکھا کہ

---

(۱) امام شافعیؒ، احمد اسحاق (اور اہل حدیث علماء) کے نزدیک یہ مستحب ہے۔ امام مالک کے نزدیک مستحب نہیں ہے کیونکہ انہوں نے اسے روایت نہیں کیا۔ ابن العربی بحوالہ اوجز المسالک ج ۱ ص ۲۲۱) حنفی فقہ کی کتابوں میں بھی اس دعا کا ذکر نہیں ہے۔ حنابلہ کے نزدیک دونوں سجدوں کے درمیان کی دعا واجب ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۲۰۰)

(۲) جلسۂ استراحت کے سنت ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ، احمد بن حنبل اور بعض محدثین کے نزدیک یہ سنت ہے لیکن امام ابو حنیفہ، امام مالک اور بعض محدثین کے نزدیک یہ سنت نہیں ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اگر جلسۂ استراحت سنت ہوتا تو جن احادیث میں نبی ﷺ کی نماز کی کیفیت بیان ہوئی ہے ان میں اس کا ذکر ہوتا۔ ممکن ہے نبی ﷺ نے کسی عذر کی بناء پر کبھی جلسۂ استراحت فرمایا ہو"۔ (نیل الاوطار ج ۲ ص ۲۲۶)

آپ اسے ہلا رہے ہیں اور دعا پڑھ رہے ہیں۔(۱) (ابو داؤد)

پہلے تشہد کے بیٹھنے کی کیفیت وہی ہے جو دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنے کی ہے لیکن دوسرے تشہد میں بیٹھنے کی کیفیت یہ ہے کہ دایاں پاؤں کھڑا رہے بائیں پاؤں کو کھینچ کر دائیں پاؤں کے نیچے رکھا جائے اور پھر زمین پر بیٹھا جائے۔اس طرح بیٹھنے کو تورک کہتے ہیں (۲)۔ حضرت ابو حمیدؓ نبی ﷺ کی نماز کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "پھر جب آپ دوسری رکعت میں بیٹھے، تو اپنا بایاں پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھے اور دائیں پاؤں کو کھڑا رکھا اور آخری رکعت میں اپنے بائیں پاؤں کو کھینچا اور دائیں کو کھڑا رکھا اور زمین پر بیٹھے"۔(بخاری)

۱۷- درود

نماز کی آخری رکعت میں تشہد کے بعد نبی ﷺ پر درود پڑھنا مسنون (۳) ہے۔ مختلف صحیح احادیث میں درود کے جو مختلف الفاظ آئے ہیں ان سب کو یوں ایک ساتھ جمع کیا جا سکتا ہے (۴)۔

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک شہادت کی انگلی لَا اِلٰہ پر اٹھائی اور اِلَّا اللہ پر رکھ لی جائے گی۔ شافعیہ کے نزدیک اِلَّا اللہ پر اٹھائی اور اسی وقت رکھ لی جائے گی۔ مالکیہ کے نزدیک سلام پھیرنے تک انگلی اٹھائے رکھنا اور اس سے دائیں بائیں، اوپر اور نیچے اشارہ کرنا مسنون ہے۔ حنبلیہ کے نزدیک جب بھی اللہ تعالیٰ کا نام آئے انگلی کا بغیر ہلائے اٹھائے رکھنا مسنون ہے۔(الفقہ ج ۱ ص ۲۶۵)

(۲) امام ابو حنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کے نزدیک ہر حال میں بیٹھنے کی ایک ہی صورت مستحب ہے یعنی بائیں پاؤں کو بچھا کر اس پر بیٹھنا اور دائیں پاؤں کو کھڑا رکھنا۔ امام مالکؒ اور شافعیؒ کے نزدیک آخری رکعت میں تورک مسنون ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک تورک صرف اس نماز میں مسنون ہے جس میں دو تشہد ہوں۔(نیل الاوطار ج ۲، ص ۲۳۰) حنفیہ کے نزدیک عورت کے لئے نماز میں ہر جگہ تورک مسنون ہے۔(الفقہ ج ۱ ص ۲۶۴)

(۳) شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک آخری رکعت میں تشہد کے بعد درود نماز کے فرائض میں داخل ہے۔ حضرت عمرؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور جابرؓ بن زید وغیرہ کا بھی یہی مذہب ہے لیکن جمہور، محدثین و فقہا کے نزدیک درود نماز کی سنتوں میں سے ہے۔(نیل الاوطار، الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۲۱۲)

(۴) حنفیہ کے نزدیک درود کے یہ الفاظ افضل ہیں "اللھم صل علی محمد وعلی ال محمد کما صلیت علی ابراہیم و علی ال ابراہیم انک حمید مجید۔ اللھم بارک علی محمد وعلی ال محمد کما بارکت علی ابراہیم و علی ال ابراہیم انک حمید مجید (متاخرین شافعیہ نے درود میں نبی ﷺ کے نام سے پہلے سیدنا کا اضافہ کیا ہے۔(الفقہ)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَ رَسُوْلِكَ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِهٖ اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ ذُرِّيَّتِهٖ وَاَهْلِ بَيْتِهٖ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ- اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدِ نِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ فِي الْعَالَمِيْنَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ-

(بخاری، مسلم، احمد' ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، نسائی)

اے اللہ! درود بھیج اپنے بندے اور رسول محمد ﷺ پر جو نبی امی ہیں اور درود بھیج محمد کی اولاد اور آپ کی ازواج پر جو مومنوں کی مائیں ہیں اور درود بھیج آپ کی اولاد پر اور آپ کے تمام گھر والوں پر، جیسا کہ تو نے درود بھیجا ابراہیمؑ اور ان کی اولاد پر- بیشک تو حمد اور بزرگی والا ہے- اے اللہ برکت نازل فرمانبی امی محمدؐ پر، آلِ محمدؐ پر اور آپؐ کی ازواج اور اولاد پر، جیسا کہ تو نے ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ پر برکت نازل فرمائی تمام عالموں میں بیشک تو حمد اور بزرگی والا ہے-

۱۸- سلام سے پہلے کی دعائیں

درود کے بعد اور سلام سے پہلے دعا کرنا مسنون ہے اس موقع کے لئے احادیث میں متعدد دعائیں آتی ہیں- اختصار کے خیال سے ہم ان میں سے صرف ۸ کو نقل کرتے ہیں-

۱- حضرت ابو بکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مجھے نماز میں پڑھنے کے لئے یہ دعا سکھائی-

اَللّٰهُمَّ اِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي ظُلْمًا كَثِيْرًا وَّلَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْ لِي مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِي اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ- (بخاری، مسلم)

اے اللہ! میں نے اپنے آپ پر بہت ظلم کیا ہے اور تیرے سوا کوئی دوسری ہستی گناہوں کو نہیں بخش سکتی- اس لئے تو اپنی طرف سے میری مغفرت فرما اور مجھ پر رحم کر، بیشک تو بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے-

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی

شخص تشہد پڑھے تو چار چیزوں سے اللہ کی پناہ مانگے (۱) اور یہ دعا کرے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ وَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ۔ (بخاری، مسلم)

اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں۔ عذابِ جہنم سے، عذابِ قبر سے، زندگی اور موت کی آزمائش سے اور مسیح دجال کی آزمائش سے

(۳) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ سلام اور تشہد کے درمیان نبی ﷺ یہ دعا پڑھا کرتے تھے:۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ مَا قَدَّمْتُ وَ مَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَ مَا اَعْلَنْتُ وَ مَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّیْ۔ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ اَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ (مسلم)

اے اللہ! میرے سارے گناہ جو میں نے پہلے کئے یا بعد میں کئے، چھپ کر کئے یا علانیہ کئے، معاف کر دے۔ میری زیادتیوں کو معاف کر دے اور میرے اس گناہ کو معاف کر دے جو تو میرے متعلق مجھ سے زیادہ جانتا ہے تو ہی آگے کرنے والا اور تو ہی پیچھے کرنے والا ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔

(۴) حضرت شداد بن اوسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اپنی نماز میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الثَّبَاتَ فِی الْاَمْرِ وَالْعَزِيْمَةَ عَلَى الرُّشْدِ وَ اَسْئَلُكَ شُكْرَ نِعْمَتِكَ وَ حُسْنَ عِبَادَتِكَ وَ اَسْئَلُكَ قَلْبًا سَلِيْمًا وَ لِسَانًا صَادِقًا وَ اَسْئَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا تَعْلَمُ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا تَعْلَمُ وَاسْتَغْفِرُكَ لِمَا تَعْلَمُ۔ (نسائی)

اے اللہ! میں تجھ سے ثابت قدمی اور بھلائی کے کام میں عزیمت طلب کرتا ہوں، میں تجھ سے تیری نعمت پر شکر اور تیری عبادت میں عمدگی کی توفیق طلب کرتا ہوں۔ میں تجھ سے قلب سلیم اور لسان صادق طلب کرتا ہوں تیرے علم میں جو بھلائی ہے میں تجھ سے وہ طلب کرتا ہوں اور تیرے علم میں جو برائی ہے میں اس سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور اپنے اس گناہ پر معافی چاہتا ہوں جو تو جانتا ہے۔

---

(۱) نبی ﷺ کے اس حکم سے استدلال کرتے ہوئے ظاہر یہ کا مذہب یہ ہے کہ پہلے اور دوسرے دونوں تشہدوں کے بعد ان چار چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنا ضروری ہے ورنہ نماز نہیں ہوتی لیکن جمہور محدثین اور فقہا نے اس حکم کو استحباب پر صرف آخری تشہد کے بعد دعا کرنے پر محمول کیا ہے۔ (نیل الاوطار ج ۲)

(۵) حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے انہیں یہ دعا پڑھنے کے لیے سکھائی۔

اَللّٰهُمَّ اَلِّفْ بَيْنَ قُلُوبِنَا وَ اَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِنَا وَاهْدِنَا سُبُلَ السَّلَامِ وَ نَجِّنَا مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّورِ وَ جَنِّبْنَا الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ، وَبَارِكْ لَنَا فِيْ اَسْمَاعِنَا وَ اَبْصَارِنَا وَ قُلُوبِنَا وَاَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيَّاتِنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ، وَ اجْعَلْنَا شَاكِرِيْنَ لِنِعْمَتِكَ مُثْنِيْنَ بِهَا قَابِلِيْهَا وَاَتِمَّهَا عَلَيْنَا۔ (ابو داؤد)

اے اللہ! ہمارے دلوں میں الفت ڈال دے اور ہمارے مابین اصلاح فرما۔ ہمیں سلامتی کے راستوں کی ہدایت فرما۔ ہمیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے جا' ہمیں تمام کھلی اور پوشیدہ برائیوں سے بچا اور ہمارے لیے ہمارے کانوں' آنکھوں' دلوں' بیویوں اور اولاد میں برکت عطا فرما ہم پر نظرِ کرم رکھ۔ بے شک تو ہی توبہ قبول کرنے اور رحم کرنے والا ہے۔ ہمیں اپنی نعمت کا شکر گذار' ان کی ثناء کرنے اور اسے قبول کرنے والے بنا اور ہم پر اسے مکمل کر۔

(۶) حضرت عمار بن یاسرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نماز میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ بِعِلْمِكَ الْغَيْبَ وَ قُدْرَتِكَ عَلَى الْخَلْقِ اَحْيِنِىْ مَا عَلِمْتَ الْحَيَاةَ خَيْرًا لِّىْ وَ تَوَفَّنِىْ اِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّىْ اَسْئَالُكَ خَشْيَتَكَ فِي الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ وَ كَلِمَةِ الْحَقِّ فِي الْغَضَبِ وَ الرِّضَاءِ، وَ الْقَصْدِ فِي الْفَقْرِ وَ الْغِنٰى وَلَذَّةِ النَّظَرِ اِلَى وَجْهِكَ، وَ الشَّوْقِ اِلَى لِقَائِكَ وَ اَعُوْذُبِكَ مِنْ ضَرَّاءَ مُضِرٍّوَمِنْ فِتْنَةٍ مُّضِلَّةٍ،

اے اللہ! اپنے علمِ غیب اور مخلوق پر اپنی قدرت کے ذریعے مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک تو زندگی میرے لیے بہتر سمجھے اور مجھے دنیا سے اٹھا لے جب تک موت کو میرے لیے بہتر سمجھے۔ میں تجھ سے علانیہ اور پوشیدہ طور پر تجھ سے ڈرنے' خوشی و ناراضگی ہر حال میں کلمہ حق کہنے' خوشحالی و تنگدستی میں اعتدال پر رہنے' تیری طرف دیکھنے کی لذت سے بہرہ اندوز

اَللّٰھُمَّ زَیِّنَّا بِزِیْنَةِ الْاِیْمَانِ' وَ اجْعَلْنَا ھُدَاةً مَّھْدِیِّیْنَ- (احمد' نسائی)

ہونے اور تجھ سے ملنے کا شوق رکھنے کی توفیق طلب کرتا ہوں- میں نقصان پہنچانے والی باتوں کے نقصان اور گمراہ کرنے والی آزمائش سے تیری پناہ مانگتا ہوں- اے اللہ! ہمیں ایمان کی زینت سے آراستہ کر اور ہمیں ہدایت کرنے اور ہدایت پر رہنے والے بنا-

(۷) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ میں نبی ﷺ کے ساتھ کھڑا تھا اور ایک آدمی نماز پڑھ رہا تھا- جب رکوع کیا اور تشہد کیا تو یہ دعا پڑھی-

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِاَنَّ لَكَ الْحَمْدُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْمَنَّانُ' بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَا ذَالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ

اے اللہ! میں تجھ سے اس ذریعے سے سوال کرتا ہوں کہ تیرے ہی لیے حمد و ثناء ہے- تیرے سوا کوئی معبود نہیں' تو ہی عطا کرنے والا اور زمین اور آسمانوں کا بنانے والا ہے- اے بزرگی و برتری کے مالک! اے ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والے! میں تیرے حضور سوال کرتا ہوں-"

نبی ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس شخص نے کس ذریعہ سے دعا مانگی ہے؟" انہوں نے عرض کی "اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں-" فرمایا "مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے' اس شخص نے اللہ تعالیٰ سے اس کے اسمِ اعظم (بڑے نام) کے ذریعے دعا کی ہے جس کے ذریعے اگر اس سے دعا کی جاتی ہے تو ضرور قبول کرتا ہے اور اس سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ دیتا ہے-" (نسائی)

(۸) عمیر بن سعدؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابنِ مسعودؓ ہمیں تشہد سکھایا کرتے تھے پھر فرماتے جب تم میں سے کوئی شخص تشہد سے فارغ ہو جائے تو اسے یہ دعا پڑھنی چاہیے-

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنَ الْخَیْرِ كُلِّهٖ مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَ مَالَمْ اَعْلَمْ- اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنْ خَیْرِ مَاسَئَلَكَ مِنْهُ عِبَادِكَ

اے اللہ! میں تجھ سے ہر وہ بھلائی طلب کرتا ہوں جسے میں جانتا ہوں یا نہیں جانتا اے اللہ! میں تجھ سے ہر وہ بھلائی طلب

الصَّالِحُوْنَ وَ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّمَا اَسْتَعَاذَكَ مِنْ عِبَادِكَ الصَّالِحُوْنَ" رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

کرتا ہوں جو تجھ سے تیرے نیک بندوں نے طلب کی اور ہر اس برائی سے تیری پناہ مانگتا ہوں جس سے تیرے نیک بندوں نے تیری پناہ مانگی۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی اچھائی عطاء فرما اور آخرت میں بھی اچھائی عطا فرما اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔"

اس کے بعد حضرت ابنِ مسعودؓ فرماتے کسی نبی یا کسی نیک بندے نے کوئی دعا نہیں کی جو اس دعا میں شامل نہ ہو" (ابن ابی شیبہ)

۱۹۔ سلام کے بعد اذکار اور دعائیں:

سلام کے بعد اللہ تعالیٰ کا ذکر اور دعا مسنون ہے[۱]۔ احادیث سے اس موقع کے لیے متعدد اذکار ثابت ہیں' جن میں سے ہم چند کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ بلند آواز سے اللہ اکبر کہنا: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے ختم ہو جانے کو آپ کی تکبیر (اللہ اکبر کہنے) سے پہچانتا تھا۔" (بخاری و مسلم)

۲۔ حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی نماز سے پلٹتے تو تین مرتبہ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ کہتے اور پھر یہ فرماتے:

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذَالْجَلَالِ وَ الْإِكْرَام

اے اللہ تو ہی سلامتی والا اور سلامتی عطا کرنے والا ہے۔ اے بزرگی و برتری کے مالک تو بابرکت ہے۔

(۳) حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا "اے معاذ! مجھے تم سے محبت ہے۔" حضرتِ معاذؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول!

---

(۱) نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے متعدد موقعوں پر ثابت ہے۔ لیکن اسے لازم سمجھتے ہوئے اس پر ہمیشگی کرنا صحیح نہیں ہے۔ مفصل بحث کتاب الدعا میں آئے گی۔ (تحفۃ الاحوذی ج ا ص ۲۴۵)

آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں اور مجھے بھی آپ سے محبت ہے"۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اے معاذ! میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم کسی نماز کے بعد یہ ذکر نہ چھوڑو:

اَللّٰهُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَ شُکْرِکَ وَ حُسْنِ عِبَادَتِکَ (احمد، ابو داؤد، نسائی، ابن خزیمہ، حاکم)

اے اللہ! مجھے توفیق بخش کہ تیرا ذکر و شکر کروں اور باحسن طریق تیری عبادت کروں۔

(۴) حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نماز کے بعد فرمایا کرتے۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْکُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ، وَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اِیَّاهُ، اَهْلَ النِّعْمَةِ وَالْفَضْلِ وَالثَّنَاءِ الْحَسَنِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ وَلَوْ کَرِهَ الْکَافِرُوْنَ (احمد، ابو داؤد، نسائی)

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کی بادشاہت اور اسی کی حمد و ثنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ ہی کے سہارے طاقت و ہمت ہے۔ ہم اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں کرتے وہ نعمت، فضل و کرم اور عمدہ حمد و ثنا کا مالک ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ہم اسی کے لئے اطاعت و فرمانبرداری کو خالص کرتے ہیں، خواہ کافر ناپسند ہی کریں

(۵) حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ہر فرض نماز کے بعد فرمایا کرتے:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْکُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ۔ اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْکَ الْجَدُّ

(احمد، بخاری، نسائی)

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کی بادشاہت اور حمد و ثنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اے اللہ جو چیز تو عطا فرمائے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جسے روکے اسے کوئی عطا کرنے والا نہیں اور تیرے مقابلہ میں کسی بڑائی والے کی بڑائی اسے کوئی کام نہیں دیتی۔

(۶) حضرت عقبہ بن عامرؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں ہر نماز کے بعد سورہ قل ھو اللہ، سورہ قل اعوذ برب الفلق، سورہ قل اعوذ برب الناس پڑھا کروں"۔ (احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی)

(۷) حضرتِ علیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھی، وہ اگلی نماز تک اللہ کی حفاظت میں ہو گیا"۔ (طبرانی)

اس روایت کی سند زیادہ قوی نہیں ہے

(۸) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ (اللہ پاک ہے)، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ (تعریف صرف اللہ کے لئے ہے)، ۳۳ مرتبہ اللہ اکبر (اللہ سب سے بڑا ہے) کہا اور اس طرح ۹۹ مرتبہ ہو جانے کے بعد آخری مرتبہ:

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔	اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ تنہا ہے اور اس کا شریک نہیں۔ اسی کیلئے بادشاہت اور حمد و ثناء ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

کہا اس کے گناہ معاف کر دیئے گئے، اگرچہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں"۔ (احمد، بخاری، مسلم، ابو داؤد)

(۹) حضرتِ کعب بن عجرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "نماز کے بعد کی کچھ دعائیں ہیں جن کے پڑھنے والا کبھی ناکام نہیں ہوتا' ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ ۳۳' مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر"۔ (مسلم)

(۱۰) حضرتِ علیؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ وہ اور حضرتِ فاطمہؓ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ آپ سے ایک خادمہ طلب کریں جو گھر کے کاموں میں ان کا سہارا بنے۔ نبی ﷺ نے اس سے انکار کیا اور فرمایا "تم جو چیز مجھ سے مانگنے آئے ہو، کیا میں تمہیں اس سے ایک بہتر چیز نہ بتاؤں؟ ان دونوں نے عرض کیا "ضرور بتایئے"۔ فرمایا "چند کلمے ہیں جو مجھے جبرئیلؑ نے سکھائے ہیں۔ تم دونوں ہر نماز کے بعد دس مرتبہ سبحان اللہ دس مرتبہ الحمد للہ اور دس مرتبہ اللہ اکبر کہو اور جب سونے لگو تو ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر کہو"۔

(۱۱) بخاری و ترمذی کی روایت ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اپنے بچوں کو یہ کلمات سکھایا کرتے تھے جیسا کہ معلّم بچوں کو لکھنا سکھاتا ہے اور فرماتے ہیں نبی ﷺ نماز کے بعد ان کلمات کے ذریعے اللہ کی پناہ مانگتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْبُخْلِ وَ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَ اَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ اُرَدَّ نِیْ اِلٰی اَرْذَلِ الْعُمُرِ وَ اَعُوْذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْیَا وَ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ۔

اے اللہ! میں بخل سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور بزدلی سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ بے کار عمر کی طرف لوٹا دیا جاؤں اور میں دنیا کے فتنے (آزمائش) سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور قبر کے عذاب سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

وہ چیزیں جو نماز میں جائز ہیں ؎

نماز میں مندرجہ ذیل چیزیں جائز ہیں

رونا

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا (مریم : ۵۸) جب ان پر اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ روتے ہوئے سجدہ میں گر جاتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن شخیرؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا اور آپ کے سینے سے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں جیسے پکتی ہوئی ہنڈیا سے آواز آتی ہے"۔ (احمد، ابو داؤد، نسائی، ترمذی)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ غزوۂ بدر کے دن ہم میں مقداد بن اسودؓ کے سوا کوئی سوار نہ تھا اور رات کو نبی ﷺ کے سوا کوئی قیام کرنے والا نہ تھا۔ آپ ایک درخت کے نیچے نماز پڑھ رہے تھے اور رو رہے تھے یہاں تک کہ صبح ہو گئی"۔ (ابن حبان)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ جب نبی ﷺ کی تکلیف بہت زیادہ ہو گئی اور آپ کو بتایا گیا کہ نماز کا وقت ہو گیا تو آپ نے فرمایا "ابو بکرؓ سے کہو کہ نماز پڑھائیں"۔ حضرت عائشہؓ نے کہا "ابو بکرؓ نرم دل آدمی ہیں، جب وہ قرآن پڑھتے ہیں تو رونے کو برداشت نہیں کر سکتے "۔ آپ نے فرمایا "ان سے کہو کہ نماز پڑھائیں"۔ حضرت عائشہؓ نے پھر یہی بات کہی۔ آپ ﷺ نے فرمایا "ان سے کہو کہ نماز پڑھائیں، تم عورتیں تو یوسفؑ کے زمانے کی عورتوں جیسی ہو(۱)"۔ (بخاری)

---

(۱) جائز سے مراد وہ چیزیں ہیں کہ اگر انسان کو ضرورت پیش آ جائے تو وہ نماز میں انہیں کر سکتا ہے اور ان سے نماز مکروہ یا باطل نہیں ہوتی۔

(۱) اس بارے میں اختلاف نہیں ہے۔ البتہ ائمہ اربعہ کے نزدیک رونا اور آہ کرنا اگر خشیتِ الٰہی یا کسی بیماری کی وجہ سے ہو جسے روکنا مشکل ہو تو جائز ہے اور اگر وہ خشیت الٰہی اور بیماری کی وجہ سے نہ ہو اور وہ دو حرفوں یا ان سے زیادہ پر مشتمل ہو تو اس سے نماز باطل ہو جائے گی۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۲۴۹)

۲- کھنکارنا

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں ایک خاص گھڑی میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، میں آکر اجازت طلب کرتا۔ آپ اگر نماز میں ہوتے تو کھنکار دیتے اور میں داخل ہو جاتا اور اگر آپ فارغ ہوتے تو اجازت دے دیتے"۔(۱) (احمد نسائی)

۳- التفات (یعنی کسی طرف توجہ کرنا)

فرض نماز میں التفات جائز نہیں ہے، فرض کے علاوہ دوسری نمازوں میں سخت ضرورت کے وقت جائز ہے۔

حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اے لوگو! نماز میں التفات سے بچو، اس لئے کہ جو شخص التفات کرتا ہے اس کی نماز نہیں اگر تطوع (فرض کے علاوہ دوسری نمازوں) میں تم مغلوب ہی ہو جاؤ تو فرض میں تو ہرگز مغلوب نہ ہو"۔ (مسند امام احمد)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "نماز میں التفات سے بچو، اس لئے کہ نماز میں التفات سے ہلاکت ہے۔ اگر ناگزیر ہو تو تطوع میں التفات کر لو، نہ کہ فرض میں"۔(ترمذی)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ دائیں اور بائیں التفات فرماتے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے لیکن پیچھے کی طرف اپنی گردن نہ پھیرتے تھے"۔(امام مسند)

۴- سانپ، بچھو، بھڑ اور دوسرے زہریلے اور نقصان دِہ جانوروں کا مارنا

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "نماز میں دو سیاہ جانوروں سانپ اور بچھو کو مار دو (۲)"۔ (احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

---

(۱) حنفیہ، شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک اگر کھنکارنا ضرورت سے ہے اور دو حرفوں سے کم ہے تو اس سے نماز باطل نہ ہو گی لیکن اگر وہ بلا ضرورت ہے یا --- ضرورت سے تو ہے مگر دو حرفوں یا ان، سے زیادہ تو اس سے نماز باطل ہو جائے گی۔ مالکیہ کے نزدیک کھنکارنے سے نماز باطل نہیں ہوتی خواہ وہ کم ہو یا زیادہ اِلّا یہ کہ وہ بلا ضرورت ہو۔(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۲۴۸)

(۲) تمام حنفیہ کے نزدیک نماز میں سانپ اور بچھو کا مارنا جائز ہے۔ البتہ نماز کے متعلق اختلاف ہے ایک قول یہ ہے کہ ان کے مارنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی خواہ ان کا مارنا عمل کثیر ہی سے ہو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اگر ان کا مارنا عمل کثیر سے ہو تو نماز فاسد ہو جائے گی (العرف الشذی شرح ترمذی از مولانا سید انور شاہ صاحب)

۵- سخت ضرورت کے وقت تھوڑا سا چلنا

حضرتِ عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ گھر میں نماز پڑھ رہے تھے اور اندر سے دروازہ بند کیے ہوئے تھے- میں آئی اور دروازہ کھلوایا- آپ چلے اور دروازہ کھول کر اپنی نماز کی جگہ واپس چلے گئے- دروازہ آپ کے سامنے کی طرف تھا"- (احمد، ابوداؤد، نسائی، ترمذی)

حضرتِ عائشہؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نماز پڑھا کرتے تھے جب کوئی انسان دروازہ کھلواتا اور دروازہ سامنے یا دائیں یا بائیں طرف ہوتا تو آپ ﷺ دروازہ کھول دیتے اور آپ ﷺ قبلہ کی طرف پیٹھ نہ کیا کرتے تھے"- (یعنی اگر دروازہ آپ ﷺ کے پیچھے ہوتا تو آپ ﷺ دروازہ نہ کھولتے)"- (دارقطنی)

ارزق بن قیسؒ سے روایت ہے کہ حضرتِ ابو برزہ اسلمیؓ اہواز (عراق کا ایک شہر) میں ایک نہر کے کنارے پر تھے اور اپنے گھوڑے کی لگام ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی- نماز پڑھنے لگے تو گھوڑا پیچھے ہٹنے لگا- آپ بھی اس کے ساتھ پیچھے ہٹنے لگے- خوارج میں سے ایک آدمی نے کہا "اے اللہ! اس بڈھے کو ذلیل کر' کیسے نماز پڑھ رہا ہے؟" جب وہ نماز پڑھ چکے تو کہنے لگے "میں نے تمہاری بات سن لی تھی- میں نبی ﷺ کے ساتھ چھ' سات یا آٹھ غزوات میں شریک رہا ہوں' اس لئے میں نے آپؐ کو اچھی طرح دیکھا ہے اور دین کے معاملے میں آپؐ نے جو آسانی فرمائی ہے اسے بھی دیکھا ہے- میرا اپنے گھوڑے کے ساتھ پیچھے کو ہٹنا میرے لئے اس چیز کی نسبت زیادہ آسان تھا کہ میں اسے چھوڑ دیتا اور وہ ٹھکانے پر آجاتا اور میرے لئے اس کا پکڑنا اور لانا مشکل ہو جاتا- اور حضرتِ ابو برزہؓ نے عصر کی دو رکعتیں پڑھیں (یعنی آپ فرض نماز پڑھ رہے تھے) (احمد' بخاری' بیہقی)

ضرورت کے وقت چلنا فرض اور غیر فرض ہر نماز میں جائز ہے البتہ فرض نماز میں زیادہ چلنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے-(۱)

۶- بچے یا بچی کا اٹھانا

حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے نماز پڑھی اور آپ کی نواسی امامہ بنت

---

(۱) اس پر تمام اہل علم کا اجماع ہے- لہذا حضرتِ ابو برزہؓ کی حدیث کو تھوڑا سا چلنے پر محمول کیا جائے گا"- (فتح الباری)

زینبؓ آپ کی گردن پر تھی۔ آپؐ رکوع میں گئے تو اسے اتار دیا اور جب سجدوں کے بعد کھڑے ہوئے تو اسے دوبارہ گردن پر بٹھا لیا۔" حضرت عمروؓ بن سلیمؓ بیان کرتے ہیں کہ یہ واقعہ صبح کی نماز میں پیش آیا تھا۔ (مسلم' احمد' نسائی)

حضرت شدادؓ سے روایت ہے کہ ایک روز ظہر یا عصر کی نماز کے وقت نبی ﷺ باہر تشریف لائے اور آپ حضرت حسنؓ یا حسینؓ کو اٹھائے ہوئے تھے۔ نبی ﷺ آگے بڑھے اور نماز کے لئے اللہ اکبر کہا۔ نماز کے دوران ایک سجدہ میں آپ بڑی دیر تک زمین پر سر رکھے رہے۔ میں نے اپنا سر اٹھایا۔ دیکھا کہ نبی ﷺ سجدہ میں ہیں اور بچہ آپ کی پیٹھ پر بیٹھا ہے۔ میں پھر سجدے میں چلا گیا۔ جب نماز ختم ہوئی تو لوگوں نے حضورؐ سے عرض کیا "اے اللہ کے رسول! آج تو آپ نے نماز کے دوران ایک بہت ہی لمبا سجدہ فرمایا' یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ کو کوئی حادثہ پیش آگیا ہے یا آپ پر وحی ہو رہی ہے۔" فرمایا "ان دونوں میں سے کوئی چیز نہیں ہوئی۔ میرا بیٹا مجھ پر سوار ہو گیا تھا اور مجھے یہ ناگوار ہوا کہ اسے اپنا جی بھر لینے سے پہلے اتار دوں۔ (احمد' نسائی' حاکم)

۷۔ انگلی' ہاتھ یا سر ہلا کر سلام کا جواب دینا

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مصطلق کی طرف جاتے ہوئے مجھے کسی کام کے لئے بھیجا۔ جب میں آپؐ کے پاس آیا تو آپؐ اونٹ پر نماز پڑھ رہے تھے' میں نے آپؐ سے بات کی تو آپؐ نے اپنا ہاتھ یوں ہلا دیا۔ میں نے پھر بات کی' تو آپؐ نے پھر اپنا ہاتھ یوں ہلا دیا (یعنی ہاتھ سے اشارہ فرمایا) میں آپؐ کو قرآن پڑھتے سن رہا تھا اور آپؐ اپنے سر سے اشارہ فرما رہے تھے۔ جب فارغ ہوئے تو فرمایا "جس کام کے لئے میں نے تمہیں بھیجا تھا' اس کا کیا ہوا؟ میں نے صرف اس وجہ سے تمہاری بات کا جواب نہیں دیا کہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔"

(احمد۔ مسلم)

حضرت صہیبؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے پاس سے گزرتے ہوئے آپ کو سلام کیا تو آپؐ نے انگلی سے اشارہ فرمایا۔ (احمد' ترمذی)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضرت بلالؓ سے دریافت کیا۔ جب لوگ نبی ﷺ کو نماز میں سلام کہا کرتے تھے تو آپؐ انہیں کیسے جواب دیتے تھے؟ "انہوں نے کہا "آپؐ ہاتھ سے

اشارہ فرماتے ا ۔ (احمد ابوداؤد ابن خزیمہ)

۸ - سبحان اللہ کہنا اور تالی بجانا

جب نماز پڑھتے ہوئے انسان کو کوئی ایسی چیز پیش آئے جس پر وہ دوسروں کو ٹوکنا یا متنبہ کرنا چاہتا ہو (مثلاً یہ کہ امام نماز میں کوئی غلطی کرتا ہے اور اسے بتانا مقصود ہے) تو مردوں کے لئے سبحان اللہ کہنا اور عورتوں کے لئے تالی بجانا (دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلیوں پر مار کر) جائز ہے۔

حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جس کسی نماز میں کوئی چیز پیش آئے تو اسے چاہئے کہ سبحان اللہ کہے۔ تالی بجانا صرف عورتوں کے لئے ہے اور سبحان اللہ کہنا مردوں کے لئے۔" (احمد۔ ابوداؤد۔ نسائی)

۹ - امام قرآن بھول جائے تو اسے لقمہ دینا

نماز پڑھتے ہوئے اگر امام قرآن کی کوئی آیت بھول جائے یا وہ اسے غلط پڑھ رہا ہو تو اسے لقمہ دینا جائز ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک نماز پڑھائی قرآن پڑھتے ہوئے آپ پر التباس ہو گیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے فرمایا "کیا تم ہمارے ساتھ نماز میں شامل تھے؟ انہوں نے جواب دیا جی ہاں۔" فرمایا "تو تم نے مجھے یاد کیوں نہیں دلایا؟" (ابوداؤد)

حضرت مسور بن یزید مالکیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے نماز پڑھی اور ایک آیت چھوڑ گئے۔ آپؐ سے بعد میں ایک آدمی نے اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے اس سے فرمایا "تو تم نے مجھے وہ آیت یاد کیوں نہیں دلاوی؟" (ابوداؤد ابن ماجہ)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں "جب امام تم سے لقمہ مانگے تو اسے لقمہ دو ۲ ۔" (فتح الباری)

ا ۔ حنفیہ کے نزدیک ہاتھ سے اشارہ کر کے سلام کا جواب دینا مکروہ ہے۔ (الفقہ ...... ج ا ص ۲۵۴)

۲ ۔ حنفیہ کے نزدیک تفصیل یہ ہے کہ اگر امام بھول جائے اور رک جائے تو مقتدی کے لئے اسے لقمہ دینا جائز ہے بشرطیکہ اس کی نیت لقمہ دینے ہی کی ہو نہ کہ قرآت کی کیونکہ امام کے پیچھے قرآت مکروہ تحریمی ہے۔ دوسری طرف امام کو بھی چاہئے کہ وہ مقتدی کو بار بار پڑھ کر لقمہ دینے پر مجبور نہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

۱۰- عذر کے وقت کپڑے یا پگڑی پر سجدہ کرنا

حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ایک کپڑے میں نماز پڑھتے تھے اور اس کے فالتو حصوں کے ذریعے سردی اور گرمی سے اپنا بچاؤ کرتے تھے۔" (مسند امام احمد)

۱۱- جوتے کے ساتھ نماز پڑھنا

جوتے میں نماز پڑھنا جائز ہے (جبکہ جوتے میں کوئی گندگی نہ لگی ہو) سعید بن یزیدؒ سے روایت ہے کہ میں نے حضرتِ انسؓ سے دریافت کیا' کیا نبی ﷺ جوتے کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے؟" انہوں نے جواب دیا "ہاں" (مسلم)

۱۲- دل میں وساوس اور ادھر ادھر کے خیالات کا آنا

نماز پڑھتے ہوئے اگر دل میں ادھر ادھر کے خیالات آتے رہیں تو ان سے نماز باطل نہیں ہوتی۔

حضرتِ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جب نماز کے لئے اذان ہوتی ہے تو شیطان پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہے اور اس کی ہوا نکلنے کی آواز ہوتی ہے (یعنی وہ بدحواس ہو کر بھاگتا ہے) تاکہ وہ اذان نہ سن سکے۔ جب اذان ہو چکتی ہے تو آتا ہے اور انسان کے دل میں طرح طرح کے خیالات لاتا ہے۔ اس سے کہتا ہے فلاں چیز یاد کر' فلاں بات یاد کر' یہاں تک کہ انسان کو یہ یاد نہیں رہتا کہ اس نے کتنی نماز پڑھی ہے اگر تم میں سے کسی کو یہ یاد نہ رہے کہ اس نے تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار' تو اسے چاہئے کہ بیٹھ کر دو سجدے کرلے۔"

(بخاری و مسلم)

حضرتِ عمرؓ فرماتے ہیں "میں اپنا لشکر روانہ کرتا ہوں حالانکہ میں نماز میں ہوتا ہوں (یعنی بعض اوقات نماز کے دوران میرا خیال لشکر کی تیاری کی طرف پلٹ جاتا ہے) (بخاری)

کرے' بلکہ اسے چاہئے کہ کوئی دوسری آیت یا سورہ شروع کردے یا یہ کہ اگر وہ تین چھوٹی آیتیں پڑھ چکا ہے تو رکوع کرلے۔ اور اگر امام نے اپنے مقتدیوں کے علاوہ کسی اور کا لقمہ قبول کرلیا تو سب کی نماز باطل ہو جائے گی۔ حنابلہ' شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک مقتدی کا امام کو یاد دلانا جائز ہے' لیکن اس وقت جبکہ امام پڑھنے سے رک جائے اور اسے ضرورت ہو کہ کوئی اسے لقمہ دے۔ (الفقہ......ج ۱ ص ۲۵۱)

لیکن انسان کو اس قسم کے خیالات دل سے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اپنی نماز میں پورے دھیان سے مشغول ہونا چاہئے' اس لئے کہ اس کا دھیان نماز میں جتنا کم ہوگا اتنا ہی کم ثواب ملے گا۔

حضرتِ عمار بن یاسرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "انسان نماز سے پلٹتا ہے' حالانکہ اس کی نماز کے ثواب کا صرف دسواں حصہ' نواں حصہ' آٹھواں حصہ' ساتواں حصہ' چھٹا حصہ' پانچواں حصہ' چوتھا حصہ' تیسرا حصہ یا آدھا حصہ اس کے لئے لکھا جاتا ہے۔"
(ابوداؤد' نسائی' ابن حبان)

۱۳- سجدہ میں زمین کو صاف کرنے کے لئے پھونک مارنا

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے کسوف کی نماز میں (سجدہ کے وقت زمین صاف کرنے کے لئے) پھونک ماری (احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' بخاری تعلیقاً)

اگرچہ بہتر یہ ہے کہ پھونک نہ ماری جائے۔

حضرت اُمِ سلمہؓ سے روایت ہے کہ ایک لڑکے نے جس کا نام یسار تھا' نماز میں پھونک ماری' اس سے نبی ﷺ نے فرمایا "اللہ کے لئے اپنے چہرے کو خاک آلود کرو[1]"
(مسند امام احمد)

۱۴- آنکھوں کا بند کرنا

نماز میں آنکھوں کا بند کرنا جائز ہے۔ اس کے مکروہ ہونے کے متعلق جو حدیث آئی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

فائدہ: امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں اگر آنکھوں کے بند کرنے سے خشوع و خضوع میں خلل نہ آتا ہو' تو آنکھوں کا بند کرنا بہتر ہے۔ اگر نمازی کے سامنے کوئی ایسی چیز ہو جس پر نگاہ پڑنے سے دھیان بٹنے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں آنکھوں کے بند کرنے میں کوئی کراہت نہیں ہے۔ بلکہ ایسی صورت میں اسے افضل کہنا مکروہ کہنے کی نسبت اصولِ شریعت سے زیا

---

[1] امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر پھونکنے سے آواز پیدا ہو تو نماز باطل ہو جائے گی۔ دوسروں کے نزدیک پھونک میں دو حرف ہوں تو نماز باطل ہو جائے گی اور اگر ایک ہو (جیسے (ف)) تو نماز باطل نہیں ہوگی۔ (المغنی ج ۱ ص ۶۰۷)

قریب ہے۔

۱۵۔ایک کپڑے میں نماز پڑھنا

مرد کے لئے ضرورت کے وقت ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھنا جائز ہے۔ عورت کے پاس اگر صرف قمیص ہو تو وہ اس میں نماز پڑھ سکتی ہے بشرطیکہ وہ اس کے پاؤں کے اوپر کے حصوں کو ڈھانپ لے۔

۱۶۔ ننگے سر نماز پڑھنا

ننگے سر نماز پڑھنا جائز ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ بعض اوقات ننگے سر نماز پڑھا کرتے تھے۔[1] (ابن عساکر)

---

[1] حنفیہ کے نزدیک سستی کی بنا پر ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ ہے لیکن اگر یہ خشوع و خضوع کے لئے ہو تو جائز ہے اس میں کوئی کراہت نہیں ہے۔(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ص ۲۳۴)

نماز کے مکروہات [1]

باب "نماز کی سنتیں" میں جن سنتوں کا ذکر کیا گیا ہے' ان میں سے کسی سنت کا ترک کرنا مکروہ ہے- علاوہ ازیں نماز میں مندرجہ ذیل چیزیں مکروہ ہیں:

۱- کپڑے یا بدن یا زمین کو ٹھیک کرتے رہنا

حضرت معیقبؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "نماز پڑھتے ہوئے کنکریوں پر ہاتھ نہ پھیرو (یاد رہے کہ نبی ﷺ کے زمانے میں مسجد کا فرش کچا ہوتا تھا اور اس پر کنکریاں بچھی ہوتی تھیں) اگر تمہیں ایسا کرنا ضروری ہو تو ایک مرتبہ کنکریوں کو ہموار کر لو-" (بخاری- مسلم- ابوداؤد- احمد- ترمذی- نسائی- ابن ماجہ)

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو اللہ کی رحمت اس کے سامنے ہوتی ہے' اس لئے اسے کنکریوں پر ہاتھ پھیرنا (یعنی سجدہ کرنے کے لئے انہیں ہموار کرنا) نہیں چاہئے-"

(مسند امام احمد- ابوداؤد- ترمذی- نسائی- ابن ماجہ)

۲- کمر پر ہاتھ رکھنا

حضرت ابوہریرہؓ نے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے نماز میں کمر پر ہاتھ رکھنے سے منع فرمایا ہے-" (ابوداؤد)

۳- آسمان کی طرف دیکھنا

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "کچھ لوگ نماز میں اپنی نگاہیں

---

[1] مکروہ سے مراد وہ چیزیں ہیں جن سے اگرچہ نماز باطل نہیں ہوتی' لیکن نماز میں ان کا کرنا ناپسندیدہ ہے-

آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں- انہیں چاہئے کہ باز آجائیں' ورنہ ان کی نگاہیں اچک لی جائیں گی-" (احمد' مسلم' نسائی)

۴- کسی ایسی چیز کا سامنے ہونا' جس سے نماز میں غفلت پیدا ہوتی ہو

حضرتِ انسؓ سے روایت ہے کہ حضرتِ عائشہؓ کا ایک باریک پردہ تھا جسے وہ اپنے گھر کے ایک حصے میں لٹکایا کرتی تھیں- ان سے نبی ﷺ نے فرمایا اس پردے کو ہٹادو' اس لئے کہ اس کی تصویریں نماز میں میرے سامنے آتی ہیں-" (بخاری)

حضرتِ عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے میری ایک اونی چادر میں جس میں دھاریاں تھیں' نماز پڑھی- آپ نے فرمایا "اس کی دھاریوں نے میرا دھیان ہٹادیا- اسے ابو جہمؓ (جنہوں نے وہ چادر حضور کو بطور تحفہ دی تھی) کے پاس لے جاؤ اور اس کی موٹی چادر (جس پر دھاریاں نہیں تھیں) لے آؤ-" (بخاری و مسلم)

۵- سلام پھیرتے وقت ہاتھوں سے اشارہ کرنا

حضرتِ جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ نبی ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے- آپؐ نے فرمایا "یہ لوگ ہاتھوں سے کیوں سلام پھیرتے ہیں' گویا کہ وہ ٹھہرے ہوئے گھوڑوں کی دمیں ہیں- تم میں سے ایک آدمی کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ اپنی ران پر ہاتھ رکھ کر اسلام علیکم 'السلام علیکم' کہے-" (نسائی)

۶- کپڑے کو لٹکانا اور منہ چھپانا

حضرتِ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے منع فرمایا کہ کوئی شخص نماز میں اپنا کپڑا لٹکائے اور یہ کہ اپنا منہ چھپائے-" (احمد' ابو داؤد' ترمذی- نسائی- ابن ماجہ- حاکم)

۷- کھانے کی موجودگی میں نماز کا پڑھنا

حضرتِ عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب کھانا نکال کر رکھ دیا جائے اور نماز کھڑی ہو رہی ہو' تو پہلے کھانا کھاؤ-" (احمد' مسلم)

نافعؒ سے روایت ہے کہ حضرتِ عبداللہ بن عمرؓ کے لئے کھانا نکال کر رکھا جاتا اور نماز کھڑی ہو رہی ہوتی تو آپ اس وقت تک نماز میں نہ آتے' جب تک کھانے سے فارغ نہ ہو لیتے' حتیٰ کہ آپ امام کے پڑھنے کی آواز سن رہے ہوتے تھے۔" (بخاری)

۸- پیشاب وپاخانہ کو روک کر نماز پڑھنا

حضرتِ عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے "تم میں سے کوئی شخص کھانے کی موجودگی میں اور پیشاب وپاخانہ کو روکتے ہوئے نماز نہ پڑھے۔"
(احمد' مسلم' ابو داؤد)

۹- نیند کی حالت میں نوافل کا پڑھنا

حضرتِ عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص اونگھ رہا ہو' تو اسے چاہئے کہ سو جائے' یہاں تک کہ اس کی نیند جاتی رہے' اس لئے کہ اگر وہ اونگھتے ہوئے نماز پڑھے گا' تو ممکن ہے کہ وہ استغفار کرتے کرتے اپنے آپ کو گالی دینے لگے۔"
(بخاری' مسلم' احمد' ابو داؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)

۱۰- مسجد میں نماز کے لئے ایک جگہ مخصوص کر لینا

حضرتِ عبدالرحمٰن بن شبلؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے کوّے کی طرح ٹھونگیں مارنے' درندے کی طرح ہاتھوں کو بچھانے اور مسجد میں اونٹ کی طرح (نماز کے لئے) ایک جگہ مخصوص کر لینے سے منع فرمایا ہے۔" (احمد' ابن خزیمہ' ابن حبان' حاکم)

۱۱- دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں ڈالنا

حضرتِ ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص مسجد کے اندر ہو' تو اسے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے کے اندر نہ ڈالنا چاہئے۔ تم میں سے ایک شخص جب تک مسجد کے اندر رہتا ہے تو وہ نماز ہی میں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مسجد سے نکل جائے۔" (مسند امام احمد)

۱۲- اٹھتے یا بیٹھتے ہاتھوں کا سہارا لینا

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اس چیز سے منع فرمایا کہ انسان نماز میں ہاتھوں کا سہارا لیتے ہوئے بیٹھے (احمد - ابو داؤد) لیکن بڑھاپے یا کسی بیماری کی وجہ سے ہاتھ یا لکڑی کا یا ستون وغیرہ کا سہارا لینا جائز ہے۔ حضرت اُمِ قیسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب بوڑھے ہو گئے اور آپ کا گوشت بڑھ گیا تو نماز میں ایک ستون کا سہارا لینے لگے۔ (ابو داؤد)

۱۳- بالوں کا پیچھے سے باندھ لینا

حضرت ابن عباسؓ نے ایک شخص کو دیکھا جو نماز پڑھ رہا تھا اور اس کے سر کے بال پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ آپ اس کے بال کھولنے لگے بعد میں اس شخص نے حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کیا۔ "میرے سر سے بال آپ کیوں کھول رہے تھے؟ انہوں نے جواب دیا" میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ بالوں کا پیچھے کی طرف باندھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنے بازوؤں کو سکیڑ کر نماز پڑھے۔" (احمد، مسلم، ابو داؤد، نسائی)

"اہل علم نے اس چیز کو ناپسند کیا ہے۔" (ترمذی)

۱۴- سامنے یا دائیں جانب تھوکنا یا ناک کا سنکنا

حضرت ابو ہریرہؓ اور ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مسجد کی دیوار پر رینٹ پائی۔ آپؐ نے ایک کنکری لی اور اسے رگڑا۔ پھر فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص اپنی ناک سنکے تو اسے اپنے سامنے یا دائیں طرف ناک نہ سنکنی چاہئے یا تو اپنی بائیں طرف تھوکے یا پاؤں کے نیچے۔ (بخاری و مسلم)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں کھڑا ہو تو اسے اپنے قبلہ کی طرف نہیں تھوکنا چاہئے بلکہ اپنی بائیں طرف یا اپنے پیروں کے نیچے تھوکنا چاہئے" پھر آپؐ نے اپنی چادر کا ایک کنارہ لیا اور اس میں تھوک کر اسے مل دیا اور فرمایا۔ "اسے یوں کر لینا چاہئے۔" (بخاری، مسلم، احمد)

لیکن ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ہے جب کہ مسجد کا فرش کچا ہو اور تھوکنے سے کسی مسلمان

کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔ اگر مسجد کا فرش پختہ ہو یا تھوکنے سے کسی مسلمان کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو تو تھوکنا یا ناک کا سنکنا جائز نہیں ہے کیونکہ بہت سی دوسری احادیث میں نبی ﷺ نے مسجد میں تھوکنے سے منع فرمایا ہے اور اگر تھوک پایا جائے تو اسے دبانے کا حکم دیا ہے۔

حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا میں نے اپنی امت کے گناہوں میں سے ایک گناہ یہ بھی پایا ہے کہ مسجد میں تھوک ہو اور اسے دبایا نہ جائے۔" (مسلم)

فائدہ: حنفیہ کے نزدیک مندرجہ بالا امور کے علاوہ بعض اور چیزیں بھی نماز میں مکروہ ہیں جن کا ہم حاشیہ میں ذکر کرتے ہیں [1]

---

[1] (۱) اقعاء (دیکھئے ص ۱۵۵) (۲) اشارہ سے سلام کا جواب دینا۔ (۳) ہاتھ سے آیتوں اور تسبیح کا شمار کرنا (۴) قرآت کا قیام کے علاوہ کسی دوسری حالت میں پورا کرنا (۵) بعد کی سورت پہلے اور پہلے کی سورت بعد میں پڑھنا (۶) بلا مجبوری جمائی لینا (۷) راستہ یا حمام میں نماز پڑھنا (۸) کسی نجاست کے قریب نماز پڑھنا (۹) امام کا محراب کے اندر پوری طرح داخل ہو کر نماز پڑھنا (۱۰) سوئے ہوئے لوگوں کے پاس نماز پڑھنا (۱۱) ہر نماز میں ایک ہی سورت کا پڑھتے رہنا (۱۲) سستی کی بنا پر ننگے سر نماز پڑھنا۔

(الفقہ .... ج ۱ ص ۲۳۵)

مُبطلاتِ نماز

(وہ چیزیں جن سے نماز باطل ہو جاتی ہے)

۱- عملِ کثیر

اس چیز پر ائمہ کا اتفاق ہے کہ ہر وہ کام جو نماز کے منافی ہو، اگر زیادہ --- عملِ کثیر --- ہو(۱) تو اس سے نماز باطل ہو جاتی ہے اور اگر وہ کم (عملِ یسیر ہو) تو اس سے نماز باطل نہیں ہوتی۔

۲- نماز کے کسی رکن یا شرط کا ترک کر دینا

جو شخص غلط نماز پڑھ رہا تھا اس سے نبی ﷺ نے فرمایا تھا "واپس جاکر دوبارہ نماز پڑھ، اس لئے کہ تم نے نماز نہیں پڑھی کیونکہ اس شخص نے سکون واطمینان سے نماز نہیں پڑھی تھی۔ (مفصل حدیث دیکھئے صفحہ ۱۶۱)

نبی ﷺ کا ارشاد ہے جب تم میں سے کسی شخص کا وضو ٹوٹ جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہیں کرتا تاوقتیکہ وہ دوبارہ وضو نہ کرے (یعنی وضو کے بغیر نماز نہیں)

۳- جان بوجھ کر بولنا

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ہم نبی ﷺ کو نماز کی حالت میں سلام کیا کرتے تھے اور آپ اس کا جواب دیا کرتے تھے۔ جب ہم حبشہ سے واپس آئے تو ہم نے آپ کو سلام کیا لیکن آپ نے جواب نہیں دیا۔ ہم نے دریافت کیا "یارسول اللہ! ہم پہلے آپ کو نماز کی حالت میں سلام کیا کرتے تھے اور آپ جواب دیتے تھے" فرمایا "نماز میں مشغولیت ہوتی ہے

---

(۱) شافعیہ کے نزدیک اس کی حد تین لگاتار قدم ہے اور حنفیہ کے نزدیک یہ کہ دیکھنے والے کو اس چیز میں شک نہ رہے کہ آدمی نماز نہیں پڑھ رہا اور اگر اسے شک ہو تو وہ عمل یسیر ہے۔ البتہ جو چیزیں جنس نماز (جیسے رکوع یا سجدہ) اور وہ بھول کر زیادہ پڑھ لی جائیں تو اس سے نماز باطل نہیں ہوگی۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ص ۲۴۶)

(جو سلام کا جواب دینے سے منع کرتی ہے) (بخاری، مسلم)

حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ نماز میں بات چیت کیا کرتے تھے ہم میں سے ایک شخص نماز میں پاس کھڑے ہوئے آدمی سے بات کرتا تھا۔ یہاں تک کہ آیت "وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ" (اور اللہ کے لئے خشوع و خضوع کے ساتھ قیام کرو) نازل ہوئی۔ اس وقت ہمیں (نماز میں) چپ رہنے اور بات چیت نہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ (بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

لیکن جو شخص بھول کر یا لاعلمی کی وجہ سے نماز میں بول پڑے، اس کی نماز ضائع نہیں ہوتی:

حضرت معاویہ بن حکم سلمیؓ سے روایت ہے کہ "میں نبی ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک آدمی کو چھینک آئی، میں نے اس سے کہا "یرحمک اللہ" (اللہ تم پر رحم کرے) لوگ اپنی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگے، تو میں نے کہا۔ ہائے میری ماں مجھے گم کرے، آپ لوگ میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟ وہ اپنی رانوں پر ہاتھ مارنے لگے۔ سو وہ مجھے چپ کرانا چاہتے تھے اور میں ان سے بات کرنا چاہتا تھا، لیکن میں چپ ہو گیا۔ اللہ کے رسول ﷺ پر میرے ماں باپ قربان ہوں، میں نے آپ ﷺ سے پہلے اور نہ آپؐ کے بعد آپؐ سے اچھی تعلیم دینے والا کوئی استاد نہیں دیکھا۔ اللہ کی قسم! نماز کے بعد آپؐ نے مجھے جھڑکا نہ پیٹا اور نہ کوسا' صرف اتنا فرمایا۔ نماز میں لوگوں کی بات چیت صحیح نہیں ہے۔ یہ صرف سبحان اللہ، اللہ اکبر اور قرآن کا پڑھنا ہے۔(۱)" (احمد، مسلم، ابو داؤد، نسائی)

---

(۱) جمہور (جس میں امام مالکؒ، شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ شامل ہیں) کا یہی مسلک ہے، (نووی) امام ابو حنیفہؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، سفیان ثوریؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک بھول کر یا لاعلمی سے بولنے سے بھی نماز باطل ہو جاتی ہے ان کا استدلال یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کی مذکورہ بالا حدیث سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جو شخص نماز میں بولا تھا حضور نے اسے دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔

(نیل الاوطار ج ۲ ۲۶۷، ۲۶۸)

۴- کھانا اور پینا

اس چیز پر اجماع ہے کہ فرض نماز کے اندر قصداً کھانے اور پینے سے نماز باطل ہو جاتی ہے- (۱)

جمہور کے نزدیک سنت اور نفل نمازوں کا بھی یہی حکم ہے جو فرض نماز کا ہے یعنی قصداً کھانے اور پینے سے سنت اور نفل نماز بھی اسی طرح باطل ہو جاتی ہے جس طرح فرض نماز (۲)

۵- ہنسنا

اس چیز پر سب کا اتفاق ہے کہ ہنسنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے-(۳)

---

(۱) اگر انسان بھول کر یا لاعلمی کی وجہ سے کھا پی لے، تو حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک اس سے بھی نماز باطل ہو جاتی ہے لیکن شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک باطل نہیں ہوتی-(الفقہ ---- ج ۱ ص ۲۶۱، ۲۶۳)

(۲) امام طاؤس اور اسحاقؒ کے نزدیک نفل نماز میں پینے سے نماز باطل نہیں ہوتی کیونکہ ان کے نزدیک یہ عمل یسیر ہے-

(۳) حنفیہ کے نزدیک قہقہہ سے وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے(تفصیل کے لئے دیکھئے حاشیہ صفحہ ۷۷) لیکن اگر قہقہہ نماز کی آخری رکعت میں اس وقت ہو جب انسان سلام سے پہلے بقدر تشہد، التحیات بیٹھ چکا ہو تو اس سے حنفیہ کے نزدیک نماز باطل نہیں ہوتی کیونکہ نماز میں آخری فرض بقدر تشہد بیٹھنا ہے درود اور السلام علیکم سے نماز کا ختم کرنا واجب ہے-(الفقہ ---- ج ۱ ص ۱۵۸)

مساجد

۱- امتِ مسلمہ کی خصوصیت

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "میرے لئے ساری زمین پاک اور مسجد بنادی گئی ہے-لہذا جس آدمی کو جہاں جس وقت نماز پالے (یعنی اس کا وقت ہو جائے) اسے نماز پڑھ لینی چاہئے-(بخاری، مسلم)

حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا "یارسول اللہ! ﷺ زمین میں سب سے پہلے کون سی مسجد بنائی گئی ہے؟ فرمایا "مسجدِ حرام" میں نے دریافت کیا "پھر"؟ فرمایا "مسجدِ اقصیٰ" میں نے دریافت کیا "دونوں کے بننے کے درمیان کتنی مدت ہے؟" فرمایا "چالیس برس" پھر آپ نے فرمایا "جہاں نماز کا وقت ہو جائے-نماز پڑھ لو، وہی مسجد ہے"- (بخاری و مسلم 'نسائی' احمد)

۲- مسجد بنانے کی فضیلت

حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو شخص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہتے ہوئے کوئی مسجد بنائے گا اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنائے گا"-
(بخاری، مسلم)

۳- مسجد کی طرف جانے اور اس میں بیٹھنے کی فضیلت

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جو شخص مسجد گیا اور آیا تو جب وہ گیا اور آیا اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے بطور مہمانی ایک منزل بنائی-(بخاری، مسلم)

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم کسی آدمی کو بار بار مسجد جاتے اور آتے دیکھو تو اس کے ایمان کی شہادت دو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (اللہ کی مسجدوں کو صرف وہی لوگ آباد رکھتے ہیں جو اللہ اور آخری دن پر ایمان رکھتے ہیں)- (احمد، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، ترمذی)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس نے اپنے گھر میں پاکیزگی

حاصل کی (یعنی وضو کیا) پھر وہ اللہ کا کوئی فریضہ ادا کرنے کے لئے اس کے کسی گھر میں گیا تو اس کے قدموں میں سے ایک قدم اس کے گناہ گراتا ہے اور دوسرا اس کا درجہ بلند کرتا ہے"۔ (مسلم)

۴۔ مسجد میں داخل ہوتے اور مسجد سے نکلتے ہوئے دعا

حضرت ابی حمیدؓ اور ابی اُسیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو یہ دعا پڑھے:

اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِکَ	اے اللہ میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے۔

اور جب نکلے تو یہ دعا پڑھے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ (احمد، مسلم، نسائی، ابوداؤد)	اے اللہ میں تجھ سے تیرا فضل چاہتا ہوں

حضرت فاطمہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب مسجد میں داخل ہوتے تو یہ دعا پڑھتے:

بِسْمِ اللّٰہِ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ وَافْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِکَ	اللہ کے نام سے داخل ہوتا ہوں۔ اللہ کے رسول پر سلام ہو۔ اے اللہ میرے گناہ معاف کر دے اور میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے

اور جب نکلتے تو یہ دعا پڑھتے:

بِسْمِ اللّٰہِ وَ السَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ وَافْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ فَضْلِکَ۔ (احمد، ابن ماجہ)	اللہ کے نام سے باہر نکلتا ہوں۔ اللہ کے رسول پر سلام ہو، اے اللہ! میرے گناہ معاف کر دے اور میرے لئے اپنے فضل کے دروازے کھول دے۔

یہ روایت سند کے لحاظ سے کمزور ہے۔ (نیل الاوطار ج ۲، ص ۱۴)

مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دایاں قدم اور نکلتے وقت بایاں قدم پہلے رکھنا مستحب ہے۔

۵- مسجد میں داخل ہونے کے بعد دو رکعت نماز

حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں آئے تو اسے چاہئے۔ بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھ لے۔ (بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) اس نماز کو تحیۃ المسجد کہتے ہیں۔

۶- مسجد کو سادہ بنانے اور سادہ رکھنے کا حکم

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک وہ زمانہ نہ آجائے کہ لوگ آپس میں مسجدوں پر فخر کریں گے۔ (احمد، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "مجھے مسجدوں کے پختہ بنانے (یعنی ضرورت سے زیادہ) کا حکم نہیں دیا گیا۔ (ابو داؤد، ابن حبان) ابو داؤد میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا "تم لوگ ضرور یہود اور نصاریٰ کی طرح انہیں سجا سجا کر رکھو گے"۔

حضرت عمرؓ نے مسجدوں کی تعمیر کا حکم دیا اور فرمایا "مسجدیں ایسی ہونی چاہئیں جو لوگوں کو بارش سے بچائیں۔ دیکھو ان میں ہرگز لال پیلے رنگ و روغن نہ کرو تاکہ وہ لوگوں کو غافل نہ کر سکیں۔ (ابن خزیمہ، تعلیقات بخاری)

۷- مسجد کو صاف ستھرا رکھنے اور اس میں خوشبو کرنے کا حکم

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے محلوں میں مسجدیں بنانے اور انہیں صاف رکھنے اور ان میں خوشبو کرنے کا حکم دیا"۔ (احمد ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان)

۸- مسجد میں کون سے کام ممنوع ہیں

(۱) گندگی اور بدبو پھیلانا: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "ان مسجدوں میں پیشاب کرنا اور گندگی پھیلانا صحیح نہیں ہے۔ یہ صرف اللہ کا ذکر کرنے اور قرآن کی تلاوت کرنے کے لئے ہیں۔" (مسلم)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے پیاز، لہسن یا کراث

اسے کھائی ہو وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے اس لئے کہ جس چیز سے انسانوں کو تکلیف ہوتی ہے اس سے فرشتوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔" (بخاری و مسلم)

حضرت عمرؓ نے ایک جمعہ کے روز خطبہ دیا اور فرمایا "اے لوگو! تم دو سبزیاں کھاتے ہو جنہیں میں گندی خیال کرتا ہوں۔ ایک پیاز، دوسرے لہسن، میں نے نبی ﷺ کو دیکھا ہے کہ جب کسی آدمی سے ان کی بدبو پا لیتے تو بقیع کی طرف نکل جانے کا حکم دیتے۔ لہذا جو شخص انہیں کھائے، اسے چاہئے کہ انہیں پکا کر مار لے (یعنی ان کی بدبو ختم کر دے)" (مسلم، احمد، نسائی)

(ب) گم شدہ چیزوں کا تلاش کرنا: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی کو بلند آواز سے مسجد میں گم شدہ جانور (اس طرح گم شدہ کوئی چیز) تلاش کرتے ہوئے سنے تو اس سے کہے، اللہ کرے تمہارا گم شدہ جانور نہ ملے، اس لئے کہ مسجد یں اس کام کے لئے نہیں بنائی گئی ہیں"۔ (مسلم)

(ج) خرید و فروخت: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم کسی ایسے آدمی کو دیکھو جو مسجد میں خرید و فروخت کر رہا ہو تو اس سے کہو اللہ تمہاری تجارت میں فائدہ نہ پہنچے"۔ (ترمذی، نسائی)

(د) فضول قسم کے اشعار پڑھنا: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مسجد میں خرید و فروخت کرنے، اشعار پڑھنے، گم شدہ چیزیں تلاش کرنے اور جمعہ کے روز نماز سے پہلے حلقے بنا کر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے"۔ (ابو داؤد، احمد ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

اس حدیث میں اشعار سے مراد گندے اور فضول قسم کے اشعار ہیں کیونکہ جن اشعار میں اسلام کی تعریف بیان کی گئی ہو اور لوگوں کو نیک کاموں کی دعوت دی گئی ہو، ان کا مسجدوں میں پڑھنا جائز ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ، حضرت حسانؓ کے پاس سے گزرے اور وہ اشعار پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کی طرف ترچھی نگاہ سے دیکھا حضرت حسانؓ نے کہا "میں مسجد میں اشعار پڑھا کرتا تھا اور اس میں وہ شخصیت ہوتی تھی جو آپ سے بہتر تھی پھر

---

(۱) ایک بدبودار سبزی جو پیاز اور لہسن سے ملتی جلتی ہے۔

وہ حضرت ابو ہریرہؓ کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے "میں اللہ کی قسم دلا کر آپ سے پوچھتا ہوں کیا آپ نے نبی ﷺ کو مجھ سے یہ فرماتے نہیں سنا "ان مشرکین کو میری طرف سے جواب دو اے اللہ جبرائیل کے ذریعے اس کی مدد فرما؟ حضرت ابو ہریرہؓ نے جواب دیا "جی ہاں"۔ (بخاری و مسلم)

(ھ) بلند آواز سے بولنا یا قرآن پڑھنا (جب کہ لوگ نماز پڑھ رہے ہوں): حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک روز نبی ﷺ مسجد میں تشریف لائے دیکھا کہ لوگ بلند آواز سے نماز پڑھ رہے ہیں۔ فرمایا "نمازی اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے، اس لئے اسے یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ اپنے رب سے کیا سرگوشی کر رہا ہے؟ تم میں سے کوئی شخص اس طرح بلند آواز سے قرآن نہ پڑھے کہ دوسروں کو دقت ہو"۔ (مسند امام احمد)

(و) حدود نافذ کرنا: حضرت حکیم بن حزامؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "مسجد میں حدود نافذ نہیں کی جائیں گی اور نہ امیر سے کسی قاتل کو قتل کرنے کے لئے کہا جائے گا"۔ (ابو داؤد، دار قطنی)

۹۔ وہ کام جن کا کرنا مسجد میں جائز ہے

ان سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کے متعلق یہ شک ہو سکتا ہے کہ وہ مسجد میں ناجائز ہیں، حالانکہ وہ جائز ہیں:

(ا) جائز قسم کی بات چیت خواہ وہ دنیا کے کاموں کے متعلق ہو: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ صبح کی نماز پڑھنے کے بعد سورج نکلنے تک نبی ﷺ اپنی جگہ سے نہیں اٹھا کرتے تھے جب سورج نکل آتا تو آپ اٹھتے۔ اس دوران میں لوگ جاہلیت کے زمانے کی باتیں کرتے اور ہنستے تھے اور نبی ﷺ مسکراتے تھے"۔ (مسلم)

(ب) کھانا پینا: حضرت عبداللہ بن حارثؓ سے روایت ہے کہ ہم نبی ﷺ کے زمانے میں مسجد کے اندر روٹی اور گوشت کھایا کرتے تھے"۔ (ابن ماجہ)

(ج) سونا: عباد بن تمیم اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی ﷺ کو مسجد میں اس طرح لیٹے ہوئے دیکھا کہ آپ کی ایک ٹانگ دوسری کے اوپر تھی"۔ (احمد، بخاری و مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ وہ نبی ﷺ کی مسجد میں لیٹا کرتے تھے حالانکہ

وہ کنوارے اور جوان تھے ان کے بیوی بچے نہ تھے (۱)" (احمد بخاری، نسائی، احمد، ابوداؤد)

(ز) ضرورت کے وقت سوال کرنا: حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ سے روایت ہے کہ ایک روز نبی ﷺ نے صحابہؓ سے دریافت فرمایا "کیا آج تم میں سے کسی نے مسکین کو کھانا کھلایا ہے"؟ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا جب میں مسجد میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک سائل سوال کر رہا ہے۔ میں نے عبدالرحمٰن (آپ کے صاحبزادے) کے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا دیکھا جو میں نے اس سے لے کر سائل کو دے دیا (۲) (ابوداؤد)

۹۔ وہ جگہیں جہاں نماز کا پڑھنا مکروہ ہے

(۱) قبرستان: حضرتِ عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنا لیا"۔ (بخاری، مسلم، احمد، نسائی)

حضرت ابو مرثد غنویؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "قبروں کی طرف نماز نہ پڑھو اور نہ ان پر بیٹھو (۳)" (احمد، مسلم)

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک پردیسی اور معتکف کے لئے مسجد میں سونا جائز ہے۔ دوسروں کے لئے مکروہ ہے۔ حنابلہ کے نزدیک دن میں سونا جائز ہے لیکن رات کو گاؤں کی مسجد میں سونا جائز ہے، شہروں کی مسجد میں مکروہ ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۲۸۵)

(۲) حنابلہ کے نزدیک مسجد میں سوال کرنا اور سائل کو خیرات دینا مکروہ ہے لیکن اس کے بغیر مانگے یا امام کے کہنے سے دینا جائز ہے۔ شافعیہ کے نزدیک مسجد میں سوال کرنا مکروہ ہے اور اگر اس سے نمازیوں کی نماز میں خلل آتا ہو تو حرام ہے مالکیہ کے نزدیک سائل کو سوال کرنے سے روکا جائے گا اور اسے خیرات نہیں دی جائے گی۔ یوں مسجد میں خیرات کرنا جائز ہے۔ حنفیہ کے نزدیک مسجد میں سوال کرنا حرام ہے اور سائل کو خیرات دینا مکروہ ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۲۹۰)

اوپر کی حدیث کے متعلق حنفیہ کا کہنا ہے کہ اس میں یہ تصریح نہیں ہے کہ سائل نے مسجد کے اندر سوال کیا تھا۔

(۳) حنفیہ کے نزدیک اگر قبر سامنے اور قریب ہو تو قبرستان میں نماز مکروہ ہے لیکن اگر قبر پیچھے، اوپر یا نیچے ہے تو نماز مکروہ نہیں ہے۔ کراہت اس وقت ہے جب کہ قبرستان میں نماز کے لئے کوئی صاف ستھری جگہ خاص طور پر نہ بنائی گئی ہو لیکن اگر ایسی جگہ ہو تو اس میں نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔ انبیاء کی قبروں کے پاس نماز پڑھنا مطلقاً مکروہ نہیں ہے۔

حنابلہ کے نزدیک اگر قبرستان میں تین یا اس سے زیادہ قبریں ہیں تو اس میں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(ب - س) حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے سات جگہوں میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے: جانوروں کے گوبر کی جگہ، چلتا ہوا راستہ، اونٹوں کے باندھنے کی جگہ، غسل خانہ (۱)، قبرستان اور کعبہ کی چھت (۲)" (ابن ماجہ، عبد بن حمید، ترمذی)

کعبہ کے اندر نماز پڑھنا جائز ہے: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ کعبہ کے اندر نبی ﷺ اور آپ کے ساتھ اسامہ بن زیدؓ بلالؓ اور عثمان بن طلحہؓ داخل ہوئے اور دروازہ بند کر لیا- جب انہوں نے کھولا، تو سب سے پہلے میں اندر گھس گیا- مجھے بلالؓ ملے اور میں نے ان سے پوچھا "کیا نبی ﷺ نے نماز پڑھی ہے"؟ انہوں نے کہا "ہاں دونوں یمانی ستونوں کے درمیان"- (بخاری، مسلم، احمد)

(ط) کنیسہ (یا مندر): اگر ان میں بت یا تصویریں ہیں تو ان میں نماز ناجائز ہے، ورنہ جائز: حضرت ابن عباسؓ نے کنیسہ میں نماز پڑھنے کو ناپسند فرمایا ہے جبکہ ان میں تصاویر ہوں-

(ابن ابی شیبہ)

امام بخاریؒ لکھتے ہیں: "ہم ان لوگوں کی عبادت گاہوں میں اس لئے داخل نہیں ہوتے کہ ان میں بت ہیں- حضرت ابن عباسؓ یہودیوں کی عبادت گاہ میں نماز پڑھتے تھے، مگر ایسی عبادت گاہ میں نماز نہیں پڑھتے تھے جہاں بت ہوں"-

---

نماز مکروہ ہے لیکن اگر اس میں ایک یا دو قبریں ہیں تو اس میں نماز جائز ہے بشرطیکہ قبر سامنے نہ ہو- اگر قبر سامنے ہو تو نماز مکروہ ہو گی، نماز جنازہ جائز ہے- شافعیہ کے نزدیک اگر قبرستان صاف ہے تو اس میں نماز مکروہ ہے، خواہ قبر سامنے ہو یا پیچھے، دائیں ہو یا بائیں، اوپر ہو یا نیچے اور اگر قبرستان گندا ہے تو اس میں نماز ناجائز ہے- شہداء اور انبیاء کی قبروں کے پاس نماز مکروہ نہیں ہے- بشرطیکہ ان کی تعظیم کی نیت نہ ہو- مالکیہ کے نزدیک اگر قبرستان میں گندگی نہ ہو تو اس میں نماز جائز ہے- (الفقہ ج ۱ ص ۲۷۹)

(۱) حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک جانوروں کے گوبر کرنے کی جگہ، جانوروں کے ذبح کرنے کی جگہ، چلتے ہوئے راستے، اونٹوں کے باندھنے کی جگہ اور غسل خانہ میں نماز مکروہ ہے- مالکیہ کے نزدیک ان جگہوں میں نماز جائز ہے- بشرطیکہ گندگی نہ ہو اگر گندگی ہو تو نماز جائز ہے- حنابلہ کے نزدیک ان جگہوں میں نماز جائز ہے الا یہ کہ کوئی عذر ہو- (الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد ۱ ص ۲۷۹)

(۲) امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک کعبہ کی چھت پر نماز مکروہ ہے- دوسروں کے نزدیک ناجائز ہے- (درمختار) (نیل الاوطار ج ۲ ص ۱۷۶)

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ نے کنیسہ میں نماز پڑھی ہے۔

(نیل الاوطار ج ۲' ص ۱۱۷)

حضرت عمرؓ کو نجران سے لوگوں کا خط آیا کہ ہمیں یہودیوں کی ایک عبادت گاہ سے زیادہ صاف جگہ کوئی نہیں ملی۔ آپ نے انہیں جواب دیا "اسے بیری کے پانی سے دھولو اور اس میں نماز پڑھو(۱)"

---

(۱) شافعیہ کے نزدیک یہودیوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہ میں نماز پڑھنا مطلقاً مکروہ ہے۔ حنابلہ کے نزدیک ان میں نماز تصویروں کی موجودگی میں بھی صرف مکروہ ہے الا یہ کہ وہ بالکل سامنے ہوں۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۲۳۶-۲۳۷)

سترہ

سترہ کے لفظی معنی پردہ یا اوٹ کے ہیں اور اس سے مراد یہ ہے کہ انسان نماز پڑھتے ہوئے اپنے سامنے کوئی چیز رکھ لے تا کہ کوئی شخص اس کے آگے سے نہ گزرے۔

۱۔ سترہ کا حکم

نماز پڑھتے ہوئے اپنے آگے سترہ بنانا مستحب ہے۔

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھے تو اسے چاہئے کہ سترہ کی طرف نماز پڑھے اور اسے چاہئے کہ اس کے قریب ہو"۔ (ابو داؤد، ابن ماجہ)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب عید کے روز نکلتے تو ایک نیزہ ساتھ لے جانے کا حکم دیتے۔ اسے آپ کے سامنے گاڑ دیا جاتا اور آپ اس کی طرف نماز پڑھتے اور لوگ آپ کے پیچھے ہوتے تھے۔ آپ سفر میں بھی ایسا ہی کرتے"۔ (بخاری و مسلم)

بعض موقعوں پر حضور ﷺ سے بغیر سترہ کے نماز پڑھنا ثابت ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے کھلی فضا میں نماز پڑھی اور آپ کے سامنے کوئی چیز نہ تھی"۔ (احمد، ابو داؤد، بیہقی)

۲۔ سترہ کن چیزوں کا بنتا ہے؟

نمازی کا اپنے آگے کوئی چیز رکھ لینے یا گاڑ لینے سے سترہ کا مقصد پورا ہو جاتا ہے اگر کوئی چیز نہ ملے تو زمین پر ایک لکیر کھینچ لینے سے بھی یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھے تو اسے چاہئے کہ اپنے سامنے کوئی چیز رکھ لے۔ اگر کوئی چیز نہ پائے، تو چھڑی گاڑ لے۔ اگر اس کے پاس چھڑی بھی نہ ہو تو ایک لکیر کھینچ لے۔ اس کے بعد اس کے آگے سے

کچھ گزرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے(۱)"۔ (احمد، ابو داؤد، ابن ماجہ)

۳- سترہ کا قریب اور کچھ دائیں یا بائیں طرف ہونا

مستحب یہ ہے کہ نمازی اور سترہ کے درمیان صرف اتنا فاصلہ ہو کہ وہ سجدہ کر سکے۔ نیز یہ بھی مستحب ہے کہ سترہ بالکل سامنے نہ ہو بلکہ ذرا سا دائیں یا بائیں طرف کو ہو:

اوپر حضرت ابو سعیدؓ سے روایت گزر چکی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ "نماز پڑھنے والے کو چاہئے کہ سترہ کے قریب ہو"۔ (ابو داؤد، ابن ماجہ)

حضرت بلالؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے نماز پڑھی اور آپ کے اور دیوار کے درمیان اندازاً تین ہاتھ کا فاصلہ تھا"۔ (بخاری، احمد، نسائی)

حضرت مقداد بن اسودؓ سے روایت ہے کہ میں نے جب بھی نبی ﷺ کو کسی ٹہنی یا ستون یا درخت کی طرف نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو یہی دیکھا کہ آپ اسے اپنے سامنے نہیں بلکہ کچھ دائیں یا بائیں طرف کئے ہوتے تھے"۔ (احمد، ابو داؤد)

لیکن یہ حدیث ضعیف ہے۔ (نیل الاوطار وغیرہ)

۴- امام کا سترہ تمام مقتدیوں کا سترہ ہے

جو سترہ امام کا ہو گا وہی تمام مقتدیوں کا سترہ سمجھا جائے گا۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں ایک گدھی پر سوار ہو کر آیا اور میں اس وقت بلوغ کے قریب تھا۔ نبی ﷺ منیٰ میں نماز پڑھا رہے تھے۔ میں صف کے کچھ حصے کے آگے سے گزرا اور گدھی کو چرنے کے لئے چھوڑ دیا اور پھر صف میں شامل ہو گیا۔ اس پر کسی نے مجھے نہیں ٹوکا"۔ (مسلم، احمد، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

۵- نمازی کے آگے سے گزرنے کی حرمت

حضرت ابو جہیم عبداللہ بن حارثؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو شخص

---

(۱) امام احمدؒ، سعید بن جبیرؒ، اوزاعیؒ (اور عام محدثین) لکیر کا سترہ بنانے کے قائل ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ مالکؒ اور لیث بن سعدؒ لکیر کے سترہ کے قائل نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ حدیث ضعیف ہے۔ امام شافعیؒ عراق میں۔ اس کے قائل تھے لیکن مصر میں قائل نہ رہے۔ وہ فرماتے تھے "نمازی سترہ کے لئے لکیر نہیں کھینچے گا، الا یہ کہ اس کے پاس کوئی ایسی سنت (حدیث) ہو جو قابل اعتبار ہو۔" (المغنی ج ۲ ص ۷۰)

نمازی کے آگے سے گزرتا ہے اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس کا کتنا بڑا گناہ ہے تو آگے سے گزرنے کی نسبت اس کے لئے چالیس سال یا چالیس مہینے یا چالیس دن تک (بعد کے راوی کا شک) کھڑا رہنا بہتر ہوتا"۔(مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

البتہ مسجد حرام (مکہ معظمہ) میں نمازی کے آگے سے گزرنے کی رخصت ہے:

حضرت مطلب بن ابی وداعہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے باب بنی سہم کے قریب نبی ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا اور لوگ آپؐ کے آگے سے گزر رہے تھے اور آپؐ کے اور ان کے درمیان کوئی سترہ نہیں تھا"۔(۱) (احمد، ابوداؤد)

یہ وعید کتنی دور تک گزرنے پر ہے، اس کی احادیث میں تصریح نہیں ہے احادیث میں صرف "بین یدی" (آگے) کا لفظ آتا ہے۔(۲)

۶- نمازی کا کسی کو اپنے آگے گزرنے سے روکنا

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص اپنے

---

(۱) اس حدیث کی بناء پر شافعیہ کا مذہب یہ بھی ہے کہ نمازی کے آگے سے گزرنے کی حرمت صرف اس صورت میں ہے جبکہ اس نے اپنے آگے سترہ رکھا ہو اور اگر وہ بغیر سترہ کے نماز پڑھ رہا ہے تو اس کے آگے سے گزرنے میں کوئی حرمت یا کراہت نہیں ہے۔(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۲۷۲)

سلف میں بعض دوسرے اہل علم حضرات کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام ابن قیمؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور اس کے دلائل پیش کئے ہیں۔(معالم السنن ج ۱ ص ۲۲۴) یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس لئے امام بخاریؒ کے نزدیک نمازی کے آگے سے گزرنا چاہے اس نے سترہ نہ بھی بنایا ہو ہر جگہ حرام ہے چاہے وہ حرم مکی ہو (الفتح الباری)۔

(۲) حنفیہ کے نزدیک اگر انسان کسی بڑی مسجد یا کھلے میدان میں نماز پڑھ رہا ہے تو اس کے پاؤں اور سجدہ کی جگہ کے درمیانی فاصلہ سے گزرنا حرام ہے اور اگر چھوٹی مسجد میں نماز پڑھ رہا ہے تو یہ فاصلہ اس کے پاؤں سے لے کر مسجد کی دیوار تک ہے اور اس کا اندازہ چالیس ہاتھ ہے۔ مالکیہ کے نزدیک اگر اس نے سترہ نہیں بنایا تو یہ فاصلہ اس کے رکوع اور سجدہ کی جگہ تک ہے۔ ورنہ سترہ تک شافعیہ کے نزدیک یہ فاصلہ اس کے پاؤں سے تین ہاتھ تک ہے یہ اس وقت ہے جبکہ اس نے سترہ بنا رکھا ہو اور اگر اس نے سترہ نہ بنایا ہو تو اس کے آگے سے گزرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ حنابلہ کے نزدیک اگر اس نے سترہ نہیں بنایا، تو یہ فاصلہ تین ہاتھ تک ہے ورنہ سترہ تک۔(الفقہ ج ۱ ص ۲۷۳)۔

سامنے کسی چیز کو سترہ بنا کر نماز پڑھ رہا ہو اور پھر کوئی شخص اس کے آگے سے گزرنا چاہے تو اسے ہٹائے۔ اگر وہ نہ مانے تو اس سے لڑے (یعنی ہاتھ بڑھا کر روکے) اس لئے کہ وہ شیطان ہے(۱)۔ (احمد' بخاری و مسلم ابوداؤد' نسائی)

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ "یہ (یعنی اپنے آگے سے کسی کو گزرنے سے روکنا) اس شخص کے لئے جائز ہے، جو اپنے آگے سترہ بنا کر نماز پڑھ رہا ہو یا ایسی جگہ نماز پڑھ رہا ہو جہاں وہ لوگوں کے گزرنے سے محفوظ ہو۔ اس پر سب کا اتفاق ہے"۔ (نیل الاوطار)

---

(۱) حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک روکنا جائز ہے، ضروری نہیں۔ مالکیہ کے نزدیک مستحب ہے۔ نیز حنفیہ کے نزدیک آدمی کو اشارے سے یا سر ہلا کر یا سبحان اللہ کہہ کر اور عورت کو تالی بجا کر روکنے کی اجازت ہے۔ ہاتھ بڑھا کر روکنا جائز نہیں ہے"۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۲۷۲)

نماز با جماعت کے احکام

۱۔ حکم اور فضیلت

جمہور کے نزدیک فرض نماز میں جماعت سنت مؤکدہ ہے(۱)۔ جماعت کی فضیلت اور تاکید میں متعدد احادیث ثابت ہیں جن میں سے بعض کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

(۱) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "آدمی کے باجماعت نماز پڑھنے کا ثواب اس کے اپنے گھر یا بازار میں نماز پڑھنے سے پچیس گنا زیادہ ہے۔ یہ اس لئے کہ جب وہ اچھی طرح وضو کر کے مسجد کی طرف جاتا ہے اور اس طرح جاتا ہے کہ نماز کے سوا کوئی دوسری چیز اسے نہیں لے جاتی، تو وہ جو قدم بھی اٹھاتا ہے اس کے ذریعے اس کا ایک درجہ بلند کیا جاتا ہے اور ایک گناہ گرایا جاتا ہے پھر جب وہ نماز پڑھتا ہے تو فرشتے اس پر اس وقت تک سلامتی بھیجتے رہتے ہیں جب تک وہ باوضو رہتا ہے اور اس کے لے یہ دعا کرتے ہیں "اے اللہ! اس پر سلامتی بھیج اے اللہ! اس پر رحم فرما"۔ اور وہ اس وقت بھی نماز ہی میں ہوتا ہے جب وہ نماز کا انتظار کر رہا ہوتا ہے"۔ (بخاری و مسلم)

۲۔ حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "مجھے اس ذات پاک کی قسم

---

(۱) امام عطاؒ، اوزاعیؒ، احمد بن حنبلؒ، ابو ثورؒ، ابن خزیمہؒ، ابن حبانؒ اور ابن المنذرؒ کے نزدیک نماز باجماعت فرض ہے۔ اگرچہ یہ شرط نہیں ہے، یعنی اگر کوئی تنہا نماز پڑھ لے تو اس کا اعادہ نہیں کرنا پڑے گا، ظاہریہ اسے شرط کہتے ہیں یعنی تنہا نماز پڑھنے والے کی نماز نہیں ہوگی اور اس کے لئے اعادہ ضروری ہے یعنی جمعہ کی نماز کی طرح۔ بعض حنفی، مالکی اور شافعی علماء اسے فرض کفایہ کہتے ہیں۔

لیکن جمہور کے نزدیک یہ سنتِ مؤکدہ ہے کیونکہ دوسری احادیث سے اس کا فرض ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ایسی سنت ہے جسے بلا عذر ترک کرنا نہایت ہی بدبختی اور بد نصیبی ہے۔ (نیل الاوطار ج ۳، ص ۱۰۵)

امام بخاریؒ کے نزدیک بھی نماز باجماعت فرض ہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کے لئے انہوں نے جو باب باندھا ہے اس کا نام "باب وجوب صلوٰۃ الجماعۃ (نماز باجماعت فرض ہونے کا باب) ہے۔ (سبل السلام ج ۲، ص ۳)

جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ میں نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ آگ جلانے کا حکم دوں۔ پھر نماز کا حکم دوں اور جب اذان ہو جائے تو کسی آدمی کو جماعت کرانے کا حکم دوں اور پھر جا کر ان لوگوں کے گھر جلادوں جو نماز میں نہیں آتے"۔ (بخاری و مسلم)

مسند امام احمدؒ میں یہ الفاظ ہیں "اگر گھروں میں عورتیں اور بچے نہ ہوتے تو میں عشاء کی جماعت شروع کراتا اور اپنے نوجوانوں کو حکم دے دیتا کہ ان لوگوں کے گھروں کو جلادیں جو گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں اور آکر جماعت میں شریک نہیں ہوتے"۔

۳- حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ ایک نابینا شخص نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا "اے اللہ کے رسول ﷺ! میرے پاس کوئی ایسا آدمی نہیں ہے جو مجھے مسجد تک لاسکے، اس لئے اگر آپ مجھے رخصت دے دیں، تو میں گھر ہی پر نماز پڑھ لیا کروں" پہلے تو حضور ﷺ نے اسے رخصت دے دی، لیکن جب وہ پیٹھ پھیر کر چلنے لگا، تو آپ ﷺ نے اسے بلایا اور اس سے دریافت فرمایا "کیا تم اذان کی آواز سنتے ہو؟ اس نے کہا "جی ہاں"۔ فرمایا "تب تو اس اذان پر لبیک کہو (یعنی ضرور مسجد میں آکر جماعت سے نماز پڑھو)" (مسلم)

۴- حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "جس بستی یا گاؤں میں تین آدمی رہتے ہوں اور پھر ان میں جماعت نہیں ہوتی تو یقیناً ان پر شیطان اپنا غلبہ پا چکا ہوتا ہے۔ لہٰذا تم ضرور جماعت سے نماز پڑھو، اس لئے کہ بھیڑیا بکھری ہوئی بھیڑوں ہی کو چیرتا اور پھاڑتا ہے"۔ (ابو داؤد)

۲- عورتوں کا مسجد میں آکر جماعت میں شریک ہونا

عورتوں کا گھر میں نماز پڑھنا بلکہ گھر میں بھی اندر کی کوٹھڑی میں نماز پڑھنا مسجد میں آکر باجماعت نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔ حضرت اُمّ سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "عورتوں کی سب سے بہتر مسجد ان کے گھر کے اندر کی کوٹھڑی ہے"۔ (مسند امام احمد)

لیکن اگر وہ مسجد میں آکر جماعت میں شریک ہونا چاہیں تو انہیں اس کی اجازت ہے بشرطیکہ کسی خرابی اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہو اور وہ خوشبو لگا کر اور بناؤ سنگار کر کے نہ آئیں۔ (۱)

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک اس زمانے میں عورتوں کا (خواہ وہ جوان ہوں یا بوڑھی) مسجد میں آکر جماعت میں شریک ہونا بسبب ظہور فساد مکروہ ہے۔ اسی پر فتویٰ ہے۔ (عالمگیری، تنویر الابصار)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اگر تم سے تمہاری عورتیں رات کو مسجد میں آنے کی اجازت طلب کریں تو تم انہیں اجازت دو"۔ (بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی)

دوسری روایت میں ہے "اللہ کی بندیوں کو مسجدوں میں آنے سے منع نہ کرو، اگرچہ ان کے گھر ان کے لئے بہتر ہیں"۔ (احمد، ابو داؤد)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں سے منع نہ کرو لیکن انہیں چاہئے کہ سادگی کے ساتھ آئیں"۔ (مسند امام احمد)

۳۔ جماعت میں شرکت کے لئے چلنے کا ثواب

مسجد جانے کے لئے انسان کو جتنا زیادہ چلنا پڑے اتنا ہی اس کا ثواب زیادہ ہے۔ حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "نماز میں سب سے زیادہ اجر اس شخص کا ہے جو سب سے زیادہ چل کر جماعت میں شامل ہوتا ہے"۔ (بخاری، مسلم)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ مسجد نبوی کے قریب کچھ جگہ خالی ہوئی تو قبیلہ بنی سلمہ کے لوگوں نے چاہا کہ وہاں منتقل ہو جائیں۔ جب نبی ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے ان سے فرمایا "مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ تم لوگ مسجد کے قریب منتقل ہونا چاہتے ہو"۔ انہوں نے کہا "جی ہاں اے اللہ کے رسول ﷺ! ہمارا یہی ارادہ ہے" فرمایا "اے قبیلہ بنی سلمہ کے لوگو! اپنی موجودہ جگہ پر ٹکے رہو، تمہارے مسجد کی طرف چلنے کے قدم لکھے جائیں گے"۔ (مسلم)

۴۔ جماعت کی طرف سکون و وقار سے چلنے کا حکم

مسجد کی طرف جماعت میں شریک ہونے کے لئے دوڑ کر یا تیزی سے نہیں چلنا چاہئے بلکہ سکون سے چلنا چاہئے۔ اس لئے کہ جب انسان نماز کے لئے نکلتا ہے تو وہ نماز ہی میں ہوتا ہے: حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ نبی ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے کہ آپ ﷺ نے بعض لوگوں کا شور سنا۔ جب ہم نماز سے فارغ ہوئے تو حضور ﷺ نے دریافت فرمایا "کیا بات تھی"؟ ان لوگوں نے عرض کیا "ہم لوگ جماعت کی طرف تیزی سے آ رہے تھے"۔ فرمایا "ایسا نہ کیا کرو جب تم نماز کی طرف آؤ تو اطمینان اور سکون کے

ساتھ آؤ۔ جتنی جماعت تمہیں مل جائے اسے پڑھ لو اور جو رہ جائے، اسے پوری کر لو"۔ (بخاری و مسلم)

۵- جماعت سے رہ جانے کے عذر

مندرجہ ذیل حالات میں جماعت سے رہ جانے کی رخصت ہے:

(۱-۲-۳) سخت سردی یا بارش یا آندھی کے وقت: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ سخت سردی کی رات میں سفر میں جب رات بہت سرد ہوتی یا اس رات بارش ہوئی ہوتی یا آندھی چل رہی ہوتی، نبی ﷺ موذن کو حکم دیتے اور وہ اذان میں کہتا "صلوا فی رحالکم" (اپنے گھروں میں نماز پڑھ لو) (احمد، مسلم)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ہم ایک سفر میں نبی ﷺ کے ساتھ نکلے بارش ہو گئی، تو حضور ﷺ نے فرمایا "تم میں سے جو شخص چاہے اپنے گھروں میں نماز پڑھ لے"۔ (احمد، مسلم، ابو داؤد، ترمذی)

ایک مرتبہ بارش کے روز حضرت ابن عباسؓ نے اپنے موذن کو حکم دیا کہ جب وہ اذان کہے تو حی علی الصّلوٰۃ کے بجائے صلوا فی رحالکم کہے۔ لوگوں کو یہ چیز پسند نہ آئی، تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا "کیا تمہیں اس سے تعجب ہو رہا ہے؟ یہ کام اس ذات پاک نے کیا ہے جو مجھ سے بہتر تھی یعنی نبی ﷺ نے فرمایا جماعت میں اس وقت آنا عزیمت ہے اور مجھے یہ بات پسند نہ آئی کہ تمہیں گھروں سے نکالوں اور تم مٹی اور کیچڑ میں چل کر مسجد تک پہنچو"۔ (بخاری و مسلم)

(۳) جب کہ کھانا سامنے ہو: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کسی شخص کے سامنے کھانا آجائے تو اسے جلدی نہیں کرنی چاہئے اور اسے چاہئے کہ اپنی ضرورت پوری کرے، خواہ نماز کھڑی ہو جائے"۔ (بخاری)

(۴) جب کہ انسان کو پیشاب یا پاخانہ آرہا ہو: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "کھانا جب سامنے ہو تو نماز نہیں اور نہ اس وقت نماز ہے جبکہ آدمی کو پیشاب یا پاخانہ محسوس ہو رہا ہو۔ (احمد، مسلم، ابو داؤد)

(۵) سخت ضرورت کے وقت: حضرت ابو درداءؓ فرماتے ہیں "انسان کی دین کے بارے

میں سمجھ کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اگر اسے نماز کے وقت کوئی سخت ضرورت درپیش ہو تو پہلے وہ اپنی ضرورت پوری کر لے (۱) تاکہ جب وہ نماز کی طرف آئے تو پوری دل جمعی کے ساتھ آئے"۔ (بخاری)

۶۔ کتنے نمازیوں کے ملنے سے جماعت بنتی ہے

امام کے علاوہ کم از کم ایک نمازی ہو تو جماعت ہو جاتی ہے خواہ وہ سمجھ دار بچہ (۲) ہو یا عورت۔

حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "دو افراد یا ان سے زیادہ افراد جماعت ہیں"۔ (ابن ماجہ)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں ایک رات اپنی خالہ میمونہؓ کے ہاں سویا۔ رات کو نبی ﷺ جب اٹھ کر نماز پڑھنے لگے، تو میں بھی آپ کے ساتھ شامل ہو گیا۔ میں آپ کی بائیں جانب کھڑا ہوا تھا، تو آپ نے مجھے سر سے پکڑا اور اپنی دائیں جانب کھڑا کر لیا"۔ (بخاری و مسلم، احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

مسند امام احمدؒ کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں اور "اور میں اس وقت دس سال کا تھا"

حضرت ابو سعیدؓ اور ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو شخص رات کو جاگا اور اس نے اپنی بیوی کو بھی جگایا اور پھر دونوں نے نماز پڑھی، تو ان دونوں کو الذّاکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّ الذّاکِرَات (اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور عورتیں) میں لکھ دیا گیا" (ابو داؤد)

۷۔ امامت کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اگر تین شخص ہوں، تو ان

---

(۱) مذاہب اربعہ میں مرض، سخت اندھیرے، آندھی اور خوف کے وقت بھی جماعت سے رہ جانے کی اجازت ہے، نابینا آدمی بھی اگر خود مسجد نہ جا سکتا ہو اور نہ اسے کوئی مسجد لے جانے والا ہو تو اسے بھی جماعت سے رہ جانے کی اجازت ہے۔ (الفقہ ج ۱ ص ۳۸)

(۲) مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک اگر صرف ایک سمجھ دار بچہ مقتدی ہو تو نفل جماعت ہو جائے گی۔ فرض نہیں ہوگی (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۴۰۵ ۔ المغنی ۲ ص ۴)

میں سے ایک شخص امام بنے اور امامت کا زیادہ حقدار وہ ہے جو ان میں اَقْرَاءُ (سب سے بہتر پڑھنے والا) ہو" (بخاری، مسلم)

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "لوگوں کا امام وہ بنے گا جو ان میں اَقْرَاءُ ____ ہو(1)۔ اگر سب پڑھنے میں برابر ہوں، تو وہ جو سب سے زیادہ سنت کا علم رکھنے والا ہو۔ اگر سنت کا علم رکھنے میں سب برابر ہوں، تو وہ جس نے سب سے پہلے ہجرت کی ہو۔ اگر ہجرت میں بھی سب برابر ہوں، تو وہ جس کی عمر سب سے زیادہ ہو اور کوئی آدمی کسی دوسرے آدمی کی جگہ پر امامت نہ کرائے اور نہ اس کے گھر میں اس کے اپنے بیٹھنے کی جگہ پر بیٹھے الا یہ کہ وہ خود اجازت دے دے"۔ (احمد، مسلم)

۸۔ وہ لوگ جن کی امامت صحیح ہے

ذیل میں ہم بعض ایسے لوگوں کا ذکر کرتے ہیں جن کی امامت جائز ہے، حالانکہ بظاہر ان کی امامت کے ناجائز ہونے کا شبہ ہو سکتا ہے۔

(الف) نابینا: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے دو مرتبہ حضرت ابن ام مکتومؓ کو اپنے پیچھے مدینہ کا امام بنایا۔ وہ لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے حالانکہ وہ نابینا تھے"(1) (احمد، ابو داؤد)

---

(1) امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک اَقْرَاءُ (زیادہ بہتر پڑھنے والا یعنی حافظ) فقہ زیادہ سمجھنے والا یعنی عالم پر مقدم ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں، حدیث کے یہ الفاظ کہ "اگر پڑھنے میں برابر ہوں تو وہ شخص سب سے زیادہ حق دار ہے، جو سنت کا سب سے زیادہ جاننے والا ہے اس بات کی دلیل ہے کہ اَقْرَاءُ (حافظ) سب پر مقدم ہے)

امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک افقہ (عالم) اقراء (حافظ) پر مقدم ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں "اس حدیث کے مخاطب صحابہؓ کرام تھے۔ ان میں سے جو شخص زیادہ پڑھنے والا ہوتا تھا۔ وہی سب سے زیادہ سمجھنے والا ہوگا۔ وہ لوگ بڑی عمر میں اسلام لائے تھے۔ لہذا پڑھنے سے پہلے سمجھتے تھے۔ ان میں کوئی پڑھنے والا ایسا نہیں پایا جاتا تھا جو سمجھتا نہ ہو۔ البتہ ایسے سمجھنے والے ان میں پائے جا سکتے تھے جو پڑھنے والے نہ ہوں۔ (نیل الاوطار ج ۳ ص ۱۴۳)

(۲) حنفیہ کے نزدیک اگر نابینا تمام نمازیوں سے بہتر ہے تو اس کی امامت صحیح ہے ورنہ مکروہ، حنابلہ کے نزدیک بھی اندھے کی امامت مکروہ ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۸۲۔۳۸۳)

(ب) غلام: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ جب پہلے پہل نبی ﷺ کی مدینہ منورہ میں تشریف آوری سے پہلے مہاجرین قباء کے قریب ایک مقام عصبہ میں ٹھہرے تو حضرت ابو حذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام حضرت سالمؓ لوگوں کی امامت کرایا کرتے تھے۔ انہیں سب سے زیادہ قرآن یاد تھا حالانکہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے والوں میں حضرت عمرؓ اور ابو سلمہؓ بھی تھے" (بخاری، ابوداؤد)

حضرت ابن ابی ملیکہؓ سے روایت ہے کہ وہ عبید بن عمیرؓ، مسور بن مخرمہ اور کچھ دوسرے لوگ حضرت عائشہؓ کے پاس آیا کرتے تھے تو حضرت عائشہؓ کے آزاد کردہ غلام ابو عمرؓو ان کی امامت کرایا کرتے تھے اور ابو عمرؓو اس وقت غلام ہی تھے، آزاد نہیں ہوئے تھے۔ (مسند امام شافعی)(۱)

(ج) مسافر: مقیم کے لئے مسافر کے پیچھے نماز پڑھنا صحیح ہے جب کہ وہ بعد میں اپنی نماز پوری کر لے۔

حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب تک سفر میں رہتے، دو رکعت نماز پڑھتے۔ آپ نے مکہ معظمہ میں اٹھارہ روز قیام فرمایا تو مغرب کے علاوہ نمازوں میں دو دو رکعتیں پڑھیں۔ پھر (یعنی سلام پھیرنے کے بعد آپ ﷺ فرمایا کرتے "اے مکہ والو! کھڑے ہو کر بقیہ دو رکعتیں پڑھو، اس لئے کہ ہم تو مسافر ہیں"۔ (مسند امام احمد)

اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (فتح الربانی ج ۵ ص ۲۸۰)

(د) کسی عذر کی بنا پر بیٹھ کر نماز پڑھنے والا: ایسے شخص کی امامت جائز ہے، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ بیمار ہوئے تو آپ نے بیٹھ کر نماز پڑھائی۔ کچھ لوگ آپ کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے تو آپ نے انہیں اشارہ فرمایا کہ بیٹھ جاؤ۔ جب آپ نے سلام پھیرا تو فرمایا "امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اتباع کی جائے، لہذا جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو اور جب وہ اٹھے تو تم بھی اٹھو اور جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو"۔ (بخاری و مسلم)

حضرت عائشہؓ ہی کی ایک دوسری روایت میں (جس میں وہ نبی ﷺ کی آخری

---

(۱)۔ مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک غلام کی امامت جمعہ کے لئے صحیح نہیں ہے، دوسری نمازوں کے لئے صحیح ہے، حنفیہ کے نزدیک جمعہ کی بھی صحیح ہے۔ (الفقہ علی المذاہب ج ۱ ص ۳۶۹)

بیماری کا حال بیان کرتی ہیں) ہے کہ حضور ﷺ نے لوگوں کو بیٹھ کر نماز پڑھائی۔ حضرت ابو بکرؓ آپ کی تکبیر کے ساتھ تکبیر کہتے جا رہے تھے اور لوگ حضرت ابو بکرؓ کی تکبیر کے ساتھ تکبیر کہتے تھے" (بخاری و مسلم) دوسری روایت سے واضح ہے کہ اس مرتبہ آپ نے لوگوں کو بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ (۱)

(ہ) تیمم (جس کا تیمم ہو) : کسی باوضو آدمی کا تیمم والے کے پیچھے نماز پڑھنا صحیح ہے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ غزوۂ ذات السلاسل میں بھیجے گئے۔ ایک رات جب کہ سردی سخت تھی مجھے غسل کی ضرورت پیش آگئی اور مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں نہایا تو مر جاؤں گا، چنانچہ میں نے تیمم کیا اور لوگوں کو صبح کی نماز پڑھائی۔ جب ہم مدینہ واپس آئے تو لوگوں نے نبی ﷺ سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا "اے عمرو تم نے جنابت کی حالت میں لوگوں کو نماز پڑھائی؟ میں نے عرض کیا، مجھے قرآن پاک کی

---

(۱) امام مالکؒ اور آپ کے اصحاب کے نزدیک بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی امامت صحیح نہیں ہے کیونکہ بیٹھ کر نماز پڑھانے کو وہ صرف نبی ﷺ کے ساتھ مخصوص مانتے ہیں، دوسروں کے لئے اسے جائز قرار نہیں دیتے۔ امام ابو حنیفہؒ، احمد بن حنبلؒ، شافعیؒ اور دوسرے تمام علمائے سلف اس کو صحیح مانتے ہیں، لیکن ان کے درمیان اختلاف اس بارے میں ہے کہ آیا جو شخص بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو اسکے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنا صحیح ہے یا یہ کہ اس کے ساتھ مقتدیوں کو بھی بیٹھ کر ہی نماز پڑھنی چاہئے۔ جیسا کہ اوپر حضرت عائشہؓ کی پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ امام احمدؒ کے نزدیک سب کو بیٹھنا چاہئے۔ البتہ اگر امام نماز کو شروع تو کھڑے ہو کر کرے لیکن درمیان میں بیٹھنے پر مجبور ہو جائے تو مقتدیوں کا کھڑے ہو کر نماز پڑھتے رہنا صحیح ہے جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مسلمؒ اور بہت سے دوسرے ائمہ پہلی حدیث کو دوسری حدیث سے منسوخ مانتے ہیں اس لئے ان کے نزدیک مقتدیوں کا بیٹھنا صحیح نہیں ہے بلکہ انہیں کھڑے ہو کر ہی نماز پڑھنی چاہئے حافظ ابن حجرؒ، امام نوویؒ اور دوسرے علماء حدیث دونوں حدیثوں کے درمیان اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنا بھی جائز ہے اور بیٹھ کر بھی البتہ بہتر یہ ہے کہ وہ بھی بیٹھ کر ہی نماز پڑھیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اوپر پہلی حدیث میں نبی ﷺ نے بیٹھنے کا جو حکم دیا ہے وہ استحباب کے لئے ہے ایسا کرنا لازمی نہیں ہے۔

(فتح الباری ج ۲ ص ۷۷ ۔ ۲ - شرح مسلم نووی ج ۱ ص ۱۷۶)

یہ آیت یاد آگئی تھی "وَلَا تَقْتُلُوٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا (اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو، بیشک اللہ تم پر رحم کرنے والا ہے) اس لئے میں نے تیمم کر کے نماز پڑھ لی۔ نبی ﷺ ہنس دیئے اور مزید کچھ نہ فرمایا" (احمد۔ ابو داؤد، حاکم، دار قطنی، ابن حبان (۱))

(و) عورت کی امامت صرف عورتوں کے لئے: عورت کا مردوں کی امامت کرانا بالاتفاق ناجائز ہے۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "کوئی عورت کسی مرد کی امامت نہ کرائے" (ابن ماجہ)

البتہ عورت کا عورتوں کی امامت کرانا جائز ہے، حضرت ام ورقہؓ بنت نوفل سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ان سے ملنے کے لئے ان کے گھر تشریف لاتے تھے۔ آپ نے ان کے لئے ایک موذن بھی مقرر کر رکھا تھا جو ان کے لئے اذان دیتا تھا اور وہ اپنے گھر والوں کی امامت کراتی تھیں" (ابو داؤد)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں "عورت عورتوں کی امامت کرائے گی اور ان کے درمیان کھڑی ہوگی" (عبد الرزاق) (۲)

(ز) مرد کی امامت صرف عورتوں کے لئے: حضرت اُبَیّ بن کعبؓ سے روایت ہے کہ وہ نبی ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا "یارسول اللہ ﷺ! رات میں نے ایک کام کیا"۔ فرمایا "وہ کیا؟" عرض کیا "چند عورتیں گھر میں جمع ہو گئیں اور کہنے لگیں کہ، تم قرآن پڑھتے ہو اور ہم نہیں پڑھتیں، لہذا آج ہماری جماعت کراؤ"۔ پھر میں نے انہیں آٹھ رکعتیں اور وتر پڑھائے"۔ اس پر نبی ﷺ خاموش ہو گئے اور آپ کا خاموش ہونا آپ کی رضامندی تھا۔ (طبرانی، ابو یعلیٰ) (۳)

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک ایک باوضو آدمی کی نماز تیمم والے کے پیچھے جائز ہے مگر مکروہ ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۷۸)

(۲) مالکیہ کے نزدیک عورت کسی حالت میں امامت نہیں کرا سکتی نہ مردوں کی اور نہ عورتوں کی (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۶۲، ۳۸۲) حنفیہ کے نزدیک عورت کا امامت کرانا جائز ہے مگر مکروہ ہے اور اگر کوئی کرے تو عورتوں کے ساتھ صف کے درمیان کھڑی ہو جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے کیا (کتاب الآثار امام محمد)

(۳) حنفیہ اور حنبلیہ کے نزدیک کسی مرد کا اجنبی عورتوں کو جن میں اس کی کوئی محرم (ماں، بہن یا بیوی وغیرہ) نہ ہو امامت کرانا مکروہ ہے۔ (الفقہ ــــ ج ۱ ص ۳۸۳، ۳۸۴)

۹- وہ لوگ جن کی امامت صحیح نہیں ہے

(ا) وہ آدمی جسے مقتدی اس کی جہالت یا کسی اور وجہ سے پسند نہ کرتے ہوں:

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "تین آدمی ایسے ہیں جن کی کوئی نماز اللہ قبول نہیں کرتا۔ ایک وہ شخص جو ایسے لوگوں کی امامت کرائے جو اسے پسند نہ کرتے ہوں، دوسرے وہ جو نماز میں ایسے وقت آتا ہو جب کہ اس کا وقت جاتا رہتا ہے۔ تیسرا وہ جو اپنے غلام کو آزاد کر کے پھر اسے غلام بنالے"۔ (ابو داؤد، ابن ماجہ)

امام ترمذیؒ لکھتے ہیں صحابہ میں سے بعض نے اس چیز کو ناپسند کیا ہے کہ کوئی آدمی ایسے لوگوں کی امامت کرائے جو اسے ناپسند کرتے ہوں، لیکن اگر امام ظالم نہ ہو (یعنی اس میں کوئی نقص یا عیب نہ ہو) تو گناہ ان لوگوں کو ہوگا جو اسے ناپسند کرتے ہوں"۔ (۱)

(ب) فاسق اور بدعتی: امامت کے بارے میں جمہور کا مسلک یہ ہے کہ جس شخص کی نماز اپنے لئے جائز ہے۔ اس کی جماعت دوسروں کے لئے بھی جائز ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "تم پر امیر کے ساتھ مل کر جہاد کرنا واجب ہے خواہ وہ نیک ہو یا بد۔ اسی طرح تم پر ہر مسلمان کے پیچھے نماز پڑھنا واجب ہے خواہ وہ نیک ہو یا بد، اگرچہ وہ کبائر کا مرتکب ہو"۔ (ابو داؤد)

حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "ہر اس شخص کے پیچھے نماز پڑھو جو لا الہ الا اللہ کہتا ہو اور ہر اس شخص کی نماز جنازہ پڑھو جو لا الہ الا اللہ کہتا ہو"۔ (دارقطنی)

یہ دونوں روایتیں اگرچہ کمزور ہیں لیکن ان تمام صحابہؓ کرام کا عمل ان ہی کے مطابق ہے۔ جنہوں نے بنی امیہ کا زمانہ پایا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ وہ حجاج کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ (بخاری)

حضرت ابو سعید خدریؓ نے مروانؒ کے پیچھے عید کی نماز پڑھی، حالانکہ مروان وہ شخص ہے جس نے عید میں نماز سے پہلے خطبہ دیا۔" (مسلم، ابو داؤد، ترمذی)

البتہ ایسے لوگوں کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔" قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں "اختلاف اگر

---

(۱) مذاہب اربعہ کا اس پر اتفاق ہے۔ (الفقہ ---ج ۱ص ۳۸۲)

ہے تو صرف اس چیز میں کہ آیا فاسق اور ظالم آدمی کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے کہ نہیں؟ رہی یہ چیز کہ ایسے آدمی کے پیچھے نماز مکروہ (ناپسندیدہ) ہے، تو اس میں کوئی اختلاف نہیں"۔(۱)

(ج) متنفل (نفل نماز پڑھنے والا) اکثر سلف (جن میں امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ شامل ہیں) کے نزدیک جو شخص نفل پڑھ رہا ہو، اس کے پیچھے لوگوں کا فرض نماز کی نیت کر کے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے "امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اتباع کی جائے"۔(۲)

(د) بچہ: نماز میں بچہ کی امامت بڑوں کے لئے صحیح نہیں ہے کیونکہ بچہ پر نماز فرض نہیں ہے، گویا اس کی حیثیت نفل پڑھنے والے ہی کی ہے۔(۳)

---

(۱) حنابلہ کے نزدیک فاسق کے پیچھے نماز جائز نہیں ہے۔ البتہ عید اور جمعہ کی نماز ایسی صورت میں جائز ہے جبکہ کسی دوسرے کا امام بننا مشکل ہو۔ حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک فاسق کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۳۸۲)

(۲) شافعیہ اور اہل حدیث کے نزدیک نفل پڑھنے والے کی امامت فرض نماز پڑھنے والے کیلئے صحیح ہے۔ امام طاؤسؒ، عطاء، اوزاعیؒ اور داؤد ظاہریؒ وغیرہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ ان کا استدلال اس روایت سے ہے کہ حضرت جابرؓ نبی ﷺ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھا کرتے تھے، پھر واپس جا کر اپنے قبیلہ کے لوگوں کو یہی نماز پڑھایا کرتے تھے۔ (بخاری، مسلم، شافعی، دارقطنی، کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں۔ یہ ان کی نفل نماز ہوتی تھی اور لوگوں کی فرض"۔۔۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، اور دوسروں کے نزدیک نبی ﷺ کے ارشاد "امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اتباع کی جائے" کی رو سے امام اور مقتدی کا نیت افعال میں باہم مطابق ہونا ضروری ہے، اور امام شافعی اور دوسروں کے نزدیک امام اور مقتدی کا صرف افعال میں باہم مطابق ہونا ضروری ہے، نیت میں ضروری نہیں، اس لئے ان کے نزدیک نفل پڑھنے والے کے پیچھے مقتدی کا فرض کی نیت کر کے یا عصر کی نماز پڑھنے والے کے پیچھے ظہر کی نیت کر کے نماز پڑھنا صحیح ہے۔ (شرح مسلم النووی ج ۱، ص ۱۷۶)

رہی حضرت جابرؓ کی حدیث تو اس کے متعلق حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ وغیرہ کا کہنا یہ ہے کہ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ نبی ﷺ کو بھی اس کا علم تھا۔ (فتح القدیر ج ۱، ص ۱۵۶)

(۳) امام شافعیؒ، حسن بصریؒ، اسحاقؒ اور اہل حدیث کے نزدیک بچہ کی امامت بڑوں کیلئے فرض نماز میں بھی صحیح ہے اور نفل نماز میں بھی۔ ان کا استدلال حضرت عمرو بن سلمہؓ کی اس روایت سے ہے کہ جب مکہ فتح ہو گیا تو لوگ جوق در جوق داخل اسلام ہونے لگے۔ میرے والد ہمارے قبیلہ میں سب سے پہلے اسلام لائے۔ جب وہ آئے تو انہوں نے لوگوں سے کہا "میں تمہارے پاس اللہ کے رسول ﷺ کی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

۱۰- امام اور مقتدیوں کے کھڑے ہونے کی صورت

(۱) اگر امام کے ساتھ ایک مقتدی ہے تو وہ امام کے ساتھ دائیں جانب کھڑا ہوگا اور اگر دو یا دو سے زیادہ مقتدی ہیں تو وہ امام کے پیچھے کھڑے ہوں گے:

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ مغرب کی نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو میں آکر آپ کی بائیں جانب شامل ہوگیا- آپ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے گھما کر اپنی دائیں جانب کھڑا کر دیا پھر جبار بن صخرؓ آگئے اور نبی ﷺ کی بائیں جانب کھڑے ہوگئے- آپ نے ہمارے ہاتھ پکڑے اور ہمیں دھکیل دیا اور اپنے پیچھے کھڑا کر دیا(۱)"- (مسلم، ابو داؤد)

حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ اگر ہم تین آدمی ہوں تو ہم میں سے ایک آگے ہو (اور دو پیچھے)" (ترمذی)

اگر جماعت میں عورت آجائے تو وہ مردوں سے الگ ان کے پیچھے کھڑی ہوگی:

حضرت انسؓ ہی سے روایت ہے کہ میں نے اور ہمارے گھر کے ایک یتیم لڑکے نے نبی ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی اور میری والدہ ام سلیمؓ ہمارے پیچھے تھیں"- دوسری روایت میں ہے- "میں اور وہ یتیم لڑکا نبی ﷺ کے پیچھے کھڑے ہوئے اور والدہ ہمارے پیچھے"- (بخاری)

طرف سے حق بات لے کر آیا ہوں- فلاں فلاں نماز فلاں فلاں وقت پڑھو اور جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے ایک شخص اذان دے اور تمہاری امامت وہ کرائے، جسے سب سے زیادہ قرآن یاد ہو، لوگوں نے دیکھا کہ مجھ سے زیادہ کسی کو قرآن یاد نہ تھا، اس لئے کہ میں مختلف قافلہ والوں سے قرآن سیکھتا رہتا تھا- لہذا انہوں نے مجھے امامت کے لئے آگے بڑھا دیا اور میں اس وقت چھ یا سات برس کا تھا مجھ پر ایک چادر ہوا کرتی تھی جب میں سجدہ میں جاتا تو وہ کھسک جاتی، بستی کی ایک عورت نے ایک روز لوگوں سے کہا اپنے امام کے چوتڑ تو ڈھانک دو" اس پر لوگوں نے میرے لئے کپڑا خریدا جس سے مجھے از حد خوشی ہوئی"-

(بخاری، مسلم، ابو داؤد)

اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ حنفیہ، مالکیہ، حنابلہ اور دوسرے (جن کے نزدیک بچے کی امامت صحیح نہیں ہے) حضرت عمرو بن سلمہؓ کی اس روایت کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اس میں صحابہ کا عمل بیان ہوا ہے اور اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ نبی ﷺ کو بھی اس کی اطلاع تھی- (المغنی ج ۲)

(۱) حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک اگر مقتدی ایک ہے تو اس کا امام کے دائیں طرف کچھ پیچھے ہٹ کر کھڑا ہونا بہتر ہے- مالکیہ کے نزدیک اس کا امام کے برابر کھڑا ہونا مکروہ ہے- حنفیہ کے ہاں مکروہ نہیں ہے- (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۴۳۲)

ومسلم)

(ب) یہ چیز مستحب ہے کہ امام کی دائیں اور بائیں طرف لوگ برابر ہوں اور اس کے قریب وہ لوگ کھڑے ہوں جو علم رکھتے ہوں تاکہ اگر کبھی امام کو کسی عذر کی وجہ سے ہٹنا پڑ جائے تو وہ اس کی جگہ کھڑے ہو کر جماعت کا نظم برابر رکھ سکیں:۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "امام کو وسط میں رکھو اور اپنے درمیان کے فاصلہ کو پر کرو"۔ (ابو داؤد)

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "میرے قریب وہ لوگ کھڑے ہوں جو عقل و سمجھ رکھتے ہوں پھر وہ لوگ جو ان سے کم تر ہوں پھر وہ لوگ جو ان سے کم تر ہوں اور تم بازاروں کی فضول قسم کی باتوں سے بچو۔ (احمد، مسلم، ابو داؤد، ترمذی)

(ج) اگر مقتدیوں میں مرد، عورتیں اور بچے سب شامل ہوں تو سب سے آگے مرد ہوں گے پھر بچے اور پھر عورتیں:

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جماعت میں مردوں کو سب سے آگے رکھتے تھے۔ ان کے پیچھے بچوں کو اور ان کے پیچھے عورتوں کو۔ (احمد، ابو داؤد)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "مردوں کی سب سے اچھی صف اگلی صف ہے اور ان کی سب سے خراب صف پچھلی صف ہے۔ عورتوں کی سب سے اچھی صف پچھلی صف ہے اور ان کی سب سے خراب صف اگلی صف ہے"۔ (مسلم، احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

(د) صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھنے سے اگرچہ نماز ہو جاتی ہے لیکن مکروہ ہے:

حضرت وابصہ بن معبدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جو صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھ رہا تھا تو آپ نے اسے نماز دوہرانے کا حکم دیا"۔ (ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

حضرت طلقؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جو شخص صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھے، اس کی نماز نہیں"۔ (ابن حبان)

ان احادیث میں نبی ﷺ کی ممانعت کو کراہت پر اور دوبارہ نماز پڑھنے کے حکم کو کراہت کو دور کرنے پر محمول کیا جائے گا کیونکہ حضرت ابو بکرہؓ سے روایت ہے کہ میں مسجد میں آیا تو دیکھا کہ نبی ﷺ نماز پڑھا رہے ہیں اور رکوع میں ہیں۔ میں صف میں پہنچنے سے پہ

ہی رکوع میں ہو گیا اور اسی طرح چل کر جماعت سے مل گیا بعد میں نبی ﷺ نے مجھ سے فرمایا "اللہ خیر پر تمہاری حرص کو زیادہ کرے۔ آئندہ ایسا نہ کرو" (بخاری) یعنی جب صف کے پیچھے تنہا رکوع جائز ہے تو پھر پوری نماز بھی جائز ہے"۔(۱)

اگر کوئی شخص اس وقت آئے جب کہ صف پوری ہو چکی ہو تو اسے چاہئے کہ تنہا نماز پڑھنے کے بجائے صف میں سے کسی کو کھینچ کر اپنے ساتھ ملالے:

حضرت مقاتل بن حیانؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اگر کوئی شخص آئے اور وہ کسی دوسرے شخص کو نہ پائے تو اسے چاہئے کہ صف میں سے کسی آدمی کو کھینچ کر اپنے ساتھ کھڑا کرلے، جس شخص کو کھینچا جائے گا اس کا ثواب بہت ہے"۔(ابوداؤد)

حضرت وابصہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے صف کے پیچھے (تنہا، نماز پڑھی، نبی ﷺ نے اس سے فرمایا "اے نماز پڑھنے والے! تم صف میں داخل کیوں نہ ہو گئے؟ یا (اگر صف پوری ہو چکی تھی، تو) کسی کو صف میں سے کیوں نہ کھینچ لیا۔ اپنی نماز دہراؤ (۲)"۔ (بیہقی، طبرانی)

---

(۱) امام احمدؒ، نخعیؒ، اسحاقؒ، حسن بن صالحؒ اور اہل حدیث علماء) ان احادیث میں نبی ﷺ کے حکم کو حرمت پر محمول کرتے ہیں۔ لہذا ان کے نزدیک جو شخص صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھے، اس کی نماز نہیں ہوگی اور اس کے لئے دوبارہ نماز پڑھنا ضروری ہے۔ (نیل الاوطار ج ۳' ص ۱۵۷) رہی حضرت ابوبکرہؓ والی حدیث تو امام احمد فرماتے ہیں کہ اس کا حکم خاص ہے اور دوسری احادیث کا عام یعنی جو شخص حضرت ابوبکرہؓ کی طرح جماعت میں ملنے سے پہلے سے رکوع کرے، اس کی نماز ہو جائے گی، لیکن جماعت کے پیچھے تنہا نماز پڑھنے سے نماز نہیں ہوگی۔ (الفتح الربانی ج ۵' ص ۳۲۸)

(۲) اس بارے میں حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے البتہ تفصیلات میں اختلاف ہے۔ حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک ایسے شخص کو چاہئے کہ اللہ اکبر کہنے کے بعد صف میں سے کسی ایسے شخص کو کھینچ لے جو یہ مسئلہ جانتا ہو۔ حنابلہ کے نزدیک اسے چاہئے کہ صف میں سے کسی شخص کو بول کر یا کھنکار کر اپنے ساتھ پیچھے کرے، ہاتھ سے پکڑ کر کھینچنا مکروہ ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱' ص ۳۸۵)
امام مالک کے نزدیک وہ اکیلا کھڑا ہو جائے اور کسی کو صف میں سے نہ کھینچے کسی کو صف میں سے کھینچنا مکروہ ہے' ان کے نزدیک حضرت مقاتل اور وابصہ کی مذکورہ بالا روایات کی سند میں کلام ہے اور وہ معتبر نہیں ہیں (الفتح الربانی ج ۵ ص ۳۲۸)

(ر) امام کا مقتدیوں سے اونچا کھڑا ہونا صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ امام کسی اونچی جگہ کھڑا ہو اور لوگ اس سے نیچے ہوں"۔ (دارقطنی)

حضرت حذیفہؓ نے مدائن میں لوگوں کی ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر امامت کرائی، تو حضرت ابو مسعودؓ نے ان کی قمیض پکڑ کر انہیں کھینچ لیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو انہوں نے حضرت حذیفہؓ سے کہا "کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اس چیز سے منع کیا گیا ہے؟ انہوں نے کہا جی ہاں جو نہی آپ نے مجھے کھینچا، مجھے اسی وقت یاد آگیا"۔ (ابو داؤد، ابن حبان)

البتہ کسی ضرورت، تعلیم یا مصلحت کے پیش نظر امام مقتدیوں سے اونچا کھڑا ہو سکتا ہے: حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ جس روز پہلی مرتبہ منبر رکھا گیا، نبی ﷺ اس کے اوپر بیٹھے اور اللہ اکبر کہا، پھر رکوع کیا پھر پیچھے ہٹ کر نیچے اترے اور سجدہ کیا اور آپؐ کے ساتھ لوگوں نے بھی سجدہ کیا پھر دوسری رکعت میں بھی ایسے ہی کیا یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو گئے جب سلام پھیرا تو فرمایا "اے لوگو! میں نے یہ اس لئے کیا ہے کہ تم میری اتباع کرو اور یہ سیکھو کہ میں کیسے نماز پڑھتا ہوں"۔ (بخاری و مسلم)

مقتدیوں کا امام سے اوپر کھڑا ہونا جائز ہے: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے جماعت میں شامل ہو کر مسجد کی چھت پر نماز پڑھی"۔ (مسند سعید بن منصور، شافعی، بیہقی، بخاری فی التعلیقات)

(س) جماعت کی پہلی صف میں دائیں طرف کھڑا ہونے کی فضیلت: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو تا کہ اذان اور پہلی صف کا کیا ثواب ہے اور پھر انہیں قرعہ ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا تو وہ قرعہ ڈالا کرتے"۔ (بخاری)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے ان لوگوں پر سلامتی بھیجتے ہیں جو صفوں کی دائیں طرف نماز پڑھتے ہیں"۔ (ابو داؤد)

اگر امام اور مقتدیوں کے درمیان کوئی چیز (مثلاً دیوار) حائل ہو لیکن مقتدیوں کو دیکھنے یا سننے کے ذریعے اس کی تکبیروں وغیرہ کا علم رہے تو ایسی صورت میں جماعت جائز ہے:

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ رات کو اپنے کمرے میں نماز پڑھا کرتے تھے

اور کمرے کی دیوار چھوٹی تھی۔ ایک رات لوگوں نے آپ کو نماز پڑھتے دیکھ لیا اور آپ کی نماز کے ساتھ (یعنی آپ کی امامت میں) نماز پڑھنے لگے"۔ (بخاری)

۱۱۔ وہ کام جو امام کے لئے مستحب ہیں

(ا) امام کے لئے مستحب ہے کہ مقتدیوں کا خیال کرتے ہوئے ہلکی نماز پڑھے:
حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص لوگوں کی امامت کرا رہا ہو، تو اسے چاہئے کہ ہلکی نماز پڑھے، اس لئے کہ ان میں کمزور بھی ہوتے ہیں، بیمار بھی اور بوڑھے بھی اور اگر وہ تنہا نماز پڑھے تو اسے چاہئے کہ لمبی نماز پڑھے"۔ (بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب میں نماز شروع کرتا ہوں تو چاہتا ہوں کہ لمبی نماز پڑھوں لیکن اتنے میں کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو نماز ہلکی کر دیتا ہوں۔ اس خیال سے کہ بچے کی ماں کو اس کے رونے کی وجہ سے تکلیف ہو رہی ہو گی"۔ (بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

(ب) امام کا پہلی رکعت لمبی پڑھنا مستحب ہے تاکہ آنے والے نمازی شریک ہو سکیں: حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ظہر کی نماز میں پہلی رکعت دوسری سے لمبی پڑھا کرتے تھے، اسی طرح عصر میں اور اسی طرح فجر میں"۔ (بخاری، مسلم، ابو داؤد) ابو داؤد میں یہ الفاظ زیادہ ہیں "ہم خیال کرتے تھے کہ حضور ﷺ ایسا اس لئے فرماتے ہیں کہ لوگ پہلی رکعت میں شامل ہو سکیں"۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ "نماز کھڑی ہو جاتی تھی اور ہم میں سے کوئی شخص بقیع جاتا اور رفع حاجت کے بعد آکر وضو کرتا اور پہلی رکعت میں شامل ہو جاتا کیونکہ نبی ﷺ اسے لمبی پڑھا کرتے تھے"۔(۱) (احمد، مسلم، ابن ماجہ، نسائی)

(ج) امام کے لئے مستحب ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد دائیں یا بائیں طرف پلٹ

---

(۱) امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ، اوزاعیؒ اور ابو یوسفؒ کے نزدیک لوگوں کے انتظار کی وجہ سے نماز کا لمبا کرنا مکروہ ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ، اور اسحاقؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر انتظار سے دوسرے مقتدیوں کو تکلیف نہ ہوتی ہو تو وہ جائز ہے ورنہ نہیں"۔ (نیل الاوطار ج ۳، ص ۱۱۷)

کر مقتدیوں کی طرف رخ کرے:

حضرت ہلبؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ہماری امامت کراتے تھے (سلام کے بعد) آپ اپنی دائیں یا بائیں طرف پلٹ کر ہماری طرف رخ فرماتے"۔ (ترمذی)

حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ ہم جب نبی ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تو یہ چاہا کرتے تھے کہ آپ کی دائیں طرف ہوں، تاکہ حضور ﷺ ہماری طرف رخ فرمائیں (یعنی آپ زیادہ تر دائیں طرف رخ فرمایا کرتے تھے"۔) (ابوداؤد)

(د) نماز کے بعد امام کا اپنی جگہ سے ہٹ کر سنتیں وغیرہ پڑھنا مستحب ہے:

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "امام کو اپنی اس جگہ نماز نہ پڑھنی چاہیے جہاں اس نے فرض نماز پڑھائی ہو، بلکہ وہاں سے ہٹ کر نماز پڑھنی چاہیے"۔ (ابو داؤد، ابن ماجہ) یہ روایت اگرچہ کچھ کمزور ہے لیکن اس پر عمل سب کے نزدیک مستحب ہے۔

۱۲- وہ کام جو مقتدیوں کے لئے ضروری یا مستحب ہے

(ا) اپنی صفوں کو ملانا، اور خوب مل کر کھڑے ہونا ضروری ہے: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ اللہ اکبر کہنے سے پیشتر نبی ﷺ ہماری طرف متوجہ ہوتے اور فرماتے "مل جاؤ اور سیدھے ہو جاؤ"۔ (بخاری و مسلم)

حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ہماری صفوں کو اس طرح سیدھی کیا کرتے تھے گویا کہ آپ ان سے تیر سیدھا کر رہے ہیں یہاں تک کہ آپ جان لیتے کہ ہم سمجھ گئے۔ پھر ایک دن آپ باہر تشریف لائے اور نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اللہ اکبر کہنے والے ہی تھے کہ آپ نے ایک آدمی کو دیکھا جس کا سینہ صف سے آگے کی طرف نکلا ہوا تھا۔ فرمایا "اے اللہ کے بندو! اپنی صفیں سیدھی کر لو ورنہ اللہ تمہارے درمیان مخالفت ڈال دے گا"۔ (مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اپنی صفیں سیدھی کرو۔ اپنے کندھے برابر رکھو۔ اپنے بھائیوں کے لئے نرم ہو جاؤ۔ خالی جگہوں کو پر کرو اس لئے کہ شیطان تمہارے درمیان بھیڑ کے بچے کی طرح داخل ہو جاتا ہے"۔ (احمد، طبرانی)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اگلی صف پوری کرو، پھر جو اس کے بعد ہو اس طرح جو بھی کمی ہو وہ پچھلی صف میں رہنی چاہیے"۔(ابو داؤد، نسائی، بیہقی)

(ب) جماعت میں امام کی متابعت (پیچھے رہنا) ضروری ہے اور اس سے مسابقت کرنا گناہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اتباع کی جائے، لہذا تم اس سے جلدی نہ کرو جب وہ اللہ اکبر کہے تو تم اللہ اکبر کہو جب وہ رکوع کرے تو تم رکوع کرو جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللھم ربنا لک الحمد کہو۔ جب وہ سجدہ کرے تو تم سجدہ کرو اور تم رکوع نہ کرو یہاں تک کہ وہ رکوع کرے اور تم سجدہ نہ کرو، یہاں تک کہ وہ سجدہ کرے"۔(احمد، ابو داؤد)

حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات سے نہیں ڈرتا کہ جب وہ امام سے پہلے سر اٹھائے تو اللہ تعالیٰ اس کا چہرہ گدھے کا بنا دے یا اس کی شکل گدھے کی بنا دے"۔(بخاری، مسلم، ابو داؤد، احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اے لوگو! میں تمہارا امام ہوں، لہذا تم مجھ سے پہلے نہ رکوع کرو، نہ سجدہ کرو، نہ بیٹھو، اور نہ سلام پھیرو"۔ (احمد، مسلم)

حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ "ہم لوگ نبی ﷺ کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے جب آپ سمع اللہ لمن حمدہ فرماتے تو ہم میں سے کوئی شخص سجدہ کے لئے اپنی پیٹھ اس وقت تک نہ جھکاتا جب تک آپؐ زمین پر اپنی پیشانی مبارک نہ رکھ لیتے"۔ (بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، احمد، نسائی، ابن ماجہ)

(ج) مقتدیوں کے لئے بھی مستحب ہے کہ فرض نماز کے بعد اپنی جگہ بدل کر سنتیں اور دوسری نمازیں پڑھیں، نیز یہ کہ سلام کے بعد اس وقت تک اپنی جگہ سے نہ اٹھیں جب تک کہ امام پلٹ کر دائیں یا بائیں طرف رخ نہ کر لے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "کیا تم یہ نہیں کر سکتے کہ جب نماز پڑھ لو تو یا آگے بڑھو یا پیچھے ہٹو یا دائیں طرف ہو جاؤ یا بائیں طرف ہو جاؤ"۔(احمد، ابو داؤد، ابن ماجہ)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے انہیں نماز کی ترغیب دلائی اور اس چیز سے منع فرمایا کہ آپ کے (دائیں یا بائیں طرف) پلٹنے سے پہلے پلٹ جائیں"۔(ابو داؤد)

۱۴- مقتدی کا امام کے پیچھے قرأت کرنا

اس بارے میں سلف کے تین مسلک ہیں، پہلا مسلک یہ ہے کہ سری رکعتوں میں قرأت کی جائے اور جہری رکعتوں میں خاموش رہا جائے۔ اس مسلک کی بنیاد یہ ہے کہ نماز میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ "سورۃ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں"۔ لیکن یہ حکم صرف سری رکعتوں کے لئے ہے، جہری رکعتوں کے لئے نہیں ہے کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک جہری نماز سے سلام پھیرا تو آپ نے فرمایا "کیا ابھی تم میں سے کسی شخص نے میرے پیچھے قرأت کی ہے؟ ایک شخص نے جواب دیا "جی ہاں! میں نے قرأت کی تھی۔ اے اللہ کے رسول ﷺ فرمایا! تب ہی میں سوچ رہا تھا کہ مجھے قرآن پڑھنے میں الجھن کیوں پیش آ رہی ہے؟" جب لوگوں نے نبی ﷺ کی یہ ہدایت سنی تو وہ جہری نمازوں میں قرأت کرنے سے رک گئے"۔(۱)

---

(۱) یہ سعید بن مسیبؒ، عروہؒ، شعبیؒ، نافع بن جبیرؒ، مکحولؒ، زہریؒ اور بہت سے دوسرے تابعین کا مسلک ہے اور اسی کو امام مالکؒ، احمد بن حنبلؒ، اسحاق اور (حنفیہ میں سے) امام محمدؒ نے اختیار کیا ہے، البتہ امام احمدؒ کے نزدیک اگر جہری نماز میں مقتدی امام سے اس قدر فاصلہ پر ہو کہ وہ امام کی قرأت نہ سن پاتا ہو تو اس کے لئے قرأت کرنا مستحب ہے۔

اس بارے میں دوسرا مسلک یہ ہے کہ سری اور جہری دونوں رکعتوں میں قرأت کی جائے۔ البتہ جہری رکعتوں میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھی جائے' اس مسلک کی بنیاد یہ ہے کہ نبی ﷺ کے ارشاد "سورۃ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں" کا حکم ہر شخص کے لئے ہے خواہ وہ تنہا نماز پڑھ رہا ہو یا جماعت میں شامل ہو، امام ہو یا مقتدی، نماز جہری ہو یا سری۔ نیز حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب میں بلند آواز سے قرأت کروں، تو تم میں سے کوئی شخص قرآن نہ پڑھے مگر سورہ فاتحہ" دوسری روایت میں ہے "مگر سورۃ فاتحہ کیونکہ اس کے بغیر کوئی نماز نہیں"۔ مسند امام احمد ترمذی (ابو داؤد۔ نسائی۔ دارقطنی ،بخاری فی جزء القرأۃ) یہ حسن بصری، سعید بن جبیر، میمون بن مہران، اسحاق، امام شافعی، امام بخاری اور دوسرے محدثین کا مسلک ہے۔

اس بارے میں تیسرا مسلک یہ ہے کہ سری یا جہری کسی رکعت میں کچھ نہ پڑھا جائے، نہ سورۃ فاتحہ اور نہ قرآن کا کوئی اور حصہ۔ اس مسلک کی بنیاد یہ ہے کہ قرآن کی آیت " وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا (اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے غور سے سنو اور خاموش رہو) کا حکم جس طرح نماز سے باہر کے لئے ہے، اسی طرح سری اور جہری دونوں نمازوں کے لئے بھی ہے، اس آیت میں فاستمعوا (غور سے سنو) کا لفظ جہری رکعتوں میں قرآن کے سننے کو اور وانصتوا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(ابو داؤد، ترمذی، نسائی، احمد، مالک، شافعی، ابن ماجہ، ابن حبان)

۱۴- مقتدی کا جماعت کے دوران آکر شامل ہونا اور اس کی مختلف صورتیں

(ا) اگر کوئی شخص اس وقت آئے جب کہ جماعت ہو رہی ہو تو اسے چاہئے کہ اللہ اکبر

(اور خاموش رہو) کا لفظ جہری رکعتوں کے ساتھ سری رکعتوں میں بھی خاموش رہنے کو لازم قرار دیتا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس شخص کا امام ہو تو امام کی قراءت ہی اس کی قراءت ہے"۔ (دارقطنی) نیز حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا امام اس لئے بنایا گیا ہے اس کی اتباع کی جائے، لہذا جب وہ اللہ اکبر کہے تو تم بھی اللہ اکبر کہو اور جب وہ قراءت کرے تو تم خاموش رہو"۔ (مسلم)

یہ امام ابو حنیفہؒ، سفیان ثوریؒ اور کوفہ کے دوسرے فقہاء کا مسلک ہے۔

اختلاف کی وجہ: پہلے مسلک والوں کے نزدیک آیت واذا قرء--- اور نبی ﷺ کے ارشاد "جس شخص کا امام ہو تو امام کی قراءت ہی اس کی قراءت ہے" اور آپ کے دوسرے ارشاد کہ "جب وہ قراءت کرے تو خاموش رہو" کا حکم حضرت ابو ہریرہؓ کی مذکورہ بالا حدیث کہ نبی ﷺ نے فرمایا "تب ہی میں سوچ رہا تھا کہ مجھے قرآن پڑھنے میں الجھن کیوں پیش آرہی ہے" اور یہ کہ "جب لوگوں نے نبی ﷺ کی یہ ہدایت سنی تو وہ جہری نمازوں میں قراءت کرنے سے رک گئے" کی روشنی میں صرف جہری رکعتوں کے لئے ہے سری رکعتوں کے لئے نہیں ہے۔ رہی حضرت عبادہ بن صامتؓ کی حدیث کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب میں بلند آواز سے قراءت کروں تو تم میں سے کوئی شخص قرآن نہ پڑھے مگر سورہ فاتحہ کیونکہ اس کے بغیر کوئی نماز نہیں" تو اس کا حکم حضرت ابو ہریرہؓ کی مذکورہ حدیث کی وجہ سے منسوخ ہے، نیز اس کی سند میں ایک راوی محمد بن اسحاق کمزور ہے۔

دوسرے مسلک والوں کے نزدیک قرآن کی آیت و اذا قرء القرآن--- اول تو نماز کے متعلق ہے ہی نہیں کیونکہ یہ آیت مکہ معظمہ میں اس وقت اتری تھی جب مشرکین قرآن کو سن کر شور مچایا کرتے تھے لیکن اگر اسے نماز کے متعلق بھی تسلیم کر لیا جائے تو حضرت عبادہ بن صامتؓ کی حدیث کی وجہ سے سورہ فاتحہ اس کے حکم سے مستثنیٰ ہے۔ رہی حضرت جابرؓ کی یہ حدیث کہ نبی ﷺ نے فرمایا جس شخص کا امام ہو تو امام کی قراءت ہی اس کی قراءت ہے تو یہ حدیث اگرچہ متعدد (سلسلوں سے مروی ہے لیکن اس کی تمام روایات کمزور ہیں لہذا یہ قابل حجت نہیں۔ تاہم اگر اسے صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس میں قراءت کا لفظ عام ہے جس سے حضرت عبادہ بن صامتؓ کی حدیث کی روشنی میں سورہ فاتحہ مستثنیٰ ہے کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ جنہوں نے اس حدیث کو روایت کیا ہے ان کا اپنا مسلک یہی تھا کہ وہ جہری اور سری دونوں قسم کی رکعتوں میں سورہ فاتحہ پڑھنے کو ضروری قرار دیتے تھے پھر اس حدیث میں خاموش رہنے کا مطلب یہ ہے کہ سورہ فاتحہ بلند آواز سے نہیں بلکہ آہستہ پڑھی جائے۔ رہی حضرت ابو ہریرہؓ کی دوسری حدیث (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(تکبیر تحریمہ) کہے اور جس حالت میں امام ہو، اسی میں شریک ہو جائے۔

حضرت علیؓ اور معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص نماز کو آئے اور امام نماز پڑھا رہا ہو تو اسے وہی کرنا چاہئے جو امام کر رہا ہو"۔ (ترمذی)(۱)

(ب) جمہور (جن میں ائمہ اربعہ شامل ہیں) کے نزدیک جو شخص کسی رکعت کے رکوع میں آکر شامل ہو گیا، اس نے وہ رکعت پالی، البتہ اگر وہ رکوع کے بعد (مثلاً قومہ یا سجدہ میں) آکر شامل ہوا تو وہ اسے اپنی رکعت شمار نہیں کرے گا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم نماز کی طرف آؤ اور ہم سجدہ میں ہوں تو تم بھی سجدہ میں شامل ہو جاؤ اور اسے اپنی رکعت شمار نہ کرو، و من ادرک

کہ نبی ﷺ نے فرمایا تب ہی میں سوچ رہا تھا کہ مجھے قرآن پڑھنے میں الجھن کیوں پیش آرہی ہے"۔ اور یہ کہ جب لوگوں نے نبی ﷺ کی یہ روایت سنی تو وہ جہری رکعتوں میں قرائت کرنے سے رک گئے" کے الفاظ حضرت ابو ہریرہؓ کے نہیں بلکہ امام زہریؒ کے ہیں جنہوں نے بعد میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔ (مختصراً از نیل الاوطار، تحفۃ الاحوذی ج ۱ ص ۲۵۳، الفتح الربانی ج ۳ ص ۲۰۰ وغیرہ)

تیسرے مسلک والوں کے نزدیک امام کے پیچھے سری یا جہری نمازوں میں قرائت کرنے کی کوئی حدیث صحیح یا واضح نہیں ہے اور اگر صحیح ہو بھی تو آیت واذا قرء --- اور نبی ﷺ کے ارشاد (جس شخص کا امام ہو تو اس کے امام کی قرائت ہی اس کی قرائت ہے" کی روشنی میں وہ منسوخ ہے رہا نبی ﷺ کا یہ ارشاد کہ "سورہ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں" تو اس کا حکم صرف اس شخص کے لئے ہے جو تنہا نماز پڑھ رہا ہو، نہ کہ جماعت سے۔ (مختصراً از اوجز المسالک ج ۱ ص ۲۳۸-۲۴۹-الکوکب الدری ج ۱ ص ۱۴۴-۱۵۰ وغیرہ)

(۱) حنفیہ کے نزدیک ثنا- سبحانک اللھم- بھی پڑھی جائے گی- اگر سری نماز ہے تو اسے تکبیر تحریمہ کے بعد اسی وقت پڑھ لے گا جبکہ وہ جماعت کے ساتھ ملنے لگے، اور اگر نماز جہری ہے تو وہ اسے اس وقت پڑھے گا جب وہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد بقیہ رکعتیں پڑھنے کے لئے کھڑا ہو گا لیکن اگر وہ ایسے وقت میں جماعت سے ملے (خواہ وہ سری ہو یا جہری) جبکہ امام رکوع یا سجدہ میں ہو تو وہ یہ دیکھے گا کہ آیا ثنا پڑھنے کے بعد وہ امام کو اسی حالت میں (یعنی رکوع یا سجدہ کی حالت میں) پائے گا تو وہ ثنا پڑھ کر جماعت میں شامل ہو جائے گا ورنہ ثنا پڑھے بغیر صرف اللہ اکبر کہہ کر شامل ہو جائے اور اگر امام بیٹھا ہے تب بھی ثنا نہیں پڑھے گا بلکہ صرف اللہ اکبر کہہ کر جماعت میں شامل ہو جائے گا اور بعد میں اس وقت پڑھے گا جب وہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی بقیہ رکعتیں پڑھنے کے لئے کھڑا ہو گا۔ (الفقہ ج ۲ ص ۳۹۲)

الرکعۃ فقد ادرک الصلوۃ (اور جس نے رکعت یعنی رکوع کو پالیا اس نے نماز کو پالیا، یعنی اس کی وہ رکعت شمار ہو گئی)۔ (ابو داؤد، ابن خزیمہ، حاکم)

نیز حضرت ابو بکرہؓ سے روایت ہے کہ میں مسجد میں داخل ہوا۔ دیکھا کہ نبی ﷺ نماز پڑھا رہے ہیں اور رکوع کی حالت میں ہیں۔ میں نے صف تک پہنچنے سے پہلے ہی رکوع کر لیا اور اسی طرح چل کر جماعت میں شامل ہو گیا۔ بعد میں مجھ سے نبی ﷺ نے فرمایا "اللہ خیر پر تمہاری حرص زیادہ کرے، آئندہ ایسا نہ کرنا" (بخاری) یعنی نبی ﷺ نے حضرت ابو بکرہؓ کو پہلے ہی سے رکوع کر کے جماعت میں شامل ہونے سے آئندہ کے لئے منع فرمادیا، لیکن وہ رکعت دوبارہ پڑھنے کا حکم نہ دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص رکوع میں آکر شامل ہوتا ہے اس کی وہ رکعت ہو جاتی ہے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اوپر حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں نبی ﷺ کے جو یہ الفاظ ہیں کہ من ادرک الرکعۃ فقد ادرک الصلوۃ، ان میں بھی رکعت سے مراد رکوع ہی ہے۔(۱)

(ج) جتنی رکعتیں کسی کو امام کے ساتھ مل جائیں وہ انہیں پڑھے گا اور بقیہ رکعتیں امام کے سلام پھیرنے کے بعد کھڑا ہو کر پوری کرے گا۔

---

(۱) حضرت ابو ہریرہؓ، عام محدثین اور ظاہریہ کے نزدیک کوئی شخص اپنی رکعت اس وقت تک شمار نہیں کرے گا جب تک وہ امام کو قیام کی حالت میں پاکر سورہ فاتحہ نہ پڑھ لے۔ اس مسلک کی بنیاد یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ہر شخص کے لئے فرض ہے، خواہ وہ تنہا نماز پڑھ رہا ہو یا جماعت سے، مقتدی ہو یا امام۔ رہی اوپر کی دونوں احادیث تو ان میں سے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے متعلق ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اس میں رکعت سے مراد رکعت ہی ہے نہ کہ رکوع یعنی نبی ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے جماعت کے ساتھ ایک رکعت پالی، اس نے وہ جماعت پالی۔ خود حضرت ابو ہریرہؓ کا جنہوں نے اس حدیث کو روایت کیا مسلک یہی تھا کہ وہ رکوع میں شامل ہو جانے پر رکعت شمار نہ کرتے تھے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا "اگر تم لوگوں کو رکوع میں پاؤ تو اپنی رکعت شمار نہ کرو" نیز امام ابن خزیمہؒ جنہوں نے بعد میں اس حدیث کو روایت کیا ہے ان کا مسلک بھی یہی تھی۔ حضرت ابو بکرہؓ کی روایت کے متعلق ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اس سے یہ بات واضح طور پر ثابت نہیں ہوتی کہ حضور ﷺ نے حضرت ابو بکرہؓ کی وہ رکعت شمار فرمائی تھی اور انہیں اس کے پڑھنے کا دوبارہ حکم نہ دیا تھا۔ (نیل الاوطار ج ۲، ص ۱۸۴)، اہلحدیث علماء اور امام محمد بن اسماعیل الامیر (صاحب سبل السلام) کا مسلک بھی جمہور ہی کے مطابق ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم اقامت سنو، تو نماز کی طرف سکون و اطمینان کے ساتھ جاؤ اور جلدی نہ کرو۔ جتنی نماز تمہیں مل جائے اسے پڑھ لو وَمَا فَاتَكُمْ فَاَتِمُّوا (اور جو تم سے رہ جائے اسے بعد میں پوری کرو) مسلم احمد اور نسائی کی بعض دوسری روایات میں حضور ﷺ کے الفاظ یوں ہیں وَمَا فَاتَكُمْ فَاقْضُوا (اور جو تم سے رہ جائے اس کی بعد میں قضا کرو)۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ غزوہ تبوک کے موقع پر میں نبی ﷺ کے ساتھ پیچھے رہ گیا۔ حضور ﷺ رفع حاجت کے لئے تشریف لے گئے، وہیں آپ ﷺ نے وضو فرمایا۔ پھر جب لوگوں کی طرف آئے تو دیکھا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نماز پڑھا رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے لوگوں کے ساتھ آخری رکعت پڑھی۔ جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے سلام پھیرا، قام رسول الله صلى الله عليه وسلم يتم صلاته (تو نبی ﷺ اپنی نماز پوری کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے) جب نماز پوری کر چکے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا "تم نے بہت اچھا کیا کہ وقت پر نماز پڑھ لی"۔ (بخاری، مسلم، احمد)

اس معنی میں اور بھی بہت سی روایات ہیں لیکن ان سے یہ چیز واضح نہیں ہوتی کہ جو شخص بعد میں آکر جماعت سے ملتا ہے اس کی شروع کی نماز آیا وہ ہو گی جسے وہ امام کے ساتھ پڑھے گا یا وہ جسے وہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد کھڑا ہو کر خود پڑھے گا؟ اس بارے میں جمہور سلف کا مسلک یہ ہے کہ اس کی شروع کی نماز وہی ہو گی جسے وہ امام کے ساتھ پڑھے گا اور بعد کی، وہ جسے وہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد کھڑا ہو کر خود پڑھے گا لیکن وہ آخری رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے ساتھ کوئی دوسری سورت یا قرآن کا کوئی حصہ بھی پڑھے گا۔ امام بیہقیؒ نے حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے "جو نماز تمہیں امام کے ساتھ ملی وہ تمہاری شروع کی نماز ہے لیکن قرآن کا جو حصہ تم سے رہ گیا ہے اسے پورا کرو" اور اسی پر جمہور کے مسلک کی بنیاد ہے یعنی اگر کوئی شخص ظہر، عصر یا عشاء کی تیسری رکعت میں آکر شامل ہوتا ہے تو اگرچہ اس کی پہلی اور دوسری رکعتیں وہ ہوں گی جنہیں وہ امام کے ساتھ پڑھے گا اور تیسری اور چوتھی وہ جو وہ امام کے بعد اٹھ کر پڑھے گا۔ اس لحاظ سے اسے ان آخری دو رکعتوں میں صرف سورہ فاتحہ پڑھنی چاہئے لیکن اسے چاہئے کہ ان میں سورہ فاتحہ کے ساتھ کوئی دوسری سورت یا قرآن کا

کوئی حصہ بھی پڑھے، اسی طرح اگر وہ مغرب کی تیسری رکعت میں آکر شامل ہوتا ہے تو اسے چاہئے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی آخری دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے علاوہ کوئی دوسری سورۃ یا قرآن کا کوئی حصہ بھی پڑھے- اسی طرح اگر وہ ظہر، عصر یا عشاء کی دوسری رکعت میں آکر شامل ہوتا ہے تو اسے چاہئے کہ امام کے سلام کے بعد جو باقی رہ گئی ہے وہ ایک رکعت پڑھے، اور --- اس میں سورۂ فاتحہ کے علاوہ کوئی دوسری سورت یا قرآن کا کوئی حصہ بھی پڑھے- (۱)

---

(۱) اس مسلک کی روایت حضرت عمرؓ، علیؓ، ابو درداءؓ، عمر بن عبدالعزیزؒ، سعید بن مسیبؒ، حسن بصریؒ، سعید بن جبیرؒ سے ملتی ہے اور اسی کو امام شافعیؒ اور عام محدثین نے اختیار کیا ہے- ایک روایت میں امام مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ کا بھی یہی مسلک ہے-

اس بارے میں دوسرا مسلک حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عمرؓ، ابراہیم نخعیؒ، مجاہد، شعبیؒ، ابن سیرینؒ، اور عبید بن عمیرؒ کا ہے اور وہ یہ کہ جو شخص بعد میں آکر جماعت میں شامل ہو، اس کی شروع کی نماز وہ ہوگی جسے وہ امام کے سلام کے بعد پڑھے گا- اسی مسلک کو امام ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ نے اختیار کیا ہے- دوسری روایت میں امام مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ کا بھی یہی مسلک ہے- اس مسلک کی بنیاد مذکورہ بالا احادیث میں نبی ﷺ کا یہ ارشاد ہے وما فاتکم فاقضوا (اور جو تم سے رہ جائے، بعد میں اس کی قضا کرو) اس سے معلوم ہوا کہ بعد میں آنے والے کو جو رکعتیں جماعت سے نہیں ملتیں وہ اس سے فوت ہو جاتی ہیں اور امام کے سلام کے بعد وہ ان ہی کی قضا کرتا ہے-

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ پہلے مسلک والوں کے نزدیک فاقضوا کے معنی وہی ہیں کہ جو دوسری روایات میں فاتموا کے ہیں یعنی "جو تم سے رہ جائے بعد میں اسے پورا کرو" جیسا کہ قرآن میں ہے "فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ (اور جب نماز پوری ہو جائے یا نماز سے فراغت ہو جائے)-

اس بارے میں تیسرا مسلک جو امام مالکؒ سے منقول ہے اور جو حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کا اس وقت مسلک ہے، وہ یہ ہے کہ جو شخص بعد میں آکر جماعت سے ملتا ہے اس کی شروع کی نماز اقوال (یا قیام) کے لحاظ سے وہ ہے جسے وہ جماعت ختم ہونے کے بعد خود پڑھتا ہے اور افعال (یا بیٹھنے) کے لحاظ سے وہ جسے وہ امام کے ساتھ پڑھتا ہے- مثلاً جو شخص ظہر، عصر یا عشاء کی تیسری رکعت میں آکر شامل ہوتا ہے تو وہ دو رکعتیں جنہیں وہ امام کے ساتھ پڑھے گا، اقوال (یا قیام) کے لحاظ سے وہ اس کی تیسری اور چوتھی رکعتیں ہوں گی (جو خود امام کی ہیں) افعال (یا بیٹھنے) کے اعتبار سے بھی وہ اس کی تیسری اور چوتھی رکعتیں ہوں گی- امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہ جو دو رکعتیں پڑھے گا، اقوال (یا قیام) کے لحاظ سے وہ اس کی پہلی اور دوسری، لیکن افعال (یا بیٹھنے) کے اعتبار سے اس کی تیسری اور چوتھی ہوں گی- ان میں سے پہلی میں وہ سورہ فاتحہ سے پہلے ثناء اور اعوذباللہ (حنفیہ کے نزدیک صرف اس وقت جبکہ اس نے جماعت میں

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

(فتح الباری ج ۲' ص ۳۵۵، الفتح الربانی ج ۵ ص ۲۱۴، نیل الاوطار ج ۳ ص ۱۱۴)

۱۵- اگر امام نماز کی کوئی شرط یا رکن چھوڑ جائے

اگر امام نماز کی کوئی شرط یا رکن چھوڑ جائے اور مقتدیوں کو اس کا علم نہ ہو اور وہ اسے پورا کر لیں تو ان کی نماز ہو جائے گی، اگرچہ امام کو دوبارہ نماز پڑھنی پڑے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "لوگ تمہیں نماز پڑھاتے ہیں، اگر وہ صحیح نماز پڑھیں تو تمہارے لئے بھی ہے اور ان کے لئے بھی (یعنی دونوں کی نماز ہو جائے گی) اور اگر وہ غلطی کر جائیں تو تمہارے لئے ہے اور ان کے لئے نہیں (یعنی تمہاری نماز ہو جائے گی ان کی نہیں ہو گی۔ (بخاری، مسند امام احمد)

صحیح روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک روز لوگوں کو نماز پڑھائی حالانکہ آپ جنابت کی حالت میں تھے اور آپ کو یاد نہ تھا۔ بعد میں آپ نے دوبارہ نماز پڑھی اور لوگوں نے نہیں پڑھی"۔(۱) (نیل الاوطار ج ۳' ص ۱۴۷)

شامل ہوتے وقت تکبیر تحریمہ کے ساتھ انہیں نہ پڑھا ہو، تفصیل دیکھئے حاشیہ صفحہ ۲۶۱) اور بعد میں کوئی سورت یا قرآن کا کوئی حصہ پڑھے گا بالکل اسی طرح جس طرح وہ اپنی ظہر، عصر اور عشاء کی پہلی اور دوسری رکعت میں پڑھتا ہے لیکن ان میں سے دوسری رکعت کے آخر میں وہ تشہد کے ساتھ درود اور دعائیں پڑھ کر سلام پھیرے گا بالکل اسی طرح جس طرح وہ اپنی ظہر، عصر اور عشاء کی چوتھی رکعت میں تشہد کے ساتھ درود اور دعائیں پڑھ کر سلام پھیرتا ہے کیونکہ افعال (یا بیٹھنے) کے اعتبار سے وہ اس کی چوتھی رکعت ہو گی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص مغرب کی تیسری رکعت میں آکر جماعت سے ملتا ہے۔ امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہ جو دو رکعتیں پڑھے گا ان میں سے پہلی میں وہ اسی طرح قراءت کرے گا جس طرح اپنی ظہر، عصر یا عشاء کی پہلی رکعت میں کرتا ہے کیونکہ افعال (یا قیام) کے اعتبار
سے وہ اس کی پہلی رکعت ہے لیکن اس کے آخر میں تشہد، درود اور دعائیں پڑھ کر سلام پھیرے گا، کیونکہ افعال (یا بیٹھنے) کے لحاظ سے وہ اس کی چوتھی رکعت ہے۔ (الفتح الربانی ج ۵' ص ۲۱۴۔ الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱' ص ۳۹۲۔۳۹۶)

اس موقع پر یہ جاننا ضروری ہے کہ حنفیہ کے نزدیک جو شخص بعد میں آکر جماعت میں شامل ہوتا ہے، وہ جماعت کی آخری رکعت میں (جب کہ امام سلام پھیرنے کے لئے بیٹھے) اس قدر آہستہ رفتار سے تشہد پڑھے گا کہ امام کے سلام پھیرنے کے قریب اس سے فارغ ہو، اور اگر وہ امام کے سلام پھیرنے سے پہلے تشہد پڑھ چکا ہے تو صرف اشہد ان لا الہ الا اللہ کی تکرار کرتا رہے گا۔ (عالمگیری)

(۱) حنفیہ کے نزدیک مقتدیوں کو بعد میں علم ہو جانے پر دوبارہ نماز پڑھنی ہو گی لیکن اگر علم نہ ہو تو ضروری نہیں۔ (موطا امام محمد)

۱۶- اگر امام کو دوران نماز میں کوئی عذر پیش آجائے

اگر امام کو نماز کے دوران کوئی عذر پیش آجائے مثلاً یہ کہ اس کا وضو ٹوٹ جائے یا اسے یاد آجائے کہ اس کا وضو نہیں ہے تو اس کے لئے جائز ہے کہ مقتدیوں میں سے کسی شخص کو اپنی جگہ امام بنا دے اور خود ہٹ جائے تاکہ جماعت جاری رہے۔

حضرت عمرو بن میمونؒ سے روایت ہے کہ جس صبح حضرت عمرؓ پر حملہ ہوا ہے اس صبح میں جماعت کی اگلی صف میں شامل تھا اور میرے اور حضرت عمرؓ کے درمیان عبداللہ بن عباسؓ کے سوا کوئی شخص نہ تھا۔ انہوں نے اللہ اکبر کہا ہی تھا کہ میں نے انہیں یہ کہتے سنا "مجھے کتے نے مار ڈالا" یا وہ "مجھے کھا گیا" یعنی آپ نے اس وقت کہا جب کہ آپ پر حملہ کیا گیا۔ اسی وقت حضرت عمرؓ نے عبدالرحمن بن عوفؓ کو پکڑا اور انہیں آگے کر دیا اور انہوں نے ہلکی نماز پڑھائی۔ (بخاری)

ابو رزینؒ سے روایت ہے کہ ایک روز نماز پڑھاتے ہوئے حضرت علیؓ کا وضو ٹوٹ گیا تو آپ نے ایک آدمی کا ہاتھ پکڑا، اسے آگے کر دیا اور خود ہٹ گئے"۔ (سنن سعید بن منصور)

ایسے موقع پر یہ بھی جائز ہے کہ مقتدی اپنے طور پر الگ الگ نماز پوری کر لیں جیسا کہ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں "اگر امام اپنی جگہ دوسرے کو امام بنا دیتا ہے تو یہ بھی صحیح ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ اور علیؓ نے کیا اور اگر لوگ اپنے طور پر الگ الگ نماز پوری کر لیں تو یہ بھی صحیح ہے جیسا کہ حضرت معاویہؓ پر نماز کے دوران حملہ کیا گیا اور لوگوں نے اپنے طور پر الگ الگ نماز پوری کر لی۔(۱)"

۱۷- منفرد کا تنہا نماز پڑھتے ہوئے امام بن جانا

ایک شخص اگر تنہا نماز شروع کرے اور پھر اس کے ساتھ دوسرے لوگ آکر شامل ہو جائیں تو جماعت ہو جائے گی:

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک الگ الگ نماز پڑھنے سے نماز باطل ہو جائے گی، ضروری ہے کہ مقتدیوں میں سے کوئی شخص آگے بڑھے (خواہ امام کے بڑھانے سے یا بطور خود) اور جماعت جاری رہے، مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک دونوں صورتیں جائز ہیں لیکن مستحب یہ ہے کہ الگ الگ نماز نہ پڑھی جائے بلکہ کوئی شخص آگے بڑھ کر جماعت پوری کرائے۔ حنبلیہ کے نزدیک دونوں صورتیں جائز اور یکساں ہیں۔ (الفقہ ج ۱ ص ۷۴۴)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک رات میں اپنی خالہ میمونہؓ کے ہاں سویا۔ رات جب نبی ﷺ اٹھ کر نماز پڑھنے لگے تو میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ شامل ہو گیا"۔ (بخاری، مسلم، احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک آدمی کو تنہا نماز پڑھتے دیکھا تو فرمایا "کیا کوئی ایسا شخص ہے جو اس پر صدقہ کرے اور اس کے ساتھ نماز پڑھے"؟ (ابو داؤد، ترمذی) (۱)

۱۸- فرض نماز کا ایک مرتبہ پڑھ لینے کے بعد جماعت میں شریک ہونا!

جو شخص ایک مرتبہ تنہا یا با جماعت فرض نماز پڑھ چکا ہو وہ اگر مسجد میں آئے اور جماعت ہو رہی ہو تو اسے چاہئے کہ نفل کی نیت کر کے جماعت میں شامل ہو جائے:

حضرت یزید بن اسودؓ سے روایت ہے کہ میں حج میں نبی ﷺ کے ساتھ تھا۔ میں نے صبح کی نماز آپؐ کے ساتھ مسجد خیف میں پڑھی۔ جب آپؐ نے سلام پھیرا تو دیکھا کہ لوگوں کے پیچھے دو آدمی کھڑے ہیں جنہوں نے آپ کے ساتھ نماز نہیں پڑھی۔ آپؐ نے فرمایا "ان دونوں کو میرے پاس لاؤ"۔ جب وہ لائے گئے تو وہ خوف کے مارے کانپ رہے تھے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا "تم نے ہمارے ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھی"؟ انہوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ! ہم اپنے گھروں میں نماز پڑھ کر آئے تھے"۔ فرمایا "ایسا نہ کرو جب تم اپنے گھروں میں نماز پڑھ کر مسجد میں آؤ اور اس میں نماز ہو رہی ہو تو جماعت میں شامل ہو جاؤ۔ یہ نماز تمہارے لئے نفل ہو جائے گی"۔

(احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، دار قطنی، ابن حبان، حاکم)

حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ مجھ سے نبی ﷺ نے فرمایا "تمہارا اس وقت کیا حال ہو

---

(۱) حنابلہ کے نزدیک ہر فرض نماز میں ضروری ہے کہ امام ابتداء ہی سے جماعت کی نیت کرے۔ شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک صرف جمعہ کی نماز میں امام کی شروع سے نیت شروع ہے۔ حنفیہ کے نزدیک اگر مقتدی عورتیں ہوں تو امام کی شروع ہی سے نیت ضروری ہے۔ مردوں کی امامت کے لئے ضروری نہیں۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱' ص ۴۱۷) البتہ نفل نمازوں میں امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک امام کی جماعت کے لئے نیت شروع سے ضروری نہیں۔ (نیل الاوطار ج ۳' ص ۱۲۱۱)

گا جب کہ تم پر ایسے امراء مسلط ہو جائیں گے جو نماز کو اپنے وقت سے موخر کر کے پڑھیں گے"؟ میں نے عرض کیا" تو حضور ﷺ مجھے کیا حکم دیتے ہیں"؟ فرمایا" اپنے وقت پر نماز پڑھ لو پھر اگر ان کے ساتھ نماز پاؤ تو اسے بھی پڑھ لو اس لئے کہ وہ تمہارے لئے نفل نماز ہو گی"۔ (احمد، مسلم، نسائی) (۱)

۱۹- امام کی تکبیروں کی آواز مقتدیوں تک پہنچانا

پہلے یہ حدیث گزر چکی ہے کہ نبی ﷺ نے بیٹھ کر نماز پڑھائی- آپؐ چونکہ بیمار تھے اور آپؐ کی آواز پست تھی، اس لئے حضرت ابو بکرؓ آپؐ کی تکبیروں کے ساتھ تکبیر کہتے جاتے تھے اور لوگ ابو بکرؓ کی تکبیروں کے ساتھ تکبیر کہہ رہے تھے- (بخاری و مسلم)

۲۰- پہلی جماعت کے بعد دوسری جماعت

اگر بعض لوگ کسی عذر کی وجہ سے مسجد میں اس وقت پہنچیں جب کہ جماعت ہو چکی ہو تو ان کے لئے دوسری جماعت کرانا جائز ہے- یہ دوسری جماعت اذان کے ساتھ بھی پڑھی جا سکتی ہے، صرف اقامت کے ساتھ بھی اور بغیر اذان واقامت کے بھی-

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی اس وقت مسجد میں آیا جب کہ لوگ نماز پڑھ چکے تھے تو نبی ﷺ نے فرمایا "کون ہے جو اس شخص پر صدقہ کرے اور اس کے ساتھ نماز پڑھے؟" تو ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ نماز پڑھی"- (ابو داؤد، ترمذی)

---

(۱) اس بارے میں جو اختلاف ہے وہ تفصیلات میں ہے- شافعیہ کے نزدیک ہر نماز دہرائی جا سکتی ہے، حنابلہ کے نزدیک مغرب کا دہرانا جائز نہیں، حنفیہ کے نزدیک فجر، عصر اور مغرب کی نماز کا دہرانا جائز نہیں- مالکیہ کے نزدیک مغرب کی نماز کا اور وتروں کے بعد عشاء کی نماز کا دوہرانا جائز نہیں- (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۴۳۶) (مسند امام ابو حنیفہ)

امام مالکؒ، امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک دوبارہ نماز صرف اسی صورت میں پڑھی جا سکتی ہے جبکہ انسان نے پہلی نماز تنہا پڑھی ہو- اگر اس نے جماعت سے نماز پڑھی ہو تو وہ دوبارہ کسی جماعت میں شریک نہیں ہو سکتا--- ان کا استدلال نبی ﷺ کی اس حدیث سے ہے کہ کوئی نماز ایک دن میں دو مرتبہ نہیں پڑھی جائے گی لیکن امام احمد فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک فرض نماز دوبارہ فرض کی نیت سے نہ پڑھی جائے"- (نیل الاوطار ج ۳ ص ۷۸ - ۱۲۹)

حضرت انسؓ ایک مسجد میں داخل ہوئے، جہاں نماز ہو چکی تھی۔ آپ نے اذان اور اقامت کہی اور جماعت سے نماز پڑھی"۔(بخاری) (۱)

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک راستوں کی مسجدوں میں دوبارہ جماعت مکروہ نہیں ہے اور ان سے مراد وہ مسجدیں ہیں جن کا نہ کوئی امام ہو اور نہ ان کے نمازی متعین ہوں۔ محلوں کی مسجدوں میں جن کے امام اور نمازی متعین ہوں ان میں بھی دوسری جماعت مکروہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ پہلی جماعت کی شکل میں نہ پڑھی جائے۔ اگر پہلی جماعت محراب میں ہوئی ہے اور دوسری اس کے بعد اس سے دور تو وہ مکروہ نہیں لیکن اگر وہ پہلی جماعت ہی کی شکل میں ہو تو مکروہ تحریمی ہے۔ اسی طرح محلّہ کی مسجد میں بغیر اذان اور بغیر اقامت کے دوسری جماعت ہونے میں کوئی کراہت نہیں ہے۔ شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک جس مسجد کا امام مقرر ہو، اس میں دوسری جماعت اس کی اجازت ہی سے ہو سکتی ہے ورنہ مکروہ ہے۔

مالکیہ کے نزدیک دوسری جماعت ہر مسجد میں مکروہ ہے۔(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۹۰)

تطوّع

(سنت اور نفل نمازیں)

فرائض کی ادائیگی میں جو نقص یا کسر رہ جاتی ہے اس کی تلافی کے لئے یہ دوسری نمازیں رکھی گئیں ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "لوگوں کے اعمال میں سے جس چیز کا سب سے پہلے حساب کتاب ہو گا وہ نماز ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے خود جاننے کے باوجود دریافت کرے گا' میرے بندے کی نماز کو دیکھو، آیا اس نے اسے پورا کیا ہے یا اس میں کوئی کمی ہے"؟ اگر وہ پوری ہوئی تو اسے مکمل لکھا جائے گا اور اگر اس میں کچھ کمی ہوئی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا "دیکھو کیا اس بندے کی کوئی زائد از فرض نماز ہے"؟ اگر ہوئی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا "میرے بندے کی فرض نماز کو اس زائد سے پوری کر دو"۔ پھر اس طرح تمام اعمال کا جائزہ لیا جائے گا"۔ (ابو داؤد)

حضرت ربیعہ بن مالک اسلمیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مجھ سے فرمایا "مانگو"۔ میں نے عرض کی "اے اللہ کے رسول ﷺ! میں جنت میں آپ کی رفاقت چاہتا ہوں"۔ فرمایا "کچھ اور بھی"؟ میں نے عرض کی "بس یہی میری درخواست ہے"۔ فرمایا "تو تم سجدوں کی کثرت کے ذریعے اپنے نفس کے مقابلہ میں میری مدد کرو"۔ (مسلم)

سنت اور نفل نمازوں کے احکام

۱۔ ان کا گھر پر پڑھنا مستحب ہے

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں نماز پڑھے تو اسے چاہیئے کہ اپنی نماز کا کچھ حصہ اپنے گھر کے لئے رکھ لے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس کی نماز کے ذریعے اس کے گھر میں خیر و برکت کرنے والا ہے"۔ (احمد، مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اپنی نمازوں کا کچھ حصہ اپنے گھروں میں ادا کرو، انہیں قبریں نہ بناؤ"۔ (مسند امام احمد)

حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "آدمی کی گھر میں نماز میری اس مسجد میں نماز سے افضل ہے، مگر فرض نماز"(۱)۔ (ابو داؤد)

۲۔ ان میں سجدوں کی کثرت کی بجائے قیام کا لمبا کرنا افضل ہے

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ رات کے قیام میں نبی ﷺ اس قدر لمبی نماز پڑھتے کہ پاؤں ورم آلود ہو جاتے، صحابہؓ آپ سے عرض کرتے تو آپ فرماتے "کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ ہوں؟"۔ (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

حضرت عبداللہ بن حبشی خثعمیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ سب سے بہتر عمل کون سا ہے؟ فرمایا "نماز میں قیام کا لمبا کرنا"۔ (ابو داؤد)

۳۔ ان کا بلا عذر بھی بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اگر طاقت ہو تو فرض نماز کھڑے ہو کر پڑھنا فرض ہے لیکن فرض کے علاوہ دوسری نمازوں کا طاقت کے باوجود بیٹھ کر پڑھنا بھی جائز ہے۔ (۲) اگرچہ بیٹھ کر نماز پڑھنے کا ثواب کھڑے ہو کر پڑھنے سے آدھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں "مجھ سے یہ حدیث بیان کی گئی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "بیٹھ کر نماز پڑھنے کا ثواب آدھی نماز کے برابر ہے"۔ (بخاری)

سنت اور نفل نماز کا کچھ حصہ کھڑے ہو کر اور کچھ بیٹھ کر پڑھنا بھی جائز ہے بلکہ ایک ہی رکعت کو کچھ دیر کھڑے ہو کر اور کچھ دیر بیٹھ کر پڑھنا بھی جائز ہے خواہ پہلے بیٹھ لیا جائے یا بعد میں۔

علقمہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ سے دریافت کیا "نبی ﷺ جب دو

---

(۱) امام مالکؒ اور امام ثوریؒ کے نزدیک رات کے نوافل کا گھر میں اور دن کے نوافل کا مسجد میں پڑھنا افضل ہے۔ (نیل الاوطار، ج ۳، ص ۱۳)

(۲) حنفیہ کے نزدیک وتروں، صبح کی سنتوں اور نذر مانی ہوئی نماز میں بھی کھڑا ہونا فرض ہے۔ (الفقہ ج ۱ ص ۲۲۷)

رکعتیں بیٹھ کر ادا فرماتے تھے تو کیا کرتے "؟ فرمایا "آپ ان میں قرآت فرماتے تھے جب رکوع کرنا چاہتے تو کھڑے ہو جاتے اور رکوع کرتے "۔ (مسلم)

حضرت عائشہ ہی بیان فرماتی ہیں "میں نے رات کی نماز میں نبی ﷺ کو کبھی بیٹھ کر قرآت فرماتے نہیں دیکھا یہاں تک کہ آپ پر بڑھاپا آگیا۔ اس وقت آپ بیٹھ کر قرآت فرماتے یہاں تک کہ جب چالیس یا تیس آیتیں رہ جاتیں تو آپ کھڑے ہو کر انہیں پڑھتے۔ پھر سجدہ فرماتے "۔ (احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

۴۔ تطوع کے اقسام

فرض کے علاوہ جو نمازیں ہیں ان کی دو قسمیں ہیں ایک معین اور دوسری غیر معین۔ غیر معین نماز سے مراد عام نوافل ہیں جو ان اوقات کے علاوہ ہیں جن میں کوئی نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔ [۱] ہر وقت اور ہر تعداد میں پڑھے جا سکتے ہیں۔

معین نماز سے مراد وہ تمام نمازیں ہیں جن کے اوقات اور رکعتیں نبی ﷺ سے ثابت ہیں۔ پھر ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ سنتیں جو فرض نمازوں کے ساتھ (پہلے یا بعد میں) پڑھی جاتی ہیں۔ دوسری وہ سنتیں جو دوسرے اوقات اور مواقع پر ادا کی جاتی ہیں۔

آئندہ صفحات میں ہم ان تمام قسموں کا الگ الگ ذکر کریں گے۔

---

(۱) دیکھئے باب "نمازوں کے اوقات"

سُنن راتبہ و غیر راتبہ

(مؤکدہ و غیر مؤکدہ)

جو سنتیں فرض نمازوں کے ساتھ (پہلے یا بعد میں) ادا کی جاتی ہیں وہ دو طرح کی ہیں ایک سنن راتبہ یا مؤکدہ، دوسری سنن غیر راتبہ یا غیر مؤکدہ

۱۔ سُنن راتبہ (یا سُنن مؤکدہ)

۱۔ فجر کی سنتیں:

(ا) فضیلت: فجر کی سنتوں کی تعداد دو ہے۔ ان کی فضیلت اور انہیں پابندی سے ادا کرنے کے بارے میں متعدد صحیح احادیث منقول ہیں جن میں سے ہم اختصار کے خیال سے صرف دو کا ذکر کرتے ہیں۔

حضرت عائشہؓ نبی ﷺ سے فجر کی سنتوں کے بارے میں روایت کرتی ہیں کہ آپ نے فرمایا "یہ دو رکعتیں مجھے پوری دنیا سے زیادہ محبوب ہیں"۔ (احمد، مسلم، ترمذی)

حضرت عائشہؓ ہی بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ صبح کی سنتوں سے زیادہ کسی نفل پر پابندی نہ فرماتے تھے"۔ (بخاری، مسلم، احمد)

(ب) تخفیف: متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ فجر کی سنتیں نہایت ہلکی پڑھا کرتے تھے۔(۱)

حضرت حفصہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ فجر کی نماز سے پہلے میرے گھر میں دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور انہیں بہت ہی ہلکی پڑھا کرتے تھے"۔ (احمد، بخاری، مسلم)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ صبح کی نماز سے پہلے دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور انہیں اتنی ہلکی پڑھتے تھے کہ میں شک کرنے لگتی کہ آیا آپ ﷺ نے سورہ فاتحہ بھی

---

(۱) امام ابراہیم نخعیؒ، مجاہد اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک صبح کی سنتوں میں بھی قرآت کے لمبا کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے (یعنی اگر وقت میں گنجائش ہو)۔ (الفتح الربانی ج ۴ ص ۲۲۱)

پڑھی ہے یا نہیں(۱)- (مسند امام احمدؒ)

(ج) قرآت: مستحب یہ ہے کہ فجر کی سنتوں میں وہ سورتیں اور آیتیں پڑھی جائیں جو نبی ﷺ پڑھا کرتے تھے:

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ صبح کی سنتوں میں آیت قُولُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا اور سورہ آل عمران کی آیت تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ" پڑھا کرتے تھے-(مسلم)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ فجر کی سنتوں میں آیت قولوا امنا بالله وما انزل الينا اور سورہ آل عمران کی آیت تعالوا الیٰ كلمة سواء بيننا و بينكم پڑھا کرتے تھے"-(مسلم)

یعنی سورہ فاتحہ کے بعد آنحضرت ﷺ پہلی رکعت میں یہ آیت پڑھتے تھے-

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (البقرہ : ۱۳۶)

مسلمانو! کہو ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیمؑ اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولاد یعقوبؑ کی طرف نازل ہوئی تھی اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی- ہم انؑ کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں

اور دوسری رکعت میں یہ آیت

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ؀ (آل عمران:۶۴)

کہو! "اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں- اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے- اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ تم شہادت دو ہم مسلم ہیں

---

(۱) اس حدیث کی بنیاد پر امام مالکؒ فرماتے ہیں میں تو کسی رکعت میں سورہ فاتحہ کے علاوہ کچھ نہیں پڑھتا"- (نیل الاوطار ج ۳' ص ۸)

ابن عباسؓ سے دوسری روایت ہے کہ نبی ﷺ پہلی رکعت میں قولوا آمنا باللہ پڑھا کرتے تھے اور دوسری رکعت میں یہ آیت:

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِىْٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔ (ابوداود) (آل عمران:۵۲)

اور جب عیسیٰ نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کفر وانکار پر آمادہ ہیں تو اس نے کہا "کون ہے جو اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوگا؟" حواریوں نے جواب دیا "ہم اللہ کے مددگار ہیں۔ ہم اللہ پر ایمان لائے۔ گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں۔

(د) لیٹنا: فجر کی سنتوں کے بعد دائیں پہلو پر لیٹنا مستحب ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب صبح کی سنتیں پڑھ لیتے تو اپنے دائیں پہلو پر لیٹتے۔ (بخاری، مسلم وغیرہ)

دوسری حدیث میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ صبح کی سنتیں پڑھتے اگر میں سو رہی ہوتی تو آپ لیٹ جاتے اور اگر جاگ رہی ہوتی تو مجھ سے بات چیت فرماتے (۱)"۔ (بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی، احمد، ابن ماجہ، نسائی)

---

(۱) یہ عام محدثین کا مسلک ہے۔ صحابہ میں سے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، رافع بن خدیجؓ، انسؓ اور ابو ہریرہؓ کا یہی مسلک تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ صبح کی سنتوں کے بعد (عبادت کے خیال سے) لیٹنے کو مکروہ اور بدعت فرماتے ہیں۔ تابعین میں سے اسود بن یزیدؒ، ابراہیم نخعیؒ، سعید بن مسیبؒ اور سعید بن جبیرؒ بھی اسی کے قائل تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ --- جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں صبح کی سنتوں کے بعد گھر میں لیٹنے کو پسند اور مسجدوں میں لیٹنے کو ناپسند فرماتے تھے۔

ائمہ اربعہ میں سے امام شافعیؒ کے نزدیک صبح کی سنتوں کے بعد لیٹنا مستحب ہے، امام احمدؒ فرماتے ہیں، میں خود تو ایسا نہیں کرتا لیکن اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو وہ اچھا کرتا ہے"۔ امام ابو حنیفہؒ اور مالک کے نزدیک (عبادت کے خیال سے) لیٹنا مکروہ ہے۔ (نیل الاوطار ج ۳، ص ۱۹)

مولانا انور شاہ صاحب فرماتے ہیں ہمارے (یعنی حنفیہ کے) نزدیک صبح کی سنتوں کے بعد لیٹنا جائز ہے۔ نبی ﷺ کا لیٹنا بطریق عبادت نہ تھا بلکہ بطریق عادت تھا۔ میں جس چیز کا قائل ہوں وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حضور ﷺ کی عادت کی بھی پیروی کرتا ہے وہ ثواب سے بہر حال محروم نہیں رہ سکتا۔ (العرف الشذی شرح ترمذی)

(ر) قضا: اگر صبح کی سنتیں جماعت سے پہلے پڑھنے سے رہ جائیں تو سورج نکلنے کے بعد ان کی قضا کی جائیگی۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس نے صبح کی سنتیں نہیں پڑھیں تو (فلیصلہما) اسے چاہئے کہ انہیں سورج نکلنے کے بعد پڑھے (یا پڑھ لے)(ترمذی) (۱)

۲۔ ظہر کی سنتیں

حدیث میں ظہر کی سنتوں کی تعداد چھ بھی ہے اور چار بھی: بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد چار ہے۔ دو فرض نماز سے پہلے اور دو بعد میں۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت

---

(۱) یہ حدیث سند کے اعتبار سے شاذ (ضعیف) ہے امام مالکؒ، سفیان ثوریؒ، عبداللہ بن مبارکؒ اور اسحاق رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے۔ امام شافعیؒ اور عام اہل حدیث علماء کے نزدیک اگر صبح کی سنتیں جماعت سے پہلے پڑھنے سے رہ جائیں تو انہیں جماعت کے بعد پڑھا جا سکتا ہے۔ یہی مسلک حضرت ابن عمرؓ عطاء، طاؤس اور ابن جریجؒ سے منقول ہے۔ ان کا استدلال حضرت قیس بن عمروؓ کی اس روایت سے ہے کہ میں صبح کی نماز کے لئے نکلا۔ دیکھا کہ نبی ﷺ نماز میں ہیں۔ میں نے جماعت سے نماز پڑھی اور بعد میں اٹھ کر سنتیں پڑھنے لگا۔ نبی ﷺ میرے پاس سے گزرے اور دریافت فرمایا "کون سی نماز ہے؟" (احمد، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

امام احمد بن حنبل کے نزدیک ایسے جماعت کے بعد پڑھا جا سکتا ہے لیکن اختلاف سے بچنے کے لئے بہتر یہ ہے کہ انہیں چاشت کے وقت پڑھا جائے (المغنی)

یہ روایت بھی سند کے لحاظ سے حسن ہے۔ اوپر کی حدیث کا مطلب ان حضرات کے نزدیک یہ ہے کہ اس میں نبی ﷺ نے یہ حکم دیا ہے کہ اگر صبح کی سنتیں رہ جائیں تو انہیں سورج نکلنے کے بعد پڑھا جا سکتا ہے، جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس نے صبح کی سنتیں نہیں پڑھیں۔ یہاں تک کہ سورج نکل آیا تو اسے چاہئے کہ انہیں پڑھ لے۔ (بیہقی، نیل الاوطار ج ۳ ص ۲۱)

حنفیہ کے نزدیک صبح کی سنتوں کا گھر پر اول وقت پڑھنا مسنون ہے۔ اگر کسی نے یہ سنتیں نہ پڑھی ہوں اور اسی حال میں جماعت کھڑی ہو جائے تو وہ دیکھے کہ آیا سنتیں پڑھ کر وہ جماعت کو پا سکتا ہے یا نہیں۔ اگر اسکا خیال ہو کہ وہ جماعت کو پالے گا تو اسے سنتیں نہیں پڑھنی چاہئیں بلکہ جماعت سے مل جانا چاہئے بعد میں بھی ان کی قضا نہیں ہے نہ سورج نکلنے سے پہلے اور نہ سورج نکلنے کے بعد، کیونکہ فجر کی سنتیں فرض نماز کے تابع ہیں جو اس نے پہلے ہی پڑھی جائیں گی، بعد میں سنتوں اور فرض دونوں کی ایک ساتھ قضا کی جا سکتی ہے۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۲۸۲)

ہے کہ مجھے نبی ﷺ سے: دو ظہر کے بعد، دو مغرب کے بعد اپنے گھر پر اور دو عشاء کے بعد گھر پر اور دو صبح کی نماز سے پہلے کی دو رکعتیں یاد ہیں"۔ (بخاری)

بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد چھ ہے: چار فرض نماز سے پہلے اور دو بعد میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں "نبی ﷺ چار رکعتیں (۱) ظہر سے پہلے اور دو رکعتیں ظہر کے بعد پڑھا کرتے تھے"۔ (مسلم، احمد)

حضرت ام حبیبہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے دن اور رات میں بارہ رکعتیں پڑھیں، اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنا دیا گیا۔ چار ظہر سے پہلے، دو ظہر کے بعد، دو مغرب کے بعد، دو عشاء کے بعد اور دو فجر کی نماز سے پہلے"۔ (مسلم، ترمذی)

یہ دونوں روایات سند کے لحاظ سے قوی ہیں۔ ان دونوں کے درمیان کوئی متعارض نہیں ہے۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں "بہتر یہ ہے کہ ان روایات کو اس چیز پر محمول کیا جائے کہ نبی ﷺ ظہر سے پہلے کبھی چار رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور کبھی دو، انہیں اس چیز پر محمول کیا جا سکتا ہے کہ نبی ﷺ گھر پر چار رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور مسجد میں دو حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عمرؓ نے جیسا دیکھا ویسا بیان کر دیا"۔ (۲)

حضرت ام حبیبہؓ کی ایک روایت سے ظہر سے پہلے بھی چار اور ظہر کے بعد بھی چار رکعتیں پڑھنے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ ان کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے ظہر سے پہلے چار اور ظہر کے بعد چار رکعتیں پڑھیں، اللہ تعالیٰ نے اس کے گوشت کو آگ پر حرام کر دیا"۔ (احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، نسائی)

---

(۱) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہر سے پہلے کی چار سنتیں ایک سلام کے ساتھ پڑھی جائیں گی' امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہی افضل ہے۔ امام مالکؒ، شافعی اور احمد بن حنبلؒ کے نزدیک ان کا دو دو رکعتیں کر کے پڑھنا افضل ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں "دن اور رات کی نماز دو دو رکعتیں کر کے ہے"۔ (موطاء امام مالکؒ' الفتح الربانی ج ۴' ص ۲۰۳) رات کی نماز کا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بھی دو دو رکعتیں کر کے پڑھنا افضل ہے جیسا کہ آئندہ "تہجد" کے باب میں ہم بیان کریں گے۔

(۲) حنفیہ کے نزدیک ظہر کی سنتوں کی تعداد چھ ہے: چار فرض نماز سے پہلے اور دو فرض نماز کے بعد مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک ظہر کی سنتوں کی تعداد چار ہے۔ دو فرض نماز سے پہلے اور دو فرض کے بعد۔ حنابلہ کے نزدیک ظہر کی چار سنتیں بھی ہیں اور چھ بھی، یعنی دو یا چار فرض سے پہلے اور دو فرض کے بعد۔

اگر ظہر سے پہلے کی سنتیں رہ جائیں تو انہیں فرض نماز کے بعد ادا کیا جا سکتا ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب ظہر سے پہلے چار رکعت نہ پڑھتے تو انہیں بعد میں پڑھ لیتے"۔(ترمذی)

۳۔ مغرب کی سنتیں

مغرب کے بعد دو رکعتیں سُنّتِ مؤکدہ ہیں جیسا کہ اوپر والی احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

مغرب کی سنتوں کا گھر پر پڑھنا افضل ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی اوپر والی حدیث میں ہے "مجھے نبی ﷺ سے دس رکعتیں یاد ہیں، دو ظہر سے پہلے، دو ظہر کے بعد، دو مغرب کے بعد گھر پر، دو عشاء کے بعد گھر پر اور دو صبح کی نماز سے پہلے"۔(بخاری)

حضرت محمود بن لبیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ قبیلہ بنی عبدالاشہل کے ہاں آئے اور لوگوں کو مغرب کی نماز پڑھائی جب سلام پھیرا تو فرمایا "یہ دو رکعتیں تم لوگ اپنے گھروں میں پڑھو"۔(احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

۴۔ عشاء کی سنتیں

عشاء کے بعد دو رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں جیسا کہ اوپر کی روایت میں بیان ہوا ہے۔

۲۔ سُنَنِ غیر راتبہ (غیر مؤکدہ)

مذکورہ بالا دس یا بارہ رکعتیں سنن مؤکدہ ہیں۔ان کے علاوہ بعض سنتیں ایسی ہیں جن کا پڑھنا مستحب ہے، اگرچہ ان کی تاکید نہیں ہے۔ایسی سنتیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ عصر سے پہلے دو یا چار رکعتیں

اس بارے میں بہت سی احادیث آتی ہیں جن میں اگرچہ سند کے لحاظ سے کلام کیا گیا ہے لیکن کثرتِ تعداد کی وجہ سے ان کی تائید ہوتی ہے،

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحمت کرے جس نے عصر سے پہلے چار رکعت نماز پڑھی"۔ (احمد، ابوداؤد، ترمذی)

۲- مغرب سے پہلے دو رکعتیں

حضرت عبداللہ بن مغفلؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "مغرب سے پہلے نماز پڑھو، مغرب سے پہلے نماز پڑھو، اور تیسری مرتبہ اس اندیشہ سے کہ لوگ اسے سنت ہی نہ مان لیں، آپ ﷺ نے فرمایا" یہ اس شخص کے لئے ہے جو ایسا کرنا چاہے"۔ (بخاری) (۱)

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ مغرب کے بعد بھی (دو رکعت سنت مؤکدہ کے علاوہ) نوافل پڑھا کرتے تھے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے مغرب کے بعد بیس رکعتیں نماز پڑھی، اللہ نے اس کے لئے جنت میں گھر بنا دیا" (ترمذی)

حضرت عمار بن یاسرؓ کے بیٹے محمدؒ نے انہیں (یعنی حضرت عمارؓ کو) مغرب کے بعد چھ رکعتیں نماز پڑھتے دیکھا۔ پھر انہوں نے فرمایا "میں نے اپنے محبوب رسول خدا ﷺ کو مغرب کے بعد چھ رکعتیں پڑھتے دیکھا اور پھر آپ کو یہ فرماتے سنا جس نے مغرب کے بعد چھ رکعتیں پڑھیں اللہ نے اس کے تمام گناہ معاف کر دیئے، خواہ وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں"۔ (طبرانی، ہیثمی) (۲)

حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ میں نبی ﷺ کے پاس آیا اور میں نے آپ کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد آپ عشاء تک نوافل پڑھتے رہے"۔ (نسائی)

ان روایات میں سے اگرچہ پہلی دو کی سند کمزور ہے لیکن بہر حال ان سے مغرب و عشاء کے درمیان نوافل کا پڑھنا مستحب معلوم ہوتا ہے۔ (الفتح الربانی ج ۴ ص ۲۱۵)

۳- عشاء سے پہلے دو یا چار رکعتیں

حضرت عبداللہ بن مغفلؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "ہر اذان اور اقامت

---

(۱) امام مالکؒ کے نزدیک وقت تنگ ہونے کی وجہ سے مغرب کی نماز سے پہلے نفل پڑھنا مکروہ ہیں۔ امام شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور عام محدثین کے نزدیک ان کا پڑھنا مستحب ہے۔ حنفی علماء کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ اگر ان سے تکبیر تحریمہ کے چھوٹ جانے کا اندیشہ نہ ہو، تو ان کا پڑھنا مستحب ہے۔ (الکوکب الدری ج ۱ ص ۱۰۳)

(۲) اس حدیث کے مطابق حنفیہ کے نزدیک مغرب کے بعد چھ رکعتیں سنت غیر مؤکدہ ہیں۔ (الفقہ ج ۱ ص ۲۸۲)

کے درمیان نماز ہے' ہر اذان اور اقامت کے درمیان نماز ہے۔ اور تیسری مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا "یہ اس شخص کے لئے ہے جو ایسا کرنا چاہے (۱)۔ (بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، نسائی)

جمہور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ عشاء کے بعد (دو رکعتوں سنتِ مؤکدہ کے علاوہ) نوافل کا پڑھنا مستحب ہے۔ (الفتح الربانی ج ۴ ص ۲۲۱)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کبھی عشاء کے بعد نماز پڑھ کر میرے ہاں تشریف نہیں لائے مگر آپؐ نے چار یا چھ رکعتیں (مع دو رکعتیں سنتِ مؤکدہ) ضرور پڑھیں (۲)"۔ (مسند امام احمد)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں ایک رات اپنی خالہ میمونہؓ کے گھر سویا' نبی ﷺ عشاء کی نماز پڑھ کر گھر آئے تو آپؐ نے چار رکعتیں نماز پڑھی"۔ (بخاری، احمد، ابو داؤد، نسائی)

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک عشاء سے پہلے غیر مؤکدہ سنتوں کی تعداد چار ہے۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱' ص ۲۸۳)

(۲) اس حدیث کے مطابق حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک عشاء کے بعد (دو رکعتیں سنتِ مؤکدہ کے علاوہ چار رکعتیں سنتِ غیر مؤکدہ ہیں)۔ (الفتح الربانی ایضاً)

جمعہ

۱- جمعہ کا حکم

جمعہ کی نماز ہر بالغ مسلمان مرد پر فرض ہے اور اس کی یہ فرضیت قرآن، سنت اور اجماعِ امت تینوں سے ثابت ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ (جمعہ ۹)

اے ایمان لانے والو! جب جمعہ کے روز نماز کے لئے پکار (اذان) ہو تو تم اللہ کے ذکر کی طرف لپکو اور اپنا کاروبار چھوڑ دو۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "دنیا میں ہمارے آنے کا زمانہ سب کے بعد ہے لیکن قیامت کے روز ہم سب سے آگے جانے والے (یعنی حساب کتاب میں سب پہلے فارغ ہونے والے) ہیں۔البتہ یہ اس لئے کہ (یعنی یہود و نصاریٰ کو) ہم سے پہلے کتاب ملی ہے اور ہمیں ان کے بعد ملی ہے۔اس روز (یعنی جمعہ کے روز) کی تعظیم ان پر فرض کی گئی تھی لیکن وہ اس میں اختلاف کر بیٹھے، اور اللہ نے ہمیں (اس پر اتفاق کرنے کی) توفیق عطا فرمائی۔لہذا تمام لوگ ہم سے پیچھے ہیں۔یہود کل کے دن (یعنی سنیچر) کی تعظیم کرتے ہیں اور نصاریٰ پرسوں کے دن (یعنی اتوار) کی"۔ (بخاری و مسلم)

حضرت ابو جعد ضمریؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے جمعہ کی قدر نہ کرتے ہوئے (یعنی بلا عذر) تین جمعہ (لگاتار) ترک کر دیئے، اللہ نے اس کے دل پر مہر لگا دی"۔(ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

حضرت حفصہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جمعہ کی طرف جانا ہر بالغ مسلمان مرد پر فرض ہے"۔ (نسائی)

حضرت ابو ہریرہؓ اور ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کو منبر کی سیڑھیوں

پر یہ فرماتے سنا ہے "بعض لوگوں کو جمعہ کی نماز ترک کرنے سے باز آجانا چاہئے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگادے گا اور پھر وہ ضرور غافلین میں سے ہو جائیں گے"۔ (مسلم، احمد، نسائی)

امت میں کسی کے نزدیک جمعہ کی فرضیت میں اختلاف نہیں ہے۔

۲۔ جمعہ کن پر فرض نہیں ہے

(۱-۲) عورت اور بچہ: اس پر سب کا اتفاق ہے۔ حدیث آگے آرہی ہے۔

(۳-۴) بیمار: حضرت طارق بن شہابؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جمعہ ہر مسلمان پر باجماعت فرض ہے مگر چار شخصوں پر فرض نہیں ہے۔ غلام، عورت، بچہ، اور بیمار"۔ (ابوداؤد) (۱)

(۵) جو شخص (دشمن کے یا مال وغیرہ کے ضائع ہو جانے کے یا سفر میں ساتھیوں کے چھوٹ جانے کے) خوف، بارش، کیچڑ، سخت سردی یا گرمی وغیرہ کی وجہ سے مسجد نہ آسکتا ہو:

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے جمعہ کی اذان سنی اور پھر بھی وہ مسجد میں نہیں آیا، اس کی کوئی نماز نہیں، الا یہ کہ اسے عذر ہو"۔ صحابہ نے دریافت کیا "اے اللہ کے رسول ﷺ! عذر کیا ہے"؟ فرمایا "مرض یا خوف"۔ (ابوداؤد)

حضرت ابن عباسؓ نے ایک دن جب کہ بارش ہو رہی تھی، موذن کو حکم دیا کہ "جب تم اذان میں اشھدان محمد رسول اللہ کہہ لو تو حی علی الصلوٰۃ نہ کہو بلکہ اس کے بجائے صلوا فی بیوتکم (اپنے گھروں میں نماز پڑھ لو) کہو" یہ چیز لوگوں کو عجیب معلوم ہوئی، تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا "ایسا ہی اس ذاتِ مقدس نے فرمایا ہے جو مجھ سے بہتر تھی (یعنی نبی ﷺ) جمعہ فرض ہے اور مجھے یہ بات پسند نہ آئی کہ تمہیں گھروں سے بلاؤں اور تم کیچڑ اور پھلنے کی جگھوں سے گزر کر مسجد پہنچو"۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)۔

(۶) مسافر: نبی ﷺ جمعہ کے روز اگر سفر میں ہوتے تو جمعہ نہ پڑھتے بلکہ اس کے بجائے ظہر پڑھتے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر جمعہ کے دن آپؐ عرفات میں تھے۔ اس روز آپ نے جمعہ نہ پڑھا بلکہ ظہر و عصر کی نمازیں جمع تقدیم (ظہر کے وقت دونوں کو جمع کر کے)

---

(۱) ائمہ اربعہ کے نزدیک اگر بیمار پیدل مسجد نہ آسکتا ہو لیکن سوار ہو کر آنا اس کے لئے ممکن ہو اس کے لئے آنا ضروری ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۲۲۳)

پڑھیں اور یہی عمل خلفائے راشدین کا بھی تھا(۱)۔" (المغنی)

ان تمام لوگوں پر جمعہ فرض نہیں ہے۔ان پر ظہر کی نماز فرض ہے لیکن اگر وہ مسجد آکر جمعہ کی نماز میں شریک ہوں تو ان کے لئے ایسا کرنا صحیح ہے۔اس صورت میں ظہر کی نماز ان سے ساقط ہو جاتی ہے چنانچہ متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں عورتیں مسجد میں آکر جمعہ کی نماز میں شریک ہوا کرتی تھیں۔(۲)

۳- جمعہ کا وقت

جمہور صحابہ، تابعین اور ائمہ کے نزدیک جمعہ کا وقت وہی ہے جو ظہر کی نماز کا ہے یعنی زوالِ آفتاب سے لے کر اس وقت تک جب کہ ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو جائے: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جمعہ اس وقت پڑھا کرتے تھے جب کہ سورج کو زوال ہو جاتا"۔ (احمد، بخاری، ابو داؤد، ترمذی، بیہقی)

امام بخاریؒ فرماتے ہیں "جمعہ کا وقت زوال آفتاب کے بعد ہے۔ حضرت عمرؓ، علیؓ، نعمان بن بشیرؓ اور عمروؓ بن حریثؓ سے اسی کی روایتیں ہیں"۔

حضرت سلمہ بن اکوعؓ سے روایت ہے کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ جمعہ پڑھ کر جب گھروں کو واپس جاتے تھے تو دیواروں کا سایہ نہ ہوتا تھا"۔ (بخاری، مسلم، ابو داؤد)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب سردی سخت ہوتی تو نبی ﷺ جمعہ کی نماز سویرے پڑھا کرتے تھے اور جب گرمی سخت ہوتی تو جمعہ کی نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھا کرتے تھے"۔

---

(۱) مسافر کی تعریف کے لئے دیکھئے باب "مسافر کی نماز"

(۲) مذاہب اربعہ میں باقی سب کا حکم تو وہی ہے جو ہم نے اوپر نقل کیا ہے لیکن عورت کے متعلق حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اس کا گھر پر ظہر کی نماز پڑھنا مسجد جا کر جمعہ میں شریک ہونے سے بہتر ہے خواہ وہ جوان ہو یا بوڑھی۔ مالکیہ کے نزدیک اگر عورت بوڑھی ہے تو اس کا مسجد میں جانا جائز ہے اور اگر جوان ہے جسے فتنہ کا اندیشہ ہو تو اس کا مسجد میں جانا مکروہ ہے، تقریباً یہی مسلک حنبلیہ اور شافعیہ کا بھی ہے"۔ (الفقہ ج ۱ ص ۲۵۵)

غالباً ان سب کے مسلک کی بنیاد حضرت عائشہؓ کے اس فرمان پر ہے "اس زمانے میں عورتوں نے جو نئے نئے کام شروع کر دیئے ہیں اگر انہیں رسول ﷺ دیکھ لیتے تو انہیں مسجد میں جانے سے منع فرما دیتے جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کر دیا گیا تھا"۔(ترمذی)

(بخاری) (۱)

۴- جمعہ کے لئے نمازیوں کی کم سے کم تعداد

جمعہ کے لئے جماعت شرط ہے اس بارے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اوپر حضرت طارق بن شہابؓ کی روایت گزر چکی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جمعہ ہر مسلمان پر باجماعت فرض ہے"۔ (ابوداؤد)

باقی رہی نمازیوں کی وہ کم سے کم تعداد جن سے جمعہ کی جماعت ہو سکے تو کسی حدیث سے اس کی تعیین نہیں ہوتی۔ (۲)

۵- جمعہ کی جگہ

جمعہ کے لئے حدیث میں کسی مخصوص جگہ کی شرط کا کر نہیں ہے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں "نبی ﷺ کی مسجد میں جمعہ ہونے کے بعد سب سے پہلا

---

(۱) امام احمدؒ اور امام اسحاقؒ کے نزدیک جمعہ کا وقت سورج کے ایک نیزہ بلند ہونے سے شروع ہو جاتا ہے لیکن ان کے نزدیک زوال سے پہلے جمعہ کا صرف جواز ہے، وجوب کا وقت زوال کے بعد ہی ہے"۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۷۵) ان کے مسلک کی بنیاد حضرت جابرؓ کی اس روایت پر ہے کہ نبی ﷺ جمعہ کی نماز پڑھاتے تھے پھر ہم زوال کے وقت اپنے اونٹوں کے پاس جاتے اور انہیں کھولتے"۔ (احمد، مسلم، نسائی)۔ اس مضمون کی بعض دوسری روایتیں بھی ہیں جن کا مطلب جمہور کے نزدیک یہ ہے کہ نبی ﷺ جمعہ کی نماز بہت سویرے (لیکن زوال کے بعد) پڑھا کرتے تھے۔ (نیل الاوطار ج ۳)

(۲) حافظ ابن حجرؒ نے اس بارے میں سلف کے پندرہ مختلف اقوال نقل کئے ہیں۔ حنفیہ کے نزدیک یہ تعداد امام کے علاوہ تین مقیم مرد (یعنی جو مسافر نہ ہوں) ہے، مالکیہ کے نزدیک امام کے علاوہ بارہ ص ۲۱۷-۲۶۶) ہے۔ شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک چالیس مرد ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۸۸)۔

اس بارے میں امام نخعیؒ اور ظاہریہ کا مسلک یہ ہے کہ جس طرح ہر جماعت امام کے علاوہ ایک مقتدی کے ہونے سے ہو جاتی ہے اسی طرح جمعہ کی جماعت بھی ایک امام اور ایک مقتدی سے ہو جاتی ہے کیونکہ جہاں تک جمعہ کے فرض ہونے کا تعلق ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ لیکن کسی حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جمعہ کی جماعت عام نمازوں کی جماعت سے مختلف ہے۔

علامہ شوکانی لکھتے ہیں "میرے نزدیک سب سے راجح مسلک یہی ہے)"۔ (نیل الاوطار ج ۳، ص ۱۹۷)

جمعہ جو اسلام میں ہوا وہ جمعہ تھا جو بحرین کے ایک گاؤں "جواثی" میں ہوا"۔ (بخاری، ابو داؤد)

حضرت ابن عمرؓ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان چھوٹی چھوٹی بستیوں میں لوگوں کو جمعہ پڑھتے دیکھتے تھے اور انؓ پر کوئی اعتراض نہ کرتے تھے"۔(۱) (عبدالرزاق)

۶۔ جمعہ کی دو اذانیں اور ان کا وقت

نبی ﷺ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ تک جمعہ کی ایک ہی اذان ہوتی تھی اور وہ اس وقت جب امام خطبہ دینے کے لئے منبر پر آکر بیٹھ جاتا حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب مدینہ منورہ کی آبادی بڑھ گئی تو انہوں نے ایک اور اذان کو رواج دیا۔ اس کے بعد آج تک سب کا عمل اسی کے مطابق ہے۔

حضرت سائب بن یزیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں پہلی اذان (۲) اس وقت ہوا کرتی تھی جب کہ امام آکر منبر پر بیٹھ جاتا ہے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں جب لوگ زیادہ ہو گئے تو انہوں نے تیسری اذان (۳) کا اضافہ کیا، جو زوراء (مسجد کے دروازے کے قریب بازار میں ایک بلند جگہ) پر کہی جاتی تھی (۴)"۔ (بخاری، ابو داؤد، نسائی)

---

(۱) مالکیہ کے نزدیک جمعہ کے لئے مسجد کا ہونا شرط ہے۔ میدان یا کسی گھر میں جمعہ نہیں ہو سکتا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک گاؤں میں جمعہ نہیں ہو سکتا، صرف شہر میں ہو سکتا ہے، جیسا کہ حضرت علیؓ نے فرمایا "جمعہ، تشریق اور عیدین کی نماز کسی مصر جامع یا شہر ہی میں ہو سکتی ہے"۔ (قریہ (گاؤں) اور مصر (شہر) کے درمیان فرق یہ ہے کہ کہ شہر وہ ہے جس کی سب سے بڑی مسجد میں وہ تمام لوگ نہ آسکتے ہوں جن پر جمعہ کی نماز فرض ہے، خواہ عملاً اس میں نہ ہی آئیں۔ گاؤں کے لوگوں پر ان کے نزدیک جمعہ فرض نہیں ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۷۹)۔ حنبلیہ اور شافعیہ کے نزدیک ۴۰ ایسے آدمیوں کی بستی ہونا شرط ہے جن پر جمعہ فرض ہو۔ (المغنی ج ۲ ص ۱۷۳)

(۲) اس سے مراد ہمارے زمانہ کی دوسری اذان ہے یہاں اسے پہلی اذان اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ اس زمانے میں اقامت کو دوسری اذان کہا جاتا تھا۔

(۳) اس سے مراد ہمارے زمانہ کی پہلی اذان ہے یہاں اسے تیسری اذان اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ اس زمانہ میں ہمارے وقت کی دوسری اذان کو پہلی اذان اور اقامت کو دوسری اذان کیا گیا ہے۔

(۴) حنفیہ کے نزدیک پہلی اذان کے بعد کاروبار حرام ہو جاتا ہے اور اس وقت مسجد میں جانا واجب ہے، دوسروں کے نزدیک یہ چیزیں دوسری اذان سے متعلق ہیں۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

۷- خطبۂ جمعہ کے احکام

خطبۂ جمعہ کے دو حصے ہیں، جنہیں پہلا خطبہ اور دوسرا خطبہ بھی کہا جاتا ہے- جمہور سلف (جن میں امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ اور احمدؒ شامل ہیں) کے نزدیک ان میں سے پہلا خطبہ واجب ہے اور دوسرا سنت، کیونکہ نبی ﷺ سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ نے کوئی جمعہ خطبہ کے بغیر پڑھا ہو- (نیل الاوطار، الفقہ علی المذاہب الاربعہ) [۱]

ذیل میں ہم خطبۂ جمعہ کے متعلق چند ضروری مسائل بیان کرتے ہیں:

۱- نبی ﷺ کا خطبہ جمعہ (۱) اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا (۲) اپنی رسالت کی شہادت (۳) لوگوں کو وعظ و نصیحت (۴) قرآن پاک کی بعض سورتوں یا آیتوں کی تلاوت اور (۵) مسلمانوں کے لئے دعا پر مشتمل ہوتا تھا [۲] حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "ہر وہ کلام جو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء سے شروع نہیں ہوتا، وہ ناقص ہے"- (ابو داؤد، احمد)

دوسری روایت میں ہے "وہ خطبہ جس میں شہادت (یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید اور نبی ﷺ کی رسالت کی شہادت) نہیں وہ کٹے ہوئے ہاتھ کی مانند ہے"- (ابو داؤد، احمد، ترمذی)

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ (جمعہ کے روز خطبہ میں) جب تشہد فرماتے، تو ارشاد ہوتا:-

---

(۱) امام شافعیؒ کے نزدیک دونوں خطبے واجب ہیں- امام حسن بصریؒ، داؤد ظاہریؒ اور جوینیؒ کے نزدیک جمعہ کے دونوں خطبے سنت ہیں- ان کا استدلال یہ ہے کہ کسی چیز پر نبی ﷺ کے ہیشگی کرنے سے یہ بہر حال ثابت نہیں ہوتا کہ وہ لازمی ہے- لہٰذا جمعہ میں اصل فرض صرف نماز ہے جس کا اللہ اور رسول ﷺ کی طرف سے بصراحت حکم دیا گیا ہے-

اہل حدیث کا مسلک بھی یہی ہے- امام شوکانی لکھتے ہیں "بظاہر یہ مسلک صحیح تر معلوم ہوتا ہے- (الفتح الربانی ج: ص ۹۵، نیل الاوطار ج ۳' ص ۲۲۵)

(۲) حنابلہ کے نزدیک پہلی چار چیزیں خطبہ کے ارکان ہیں، یعنی اگر ان میں سے ایک بھی رہ جائے تو خطبہ نہیں ہوتا- شافعیہ کے نزدیک یہ سب چیزیں خطبہ کے ارکان ہیں، حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک خطبہ کا رکن صرف ایک ہے- حنفیہ کے نزدیک یہ رکن اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ- صرف الحمد للہ، لا الہ الا اللہ یا سبحان اللہ کہہ دینے سے بھی خطبہ کا وجوب پورا ہو جاتا ہے لیکن اسی پر اکتفا کرنا مکروہ ہے- باقی چیزیں سنت ہیں- مالکیہ کے نزدیک خطبہ کا رکن لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا ہے باقی چیزیں سنت ہیں- (الفقہ ---ج ۱ص ۳۳۷)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهٗ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ رَشَدَ، وَ مَنْ يَّعْصِهِمَا فَاِنَّهٗ لَا يَضُرُّ اِلَّا نَفْسَهٗ وَلَا يَضُرُّ اللّٰهَ شَيْئًا۔ (ابوداؤد)

حمد و ثنا اللہ ہی کے لئے ہے ہم اسی سے مدد طلب کرتے ہیں اور بخشش چاہتے ہیں۔ اپنے نفسوں کی برائیوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں' اور جسے وہ گمراہ کر دے اسے ہدایت دینے والا کوئی نہیں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں جنہیں اس نے قیامت سے پہلے خوشخبری دینے والے بنا کر مبعوث کیا۔ جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی۔ اس نے ہدایت پائی، اور جس نے ان کی نافرمانی کہ وہ اپنے آپ ہی کو نقصان پہنچاتا ہے اور وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے اور دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھتے تھے۔ آپ قرآن کی آیتیں تلاوت فرماتے اور لوگوں کو نصیحت فرماتے"۔ (مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

حضرت ام ہشام بنت حارثہ بن نعمانؓ سے روایت ہے کہ میں نے سورہ ق نبی ﷺ کی زبان مبارک ہی سے یاد کی ہے۔ آپ ہر جمعہ کے روز جب خطبہ دیتے تو منبر پر اس سورت کی تلاوت فرماتے"۔ (احمد، مسلم، ابوداؤد، نسائی)

حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو جمعہ کے روز جب کہ آپ منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں کو وعظ فرما رہے تھے، سورہ تبرك الذی کی تلاوت فرماتے سنا"۔ (ابن ماجہ)

۲ : جمعہ کا خطبہ منبر پر یا کسی بلند جگہ پر کھڑے ہو کر دینا اور درمیان میں کچھ دیر کے لئے بیٹھنا سنت ہے۔ اس طرح گویا کہ خطبہ کے دو حصے ہو جاتے ہیں جن میں سے پہلے کو پہلا خطبہ اور دوسرے کو دوسرا خطبہ بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ جمعہ کے روز نبی ﷺ کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے

تھے۔ پھر آپ بیٹھتے، پھر کھڑے ہوتے، جیسا کہ آج کل لوگ کرتے ہیں۔(بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، احمد)

نبی ﷺ سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ نے کبھی بیٹھ کر خطبہ دیا ہو، یہی طریقہ تمام صحابہ کرامؓ کا بھی تھا۔ سب سے پہلے جس نے جمعہ کا خطبہ بیٹھ کر دیا وہ حضرت معاویہؓ تھے جب کہ ان کا جسم بہت بھاری ہو گیا تھا۔(۱)

۳- خطبہ کا مختصر اور جامع ہونا مستحب ہے:

حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کی نماز درمیانی اور آپ کا خطبہ درمیانہ ہوتا تھا"۔(مسلم، احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

حضرت عمار بن یاسرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "آدمی کی نماز کا لمبا اور خطبہ کا مختصر ہونا اس کے دین کو سمجھنے کی علامت ہے، لہٰذا تم نماز لمبی پڑھو اور خطبہ مختصر دو"۔ (مسلم، احمد)

۴- جمعہ کے خطبہ کے لئے خاص اہتمام کرنا اور اس میں بلند، موثر اور دل نشین زبان استعمال کرنا مستحب ہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب خطبہ دیتے تو آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں اور آپ کی آواز بلند ہو جاتی اور آپ کا غضب سخت ہو جاتا گویا کہ آپ لوگوں کو ایک ایسے لشکر سے باخبر کر رہے ہیں جو ابھی شام کے وقت یا صبح کے وقت ان کے سروں پر پہنچنے والا ہے"۔(مسلم، ابن ماجہ)

---

(۱) شافعیہ کے نزدیک خطبہ کا کھڑے ہو کر دینا شرط ہے یعنی ایسا کرنا ضروری ہے البتہ عذر کی بناء پر بیٹھ کر بھی خطبہ دیا جا سکتا ہے۔ حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک کھڑے ہو کر خطبہ دینا سنت ہے اسی طرح دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھنا شافعیہ اور دوسروں کے نزدیک سنت ہے۔ شافعیہ کے نزدیک بیٹھنے کی یہ مدت اتنی ہے جس میں ایک سانس لیا جا سکتا ہے۔ حنابلہ اور مالکیہ کے نزدیک سورہ قل ھو اللہ کے برابر اور حنفیہ کے نزدیک اتنی جس میں قرآن کی تین آیتیں پڑھی جا سکتی ہوں۔ مذاہب اربعہ میں دوسرے خطبہ کا پہلے خطبہ کی نسبت مختصر ہونا مسنون ہے۔ حنفیہ کے نزدیک یہ مسنون ہے کہ پہلا خطبہ شروع کرنے سے پہلے امام اپنے دل میں اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھے پھر بلند آواز سے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، شہادت اور نبی ﷺ پر درود بھیجے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کرے۔ پھر دوسرا خطبہ بھی اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سے شروع کرے۔ نبی ﷺ پر درود بھیجے اور مسلمانوں کے لئے دعا کرے۔(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۳۴۴)

۵- کسی ضرورت کی وجہ سے خطبہ کا منقطع کرنا اور ضرورت پوری ہونے کے بعد اسے جاری رکھنا جائز ہے۔

حضرت ابو بریدہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ہمیں خطبہ دے رہے تھے کہ حسنؓ اور حسینؓ آگئے۔ اس وقت انہوں نے سرخ قمیض پہن رکھی تھیں اور وہ اچھلتے کودتے چلے آرہے تھے۔ انہیں دیکھ کر نبی ﷺ منبر سے نیچے تشریف لے آئے اور انہیں اٹھا کر اپنے سامنے بٹھا لیا۔ پھر آپ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا "اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَ اَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ" (بیشک تمہارے مال اور اولاد تمہارے لئے آزمائش ہیں) میں نے ان دونوں کو اچھلتے کودتے چلے آتے دیکھا تو مجھ سے صبر نہ ہو سکا اور میں نے اپنا خطبہ بند کر کے انہیں اٹھالیا"۔ (احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

حضرت ابو رفاعہ عدویؓ سے روایت ہے کہ میں مسجد میں آیا تو دیکھا کہ نبی ﷺ خطبہ دے رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ! ایک بے وطن آدمی ہے جسے اپنے دین کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہے اور وہ معلوم کرنا چاہتا ہے"۔ آپ ﷺ میری طرف متوجہ ہوئے اور خطبہ چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ میرے پاس پہنچے اور ایک لکڑی کی کرسی منگوائی جس کی ٹانگیں لوہے کی تھیں۔ آپ اس پر بیٹھ گئے اور مجھے دین کی باتیں بتانے لگے پھر آپ منبر پر آئے اور اپنا خطبہ پورا کیا(۱)"۔ (مسلم، نسائی)

۶- جب خطبہ ہو رہا ہو تو ہر قسم کی بات چیت کرنا ممنوع ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جمعہ کے روز جب امام خطبہ دے رہا ہو اس وقت جو آدمی بات چیت کرتا ہے وہ اس گدھے کی مانند ہے جس کی پیٹھ پر کتابیں لدی ہوں اور جو شخص دوسرے آدمی سے یہ کہتا ہے کہ چپ ہو جاؤ، اس کا جمعہ نہیں ہے"۔ (احمد، ابن ابی شیبہ، بزار، طبرانی)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جمعہ میں تین قسم کے آدمی آتے ہیں ایک وہ جو آکر فضول باتیں کرتا ہے تو اس کے حصے میں یہی باتیں ہیں۔ دوسرا وہ جو آکر اللہ سے دعا کرتا ہے۔ اگر اللہ چاہے گا تو اس کی دعا قبول فرمائے گا اور اگر چاہے تو قبول نہیں فرمائے گا۔ تیسرا وہ جو آکر خاموش اور پر سکون طریقہ سے بیٹھتا ہے کسی مسلمان کی

(۱) حنفیہ کے نزدیک خطبہ کے دوران امام کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سوا ہر بات کرنا مکروہ ہے لیکن اگر ہو جائے تو اس سے خطبہ فاسد نہیں ہوتا۔ (بذل المجہود، ص ۱۸۸)

گردن نہیں پھلانگتا اور نہ کسی کو تکلیف دیتا ہے تو اس کا یہ عمل اس کے آئندہ جمعہ تک اور تین دن مزید تک کے لئے گناہوں کا کفارہ ہے۔ یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا (جو شخص نیکی کرتا ہے اس کے لئے دس گنا ثواب ہے)۔
(احمد، ابو داؤد)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس وقت امام خطبہ دے رہا ہو اس وقت اگر تم نے اپنے ساتھی سے یہ کہا کہ خاموش ہو جاؤ تو تم نے فضول بات کی (۱)"۔
(بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ترمذی)

البتہ جب خطبہ نہ ہو رہا ہو اور امام منبر پر بیٹھا ہو تو بات چیت کرنا جائز ہے:
حضرت ثعلبہ بن ابی مالکؓ سے روایت ہے کہ جمعہ کے روز حضرت عمرؓ منبر پر بیٹھے ہوتے تھے اور لوگ آپس میں بات چیت کیا کرتے تھے۔ پھر جب مؤذن اذان ختم کر لیتا اور حضرت عمرؓ خطبہ کے لئے کھڑے ہو جاتے تو کوئی شخص بات نہ کرتا۔ یہاں تک کہ دونوں خطبے ہو چکتے۔ پھر جب نماز کھڑی ہوتی اور حضرت عمرؓ منبر سے اترتے تو لوگ بات چیت کرتے"۔
(مسند امام شافعی)

حضرت عثمانؓ منبر پر بیٹھنے کے بعد جب کہ مؤذن اذان دے رہا ہوتا تھا، لوگوں سے ان کا حال دریافت فرمایا کرتے تھے۔ (مسند امام احمد) (۲)

۷۔ خطبہ کے دوران لوگوں کا امام سے زیادہ سے زیادہ قریب ہونا اور اس کی طرف رخ کرنا مستحب ہے: حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا اللہ کے ذکر کی طرف آؤ، امام کے قریب ہو کر بیٹھو، اس لئے کہ انسان دور ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جنت میں بھی دیر سے داخل ہوتا ہے اگرچہ داخل ہو جاتا ہے"۔ (ابو داؤد)

---

(۱) شافعیہ کے نزدیک خطبہ کے دوران چھینک آنے پر الحمد للہ کہنا اور کسی کے سلام کا جواب دینا مکروہ نہیں ہے حنابلہ کے نزدیک چھینک آنے پر آہستہ سے الحمد للہ کہنا اور کسی کے اشارے کا زبان سے، نہ کہ ہاتھ سے جواب دینا جائز ہے مالکیہ اور حنفیہ کے نزدیک ہر قسم کی بات کرنا ناجائز ہے۔ حتیٰ کہ کسی سلام کرنے آنے والے کا جواب دینا بھی۔ البتہ نبی ﷺ پر درود (جبکہ خطیب نبی ﷺ کا نام لے) دل میں پڑھا جا سکتا ہے۔
(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۵۱)

(۲) امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ان اوقات میں بھی بات چیت کرنا ناجائز ہے لیکن امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ کے نزدیک ان اوقات میں بات چیت کرنا جائز ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۱۵۱)

یہ روایت اگرچہ منقطع ہے لیکن امام کے قریب ہو کر بیٹھنا سب کے نزدیک مستحب ہے۔

عدی بن ثابت اپنے والد کے ذریعے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ جب خطبہ کے لئے منبر پر کھڑے ہو جاتے تو صحابہؓ کرام اپنے چہرے آپؐ کی طرف کر لیتے"۔ (ترمذی)

اس حدیث میں اگرچہ سند کے لحاظ سے کلام ہے لیکن خطبہ کے دوران امام کی طرف رخ کرنا صحابہؓ کرام اور دوسرے تمام لوگوں کے نزدیک مستحب ہے"۔(ترمذی)

۸- خطبہ سننے کے دوران لوگوں کا اپنے پاؤں کھڑے کر کے ٹانگوں کا پیٹ سے ملا کر بیٹھنا مکروہ ہے:-

حضرت معاذؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اس چیز سے منع فرمایا ہے کہ جب خطبہ ہو رہا ہو تو لوگ اپنے پاؤں کھڑے کر کے اپنی ٹانگوں کو پیٹ سے ملا کر بیٹھیں"۔ (ترمذی)

سند کے لحاظ سے یہ حدیث اوسط درجہ کی ہے۔ (۱)

۹- خطبہ کے دوران آگے بڑھنے کے لئے لوگوں کی گردنوں پر سے گزرنا مکروہ ہے:-

حضرتِ معاذ بن انس جُہنیؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو شخص جمعہ کے روز لوگوں کی گردنوں سے گزرتا ہوا آگے گیا، اسے جہنم کا پل بنا دیا جائے گا"۔ (ترمذی)

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ "یہ حدیث اگرچہ سند کے لحاظ سے کمزور ہے لیکن تمام اہل علم کے نزدیک جمعہ کے روز لوگوں کی گردنوں پر سے گزرتے ہوئے آگے بڑھنا مکروہ ہے۔ (۲)

۱۰- خطبہ سننے کے دوران اگر کوئی شخص اپنی جگہ سے کسی ضرورت کی وجہ سے اٹھ جائے تو دوسرے لوگوں کو اس جگہ پر نہ بیٹھنا چاہیے، تاکہ وہ واپس آکر اپنی جگہ پر بیٹھ سکے اور

---

(۱) صحابہؓ کرام میں سے بعض کے نزدیک اس طرح بیٹھنا مکروہ تھا اور بعض کے نزدیک مکروہ نہیں تھا (ترمذی) لیکن بہر حال احتیاط اسی میں ہے کہ اس طرح بیٹھنے سے پرہیز کیا جائے، خصوصاً گرمیوں میں جب کہ اس طرح نیند آجانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ (تحفۃ الاحوذی)

(۲) مذاہب اربعہ میں اس طرح گردنیں پھلانگتے ہوئے آگے بڑھنا جائز ہے۔ البتہ حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک سخت ضرورت کے وقت جب کہ لوگوں کو بھی تکلیف نہ ہو، ایسا کرنا جائز ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۳۵۴)

نہ کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ پر بیٹھنا چاہئے:-

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص اپنی جگہ سے اٹھ جائے اور پھر واپس آئے تو وہ اس کا زیادہ حقدار ہے"۔ (مسلم، احمد)

حضرت ابن عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ جب کوئی شخص اپنی جگہ سے اٹھ جاتا تو اس کی جگہ پر نہ بیٹھا کرتے"۔ (احمد، مسلم)

۱۱- جمعہ کے روز امام کا خطبہ شروع کرنے سے پیشتر منبر پر آکر بیٹھنا اور لوگوں کو السلام علیکم کہنا مستحب ہے۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب منبر پر تشریف لاتے تو لوگوں کو السلام علیکم فرماتے"۔ (ابن ماجہ)

امام شعبیؒ فرماتے ہیں "حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ بھی ایسا کیا کرتے تھے"۔ (۱)

(نوٹ) خطبہ کے عربی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں ہو سکنے یا نہ ہو سکنے کے متعلق مذاہب اربعہ میں جو تفصیل ہے اسے ہم حاشیہ میں درج کرتے ہیں۔ (۲)

۸- نماز جمعہ کے احکام

اس بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ جمعہ کی نماز کی دو رکعتیں ہیں اور اس کی قرآت جہری

---

(۱) امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک امام کا منبر پر آکر لوگوں کو السلام علیکم کہنا مکروہ ہے، کیونکہ جب وہ مسجد میں داخل ہو کر لوگوں کو سلام کرتا ہے تو اس کا وہی سلام کافی ہے۔ (الفقہ ---ج ۱ ص ۳۹۸، نیل الاوطار ج ۳)

(۲) حنفیہ: امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عربی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں خطبہ دینا جائز ہے۔ امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ کے نزدیک خطبہ کا عربی زبان ہی میں دینا ضروری ہے۔ (فتح القدیر شرح ہدایہ ج ۱ ص ۱۱۶) (مصر کے حنفی علماء کا فتویٰ امام صاحبؒ کے مسلک پر ہے اور ہمارے ہاں کے حنفیہ علماء کا فتویٰ صاحبینؒ کے مسلک پر) حنبلیہ: اگر خطیب عربی میں خطبہ دینے کی قدرت رکھتا ہو تو عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں خطبہ جائز نہیں، لیکن اگر وہ قدرت نہیں رکھتا تو کسی دوسری زبان میں خطبہ دے سکتا ہے، خواہ سننے والے عرب ہوں یا غیر عرب، شافعیہ: اگر سننے والے عرب ہوں تو خطبہ کے ارکان کا عربی میں ہونا ضروری ہے، لیکن اگر وہ غیر عرب ہوں تو ارکان کا بھی عربی میں ہونا ضروری نہیں۔

مالکیہ: خطبہ کا عربی میں ہونا ضروری ہے خواہ سننے والے عرب ہوں یا غیر عرب، اگر کوئی بھی ایسا آدمی نہ ملے جو عربی میں خطبہ دے سکتا ہو تو لوگوں سے خطبہ ساقط ہو جائے گا۔ (الفقہ ج ۱ ص ۳۲۵)

ہے۔

ذیل میں ہم نماز جمعہ کے متعلق مختلف مسائل بیان کرتے ہیں:

(ا) نماز جمعہ کی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے بعد قرآن کا ہر حصہ پڑھا جا سکتا ہے لیکن مستحب یہ ہے کہ پہلی رکعت میں سورہ جمعہ اور دوسری میں اِذَا جَاءَکَ الْمُنَافِقُوْنَ، یا پہلی رکعت میں سورۃ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی اور دوسری میں ھَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَہ، یا پہلی رکعت میں سورہ جمعہ اور دوسری میں ھَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَہ پڑھی جائے۔

حضرتِ عبداللہ بن ابی رافعؓ سے روایت ہے کہ مروانؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو مدینہ منورہ کا حاکم مقرر کیا۔ اس اثناء میں' انہوں نے جمعہ کے روز پہلی رکعت میں سورہ جمعہ اور دوسری رکعت میں اِذَا جَاءَکَ الْمُنَافِقُوْنَ پڑھی۔ میں نے نماز کے بعد ان سے کہا کہ "آپ نے نماز میں وہی دو سورتیں پڑھی ہیں جو کوفہ میں حضرت علیؓ پڑھا کرتے تھے"۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے جواب دیا" میں نے نبی ﷺ کو جمعہ کے روز یہ دو سورتیں پڑھتے سنا ہے"۔ (مسلم، احمد، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جمعہ کے روز پہلی رکعت میں سورہ جمعہ اور دوسری رکعت میں ھَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَۃَ پڑھا کرتے تھے"۔ (مسلم، احمد، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

(ب) کتنی رکعتیں مل جانے سے جمعہ کی نماز مل جاتی ہے:۔ جمہور (جن میں امام مالکؒ، شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ شامل ہیں) کے نزدیک جو شخص جمعہ کی ایک رکعت پالے وہ تو ایک اور رکعت پڑھے گا اور اس کی نماز جمعہ کی ہی نماز ہو گی لیکن جو شخص دوسری رکعت میں رکوع کے بعد شامل ہو گا وہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد دو کی بجائے چار رکعتیں پڑھے گا اور اس کی نماز ظہر ہو گی۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا"جس شخص نے جمعہ کی دوسری رکعت کے رکوع کو پالیا اسے ایک اور رکعت پڑھ لینی چاہئے لیکن جس نے (دوسری رکعت کا) رکوع بھی نہ پایا، اسے چار رکعتیں پڑھنی چاہئیں (ا)" (دارقطنی)

(ا) حنفیہ کے نزدیک جو شخص جمعہ کی نماز کا کچھ بھی حصہ پالے اسے جمعہ کی جماعت مل جاتی ہے اگر کوئی شخص دوسری رکعت میں اس وقت آکر شامل ہوتا ہے جبکہ لوگ تشہد میں بیٹھے ہوں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(ج) جمعہ سے پہلے اور بعد میں سنتیں: ظہر کی طرح جمعہ سے پہلے سنتوں کا پڑھنا نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔لہذا جمہور ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ نماز جمعہ سے پہلے کوئی ایسی سنت نہیں ہے جس کا وقت اور مقدار متعین ہو (۱)"۔ (ابن تیمیہؒ)

جمعہ کے بعد دو رکعتیں بھی سنت ہیں اور چار رکعتیں بھی:

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جمعہ کے بعد اپنے گھر میں دو رکعتیں نماز پڑھا کرتے تھے"۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "تم میں سے جو شخص جمعہ کے بعد نماز پڑھنے والا ہو، اسے چاہئے کہ چار رکعتیں نماز پڑھے (۲)"۔ (مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہ دو ہی رکعت نماز پڑھے گا، اور اس کی نماز جمعہ ہو گی کیونکہ نبی ﷺ کی حدیث "جس شخص نے جماعت کا کچھ حصہ بھی پالیا اس نے جماعت کو پالیا"۔ (دوسری تمام نمازوں کی طرح جمعہ کے لئے بھی ہے)۔اس مسلک کو اہل حدیث علماء نے راجح قرار دیا ہے۔

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ جمہور کے نزدیک حدیث "جس شخص نے جماعت کا کچھ حصہ بھی پالیا، اس نے جماعت کو پالیا" کا حکم دوسری نمازوں کے لئے تو ہے لیکن جمعہ کے لئے نہیں ہے، اس کے برعکس حنفیہ اور اہل حدیث علماء جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں "اس حدیث کا حکم دوسری تمام نمازوں کی طرح جمعہ کے لئے بھی لیتے ہیں۔۔رہی حضرت ابوہرہؓ کی مذکورہ بالا حدیث تو وہ ان کے نزدیک معتبر نہیں ہے کیونکہ اس کی سند کمزور ہے۔ مولانا عبدالرحمن مبارکپوریؒ فرماتے ہیں "اس مذہب یعنی جمہور کے مذہب کی تائید میں کوئی واضح حدیث نہیں ہے"۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۱ ص ۳۷۲)

(۱) امام مالکؒ کا اور مشہور روایت میں امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ اہل حدیث علماء کا بھی یہی مسلک ہے۔ حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں، عید کی طرح جمعہ سے پہلے بھی کوئی سنت نماز نہیں ہے۔ علمائے سلف کا صحیح تر قول یہی ہے اور اس کا نبی ﷺ کی سنت سے بھی پتہ چلتا ہے، اس لئے کہ نبی ﷺ اپنے گھر سے باہر تشریف لا کر جب منبر پر بیٹھ جاتے تو حضرت بلالؓ اذان کہنا شروع کر دیتے جب اذان ہو چکتی تو نبی ﷺ کسی وقفہ کے بغیر خطبہ شروع فرماتے۔ یہ کھلے مشاہدہ کی بات تھی، تو اس صورت میں بھلا نماز کیسے پڑھی جا سکتی تھی؟

حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک ظہر کی طرح جمعہ کی نماز سے پہلے بھی سنتیں ہیں (حنفیہ کے نزدیک چار رکعتیں اور شافعیہ کے نزدیک دو رکعتیں بھی اور چار رکعتیں بھی) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق روایت ہے کہ وہ جمعہ سے پہلے چار رکعتیں اور بعد میں بھی چار رکعتیں نماز پڑھا کرتے تھے اور اسی مسلک کو امام سفیان ثوریؒ اور عبداللہ بن مبارکؒ نے بھی اختیار کیا۔ ان حضرات کا استدلال یہ ہے کہ جمعہ بھی دراصل ظہر ہی کی مختصر نماز ہے، لہذا اس کے وہی احکام ہیں جو ظہر کے ہیں۔ (الفتح الربانی ج ۶ ص ۸۰)

(۲) حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک جمعہ کے بعد چار ہی سنتیں ہیں۔ (الفقہ۔۔۔ج ۱ ص ۲۸۲) امام ابن تیمیہؒ اوپر کی دونوں حدیثوں کو جمع کرتے ہوئے فرماتے ہیں "۔اگر انسان مسجد میں نماز پڑھے تو چار رکعتیں پڑھے اور اگر گھر جا کر پڑھے تو دو رکعتیں پڑھے"۔

۹- جمعہ کے روز کی فضیلت اور وہ کام جو اس روز مستحب ہیں

(ا) حضرتِ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "سب سے اچھا دن جس میں سورج طلوع ہوا جمعہ کا دن ہے- اس روز آدمؑ کی پیدائش ہوئی، اسی روز وہ جنت میں داخل کئے گئے اور اسی روز اس سے نکالے گئے اور قیامت بھی جمعہ ہی کے روز آئے گی"- (مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی)

(ب) حضرتِ ابو سعیدؓ اور ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جمعہ کے روز ایک ایسی گھڑی ہے کہ جو مسلمان بندہ اس میں دعا مانگتا ہے اور اللہ سے خیر طلب کرتا ہے، اللہ تعالٰی اسے وہ خیر دے دیتا ہے اور یہ گھڑی عصر کے بعد ہے"- (مسند امام احمد)

حضرتِ جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جمعہ کے دن میں بارہ گھڑیاں ہیں جن میں سے ایک گھڑی ایسی ہے جس میں کوئی مسلمان بندہ اللہ تعالٰی سے سوال کرتا ہوا نہیں پایا جاتا، مگر اللہ تعالٰی اس کا سوال پورا کرتا ہے- تم اس گھڑی کو عصر کے بعد آخری وقت میں تلاش کرو"- (نسائی، ابو داؤد، حاکم)

حضرتِ ابو سلمہ بن عبدالرحمنؒ سے روایت ہے کہ صحابہؓ کرام میں سے چند حضرات ایک جگہ جمع ہوئے اور جمعہ کے روز قبولیت دعا کی گھڑی کا ذکر کیا- پھر وہ اس طرح ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے کہ ان میں اس چیز کا اتفاق تھا کہ یہ گھڑی جمعہ کے روز کی آخری گھڑی ہے-(۱) (سنن امام سعیدؒ)

(ج) جمعہ کے دن اور رات میں نبی ﷺ پر درود بھیجنے کی بڑی فضیلت ہے:-

حضرت اوس بن اوسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "تمہارے دنوں میں سے سب سے افضل دن جمعہ کا دن ہے، اسی میں آدمؑ کی پیدائش اور اسی میں ان کی وفات ہوئی- اسی میں قیامت آئے گی- لہذا اس روز تم مجھ پر کثرت سے درود بھیجو، اس لئے کہ تمہارا درود

---

(۱) مسلم اور ابو داؤد میں حضرت ابو موسٰیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "یہ گھڑی امام کے منبر پر بیٹھنے اور نماز کے ختم ہونے کے درمیان ہے" لیکن محدثین نے اس حدیث کو مضطرب اور منقطع قرار دیا ہے- امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں اس گھڑی کے متعلق اکثر احادیث یہی ہیں کہ یہ عصر کی نماز کے بعد ہے اور یہ زوال آفتاب کے بعد ہو سکتی ہے"- امام شوکانیؒ فرماتے ہیں "راجح یہی ہے کہ یہ گھڑی عصر کے بعد ہے- جمہور صحابہ تابعین اور ائمہ اسی طرف گئے ہیں"- (نیل الاوطار ج ۳ ص ۲۰۸)

مجھ پر پیش ہونے والا ہے"۔ صحابہؓ نے عرض کیا! اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ پر ہمارا درود کیسے پیش ہوگا، حالانکہ آپ بوسیدہ ہو چکے ہوں گے؟" فرمایا "اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کے جسموں کو کھائے"۔ (ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، احمد)

حضرتِ صفوان بن سلیمؒ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب جمعہ کا دن اور جمعہ کی رات ہو تو مجھ پر کثرت سے درود بھیجو"۔ (مسند امام شافعیؒ)

(د) جمعہ کے روز نہانے، مسواک کرنے، خوشبو لگانے اور عمدہ لباس (۱) پہننے کی بھی فضیلت ہے:

حضرتِ ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "ہر مسلمان کو چاہئے کہ جمعہ کے روز نہائے، اپنے عمدہ کپڑے پہنے اور اگر اس کے پاس خوشبو ہو تو اسے لگائے"۔ (بخاری، مسلم، احمد)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک جمعہ کے روز فرمایا "اے مسلمانو! اس دن کو اللہ نے تمہارے لئے عید بنایا ہے۔ لہٰذا تم اس روز غسل کرو اور مسواک کرو"۔ (طبرانی)

(ر) جمعہ کے روز نماز کے لئے جلد سے جلد مسجد میں پہنچنے کی بھی فضیلت ہے:

حضرتِ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے جمعہ کے روز غسل جنابت جیسا غسل کیا اور پھر مسجد گیا، گویا اس نے ایک اونٹ کا صدقہ کیا۔ پھر جو شخص دوسری گھڑی میں گیا، گویا اس نے ایک گائے کی قربانی دی پھر جو شخص تیسری گھڑی میں گیا، گویا اس نے ایک سینگوں والے مینڈھے کی قربانی، پھر جو شخص چوتھی گھڑی میں گیا، گویا اس نے ایک مرغی کا صدقہ کیا پھر جو پانچویں گھڑی میں گیا، گویا اس نے ایک انڈے کا صدقہ کیا۔ اس کے بعد جب امام آجاتا ہے (یعنی جب خطبہ شروع ہو جاتا ہے) تو فرشتے آکر خطبہ سننا شروع کر دیتے ہیں (۲)"۔ (بخاری، مسلم، احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

(س) جمعہ کے روز خطبہ شروع ہونے سے پہلے نفل پڑھنے کی بھی فضیلت ہے:

حضرتِ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے جمعہ کے روز غسل کیا، پھر جمعہ کی نماز کے لئے آیا اور جتنی نفل نماز اس سے ہو سکی اس نے پڑھی، پھر امام

---

(۱) حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک کپڑوں کا سفید ہونا افضل ہے۔ (الفقہ ---)

(۲) ائمہ اربعہ کے نزدیک امام کا مسجد میں خطبہ کا وقت ہو جانے سے پہلے پہنچنا مستحب نہیں ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۵۰)

کے خطبہ سے فارغ ہونے تک خاموشی اور دھیان سے خطبہ سنتا رہا اور پھر اس کے پیچھے نماز پڑھی تو اس کے اس جمعہ اور اگلے جمعہ کے درمیان کے گناہ اور تین دن مزید کے گناہ معاف کر دیئے گئے"۔ (مسلم)

جب خطبہ شروع ہو جائے تو جمہور صحابہؓ، تابعین اور ائمہ کے نزدیک ہر قسم کے نوافل سے رک جانا چاہئے، جیسا کہ اوپر کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے، نیز حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اگر تم میں سے کوئی شخص مسجد میں اس وقت داخل ہو جب کہ امام منبر پر (خطبہ دے رہا) ہو، تو کوئی نماز یا بات چیت نہیں ہے یہاں تک کہ وہ فارغ ہو جائے۔(۱)" (طبرانی)

(د) جمعہ کے روز صبح کی نماز میں آلم تنزیل اور هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ کا پڑھنا

---

(۱) ائمہ اربعہ میں سے امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کا یہی مسلک ہے۔

امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور بہت سے اہل حدیث علماء کے نزدیک خطبہ کے دوران دوسرے نوافل تو نہیں پڑھے جا سکتے، لیکن تحیۃ المسجد (مسجد میں آنے) کی دو رکعتوں کا پڑھنا جائز ہے، ان کا استدلال حضرت جابرؓ کی اس روایت سے ہے کہ "ایک روز نبی ﷺ خطبہ دے رہے تھے کہ ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا۔ اس سے نبی ﷺ نے دریافت فرمایا "کیا تم نے نماز پڑھی لی"؟ اس نے عرض کیا "نہیں" فرمایا تو تم دو رکعت نماز پڑھو۔ (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، احمد، ابن ماجہ)

دوسری روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں داخل ہو اور امام خطبہ دے رہا ہو، تو اسے چاہئے کہ دو ہلکی رکعتیں نماز پڑھ لے"۔ (احمد، مسلم، ابو داؤد)

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ خطبہ کے دوران تحیۃ المسجد کے قائل نہیں، وہ حضرت جابرؓ کی مذکورہ روایت (جس میں تحیۃ المسجد کا ذکر ہے) کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اس میں ایک خاص واقعہ بیان ہوا ہے' ایک فقیر آدمی پھٹے ہوئے کپڑوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہوا، تو حضور ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ اسے خیرات دیں اور خود اسے یہ حکم دیا کہ وہ کھڑے ہو کر دو رکعت میں نماز پڑھے تاکہ لوگ اسے دیکھ سکیں۔ دوسری روایت میں کہ وہ قرآن کی آیت "وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا" اور نبی ﷺ کے ارشاد "امام کے خطبہ دینے کے دوران اگر تم نے اپنے ساتھی سے یہ بھی کہا کہ خاموش ہو جاؤ تم فضول بات کر دگے" کے خلاف مانتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں جو حضرات خطبہ کے دوران تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں پڑھنے کو جائز رکھتے ہیں۔ ان دونوں احادیث کو قرآن یا نبی ﷺ کے کسی حکم کے خلاف نہیں مانتے بلکہ ان کے درمیان تطبیق دیتے ہیں۔ رہی حضرت ابن عمرؓ کی مذکورہ بالا روایت (جس میں نبی ﷺ نے خطبہ کے دوران ہر قسم کی نماز سے منع فرمایا) تو اسے یہ حضرات معتبر نہیں مانتے کیونکہ اس کی سند کمزور ہے' امام نووی فرماتے ہیں "میں نہیں سمجھ سکتا کہ کسی عالم کو نبی ﷺ کی تحیۃ المسجد کی صحیح روایات ملیں اور انہیں نہ مانے"۔ (نیل الاوطار ج ۳' ص ۱۲۹۔۱۱ الفتح الربانی ج ۶' ص ۸۷)

مستحب ہے:

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جمعہ کے روز صبح کی نماز میں نبی ﷺ سورہ آلم تنزیل اور ھل اتی علی الانسان اور جمعہ کی نماز میں سورہ جمعہ اور سورہ منافقون پڑھا کرتے تھے"۔ (احمد، مسلم، ابو داؤد، نسائی)

۱۰- جب کہ جمعہ اور عید ایک روز جمع ہو جائیں

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کبھی عید اور جمعہ ایک روز جمع ہو جائیں تو جمعہ کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے:

حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے عید کی نماز پڑھی اور جمعہ کی رخصتی دے دی اور فرمایا "جو شخص جمعہ پڑھنا چاہے وہ پڑھ لے"۔ (ابو داؤد، حاکم، نسائی، ابن ماجہ، احمد)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "آج دو عیدیں (عید اور جمعہ) ایک ساتھ جمع ہو گئیں ہیں، لہٰذا تم میں سے جو شخص چاہے، جمعہ نہ پڑھے، اس کے لئے یہی (عید کی) نماز کافی ہے، البتہ ہم تو جمعہ پڑھنے والے ہیں۔ (ابو داؤد)

لیکن جمہور کا مسلک اس بارے میں یہ ہے کہ یہ رخصت اہل مدینہ کے لئے نہیں تھی، بلکہ ارد گرد کے گاؤں سے آنے والوں کے لئے تھی تاکہ انہیں اپنے گھروں کو ایک مرتبہ جا کر جمعہ کے لئے دوبارہ آنے کے مشقت نہ ہو، لیکن ان لوگوں پر ظہر کی فرضیت بہر حال برقرار رہتی تھی۔(۱)

---

(۱) حنفیہ اور شافعیہ کا یہی مسلک ہے، مشہور روایت میں مالکیہ کا بھی یہی مسلک ہے اور اسی کی روایت حضرت عثمانؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے ملتی ہے۔ حنابلہ کے نزدیک اگر عید اور جمعہ ایک دن جمع ہو جائیں امام کے سوا سب سے جمعہ کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے، خواہ وہ شہر کے لوگ ہوں یا گاؤں کے۔ امام سے جمعہ کی فرضیت اس لئے ساقط نہیں ہوتی کہ نبی ﷺ نے فرمایا "البتہ ہم تو جمعہ پڑھنے والے ہیں"۔ دوسرے لوگ اگر جمعہ پڑھیں تو بہتر ہے، ضروری نہیں۔ اگر جمعہ نہ پڑھیں تو ظہر کی نماز ان پر بہر حال فرض ہے۔ اس کا استدلال مذکورہ بالا احادیث کے ظاہری الفاظ سے ہے۔

عطا بن ابی رباحؒ کے نزدیک اگر عید اور جمعہ ایک روز جمع ہو جائیں تو عید کی نماز پڑھ لینے کے بعد اس روز کسی پر نہ جمعہ فرض رہتا ہے اور نہ ظہر کی نماز۔ اسی مسلک کی روایت صحابہ میں سے حضرت علیؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ سے ملتی ہے۔ عطاءؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے ایک جمعہ کے روز عید کی نماز پڑھ لی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ طائف میں تھے۔ جب وہ واپس آئے تو ہم نے ان سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا "انہوں نے (یعنی حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے) سنت کے مطابق عمل کیا ہے"۔ (ابو داؤد) اہل حدیث علماء میں سے امام شوکانیؒ نے اسی مسلک کو ترجیح دی ہے۔ (الفتح الربانی ج ۶ ص ۴۳- اوجز المسالک ج ۲ ص ۱۴۲)

وِتر

وتر کے لفظی معنی طاق کے ہیں چونکہ اس نماز کی رکعتوں کی تعداد طاق ہے، اس لئے اسے وِتر کہا جاتا ہے۔

۱- وتر کی فضیلت

نبی ﷺ نے وتر کی سخت تاکید فرمائی ہے:

حضرت خارجہ بن حذافہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی نماز کے ذریعے تمہاری مدد فرمائی جو تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے"۔ ہم نے عرض کیا "یارسول اللہ ﷺ! وہ کون سی نماز ہے"؟ فرمایا "وتر اس کا وقت عشاء کی نماز سے طلوع فجر تک ہے"۔ (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، احمد)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اے قرآن والو! وتر پڑھو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ وتر (طاق) ہے اور وہ وتر کو پسند کرتا ہے"۔

۲- وتر کا حکم

جمہور (جن میں امام مالکؒ، شافعیؒ، اور احمد بن حنبلؒ شامل ہیں) کے نزدیک وتر سنت ہے جس کی تاکید اور فضیلت اگرچہ فرض کی نہیں لیکن سنت نمازوں میں سب سے زیادہ ہے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں "وتر فرض نماز کی طرح لازم نہیں ہے، لیکن وہ سنت ہے جسے نبی ﷺ نے جاری فرمایا"۔ (احمد، نسائی، ترمذی)

حضرت طلحہ بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ اہل نجد میں سے ایک آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوال کیا "دن اور رات میں پانچ نمازوں کے علاوہ مجھ پر کوئی اور نماز بھی ہے"؟ فرمایا "نہیں، الا یہ کہ تم اپنی مرضی سے سنتیں اور نفل پڑھو۔ (بخاری و مسلم)

ان اور بعض دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ وتر کی نبی ﷺ نے سخت

تاکید فرمائی ہے لیکن اس کا حکم سنت ہی کا ہے (۱)۔ (نیل الاوطار وغیرہ)

۳- وتر کا وقت

وتر کا وقت عشاء کی نماز کے بعد سے طلوع فجر تک ہے جیسا کہ حضرت خارجہ بن حذیفہؓ کی اوپر والی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ حضرت ابو مسعود انصاریؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ وتر شروع رات میں بھی پڑھا کرتے تھے، آدھی رات بھی اور آخر رات بھی۔" (مسند امام احمد)

افضل یہ ہے کہ وتر کی نماز رات کے آخری حصہ میں طلوع فجر کے قریب پڑھی جائے لیکن جس شخص کو اندیشہ ہو کہ وہ رات کے آخری حصہ میں اٹھ نہیں سکے گا اس کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ شروع رات میں وتر پڑھ لے:

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "تم میں سے جو شخص یہ سمجھتا ہو کہ وہ رات کے آخری حصہ میں اٹھ نہیں سکے گا، اسے چاہئے کہ شروع رات ہی میں وتر پڑھ لے، لیکن جو شخص یہ سمجھتا ہو کہ وہ آخر رات میں اٹھ جائے گا اسے چاہئے کہ آخر رات میں وتر پڑھے، اس لئے کہ رات کی نماز میں فرشتے آتے ہیں اور وہ افضل ہے"۔ (احمد، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ)

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک وتر واجب، سنت اور فرض کے درمیان ہے۔ ان کا استدلال جن احادیث سے ہے ان میں سے ایک طرح کی احادیث وہ ہیں جن کا ہم نے اوپر وتر کی فضیلت میں ذکر کیا ہے، دوسروں کے نزدیک ان سے وتر کی تاکید اور فضیلت تو ظاہر ہوتی ہے، لیکن اس کا واجب ہونا ظاہر نہیں ہوتا۔ دوسری طرح کی احادیث وہ ہیں جن میں واقعی وتر کے واجب ہونے کا ذکر ہے۔ مثلاً حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "وتر حق ہے، جس نے وتر نہیں پڑھا وہ ہم میں سے نہیں"۔ (حاکم، ابو داؤد) حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں "وتر ہر مسلمان پر واجب ہے"۔ (بزار) دوسروں کے نزدیک یہ تمام احادیث سند کے لحاظ سے کمزور ہیں اس لئے وہ انہیں معتبر نہیں مانتے۔ (نیل الاوطار ج ۳، ص ۲۶)

حنفیہ میں سے امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ کے نزدیک بھی وتر سنت ہے، واجب نہیں (ہدایہ) اس مقام پر یہ فرق ذہن نشین رہنا چاہئے کہ حنفیہ کے نزدیک فرض اور واجب دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ واجب کا درجہ سنت موکدہ سے زیادہ اور فرض سے کم ہے، دوسروں کے ہاں فرض اور واجب ہم معنی لفظ ہیں یعنی فرض اور سنت کے درمیان اس طرح کی کوئی چیز نہیں ہے جس طرح کی حنفیہ کے ہاں واجب ہے۔

۴- وتر کی رکعتیں

نبی ﷺ سے وتر کی ایک رکعت بھی ثابت ہے- تین بھی، پانچ بھی، نو بھی، اور گیارہ بھی-ذیل میں ہم ان کا الگ الگ ذکر کریں گے:

(ا) ایک رکعت: حضرت ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے سنا "وتر آخر رات میں ایک رکعت ہے"- (احمد، مسلم)

حضرت ابن عمرؓ ہی سے روایت ہے کہ ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس نے دریافت کیا "اے اللہ کے رسول ﷺ! رات کی نماز کیسے پڑھی جائے؟" فرمایا "دو دو رکعتیں پڑھو اور جب تمہیں صبح ہونے کا اندیشہ ہو تو ایک رکعت پڑھ لو"-

(بخاری، مسلم، احمد، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

(ب) تین رکعتیں: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ وتر میں تین رکعتیں پڑھا کرتے تھے"- (مسند امام احمد)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے وتر میں تین رکعت نماز پڑھی- آپ نے پہلی رکعت میں سورہ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى، دوسری میں قل يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ اور تیسری میں قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھی"- (مسند امام احمد، نسائی، دار قطنی، حاکم)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ وتر میں تین رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور صرف آخر میں بیٹھا کرتے تھے"- دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں اور دوسری رکعت میں آپ سلام نہ پھیرا کرتے تھے"- (حاکم)

(ج) پانچ رکعتیں: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ رات کو تیرہ رکعت نماز پڑھا کرتے تھے- ان میں سے وتر کی صرف پانچ رکعتیں ہوتی تھیں اور ان میں آپ ﷺ آخری رکعت سے پہلے نہ بیٹھتے تھے"- (بخاری و مسلم)

(د، ہ) سات اور نو رکعتیں: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ رات کو (وتر کی) نو رکعتیں پڑھا کرتے تھے- ان میں سے آپ ﷺ صرف آٹھویں رکعت میں بیٹھتے- اللہ تعالیٰ کا ذکر اور دعا کرتے- پھر سلام پھیرے بغیر اٹھ جاتے- پھر نویں رکعت پڑھتے اور اس میں بیٹھ کر تشہد پڑھتے اور سلام پھیرتے اور ہمیں یہ سلام سناتے- پھر سلام کے بعد دو

رکعتیں بیٹھ کر پڑھتے -اس طرح گیارہ رکعتیں پڑھتے -جب آپ کی عمر زیادہ ہو گئی اور بڑھاپا آ گیا تو آپ وتر میں سات رکعتیں پڑھنے لگے اور ایسا ہی کرتے جیسا کہ آپ پہلے کیا کرتے تھے"- (دوسری روایت میں ہے "آپ وتر میں سات رکعتیں پڑھتے اور چھٹی اور سوائے ساتویں رکعت کے آپ کسی رکعت میں نہ بیٹھتے اور ساتویں رکعت میں سلام پھیرتے"-

(بخاری، مسلم، احمد، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ)

(و) گیارہ رکعتیں: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "وتر میں تین رکعتیں نہ پڑھو وتر کو مغرب کے مشابہ نہ بناؤ بلکہ وتر میں پانچ، سات، نو گیارہ، یا اس سے زیادہ رکعتیں پڑھو"- (محمد بن نصر)

ان اور بعض دوسری احادیث کی روشنی میں وتر کی رکعتوں کی تعداد اور ان کے پڑھنے کے طریقہ میں ائمہ سلف کے درمیان جو اختلاف ہے، ان کا ہم حاشیہ میں ذکر کرتے ہیں (۱)-

---

(۱) شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک وتر میں ایک سے لے کر گیارہ تک رکعتیں پڑھی جا سکتی ہیں، اگرچہ صرف ایک رکعت کا پڑھنا خلاف اولیٰ ہے- کمال کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ تین رکعتیں پڑھی جائیں- تین سے گیارہ تک کی رکعتیں تین طریقوں سے پڑھی جا سکتی ہیں:-

۱- ہر دو رکعتوں کے بعد تشہد پڑھ کر سلام پھیر لیا جائے، پھر آخر میں ایک رکعت پڑھی جائے، اور اس میں تشہد، درود اور دعا پڑھ کر سلام پھیرا جائے-

۲- ساری رکعتیں لگاتار پڑھی جائیں اور صرف آخری سے پہلی رکعت میں بیٹھ کر تشہد پڑھا جائے پھر سلام پھیرے بغیر آخری رکعت کے لئے کھڑا ہوا جائے اور اس میں تشہد، درود اور دعا پڑھ کر سلام پھیرا جائے-

۳- تمام رکعتیں لگاتار پڑھی جائیں اور صرف آخری رکعت میں بیٹھا جائے، اور اس میں تشہد، درود اور دعا پڑھ کر سلام پھیرا جائے-

تین رکعتوں کا پہلی صورت سے اور پانچ اور سات رکعتوں کا تیسری صورت سے پڑھنا افضل ہے- حنفیہ کے نزدیک وتر میں صرف تین رکعتیں ہیں- نہ ان سے کم اور نہ ان سے زیادہ- اس بارے میں اس کا استدلال (مختصر طور پر) یہ ہے کہ تین سے کم یا زیادہ رکعتوں کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے- اور تین رکعتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے- لہذا ہم نے ان ہی کو اختیار کر لیا- (موطا امام محمد)

حنفیہ کے نزدیک تین رکعتوں کے پڑھنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ --- انہیں ساتھ پڑھا جائے دوسری رکعت میں بیٹھ کر تشہد پڑھا جائے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

۵- وتر میں قرأت

وتر کی اگر تین رکعتیں ہوں تو ان میں سے پہلی رکعت میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی، دوسری میں قُلْ يٰاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ اور تیسری میں قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھنا مسنون ہے۔

حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ وتر میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی، قُلْ يٰاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھا کرتے تھے"۔ (احمد، ابو داود، نسائی)

امام ترمذیؒ اور امام ابو داودؒ نے حضرت عائشہؓ سے ایک دوسری روایت نقل کی ہے جس میں وتر کی تیسری رکعت میں قل ھو اللہ کے ساتھ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ کا بھی ذکر ہے لیکن امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ "اکثر اہل علم کا عمل اسی پر ہے کہ پہلی رکعت میں سورہ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی، دوسری رکعت میں قل یاایھا

(بقیہ) لیکن سلام نہ پھیرا جائے بلکہ اس کے بعد کھڑے ہو کر تیسری رکعت پڑھی جائے اور اس میں تشہد، درود اور دعا پڑھ کر سلام پھیرا جائے۔

جن احادیث میں نبی ﷺ نے وتر میں تین رکعتوں کے پڑھنے سے اور وتر کو مغرب کے مشابہ بنانے سے منع فرمایا ہے وہ احادیث حنفیہ کے نزدیک یا منسوخ ہیں یا قابلِ تاویل (بذل المجہود)

مالکیہ کے نزدیک وتر کی صرف ایک رکعت ہے لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیرا جائے۔ اگر یہ دو رکعتیں نہ پڑھی جائیں گی تو صرف ایک رکعت کا پڑھنا مکروہ ہے۔ مالکیہ کے اس مسلک کی بنیاد حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی اس حدیث پر ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "(رات کی نماز) دو رکعتیں کر کے پڑھو اور جب تمہیں صبح ہونے کا اندیشہ ہو تو ایک رکعت وتر پڑھ لو"۔

اہل حدیث علماء کے نزدیک وتر میں ایک سے لے کر گیارہ رکعتیں تک پڑھی جا سکتی ہیں اور اس بارے میں ان کا مسلک شافعیہ اور حنابلہ کے مطابق ہے۔ البتہ تین رکعتوں کے متعلق ان کا مسلک یہ ہے کہ انہیں ملا کر اس طرح پڑھا جائے کہ دوسری رکعت میں نہ بیٹھا جائے اور نہ اس میں پڑھ کر سلام پھیرا جائے۔

جن احادیث میں نبی ﷺ نے وتر میں تین رکعتوں کے پڑھنے اور وتر کو مغرب کی نماز سے مشابہ بنانے سے منع فرمایا ہے' ان کا مطلب اہل حدیث علماء کے نزدیک یہ ہے کہ دوسری رکعت میں مغرب کی نماز کی طرح بیٹھ کر تشہد نہ پڑھا جائے بعض اہل حدیث علماء (جیسے "قاضی شوکانیؒ) کے نزدیک ان احادیث کی وجہ سے وتر میں تین رکعتوں کا پڑھنا مکروہ ہے۔ (الفتح الربانی ج ۴' ص ۳۰۳۔ نیل الاوطار، تحفۃ الاحوذی ج ۱' ص ۳۳۸۔ الفقہ المذاہب الاربعہ ج ۱' ص ۳۳۷)

الکافرون اور تیسری رکعت میں قل ھو اللہ احد (اور اس پر قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس کا اضافہ نہ کیا جائے)۔ (۱)

۶- وتر میں دعائے قنوت

(ا) حکم: کسی صحیح حدیث میں نبی ﷺ سے وتر میں دعائے قنوت کا ثبوت نہیں ملتا' صرف ایک روایت حضرت حسنؓ سے ہے جسے اکثر محدثین نے کمزور قرار دیا ہے۔ البتہ صحابہ میں سے حضرت ابن مسعودؓ، ابو موسیٰؓ، ابن عباسؓ، انسؓ اور تابعین میں سے امام حسن بصریؒ، عمر بن عبدالعزیزؒ، سفیان ثوریؒ اور عبداللہ بن مبارکؒ وتر میں دعائے قنوت کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک وتر میں سال بھر دعائے قنوت کا پڑھنا جائز ہے۔(۲)

(ب) کلمات: حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ مجھے نبی ﷺ نے قنوت کے یہ الفاظ سکھائے:

اَللّٰهُمَّ اهْدِنِیْ فِیْ مَنْ هَدَیْتَ، وَعَافِنِیْ فِیْ مَنْ عَافَیْتَ وَ تَوَلَّنِیْ فِیْ مَنْ تَوَلَّیْتَ، وَ بَارِکْ لِیْ فِیْ مَا اَعْطَیْتَ، وَقِنِیْ شَرَّ مَا قَضَیْتَ فَاِنَّکَ تَقْضِیْ وَ لَا یُقْضٰی عَلَیْکَ اِنَّهٗ لَا یَذِلُّ مَنْ وَّالَیْتَ وَلَا یَعِزُّ مَنْ عَادَیْتَ(۳)

اے اللہ! مجھے ہدایت دے منجملہ ان لوگوں کے جنہیں تو نے ہدایت دی اور مجھے عافیت عطا فرما منجملہ ان لوگوں کے جنہیں تو نے عافیت عطا فرمائی اور میرا ولی و کارساز بن۔ تو نے مجھے جو نعمتیں دے رکھی ہیں ان میں برکت عطا کر اور مجھے اپنے فیصلہ کے شر سے محفوظ رکھ، اس لئے کہ تو ہی فیصلہ کرتا ہے اور تیرے مقابلے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا جس کا تو کارساز بن گیا وہ کبھی

---

(۱) حنفیہ اور حنابلہ کا یہی مسلک ہے۔ مالکیہ کے نزدیک پہلی رکعت میں قل ھو اللہ احد دوسری میں قل اعوذ برب الفلق اور تیسری میں قل اعوذ برب الناس کا پڑھنا مستحب ہے۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا ص ۳۳۶)

(۲) صحابہ میں سے حضرت علیؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور ابی بن کعبؓ کے متعلق روایت ہے کہ وہ سال بھر میں صرف رمضان کی سولھویں رات سے آخر رمضان تک وتر میں
دعائے قنوت کے قائل نہ تھے۔ یہی مذہب امام مالکؒ اور امام طاؤسؒ کا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک وتر میں دعائے قنوت کا سال بھر پڑھنا واجب ہے اور حنابلہ کے نزدیک جائز (نیل الاوطار ج ۳، ص ۳۸۔ الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا ص ۳۳۶)

(۳) یہ الفاظ صرف بیہقی میں ہیں۔

(سُبْحَانَکَ)⁽¹⁾ تَبَارَکْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَیْتَ (وَصَلَّی اللّٰہُ عَلَی النَّبِیِّ)⁽²⁾
(احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بیہقی، حاکم، دارقطنی، ابن حبان)

ذلیل نہیں ہوتا اور جس کا تو دشمن ہو گیا اسے کوئی عزت نہیں دے سکتا تو پاک ہے۔ اے ہمارے رب! تو برکت والا ہے اور بزرگ و برتر ہے اور اللہ اپنے نبی پر درود و سلام بھیجے۔

یہ روایت اگرچہ کمزور ہے لیکن امام ترمذیؒ فرماتے ہیں "دعائے قنوت کے متعلق نبی ﷺ سے اس سے قوی کوئی دوسری حدیث ثابت نہیں ہے۔ (۳)

(ج) دعائے قنوت پڑھنے کا موقع: وتر کی آخری رکعت میں دعائے قنوت رکوع سے پہلے بھی جائز ہے اور رکوع کے بعد بھی۔ اس بارے میں بھی اگرچہ نبی ﷺ سے کوئی صحیح

---

(۱) یہ الفاظ صرف "ترمذی" میں ہیں۔

(۲) یہ الفاظ صرف "نسائی" میں ہیں۔

(۳) حنفیہ کے نزدیک دعائے قنوت کے الفاظ جو حضرت ابن مسعودؓ سے ثابت ہیں، یہ ہیں:

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُکَ وَ نَسْتَغْفِرُکَ وَ نُؤْمِنُ بِکَ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْکَ وَنُثْنِیْ عَلَیْکَ الْخَیْرَ وَنَشْکُرُکَ وَلَا نَکْفُرُکَ وَ نَخْلَعُ وَ نَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ، اَللّٰھُمَّ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ لَکَ نُصَلِّیْ وَ نَسْجُدُ وَاِلَیْکَ نَسْعٰی وَ نَرْجُوْا رَحْمَتَکَ وَ نَخْشٰی عَذَابَکَ اِنَّ عَذَابَکَ بِالْکُفَّارِ مُلْحِقٌ۔

اے اللہ! ہم تجھ سے مدد طلب کرتے ہیں اور بخشش چاہتے ہیں، تجھ پر ایمان رکھتے ہیں اور تیرے اوپر بھروسہ کرتے ہیں۔ تیری حمد و ثناء کرتے ہیں۔ تیرا شکر بجا لاتے ہیں اور تیری ناشکری نہیں کرتے۔ ہم اس شخص سے الگ ہو جائیں گے جو تیری نافرمانی کرے گا۔ اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیرے ہی لئے نماز پڑھتے، تجھ ہی کو سجدہ کرتے، تیری ہی طرف لپکتے، تیری ہی رحمت کی امید کرتے اور تیرے ہی عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بیشک تیرا عذاب کافر لوگوں کو لے لینے والا ہے۔

اگر کسی کو یہ دعا یاد نہ ہو تو وہ تین مرتبہ ربنا اتنا فی الدنیا حسنة و فی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار پڑھے۔ شافعیہ کے نزدیک دعائے قنوت کے الفاظ "اللھم اھدنی---" ہیں اور حنبلیہ کے نزدیک ان دونوں دعاؤں کو ملا کر۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۳۶-۳۳۷)

حدیث ثابت نہیں لیکن صحابہ کرام سے دونوں قسم کے آثار ملتے ہیں۔

حضرت ابن مسعودؓ اور نبی ﷺ کے دوسرے صحابہ وتر میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھا کرتے تھے۔ (ابن ابی شیبہ)

حضرت انسؓ سے پوچھا گیا "قنوت رکوع سے پہلے ہے یا رکوع کے بعد"؟ فرمایا "ہم لوگ رکوع سے پہلے بھی قنوت پڑھا کرتے تھے اور بعد میں بھی"۔ (ابن ماجہ، محمد بن نصر) (۱)

(د) دعائے قنوت کے لئے تکبیر اور رفع الیدین: دعائے قنوت کے لئے (رکوع سے پہلے یا رکوع کے بعد) اللہ اکبر کہنے اور رفع الیدین کرنے کے بعض صحابہ کرام سے آثار ملتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وتر کی آخری رکعت میں قل ھو اللہ پڑھتے، پھر ہاتھ اٹھاتے اور رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے"۔ (بخاری)

طارق بن شہابؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ قرآت سے فارغ ہوئے تو انہوں نے "اللہ اکبر" کہا، پھر قنوت پڑھا۔ پھر اللہ اکبر کہا اور رکوع کیا"۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۱ ص ۳۴۳)

ان آثار سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ ہاتھ اٹھا کر دعائے قنوت پڑھنے کی کیفیت کیا ہوگی؟" (۲)

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک وتر میں قنوت رکوع سے پہلے ہے۔ شافعیہ کے نزدیک بعد میں حنابلیہ کے نزدیک رکوع سے پہلے بھی ہے اور بعد میں بھی لیکن بعد میں افضل ہے۔
(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۳۶-۳۳۷)

(۲) حنفیہ کے نزدیک قنوت کا طریقہ یہ ہے کہ قرآت کے بعد اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ اٹھائے جائیں جیسا کہ تکبیر اولیٰ کے وقت اٹھائے جاتے ہیں پھر اسی طرح باندھ لئے جائیں جیسا کہ قیام کے وقت باندھے جاتے ہیں پھر دعائے قنوت پڑھی جائے اور پھر اللہ اکبر کہہ کر رکوع کیا جائے۔ ہاتھوں کا اٹھانا اور اللہ اکبر کہنا واجب ہے۔ حنابلیہ اور شافعیہ کے نزدیک اللہ اکبر کہہ کر دعا کی طرح ہاتھ اٹھائے جائیں گے اور پھر اللہ اکبر کہہ کر رکوع (اگر قنوت رکوع سے پہلے ہے) یا سجدہ (اگر قنوت رکوع کے بعد ہے) کیا جائے گا حنابلیہ کے نزدیک دعا کے بعد ہاتھوں کا چہروں پر ملنا بھی جائز ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۳۸)

اہل حدیث علما کا بھی یہی مسلک ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ فرماتے ہیں "صحابہ کے مندرجہ بالا آثار سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ اسی طرح اٹھائے جائیں گے جس طرح دعا کے لئے اٹھائے جاتے ہیں کیونکہ قنوت بھی دعا ہی ہے"۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۱ ص ۳۴۳)

قنوت کے بعد ہاتھوں کو چہرے پر ملنے کے متعلق امام بیہقیؒ فرماتے ہیں "سلف سے ایسا کرنے کے آثار نہیں ملتے بہتر یہ ہے کہ ایسا نہ کیا جائے اور صرف سلف کے عمل پر اکتفا کیا جائے یعنی ہاتھوں کو اٹھایا تو جائے مگر انہیں چہرے پر نہ ملا جائے"۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۱ ص ۳۴۳)

۷- وتر کے بعد دعا

(۱) حضرت ابی بن کعب اور عبدالرحمن بن ابزیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب وتر کے بعد سلام پھیرتے تو تین مرتبہ یہ دعا پڑھتے۔

سُبْحَانَ الْمَلِکِ الْقُدُّوْس (حمد و پاکیزگی والا بادشاہ پاک ہے)

حضرت عبدالرحمن بن ابزیؓ کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں اور تیسری مرتبہ یہ دعا بلند آواز سے پڑھتے"۔ (ابوداؤد، نسائی، احمد، دارقطنی)

دارقطنی کی روایت میں دعا کے یہ الفاظ زیادہ ہیں:

رَبُّ الْمَلاَئِکَةِ وَ الرُّوْحِ (جو فرشتوں اور جبرائیلؑ کا رب ہے)

(۲) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اپنے وتر کے آخر میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُ بِرِضَاکَ مِنْ سَخَطِکَ وَ اَعُوْذُ بِمُعَافَاتِکَ مِنْ عُقُوْبَتِکَ، وَ اَعُوْذُبِکَ مِنْکَ، لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ، اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ

اے اللہ! میں تیرے غضب سے تیری رضا مندی کی پناہ مانگتا ہوں اور تیرے عذاب سے تیری رحمت کی پناہ مانگتا ہوں۔ میں تجھ سے تیری ہی پناہ مانگتا ہوں۔ میں تیری حمد و ثنا شمار نہیں کر سکتا ہوں تو ویسا ہی ہے جیسا تو نے خود اپنی تعریف کی۔

(ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، احمد)

محدثین نے اس دعا کی سند پر کلام کیا ہے لیکن اوپر والی دعا کے ساتھ اسے ملا کر پڑھنا بہر حال مستحب ہے۔

۸- وتر کے بعد دو سنتیں

اگرچہ متعدد صحیح احادیث میں نبی ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ "وتر کو رات کے وقت اپنی آخری نماز بناؤ" لیکن بعض دوسری احادیث میں وتر کے بعد دو رکعتوں کا پڑھنا ثابت ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں "نبی ﷺ وتر سے سلام پھیرتے اور پھر بیٹھ کر دو رکعت نماز پڑھتے"۔ (احمد، مسلم، ابوداؤد، نسائی)

ان دونوں قسم کی روایات میں اکثر ائمہ سلف نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ رات کے

وقت انسان کی آخری نماز تو وتروں ہی کو ہونا چاہئے لیکن کبھی کبھی وتروں کے بعد دو رکعت سنتوں کا پڑھنا بھی مستحب ہے۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں "اصل بات یہ ہے کہ وتر کے بعد نبی ﷺ بیٹھ کر یہ دو رکعتیں صرف جواز کو ظاہر کرنے کے لئے پڑھتے تھے۔ آپ نے ان پر ہمیشگی نہیں فرمائی بلکہ آپ نے انہیں صرف ایک یا چند مرتبہ پڑھا ہے۔ (۱)

۹- ایک رات میں دو مرتبہ وتر نہیں ہیں

جو شخص رات کو وتر پڑھ کر سوئے اور دوبارہ اٹھ کر نفل نماز پڑھنا چاہے تو وہ نماز پڑھ سکتا ہے، بغیر اس کے کہ وہ بعد میں دوبارہ وتر پڑھے۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے "ایک رات میں دو مرتبہ وتر نہیں ہیں"(۲)

(ابو داؤد، نسائی، ترمذی)

۱۰- وتر کی قضا

جس شخص کے وتر رات کو رہ جائیں گے، وہ اگلے دن ان کی قضا کر سکتا ہے:

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص اس حال میں صبح کرے کہ اس کے وتر رہ گئے ہوں یا وہ انہیں بھول گیا ہو تو جب وہ اسے یاد آئیں، انہیں پڑھ لیں"۔ (ابو داؤد)

---

(۱) حنفیہ، شافعیہ، حنبلیہ اور عام اہل حدیث علماء کا یہی مسلک ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک وتر کے بعد دو رکعتوں کا پڑھنا مکروہ ہے۔ بعض دوسرے ائمہ نے مذکورہ بالا دونوں قسم کی روایات میں یوں تطبیق دی ہے کہ وتر کے بعد دو رکعتوں کا پڑھنا صرف نبی ﷺ کے ساتھ خاص تھا۔ امت کے لئے یہی حکم ہے کہ وتر کو رات کی آخری نماز بنایا جائے (اور غالباً یہی امام مالکؒ کے مسلک کی بنیاد ہے)۔

(نیل الاوطار ج ۳، ص ۳۳۔ الفقہ علی المذاہب ۱/رکن دین)

(۲) اکثر صحابہؓ، تابعین اور ائمہ کا مسلک یہی ہے۔ ائمہ اربعہ کا مسلک بھی یہی ہے۔۔۔ لیکن حضرت ابن عمرؓ، ابن عباسؓ اور بعض دوسرے صاحبان کا مسلک یہ ہے کہ اگر انسان شروع رات میں وتر پڑھ کر سوئے اور آخر رات میں پھر نماز پڑھنا چاہے تو وہ پہلے ایک رکعت پڑھے، پھر اپنی نماز پڑھے اور آخر میں پھر وتر پڑھے۔ امام اسحاقؒ کا یہی مسلک ہے۔ اہل حدیث علماء میں سے مولانا عبدالرحمان نے جمہور ہی کے مسلک کو راجح قرار دیا ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۱، ص ۳۴۵)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص اس حال میں صبح کرے کہ اس نے رات کو وتر نہ پڑھے ہوں تو اسے چاہئے کہ انہیں پڑھ لے (۱)" (حاکم)

۱۱- وتر میں جماعت

نبی ﷺ اور صحابہ کرام رمضان میں تراویح کے ساتھ وتروں کو باجماعت پڑھا کرتے تھے، اس لئے وتروں کا رمضان میں باجماعت پڑھنا سب کے نزدیک مستحب ہے۔ (۲)

۱۲- نوازل کے وقت فرض نمازوں میں دعائے قنوت

نوازل (اجتماعی مصائب) میں تمام فرض کی آخری رکعت میں رکوع کے بعد قنوت کا پڑھنا جائز ہے:

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک ماہ تک لگاتار صبح، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازوں کی آخری رکعت میں رکوع کے بعد قنوت فرمایا۔ آپ بنی سلیم کی بستی میں سے قبیلہ رعل، ذکوان اور عصیہ کے لئے بددعا فرماتے تھے۔ اور لوگ پیچھے پیچھے آمین کہتے تھے (۳)۔" (ابوداؤد، مسند امام احمد)

---

(۱) اس بارے میں اختلاف ہے کہ وتروں کی قضا کب کی جائے؟ شافعیہ کے نزدیک جب بھی انسان کو یاد آ جائے وہ وتر پڑھ لے خواہ کوئی وقت ہو، حنفیہ کے نزدیک ان اوقات میں وتر نہیں پڑھے جا سکتے جن میں نماز کا پڑھنا جائز نہیں، مالکیہ اور حنابلیہ کے نزدیک طلوع فجر کے بعد فرض نماز سے پیشتر وتر پڑھے جا سکتے ہیں۔
(نیل الاوطار ج ۳' ص ۱۴۱)

(۲) غیر رمضان میں وتروں کو باجماعت پڑھنا حنابلیہ کے نزدیک جائز ہے، مالکیہ اور حنفیہ کے نزدیک مکروہ ہے۔ حنابلیہ کے نزدیک اگر کوئی شخص وتر پڑھ رہا ہو اور ایک یا دو یا تین آدمی بلا لائے جو آ کر اس کے ساتھ شامل ہو جائیں تو یہ جائز ہے۔ جماعت کے لئے بلانا جائز نہیں۔ نیز حنفیہ کے نزدیک دعائے قنوت کا آہستہ پڑھنا مسنون ہے۔ خواہ انسان تنہا نماز پڑھ رہا ہو یا جماعت کے ساتھ پڑھ رہا ہو،
(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱' ص ۳۳۶)

(۳) حنفیہ کے نزدیک نوازل میں صرف صبح کی نماز میں قنوت کیا جائے گا دوسری نمازوں میں نہیں کیا جائیگا۔ نیز نوازل میں قنوت کا وقت رکوع کے بعد ہے جبکہ وتر میں اس کا وقت رکوع سے پہلے ہے۔" نیز نوازل میں قنوت امام کے لئے جائز ہے، تنہا نماز پڑھنے والے کیلئے جائز نہیں۔ شافعیہ کے نزدیک نوازل کے علاوہ عام دنوں میں بھی صبح کی نماز میں قنوت مستحب ہے۔ دوسروں کے نزدیک قنوت صرف نوازل میں ہے۔ مالکیہ کے نزدیک نوازل کے وقت بھی کسی نماز میں قنوت جائز نہیں ہے۔
(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱' ص ۳۳۸)

تہجد (قیام اللّیل)

۱۔ فضیلت

قرآن اور حدیث دونوں میں تہجد کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔ (بنی اسرائیل: ۷۹)

اور رات کو تہجد پڑھو۔ یہ تمہارے لئے نفل ہے بعید نہیں کہ تمہارا رب تمہیں مقام محمود پر فائز کر دے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ اٰخِذِيْنَ مَاۤ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۔ (الذّاریٰت: ۱۸-۱۵)

بے شک اللہ سے ڈرنے والے باغوں اور چشموں میں ہونگے اور اس (نعمت) کو لیں گے جسے ان کا رب دے گا۔ بیشک وہ اس سے پہلے احسان (ہر کام خیر و خوبی سے) کرنے والے تھے، رات کو بہت کم سوتے تھے اور صبح کے وقت اللہ سے بخشش طلب کیا کرتے تھے۔

تیسری جگہ ارشاد ہے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا۔ (الفرقان: ۶۳-۶۴)

اور اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرمی سے چلتے ہیں اور جب جاہل قسم کے لوگ ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ ان سے یہ کہتے ہیں (اور ان سے الگ ہو جاتے ہیں، کہ بھی سلام (معاف کرو)، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے حضور قیام اور سجدہ کرتے ہوئے رات بسر کرتے ہیں۔

چوتھی جگہ ارشاد ہے:

اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ۝ تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ۝ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔ (السجدۃ: ۱۵-۱۷)

ہماری آیات پر (دراصل) ایمان وہ رکھتے ہیں کہ جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے، تو سجدہ کرتے ہوئے گر جاتے ہیں اور اپنے رب کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور اکڑتے نہیں۔ ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں، وہ اپنے رب سے (اس کے عذاب سے) ڈرتے ہوئے اور (اس کی رحمت کی) امید کرتے ہوئے پکارتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں کوئی نہیں جانتا کہ آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والی کتنی نعمتیں ان کے لئے چھپا کر رکھی ہوئی ہیں جو ان کے نیک اعمال کا بدلہ ہوگی۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ فرض نماز کے بعد کون سی نماز سب سے بہتر ہے؟ فرمایا "آدمی کی رات کی نماز (یعنی تہجد)"
(مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "تم لوگوں کو چاہیے کہ رات کو قیام کرو، اس لئے کہ یہ تم سے پہلے نیک بندوں کی عادت ہے۔ تمہارا اپنے رب سے قربت حاصل کرنا ہے۔ یہ تمہاری برائیوں کو مٹانے والا، اور تمہیں گناہوں سے بچانے والا ہے"۔
(ترمذی)

حضرت مغیرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے رات کو قیام فرمایا یہاں تک کہ آپ کے پاؤں ورم آلود ہو گئے۔ صحابہؓ نے آپ سے عرض کیا "اے اللہ کے رسول اللہ ﷺ! آپ کے تو تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے، پھر آپ ایسا کیوں فرماتے ہیں"؟ فرمایا "کیا میں اپنے پروردگار کا شکر گزار بندہ نہ ہوں"؟ (بخاری و مسلم، نسائی)

۲۔ آداب

تہجد کے چند آداب ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

(ا) سوتے وقت تہجد کے لئے اٹھنے کی نیت کرنا: حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو شخص یہ نیت کر کے سویا کہ رات کو اٹھ کر نماز پڑھے گا- پھر وہ سوتا ہی رہ گیا- یہاں تک کہ صبح ہو گئی اس کے نامہ اعمال میں وہی لکھ دیا گیا جس کی اس نے نیت کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس پر نیند کا صدقہ کیا"- (نسائی، ابن ماجہ)

(ب) اٹھنے کے بعد دعا کرنا: (ا) حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک رات میں اپنی خالہ میمونہؓ کے پاس سویا- اس رات نبی ﷺ بھی انہیں کے گھر میں تھے- حضور ﷺ کچھ دیر تک اپنے گھر والوں سے گفتگو فرماتے رہے پھر سو گئے' جب تہائی رات باقی رہ گئی تو بیدار ہوئے- آپ ﷺ نے آسمان کی طرف دیکھا اور قرآن پاک کی یہ آیتیں تلاوت فرمائیں "اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ (آل عمران: ۱۹۰) یہاں تک کہ آپ نے سورت (سورہ آل عمران ختم کر دی" (بخاری و مسلم) مسلم کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے اٹھنے کے بعد مسواک کی اور وضو کرتے وقت یہ آیات تلاوت فرمائیں-

(۲) حضرت ابن عباسؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ رات کو تہجد پڑھنے کے لئے بیدار ہوتے تو یہ دعا فرماتے:-

اَللّٰهُمَّ لَکَ الْحَمْدُ، اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِیْهِنَّ وَلَکَ الْحَمْدُ- اَنْتَ قَیِّمُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ مَنْ فِیْهِنَّ وَ لَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ الْحَقُّ وَ وَعْدُکَ الْحَقُّ وَلِقَاؤُکَ حَقٌّ، وَ الْجَنَّةُ حَقٌّ، وَالنَّارُ حَقٌّ وَ النَّبِیُّوْنَ حَقٌّ وَ مُحَمَّدٌ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ حَقٌّ- اَللّٰهُمَّ لَکَ اَسْلَمْتُ وَ بِکَ اٰمَنْتُ وَ عَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ وَ اِلَیْکَ اَنَبْتُ وَ بِکَ خَاصَمْتُ وَ اِلَیْکَ حَاکَمْتُ،	اے اللہ! تیرے ہی لئے حمد ہے تو آسمانوں اور زمین کا نور ہے اور ان سب کا بھی جو ان میں بستے ہیں- تیرے ہی لئے حمد تو ہی زمین و آسمان کو اور ان کے اندر رہنے والوں کو قائم رکھنے والا ہے- تیرے ہی لئے حمد ہے تو ہی حق ہے تیرا وعدہ حق ہے- تیری ملاقات یقینی ہے- جنت یقینی ہے- آگ یقینی ہے- انبیاء کرام حقیقت ہیں اور محمد حق ہیں- قیامت کا آنا یقینی ہے- اے اللہ میں نے تیرے لئے اپنے آپ کو یکسو کر لیا، تیرے ہی اوپر ایمان لایا اور تیرے ہی اوپر میں نے بھروسہ کیا- میں تیری ہی طرف متوجہ ہوا- میں تیرے ہی سہارے

فَاغْفِرْلِیْ مَا قَدَّمْتُ وَ مَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ، اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ (بخاری، مسلم) (اذکار نووی ۴۶) (فتح الباری ۴ر۳) (فتح الربانی ۱۰۱۵)

عث کرتا ہوں تیری طرف ہی میں اپنا مقدمہ لاتا ہوں۔ لہذا تو میرے ان تمام گناہوں کو معاف فرما جو میں نے پہلے یا بعد میں چھپ کر یا علانیہ کئے تو ہی اللہ ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔

(۳) حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو شخص رات کو اٹھے اور یہ کلمات کہے:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْکُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ (اذکار نووی ص ۹۰)

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کی بادشاہی اور حمد ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے اور اللہ پاک ہے۔ حمد اللہ ہی کے لئے ہے اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اللہ سب سے برتر ہے اور کوئی طاقت اور حوصلہ اللہ کے سہارے کے سوا نہیں ہے۔

پھر وہ یہ دعا کرے اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ (اے اللہ مجھے بخش دے)، اس کی دعا قبول ہوتی ہے اگر وہ وضو کر کے نماز پڑھے تو اس کی نماز قبول ہوتی ہے"۔ (بخاری)

(۴) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب رات کو بیدار ہوتے تو یہ دعا فرماتے:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَنْتَ سُبْحَانَکَ وَ اَسْتَغْفِرُکَ لِذَنْبِیْ وَاَسْاَلُکَ وَرَحْمَتَکَ۔ اَللّٰهُمَّ زِدْنِیْ عِلْمًا وَلَا تُزِغْ قَلْبِیْ بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنِیْ وَ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً۔ اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ۔ (ابو داؤد، اذکار نووی ص ۹۰)

اے اللہ! تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے۔ میں تجھ سے بخشش چاہتا ہوں اور تجھ سے تیری رحمت کا طلب گار ہوں۔ اے اللہ! میرا علم زیادہ کر دے اور ایک مرتبہ ہدایت دے دینے کے بعد میرے دل کو ٹیڑھا نہ کر، اپنی طرف سے مجھے رحمت عطا فرما۔ بے شک تو ہی عطا کرنے والا ہے حمد اسی اللہ کے لئے ہے جس نے ہم کو مار دینے کے بعد زندہ کیا اور ہمیں آخر کار اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

(ج) پہلی دو رکعتیں ہلکی پڑھنا: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص رات کو جاگے تو اسے چاہئے کہ اپنی نماز دو ہلکی رکعتوں سے شروع کرے"۔ (مسلم)

(د) اپنے ساتھ اپنے گھر والوں کو جگانا: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب آدمی رات کو اٹھ کر (اپنے ساتھ) اپنی بیوی کو بھی جگاتا ہے پھر دونوں مل کر نماز پڑھتے ہیں تو انہیں اَلذّٰکِرِیْنَ وَالذّٰاکِرَات میں لکھ دیا جاتا ہے"۔ (ابو داؤد)

(ر) جب نیند کا غلبہ ہو تو نماز ختم کر کے سو رہنا: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص رات کو اٹھے اور قرآن اس سے صحیح نہ پڑھا جا رہا ہو اور وہ یہ نہ جانتا ہو کہ کیا کہہ رہا ہے تو اسے سو جانا چاہئے"۔ (مسلم)

حضرتِ انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ مسجد میں تشریف لائے تو دیکھا کہ دو ستونوں کے درمیان رسی بندھی ہوئی ہے۔ دریافت فرمایا "یہ کیا ہے"؟ صحابہؓ نے فرمایا "یہ زینبؓ کی رسی ہے وہ نماز پڑھنے میں جب سستی محسوس کرتی ہیں یا اکتا جاتی ہیں تو اسے پکڑ لیتی ہیں۔ فرمایا "اسے کھول دو" "تم میں سے ہر شخص اس وقت تک نماز پڑھے جب تک وہ اپنے اندر چستی پاتا ہو جب وہ سستی محسوس کرے یا اکتا جائے تو اسے چاہئے کہ سو جائے"۔ (بخاری و مسلم)

(س) حتی المقدور تہجد کی نماز پر پابندی کرنا: حضرتِ عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "تم اتنا ہی عمل کرو جتنے کی تم اپنے اندر طاقت پاتے ہو۔ اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ اس وقت تک نہیں اکتاتا جب تک تم خود نہیں اکتا جاتے"۔ (بخاری و مسلم)

حضرتِ عائشہؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سے سوال کیا گیا کہ "اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پیارا عمل کون سا ہے؟ فرمایا "وہ جس پر پابندی کی جائے، اگرچہ وہ مقدار میں کم ہو"۔ (بخاری و مسلم)

حضرتِ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ان سے فرمایا "اے عبداللہؓ! تم اس شخص کی مانند نہ ہو جاؤ جو رات کو نماز پڑھا کرتا تھا پھر اس نے نماز چھوڑ دی"۔ (بخاری و مسلم)

۴- وقت

تہجد کی نماز کا کوئی وقت معین نہیں ہے۔ عشاء کی نماز کے بعد سے طلوع فجر تک ہر

وقت یہ نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں "ہم رات کے جس حصے میں چاہتے نبی ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھ لیتے، ہم جب چاہتے آپ کو نماز میں کھڑے دیکھ لیتے۔ آپ ﷺ مہینے میں روزہ رکھتے یہاں تک کہ ہم کہتے کہ اب اس مہینے کا کوئی دن بغیر روزہ کے نہ رہنے دیں گے۔ آپ روزہ چھوڑتے تو ہم کہتے کہ اب آپ ﷺ اس مہینہ میں کوئی روزہ نہیں رکھیں گے"۔ (بخاری، احمد، نسائی)

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں "نبی ﷺ کے تہجد کا کوئی معین وقت نہیں تھا۔ اپنی آسانی کے لحاظ سے جب آپ نماز پڑھنا چاہتے، پڑھ لیتے"۔

لیکن افضل یہ ہے کہ تہجد کی نماز رات کے آخری تہائی حصے میں پڑھی جائے:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب رات کا تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے تو ہمارا بزرگ و برتر پروردگار پہلے آسمان پر اترتا اور فرماتا ہے "ہے کوئی میرے حضور دعا کرنے والا کہ میں اس کی دعا قبول کروں؟ ہے کوئی سوال کرنے والا کہ میں اس کا سوال پورا کروں' ہے کوئی بخشش چاہنے والا کہ میں اسے بخش دوں"۔

(بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "میرے نزدیک سب سے محبوب روزہ داؤد کا روزہ ہے اور میرے نزدیک سب سے محبوب نماز داؤد کی نماز ہے۔ داؤد نصف رات سوتے تھے اور تہائی رات نماز پڑھتے تھے اور پھر رات کا چھٹا حصہ سوتے تھے' اسی طرح وہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن روزہ نہ رکھتے"۔

(بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ)

۴۔ تعداد رکعات

تہجد کی نماز کی رکعتوں کی کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ کی کوئی تعداد معین نہیں ہے۔ وتر کی ایک رکعت سے بھی تہجد کی نماز ہو جاتی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ہمیں رات کی نماز کا حکم دیا اور اس کی ترغیب دیتے ہوئے ہمیں فرمایا "تمہیں چاہئے کہ رات کی نماز پڑھو، خواہ ایک ہی رکعت"۔ (طبرانی)

حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ہمیں رات کو خواہ کم یا زیادہ نماز

پڑھنے کا حکم دیا، اس طرح کہ سب سے آخر میں وتر ہو"۔ (طبرانی، بزار)

البتہ افضل یہ ہے کہ گیارہ رکعتوں (مع وتر) پر پابندی کی جائے، متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ زیادہ تر گیارہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ یوں حضور ﷺ سے تیرہ، نو اور سات رکعتیں بھی ثابت ہیں۔

حضرتِ عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ عشاء کی نماز اور طلوع فجر کے درمیان گیارہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ ہر دو رکعتوں کے بعد سلام پھیرتے اور آخر میں ایک رکعت وتر پڑھتے"۔ (بخاری و مسلم)

حضرت عائشہؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ رمضان میں یا غیر رمضان میں کبھی گیارہ رکعتوں سے زیادہ نماز نہ پڑھا کرتے تھے"۔ (بخاری و مسلم)

اس حدیث میں حضرت عائشہؓ نے نبی ﷺ کا زیادہ تر معمول بیان کیا ہے ورنہ خود حضرت عائشہؓ ہی سے تیرہ، نو اور سات رکعتوں کی روایات بھی ثابت ہیں۔

ایک روایت میں آپؓ فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ رات کو تیرہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ ان میں سے پانچ رکعتیں وتر کی ہوتیں اور ان میں حضور ﷺ آخری رکعت سے پہلے کسی رکعت میں نہ بیٹھتے تھے"۔ (بخاری و مسلم)

حضرت مسروقؒ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے نبی ﷺ کی رات کی نماز کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا "فجر کی سنتوں کے علاوہ سات رکعتیں، نو رکعتیں اور گیارہ رکعتیں"۔ (بخاری)

تہجد کی نماز میں سات سے کم رکعتیں نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہیں، افضل یہ ہے کہ رات کی نماز دو دو رکعتیں کر کے پڑھی جائے۔ زیادہ تر احادیث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ رات کی نماز میں ہر دو رکعتوں کے بعد سلام پھیرا کرتے تھے جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی اوپر والی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس نے نبی ﷺ سے دریافت کیا "رات کی نماز کیسے ہے" فرمایا "رات کی نماز کی دو دو رکعتیں ہیں، جب تمہیں صبح کا اندیشہ ہو تو ایک رکعت وتر پڑھو(۱)"۔ (بخاری، مسلم، احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، نسائی، مؤطا)

---

(۱) نبی ﷺ کے اس حکم کی بناء پر امام مالکؒ کے نزدیک رات کی نماز کا دو دو رکعتیں کر کے پڑھنا ضرور ہے۔ دوسرے اسے افضل مانتے ہیں۔ ﷺ (نیل الاوطار ج ۳ ص ۳۷)

بعض دوسری روایات میں چار چار رکعتیں بھی نبی علیہ السلام سے ثابت ہیں۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام رمضان میں یا غیر رمضان میں گیارہ رکعتوں سے زیادہ نماز نہ پڑھا کرتے تھے۔ پہلے آپ چار رکعتیں پڑھتے جو نہایت عمدہ اور لمبی ہوتیں۔ پھر آپ چار رکعتیں پڑھتے، جو نہایت عمدہ اور لمبی ہوتیں پھر آپ تین رکعتیں (وتر کی) پڑھتے"۔ (بخاری و مسلم)

۵- قرآت

رات کی نماز میں قرآت جہراً (بلند آواز سے) بھی کی جا سکتی ہے اور سراً (پست آواز سے) بھی لیکن افضل یہ ہے کہ آواز درمیانی ہو، نہ بہت بلند اور نہ بالکل پست:

حضرت عائشہؓ سے سوال کیا گیا کہ رات کے وقت نبی علیہ السلام کی قرآت کیسی ہوا کرتی تھی؟ فرمایا "نبی علیہ السلام کی قرآت سب طرح کی ہوتی تھی۔ کبھی آپ کی آواز بلند ہوتی اور کبھی پست"۔ (ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، احمد)

حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا "آپ کے پاس سے گزرا دیکھا کہ آپ پست آواز سے قرآن پڑھ رہے ہیں"۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا "جس ذات سے میں سرگوشی کر رہا تھا، اسے میں نے سنا دیا" فرمایا "اپنی آواز کو قدرے بلند کیجئے"۔ پھر حضور علیہ السلام نے حضرت عمرؓ سے فرمایا "میں آپ کے پاس سے گزرا، دیکھا کہ آپ بلند آواز سے قرآن پڑھ رہے ہیں"۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا "میں اونگھتے کو جگاتا ہوں اور شیطان کو بھگاتا ہوں"۔ فرمایا "اپنی آواز کو قدرے پست کیجئے"۔ (ابوداؤد، ترمذی)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام کی آواز اتنی ہوتی تھی کہ جب آپ گھر میں نماز پڑھ رہے ہوتے تو کمرے والے سن سکتے"۔ (ابوداؤد)

۶- قضا

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ اگر کبھی نبی علیہ السلام کی رات کو نماز رہ جاتی تو آپ علیہ السلام دن میں بارہ رکعتیں پڑھ لیتے"۔ (مسلم)

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا "جو شخص اپنے مقرر کئے ہوئے وظیفہ (نماز تہجد وغیرہ) اس کے کچھ حصہ سے سوتا رہا جائے اور اسے فجر اور ظہر کی نماز کے درمیان پڑھ لے تو اس کے لئے ایسا ہی لکھ دیا جاتا ہے گویا اس نے رات ہی کو اپنا وظیفہ پڑھا"۔ (مسلم، احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، نسائی)

تراویح یا قیامِ رمضان

ا- حکم

تراویح یا قیامِ رمضان سب کے نزدیک مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے سنتِ مؤکدہ ہے۔ (۱)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک رات مسجد میں نماز پڑھی تو بہت سے لوگ آپ ﷺ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ دوسری رات آپ ﷺ نے نماز پڑھی تو لوگ اور زیادہ ہو گئے پھر تیسری یا چوتھی رات لوگ جمع ہو گئے تو نبی ﷺ باہر تشریف نہ لائے جب صبح ہوئی تو فرمایا "میں نے رات دیکھ لیا تھا کہ تم لوگ جمع ہوئے ہو لیکن مجھے صرف ایک چیز نے باہر آنے سے روک دیا اور وہ یہ کہ یہ نماز تم پر فرض نہ کر دی جائے' یہ قصہ رمضان میں پیش آیا تھا"۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، احمد، مالک)

مردوں کی طرح عورتوں کے لئے بھی تراویح کی نماز سنت ہے۔ حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ وہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "اے اللہ کے رسول اللہ ﷺ! آج رات میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا" اس وقت رمضان کا مہینہ تھا۔ فرمایا "اے ابی! وہ کیا؟" انہوں نے عرض کیا "میرے گھر میں چند عورتوں نے مجھ سے کہا" آج ہم قرآن نہیں پڑھیں گے 'آپ کے ساتھ نماز پڑھیں گے تو میں نے انہیں آٹھ رکعتیں پڑھائیں۔ پھر وتر پڑھے" تو نبی ﷺ نے کچھ نہ فرمایا۔ گویا آپ ﷺ نے اس سنت پر رضا مندی ظاہر فرما دی۔ (طبرانی، ابو یعلیٰ)

حضرت عرفجہؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ رمضان کی راتوں میں نماز کا حکم دیتے تھے۔ مردوں کے لئے الگ امام مقرر کرتے اور عورتوں کے لئے الگ میں عورتوں کا امام ہوتا تھا۔

---

(۱) الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱' ص ۳۴۰

۲- فضیلت

قیام رمضان کی بڑی فضیلت ہے- حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ لوگوں کو رمضان کی راتوں میں نماز پڑھنے کی ترغیب دلاتے تھے- بغیر اس کے کہ آپ انہیں عزیمت (وجوب اور پابندی) کا حکم دیتے، آپ فرمایا کرتے "جس شخص نے ایمان کے ساتھ اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مندی چاہتے ہوئے رمضان کا قیام کیا اس کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے- (بخاری، مسلم، احمد، مالک، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

۳- وقت

تراویح کا وقت عشاء کی نماز کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور طلوع فجر تک باقی رہتا ہے لیکن اس کا رات کے آخری حصہ میں پڑھنا افضل ہے 'بہتر یہ ہے کہ وتر سب سے آخر میں پڑھے جائیں لیکن جو شخص شروع رات میں وتر پڑھ لے اور آخری رات میں پھر تراویح کی نماز پڑھنا چاہے تو وہ پڑھ سکتا ہے"-

بغیر اس کے کہ آخر میں دوبارہ وتر پڑھے اس لئے کہ ایک رات میں دو مرتبہ وتر نہیں ہیں- (مفصل بحث وتر کے باب میں گزر چکی ہے)-

۴- رکعات

تراویح کی رکعتوں کی کوئی تعداد معین نہیں ہے- البتہ نبی ﷺ کی سنت بعض روایات کے مطابق آٹھ رکعت (علاوہ وتر) اور ایک روایت کے مطابق بیس رکعت (علاوہ وتر) ہے- ذیل میں ہم دونوں قسم کی روایات کو نقل کرتے ہیں-

۱- حضرتِ عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ رمضان یا غیر رمضان میں گیارہ رکعتوں (مع وتر) سے زیادہ نماز نہ پڑھا کرتے تھے- (بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے تین رات لوگوں کو آٹھ رکعت نماز پڑھائی اور پھر وتر پڑھائے- پھر اگلی (یعنی چوتھی) رات لوگوں نے آپؐ کا انتظار کیا مگر آپؐ باہر تشریف نہ لائے- (طبرانی، ابن خزیمہ، ابن حبان، محمد بن نصر)

۲- حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ رمضان میں جماعت سے الگ بیس رکعت نماز پڑھا کرتے تھے-

حضرت عمرؓ کے متعلق ایک روایت میں ہے کہ انھوں نے حضرت ابی بن کعبؓ اور تمیم داریؓ کو حکم دیا کہ لوگوں کو گیارہ رکعت (مع وتر) نماز پڑھائیں۔ (موطا امام مالکؒ) دوسری روایت میں گیارہ کے بجائے اکیس رکعتوں کا ذکر ہے۔ (محمد بن نصر) تیسری روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں لوگ تراویح کی تیرہ رکعتیں (مع وتر) پڑھا کرتے تھے۔ (محمد بن نصر) چوتھی قسم کی کئی روایتوں میں بیس (علاوہ وتر) یا تیئس (مع وتر) رکعتوں کا ذکر ہے۔ (موطا امام مالک، محمد بن نصر، بیہقی)

اس کے بعد زیادہ تر بیس رکعتوں (علاوہ وتر) کا رواج رہا۔ بعض دوسرے صحابہؓ اور تابعین سے ۱۶-۲۴-۲۸-۳۴-۳۶-۴۰ رکعتوں (علاوہ وتر) کے پڑھنے کی بھی روایات ملتی ہیں[1]۔ (عمدۃ القاری، نیل الاوطار)

---

(۱) حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک تراویح میں بیس رکعتیں (علاوہ وتر) سنت ہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے (آخرکار) اسی تعداد پر لوگوں کو جمع کیا، دوسرے صحابہؓ نے اس پر ان سے اتفاق کیا اور بعد کے خلفائے راشدین میں سے کسی نے اس کی مخالفت نہ کی۔ نیز حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا روایت بھی جو اگرچہ سند کے لحاظ سے کمزور ہے اس وجہ سے صحیح حدیث کے حکم میں آجاتی ہے کہ بعد میں امت نے اسے عملاً قبول کر لیا۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں "تراویح سنت مؤکدہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے (اس میں بیس رکعتوں کو) اپنی طرف سے جاری نہیں فرمادیا۔ آپ نے ان کا جو حکم دیا تو آپ کے سامنے نبی ﷺ کی طرف سے کوئی نہ کوئی اصل ضرور ہو گی" امام سفیانؒ اور عبداللہ مبارک کا مسلک بھی بیس رکعتوں (علاوہ وتر) ہی کا ہے۔ (التعلیق الصبیح)۔

امام احمد حنبلؒ نے تراویح کی رکعتوں کی کوئی تعداد متعین نہیں کی وہ فرماتے ہیں اس بارے میں مختلف قسم کی روایات آئی ہیں۔ امام مالکؒ کا اپنے لئے اختیار کردہ مسلک گیارہ رکعتوں (مع وتر و شفع) کا تھا لیکن ان کے ہاں بھی ہر تعداد کی گنجائش تھی"۔ وہ فرماتے ہیں "ہمارے ہاں مدینہ میں ۳۹ رکعتیں (مع وتر) اور مکہ میں ۲۳ رکعتیں (مع وتر) پڑھی جاتی ہیں اور ان میں سے ہر چیز کی گنجائش ہے"۔

محدثین حضرت ابن عباسؓ کی روایت جس میں نبی ﷺ کے بیس رکعتیں نماز پڑھنے کا ذکر ہے کو سند کے کمزور ہونے کی وجہ سے قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔ ان کا مسلک یہی ہے کہ نبی ﷺ کی سنت آٹھ رکعتوں ہی کی ہے۔ البتہ اس سے زائد جو بھی رکعتیں پڑھی جائیں گی۔ وہ سب صحیح اور مستحب ہوں گی۔ حافظ ابن حجرؒ حضرت عمرؓ کے متعلق مختلف روایات کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں ان تمام روایات کو یوں جمع کیا جا سکتا ہے کہ مختلف حالات کے لحاظ سے لوگوں کی رکعتوں کی تعداد مختلف ہوا کرتی تھی۔

(فتح الباری بحوالہ تحفۃ الاحوذی)

۵- جماعت

تراویح کی نماز کا جماعت سے پڑھنا بھی جائز ہے تنہا بھی، لیکن اس کا مسجد میں باجماعت نماز پڑھنا مستحب ہے- نبی ﷺ نے صحابہ کو تین راتیں باجماعت نماز پڑھائی اور چوتھی رات آپ صرف اس اندیشہ سے باہر تشریف نہیں لائے کہ کہیں تراویح کی نماز بھی مسلمانوں پر فرض نہ کر دی جائے- پھر لوگ مسجد میں یا اپنے گھروں میں فردا فردا نماز پڑھتے رہے' یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں پھر انہیں مسجد میں ایک امام کے پیچھے جمع کر دیا کیونکہ اب تراویح کے فرض ہو جانے کے اندیشہ نہیں رہا تھا- حضرت عبدالرحمن بن عبدالقاریؒ سے روایت ہے کہ رمضان کی ایک رات میں حضرت عمرؓ کے ساتھ مسجد آیا تو دیکھا کہ لوگ علیحدہ علیحدہ نماز پڑھ رہے ہیں- کوئی تنہا نماز پڑھ رہا ہے اور کسی کے ساتھ چند دوسرے لوگ بھی شامل ہیں- حضرت عمرؓ نے فرمایا "میرا خیال ہے کہ اگر میں ان سب کو ایک امام کے پیچھے جمع کر دوں تو یہ بہتر ہوگا- پھر انہوں نے سب کو حضرت ابی بن کعبؓ کے پیچھے جمع کر دیا- ایک روایت میں ہے میں حضرت عمرؓ کے ساتھ پھر مسجد میں آیا تو دیکھا کہ لوگ اپنے قاری کے پیچھے باجماعت نماز پڑھ رہے ہیں- حضرت عمرؓ نے فرمایا "یہ نیا طریقہ کتنا اچھا ہے، رات کے جس حصے میں یہ سوتے ہیں (یعنی آخری حصہ) وہ اس سے بہتر ہے جس میں یہ نماز پڑھتے ہیں (یعنی شروع کا حصہ) اور لوگ شروع رات میں نماز پڑھا کرتے تھے- (بخاری، ابن خزیمہ، بیہقی) (۱)

۶- قرآت

تراویح میں قرآت کے متعلق کوئی چیز نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے- البتہ موطا امام مالکؒ میں سائب بن یزیدؒ کی روایت سے کہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں امام سو

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک تراویح کی جماعت پوری بستی والوں کے لئے سنت کفایہ ہے یعنی اگر چند لوگ باجماعت نماز پڑھ لیں تو دوسروں سے اس سنت کا مطالبہ ختم ہو جاتا ہے- مالکیہ کے نزدیک تراویح میں جماعت مستحب ہے- شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک تراویح کی جماعت سب کے لئے سنت ہے- اگرچہ لوگ جماعت سے نماز پڑھ لیں تو دوسروں سے سنت ساقط نہیں ہو جاتی- (الفقہ ج ۱ص ۴۴۱)

البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک اگر انسان خود قاری (قرآن کا حافظ اور عالم) ہو، تو اس کا تنہا نماز پڑھنا بہتر ہے- (ترمذی)

سو آیتیں پڑھتا تھا- یہاں تک کہ مقتدی لکڑیوں پر سہارا لگاتے اور اور فجر کے قریب نماز سے فارغ ہوتے (یہ روایت اوپر گذر چکی ہے)-

گویا اس کا انحصار پڑھنے والوں کی اپنی سہولت اور طاقت پر ہے(۱)-

۷- استراحت

تراویح کی نماز کا دو دو رکعت کر کے پڑھنا افضل ہے کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے "رات کی نماز دو دو رکعتیں کر کے ہے"- (بخاری، مسلم) صحابہؓ کرام بھی دو دو رکعتیں کر کے تراویح کی نماز پڑھا کرتے تھے-(۲)

ہر چار رکعت کے بعد کچھ دیر ٹھہر کر نماز کا شروع کرنا مستحب ہے کیونکہ صحابہ کرام ایسا کیا کرتے تھے اور اسی وجہ سے اس نماز کا نام تراویح رکھا گیا ہے-

---

(۱) مالکیہ، حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک رمضان میں قرآن کا ایک بار ختم کرنا مسنون ہے- الا یہ کہ مقتدی اس کی طاقت نہ رکھتے ہوں- اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے- (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۴۳)

(۲) مالکیہ کے نزدیک دو رکعت کے بعد سلام پھیرنا ضروری ہے ورنہ نماز صحیح نہیں ہوگی، دوسروں کے نزدیک ایسا کرنا بہتر ہے- (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۴۳)

صلوۃ العیدین

(عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی نماز)

عید کی نماز حنفیہ کے نزدیک واجب ہے، حنبلیہ کے نزدیک فرض کفایہ مالکیہ اور شافعیہ (اور اہل حدیث علماء) کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے(۱) جس کی ابتدا نبی ﷺ نے اھ یا ۲ھ میں فرمائی اور اس کے بعد ہر سال اس کی پابندی کی اور اس کی تاکید فرمائی۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب مکہ سے مدینہ پہنچے، تو آپ نے دیکھا کہ یہاں کے لوگوں نے سال میں دو دن کھیلنے اور تفریح کرنے کے لئے مقرر کر رکھے ہیں۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا یہ دونوں دن کیسے ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ جاہلیت میں ہم ان میں کھیلتے اور خوشیاں منایا کرتے تھے۔ فرمایا "اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان دو دنوں کو ان سے بہتر دو دنوں سے بدل دیا ہے۔ ایک عید الفطر کا دن اور دوسرا عید الاضحیٰ کا دن"۔ (ابو داؤد)

عید کے روز جائز حدود کے اندر کھانا پینا کھیلنا اور خوشی منانا سب کے نزدیک مستحب ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے "ایک عید کے روز حبشی لوگ نبی ﷺ کے پاس کھیل رہے تھے۔ میں حضور ﷺ کے مونڈھے کے اوپر سے جھانک کر دیکھنے لگی تو آپ نے اپنے مونڈھے کو نیچا کر لیا، تو آپ کے مونڈھے کے اوپر سے دیکھتی رہی، یہاں تک کہ میرا جی بھر گیا اور میں پلٹ گئی"۔ (بخاری، مسلم، احمد)

ذیل میں ہم اس نماز کے چند ضروری مسائل کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ عید کے روز غسل کرنا، خوشبو لگانا اور خوبصورت کپڑے پہننا مستحب ہے

جعفر بن محمد اپنے والد کے واسطے سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ ہر روز عید کے روز اپنی حبری چادر (یمن کی ایک عمدہ چادر) پہنا کرتے تھے۔ (شافعیؒ)

نافعؒ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ عید الفطر کے روز عید گاہ جانے سے پیشتر

---

(۱) الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ص ۳۴۸

غسل کیا کرتے تھے۔ (موطا امام مالکؒ)

اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

۲۔ عید الفطر کے روز نماز کو جانے سے پہلے اور عید الاضحیٰ کے روز نماز سے واپسی کے بعد کھانا

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ عید الفطر کے روز نبی ﷺ اس وقت تک نماز کے لئے نہیں نکلا کرتے تھے، جب تک آپ ﷺ چند کھجوریں نہ کھا لیتے اور آپ طاق (۱، ۳، ۵، ۷ ---) تعداد میں کھجوریں کھایا کرتے تھے"۔ (احمد، بخاری)

حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ عید الفطر کے روز نبی ﷺ اس وقت تک نماز کے لئے نہ نکلا کرتے تھے جب تک کہ آپ ﷺ کچھ کھا نہ لیں اور عید الاضحیٰ میں آپ اس وقت تک کچھ نہ کھاتے تھے جب تک آپ ﷺ واپس نہ آجائیں۔ (ترمذی، ابن ماجہ، احمد) مسند احمد میں یہ الفاظ زیادہ ہیں۔ آپ ﷺ قربانی کے گوشت میں سے کھایا کرتے تھے"۔

۳۔ نماز عید کا شہر سے باہر جا کر میدان میں ادا کرنا

مسنون یہ ہے کہ نماز عید شہر سے باہر نکل کر میدان میں ادا کی جائے' نبی ﷺ مدینہ منورہ سے باہر نکل کر مصلیٰ (عید گاہ) میں نماز عید ادا فرمایا کرتے تھے، البتہ اگر بارش ہوتی تو مسجد ہی میں نماز پڑھ لیتے:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ عید کے روز بارش ہو رہی تھی تو نبی ﷺ نے لوگوں کو مسجد ہی میں عید کی نماز پڑھائی"۔ (ابو داؤد، نسائی)

اکثر ائمہ جن میں (امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ شامل ہیں) کے نزدیک عید کا بلا عذر مسجد میں پڑھنا مکروہ ہے۔(۱)

۴۔ عید گاہ کی طرف پیدل جانا

حضرت علیؓ فرماتے ہیں سنت یہ ہے کہ عید گاہ کی طرف پیدل جایا جائے اور نکلنے سے پہلے کوئی چیز کھالی جائے"۔ (ترمذی)

---

(۱) شافعیہ کے نزدیک نماز عید کا مسجد میں ادا کرنا بہتر ہے۔ الا یہ کہ مسجد تنگ ہو تو شہر سے باہر نکلا مسنون ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۱۷)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ عید گاہ کی طرف پیدل جایا کرتے تھے (۱)"۔ (ابن ماجہ)

۵- عید گاہ جاتے وقت بلند آواز سے تکبیر کہنا

حضرت ابن عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ "جب وہ عید گاہ کی طرف نکلتے تو بلند آواز سے تکبیر کہتے"۔ دوسری روایت میں ہے "عید الفطر کے روز جب سورج نکل آتا تو آپ عید گاہ کی طرف نکلتے اور تکبیر کہتے، یہاں تک کہ آپ عید گاہ پہنچ جاتے۔ پھر آپ عید گاہ میں تکبیر کہنا بند کر دیتے"۔ (شافعیؒ)

اس بارے میں بعض مرفوع احادیث بھی ہیں، جو اگرچہ کمزور ہیں لیکن ان کی کثرتِ تعداد کی بنا پر عید گاہ جاتے وقت اور عید گاہ کے اندر تکبیر کہنا سب کے نزدیک مستحب ہے۔(۲)

۶- عید گاہ جاتے اور آتے وقت راستہ تبدیل کرنا

عید گاہ کو ایک راستہ سے جانا اور دوسرے راستہ سے واپس آنا مستحب ہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ عید کے روز نبی ﷺ عید گاہ جاتے اور واپس آتے وقت راستہ تبدیل فرمایا کرتے تھے"۔ (بخاری)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب عید گاہ تشریف لے جاتے تو راستہ تبدیل کر کے دوسرے راستہ سے واپس تشریف لاتے تھے"۔ (مسلم، احمد، ترمذی)

اس بارے میں سب کا اتفاق ہے۔

۷- عید کی نماز میں عورتوں اور بچوں کا شریک ہونا

مردوں کے علاوہ عورتوں کا بھی عید گاہ جا کر نماز میں شریک ہونا مسنون ہے:

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں عید الفطر یا عید الاضحیٰ کے روز نبی ﷺ کے

---

(۱) یہ دونوں حدیثیں اگرچہ سند کے لحاظ سے کمزور ہیں لیکن بہت سی دوسری احادیث سے مل کر قوی ہو جاتی ہیں چنانچہ عید گاہ کی طرف پیدل جانا سب کے نزدیک مستحب ہے۔ (الفقہ ۔۔۔ ج ۱ ص ۳۱۷)

(۲) مالکیہ کے نزدیک اگر سورج نکلنے سے پہلے عید گاہ کی طرف نکلا جائے تو اس وقت تک تکبیر نہیں کہی جائے گی جب تک کہ سورج نکل نہ آئے۔ حنفیہ کے نزدیک تکبیر کا پست آواز سے کہنا افضل ہے۔

(الفقہ ج ۱ ص ۳۱۷)

ساتھ گیا- آپ ﷺ نے نماز پڑھائی اور پھر خطبہ دیا- اس کے بعد آپ عورتوں کی طرف تشریف لائے اور انہیں وعظ و نصیحت فرمائی اور انہیں صدقہ کا حکم دیا"- (بخاری)

حضرت ام عطیہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے روز ہم چھوٹی بچیوں، جوان گھونگھٹ والیوں اور حائضہ عورتوں کو بھی عید گاہ لے جائیں البتہ حائضہ عورتیں نماز سے (اور دوسری روایت میں ہے، نماز کی جگہ سے) الگ رہیں گی اور خیر اور مسلمانوں کی دعا میں شریک ہوں گی"- میں نے عرض کیا یارسول اللہ! بعض عورتیں ایسی بھی ہیں جن کے پاس چادر نہیں ہوتی "فرمایا جس عورت کے پاس چادر نہ ہو، ---اس کی بہن کو چاہئے کہ اسے اپنی چادر میں لے لے- (بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، ترمذی، احمد)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ عید کے روز نبی ﷺ اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو عید گاہ لے جایا کرتے تھے- (ابن ماجہ)

۸- عید کی نماز کا وقت

عید کی نماز کا وقت سورج کے تقریباً ڈیڑھ دو گز بلند ہو جانے سے شروع ہو جاتا ہے- اس بارے میں سب سے صحیح حدیث حضرت جندبؓ کی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں "عید الفطر کی نماز نبی ﷺ ہمیں اس وقت پڑھاتے تھے جبکہ سورج دو نیزوں کے برابر بلند ہو چکتا تھا اور عید الاضحیٰ کی نماز اس وقت پڑھاتے تھے جبکہ سورج ایک نیزے کے برابر بلند ہو چکتا تھا(۱)-" (احمد بن حسن البناء)

عید الفطر میں نماز کا دیر سے اور عید الاضحیٰ میں اس کا جلدی پڑھنا مستحب ہے (۲) جیسا

---

(۱) حضرت ام عطیہؓ کی روایت کی وجہ سے حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ اور علیؓ کے نزدیک عورتوں کا عید گاہ جانا ضروری ہے لیکن اکثر صحابہ اور ائمہ کے نزدیک یہ سنت ہے- امام احمدؒ کے نزدیک عورتوں کے لئے عید گاہ جانا مستحب نہیں ہے لیکن انہیں اس کی اجازت ہے- امام شافعیؒ، عبد اللہ بن مبارکؒ، مالکؒ اور ابو یوسفؒ کے نزدیک عورتوں کا عید گاہ جانا مکروہ ہے- حنفیہ کا عام مسلک یہی ہے- وہ عورتوں کے عید گاہ جانے کو منسوخ مانتے ہیں کیونکہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں" اس زمانے میں عورتوں نے جو نئے نئے کام شروع کئے ہیں، اگر انہیں رسول اللہ ﷺ دیکھ لیتے تو انہیں مسجد میں جانے سے منع فرما دیتے، جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کر دیا گیا تھا- (ترمذی، سبل السلام ج ۲ ص ۷۶)

(۲) شافعیہ کے نزدیک سورج کے طلوع ہوئے سے عید کی نماز کا وقت شروع ہو جاتا ہے لیکن اس کا سورج کے ایک نیزے کے بلند ہو جانے تک موخر کرنا مسنون ہے- (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۰۹)

(۳) مالکیہ کے نزدیک عید الفطر اور عید الاضحیٰ دونوں میں نماز کا اول وقت سے موخر کرنا مسنون نہیں ہے- (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۰۹)

کہ مندرجہ ذیل بالا حدیث سے بھی ظاہر ہے۔ نیز امام شافعیؒ نے اپنی مسند میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت عمرو بن حزمؓ کو جبکہ وہ نجران میں تھے یہ خط لکھا کہ عید الاضحیٰ کی نماز جلد پڑھاؤ اور عید الفطر کی نماز دیر سے، اور اس کے بعد لوگوں کو وعظ و نصیحت کرو۔ (یعنی خطبہ دو)

عید کی نماز کا وقت سورج کے زوال کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے اس بارے میں کسی اختلاف نہیں ہے۔

۹۔ عید کی نماز میں کوئی اذان یا اقامت نہیں ہے

حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے بارہا نبی ﷺ کے پیچھے عید کی نماز بغیر کسی اذان یا اقامت کے پڑھی ہے"۔ (احمد، مسلم، ابو داؤد، ترمذی)

حضرت ابن عباسؓ اور جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے زمانے میں (عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عید کی نماز کے لئے کوئی اذان نہیں کہی جاتی تھی"۔ (بخاری و مسلم)

البتہ عید کی نماز سے پہلے "الصلوۃ جامعۃ" کہہ کر پکارنا مستحب ہے۔ امام شافعیؒ زہریؒ سے مرسلاً روایت کرتے ہیں کہ عیدین کے روز نبی ﷺ مؤذن کو حکم دیتے تھے اور وہ الصلوۃ جامعۃ کہہ کر پکارا کرتا تھا(۱)۔

۱۰۔ عید کی نماز سے پہلے یا بعد کوئی سنتیں نہیں ہیں

نماز عید سے پہلے یا بعد میں کوئی سنت نماز نہ نبی ﷺ سے ثابت ہے اور نہ صحابہ کرام سے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک عید کے روز نبی ﷺ عید گاہ تشریف لے گئے۔ آپ نے دو رکعت نماز (نماز عید) پڑھی۔ آپ نے نہ اس سے پہلے کوئی نماز پڑھی اور نہ بعد میں"۔ (بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، احمد)

حضرت ابن عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ آپ عید کے روز عید گاہ آئے تو آپ نے عید کی نماز باجماعت سے پہلے کوئی نماز پڑھی اور نہ بعد میں۔ اس کے بعد آپ نے لوگوں کو بتایا کہ نبی ﷺ نے بھی ایسا ہی فرمایا تھا"۔ (احمد، ترمذی)

---

(۱) یہ حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کا مسلک ہے۔ مالکیہ کے نزدیک ایسا کرنا مستحب نہیں صرف جائز ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۱۰)

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں "امام شافعیؒ کی مذکورہ روایت مرسل ہے اور اگر عید کی نماز کو استسقاء کی نماز پر قیاس کیا جائے تو اس کی تائید ہوتی ہے۔ (یعنی الصلوۃ جامعۃ کہنا جائز ہے)۔

اس چیز پر سب کا اتفاق ہے کہ عید کی نماز سے پہلے یا بعد میں کوئی سنت نماز نہیں ہے، رہے عام نوافل، تو ان کی ممانعت میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے- چنانچہ ان کا پڑھنا جائز ہے، الا یہ کہ انہیں ایسے وقت میں پڑھا جائے جبکہ تمام باقی دنوں میں نوافل کا پڑھنا ناجائز ہے جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں- بہت سے صحابہ کرامؓ سے نماز عید سے پہلے اور بعد میں عام نوافل کا پڑھنا ثابت ہے"- (ترمذی)

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نماز عید سے پہلے کوئی نماز نہ پڑھا کرتے تھے، لیکن جب آپ گھر واپس تشریف لاتے، تو دو رکعت نماز پڑھتے (۱)- (ابن ماجہ)

۱۱- نماز عید کی رکعتیں اور ان میں قرآت

یہ چیز قطعی طور پر ثابت ہے کہ عید کی نماز کی دو رکعتیں ہیں جن میں سورہ فاتحہ کے ساتھ قرآن کا ہر حصہ پڑھا جا سکتا ہے، لیکن مستحب یہ ہے کہ وہ سورتیں پڑھی جائیں جنہیں نبی ﷺ خود پڑھا کرتے تھے:

حضرت سمرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ عیدین کی نماز میں سورہ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی اور هَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَة پڑھا کرتے تھے"- (احمد)

حضرت ابو واقد لیثیؓ سے حضرت عمرؓ نے دریافت فرمایا کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی نماز میں نبی ﷺ کیا پڑھا کرتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا "آپ ان میں سورہ "ق" اور اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ (۲)" پڑھا کرتے تھے-(مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، احمد)

---

(۱) مالکیہ کے نزدیک اگر نماز عید میدان میں پڑھی جائے تو اس سے پہلے اور بعد میں نوافل کا پڑھنا مکروہ ہے اور اگر خلاف سنت طریقہ پر مسجد میں پڑھی جائے تو اس سے پہلے اور بعد میں نوافل کا پڑھنا مکروہ نہیں ہے، حنابلہ کے نزدیک عید کی نماز سے پہلے اور بعد میں نوافل کا پڑھنا مکروہ ہے، خواہ نماز کہیں پڑھی جائے،- شافعیہ کے نزدیک امام کے لئے عید کی نماز سے پہلے اور بعد میں نوافل کا پڑھنا مکروہ ہے لیکن جو نمازی خطبہ نہ سن سکتا ہو تو اس کے لئے نماز سے پہلے اور بعد میں نوافل کا پڑھنا مکروہ نہیں ہے- حنفیہ کے نزدیک نماز عید سے پہلے ہر جگہ نوافل کا پڑھنا مکروہ ہے- البتہ نماز کے بعد صرف عید گاہ میں نوافل کا پڑھنا مکروہ ہے، گھر پر نہیں-(الفقہ---ج ۱ ص ۳۱۸)

(۲) حنفیہ کے نزدیک پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلی اور دوسری هل اتک پڑھنا مستحب ہے- حنابلہ کے نزدیک پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلی اور دوسری میں سورہ غاشیہ پڑھنا مستحب ہے- مالکیہ کے نزدیک پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلی اور دوسری میں سورہ غاشیہ پڑھنا مستحب ہے- شافعیہ کے نزدیک پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلی اور دوسری میں سورہ والشمس پڑھنا مستحب ہے- شافعیہ کے نزدیک پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلی اور دوسری میں سورہ الکافرون پڑھنا مستحب ہے-

عید کی نماز میں جہری قرآت سنت ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

۱۲- نماز عید کی رکعتوں میں تکبیریں اور ان کی تعداد

نماز عید کی پہلی رکعت میں تکبیر تحریمہ کے علاوہ قرآت سے پہلے سات تکبیریں (اللہ اکبر کہنا) اور دوسری رکعت میں قرآت سے پہلے پانچ تکبیریں سنت ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے عید کی نماز کی پہلی رکعت میں قرآت سے پہلے سات تکبیریں اور دوسری رکعت میں قرآت سے پہلے پانچ تکبیریں کہیں"۔ (ترمذی)

امام ترمذی نے اس روایت کو حسن (اوسط درجہ کی) قرار دیا ہے اور اس کے متعلق امام بخاریؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اس باب میں اس سے زیادہ صحیح کوئی دوسری روایت ثابت نہیں ہے[1] اور اسی پر میرا عمل ہے۔ (العلل المفردۃ الترمذی، نیل الاوطار ج ۳ ص ۲۵۲)

ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین (ہاتھوں کا اٹھانا) نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے البتہ حضرت عمرؓ اور عبداللہ بن عمرؓ سے ایسا کرنے کی روایت ملتی ہے۔[2] (نیل الاوطار)

تکبیروں کے درمیان کوئی ذکر نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔[3]

---

(۱) اس بارے میں سلف کے کل دس مسلک امام شوکانیؒ نے نقل کئے ہیں۔ ان میں پہلا مسلک وہ ہے جو ہم نے اوپر نقل کیا ہے۔ یہ اکثر صحابہ، تابعین اور ائمہ کا مسلک ہے۔ امام شافعیؒ کا مسلک بھی یہی ہے۔
دوسرا مسلک یہ ہے کہ پہلی رکعت میں تکبیر تحریمہ سمیت قرآت سے پہلے سات تکبیریں اور دوسری رکعت میں قرآئت سے پہلے پانچ تکبیریں کہی جائیں۔ یہ امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک ہے۔
تیسرا مسلک یہ ہے کہ پہلی رکعت میں سات تکبیریں اور دوسری میں بھی سات تکبیریں کہی جائیں، یہ حضرت انسؓ، مغیرہ بن شعبہؓ، امام سعید بن مسیبؒ اور ابراہیم نخعیؒ کا مسلک ہے۔
چوتھا مسلک یہ ہے کہ پہلی رکعت میں تکبیر تحریمہ کے بعد اور قرآت سے پہلے تین تکبیریں اور دوسری رکعت میں قرآت کے بعد اور رکوع سے پہلے تین تکبیریں کہی جائیں۔ یہ حضرت ابن مسعودؓ، ابو موسیٰؓ، اور ابو مسعود انصاریؓ کا مسلک ہے اور اسی کے قائل امام ثوریؒ اور امام ابو حنیفہؒ ہیں۔ بقیہ مسلکوں کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ (نیل الاوطار ج ۳ ص ۲۵۳، الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۱۱-۳۱۲)

(۲) مالکیہ کے نزدیک تکبیر اولیٰ کے علاوہ دوسری تکبیروں کے ساتھ رفع الیدین مکروہ ہے۔ حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک سنت ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۱۰ تا ۳۱۲)

(۳) جمہور کا مسلک یہی ہے کہ تکبیریں پے درپے کہی جائیں گی اور ان کے درمیان کوئی دعا یا ذکر نہیں کیا جائے گا۔ البتہ امام شافعیؒ، احمد اور عطاء کے نزدیک تکبیروں کے درمیان اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور نبی ﷺ پر درود بھیجنا مستحب ہے اور اسی کی ایک روایت حضرت ابن مسعودؓ سے بھی ہے۔ (شرح مسلم للنووی ج ۱ ص ۲۹۰)

۱۳- عید کا خطبہ

نماز عید کے بعد امام کا لوگوں کو خطبہ دینا مسنون ہے-

حضرت عبداللہ بن سائبؓ سے روایت ہے کہ ایک عید کے روز میں نبی ﷺ کے ساتھ عید گاہ میں رہا- جب آپ نے نماز ختم کی، تو فرمایا "اب ہم خطبہ دیں گے، لہذا جو شخص بیٹھنا چاہے وہ بیٹھ کر خطبہ سنے اور جو شخص جانا چاہے وہ چلا جائے"- (ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ)(۱)

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے روز نبی ﷺ عید گاہ تشریف لے جاتے، سب سے پہلی چیز جس سے آپ ابتدا فرماتے، وہ نماز ہوتی تھی پھر آپ پلٹتے اور لوگوں کے سامنے کھڑے ہو جاتے اور لوگ اپنی صفوں میں بیٹھے رہتے تھے، آپ انہیں وعظ و نصیحت فرماتے اور احکام دیتے(۲) اور اگر کبھی آپ کو کوئی لشکر روانہ کرنا ہوتا، لوگوں کو کسی اور چیز کا حکم دینا ہوتا تو آپ اس کا حکم دیتے اور پھر گھر واپس تشریف لے آتے"- (بخاری و مسلم)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایک عید کے روز میں نبی ﷺ کے ساتھ عید گاہ میں رہا- خطبہ سے پہلے آپ نے بغیر کسی اذان یا اقامت کے نماز پڑھائی- پھر نماز کے بعد بلالؓ کا سہارا لے کر آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور لوگوں کو اللہ سے ڈرتے رہنے کا حکم دیا، اس کی اطاعت پر ابھارا اور انہیں وعظ و نصیحت فرمائی- پھر آپ ﷺ عورتوں کی طرف تشریف لے گئے اور انہیں وعظ و نصیحت فرمائی"- (مسلم، نسائی)

نبی ﷺ کے متعلق تمام صحیح روایات میں یہی ثابت ہے کہ عید کے روز آپ ایک ہی خطبہ دیا کرتے تھے- جمعہ کی طرح دو خطبے نہ دیتے تھے"- البتہ عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہؒ (جو ایک تابعی ہیں) فرماتے ہیں "سنت یہ ہے کہ امام عید کے روز دو خطبے دے اور دونوں کے

---

(۱) خطبہ عید کے سنت ہونے پر سب کا اتفاق ہے، حتیٰ کہ ان کا بھی جو نماز عید کو فرض یا واجب کہتے ہیں، جیسے حنبلیہ اور حنفیہ- (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۱۴، نیل الاوطار ج ۳ ص ۲۵۹)

(۲) حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک سنت یہ ہے کہ امام عید الفطر کے خطبے میں لوگوں کو صدقۃ الفطر کے مسائل بتائے اور عید الاضحیٰ کے خطبے میں قربانی اور آئندہ تین دنوں میں تکبیر کہتے رہنے کے مسائل بتائے- بہتر یہ ہے کہ جو جمعہ یا عید سے پہلے آئے، اس کے خطبہ میں یہ مسائل بیان کر دیئے جائیں- (الفقہ ---ج ۱ ص ۳۱۴)

درمیان بیٹھ کر فصل کرے۔(۱) (شافعی) مذاہب اربعہ میں بھی یہ سنت ہے۔
(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۱۴)

مستحب یہ ہے کہ تمام دوسرے خطبوں کی طرح عید کا خطبہ بھی الحمد للہ کے لفظ سے شروع کیا جائے اور خطبہ کے درمیان کثرت سے اللہ اکبر کہا جائے۔

نبی ﷺ کے موذن حضرت سعدؓ سے روایت ہے کہ "حضور ﷺ خطبہ کے دوران اللہ اکبر فرمایا کرتے تھے اور عیدین کے خطبہ میں کثرت سے اللہ اکبر فرماتے"۔(ابن ماجہ) (۲)

نوٹ : (۱) عید الفطر کے روز صدقۃ الفطر کا بیان کتاب الصیام میں آئے گا۔

(۲) ذی الحجہ کے پہلے دس دنوں کی فضیلت اور عید الاضحیٰ کے بعد ایام تشریق کی فضیلت کا بیان کتاب الحج میں آئے گا۔

---

(۱) امام نوویؒ، امام شوکانی، امام احمد بن اسماعیل الامیر اور دیگر اہل حدیث علماء کا کہنا ہے کہ عید کے روز سنت ایک ہی خطبہ ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں "خطبہ کے مکرر ہونے کے متعلق کوئی چیز ثابت نہیں ہے"۔ امام محمد بن اسماعیل الامیر لکھتے ہیں "شائد جمعہ کی طرح عید کے خطبہ کے دوران امام کا بیٹھنا نبی ﷺ کے عمل سے ثابت نہیں ہے۔ محض جمعہ کے خطبہ پر قیاس کرتے ہوئے لوگوں نے اسے ایجاد کر لیا ہے۔
(سبل السلام ج ۲ ص ۶۷)

(۲) ائمہ اربعہ کے نزدیک عید کے خطبہ میں جب امام اللہ اکبر کہے تو اس کے ساتھ خطبہ سننے والوں کے لئے بھی اللہ اکبر کہنا مستحب ہے۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا عام خطبوں کی طرح عید کا خطبہ بھی "الحمد للہ" سے شروع کیا جائے یا مندرجہ بالا حدیث کی روشنی میں اس کا اللہ اکبر سے شروع کرنا مستحب ہے۔ آئمہ اربعہ کے نزدیک اس کا اللہ اکبر سے شروع کرنا مستحب ہے۔(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۲۰۲) لیکن امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں صحیح بات یہ ہے کہ عید اور استسقاء کا خطبہ بھی الحمد ہی سے شروع کیا جائے، کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے "ہر اہم کام جو اللہ کی حمد سے شروع نہیں کیا جاتا، وہ ناقص ہے اور نبی ﷺ اپنا ہر خطبہ الحمد للہ ہی سے شروع فرماتے تھے۔ باقی رہا بہت سے فقہا کا یہ قول کہ استسقاء کا خطبہ استغفار سے اور عید کا خطبہ تکبیر سے شروع کیا جائے تو حقیقت میں ان کا نبی ﷺ کی سنت کے خلاف ہے۔ سنت یہ ہے کہ ہر خطبہ الحمد للہ سے شروع کیا جائے۔ زاد المعاد)

نمازِ قصر

(مسافر کی نماز)

ا- رباعی (چار رکعتوں والی) نماز میں قصر (اختصار)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (النساء: ۱۰۱)

اور جب تم لوگ سفر کے لئے نکلو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر نماز میں قصر کرو، جب کہ تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے۔

بظاہر اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں قصر صرف "خوف" کے وقت جائز ہے لیکن نبی ﷺ اور صحابہ کرام کا طرز عمل یہی ہے کہ وہ ہر سفر میں (خواہ اس میں خوف ہو یا نہ ہو) قصر فرمایا کرتے تھے۔ حضرت یعلیٰ بن امیہؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر بن خطابؓ سے کہا "کیا وجہ ہے وہ لوگ اب تک سفر میں قصر کئے جا رہے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ صرف یہ فرماتا ہے کہ جب تم لوگ سفر کے لئے نکلو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر نماز میں قصر کرو جب کہ تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے؟ اور آج خوف کی یہ حالت باقی نہیں رہی؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا "جس چیز سے آپ کو تعجب ہوا ہے خود مجھے بھی اس سے تعجب ہوا اور میں نے نبی ﷺ سے اس کا ذکر کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ ایک صدقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے تم پر کیا ہے۔ لہٰذا تم اس کا صدقہ قبول کرو"۔

(بخاری، مسلم، احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ مکہ معظمہ میں نماز کی دو رکعتیں فرض کی گئی تھیں جب نبی ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے ہر دو رکعتوں کے ساتھ دو رکعتوں

کا اضافہ کر دیا سوائے مغرب کی نماز کے، کیونکہ وہ دن کے وتر ہیں اور سوائے صبح کی نماز کے کیونکہ اس کی قرآت لمبی ہوتی ہے لیکن جب حضور ﷺ سفر میں ہوتے تو آپ ﷺ پہلی ہی نماز (یعنی دو دو رکعتیں، جیسا کہ مکہ معظمہ میں فرض کی گئی تھیں)۔ پڑھتے"۔

(احمد، بیہقی، ابن حبان، ابن خزیمہ)

احادیث سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے ہمیشہ سفر میں قصر کیا ہے اور معتبر روایت میں یہ منقول نہیں ہے کہ آپ نے کبھی سفر میں چار رکعتیں پڑھی ہوں۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اور ابو بکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ کے ساتھ سفروں میں رہا ہوں اور کبھی نہیں دیکھا کہ انہوں نے دو رکعتوں سے زیادہ نماز پڑھی ہو"۔

(بخاری، مسلم)

اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔(۱)

اس پر اجماع ہے کہ فجر اور مغرب کی نماز میں قصر نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ قصر کی مسافت

سفر کی کم از کم کتنی مقدار ہے جس میں قصر کیا جا سکتا ہے؟ اس کی تعیین نہ قرآن پاک کی آیت "واذا ضربتم ---" سے ہوتی ہے اور نہ نبی ﷺ کی کسی صحیح حدیث سے، نبی ﷺ کے متعلق جو چیز بلا شبہ ثابت ہے وہ صرف یہ ہے کہ آپؐ نے ہر سفر میں قصر فرمایا ہے۔ کسی سفر میں آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو شخص اس سے کم سفر کرے، وہ قصر نہ کرے۔

صحابہ کرامؓ کے درمیان بھی اس بارے میں کوئی ایک رائے نہیں ہے۔ مختلف صحابہؓ نے نبی ﷺ کے مختلف سفروں کے پیش نظر مختلف قیاسات کئے ہیں۔ امام ابن منذر اور دوسرے

---

(۱) صحابہؓ اور ائمہ کرامؒ میں جو اختلاف ہے وہ صرف اس بارے میں ہے کہ آیا سفر میں قصر ضروری ہے یا جائز؟ حضرت عمرؓ، علیؓ، ابن عمرؓ، ابن مسعودؓ، جابرؓ اور ابن عباسؓ کے نزدیک یہ ضروری ہے۔ حضرت عائشہؓ، عثمانؓ اور دوسرے صحابہ کے نزدیک اس کی صرف رخصت ہے۔ (نیل الاوطار ج ۳، ص ۱۷۰)

حنفیہ کے نزدیک ایک سفر میں قصر واجب ہے۔ مالکیہ کے نزدیک سفر میں قصر نماز با جماعت سے زیادہ سخت مؤکدہ ہے اگر مسافر کو کوئی مسافر امام نہ ملے تو وہ تنہا قصر نماز پڑھے گا۔ کسی مقیم کے پیچھے اس کا نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک سفر میں قصر جائز ہے لیکن وہ پوری نماز پڑھنے سے افضل ہے۔

(الفقہ ---ج ۱، ص ۴۷۱)

علمانے اس بارے میں سلف کے بیس سے زیادہ مسلک نقل کئے ہیں۔

حضرت انسؓ کے متعلق روایت ہے کہ وہ پندرہ میل کے سفر میں قصر کیا کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کے متعلق روایت ہے کہ وہ نخلستان تشریف لے گئے اور وہاں لوگوں کو ظہر کی دو رکعت نماز پڑھائی۔ پھر اسی روزہ مدینہ منورہ واپس آگئے۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں "میں (مکہ سے) عرفات جاکر قصر کرتا ہوں"۔ (معالم السنن ج ۲ ص ۴۹)

حضرت ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ ۴۸ میل کے سفر میں قصر فرماتے تھے اور روزہ نہ رکھتے تھے"۔ (۱) (صحیح بخاری)

۳- وہ مقام جہاں سے قصر شروع ہوتا ہے

اس بارے میں بھی نبی ﷺ کا کوئی ارشاد ثابت نہیں ہے۔ البتہ حضور ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب آپ بستی سے نکل جاتے تو قصر شروع فرماتے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کے ساتھ مدینہ میں ظہر کی چار رکعتیں پڑھیں اور ذی الحلیفہ (جو مدینہ منورہ سے ۶ میل تھا اور وہ مکہ معظمہ جاتے ہوئے نبی ﷺ کے راستے میں آیا تھا) میں عصر کی دو رکعتیں"۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

---

(۱) ظاہر یہ کے نزدیک مقدار سفر جس میں قصر کیا جاسکتا ہے کچھ نہیں ہے۔ ہر سفر جسے لغت اور عرف عام میں سفر کہا جاتا ہو، اس میں قصر کیا جاسکتا ہے خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ قدیم اور موجودہ زمانہ میں بہت سے محقق علماء نے یہی مسلک اختیار کیا ہے۔ امام ابن قیم نے بھی اسی مسلک کو ترجیح دی ہے۔ (زاد المعاد) مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک ۴۸ میل یا ایک دن اور رات کے سفر میں قصر ہو سکتا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک جس سفر میں پیدل یا اونٹ کی سواری سے تین دن صرف ہوں یعنی ۱۸ فرسنگ یا ۵۴ میل اس میں قصر کیا جا سکتا ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۴۷۳)

ان سب کی بنیاد نبی ﷺ کی اس حدیث پر ہے "جو عورت اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ ایک دن اور رات کا سفر بغیر کسی محرم مرد کے کرے۔ دوسری روایت میں "تین دن" کے الفاظ ہیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں "نبی نے (کم از کم) ایک دن اور رات کے سفر کو فرمایا ہے"۔ اس کے بعد امام بخاری اوپر والی دونوں روایتوں کو نقل فرماتے ہیں"۔ اس چیز پر مذاہب اربعہ کا اتفاق ہے کہ قصر کی یہ مسافت خواہ پیدل یا اونٹ وغیرہ پر جانے کی وجہ سے) کئی دن میں طے ہو یا (موٹر، گاڑی یا ہوائی جہاز کی وجہ سے) جلد طے ہو، اس میں قصر ہو سکتا ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۴۷۳)

امام ابن منذرؒ لکھتے ہیں "مجھے نہیں معلوم کہ نبی ﷺ نے کسی سفر میں نکلنے سے پہلے قصر کیا ہو۔" (۱)

۴۔ قصر کی مدت

مسافر کب تک قصر کرتا رہے گا؟ --- نبی ﷺ کی کسی حدیث سے اس کی تعیین نہیں ہوتی۔ نبی ﷺ جب تک اپنے کسی سفر میں رہتے، قصر سے نماز پڑھتے رہتے۔ کسی سفر میں آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو شخص اس سے زیادہ کسی سفر میں رہے، وہ قصر نہ کرے۔

اس بارے میں صحابہؓ کرام سے بھی کوئی ایک رائے ثابت نہیں ہے:

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں "نبی ﷺ ایک سفر میں ۱۹ روز ٹھہرے اور قصر فرماتے رہے۔ لہذا ہم جب کسی جگہ ۱۹ روز تک ٹھہریں گے، قصر کریں گے اور جب اس سے زیادہ ٹھہریں گے تو پوری نماز پڑھیں گے"۔ (بخاری) (۲)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ جو شخص دس روز ٹھہرے گا، پوری نماز پڑھے گا"۔ (ترمذی)

حضرت ابن عمرؓ سے دو روایتیں ہیں ایک روایت میں وہ فرماتے ہیں جو شخص پندرہ روز ٹھہرے گا، پوری نماز پڑھے گا"۔ دوسری روایت میں وہ فرماتے ہیں "جو شخص بارہ روز ٹھہرے گا، پوری نماز پڑھے گا"۔ (ترمذی)

حضرت عثمانؓ اور انسؓ سے چار روز کی روایت ہے۔ (سبل السلام، نیل الاوطار) (۳)

---

(۱) مذاہب اربعہ کا اس بارے میں اتفاق ہے صرف بعض تفصیلات میں اختلاف ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا ص ۴۷۵)

(۲) حضرت ابن عباسؓ سے یہی روایت حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی نقل ہوئی ہے اس میں ۱۹ کے بجائے ۱۷-۱۸ اور ۱۵ روز کا ذکر ہے لیکن صحیح بخاری کی یہ روایت سب سے صحیح ہے۔ اس اختلاف کی وجہ دراصل یہ ہے کہ بعض راویوں نے پہنچنے اور واپس ہونے کے دن کو شمار کیا ہے۔ اور بعض نے شمار نہیں کیا۔

(۳) حنفیہ کے نزدیک جہاں آدمی پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کا ارادہ کرلے وہاں وہ پوری نماز پڑھے گا۔ شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک جہاں آدمی چار دن ٹھہرنے کا ارادہ کرلے وہاں پوری نماز پڑھے گا۔ حنابلہ کے نزدیک جہاں آدمی اتنی مدت ٹھہرنے کا ارادہ کرلے کہ اس میں اس پر بیس سے زیادہ نمازیں پڑھنا ضرور ہوں، وہاں پوری نماز پڑھے گا۔ (الفقہ المذاہب الاربعہ ج ا ص ۴۷۹) اس بارے میں بعض علماء کا مسلک یہ ہے کہ قصر کی مدت کی کوئی حد نہیں ہے اور سفر میں کسی جگہ قیام کرنے سے سفر کا حکم ختم نہیں ہوتا جب تک انسان سفر میں رہے وہ قصر کر سکتا ہے۔ امام ابن قیم نے اسی مسلک کو ترجیح دی ہے اور اسی کے دلائل دیئے ہیں۔ (زاد المعاد)

اس چیز پر تمام صحابہؓ کا اتفاق ہے کہ اگر کسی جگہ آدمی مجبور ار کا ہوا ہو اور ہر وقت یہ خیال ہو کہ مجبوری دور ہوتے ہی وطن واپس ہو جائے گا تو ایسی جگہ بلا تعیّنِ مدت قصر کیا جس سکتا ہے۔ صحابہ کرامؓ سے اس بارے میں متعدد مثالیں ثابت ہیں۔

حضرتِ انسؓ شام میں دو سال تک ٹھہرے رہے اور قصر سے نماز پڑھتے رہے۔ نافعؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ آذربائجان میں چھ ماہ تک راستے میں برف کی وجہ سے رکے رہے اور قصر سے نماز پڑھتے رہے۔ حضرتِ انسؓ فرماتے ہیں کہ صحابہؓ کرام رام ہرمز میں سات ماہ تک رہے اور قصر نماز پڑھتے رہے۔ (۱)

۵- سفر میں سنتیں اور نوافل

کسی صحیح حدیث میں نبی ﷺ سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ نے کسی سفر میں فرض نماز سے پہلے یا بعد میں نفل پڑھے ہوں لیکن رات کے وتر اور صبح کی دو سنتیں آپ ہر سفر میں پڑھا کرتے تھے اور انہیں کبھی نہ چھوڑتے تھے۔ (زاد المعاد) اس بارے میں حضرت ابن عمرؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ کا مسلک یہ ہے کہ سفر میں سنتوں کا پڑھنا صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے ایک مرتبہ سفر میں لوگوں کو فرض نماز کے بعد نماز پڑھتے دیکھا تو فرمایا "اگر مجھے سنتیں پڑھنا ہی ہوتیں تو میں اپنی فرض نماز کو پورا کر لیتا، اے میرے بھتیجے! میں نبی ﷺ کے ساتھ (سفر میں) رہا ہوں۔ آپ دو رکعتوں سے زیادہ نماز نہیں پڑھتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔ میں حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ بھی رہا ہوں وہ بھی دو رکعتوں سے زیادہ نماز نہ پڑھتے تھے"۔ حضرت عمرؓ اور عثمانؓ کا ذکر آیا تو فرمایا "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین اسوہ ہے۔)" (بخاری)

البتہ امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ سفر کیا کرتے تھے اور فرض نماز سے پہلے اور بعد میں سنتیں اور نفل پڑھا کرتے تھے۔

ان دونوں قسم کی روایتوں کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر میں سنتوں اور دوسری نفل نمازوں کا چھوڑنا بھی جائز ہے اور پڑھنا بھی۔ نہ ان کے چھوڑنے میں حرج ہے اور نہ پڑھنے میں (۲)۔ البتہ صبح کی سنتوں اور وتر کا چھوڑنا صحیح نہیں ہے۔

---

(۱) حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کا اس پر اتفاق ہے۔ شافعیہ کے نزدیک ایسی صورت میں بھی ۱۸ روز سے زیادہ قصر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۴۸۰)

(۲) اس بارے میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر انسان سفر میں چل رہا ہو تو سنتیں نہ پڑھے اور اگر کسی جگہ ٹھہرا ہوا ہو تو پڑھے"۔ (العرف الشذی، شرح ترمذی از مولانا سید انور شاہ صاحبؒ)

دوسری نفل نمازوں کا بھی سفر میں پڑھنا جائز ہے۔

حضرت اُمّ ہانیؓ سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے روز نبی ﷺ نے ان کے گھر میں غسل فرمایا اور (چاشت کی) آٹھ رکعتیں پڑھیں"۔(بخاری)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سفر کے دوران اپنی سواری پر جس رخ پر بھی وہ جاتی، نفل نماز اور وتر پڑھتے تھے۔البتہ آپؐ فرض نماز سواری پر نہ پڑھتے تھے"۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی)

۶۔ جمعہ کے روز سفر

جمعہ کے روز اگر جمعہ کی نماز کا وقت نہ ہو سفر کرنا جائز ہے:

حضرت عمرؓ نے ایک آدمی کو دیکھا جو کہہ رہا تھا "اگر آج جمعہ نہ ہوتا تو میں نکل جاتا" حضرت عمرؓ نے اس سے فرمایا "نکل جاؤ اس لئے کہ جمعہ سفر سے نہیں روکتا"۔(مسند امام شافعیؒ)

حضرت ابو عبیدہؓ نے جمعہ کے روز سفر کیا اور نماز کا انتظار نہیں کیا (سعید بن منصور)

امام زہریؒ نے جمعہ کے روز دوپہر کے وقت سفر کرنا چاہا تو لوگوں نے اعتراض کیا، انہوں نے فرمایا "نبی ﷺ نے جمعہ کے روز سفر کیا ہے"۔ (۱)

۷۔ مسافر کا مقیم کے پیچھے نماز پڑھنا

مسافر جب مقیم کے پیچھے نماز پڑھے گا تو قصر نہیں کرے گا بلکہ پوری نماز پڑھے گا، خواہ اس کے ساتھ ایک یا اس سے بھی کم رکعت پائے:

حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا "کیا وجہ ہے کہ مسافر جب تنہا نماز پڑھتا ہے تو دو رکعتیں پڑھتا ہے اور جب مقیم کے پیچھے نماز پڑھتا ہے تو پوری چار رکعتیں پڑھتا ہے؟ فرمایا یہ سنت ہے"۔دوسری روایت میں ہے "یہ ابوالقاسم ﷺ کی سنت ہے"۔(مسند امام احمد)(۲)

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک جمعہ کی پہلی اذان کے بعد اس وقت تک شہر سے نکلنا مکروہ ہے جب تک جماعت نہ ہو جائے۔البتہ زوال سے پہلے سفر میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

حنابلہ، شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک جس شخص کو راستے میں جمعہ نہ ملے گا اس کے لئے طلوع فجر کے بعد ہی سے جمعہ کے روز سفر کرنا مکروہ ہے اور اگر اسے راستے میں جمعہ مل جائے گا تو اس کے لئے سفر کرنا جائز ہے۔زوال کے بعد سفر حرام ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۴۰۰)

(۲) یہ اکثر ائمہ سلف کا مسلک ہے۔امام حسن بصریؒ، ابراہیم نخعیؒ، زہریؒ، قتادہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک اگر مسافر مقیم کے پیچھے ایک رکعت یا اس سے زائد رکعتیں پائے پھر وہ پوری نماز پڑھے گا اور اگر ایک رکعت سے کم پائے تو وہ قصر کرے گا۔ (الفتح الربانی ج ۵ ص ۲۸۱)

الجمع بین الصلاتین

(دو نمازوں کا اکٹھا پڑھنا)

مندرجہ ذیل حالتوں میں ظہر و عصر کا (ظہر یا عصر کے وقت) اور مغرب و عشا کا (مغرب یا عشاء کے وقت) جمع کرنا (اکٹھا پڑھنا) جائز ہے۔

۱۔ عرفات اور مزدلفہ میں

حجۃ الوداع میں نبی ﷺ نے عرفات میں ظہر اور عصر کو ظہر کے وقت اور مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کو عشاء کے وقت ایک ساتھ پڑھا تھا۔ لہٰذا اس کے سنت ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

۲۔ سفر میں

انسان خواہ سفر کر رہا ہو یا کسی جگہ مقیم ہو وہ ظہر و عصر اور "مغرب و عشاء" کو ایک ساتھ پڑھ سکتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا "کیا میں تمہیں نبی ﷺ کی نماز کے متعلق بیان نہ کروں؟" لوگوں نے کہا "ضرور" فرمایا "اگر حضور کو گھر پر سورج ڈھل جاتا تو آپ سوار ہونے سے پہلے ظہر اور عصر کو جمع کر لیتے اور گھر پر سورج نہ ڈھلتا تو آپ روانہ ہو جاتے اور جب عصر کا وقت ہو جاتا تو اتر کر ظہر اور عصر کو جمع کر لیتے۔ اسی طرح اگر گھر پر سورج غروب ہو جاتا تو آپ مغرب اور عشاء کو جمع کر لیتے اور اگر گھر پر سورج غروب نہ ہوتا تو آپ روانہ ہو جاتے اور جب عشاء کا وقت ہو جاتا تو اتر کر مغرب اور عشاء کو جمع کر لیتے" (مسند امام شافعیؒ)

حضرت معاذؓ سے روایت ہے کہ ایک روز نبی ﷺ نے غزوہ تبوک میں تاخیر سے نماز پڑھی۔ پھر آپ باہر تشریف لائے اور ظہر اور عصر کو جمع کیا"۔ (مسلم۔ موطا امام مالکؒ)

صحابہ کرامؓ سے بھی دو نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنے کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔(۱)

دو نمازوں کو جمع کرتے وقت سنت یہ ہے کہ ان کے لئے اذان ایک کہی جائے (۲) اور اقامتیں دو اور یہ کہ ان دونوں کے درمیان سنتیں نہ پڑھی جائیں۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کو جمع فرمایا۔ ان میں سے ہر ایک اقامت کے ساتھ تھی اور نہ دونوں کے درمیان سنتیں پڑھی گئیں اور نہ ان میں سے ایک کے بعد" (بخاری۔ نسائی)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے عرفات میں دو نمازیں ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ایک ساتھ پڑھیں۔ پھر جب مزدلفہ پہنچے تو آپؐ نے مغرب اور عشاء کو ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ایک ساتھ پڑھا اور ان دونوں کے درمیان سنتیں نہیں پڑھیں۔ پھر آپ لیٹ گئے یہاں تک کہ فجر ہو گئی" (احمد، مسلم، نسائی)

یہ ضروری نہیں ہے کہ دونوں نمازیں یکے بعد دیگر فوراً پڑھی جائیں بلکہ دونوں کے درمیان فصل جائز ہے"۔

حضرت اسامہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب مزدلفہ پہنچے تو آپؐ نے وضو فرمایا پھر اقامت کہی گئی اور مغرب کی نماز پڑھی گئی۔ پھر ہر ایک آدمی نے اپنا اونٹ اپنی جائے قیام پر جا کر بٹھایا۔ پھر اقامت کہی گئی اور عشاء کی نماز پڑھی گئی' ان دونوں نمازوں کے درمیان حضور ﷺ نے کوئی نماز نہیں پڑھی"۔ (بخاری و مسلم) (۳)

---

(۱) مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک سفر میں دو نمازوں (ظہر و عصر اور مغرب و عشاء) کو جمع کر کے پڑھنا جائز ہے لیکن افضل یہ ہے کہ ہر نماز اپنے وقت پر الگ الگ پڑھی جائے۔

مالکیہ کے نزدیک عصر کو ظہر سے اور عشاء کو مغرب سے ملا کر پڑھنا صرف اس وقت جائز ہے جب کہ ظہر یا مغرب کے وقت مسافر کسی جگہ ٹھہرا ہوا ہو اور عصر یا عشاء کا وقت ہونے سے پہلے اس کا ارادہ کوچ کرنے اور پھر اس وقت دوبارہ ٹھہرنے کا ہو جب کہ عصر یا عشاء کا وقت ختم ہو جائے گا اگر یہ صورت نہیں ہے تو عصر کو ظہر کے ساتھ اور عشاء کو مغرب کے ساتھ ملا کر پڑھنا جائز نہیں ہے۔ (الفقہ ج ۱ ص ۴۸۳)

حنفیہ کے نزدیک دو نمازوں کو جمع کرنے کی صرف یہ صورت جائز ہے کہ پہلی نماز کو آخر وقت اور دوسری نماز کو اول وقت ملا کر پڑھا جائے۔ اس کو جمع صوری کہتے ہیں حنفیہ جمع حقیقی کے بالکل قائل نہیں ہیں۔ سوائے حج کے موقع پر عرفات اور مزدلفہ میں (جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے (موطا امام محمدؒ)

(۲) مالکیہ کے نزدیک دوسری نماز سے پہلے بھی آہستہ آواز سے اذان دینا مستحب ہے (الفقہ ج ۱ ص ۴۸۹)

(۳) شافعیہ کے نزدیک دونوں نمازوں میں موالات ضروری ہے جب کہ دونوں کو پہلی نماز کے وقت میں جمع کیا جائے (شرح نووی)

۳۔ بارش کے وقت

بارش کے دن جب کہ کیچڑ وغیرہ کی وجہ سے باربار مسجد آنا مشکل ہو تو مسجد میں دو نمازوں کو جمع کرنا جائز ہے۔

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ ایک بارش والی رات نبی ﷺ نے مغرب اور عشاء کی نماز کو جمع فرمایا" حضرت ابو سلمہ ؓ بن عبدالرحمٰن فرماتے ہیں "اگر بارش کا دن ہو تو مغرب اور عشاء کو جمع کرنا سنت ہے" (سنن امام اثرم، نیل الاوطار)

البتہ بارش کے دن ظہر اور عصر کو ایک ساتھ پڑھنے کا ثبوت نبی ﷺ سے نہیں ملتا۔ اگرچہ اس کی ممانعت بھی ثابت نہیں ہے اور بظاہر اس کا جواز ہے (۱)

۴۔ حضر میں مجبوری کے وقت

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ضرورت کے وقت حضر میں بھی دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھا جاسکتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کو بغیر کسی خوف یا بارش کے مدینہ منورہ میں جمع کر کے پڑھا۔ لوگوں نے حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کیا" حضور ﷺ نے ایسا کیوں فرمایا؟" انہوں نے جواب دیا" اس لئے کہ اپنی امت کو مشکل میں نہ ڈالیں"۔ (مسلم)

بخاری و مسلم کی مشترک روایت میں یہ الفاظ ہیں "نبی ﷺ نے مدینہ منورہ میں سات یا آٹھ رکعتیں ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کو جمع کر کے پڑھیں"۔

عبداللہ بن شقیق ؒ سے روایت ہے کہ ایک دن حضرت ابن عباسؓ نے ہمیں عصر کے

---

(۱) شافعیہ کے نزدیک بارش کے وقت ظہر و عصر کو صرف ظہر کے وقت اور مغرب و عشاء کو صرف مغرب کے وقت جمع کرنا جائز ہے بشرطیکہ پہلی نماز کے دوران میں اور دوسری کے شروع ہوتے وقت بارش ہو رہی ہو۔ مالکیہ کے نزدیک بارش کے روز صرف مغرب اور عشاء کو مغرب کے وقت ایک ساتھ پڑھا جاسکتا ہے۔ حنابلہ کے نزدیک صرف مغرب اور عشاء کو ایک ساتھ پڑھا جاسکتا ہے۔ خواہ مغرب کے وقت یا عشاء کے وقت۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۴۹۰)

واضح رہے کہ حنفیہ بارش میں بھی دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھنے کے قائل نہیں ہیں

(دیکھئے حاشیہ صفحہ گزشتہ)

بعد خطبہ دیا، یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا اور ستارے نکل آئے اور لوگ کہنے لگے نماز کا وقت ہو چکا، نماز کا وقت ہو چکا" بنی تمیم میں سے ایک شخص سیدھا حضرت ابن عباسؓ کے پاس نماز، نماز کہتا ہوا آیا" تو اس سے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا "کیا تم مجھے اللہ کے رسول ﷺ کی سنت سکھانے آئے ہو؟ میں نے نبی ﷺ کو ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کو جمع کر کے پڑھتے دیکھا ہے"۔ عبداللہ بن شقیقؒ بیان کرتے ہیں کہ ان سے میرے دل میں شبہ پیدا ہوا اور میں حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس پہنچا اور ان سے دریافت کیا تو انہوں نے بھی اس کی تصدیق کی"۔ (مسلم)

لیکن اس بارے میں جمہور کا مسلک یہ ہے کہ حضر میں مجبوری کے بغیر دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھنا جائز نہیں ہے اوپر کی احادیث کی تاویل بعض نے یہ کی ہے کہ حضور ﷺ نے ایسا مرض کی وجہ سے کیا۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں حضور ﷺ نے ان تمام نمازوں کو بارش کی وجہ سے جمع کر کے پڑھا"۔ (نیل الاوطار۔ معالم السنن (۱))

فائدہ : حدیث میں مرض کے وقت دو نمازوں کو جمع کرنے کا ذکر نہیں آیا۔ لیکن امام مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہے کیونکہ مریض کو ہر نماز اپنے وقت پر پڑھنے میں جو دقت پیش آتی ہے وہ بارش میں ہر نماز کو اپنے وقت پر ادا کرنے سے زیادہ ہے۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں "یہ بڑی مضبوط دلیل ہے" شافعیہ میں سے بھی بعض علماء اس کے جواز کے قائل ہیں" (معالم السنن ج ۲، ص ۵۵)

(۱) احادیث کے ظاہری الفاظ کی بنا پر بہت سے محدثین کا مسلک یہ ہے کہ حضر میں بھی جب کہ انسان کو کوئی سخت ضرورت درپیش آجائے تو وہ ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کی نمازوں کو جمع کر کے پڑھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ اسے اپنی عادت ہی نہ بنا لے۔ (معالم السنن)

صلوٰۃ المریض

(مریض کی نماز)

اگر کوئی شخص بیمار ہو یا اسے کوئی اور عذر درپیش ہو اور وہ کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکتا ہو تو اس کے لئے جائز ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھ لے۔

اور اگر بیٹھ کر بھی نماز نہ پڑھ سکتا ہو تو دائیں پہلو پر لیٹ کر نماز پڑھ لے اور اشارے سے رکوع اور سجدے کر لے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ — تو تم اللہ کا ذکر کرو۔ کھڑے ہو کر بیٹھ کر اور (لیٹ کر) اپنے پہلوؤں پر

حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ مجھے بواسیر کی شکایت تھی۔ میں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ نماز کیونکر پڑھوں"؟ فرمایا "کھڑے ہو کر نماز پڑھو اگر اس کی طاقت نہیں رکھتے تو بیٹھ کر نماز پڑھو۔ اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتے ہو تو اپنے (دائیں) پہلو پر نماز پڑھو" (بخاری۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

نسائی میں یہ الفاظ زیادہ ہیں اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتے ہو تو سیدھے لیٹ کر نماز پڑھو۔ اللہ تعالیٰ کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بار نہیں ڈالتا۔"

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا۔ "مریض کھڑے ہو کر نماز پڑھے گا اگر وہ اس کی طاقت رکھتا ہو اور اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھے گا اگر وہ سجدہ کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنے سر سے اشارہ کرے گا اور اپنے سجدے کو رکوع کی نسبت زیادہ نیچا کرے گا۔ اگر وہ بیٹھ کر نماز نہ پڑھ سکتا ہو تو قبلہ رخ ہو کر اپنے دائیں پہلو پر لیٹ کر نماز پڑھے گا اگر دائیں پہلو پر لیٹ کر بھی نماز نہ پڑھ سکتا ہو تو سیدھا لیٹ کر اور پاؤں کو قبلہ کی طرف کر کے نماز پڑھے گا" (دارقطنی)

یہ حدیث روایت کے لحاظ سے اگرچہ کمزور ہے لیکن جمہور کا مسلک اسی کے مطابق ہے کیونکہ کسی قوی تر حدیث سے اس کی مخالفت نہیں ہوتی (نیل الاوطار ج ۳ ص ۱۶۸)

فائدہ:(۱) احادیث کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر بیمار آدمی سیدھا لیٹ کر اشارے سے بھی نماز پڑھ سکتا ہو تو اس پر کوئی چیز فرض نہیں رہتی(۱)

(نیل الاوطار ج ۳ ص ۱۶۹)

(۲) امام مالکؒ، احمد بن حنبلؒ اور بعض شافعیؒ علماء کے نزدیک مریض کے لئے ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازوں کو جمع کر کے پڑھنا جائز ہے(تفصیل کے لئے دیکھئے صفحہ ۲۸۷)

---

(۱) شافعیہ، حنابلہ اور مالکیہ کے نزدیک اگر وہ آنکھ یا دل سے اشارہ کر سکتا ہو تو اس پر ان چیزوں سے اشارہ کر کے نماز پڑھنا ضروری ہے۔ حنفیہ کے نزدیک ضروری نہیں ہے

اس سے نماز ساقط ہو جائے گی(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۵۰۰

(گاڑی یا) جہاز میں نماز

(گاڑی یا) جہاز میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا ضروری ہے لیکن اگر ایسا کرنا مشکل ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ کسی نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ میں جہاز میں کیسے نماز پڑھوں؟ فرمایا "کھڑے ہو کر نماز پڑھو۔ اِلّا یہ کہ تمہیں غرق ہو جانے کا اندیشہ ہو"۔ (دار قطنی۔ حاکم)

صلوٰۃُ الکُسُوف

(سورج گہن کی نماز)

سورج گہن کی نماز مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے سنت ہے۔ اس میں جماعت اگرچہ شرط نہیں ہے، لیکن افضل یہ ہے کہ یہ نماز باجماعت ادا کی جائے۔(۱) اس کے لئے کوئی اذان یا تکبیر نہیں کہی جائے گی بلکہ الصلوٰۃ جامعۃ (نماز جمع کرنے والی ہے) کہہ کر لوگوں کو پکارا جائے گا۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے زمانے میں سورج گہن ہوا تو حضور ﷺ نے ایک آدمی کو بھیجا کہ لوگوں کو الصلوٰۃ جامعۃ کہہ کر مسجد کی طرف لائے" (بخاری و مسلم)

سورج گہن کی نماز کی دو رکعتیں ہیں۔ ہر رکعت میں اگرچہ عام نمازوں کی طرح ایک قیام اور ایک رکوع بھی جائز ہے۔ لیکن مستحب یہ ہے (جیسا کہ متعدد احادیث سے ثابت ہے) کہ ہر رکعت میں قیام اور رکوع مکرر (دو یا تین یا چار یا پانچ) ہوں زیادہ تر ائمہ اور محدثین کا مسلک ہر رکعت میں "دو قیام اور دو رکوعوں" کا ہے کیونکہ جن روایات میں دو قیام اور دو رکوعوں کا ذکر ہے وہ دوسری تمام روایات سے تعداد اور صحت میں زیادہ ہیں۔(۲)

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک ضروری ہے کہ جماعت وہ شخص کرائے جو جمعہ کی نماز پڑھاتا ہو۔ اگر وہ نہ ملے تو دوسرے شخص کے لئے خلیفہ سے اجازت لینا ضروری ہے اگر یہ دونوں صورتیں نہ ہوں تو لوگ الگ الگ نماز پڑھیں گے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج۱ ص ۳۶۵)

(۲) مالکیہ، شافعیہ اور حنبلیہ کا یہی مسلک ہے حنفیہ کے نزدیک سورج گہن کی نماز کی ہر رکعت میں عام نمازوں کی طرح ایک ہی قیام اور ایک ہی رکوع ہے۔ جیسا کہ حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے سورج گہن کے وقت ہمیں نماز پڑھائی جیسا کہ تم پڑھتے ہو۔ آپ نے ہر رکعت میں ایک رکوع کیا اور دو سجدے اور اللہ سے دعا کرتے رہے یہاں تک کہ سورج گہن ختم ہو گیا (احمد، ابوداؤد، نسائی، حاکم) نیز ان کے نزدیک سورج گہن کی نماز میں چار یا اس سے زیادہ رکعتیں بھی پڑھی جا سکتی ہیں۔ چار رکعتوں کا ایک سلام [illegible] افضل ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج۱ ص ۳۶۴)

نماز ختم ہونے کے بعد خطبہ دینا مستحب ہے جیسا کہ ان دونوں احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ بعض دوسری روایات میں خطبہ کے بجائے ذکر، دعا، استغفار و صدقہ کا ذکر ہے(۱)

اس بارے میں حدیث سے کوئی چیز ثابت نہیں ہے کہ اگر سورج گہن کسی ایسے وقت میں لگ جائے جب کہ نماز کا پڑھنا جائز نہ ہو (دیکھئے ان اوقات کا ذکر صفحہ ۱۰۴ پر) تو کیا اس وقت سورج گہن کی نماز پڑھی جائے گی یا نہیں؟ بظاہر حدیث میں اس کی ممانعت نہیں ہے بلکہ جب بھی گہن لگے نماز پڑھنے کا حکم ہے۔ (نیل الاوطار)(۲)

---

(۱) امام شافعیؒ کے نزدیک خطبہ سورج گہن کی شرائط میں داخل ہے جیسا کہ اوپر کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے لیکن امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ سورج گہن کی نماز میں کوئی خطبہ نہیں ہے۔ نبی علیہ السلام نے محض اس لئے خطبہ دیا کہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ سورج کو گہن حضورؐ کے صاحبزادے ابراہیم کی موت کی وجہ سے لگا ہے چنانچہ آپ کا مقصد صرف اس خیال کو دور فرمانا تھا۔
اس بارے میں حنابلہ کا مسلک بھی حنفیہ اور مالکیہ کے مطابق ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۶۶)

(۲) حنفیہ مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک ایسے وقت میں نماز نہیں پڑھی جائے گی بلکہ صرف ذکر اور دعا کی جائے گی، شافعیہ کے نزدیک جب بھی سورج گہن کا یقین ہو، نماز کا پڑھنا جائز ہے۔
(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۶۶)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے زمانے میں سورج کو گہن لگا۔ حضور ﷺ مسجد کی طرف گئے اور اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کر دی۔ لوگوں نے آپ کے پیچھے صفیں بنا لیں۔ آپ ﷺ نے لمبی قرآت فرمائی۔ پھر آپ ﷺ نے اللہ اکبر کہا اور لمبا رکوع فرمایا جو پہلی قرآت سے کم تھا۔ پھر آپ ﷺ نے سر اٹھایا اور سمع اللہ لمن حمدہ۔ ربنا لک الحمد کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے پھر آپ نے دوبارہ لمبی قرآت فرمائی جو پہلی قرآت سے کم تھی۔ پھر آپ نے اللہ اکبر کہہ کر رکوع فرمایا جو پہلے رکوع سے کم تھا پھر آپ نے سمع اللہ لمن حمدہ۔ ربنالک الحمد کہا۔ پھر سجدے کئے پھر دوسری رکعت میں بھی آپ نے یوں ہی کیا۔ یہاں تک کہ آپ نے چار رکوع اور چار سجدے مکمل کئے اور نماز ختم ہونے سے پہلے گہن ختم ہو گیا۔ پھر آپ نے لوگوں کو خطبہ دیا۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا "سورج اور چاند اللہ عزوجل کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں انھیں کسی کی موت یا زندگی کی وجہ سے گہن نہیں لگتا۔ جب تم انھیں گہن لگا دیکھو تو اللہ سے ڈرتے ہوئے نماز کی طرف لپکو"۔

(بخاری و مسلم)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ "سورج کو گہن لگا، تو نبی ﷺ نے نماز شروع کی آپ نے سورۂ بقرہ کی مقدار کے برابر لمبا قیام فرمایا۔ پھر لمبا رکوع فرمایا۔ پھر دوبارہ لمبا قیام فرمایا ـــــ جو پہلے قیام سے چھوٹا تھا۔ پھر دوبارہ لمبا رکوع فرمایا۔ جو پہلے رکوع سے چھوٹا تھا۔ پھر آپ نے سجدے فرمائے۔ پھر دوسری رکعت میں لمبا قیام فرمایا جو پہلے قیام سے چھوٹا تھا۔ پھر رکوع فرمایا جو پہلے رکوع سے چھوٹا تھا۔ پھر دوبارہ قیام فرمایا جو پہلے قیام سے چھوٹا تھا۔ پھر دوبارہ رکوع فرمایا۔ جو پہلے رکوع سے چھوٹا تھا۔ پھر سجدے فرمائے۔ جب نماز سے پلٹے تو گہن ختم ہو چکا تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ "سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں انھیں کسی کی موت یا زندگی کی وجہ سے گہن نہیں لگتا جب تم انھیں گہن لگا دیکھو تو اللہ کا ذکر کرو۔" (بخاری و مسلم)

سورۂ فاتحہ ہر قرآت میں ضروری ہے۔

سورج گہن کی نماز کا وقت گہن شروع ہونے سے لے کر گہن ختم ہو جانے تک ہے۔ اس میں جہری اور سری دونوں طرح کی قرآت جائز ہے۔ (۱)

---

(۱) حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک سری قرآت مستحب ہے اور حنابلہ کے نزدیک جہری (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ص ۳۶۵)

صلوٰۃ الخسوف

(چاند گہن کی نماز)

چاند گہن کی نماز بھی سورج گہن کی نماز ہی کی طرح ہے، امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں "جس زمانے میں حضرت ابن عباسؓ بصرہ کے امیر تھے۔ چاند کو گہن لگا آپ (مسجد کی طرف) نکلے اور لوگوں کو دو رکعت نماز پڑھائی۔ ہر رکعت میں دو رکوع کئے پھر سوار ہوئے اور فرمایا "میں نے اسی طرح نماز پڑھی ہے جس طرح میں نے رسول کریم ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا ہے"۔[1] (مسند امام شافعی)

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک چاند گہن کی نماز سورج گہن کی نماز ہی کی طرح ہے البتہ یہ سنتِ مؤکدہ نہیں ہے۔ مستحب ہے اس میں جماعت جائز نہیں، اس کا مسجد میں پڑھنا بھی مسنون نہیں، بلکہ یہ نماز گھروں میں الگ الگ ہی پڑھی جائے گی۔

شافعیہ کے نزدیک سورج گہن کی نماز میں قرآت سری ہے لیکن چاند گہن کی نماز میں جہری' مالکیہ کے نزدیک چاند گہن کی نماز سنت نہیں بلکہ مستحب ہے اور اس کی شکل عام نوافل ہی کی ہے یعنی نہ اس میں قرآت لمبی کی جائے گی اور نہ رکوع زیادہ کئے جائیں گے' اس میں قرآئت بالجہر مستحب ہے اس کا گہن ختم ہو جانے تک یا طلوعِ فجر تک بار بار پڑھنا مستحب ہے' اس کا مسجد میں پڑھنا اور باجماعت پڑھنا مکروہ ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا' ص ۳۶۷ - شامی ج ا' ص ۸۸۰)

صلوٰۃُ الاِستخارہ

(استخارہ کی نماز)

جو شخص کوئی جائز کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہو، لیکن اس کے کرنے یا نہ کرنے کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہ کر پاتا ہو۔ اس کے لئے مسنون ہے کہ فرض نماز کے علاوہ دن اور رات کے کسی حصہ میں دو رکعت نماز پڑھے، خواہ وہ سُنَن راتبہ اور تحیۃ المسجد ہی کی دو رکعتیں ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور نبی ﷺ پر درود کے بعد ذیل کی دعا پڑھے۔

حضرتِ جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ہمیں تمام کاموں (معمولی یا اہم) میں استخارہ کی دعا یوں سکھایا کرتے تھے جس طرح قرآن پاک کی کوئی آیت سکھاتے تھے۔ فرماتے "جب تم میں سے کسی شخص کو کوئی معاملہ درپیش ہو تو اسے چاہئے کہ فرض نماز کے علاوہ دو رکعت نماز پڑھے اور پھر یہ دعا کرے"۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُکَ بِعِلْمِکَ وَاَسْتَقْدِرُکَ بِقُدْرَتِکَ وَاَسْاَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ الْعَظِیْمِ، فَاِنَّکَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ، اَللّٰهُمَّ اِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ خَیْرٌ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَ مَعَاشِیْ وَ عَاقِبَةِ اَمْرِیْ، فَاقْدِرْهُ لِیْ وَیَسِّرْهُ لِیْ ثُمَّ بَارِکْ لِیْ فِیْهِ، وَ اِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ شَرٌّ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ

اے اللہ! میں تیرے علم کے ذریعے تجھ سے خیر طلب کرتا ہوں اور تیری قدرت کے ذریعے قدرت طلب کرتا ہوں۔ میں تجھ سے تیرا عظیم فضل مانگتا ہوں۔ اس لئے کہ تو قدرت رکھتا ہے میں قدرت نہیں رکھتا اور تو جانتا ہے اور میں نہیں جانتا اور تو ہی غیب کے کاموں کو جاننے والا ہے۔

اے اللہ! اگر تیرے علم کے مطابق یہ کام میرے لئے میرے دین، میری معاش اور میرے انجام کار میں بہتر ہے تو تو اسے میرے

وَ مَعَاشِيْ وَ عَاقِبَةِ اَمْرِيْ فَاصْرِفْهُ عَنِّيْ، وَاصْرِفْنِيْ عَنْهُ وَ اَقْدِرْلِي الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ ثُمَّ اَرْضِنِيْ بِهٖ

لئے مقدر فرمادے اسے میرے لئے آسان کر دے اور اس میں میرے لئے برکت پیدا کر دے اور اگر تیرے علم کے مطابق یہ کام میرے لئے میرے دین، میری معاش اور انجام کار میں برا ہے تو اسے مجھ سے اور مجھے اس سے پھیر دے اور میرے لئے جہاں بھی خیر ہے مقدر کر دے اور پھر مجھے اس پر راضی و مطمئن کر دے۔

اور وہ اپنی ضرورت کا نام لے۔ یعنی ھذا الامر (یہ کام) کہتے وقت" (بخاری، ابو داؤد، ترمذی، احمد، نسائی، ابن ماجہ)

نماز میں قرآت کے متعلق کوئی خاص سورت یا آیت ثابت نہیں ہے۔ (۱)

فائدہ: امام نوویؒ فرماتے ہیں "استخارہ کے بعد اپنے کام کے جس پہلو کی طرف انسان کا انشراح ہوا سے کرنا چاہیے لیکن کسی ایسے انشراح پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے جسے انسان پہلے ہی سے دل میں طے کر چکا ہو اور اس میں اس کی کوئی دلی خواہش موجود ہو، انسان کو صاف دل اور صاف نیت ہو کر اللہ کے حضور استخارہ کرنا چاہیے اور اپنے معاملہ کو اللہ ہی کے اختیار میں دے دینا چاہیے"۔

(۱) حنفیہ کے نزدیک ان میں سورہ کافرون اور قل ھو اللہ پڑھنا مستحب ہے (شامی)

صلوٰۃ التسبیح

صلوٰۃ التسبیح کی بڑی فضیلت اور ثواب ہے۔ عکرمہؒ، حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں نبی ﷺ نے ان کے والد حضرت عباسؓ سے فرمایا "اے عباس! اے میرے پیارے چچا! کیا میں آپ کو ایک خاص چیز نہ دوں؟ کیا میں آپ کو دس ایسی چیزیں نہ بتاؤں کہ اگر آپ انہیں پورا کرلیں، تو اللہ تعالیٰ آپ کے شروع اور آخر کے پرانے اور نئے عمداً کئے ہوئے اور غلطی سے کئے ہوئے، چھوٹے اور بڑے علانیہ اور پوشیدہ تمام گناہ معاف کردے؟ یہ دس چیزیں یہ ہیں، (یعنی دعا کا نماز کی مختلف حالتوں میں دس مرتبہ پڑھنا ہے) آپ چار رکعت نماز پڑھیں۔ ہر رکعت میں سورہ فاتحہ اور ایک دوسری سورت پڑھیں، جب آپ پہلی رکعت میں قرآت سے فارغ ہوں اور قیام کی حالت میں ہوں، تو پندرہ مرتبہ یہ دعا پڑھیں۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اللّٰهُ اَكْبَرُ — اللہ پاک ہے، حمد و ثنا اللہ ہی کے لئے ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے

پھر رکوع کیجئے اور اس میں یہی دعا دس مرتبہ پڑھیئے۔[1]

پھر رکوع سے سر اٹھایئے اور دس مرتبہ یہی دعا پڑھیئے، پھر سجدہ کیجئے اور دس مرتبہ یہی دعا پڑھیئے پھر سجدہ سے اٹھ کر بیٹھیئے اور دس مرتبہ یہی دعا پڑھیئے پھر دوسرا سجدہ کیجئے اور دس مرتبہ یہی دعا پڑھیئے۔ پھر سجدہ سے اٹھیے اور (جلسہ استراحت میں) دس مرتبہ یہی دعا پڑھیئے۔ گویا ہر رکعت میں آپ پچھتر مرتبہ یہ دعا پڑھیں پھر دوسری، تیسری اور چوتھی رکعت میں بھی آپ پچھتر مرتبہ یہی دعا پڑھیں۔ اگر آپ یہ نماز ہر روز پڑھ سکتے ہوں تو پڑھیئے، اگر ہفتہ میں ایک مرتبہ پڑھ سکتے ہوں تو پڑھیئے۔ اگر سال میں ایک مرتبہ پڑھ سکتے ہوں تو پڑھیئے اور اگر عمر بھر میں ایک ہی مرتبہ پڑھ سکتے ہوں تو پڑھ لیجئے"

(ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، طبرانی، بیہقی)

---

(۱) یعنی رکوع کی تسبیح پڑھنے کے بعد۔ اسی طرح دوسری تمام حالتوں میں بھی نماز کی اپنی دعائیں پڑھنے کے بعد یہ دعا پڑھی جائے گی۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں۔ "یہ حدیث متعدد صحابہؓ سے بہت سے طریقوں سے آئی ہے۔ ان میں سب سے صاف عکرمہؒ کی یہ روایت ہے جسے بہت سے محدثین نے صحیح قرار دیا ہے۔"

صَلوٰۃُ الحَاجَتہ

(کسی ضرورت کے وقت نماز)

حضرت ابو درداؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص پورے اہتمام سے وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھے، اللہ تعالیٰ اس کے ہر سوال کو دیر یا سویر ضرور پورا کرے گا"۔ (مسند امام احمدؒ)

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو شخص اللہ تعالیٰ سے یا کسی انسان سے اپنی کوئی ضرورت پوری کرانا چاہتا ہو، اسے اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھنی چاہیئے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور نبی ﷺ پر درود پڑھنے کے بعد یہ دعا کرنی چاہیئے"۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ، اَسْأَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ وَ عَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ وَّالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ اِثْمٍ ، لَا تَدَعْ لِيْ ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَهٗ وَلَا هَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَهٗ وَلَا حَاجَةً هِيَ لَكَ رِضًا اِلَّا قَضَيْتَهَا يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ۔ (ترمذی)

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی بردباری اور کرم کرنے والا ہے۔ بڑے عرش کا مالک اللہ پاک ہے۔ حمد و ثنا جہانوں کے رب اللہ ہی کے لئے ہے۔ اے اللہ! میں تجھ سے ان کاموں کے کرنے کی توفیق چاہتا ہوں جو تیری رحمت و مغفرت کا باعث ہوں۔ میں تجھ سے تیری اطاعت کرنے اور ہر گناہ سے بچا رہنے کی توفیق چاہتا ہوں میرا جو گناہ ہے اسے بخش دے میرے دل میں جو فکر ہے اسے دور کر دے اور میری ہر حاجت جو تیرے نزدیک پسندیدہ ہے اسے پورا کر دے اے سب سے بڑے رحم کرنے والے! میری دعا قبول فرما۔

امام ترمذیؒ نے اس روایت کو غریب اور کمزور قرار دیا ہے۔ لیکن امام حاکمؒ اور بعض دوسرے محدثین نے اسے قبول کیا ہے۔(۱)

(۱) ائمہ اربعہ کے نزدیک اس دعا کا پڑھنا مستحب ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۳۳۵)

صلوٰۃ الاستسقاء

(بارش کے لئے نماز)

"استسقاء" کے لفظی معنی ہیں "پانی طلب کرنا" چنانچہ صلوٰۃ الاستسقاء سے مراد وہ نماز ہے جو قحط کے وقت یا بارش نہ ہونے کے وقت پڑھی جائے۔

اللہ تعالیٰ سے بارش طلب کرنے کے لئے نبی ﷺ سے تین طریقے ثابت ہیں۔

ا۔ دعا: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ گاؤں کا ایک آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی "اے اللہ کے رسولؐ! میں آپؐ کی خدمت میں ایسے لوگوں کے پاس سے آیا ہوں جن کا چرواہا خشک سالی کی وجہ سے کوئی چیز پینے کو نہیں پاتا اور نہ ان کا جانور کمزوری کی وجہ سے اپنی دم ہلا سکتا ہے" نبی ﷺ منبر پر تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد یہ دعا فرمائی:

اَللّٰھُمَّ اَسْقِنَا غَیْثًا مُّغِیْثًا مُّرِیْئًا مُّرِیْعًا طَبَقًا غَدَقًا عَاجِلًا غَیْرَ رَائِثٍ

اے اللہ! ہم پر بارش برسا، خوب بارش اچھے نتیجہ والی بارش۔ زمین کو سرسبز کرنے والی بارش، بھرپور بارش۔ جلدی آنے والی اور دیر نہ کرنے والی بارش

پھر آپ ﷺ منبر سے اتر آئے۔ اس کے بعد جس طرف سے بھی کوئی شخص آتا یہی کہتا، "ہمارے ہاں خوب بارش ہوئی ہے" (ابن ماجہ، ابو عوانہ)

شرجیل بن سمطؒ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت کعب بن مرۃؓ سے کہا۔ اے کعب ہمیں نبی ﷺ کی کوئی حدیث بیان فرمایئے۔ کہنے لگے، "قبیلۂ مضر سے نبی ﷺ کی خدمت میں ایک آدمی حاضر ہوا اور عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسول! قبیلہ مضر کے لئے بارش کی دعا فرمایئے! فرمایا تم بڑے جرأت مند آدمی ہو کیا قبیلہ مضر کے لئے دعا کروں؟ اس نے عرض کیا۔ "آپؐ نے اللہ سے مدد طلب کی تو اس نے آپؐ کی مدد کی۔ آپؐ نے اللہ سے دعا کی تو اس نے آپؐ کی دعا قبول فرمائی"۔ نبی ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور یہ دعا فرمائی۔

اَللّٰھُمَّ اسْقِنَا غَیْثًا مُّغِیْثًا مَرِیْئًا مُرِیْعًا طَبَقًا غَدَقًا عَاجِلًا غَیْرَ رَائِثٍ نَافِعًا غَیْرَ ضَارٍّ (نفع دینے والی اور نقصان نہ دینے والی- یہ دعا قبول ہوئی، یہاں تک کہ لوگوں نے پھر آپ ؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر کثرت بارش کی شکایت کی اور کہا ہمارے گھر منہدم ہو گئے "۔ آپ ؐ نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور یہ دعا فرمائی اَللّٰھُمَّ حَوَالَیْنَا لَا عَلَیْنَا "اے اللہ! ہم پر بارش نہ برسا۔ ہمارے اردگرد جہاں بارش کی ضرورت ہے، وہاں بارش برسا" (اس پر بادل دائیں اور بائیں چھٹنا شروع ہو گئے (احمد، ابن ماجہ، بیہقی، حاکم، ابن ابی شیبہ)

شعبیؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ اللہ تعالیٰ سے بارش طلب کرنے کے لئے شہر سے باہر نکلے مگر توبہ و استغفار کے علاوہ آپؓ نے نہ کوئی دعا کی اور نہ نماز پڑھی۔ لوگوں نے کہا۔ آپؓ نے اللہ تعالیٰ سے بارش کے لئے تو کوئی دعا ہی نہیں کی؟ فرمایا میں نے اللہ تعالیٰ سے آسمان کے ان ستاروں، یعنی توبہ و استغفار کے ذریعے دعا کی ہے جن کی موجودگی میں ضرور بارش ہوتی ہے۔ پھر آپؓ نے قرآن پاک کی یہ دو آیتیں پڑھیں۔

اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ اِنَّهٗ کَانَ غَفَّارًا — اللہ کے حضور بخشش طلب کرو بیشک وہ بڑا

یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِدْرَارًا — بخشنے والا ہے وہ تم پر خوب بارش برساتا ہوا بادل بھیجے گا۔

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَیْهِ — اللہ کے حضور بخشش طلب کرو اور توبہ کرو

۲۔ جمعہ کے روز امام خطبہ میں دعا کرے اور نمازی اس پر آمین کہیں: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ایک جمعہ کے روز منبر پر کھڑے خطبہ دے رہے تھے کہ ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا اور عرض کیا "اے اللہ کے رسول ﷺ! مال مویشی ہلاک ہو گئے اور راستے کٹ گئے (یعنی تنگدستی چھا گئی اور کوئی چیز ایسی نہیں رہی جسے فروخت کرنے کے لئے بازار جائیں) اللہ سے بارش کی دعا فرمایئے، نبی ﷺ نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور دعا فرمائی۔ اللھم اغثنا اللھم اَغِثْنَا (اے اللہ! ہم پر بارش برسا۔ اے اللہ ہم پر بارش برسا۔ اللہ کی قسم! اس وقت آسمان پر کسی قسم کا کوئی بادل نہیں تھا اور ہمارے اور کوہِ سَلَع کے درمیان کوئی گھر بھی نہیں تھا (کہ ہمیں بادل نظر نہ آتا ہو) اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ پہاڑ کے پیچھے سے ڈھال کی مانند ایک بادل اٹھ رہا ہے۔ جب وہ ہمارے اوپر آ گیا، تو پھیل گیا اور بارش ہونے لگی- اللہ کی قسم اس کے بعد ایک ہفتہ تک ہم نے سورج نہیں دیکھا۔ پھر اگلے جمعہ کے روز

جب نبی ﷺ منبر پر خطبہ دے رہے تھے تو وہی آدمی مسجد کے اسی دروازے سے داخل ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ: مال مویشی تباہ ہو گئے اور راستے رک گئے۔ اللہ سے دعا فرمایئے کہ بارش تھم جائے" نبی ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور دعا فرمائی:

اَللّٰھُمَّ حَوَالَیْنَا وَلَا عَلَیْنَا اَللّٰھُمَّ	اے اللہ! ہم پر بارش نہ برسا ہمارے ارد
عَلَی الْاٰکَامِ وَالظِّرَابِ بُطُوْنِ	گرد بارش برسا۔ اے اللہ! ٹیلوں اور
الْاَوْدِیَةِ وَمَنَابِتِ الشَّجَرِ	پہاڑیوں، وادیوں میں اور درختوں کے اگنے کی جگہوں میں۔

اسی وقت بارش تھم گئی اور جب ہم مسجد سے نکلے، تو دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ (بخاری و مسلم)

۳۔ شہر سے باہر نکل کر نماز پڑھی جائے: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک روز نبی ﷺ اللہ تعالیٰ سے بارش طلب کرنے کے لئے شہر سے باہر نکلے اور بغیر کسی اذان یا اقامت کے آپ نے ہمیں دو رکعت نماز پڑھائی، پھر خطبہ دیا۔ اور اللہ کے حضور دعا کی اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے قبلہ رخ ہو گئے۔ پھر اپنی چادر کے دائیں کنارے کو بائیں طرف اور بائیں کنارے کو دائیں طرف کر لیا" (احمد۔ ابن ماجہ، بیہقی)

حضرت عبداللہ بن زید مازنیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ بارش طلب کرنے کے لئے لوگوں کے ساتھ شہر سے باہر نکلے اور انہیں دو رکعت نماز پڑھائی جس میں جہری قرآت فرمائی"۔ (بخاری۔ مسلم۔ احمد۔ ابو داؤد۔ ترمذی۔ نسائی)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ لوگوں نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر بارش نہ ہونے کی شکایت کی۔ اس پر حضور ﷺ نے مسجد میں منبر رکھنے کا حکم دیا جو رکھ دیا گیا اور حضور ﷺ نے لوگوں سے ایک دن شہر سے باہر نکلنے کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ جب دھوپ کی روشنی پھیل گئی (یعنی جب سورج کو نکلے کچھ دیر ہو چکی) تو آپؐ شہر سے باہر نکلے آپؐ منبر پر بیٹھ گئے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اللہ اکبر، اللہ اکبر فرماتے رہے۔ پھر آپؐ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا "تم نے قحط سالی کی شکایت کی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دعا کرنے کا حکم دیا ہے اور تمہاری دعا قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے پھر آپؐ نے یہ دعا فرمائی:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ، اَللّٰهُمَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ ، اَنْتَ الْغَنِيُّ وَ نَحْنُ الْفُقَرَاءُ، اَنْزِلْ عَلَيْنَا الْغَيْثَ وَ اجْعَلْ مَا اَنْزَلْتَ قُوَّةً وَ بَلَاغًا اِلٰى حِيْنٍ

حمد و ثنا اللہ ہی کے لئے ہے۔ جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ رحمان اور رحیم ہے اور فیصلے کے دن کا مالک ہے۔ اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں۔ وہ جو چاہتا ہے ہے۔ اے اللہ! تیرے سوا کوئی الہ نہیں۔ تو ہی غنی و بے نیاز ہے اور ہم ہی فقیر و حاجت مند ہیں۔ ہم پر بارش نازل فرما اور جو تو اتارے اسے ہماری قوت کا باعث بنا اور اسے ایک مدت تک (یعنی عرصہ تک ہمیں اس کی ضرورت ہے) لمبا فرما۔

پھر آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور اٹھائے رکھے یہاں تک کہ ہمیں آپ ﷺ کی بغلوں کی سفیدی نظر آئی۔ پھر لوگوں کی طرف اپنی پیٹھ پھیر لی (یعنی قبلہ رخ ہو گئے) اور ہاتھ اٹھائے ہوئے اپنی چادر کو دائیں بائیں کر لیا۔ پھر لوگوں کی طرف رخ فرمایا اور منبر سے اتر کر دو رکعت نماز پڑھائی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک بادل بھیجا جو گرجا اور بجلی بھی چمکنے لگی۔ پھر اللہ کے حکم سے بارش ہوئی حضور ﷺ مسجد تک پہنچنے نہ پائے تھے کہ پانی کا سیلاب آگیا۔ جب حضور ﷺ نے لوگوں کو جلدی جلدی اپنے گھروں کی طرف بھاگتے دیکھا تو آپ ﷺ ہنسے۔ یہاں تک کہ آپؐ کی ڈاڑھیں نظر آنے لگیں اور فرمایا "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور میں اس کا بندہ اور رسول ہوں"۔ (حاکم۔ ابو داؤد۔ ابو عوانہ۔ ابن حبان)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ "نبی ﷺ نے بارش کے لئے دعا فرمائی اور اپنے ہاتھوں کی پشت کو آسمان کی طرف رکھا" (مسلم)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نہایت خشوع و خضوع اور عاجزی کے ساتھ اور اپنے معمول کے کپڑے پہنے ہوئے شہر سے باہر نکلے اور جیسا کہ عید میں نماز پڑھتے ہیں، آپؐ نے دو رکعت نماز پڑھی (۱) اور تمہارا یہ خطبہ (یعنی جیسا کہ جمعہ کے روز نماز سے پہلے خطبہ دیا جاتا ہے) نہیں دیا"۔ (ابو داؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

مندرجہ بالا احادیث کی روشنی میں:

۱۔ بارش کے لئے نماز (نماز استسقاء) مسنون ہے (۱)۔ جس کی عید کی نماز کی طرح دو رکعتیں

۲۔ عید کی نماز کی طرح نماز استسقاء میں جہری قرآت مسنون ہے (۲)

۳۔ اس کے لئے امام کا کوئی دن اور اور وقت (علاوہ ان اوقات کے جن میں نماز پڑھنا جائز نہیں) مقرر کر کے لوگوں کے ساتھ شہر سے باہر نکلنا مسنون ہے۔ (۳)

۴۔ اس نماز سے پہلے اور اس کے بعد اللہ کا ذکر کرنا اور قبلہ رخ ہو کر ہاتھوں کو الٹا کر کے اور خوب اوپر اٹھا کر دعا اور توبہ و استغفار کرنا مسنون ہے۔

۵۔ اس نماز سے پہلے یا بعد میں خطبہ دینا مسنون ہے۔ (۴)۔ اس بارے میں دونوں طرح کی احادیث موجود ہیں۔

۶۔ خطبہ کے لئے امام کا منبر پر چڑھنا مسنون ہے۔ (۵)

۷۔ جو لوگ چادر اوڑھے ہوئے ہوں۔ ان کا اپنی چادر کو دائیں اور بائیں کر لینا مسنون ہے (۶)

۸۔ اس نماز کے لئے خشوع و خضوع کے ساتھ روزمرہ کے معمولی کپڑوں میں نکلنا مسنون ہے۔

بارش کے لئے نبی ﷺ سے بعض اور دعائیں بھی ثابت ہیں جو درج ذیل ہیں

(الف) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ بارش کے لئے یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

---

(۱) ان الفاظ کی بنا پر امام شافعیؒ کے نزدیک استسقاء کی نماز میں عید کی طرح پہلی رکعت میں تکبیر تحریمہ کے علاوہ سات تکبیریں اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیریں کہی جائیں گی۔ یہی مسلک امام سعید بن مسیب، امام عمر بن عبدالعزیز، امام ابو یوسفؒ اور امام محمد مروی ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک عید کی طرح اس طرح سات اور پانچ تکبیریں کہنے اور نہ کہنے میں اختیار ہے۔ جمہور کا مسلک یہ ہے کہ استسقاء کی نماز دوسری عام نمازوں کی طرح ہی پڑھی جائے گی یعنی اس کے شروع میں سوائے تکبیر تحریمہ کے کوئی تکبیر نہیں ہو گی (نیل الاوطار ج ۴ ص ۵)

اَللّٰھُمَّ اسْقِنَا غَيْثًا مُّغِيْثًا مُّرِيْعًا غَدَقًا مُجَلِّلًا عَامًّا طَبَقًا سَحًّا دَائِمًا اَللّٰھُمَّ اسْقِنَا الْغَيْثَ وَلَا تَجْعَلْنَا مِنَ الْقَانِطِيْنَ، اَللّٰھُمَّ اِنَّ بِالْعِبَادِ وَالْبِلَادِ وَ الْبَهَائِمِ وَ الْخَلْقِ مِنَ اللَّاْوَاءِ وَالْجَهْدِ وَ الضَّنْكِ مَالَا نَشْكُوْهُ اِلَّا اِلَيْكَ اَللّٰھُمَّ اَنْبِتْ لَنَا الزَّرْعَ وَاَدِرَّ لَنَا الضَّرْعَ وَاسْقِنَا مِنْ بَرَكَاتِ السَّمَآءِ وَ اَنْبِتْ لَنَا مِنْ بَرَكَاتِ الْاَرْضِ، اَللّٰھُمَّ ارْفَعْ عَنَّا الْجَهْدَ وَ الْجُوْعَ وَالْعُرٰى وَ اكْشِفْ عَنَّا مِنَ الْبَلَاءِ مَالَا يَكْشِفُهٗ غَيْرُكَ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَغْفِرُكَ اِنَّكَ كُنْتَ غَفَّارًا، فَاَرْسِلِ السَّمَاءِ عَلَيْنَا مِدْرَارًا۔ (مسند امام شافعی)[1]

اے اللہ! ہم پر بارش نازل فرما' خوب بارش' زمین کو سرسبز کر دینے والی بارش۔ خوب بھرپور پھیلی ہوئی اور پے در پے ہمیشہ آنے والی بارش' اے اللہ! ہم پر بارش نازل فرما اور ہمیں مایوس نہ کر۔ اے اللہ! بندوں کو' زمین کو' بے زبان جانوروں کو اور تیری ساری مخلوق کو اتنی تکلیف اور تنگی ہے جس کی شکایت ہم صرف تیرے ہی آگے کر سکتے ہیں۔ اے اللہ! ہمارے لیے ہماری کھیتی اگا اور ہمارے لیے جانوروں کے تھنوں کو دودھ سے بھر دے ہمیں آسمان کی برکتوں سے سیراب کر اور زمین کی برکتوں کو کھیتوں کی شکل میں اگا۔ اے اللہ! ہماری تکلیف' تنگی' بھوک اور برہنگی دور کر دے اور ہماری وہ آزمائش ہم سے ٹال دے جسے تیرے سوا کوئی نہیں ٹال سکتا۔ اے اللہ! ہم تجھ سے بخشش چاہتے ہیں۔ بیشک تو ہی بخشنے والا ہے لہذا ہم پر مینہ برستا ہوا بادل بھیج۔

(۱) امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بارش کے لیے نماز مسنون نہیں' بلکہ اس کے لیے صرف دعا۔ استغفار اور توبہ مسنون ہے' لیکن حنابلہ کا راجح مسلک یہ ہے کہ بارش کے لیے نماز مستحب ہے۔ (نیل الاوطار ج ۴ ص ۴)

(۲) مالکیہ' شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک نماز استسقاء سنتِ مؤکدہ ہے (الفقہ --- ج ۱ ص ۳۵۹)

(۳) شافعیہ کے نزدیک نماز استسقاء کا وہی وقت ہے جو عید کی نماز کا ہے۔ مالکیہ کے نزدیک ان اوقات میں بھی نماز استسقاء جائز ہے جن میں نوافل کا پڑھنا جائز نہیں۔

(۴) حنفیہ' شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک نماز استسقاء کے بعد عید کی طرح دو خطبے ہیں۔ حنابلہ کا مسلک وہی ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔

(۵) حنفیہ کے نزدیک امام منبر پر خطبہ نہیں دے گا بلکہ زمین پر کھڑا ہو کر دے گا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے نزدیک منبر کو باہر لے جانے کا حکم ثابت نہیں ہے۔ (فتح القدیر ج' ص ۲۷۷)

(۶) حنفیہ کے نزدیک صرف امام اپنی چادر بدلے گا اور دوسرے نمازی نہیں بدلیں گے کیونکہ نبی ﷺ نے لوگوں کو اس کا حکم نہیں دیا۔ (ایضاح ا' ص ۲۷۸)

(ب) عمرو بن شعیب کے والد ان کے دادا کے ذریعہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ بارش کے لئے یہ دعا فرمایا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اسْقِ عِبَادَکَ وَ بَہَائِمَکَ وَانْشُرْ رَحْمَتَکَ وَحْیِ بَلَدَکَ الْمَیِّتَ (ابوداؤد)	اے اللہ! اپنے بندوں اور چوپایوں کو سیراب فرما۔ اپنی رحمت پھیلا اور اپنی مردہ زمین کو زندہ فرما۔

جب بارش ہونا شروع ہو تو اپنے بدن کے کسی حصے کو کھولنا اور "اَللّٰھُمَّ صَیِّبًا نَافِعًا (اے اللہ! اس بارش کو نفع بخش بنا)" کہنا مستحب ہے، جیسا کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ (بخاری۔ مسلم۔ احمد۔ ابوداؤد۔ نسائی)

(۱) امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں پسند کرتا ہوں کہ امام یہی دعا کرے (محمد)

صلوٰۃ الضحٰی

(چاشت کی نماز)

۱۔ فضیلت

چاشت کی نماز کی فضیلت میں متعدد احادیث ثابت ہیں جن میں سے ہم تین کا ذکر کرتے ہیں:

(الف) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میرے حبیب ﷺ نے مجھے تین چیزوں کی نصیحت فرمائی ہے۔ ہر مہینے میں تین دن روزہ رکھنے کی، چاشت کی دو رکعتوں کی اور اس بات کی کہ سونے سے پہلے وتر پڑھ لوں۔ (بخاری و مسلم) مسلم کی دوسری روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں "ہر روز چاشت کی دو رکعتوں کی"۔

(ب) حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہر صحیح و سالم جوڑ یا ہڈی کے عوض ہر روز صبح کو تم پر صدقہ واجب ہوتا ہے، لہٰذا تمہارا ہر "سبحان اللہ" کہنا صدقہ ہے، ہر الحمد للہ، کہنا صدقہ ہے، ہر اللہ اکبر، کہنا صدقہ ہے، ہر لا الہ الا اللہ، کہنا صدقہ ہے۔ ہر نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے، ہر برائی سے روکنا صدقہ ہے اور ان سب کے لئے وہ دو رکعتیں کافی ہو جاتی ہیں جنہیں کوئی شخص چاشت کے وقت پڑھتا ہے" (احمد، مسلم، ابوداؤد)

(ج) حضرت نواس بن سمعانؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا اللہ عزوجل فرماتا ہے "اے آدم کے بیٹے! تو دن کے شروع کے حصے میں چار رکعتوں سے عاجز نہ بن (یعنی انہیں پڑھتا رہ) میں دن کے آخری حصے میں تیرے لئے کافی ہو جاؤں گا"۔ (یعنی تیرے برے بھلے کی نگرانی میں اپنے ذمہ لوں گا" (حاکم، طبرانی، احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

۲۔ حکم

چاشت کی نماز سنت ہے، اگرچہ مؤکدہ نہیں یعنی جو شخص ثواب کی نیت سے اسے پڑھے، اس کے لئے ثواب ہے اور جو شخص نہ پڑھے اس پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ "نبی ﷺ چاشت کی نماز پڑھا کرتے تھے، یہاں تک کہ

ہم کہتے کہ اب آپ ﷺ اسے ترک نہ فرمائیں گے۔ پھر آپ ﷺ اسے ترک کر دیتے یہاں تک کہ ہم کہتے کہ اب آپ ﷺ اسے نہیں پڑھیں گے"۔ (ترمذی)

۳۔ وقت

چاشت کی نماز کا وقت سورج کے ایک نیزہ کے برابر بلند ہو جانے سے شروع ہو کر زوال تک باقی رہتا ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ اتنی تاخیر کی جائے کہ سورج بلند ہو جائے اور دھوپ میں گرمی آجائے۔ حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے۔ کہ ایک روز نبی ﷺ اہل قبا کے ہاں تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ لوگ چاشت کی نماز پڑھ رہے ہیں۔ فرمایا: اللہ کی طرف رجوع ہونے والوں کی نماز (یعنی چاشت کی نماز) اس وقت ہے جب کہ اونٹوں کے بچوں کے پاؤں گرم ہوتے ہیں (یعنی جب زمین خوب تپ جاتی ہے) (۱) (احمد۔ مسلم۔ ترمذی)

۴۔ تعدادِ رکعات

چاشت کی نماز کی رکعتوں کی کم سے کم تعداد دو ہے جیسا کہ اوپر حضرت ابوذرؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے اور اس سے زیادہ رکعتوں کی کوئی حد نہیں ہے۔ یوں نبی ﷺ کے عمل سے زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعتیں اور آپ کے ارشاد سے زیادہ سے زیادہ بارہ رکعتیں ثابت ہیں:

حضرت اُمِ ہانیؓ سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے روز نبی ﷺ میرے ہاں تشریف لائے آپ ﷺ نے غسل فرمایا اور آٹھ رکعت نماز پڑھی۔ میں نے اتنی ہلکی نماز کوئی نہیں دیکھی، البتہ آپؐ رکوع اور سجدے پوری طرح فرماتے تھے"۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ "اور یہ چاشت کی نماز تھی"۔ (بخاری و مسلم)

حضرتِ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ چاشت کی چار رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور (کبھی) اس سے زیادہ جتنی رکعتیں چاہتے پڑھ لیتے"۔ (مسلم)

حضرتِ انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے چاشت کی بارہ رکعتیں پڑھیں، اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے جنت میں سونے کا ایک محل بنا دیا" (ترمذی۔ ابن ماجہ) امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو غریب قرار دیا ہے۔

---

(۱) حنفیہ، شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک افضل یہ ہے کہ چاشت کی نماز چوتھائی دن گزر جانے کے بعد شروع کی جائے مالکیہ کے نزدیک افضل یہ ہے کہ سورج نکلنے کے بعد اتنا وقت گزر جائے جتنا وقت عصر اور مغرب کے درمیان ہوتا ہے (الفقہ ج ۱ ص ۳۳۲)

سجدۂ سہو

نماز میں بھول جانے پر جو سجدے کیے جاتے ہیں، انہیں سجدۂ سہو کہتے ہیں۔ ان کی تعداد دو ہے۔ نبی ﷺ بھی بعض اوقات نماز میں بھول جایا کرتے تھے اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے "میں بھی ایک انسان ہوں، جس طرح تم بھول جاتے ہو، میں بھی بھول جاتا ہوں، لہٰذا جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد دہانی کرا دو" (بخاری۔ مسلم۔ ابو داؤد۔ احمد۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب انسان اپنی نماز میں کمی یا زیادتی کر جائے تو اسے چاہئے کہ دو سجدے کرے"۔ (مسلم)

ا۔ سجدۂ سہو کا وقت

سجدۂ سہو کا نماز کی آخری رکعت میں سلام سے پہلے کرنا بھی جائز ہے اور بعد میں بھی یہ دونوں چیزیں نبی ﷺ سے ثابت ہیں۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں بھول جائے اور یہ نہ جانے کہ اس نے تین رکعت نماز پڑھی ہے یا چار، تو اسے چاہئے کہ اپنا شک دور کرے اور یقین حاصل کرے اور پھر سلام سے پہلے دو سجدے کر لے۔ اس طرح اگر اس نے پانچ رکعتیں پڑھ لیں تو اس کی نماز شفع ہو جائے گی اور اگر چار پڑھیں تو اس کی نماز پوری ہو جائے گی اور شیطان کی ذلت کا باعث ہو گی"۔ (احمد۔ مسلم۔ ابو داؤد)

محمد بن سیرینؒ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک روز نبی ﷺ نے ہمیں ظہر یا عصر کی نماز پڑھائی اور دو رکعتوں کے بعد سلام پھیر دیا۔ پھر آپؐ ایک لکڑی کے پاس آئے جو مسجد میں رکھی ہوئی تھی۔ آپؐ کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے اور آپ نے اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھا ہوا تھا اور انگلیاں آپس میں ملائی ہوئی تھیں۔ پھر آپؐ نے اپنا چہرہ مبارک بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھا۔ اتنے میں لوگ جلدی سے آپؐ کے پاس پہنچے اور کہنے لگے کہ نماز کم ہو گئی؟ اس وقت لوگوں میں حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ اور دوسرے جلیل القدر صحابہؓ بھی

موجود تھے۔ لیکن کسی کو آپؐ سے بات کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ لوگوں میں ایک آدمی لمبے بازوؤں والا تھا۔ اس نے کہا "اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا آپؐ بھول گئے ہیں یا نماز ہی کم ہو گئی ہے؟ فرمایا نہ میں بھولا ہوں اور نہ نماز کم ہوئی ہے" پھر آپ ﷺ نے دوسرے لوگوں سے دریافت فرمایا "کیا یہ شخص درست کہہ رہا ہے؟" لوگوں نے عرض کیا "جی"۔ اس پر حضور ﷺ آگے بڑھے اور جو نماز رہ گئی تھی اسے پورا کیا۔ پھر سلام پھیرا پھر اللہ اکبر کہہ کر نماز کی طرح سجدہ یا اس سے لمبا سجدہ کیا۔ پھر اللہ اکبر، کہہ کر سر اٹھایا، پھر اللہ اکبر، کہہ کر سجدہ کیا۔ پھر اللہ اکبر، کہہ کر سر اٹھایا۔ اس کے بعد جب محمد بن سیرین سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا اس کے بعد حضور نے پھر سلام پھیرا؟ تو انہوں نے کہا کہ مجھے عمران بن حصینؓ سے معلوم ہوا ہے کہ حضور ﷺ نے اس کے بعد پھر سلام پھیرا"۔ (بخاری و مسلم)

اس بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ سجدۂ سہو کا سلام سے پہلے کرنا بھی جائز ہے اور بعد میں بھی۔ اختلاف صرف افضل ہونے میں ہے (1)

---

(1) اس بارے میں سلف کے مختلف مسلک ہیں، جن میں سے پانچ یہ ہیں:

1- سلام کے بعد: یہ صحابہ میں سے حضرت علیؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، عمار بن یاسرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عمران بن حصینؓ، انس بن مالکؓ، مغیرہ بن شعبہؓ اور تابعین میں سے ابو سلمٰی بن عبدالرحمٰن۔ حسن بصری۔ ابراہیم نخعیؒ۔ عمر بن عبدالعزیز، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ کا مسلک ہے اور یہی مسلک امام سفیانؒ ثوری، امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے اصحاب کا ہے۔

2- سلام سے پہلے: صحابہ میں سے یہ حضرت ابو سعید خدریؓ اور ایک روایت میں حضرت ابو ہریرہؓ، ابن عباسؓ، معاویہؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ کا مسلک ہے اور یہی مسلک امام زہریؒ، مکحولؒ، ابن ابی ذئبؒ، اوزاعیؒ، لیث بن سعدؒ اور شافعیؒ کا ہے۔

3- جہاں نماز میں کمی ہو وہاں سلام سے پہلے اور جہاں زیادتی ہو وہاں سلام کے بعد: یہ امام مزنیؒ، ابو ثورؒ، امام مالکؒ اور آپ کے اصحاب کا مسلک ہے۔

4- جس موقع پر سلام سے پہلے یا سلام کے بعد سجدۂ سہو حدیث سے ثابت ہے۔ وہاں اسی طرح سجدہ کیا جائے اور جہاں کوئی چیز حدیث سے ثابت نہیں ہے، وہاں سلام سے پہلے سجدۂ سہو کیا جائے۔ یہ امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک ہے۔

5- جس موقع پر سجدۂ سہو حدیث سے ثابت ہے وہاں اسی طرح سجدہ کیا جائے گا اور جہاں کوئی چیز ثابت نہیں ہے' وہاں کمی کے وقت سلام سے پہلے اور زیادتی کے وقت سلام کے بعد سجدۂ سہو کیا جائے گا۔ یہ امام اسحاق بن راہویہ کا مسلک ہے (نیل الاوطار ج ۲ ص ۹۱)

۲۔ سجدۂ سہو کا طریقہ

سجدۂ سہو اگر سلام سے پہلے ہو، تو آخری رکعت میں تشہد، درود اور دعا کے بعد دو سجدے کرنے چاہئیں۔ اس طرح کہ سجدہ میں جاتے اور سجدہ سے اٹھتے وقت 'اللہ اکبر' کہا جائے، پھر دونوں طرف سلام پھیر لینا چاہئے، جیسا کہ اوپر حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے ثابت ہے۔

اور اگر سجدۂ سہو سلام کے بعد ہو، تو آخری رکعت میں تشہد، درود اور دعا کے بعد دونوں طرف سلام پھیر لینا چاہئے۔ پھر دو سجدے کرنے چاہئیں، اس طرح کہ سجدہ میں جاتے وقت اور اٹھتے وقت اللہ اکبر کہا جائے اور دونوں سجدوں کے بعد دوبارہ سلام پھیرا جائے جیسا کہ اوپر محمد بن سیرینؒ کی حدیث سے ثابت ہے۔

ابو داؤد اور ترمذی میں حضرت عمران بن حصینؓ کی ایک روایت میں سلام سے پہلے تشہد کا بھی ذکر ہے۔ لیکن محدثین نے اس روایت کو کمزور قرار دیا ہے۔(۱)

۳۔ سجدۂ سہو کن صورتوں میں کیا جائے گا؟

سجدہ سہو مندرجہ ذیل صورتوں میں کیا جائے گا:

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک آخری رکعت میں تشہد کے بعد اور احتیاط یہ ہے کہ تشہد، درود اور دعا کے بعد، دائیں طرف ایک سلام پھیرا جائے گا پھر دو سجدے کئے جائیں گے۔ پھر بیٹھ کر تشہد، درود اور دعا پڑھی جائے گی اور پھر دونوں طرف سلام پھیرا جائے گا۔

شافعیہ کے نزدیک سلام سے پہلے دو سجدے کئے جائیں گے اور ان کی شکل وہی ہے جو اوپر حضرت ابو سعیدؓ کی حدیث میں بیان ہوئی ہے۔

حنبلیہ کے نزدیک یہ دونوں سجدے سلام سے پہلے بھی ہیں اور بعد میں بھی۔ اگر سلام سے پہلے ہوں تو ان کی شکل وہی ہوگی جو اوپر بیان ہوئی ہے اور اگر بعد میں ہوں تو ان کے بعد تشہد پڑھ لیا جائے گا اور پھر دونوں طرف سلام پھیرا جائے گا۔

مالکیہ کے نزدیک اگر سجدے سلام سے پہلے ہوں تو پہلے دو سجدے کئے جائیں گے اور پھر صرف تشہد (بلا درود و دعاء) کے بعد دونوں طرف سلام پھیرا جائے گا۔ اگر یہ سجدے سلام کے بعد ہوں تو پہلے دو سجدے کئے جائیں گے پھر بیٹھ کر تشہد (بلا درود و دعا) پڑھا جائے گا اور پھر دونوں طرف سلام پھیرا جائے گا۔ (الفقہ ج۱، ص ۴۵۲)

۱۔ جب کہ نماز پوری ہونے سے پہلے سلام پھیر لیا جائے جیسا کہ اوپر محمد بن سیرینؒ کی روایت سے ثابت ہے۔

محمد بن سیرینؒ کی اس روایت سے یہ بھی ثابت ہے کہ جو شخص نماز پوری کرنے سے پہلے سلام پھیر لے، تو اس کی نماز باطل نہیں ہوتی۔ وہ اپنی نماز کو پورا کر سکتا ہے خواہ وہ بات چیت یا کوئی ایسا کام بھی کر لے جو نماز کے منافی ہو۔ (۱)

۲۔ جب کہ نماز زیادہ پڑھ لی جائے: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ایک روز نبی ﷺ نے ہمیں ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھائیں۔ آپؐ سے صحابہؓ نے عرض کیا "کیا نماز زیادہ ہو گئی ہے؟ فرمایا "یہ کیوں دریافت کر رہے ہو؟ صحابہؓ نے عرض کیا "آپ نے پانچ رکعتیں پڑھی ہیں" تو آپ نے سلام کے بعد دو سجدے کئے"

(بخاری۔ مسلم۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص چوتھی رکعت میں نہ بیٹھے اور پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو جائے تو اس کی نماز ہو جاتی ہے۔ (۲)

۳۔ دوسری رکعت کا تشہد بھول جانے کے وقت (۳) : حضرت ابن بحینہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے نماز پڑھائی، دوسری رکعت میں تشہد پڑھے، بغیر کھڑے ہو گئے۔ لوگوں نے

---

(۱) حنفیہ حضرت ابن عباسؓ کی ایک حدیث (جس میں نبی ﷺ نے نماز میں بات چیت کرنے سے منع فرمایا ہے) کی وجہ سے محمد بن سیرینؒ کی روایت کو منسوخ مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر انسان نماز پوری کرنے سے پہلے سلام پھیر لے اور بات کر لے تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی اور وہ دوبارہ نماز پڑھے گا۔

(عالمگیری، سبل السلام ج ۱ ص ۲۱۳)

(۲) حنفیہ کے نزدیک آخری رکعت میں تشہد کے لئے بیٹھنا فرض ہے اس لئے اگر کوئی شخص چوتھی رکعت میں بیٹھے بغیر کھڑا ہو گیا تو جب تک اس نے پانچویں رکعت کا سجدہ نہ کیا ہو۔ اسے چاہئے کہ چوتھی رکعت کے قعدہ (بیٹھنے) کی طرف لوٹ آئے اور تشہد پڑھ کر سجدہ سہو کر لے۔ نماز ہو جائے گی اور اگر اس نے پانچویں رکعت کا سجدہ کر لیا تو ایک اور رکعت کا اضافہ کر لے تاکہ چھ رکعت نفل ہو جائیں اور آخر میں سجدہ سہو کر لے اس صورت میں فرض بہ سبب ترک قعدۂ اخیرہ کے جاتے رہے (یعنی فرض نماز دوبارہ پڑھے)

(تنویر الابصار۔ در مختار)

(۳) حنفیہ کے نزدیک ہر واجب کو سہواً ترک یا موخر کرنے سے سجدۂ سہو لازم آتا ہے اسی طرح سہواً تاخیر واجب کرنے سے بھی سجدۂ سہو لازم آتا ہے (دیکھئے باب نماز کے فرائض) (عالمگیری)

"سبحان اللہ" کہا مگر آپ کھڑے رہے، جب نماز پوری کر لی تو دو سجدے کئے اور سلام پھیرا"
(بخاری مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم سے کوئی شخص دوسری رکعت میں بیٹھے بغیر کھڑا ہونے لگے تو اگر وہ پوری طرح کھڑا نہ ہوا ہو تو اسے چاہیئے کہ بیٹھ جائے اور اگر کھڑا ہو جائے تو اسے چاہیئے کہ پھر نہ بیٹھے بلکہ آخر میں دو سجدہ سہو کرے" (احمد۔ ابو داؤد۔ ابن ماجہ) اگرچہ یہ حدیث ضعیف ہے (نیل الاوطار)

۴۔ نماز میں شک کے وقت:

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں بھول جائے اور یہ نہ جانے کہ اس نے تین رکعت نماز پڑھی ہے یا چار، تو اسے چاہیئے کہ اپنا شک دور کرے اور یقین حاصل کرے اور پھر سلام سے پہلے دو سجدے کر لے"۔ (احمد۔ مسلم۔ ابو داؤد)

دوسری حدیث میں شک دور کرنے اور یقین حاصل کرنے کی صورت یوں بتائی گئی ہے: حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ "جب تم میں سے کسی شخص کو نماز میں یہ شک ہو جائے کہ اس نے ایک رکعت پڑھی ہے یا دو، تو اسے چاہیئے کہ اپنی ایک ہی رکعت سمجھے۔ جب اسے یہ شک ہو کہ اس نے دو رکعتیں پڑھی ہیں یا تین اسے چاہیئے کہ اپنی دو ہی رکعتیں سمجھے اور جب اسے یہ شک ہو کہ اس نے تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار تو اسے چاہیئے کہ اپنی تین ہی رکعتیں سمجھے، پھر نماز کے آخر میں سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کر لے [1] (احمد۔ ابن ماجہ۔ ترمذی)

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک مذکورہ بالا دو حدیثوں میں سے پہلی حدیث اس شخص کے لئے ہے جسے اپنی نماز میں شک تو ہو جائے لیکن اسے گمان غالب حاصل ہو۔ ایسے شخص کو چاہیئے کہ اپنی رکعت وہ شمار کرے جس کا اسے گمان غالب ہو۔ دوسری حدیث ایسے شخص کے لئے ہے جسے اپنی نماز میں شک ہو جائے اور اسے کوئی گمان غالب نہ ہو۔ دوسروں کے نزدیک یہ فرق نہیں ہے نیز حنفیہ کے نزدیک اگر انسان نماز میں شک کا عادی نہ ہو اور اسے عمر میں پہلی مرتبہ یا نماز کے شروع میں شک پیش آئے تو سلام پھیر کر اپنی نماز توڑ لینی چاہیئے اور از سر نو نماز پڑھنی چاہیئے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے اسے اپنی نماز دہرانی چاہیئے۔ اس بارے میں بعض احادیث بھی ہیں جو حنفیہ کے نزدیک معتبر ہیں اور دوسروں کے نزدیک کمزور ہونے کی وجہ سے معتبر نہیں ہیں
(ہدایہ و نیل الاوطار ج ۱' ص ۶)

سجدۂ تلاوت

قرآن پاک میں بعض مقامات ایسے ہیں جنہیں انسان جب پڑھے یا کسی کو پڑھتے ہوئے سنے تو اسے سجدہ کرنا چاہئے۔ اس سجدہ کو سجدۂ تلاوت کہتے ہیں۔

ا۔ حکم

جمہور کے نزدیک سجدۂ تلاوت پڑھنے اور سننے والے دونوں کے لئے سنت ہے (۱) یعنی اس کا کرنا باعثِ اجر ہے اور نہ کرنا گناہ نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ جمعہ کے خطبہ میں حضرت عمرؓ نے سورہ نحل تلاوت فرمائی۔ جب سجدہ کے مقام پر پہنچے تو منبر سے اتر کر سجدہ کیا اور لوگوں نے بھی سجدہ کیا۔ آئندہ جمعہ کے خطبہ میں آپ نے پھر یہی

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک سجدہ تلاوت (پڑھنے اور سننے والے دونوں پر) واجب ہے کہ کیونکہ سجدہ تلاوت کی قرآن اور حدیث دونوں میں سخت تاکید ہے اور اسکی بڑی فضیلت ہے اس واجب کی ادائیگی کی مدت کبھی زیادہ ہوتی ہے اور کبھی کم۔ زیادہ اس وقت ہوتی ہے جب کہ انسان نماز سے باہر آیتِ سجدہ پڑھے۔ اس صورت میں اگر وہ مرتے دم تک بھی سجدہ کرلے تو گناہ سے بچ جائے گا اور مرتے دم تک بھی اس نے سجدہ نہ کیا تو وہ گنہگار ہوگا۔ کم مدت اس وقت ہوتی ہے جب کہ انسان نماز کے اندر آیتِ سجدہ پڑھے۔ اس صورت میں اسے فوراً سجدہ کرنا چاہئے۔ فوراً کی مقدار یہ ہے کہ آیت سجدہ کی تلاوت اور سجدہ کے درمیان تین آیتوں سے زیادہ وقفہ نہ ہو۔ پھر نماز کے اندر آیتِ سجدہ کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ قرآت کے وسط میں آئے۔ اس صورت میں فوراً سجدہ کرنا بہتر ہے اگر رکوع کر لیا جائے اور رکوع کے اندر ہی سجدہ کی نیت کرلی جائے تو بھی سجدہ ادا ہو جائے گا بشرطیکہ یہ رکوع فوراً کی مدت ختم ہونے سے پہلے کیا جائے اور اگر فوراً کی یہ مدت گزر گئی تو پھر رکوع میں سجدہ نہیں ہوگا۔ اس کے لئے الگ سجدہ کیا جائے گا۔ خواہ نماز کے اندر سلام سے پہلے یا سلام کے بعد یہ سجدہ تلاوت کی قضا ہوگی۔ نماز کے اندر آیتِ سجدہ کی دوسری صورت یہ ہے کہ وہ قرآت کے آخر میں آئے۔ اس صورت میں بہتر یہ ہے کہ سجدہ نہ کیا جائے بلکہ رکوع ہی کرلیا جائے اور اس میں سجدہ کی بھی نیت کرلی جائے۔ اگر سجدہ کیا جائے تو بہتر یہ ہے کہ رکوع کرنے سے پہلے چند آیتیں اور پڑھ لی جائیں۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ص ۴۶۴، التعلیق الصبیح ج ۲ص ۲۵)

سورت تلاوت فرمائی جب سجدہ کے مقام پر پہنچے تو سجدہ نہیں کیا بلکہ فرمایا "اے لوگو! ہمیں سجدہ کا حکم نہیں دیا گیا، جس نے سجدہ کیا اس نے بہتر کیا اور جس نے نہیں کیا اس پر کوئی گناہ نہیں"۔

دوسری روایت میں ہے "ہم پر سجدہ فرض نہیں کیا گیا، الّا یہ کہ ہم کرنا چاہیں"۔

حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو سورہ والنجم سنائی تو آپ نے اس میں سجدہ نہیں فرمایا" (بخاری۔ مسلم۔ ابو داؤد۔ احمد۔ ترمذی۔ نسائی)

حالانکہ اس سورت میں سجدہ کا ثبوت حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے ملتا ہے کہ نبی ﷺ نے سورہ والنجم میں سجدہ فرمایا اور ہم نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا۔

(دار قطنی۔ بزار)

اس بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ جب تلاوت کرنے والا خود سجدہ کرے تو سننے والے پر بھی سجدہ ضروری ہے لیکن اس بارے میں اختلاف ہے کہ اگر تلاوت کرنے والا خود سجدہ نہ کرے تو کیا سننے والے پر سجدہ ضروری ہے یا نہیں۔ اکثر ائمہ کے نزدیک اس صورت میں بھی سجدہ ضروری ہے (۱)

---

(۱) امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، اور امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔ البتہ ان کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ "سننے والے سے کیا مراد ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک محض سننا کافی ہے خواہ یہ قصداً ہو یا بغیر قصد کے امام مالک کے نزدیک سجدہ صرف ایسے سننے کی وجہ سے ہے جو قصداً ہو۔ امام شافعیؒ کے نزدیک بغیر قصد کے سننے والے پر سجدہ ضروری نہیں ہے، لیکن اس کے لئے ایسا کرنا اچھا ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک اگر تلاوت کرنے والا خود سجدہ نہ کرے تو سننے والے پر سجدہ ضروری نہیں ہے۔ ان کا استدلال عطاء بن یسار کی اس روایت سے ہے کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ کے پاس سجدہ کی آیت پڑھی، اس نے سجدہ کیا، تو نبی ﷺ نے سجدہ فرمایا پھر ایک دوسرے شخص نے سجدہ کی کوئی آیت پڑھی اور اس نے سجدہ نہیں کیا تو نبی ﷺ نے بھی سجدہ نہیں فرمایا۔ اس نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول۔ فلاں شخص نے آپ کے پاس سجدہ کی آیت پڑھی تو آپ نے سجدہ فرمایا اور میں نے سجدہ کی آیت پڑھی تو آپ نے سجدہ نہیں فرمایا۔ فرمایا "تم ہمارے امام تھے۔ اگر تم سجدے کرتے تو ہم بھی سجدہ کرتے"۔ (مسند امام شافعیؒ)

اس اختلاف کی وجہ سے عطاء بن یسارؒ کی یہ حدیث مرسل ہے (یعنی اس میں صحابی کا ذکر نہیں ہے) لہٰذا امام احمدؒ کے نزدیک یہ معتبر ہے اور دوسروں کے نزدیک معتبر نہیں ہے۔

سننے والے کی تعریف میں امام احمدؒ کا مسلک امام مالکؒ کے مطابق ہے۔

(فتح الربانی ج ۴ ص ۱۶۴۔ المغنی ج ۲ ص ۲۵۳)

۲۔ فضیلت

سجدۂ تلاوت کی بڑی فضیلت ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب انسان قرآن پڑھتے ہوئے سجدہ کے مقام پر پہنچتا اور سجدہ کرتا ہے تو اس سے شیطان روتے ہوئے الگ ہو جاتا ہے "اور کہتا ہے "ہائے تباہی! اسے سجدہ کا حکم ملا اور اس نے سجدہ کر دیا، تو اس کے لئے جنت ہے اور مجھے سجدہ کا حکم ملا اور میں نے نہیں کیا تو میرے لئے آگ ہے"۔ (احمد۔ مسلم۔ ابن ماجہ)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب کوئی ایسی سورت تلاوت فرماتے جس میں سجدہ ہوتا تو سجدہ فرماتے اور ہم بھی سجدہ کرتے یہاں تک کہ ہم میں سے بعض لوگ سجدہ کرنے کے لئے جگہ بھی نہ پاتے۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد)

۳۔ شرائط

نبی ﷺ سے اس چیز کا حکم یا ثبوت نہیں ملتا کہ سجدہ تلاوت کے لئے قبلہ رخ ہونا اور باوضو ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ وہ بغیر وضو کے سجدہ کر لیتے تھے (بخاری۔ ابن ابی شیبہ) اسی طرح حضرت ابو عبدالرحمٰن سلمیؒ کے متعلق روایت ہے کہ جب وہ تلاوت کرتے ہوئے سجدہ کے مقام پر پہنچتے تو قبلہ رخ ہوئے بغیر بلاوضو سجدہ کر لیتے تھے اور چلتے چلتے اشارہ سے سجدہ کر لیتے تھے"۔ (ابن ابی شیبہ)

لیکن دوسرے صحابہؓ اور ائمہ کے نزدیک سجدۂ تلاوت کے لئے نماز ہی کی طرح باستر قبلہ رخ اور باوضو ہونا ضروری ہے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں شعبیؒ کے سوا اس بات پر ابنِ عمرؓ کی کوئی موافقت نہیں کرتا کہ وضو کے بغیر سجدہ تلاوت کرنا جائز ہے"۔

سجدہ کرتے اور سجدہ سے اٹھتے وقت اللہ اکبر کہنا سنت ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ہمیں قرآن سنایا کرتے تھے۔ جب سجدہ کے مقام پر پہنچتے تو اللہ اکبر کہتے ہوئے سجدہ فرماتے اور ہم بھی سجدہ کرتے"۔ (ابوداؤد۔ بیہقی۔ حاکم)

حضرتِ عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں جب تم سجدہ کے مقام پر پہنچو تو 'اللہ اکبر' کہہ کر سجدہ کرو اور جب سجدہ سے سر اٹھاؤ تو اللہ اکبر کہو (۱) (ابوداؤد)

---

(۱) حنابلہ اور شافعیہ کے نزدیک سجدے کے بعد بیٹھ کر سلام پھیرنا بھی مستحب ہے (الفقہ ج ۱ ص ۴۶۸)

۴۔ دعا

سجدہ تلاوت میں حدیث سے دو دعائیں ثابت ہیں۔

(الف) حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ قرآن کے سجدہ میں یہ دعا فرمایا کرتے تھے۔

سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ خَلَقَهُ وَشَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ بِحَوْلِهِ وَ قُوَّتِهِ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ

(احمد۔ابوداود۔ترمذی۔نسائی۔حاکم)

میرے چہرے نے اس ذات پاک کو سجدہ کیا جس نے اسے پیدا کیا اور اس کے کان بنائے اور اس میں آنکھیں رکھیں۔ یہ سب اس کی توفیق اور طاقت سے ہے اللہ کی ذات پاک ہے جو سب سے اچھا پیدا کرنے والا ہے۔

(ب) حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آدمی آیا اور اس نے کہا میں نے رات خواب میں دیکھا کہ کسی درخت کی جڑ کی طرف رخ کئے نماز پڑھ رہا ہوں جب میں قرآن پڑھتے ہوئے ایک ایسے مقام پر آیا جہاں سجدہ تھا، تو میں نے سجدہ کیا اور درخت نے بھی میرے ساتھ ہی سجدہ کیا۔ اس وقت میں نے اسے یہ دعا پڑھتے ہوئے سنا۔

اَللّٰهُمَّ اَحْطُطْ عَنِّيْ وِزْرًا وَاكْتُبْ لِيْ بِهَا اَجْرًا وَاجْعَلْهَا لِيْ عِنْدَكَ ذُخْرًا

(ترمذی۔ابن ماجہ)

اے اللہ! اس سجدہ کے ذریعے میرا ایک بوجھ (گناہ) میرے اوپر سے ہٹا دے اور ایک اجر میرے لئے لکھ دے اور اسے اپنے ہاں میرے لئے بطور توشہ جمع رکھ۔

ترمذی میں یہ الفاظ زیادہ ہیں:

وَتَقَبَّلْهَا مِنِّيْ كَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ عَبْدِكَ (ابوداؤد)

اور اسے مجھ سے اس طرح قبول فرما جس طرح تو نے اپنے بندے داؤد کا سجدہ قبول فرمایا تھا

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے تلاوت کے وقت جب سجدہ فرمایا تو اسی طرح کی دعا پڑھی"۔

سجدہ تلاوت میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى کا پڑھنا بہرحال صحیح ہے۔

۵۔ نماز میں سجدۂ تلاوت

جمہور ائمہ کے نزدیک انسان جب تنہا نماز پڑھ رہا ہو یا جب وہ جماعت کی امامت کرا رہا ہو تو اس کے لئے نماز میں، خواہ وہ جہری ہو یا سری، فرض ہو یا نفل، سجدہ تلاوت کرنا مستحب ہے (الفتح الربانی ج ۴، ص ۱۶۴)

ابو رافعؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہؓ کے پیچھے عشاء کی نماز پڑھی۔ قرآت کرتے ہوئے جب آپ اِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ پر پہنچے تو آپ نے سجدہ کیا۔ میں نے (بعد میں) ان سے دریافت کیا "یہ کیسا سجدہ ہے"؟ (یعنی کیا نماز کے اندر بھی سجدۂ تلاوت کیا جا سکتا ہے؟) فرمایا "میں نے ابو القاسمؐ کے پیچھے نماز پڑھی تو ہم نے اس میں سجدہ تلاوت کیا۔ اس کے بعد میں سجدہ کرتا رہوں گا یہاں تک کہ حضور ﷺ سے جا ملوں" (بخاری و مسلم)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ نے ظہر کی نماز کی پہلی رکعت میں سجدہ تلاوت فرمایا تو صحابہؓ سمجھ گئے کہ آپ نے سورہ تنزیل السجدہ پڑھی ہے" (احمد۔ ابو داؤد۔ حاکم) (۱)

۶۔ قرآنِ پاک میں سجدے کے مقامات

قرآنِ پاک میں سجدہ کی کل تعداد پندرہ ہے۔ حضرت عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مجھے قرآن پاک میں پندرہ سجدے پڑھائے جن میں سے تین سور مفصل میں اور دو سورہ حج میں ہیں"۔ (ابو داؤد۔ ابن ماجہ۔ حاکم)

(اس روایت کی سند حسن درجہ کی ہے، اس لئے ائمہ کے درمیان سجدوں کی تعداد

---

(۱) امام مالکؒ کے نزدیک ایک روایت کے مطابق جماعت میں خواہ وہ سری ہو یا جہری، سجدہ تلاوت مکروہ ہے- دوسری روایت کے مطابق ان کے نزدیک فرض نماز کی جماعت میں سجدہ تلاوت کیا جا سکتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک سری نماز میں سجدۂ تلاوت مکروہ ہے کیونکہ اس سے مقتدیوں میں گڑبڑ پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے' اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کی مذکورہ بالا روایت (جس میں سری نماز میں سجدۂ تلاوت کا ذکر ہے) سند کے لحاظ سے پوری طرح صحیح نہیں ہے (الفتح الربانی ج ۴، ص ۱۶۱)

میں اختلاف ہے)(۱)

۱۔ سورۃ اعراف آیت ۲۰۶ ۲۔ سورۃ رعد آیت ۱۵ ۳۔ سورۃ نحل آیت ۴۹

۴۔ سورۃ بنی اسرائیل ۱۰۷ ۵۔ سورۃ مریم آیت ۵۸ ۶۔ سورۃ حج آیت ۱۸

۷۔ سورۃ حج آیت ۷۷(۱) ۸۔ سورۃ فرقان آیت ۶۰ ۹۔ سورۃ نمل آیت ۲۵

۱۰۔ سورۃ سجدہ آیت ۱۵ ۱۱۔ سورۃ ص آیت ۲۴(۲) ۱۲۔ سورۃ فصلت آیت ۳۷

۱۳۔ سورۃ النجم آیت ۶۲ ۱۴۔ سورۃ انشقاق آیت ۲۱(۳) ۱۵۔ سورۃ علق آیت ۱۹(۴)

---

(۱) امام مالکؒ کے نزدیک قرآن پاک میں کل گیارہ سجدے ہیں۔ ان کے نزدیک سور مفصل کے تینوں سجدے منسوخ ہیں۔ کیونکہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ مدینہ میں آنے کے بعد نبی ﷺ نے سور مفصل میں کوئی سجدہ نہیں فرمایا (ابوداؤد۔ ابن السکن) لیکن عام محدثین نے اس روایت کو کمزور قرار دیا ہے نیز سورہ حج میں صرف ایک سجدہ ہے۔

حنفیہ کے نزدیک قرآن میں سجدوں کی کل تعداد چودہ ہے وہ بھی سورہ حج میں صرف ایک سجدہ مانتے ہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ سورہ حج کی آیت یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَافْعَلُوْا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ "(اے ایمان لانے والو! رکوع کرو، سجدہ کرو، اپنے رب کی عبادت کرو اور نیک کام کرو شاید کہ تم کامیاب ہو جاؤ) میں خاص طور پر سجدہ کا حکم نہیں کیا گیا بلکہ عام نیکیوں کا حکم دیا گیا ہے جن میں ایک سجدہ بھی ہے (التعلیق الصبیح ج ۲، ص ۲۷)

شافعیہ کے نزدیک بھی سجدوں کی تعداد چودہ ہے فرق یہ ہے کہ وہ سورۃ حج میں تو دو سجدے مانتے ہیں لیکن سورہ ص میں کوئی سجدہ نہیں مانتے کیونکہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سورہ ص کا سجدہ اہم سجدوں میں سے نہیں ہے اگرچہ میں نے نبی ﷺ کو اس سورت میں سجدہ فرماتے دیکھا ہے" (بخاری۔ ترمذی۔ نیل الاوطار ج ۲ ص ۸۱)۔

(۲) حنفیہ کے نزدیک یہاں سجدہ نہیں ہے۔ (۳) شافعیہ کے نزدیک یہاں سجدہ نہیں ہے

سجدۂ شکر

انسان کو جب کوئی نعمت حاصل ہو یا کوئی خوش خبری ملے یا اس سے کوئی مصیبت ٹل جائے تو اس کے لئے سجدۂ شکر کرنا مستحب ہے[1]

حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ جب نبی ﷺ کو کوئی خوشی حاصل ہوتی یا کوئی خوش خبری ملتی تو آپ اللہ کا شکر کرتے ہوئے سجدہ میں پڑ جاتے" (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

حضرت علیؓ نے جب نبی ﷺ کو ہمذان کے داخل اسلام ہونے کی خبر بھیجی تو آپ سجدہ میں گر گئے۔ پھر اپنا سر اٹھایا اور فرمایا "ہمذان پر سلام ہو۔ ہمذان پر سلام ہو"۔
(بیہقی علی شرط البخاری)

سجدہ شکر نماز سے الگ سجدہ ہے۔ نماز کے اندر صحیح نہیں ہے[2] (نیل الاوطار)

---

(۱) امام مالکؒ کے نزدیک شکر کے لئے سجدہ کرنا مکروہ ہے کسی نعمت سے حاصل ہونے یا مصیبت کے ٹلنے کے وقت مستحب یہ ہے کہ انسان دو رکعت نماز پڑھے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج۱ ص ۷۱ ۴)
اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ امام مالکؒ کو اوپر کی احادیث نہیں ملیں (دیکھئے نیل الاوطار ج ۳ ص ۸۹)

(۲) حنفیہ کے نزدیک نماز کے فوراً بعد سجدہ شکر کرنا بھی پسندیدہ نہیں ہے کیونکہ اس سے یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ سجدہ نماز ہی کا ایک حصہ ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج۱ ص ۷۱ ۴)

کتاب الجنائز

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

مرض اور عیادت

۱۔ مرض مسلمان کے لئے گناہوں کا کفارہ ہے:

حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے، اسے اپنی طرف سے مرض میں مبتلا کر دیتا ہے"۔ (بخاری و مسلم)

حضرت ابو ہریرۃؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "کسی مسلمان کو جو بھی دکھ یا بیماری یا فکر یا غم یا کوئی تکلیف پہنچتی ہے، یہاں تک کہ اگر اسے کانٹا بھی چبھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اس کے گناہ کم کر دیتا ہے"۔ (بخاری و مسلم)

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب کوئی بندہ بیمار ہوتا ہے یا وہ سفر میں ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے حساب میں وہی نیکیاں لکھتا ہے جنہیں وہ تندرست اور مقیم ہونے کی حالت میں کرتا ہے"۔ (بخاری)

۲۔ مرض کے وقت صبر کرنے کا ثواب

صبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمان کے لئے بہترین عطیہ ہے، لہٰذا جب اسے کوئی بیماری، دکھ یا نقصان پہنچے، اسے صبر کرنا چاہئے"۔

حضرت صہیب بن سنانؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا۔ "مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اس کے لئے ہر حال میں خیر ہی خیر ہے، اور یہ کیفیت صرف مومن ہی کے لئے ہوتی ہے۔ اگر اسے کوئی خوشحالی نصیب ہوتی ہے وہ شکر کرتا ہے اور یہ اس کے لئے خیر ہے اور اگر اسے کبھی مصیبت پہنچتی ہے، تو وہ صبر کرتا ہے اور یہ بھی اس کے لئے خیر ہے"۔ (مسلم)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ

تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب میں اپنے کسی بندے سے اس کی دو پیاری چیزیں (یعنی آنکھیں) چھین لیتا ہوں اور وہ ان پر صبر کرتا ہے تو میں ان کے بدلے اسے جنت عطا کرتا ہوں"۔ (بخاری)

۳۔ مریض کی دعا قبول ہوتی ہے

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم کسی مریض کی عیادت کے لئے جاؤ تو اس سے کہو کہ تمہارے لئے دعا کرے، اس لئے کہ قبولیت میں اس کی دعا فرشتوں کی دعا جیسی ہے"۔ (احمد۔ ابن ماجہ)

۴۔ مریض کا اپنی تکلیف کو بیان کرنا جائز ہے

مریض کے لئے جائز ہے کہ وہ لوگوں سے اپنی بیماری اور تکلیف کا اظہار کرے، لیکن اس انداز سے کہ اس سے بے صبری اور اللہ تعالیٰ سے ناراضگی کا اظہار نہ ہوتا ہو۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ اس وقت سخت بخار میں مبتلا تھے۔ میں نے آپ کے جسم مبارک پر ہاتھ رکھا اور عرض کیا "آپ کو تو سخت بخار ہو رہا ہے"۔ فرمایا "ہاں مجھے اتنا بخار ہو رہا ہے، جتنا تم میں سے دو آدمیوں کو ہوتا ہے"۔ (بخاری و مسلم)

حضرت عائشہؓ بیمار ہوئیں اور نبی ﷺ نے ان سے ان کا حال دریافت فرمایا تو انہوں نے کہا "ہائے میرا سر"۔ نبی ﷺ نے فرمایا "بلکہ ہائے میرا سر (یعنی مجھے اس تکلیف میں تم سے پوری ہمدردی ہے)" (بخاری)

۵۔ عیادت کی تاکید و اہمیت

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا۔ "مسلمان پر مسلمان کے پانچ حق ہیں: سلام کا جواب دینا، مریض کی عیادت کرنا، جنازہ کے ساتھ جانا، دعوت قبول کرنا اور چھینک آنے پر یَرْحَمُکَ اللّٰہُ (اللہ تم پر رحم فرمائے) کہنا۔" (بخاری و مسلم)

حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "بھوکے کو کھانا کھلاؤ، مریض کی عیادت کرو اور قیدی کو آزاد کراؤ" (بخاری)

۶۔ عیادت کی فضیلت اور ثواب

حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے نبی ﷺ نے فرمایا "مسلمان جب اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کے لئے جاتا ہے، تو وہ اس وقت تک جنت کے خرفہ میں رہتا ہے جب تک واپس نہیں آجاتا"۔ (احمد، مسلم، ترمذی)

مسلم کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ صحابہؓ نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ "جنت کے خرفہ سے کیا مراد ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "اس کے پھل"۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے "جب مسلمان صبح کے وقت اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کے لئے جاتا ہے، تو شام تک ستر ہزار فرشتے اسکے لئے رحمت کی دعا کرتے رہتے ہیں، اور اگر وہ شام کے وقت عیادت کے لئے جاتا ہے تو صبح تک ستر ہزار فرشتے اس کے لئے رحمت کی دعا کرتے رہتے ہیں، اور اس کے لئے جنت میں خریف (پکے ہوئے پھل) ہوتے ہیں"۔ (ترمذی)

۷۔ عیادت کے آداب

جب مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کے لئے جائے، تو اسے چاہئے کہ اس کے لئے صحت وعافیت کی دعا کرے، اسے صبر کی تلقین کرے اور اس سے ایسی باتیں کرے جن سے اس کا دل بہلے اور وہ محسوس کرے کہ اس کی تکلیف میں کمی ہوئی ہے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب تم کسی مریض کے پاس جاؤ، تو اس کو لمبی عمر کی امید دلاؤ، اس سے اللہ تعالیٰ کی قضا تو نہیں ٹل سکتی، لیکن مریض کی ڈھارس بندھتی ہے"۔ (ابن ماجہ بحوالہ المغنی ج ۳ ص ۳۴)

اس موقع کے لئے نبی ﷺ سے متعدد دعائیں ثابت ہیں۔ اختصار کے خیال سے ہم ذیل میں ان میں سے چند دعائیں نقل کرتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ایک بدوی کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے اور آپ جب کبھی کسی کی عیادت کے لئے تشریف لے جاتے تو فرمایا کرتے۔

لَابَاسَ طَهُوْرٌ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ — کوئی بات نہیں، انشاء اللہ یہ بیماری تمہارے گناہوں کو دھو ڈالے گی۔ (بخاری)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب کبھی اپنے گھر والوں میں سے کسی کی

عیادت کے لئے تشریف لاتے تو اس پر اپنا دایاں ہاتھ رکھتے اور فرماتے:

اَللّٰهُمَّ رَبَّ النَّاسِ، اَذْهِبِ الْبَأْسَ، اِشْفِ اَنْتَ الشَّافِيُ، لَا شِفَاءَ اِلَّا شِفَاءُ كَ شِفَاءً لَّا يُغَادِرُ سَقَمًا، (بخاری و مسلم)	اے لوگوں کے پروردگار! تکلیف کو لے جا، شفا عطا فرما، تو ہی شفا دینے والا ہے، تیری شفا کے علاوہ کوئی شفا نہیں، تو ایسی شفا عطا فرما جو بیماری کو باقی نہ رہنے دے۔

حضرت سعد بن وقاصؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ میری عیادت کے لئے تشریف لائے، تو آپ نے دعا فرمائی۔ "اے اللہ! سعد کو شفا عطا فرما، اے اللہ! سعد کو شفا عطا فرما، اے اللہ! سعد کو شفا عطا فرما" (مسلم)

حضرت عثمان بن ابی العاصؓ سے روایت ہے کہ میرے جسم میں درد تھا۔ میں نے نبی ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ "جسم کے جس حصے میں درد ہے وہاں ہاتھ رکھو۔ پھر تین مرتبہ بسم اللہ پڑھو اور سات مرتبہ یہ دعا پڑھو:

اَعُوْذُ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَ قُدْرَتِهٖ مِنْ شَرِّمَا اَجِدُ وَاُحَاذِرُ (مسلم)	میں اللہ تعالیٰ کی قوت و قدرت کے ذریعے اپنی ہر موجودہ تکلیف سے اور ہر اس تکلیف سے پناہ مانگتا ہوں جس کا مجھے اندیشہ ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ حضرت جبرائیلؑ نبی ﷺ کے پاس آئے اور کہا "اے محمد (ﷺ) کیا آپ کو تکلیف ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "جی ہاں" حضرت جبرئیلؑ نے یہ دعا کی:

بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ مِنْ كُلِّ شَيْئٍ يُؤْذِيْكَ وَ مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ اَوْعَيْنِ حَاسِدٍ، اَللّٰهُ يَشْفِيْكَ بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ (مسلم)	میں اللہ کے نام کے ذریعے ہر اس چیز سے جو آپ کو تکلیف دے رہی ہے اور ہر نفس اور حاسد کی نگاہ سے آپ کو دم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو شفا دے، میں اللہ کے نام کے ذریعے آپ کو دم کرتا ہوں۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب کسی مسلمان کو کوئی تکلیف یا زخم یا پھوڑا ہوتا تو ﷺ زمین پر اپنی شہادت کی انگلی رکھتے اور فرماتے۔

بِسْمِ اللّٰهِ تُرْبَةُ اَرْضِنَا بَرِيْقَةِ بَعْضِنَا يُشْفٰى بِهٖ سَقِيْمُنَا بِاِذْنِ رَبِّنَا (بخاری و مسلم)

اللہ کے نام کے ساتھ ہماری زمین کی مٹی اور ہم میں سے کسی کے لعاب کے ساتھ ہمارا مریض شفایاب ہوگا، ہمارے رب کے اذن سے۔

۸۔ مسلمان کے لئے کسی غیر مسلم کی عیادت کرنا صحیح ہے

مسلمان کے لئے کسی غیر مسلم کی عیادت کے لئے جانا صحیح ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا نبی ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ بیمار ہوگیا۔ نبی ﷺ اس کے ہاں عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ آپ اس کے سرہانے بیٹھے اور اس سے فرمایا "تم اسلام لے آؤ"۔ اس نے اپنے والد کی طرف، جو پاس ہی بیٹھا تھا، دیکھا۔ اس نے کہا "ابوالقاسم (ﷺ) کی بات مان لو"۔ وہ لڑکا اسلام لے آیا۔ جب نبی ﷺ اس کے ہاں سے نکلے، تو آپ فرمارہے تھے "اس اللہ کے لئے حمد و ثنا ہے جس نے اس لڑکے کو آگ سے بچالیا"۔ (بخاری)

۹۔ عورتوں کا مردوں کی عیادت کرنا صحیح ہے

عورتوں کا مردوں کی عیادت کے لئے جانا صحیح ہے۔ ایک انصاری مسجد میں رہا کرتے تھے۔ حضرت اُمِّ درداءؓ ان کی عیادت کے لئے تشریف لائیں۔ نیز حضرتِ عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب نبی ﷺ مدینہ منورہ پہنچے، تو حضرت ابو بکرؓ اور حضرتِ بلالؓ کو بخار آگیا۔ میں ان کے پاس آئی اور میں نے ان سے دریافت کیا "اے ابا جان! آپ کا کیا حال ہے؟ اور اے بلال! آپ کا کیا حال ہے؟" (بخاری)

موت اور میّت کے عام مسائل

۱۔ موت کو یاد رکھنا اور نیک اعمال کے ذریعے اس کی تیاری کرنا

حضرتِ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا۔ "مزوں کو کرکرا کر دینے والی (یعنی موت) کو بہت یاد کیا کرو۔" (احمد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ)

حضرتِ ابو ہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب بندہ میری ملاقات کو پسند کرتا ہے، تو میں بھی اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہوں اور جب بندہ میری ملاقات کو ناپسند کرتا ہے تو میں بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہوں"۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے لوگوں نے کہا "ہم میں سے ہر شخص موت کو ناپسند کرتا ہے اور اس سے ڈرتا ہے"۔ حضرت ابو ہریرہ نے جواب دیا جب اس کا وقت ہوتا ہے تو اس کا پتہ چل جاتا ہے" (یعنی جب انسان کا آخری وقت آتا ہے، تو اسے پتہ چل جاتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا) ؟ اگر وہ نیک ہوتا ہے، تو وہ موت سے نہیں ڈرتا بلکہ اسے خوشی ہوتی ہے کہ اب وہ اپنے رب سے ملاقات کرے گا اور اگر وہ بد اعمال ہوتا ہے تو موت سے ڈرتا ہے کیوں کہ اس کے بعد وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہونے والا ہوتا ہے"۔ (بخاری، مالک، نسائی، ترمذی)

حضرت ابنِ عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کی خدمت میں دس آدمی تھے، جن میں سے ایک میں تھا۔ انصار میں سے ایک شخص نے اٹھ کر سوال کیا "اے اللہ کے رسول ﷺ! سب سے عقلمند اور ہوشیار آدمی کون ہے؟" فرمایا "وہ جو سب سے زیادہ موت کو یاد کرتا اور اس کے لئے سب سے زیادہ تیاری کرتا ہے۔ یہی لوگ عقلمند ہیں جو دنیا و آخرت کی عزت و کامرانی سے شرف یاب ہوں گے۔" (طبرانی باسناد حسن)

۲۔ موت کے وقت اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی امید رکھنا

حضرتِ جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو وفات سے تین روز پیشتر یہ

فرماتے سنا ہے کہ "سنو! تم میں سے کسی شخص کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھنے والا ہو"۔ (مسلم، احمد، ابن ماجہ، ابو داؤد، بیہقی)

اس حدیث کا مطلب بیان کرتے ہوئے امام خطابیؒ لکھتے ہیں "اللہ تعالیٰ سے حسن ظن وہی شخص رکھ سکتا ہے جس کے اعمال نیک ہوں۔ گویا نبی ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ نیک اعمال کرو۔ اس سے تمہارے دلوں میں اللہ تعالیٰ سے حسنِ ظن اور اس سے مغفرت کی امید پیدا ہوگی۔ جس شخص کے اعمال بُرے ہوں، وہ اللہ تعالیٰ سے حسن ظن نہیں رکھ سکتا اور نہ اس سے مغفرت کی امید کر سکتا ہے"۔ (معالم السنن)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، میں اپنے بندے کے گمان کے پاس ہوں (یعنی) اس سے وُہی سلوک کروں گا جس کی وہ مجھ سے توقع رکھے گا اگر وہ مجھ سے اچھا گمان کرے گا، تو اس میں اسی کا فائدہ ہے اور اگر مجھ سے بُرا گمان رکھے گا تو اس میں اسی کا نقصان ہے"۔ (بخاری، مسلم، احمد)

۳۔ موت کی تمنا کرنے کی کراہت

کسی بیماری، تنگ دستی یا دنیاوی تکلیف کی وجہ سے موت کی تمنا کرنے کو نبی ﷺ نے ناپسند فرمایا ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا۔ "تم میں سے کوئی شخص کسی تکلیف کی وجہ سے جو اسے پہنچے موت کی تمنا نہ کرے۔ اگر وہ تمنا کرنے پر مجبور ہی ہو جائے، تو اسے یوں دعا کرنی چاہئے کہ اے اللہ! جب تک میرے لئے زندگی بہتر ہے مجھے زندہ رکھ اور جب موت میرے لئے بہتر ہو، تو مجھے موت دے دے" (بخاری، مسلم، احمد، ابو داؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ)

موت کی تمنا نہ کرنے کی حکمت کو بعض دوسری احادیث میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص موت کی تمنا نہ کرے۔ اگر وہ گناہ گار ہوگا، تو اپنے گناہوں کی معافی مانگ لے گا اور اگر نیک ہوگا تو مزید نیک اعمال کرلے گا"۔ (بخاری، مسلم، احمد، بیہقی، نسائی وغیرہ)

حضرت ابو بکرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے سوال کیا کہ "اے اللہ کے رسولؐ! سب سے بہتر آدمی کون ہے؟" فرمایا "وہ جس کی عمر لمبی اور اعمال نیک ہوں"۔

اس شخص نے دریافت کیا"اور سب سے برا آدمی کون ہے؟" فرمایا "وہ جس کی عمر لمبی اور اعمال برے ہوں"۔ (احمد، ترمذی)

۴۔ خودکشی کی حُرمت

حضرت ثابت بن ضحاکؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس نے لوہے کے ٹکڑے کے ساتھ اپنے آپ کو ہلاک کیا، اسے جہنم کی آگ میں اسی لوہے کے ٹکڑے سے عذاب دیا جائے گا"۔ (بخاری)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنا گلا گھونٹ کر خودکشی کرتا ہے وہ جہنم میں بھی اپنا گلا گھونٹے گا، اور جو اپنے جسم پر نیزے مارتا ہے، وہ جہنم میں بھی اپنے آپ کو نیزے مارے گا"۔ (بخاری)

۵۔ وہ کام جو احتضار (جان کنی) کے وقت مستحب ہیں

(الف) کلمۂ توحید کی تلقین: اگر کسی شخص کا آخری وقت ہو تو اس سے کلمہ توحید پڑھنے اور پڑھتے رہنے کے لئے کہنا مستحب ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اپنے مردوں (یعنی جو جان کنی کی حالت میں ہوں) کو "لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰه" پڑھنے کی تلقین کرو"۔ (احمد، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، بیہقی، ابن ماجہ)

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو ایک ایسی حدیث بیان فرماتے سنا ہے جسے اب تک میں ظاہر نہیں کر رہا تھا، (تاکہ تم اس پر غلط طور پر اعتماد کر کے نہ بیٹھ جاؤ) میں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "جس شخص کی آخری بات جو اس کی زبان سے نکلے "لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰه" ہو، وہ جنت میں داخل ہو گیا"۔ (احمد، ابو داؤد)

امام نوویؒ فرماتے ہیں "مردہ کو اس طرح کلمہ توحید کی تلقین کرنا تمام ائمہ کے نزدیک مستحب ہے۔ لیکن انہوں نے اس بات کو ناپسند کیا ہے کہ مُردہ پر کلمۂ توحید پڑھنے کے لئے زور دیا جائے، تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی تکلیف اور گھبراہٹ کی وجہ سے دل میں اسے ناپسند کرنے لگے یا اس کی زبان سے کوئی نازیبا قسم کی بات نکل جائے اگر وہ ایک مرتبہ "لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰه" پڑھنا شروع کر دے، تو اسے اس وقت تک دوبارہ یاد دہانی نہ کرانی چاہیے، جب تک اس کے بعد کوئی دوسری بات نہ کرلے۔ اگر وہ کوئی دوسری بات کرنے لگے تو پھر اسے یاد د

کرائی جا سکتی ہے تاکہ اس کا خاتمہ کلمہ توحید پر ہو"۔ (نیل الاوطار ج ۳، ص ۲۲)

(ب) دعا: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو جب کہ آپ کی روح بدن سے جدا ہو رہی تھی۔ دیکھا کہ آپ کے پاس پانی کا ایک پیالہ پڑا ہوا تھا، آپ اس میں ہاتھ ڈالتے جاتے تھے اور پھر چہرے پر ہاتھ سے پانی کا مسح کرتے جاتے تھے اور یہ دعا فرماتے جاتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی سَکَرَاتِ الْمَوْتِ — اے اللہ! موت کی سختیوں (کے جھیلنے) پر میری مدد فرما۔

(احمد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ)

(ج) موت واقع ہونے کے فوراً بعد آنکھوں کا بند کر دینا: حضرت شداد بن اوسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم اپنے مردوں کے پاس جاؤ تو (ان کی) آنکھیں بند کر دو، اس لئے کہ نگاہ روح کے پیچھے چلی جاتی ہے (اس لئے آنکھ کے کھلے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں) اور اچھی بات کہو (یعنی میت کے لئے دعائے مغفرت کرو) اس لئے کہ میت کے گھر والے جو کچھ کہتے ہیں اس پر (فرشتوں کی طرف سے) آمین کہی جاتی ہے"۔ (احمد، ابن ماجہ، طبرانی، بزار، حاکم)

(د) میت کو قبلہ رخ لٹانا: حضرت براء بن معرورؓ نے وصیت کی کہ جب ان کا آخری وقت ہو، تو انہیں قبلہ رخ کر کے لٹا دیا جائے۔ نبی ﷺ کو جب اس بات کا پتہ چلا، تو آپ ﷺ نے فرمایا "انہوں نے فطرت کے مطابق کام کیا ہے"۔ (بیہقی، حاکم)

حضرت فاطمہؓ اپنی وفات کے وقت قبلہ رخ ہوئیں، پھر انہوں نے اپنے سر کو اپنے بازوؤں پر رکھ لیا"۔ (احمد)

لیکن قبلہ رخ ہونے کی صورت کیا ہو، اس کا حدیث میں ذکر نہیں۔ ائمہ کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے۔[1]

---

(۱) امام ابو حنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک مردہ کو دائیں کروٹ پر اس طرح لٹایا جائے کہ اس کا چہرہ قبلہ کی طرف رہے۔ ان کا استدلال ان احادیث سے ہے جن میں نبی ﷺ نے رات کو سوتے وقت دائیں کروٹ پر لیٹنے کی تلقین فرمائی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں آپؐ کا ارشاد ہے "جب تم اپنے بستر پر جاؤ، تو وضو کرو، جیسا کہ تم نماز کے لئے وضو کرتے ہو، پھر دائیں کروٹ پر لیٹو اور یہ دعا پڑھو اللھم انی اسلمت نفسی .... اس لئے کہ اگر تم رات کو مر جاؤ، تو فطرت پر مرو گے"۔

امام شافعیؒ اور بعض دوسرے ائمہ کا مسلک ایک روایت میں یہی ہے، لیکن دوسری روایت میں ان کا مسلک یہ ہے کہ مردہ کو چت لٹایا جائے اس طرح کہ اس کا سر اور پورا چہرہ قبلہ کی طرف رہے۔ (مختصر از نیل الاوطار ج ۳، ص ۲۳)

(ہ) میت کو چادر سے ڈھانک دینا: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے جب نبی ﷺ کی وفات ہوگئی، تو آپ کو ایک حبری (یمنی) چادر سے ڈھانک دیا گیا۔ (بخاری و مسلم)

میت کو چادر سے ڈھانک دینے کے مستحب ہونے پر اجماع ہے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ میت کی ستر پوشی بھی ہو جائے اور اس کی بدلی ہوئی حالت بھی چھپ جائے"۔

(نوویؒ بحوالہ نیل الاوطارج ۳، ص ۲۷)

۶۔ میت کا بوسہ لینے کی رخصت

حضرتِ عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ تشریف لائے اور آپؓ نے نبی ﷺ جن پر چادر پڑی ہوئی تھی۔ آپؓ نے حضور ﷺ کا چہرہ مبارک کھولا اور جھک کر آپؐ کے چہرے کا بوسہ لیا"۔ (بخاری، احمد، نسائی)

امام شوکانیؒ لکھتے ہیں "حضرت ابو بکر صدیقؓ کے اس فعل پر کسی صحابی نے اعتراض نہیں کیا۔ گویا میت کا بوسہ لینے کے جواز پر تمام صحابہ کا اجماع ہے۔ (نیل الاوطارج ۳ ص ۲۷)

۷۔ میت کے لئے مغفرت کی دعا کرنا اور بار بار اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ کہنا

حضرت اُمِّ سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا۔ "کوئی بندہ ایسا نہیں جسے کوئی مصیبت پہنچے اور اس پر وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن ، اَللّٰھُمَّ اٰجِرۡنِیۡ فِیۡ مُصِیۡبَتِیۡ وَاَخۡلُفۡ لِیۡ خَیۡرًا مِنۡہَا ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے۔ اے اللہ! میری اس مصیبت میں مجھے اجر عطا فرما اور مجھے اس کے بدلے بہتر چیز عطا فرما۔ نہیں کہتا، مگر اللہ تعالیٰ اسے اجر دیتا اور اس کے لئے اس کا بہتر بدلہ عطا فرماتا ہے"۔

(مسلم، احمد، وغیرہ)

۸۔ میت کا قرض ادا کرنے میں جلدی کرنا

میت کے ذمہ اگر قرض ہو، تو اس کی موت سے پہلے یا اس کے فوراً بعد اس کی ادائیگی میں جلدی کرنی چاہیے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "مومن کی جان اس کے قرض کے ساتھ لٹکی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ اس کی طرف سے ادا کر دیا جائے"۔

(احمد، ابن ماجہ، ترمذی)

۹۔ میت کے رشتہ داروں اور جاننے والوں کو اس کی موت کی اطلاع دینا

جب کوئی شخص مر جائے تو یہ مستحب ہے کہ اس کے رشتہ داروں اور دوستوں اور جاننے والوں کو اس کی اطلاع دی جائے، تاکہ وہ اس کے جنازہ میں شریک ہو سکیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جس روز نجاشیؒ کی وفات ہوئی، نبی ﷺ نے ان کی موت کی لوگوں کو اطلاع دی، آپ ﷺ انہیں عید گاہ کی طرف لے گئے اور وہاں ان کی چار صفیں بنا کر چار تکبیروں کے ساتھ نماز جنازہ پڑھی۔ (بخاری و مسلم)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ (غزوہ موتہ میں) جب حضرت جعفر بن ابی طالبؓ، زید بن حارثہؓ، اور عبداللہ بن رواحہؓ کی شہادت ہوئی تو نبی ﷺ نے لوگوں کو اس کی اطلاع دی۔ (بخاری، مسلم، نسائی، بیہقی وغیرہ)

ایک شخص مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا، وہ مر گیا، تو لوگوں نے نبی ﷺ کو اطلاع کئے بغیر رات ہی کو اسے دفن کر دیا۔ صبح کے وقت نبی ﷺ نے فرمایا "تم لوگوں نے مجھے کیوں اطلاع نہ کی۔"[1] (بخاری وغیرہ)

۱۰۔ میت پر رونا

میت پر رونا ایسی صورت میں ناجائز ہے جب کہ اس رونے کے ساتھ ماتم کرنا، بین کرنا، رخساروں کا پیٹنا، گریبان کا پھاڑنا، چہرے کا نوچنا، بالوں کا بکھیرنا وغیرہ شامل ہو۔ ان تمام کاموں کی حرمت میں متعدد احادیث نبی ﷺ سے ثابت ہیں۔

حضرتِ عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "وہ شخص ہم میں

---

(۱) اکثر صحابہؓ کرام اور تمام ائمہ کا یہی مسلک ہے۔

صحابہؓ میں سے حضرت حذیفہؓ اور حضرتِ عبداللہ بن مسعودؓ اور آپ کے اصحاب لوگوں کو کسی کے مرنے کی اطلاع کرنے کو ناپسند کرتے تھے۔ حضرت حذیفہؓ یہ حدیث بیان کرتے تھے کہ "نبی ﷺ نے نعی (موت کی خبر کرنے) سے منع فرمایا ہے"۔ اس حدیث کا مطلب اوپر کی احادیث کی روشنی میں جمہور یہ لیتے ہیں کہ کسی کے مرنے کی اس طرح اطلاع کرنا جس طرح اسلام سے پہلے عرب کیا کرتے تھے، منع ہے۔ اس وقت رواج تھا کہ جب کوئی شخص مر جاتا تو اس کے گھر والے اس خیال سے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں جنازے میں شریک ہیں اور اس طرح انہیں فخر کرنے کا موقع ملے، گھوڑوں پر سوار ہو کر بازاروں اور گلیوں میں منادی کرتے پھرا کرتے تھے کہ فلاں شخص کا انتقال ہو گیا اس کے جنازے میں شریک ہوں۔
(مختصر از: الفتح الربانی، ج ۷، ص ۱۴۴)

سے نہیں ہے جو (میت پر روتے ہوئے) گریبان پھاڑتا ہے یا گالوں پر تھپڑ مارتا ہے اور جاہلیت کے بین کرتا ہے"۔ (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بیہقی)

حضرت اُمّ سلمہؓ سے روایت ہے کہ جب حبشہ میں حضرت ابو سلمہؓ کا انتقال ہو گیا، تو میں کہنے لگی۔ "ہائے پردیسی تھے، پردیس میں انتقال کر گئے"۔ یہ کہتے ہوئے میں خوب روئی، عوالی مدینہ سے ایک عورت آئی اور رونے اور ماتم کرنے میں اس نے میری مدد کرنا چاہی (جیسا کہ جاہلیت کے زمانہ میں اس کا دستور تھا) نبی ﷺ کو اطلاع ہوئی، تو آپ ﷺ نے فرمایا، "کیا تم چاہتی ہو کہ جس گھر سے اللہ نے شیطان کو (یعنی جاہلیت کی رسموں کو) نکالا ہے تم اسے اس میں پھر داخل کر دو؟" حضرت اُمّ سلمہؓ فرماتی ہیں کہ "اس کے بعد میں نے خود بھی رونا بند کر دیا"۔ (مسلم، احمد، بیہقی)

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ جو عورت ماتم کرے یا جو اس کے ماتم کو سنے، نبی ﷺ نے اس پر لعنت فرمائی ہے۔" (ابو داؤد، احمد، بیہقی)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ دو رسمیں جاہلیت کی رسمیں ہیں۔ جنہیں لوگ کبھی ترک نہ کریں گے ایک ماتم کرنا اور دوسرے نسب کا طعنہ دینا"۔ (مسلم، احمد)

لیکن اگر رونے میں یہ تمام چیزیں شامل نہ ہوں تو میت پر رونے کی رخصت ہے۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کی صاحبزادی (حضرت زینبؓ) کا بیٹا نزع کے عالم میں تھا۔ اسے اٹھا کر نبی ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ حضرت سعدؓ نے آپ سے عرض کیا "اے اللہ کے رسول! یہ کیا؟ فرمایا "یہ رحمت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھی ہے اور اللہ اپنے ان ہی بندوں پر رحم فرماتا ہے جو رحم کرنے والے ہوتے ہیں"۔ (بخاری، مسلم)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اپنے صاحبزادے ابراہیم کے پاس جب کہ ان پر نزع کا عالم طاری تھا، تشریف لائے، آپؐ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسول! آپ بھی؟" حضور ﷺ نے فرمایا "اے عوف کے بیٹے! یہ رحمت ہے"۔ پھر آپؐ نے فرمایا "آنکھ آنسو بہاتی ہے، دل غمگین ہوتا ہے، لیکن ہم (زبان سے) وہی بات کہتے ہیں جسے ہمارا رب پسند فرماتا ہے، اور اے ابراہیم! ہم تیری جدائی سے غم زدہ ہیں" (بخاری)

۱۱۔ عورت کا اپنے خاوند اور دوسرے رشتہ داروں کی موت پر سوگ منانا

عورت کے لئے اپنے خاوند کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں (باپ، بیٹا، بھائی وغیرہ) کی موت پر تین دن تک سوگ منانے (یعنی زینت اور بناؤ سنگھار سے رکے رہنے) کی اجازت ہے۔ تین دن سے زیادہ سوگ منانے کی اسے اجازت نہیں۔ خاوند کی موت پر اس کے لئے چار ماہ دس دن تک (یعنی جب تک اس کی عدت باقی رہے) سوگ منانا واجب ہے۔

اُمّ المومنین حضرت زینب بنت جحشؓ سے روایت ہے کہ میں نے ﷺ کو منبر پر خطبہ دیتے وقت یہ فرماتے سنا ہے۔ "کسی ایسی عورت کے لئے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہو، یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کے مرنے پر تین دن سے زیادہ سوگ منائے، ہاں وہ اپنے خاوند کی موت پر چار ماہ دس راتیں سوگ منائے گی"۔ (بخاری، مسلم، احمد، مالک وغیرہ)

اسی طرح کی ایک روایت حضرت اُمّ عطیہ انصاریہؓ سے بھی ہے اور اس کے آخر میں نبی ﷺ کے یہ الفاظ زیادہ ہیں۔ اور وہ (بطور زینت) نہ شوخ رنگ کا کپڑا پہنے گی سوائے یمنی چادر کے، نہ سرمہ لگائے گی، نہ خوشبو استعمال کرے گی، البتہ اپنے حیض کے بعد غسل سے فارغ ہوتے وقت (بدبو کو دور کرنے کے خیال سے) تھوڑا سا قسط اور اظفار (دو ہلکی قسم کی خوشبوئیں) استعمال کر سکتی ہے[1] (بخاری، مسلم، احمد وغیرہ)

۱۲۔ میت پر صبر کرنے کا ثواب

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ عورتوں نے نبی ﷺ کی خدمت میں گزارش کی کہ ہمارے لئے (وعظ و نصیحت کا) ایک دن مقرر فرما دیجئے۔ آپ نے (وہ دن مقرر فرما دیا اور اس میں) انہیں وعظ و نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔ "جس عورت کے تین بچے فوت ہو جائیں اور وہ ان پر صبر کرے، وہ اس کے لئے آگ سے بچاؤ ہو جائیں گے" ایک عورت نے عرض کیا "اور دو بچے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "دو بچے بھی"۔ (بخاری، مسلم)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "الصبر عند الصدمة الاولی" (صبر پہلی چوٹ کے وقت ہے"۔ (بخاری) یعنی صبر کا ثواب اسی وقت ملتا ہے

---

(۱) اس بارے میں اختلاف صرف امام حسن بصریؒ اور شعبیؒ کا ہے ان کے نزدیک عورت کا اپنے خاوند کی وفات پر چار ماہ دس دن تک سوگ منانا جائز ہے واجب نہیں۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ شاید ان دونوں بزرگوں کو وجوب کی احادیث نہیں ملیں (الفتح الربانی ج ۷ ص ۱۵۱)

جب انسان مصیبت کے پہنچتے ہی صبر کرے، ورنہ بعد میں آہستہ آہستہ تو وہ صبر کر ہی لے گا کیوں کہ صبر کیے بغیر چارہ ہی کیا ہے؟

مصیبت کے وقت دو رکعت نماز کا پڑھنا بھی مستحب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ — اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو صبر اور نماز سے (مصیبتوں کو برداشت کرنے میں) کام لو۔

حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کو جب کوئی مشکل کام در پیش آتا، تو آپ نماز پڑھتے۔ (ابوداؤد)

۱۳۔ میت کی تجہیز و تکفین میں جلدی کرنا

جب کسی کی موت واقع ہو جائے تو اس کی تجہیز و تکفین، نماز جنازہ اور دفنانے میں جلدی کرنی چاہئے۔ اس میں بلاوجہ تاخیر کرنا صحیح نہیں ہے۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا۔ "تین کاموں کے کرنے میں تاخیر نہ کرو، ایک نماز، جب اس کا وقت ہو جائے، دوسرے جنازہ جب کہ موت واقع ہو جائے اور تیسرے بیوہ کی شادی جب کہ اس کے لئے مناسب رشتہ مل جائے"

(احمد، ابن ماجہ، ترمذی، حاکم، ابن حبان)

۱۴۔ میت کو اچھے الفاظ سے یاد کرنا اور اس کی برائیوں کا ذکر کرنے سے پرہیز کرنا

حضرتِ عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو مسلمان بھی مرتا ہے اور چار مسلمان اس کے لئے خیر کی شہادت دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرتا ہے"۔ ہم نے پوچھا "اور تین؟" فرمایا "اور تین بھی" ہم نے پوچھا، "اور دو؟" آپ نے فرمایا "اور دو بھی" ہم نے ایک کے متعلق آپؐ سے دریافت نہیں کیا۔

(بخاری، احمد، ترمذی، نسائی، ابن شیبہ، بیہقی)

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "مردوں کو برا بھلا نہ کہو، اس لئے کہ انہوں نے (دنیا میں) جو (اعمال) کئے ہیں، ان تک پہنچ گئے ہیں (اور تمہارا انہیں برا بھلا کہنا کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا)"۔ (بخاری، احمد، نسائی، بیہقی)

غسلِ میت

ا۔ میت کو غسل دینے کا حکم

اگر کوئی مسلمان مر جائے، تو اسے غسل دینا مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔ یعنی ان میں سے اگر چند آدمی اس کام کو انجام دے دیں تو وہ دوسروں کی طرف سے بھی...... ادا ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں نبی ﷺ کا قول اور عمل دونوں ثابت ہیں۔ اور امت کا اس پر اعتقاد اور عمل ہے(۱)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ (حجتہ الوداع کے موقع پر) ایک شخص نبی ﷺ کے ساتھ تھا، اسے اس کی اونٹنی نے روند ڈالا اور وہ مر گیا۔ اس وقت وہ احرام کی حالت میں تھا۔ نبی ﷺ نے فرمایا "اسے پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دو اور اس کا کفن ان ہی کپڑوں کا رہنے دو جن میں وہ مرا ہے۔ اسے خوشبو بھی نہ لگاؤ اور اس کے سر پر چادر نہ ڈالو، اس لئے کہ وہ قیامت کے روز تلبیہ کہتے ہوئے اٹھے گا۔ (مسلم، احمد، نسائی، ابن حبان)

اسی طرح نبی ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا انتقال ہوا، تو نبی ﷺ نے انہیں غسل دینے کا حکم دیا۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، احمد، بیہقی)
مفصل حدیث آگے "غسل کا طریقہ" کے عنوان کے تحت آرہی ہے۔

---

(۱) امام نوویؒ، ابن قدامہ (صاحب المغنی) ابن ہمام (صاحب فتح القدیر) اور بعض دوسرے علماء نے اس پر اجماع نقل کیا ہے، لیکن صحیح یہ ہے جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ بیان کرتے ہیں کہ بعض مالکی علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک میت کو غسل دینا سنت ہے۔ نبی ﷺ نے میت کو غسل دینے کا جو حکم دیا ہے، اسے یہ حضرات استحباب کے لئے مانتے ہیں اور جمہور وجوب کے لئے۔
(فتح الباری ج ۳، ص ۳۶۸۔ الفتح الربانی ج ۷، ص ۱۵۵)

۲۔ میت کو غسل دینے کا ثواب

حضرت معاویہ بن خدیج ؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ ''جس شخص نے کسی میت کو غسل دیا، اسے کفن پہنایا اور اس کے جنازے کے ساتھ گیا تو وہ اس طرح لوٹتا ہے کہ اس کے گناہ معاف ہو چکے ہوتے ہیں''۔ (احمد)

۳۔ خاوند کا اپنی بیوی کو اور بیوی کا اپنے خاوند کو غسل دینا

عام طریقہ یہی ہے کہ مرد مر جائے تو اس کو مرد اور عورت مر جائے تو اسے عورتیں غسل دیں لیکن بیوی کے لئے اپنے خاوند کو دینا بھی جائز ہے۔

حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں۔ ''اگر گزرا ہوا وقت واپس آسکتا تو نبی ﷺ کو آپ کی بیویاں ہی غسل دیتیں''۔ (احمد، ابو داؤد)

حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے وصیت فرمائی کہ ان کی وفات کے بعد انہیں ان کی بیوی حضرت اسماء بنت عمیس ؓ غسل دیں۔ حضرت اسماء ؓ روزہ سے تھیں تو حضرت ابو بکر ؓ نے قسم کھا کر انہیں روزہ توڑنے کی تاکید فرمائی۔ جب حضرت اسماء غسل دے کر فارغ ہوئیں تو انہیں حضرت ابو بکر ؓ کی قسم یاد آئی تو انہوں نے کہا ''میں آج ان کی قسم کی خلاف ورزی نہیں کروں گی''۔

حضرتِ جابر ؓ نے وصیت فرمائی کہ انہیں ان کی بیوی غسل دیں۔

حضرتِ موسیٰ اشعری ؓ کو ان کی بیوی حضرت ام عبداللہ ؓ نے غسل دیا۔

امام احمد ؒ فرماتے ہیں کہ اس بارے میں اہل علم (صحابہ کرام اور بعد کے ائمہ) کے درمیان اختلاف نہیں ہے (المغنی ج ۲، ص ۳۱۲)

اسی طرح خاوند بھی اپنی بیوی کو غسل دے سکتا ہے۔

حضرتِ عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ان سے فرمایا ''اے عائشہ ؓ! اگر تم مجھ سے پہلے وفات پا جاتیں، تو میں تم کو غسل دیتا''۔ (احمد، ابن ماجہ)

حضرتِ فاطمہ ؓ کا انتقال ہوا تو حضرتِ علی ؓ نے انہیں غسل دیا۔

(مسند امام شافعیؒ، بیہقی وغیرہ)

حضرت اسماء بنت عمیس ؓ فرماتی ہیں کہ ''جب حضرت فاطمہ ؓ کا انتقال ہوا تو میں نے

اور حضرت علیؓ نے انہیں غسل دیا"۔(۱)(دارقطنی)

۴۔ عورتوں کا چھوٹے بچے کو اور مردوں کا چھوٹی بچی کو غسل دینا

اس پر اجماع ہے کہ عورتوں کے لئے چھوٹے بچے کو غسل دینا جائز ہے۔ اختلاف اس بارے میں ہے کہ بچہ کس عمر تک کا ہو سکتا ہے؟(۲)

---

(۱) یہ جمہور (جن میں امام مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور عام محدثین شامل ہیں) کا مسلک ہے (المغنی وغیرہ)

امام ابو حنیفہؒ، سفیان ثوریؒ اور ایک اور روایت میں امام احمدؒ کے نزدیک شوہر کا اپنی بیوی کو غسل دینا جائز نہیں ہے کیونکہ موت واقع ہو جانے کے بعد بیوی اپنے خاوند کے لئے محرم نہیں رہتی، لہٰذا اس کا اس کی طرف دیکھنا اور چھونا جائز نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر شوہر مر جائے تو بیوی اس کے لئے محرم ہوتی ہے کیوں کہ جب تک عدت کے دن پورے نہیں ہو جاتے وہ اس کی زوجیت میں رہتی ہے اوپر کی حدیث میں نبی ﷺ کے ارشاد اے عائشہؓ! اگر تم مجھ سے پہلے وفات پا جاتیں تو میں تمہیں غسل دیتا کا مطلب حنفیہ کے نزدیک یہ ہے کہ میں تمہارے غسل کا انتظام کرتا نہ یہ کہ میں تمہیں خود غسل دیتا۔ رہی دوسری حدیث جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہوا تو حضرت علیؓ نے انہیں غسل دیا تو اس کو حنفیہ صحیح نہیں مانتے کیونکہ ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت فاطمہؓ کو حضرت اسماء بنت عمیسؓ نے غسل دیا، تاہم اگر اسے صحیح بھی مان لیا جائے تو اس کو اس لئے دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ جب حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کو غسل دیا تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ان کے اس کو فعل کو غلط قرار دیا، یہاں تک کہ حضرت علیؓ کو کہنا پڑا کہ "کیا آپ کو نہیں معلوم کہ نبی ﷺ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ فاطمہ دنیا میں بھی تمہاری بیوی ہے اور آخرت میں بھی؟" حضرت علیؓ کا اپنے لئے یہ خصوصی دلیل پیش کرنا گویا اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام کے درمیان جانا پہچانا طریقہ یہی تھا کہ شوہر اپنی بیوی کو غسل نہیں دے سکتا"

(بذل المجہود ج ۴' ص ۱۹۲)

دوسرے ائمہ اور بعض حنفی علماء (جیسے امام طحاویؒ اور علامہ عینیؒ) اس حدیث کو صحیح نہیں مانتے کہ حضرت فاطمہؓ حضرت علیؓ کی دنیا میں بھی بیوی تھیں اور آخرت میں بھی یعنی یہ کہ انتقال کے بعد بھی ان کا حضرت علیؓ سے نکاح باقی رہا۔ کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو حضرت علیؓ بعد میں حضرت فاطمہؓ کی سگی بھانجی امامہؓ سے نکاح نہ کرتے۔ (مختصراً از کتاب الجنائز ص ۴۴)

(۲) حنفیہ کے نزدیک عورتیں صرف ایسے بچے کو غسل دے سکتی ہیں جو ابھی بات کرنے نہ لگا ہو، امام احمدؒ کے نزدیک اس کی عمر سات سال تک، امام حسن بصریؒ کے نزدیک ڈھائی تین سال تک اور امام اوزاعیؒ کے نزدیک چار سال تک ہو سکتی ہے (المغنی ج ۲' ص ۳۱۳)

۵۔ اگر کوئی مرد اجنبی عورتوں کے درمیان یا کوئی عورت اجنبی مردوں کے درمیان وفات پا جائے

جب کوئی عورت مر جائے اور وہاں عورتیں موجود نہ ہوں جو اس کو غسل دیں اور نہ اس کا کوئی محرم رشتہ دار ہو اور نہ اس کا شوہر ہو، تو اس عورت کو تیمم کرایا جائے گا۔ اسے غسل نہیں دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی مرد مر جائے اور وہاں عورتوں کے سوا کوئی مرد نہ ہو، تو اس مرد کو بھی تیمم کرایا جائے گا اسے غسل نہیں دیا جائے گا۔

مکحولؒ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب کوئی عورت مر جائے اور وہاں مردوں کے سوا کوئی عورت نہ ہو اور کوئی مرد مر جائے اور عورتوں کے سوا وہاں کوئی مرد نہ ہو، تو ایسے مرد اور عورت کو تیمم کرایا جائے اور دفن کر دیا جائے وہ دونوں ایسے شخص کی مانند ہیں جس کو پانی نہ ملے"۔(۱) (مراسیل ابو داؤد)

۶۔ میت کو غسل دینے والے کے لئے غسل کر لینا مستحب ہے

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ چار چیزوں سے غسل فرمایا کرتے تھے۔ ایک جنابت سے، دوسرے جمعہ کے روز، تیسرے فصد سے، اور چوتھے میت کو غسل دینے سے (ابو داؤد)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو شخص میت کو غسل دے اسے غسل کرنا چاہئے اور جو اس کا جنازہ اٹھائے اسے وضو کرنا چاہئے"۔ (ابو داؤد۔ ترمذی)

اس حدیث میں اگرچہ نبی ﷺ نے میت کو غسل دینے پر غسل کرنے کا حکم دیا ہے لیکن آپ ﷺ کے اس حکم کو وجوب کے بجائے استحباب پر محمول کیا جائے گا کیونکہ بعض

---

(۱) یہ روایت مرسل (جس میں صحابی کا ذکر نہ ہو) ہے۔ اس لئے اس کے قابل حجت ہونے میں اختلاف ہے۔۔ امام سعید بن مسیبؒ، نخعیؒ، حمادؒ، امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ، احمد بن حنبلؒ، اور اہلحدیث علماء کے نزدیک یہ قابل حجت ہے۔ اس لئے ان کا مسلک وہی ہے جو ہم نے اوپر نقل کیا ہے۔ امام حسن بصریؒ، اسحاقؒ، اور امام شافعیؒ کے نزدیک یہ قابل حجت نہیں ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک ایسے مرد یا عورت کو تیمم نہیں کرایا جائے گا بلکہ اس کو قمیص کے اوپر ہی سے غسل دیا جائے گا اور غسل دینے والا مرد (یا عورت) اسے ہاتھ نہیں لگائے گا بلکہ اپنے ہاتھ کو کپڑے کے ٹکڑے سے لپیٹ کر غسل دے گا۔

(المغنی ج ۲ ص ۳۱۴) (کتاب الجنائز از مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری ص ۲۳)

دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ میت کو غسل دینے پر غسل کرنا ضروری نہیں ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میت کو غسل دو، تو اس کو غسل دینے سے تم پر غسل نہیں ہے۔ تمہارا مردہ پاک مرتا ہے، نجس نہیں ہے۔ لہٰذا تمہارے لئے یہ کافی ہے کہ اپنے ہاتھوں کو دھولو"۔ (بیہقی)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتقال ہوا تو ان کی بیوی حضرت اسماءؓ نے ان کو غسل دیا۔ جب وہ باہر آئیں تو انھوں نے مہاجرین صحابہؓ سے جو وہاں موجود تھے، دریافت کیا کہ "آج سخت جاڑے کا دن ہے اور میں روزے سے ہوں تو کیا میرے لئے غسل کرنا ضروری ہے؟" سب نے جواب دیا "نہیں"۔ (موطا امام مالکؒ وغیرہ)

اس بارے میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ (معالم السنن ج ۴ ص ۳۰۵) (بذل المجہود ج ۴ ص ۱۹۶)

۷۔ شہید کو غسل نہیں دیا جائے گا

شہید (جب کہ وہ کفار و مشرکین سے جنگ کرتے ہوئے شہادت پا جائے) کو غسل نہیں دیا جائے گا۔ نبی ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ غزوۂ احد کے دن نبی ﷺ نے جنگ میں شہید ہونے والوں پر نظر ڈالی اور پھر فرمایا "انھیں ان کے خون آلود کپڑوں ہی میں لپیٹ دو۔ اس لئے کہ میں نے ان کے حق میں شہادت دے دی ہے"۔ چنانچہ دو، دو اور تین تین آدمیوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا جاتا تھا۔ پہلے سے معلوم کیا جاتا کہ ان میں سب سے قرآن کس کو یاد تھا۔ چنانچہ جس کے متعلق بتایا جاتا کہ اسے سب سے زیادہ قرآن یاد تھا اسے قبر میں سب سے پہلے اتارا جاتا۔ میرے والد اور چچا کو اس روز ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا"۔

(بخاری، نسائی، احمد، ابن ماجہ، ترمذی)

حضرت جابرؓ ہی سے دوسری روایت ہے کہ جو صحابہؓ غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے ان کے متعلق نبی ﷺ نے فرمایا۔ "انھیں غسل نہ دو اس لئے کہ قیامت کے دن ان کے زخم یا انکے خون خوشبو سے مہکیں گے اور آپؐ نے ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی"۔

(بخاری، احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی)

نوٹ: شہید کی نماز جنازہ پڑھنے یا نہ پڑھنے کے متعلق اختلاف ہے جس کا ذکر ہم اگلے باب

"نماز جنازہ" میں کریں گے۔

۸۔ میت کو غسل دینے کا طریقہ

اس بارے میں سب سے صحیح اور مشہور حدیث جس پر تمام ائمہ کا عمل ہے۔ حضرت ام عطیہؓ کی ہے جس میں وہ بیان کرتی ہیں کہ "ہم نبی ﷺ کی صاحبزادی ___ حضرت زینبؓ ___ کو غسل دے رہی تھیں۔ نبی ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا "اس کو پانی اور بیری کے پتوں سے تین، پانچ یا اس سے زیادہ اگر تم ضرورت محسوس کرو، غسل دو اور آخری غسل میں تھوڑا سا کافور بھی ڈال لو اور جب تم غسل دے کر فارغ ہو تو مجھے اطلاع دو"۔ چنانچہ جب ہم غسل دے کر فارغ ہوئیں تو ہم نے نبی ﷺ کو اطلاع کرائی۔ آپ ﷺ نے ہماری طرف اپنا تہبند پھینکا اور فرمایا "اس سے اس کا جسم لپیٹ دو (یعنی اس کا کفن بنا دو)"۔ پھر ہم نے ان کے یعنی حضرت زینبؓ کے، سر میں کنگھی کی اور ان کی تین چوٹیاں بنائیں" دوسری روایت میں ہے کہ "چوٹیاں بنا کر ہم نے انہیں پیچھے کمر پر ڈال دیا تین چوٹیوں میں سے دو چوٹیاں ان کے سر کے دائیں اور بائیں حصے کے بالوں کی تھیں اور ایک پیشانی کے بالوں کی"۔

ایک اور روایت میں حضرت ام عطیہؓ بیان کرتی ہیں کہ "ہم نے نبی ﷺ کی صاحبزادی کو غسل دیا تو نبی ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم انہیں بیری کے پتوں سے تین بار غسل دیں اگر تین بار سے صفائی نہ ہو، تو پانچ بار غسل دیں اور اگر پانچ مرتبہ سے صفائی نہ ہو، تو اس سے بھی زیادہ مرتبہ غسل دیں۔ ہمارا خیال یہی تھا کہ پانچ مرتبہ سے زیادہ سے مراد سات مرتبہ غسل دینا ہے"۔

ایک اور روایت میں حضرت ام عطیہؓ فرماتی ہیں۔ "نبی ﷺ نے اپنی صاحبزادی کے غسل کے وقت ہمیں حکم دیا کہ تم جسم کے دائیں اعضاء سے اور وضو کی جگہوں سے غسل دینا شروع کرو"۔ (بخاری، مسلم، احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بیہقی)

ان تمام روایات کو ملا کر معلوم ہوتا ہے کہ میت کے غسل میں مندرجہ ذیل چیزیں مستحب ہیں۔

۱۔ جسم کے دائیں اعضاء سے غسل شروع کرانا اور وضو کرانا۔

۲۔ جس پانی سے غسل دیا جائے اس میں بیری کے پتے ڈالنا۔

۳۔ تین مرتبہ، اگر تین مرتبہ سے صفائی نہ ہو تو پانچ مرتبہ یا اس سے بھی زیادہ مرتبہ غسل دینا۔

۴۔ آخری غسل کے وقت کافور استعمال کرنا۔

۵۔ اگر میت عورت ہو تو اسے غسل دینے کے بعد اس کے بالوں کی کنگھی کرنا اور ان کی تین چوٹیاں بنا کر سر کے پیچھے کمر پر ڈال دینا۔(۱)

فائدہ: (۱) حدیث میں اس چیز کا ذکر نہیں ہے کہ میت کو غسل دینے کے لئے پہلے کس کروٹ پر لٹایا جائے؟ حنفیہ کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ میت کو تخت یا چارپائی پر پہلے بائیں کروٹ پر لٹایا جائے تاکہ غسل دائیں طرف سے شروع ہو پھر اسے غسل دیا جائے یہاں تک کہ اوپر سے نیچے تک سارے بدن کا غسل ہو جائے۔ یہ ایک مرتبہ غسل ہوا۔ پھر دائیں کروٹ پر لٹا کر اسی طرح دوسری مرتبہ غسل دیا جائے۔ پھر بائیں کروٹ پر لٹا کر تیسری مرتبہ غسل دیا جائے۔ (بذل المجہود ج ۴، ص ۱۹۲)

(۲) چونکہ میت کے منہ اور ناک سے پانی خارج نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے بعض حنفی فقہاء کے نزدیک میت کو کلی کرائے اور ناک میں پانی دیئے بغیر وضو کرایا جائے گا۔ بعض دوسرے فقہاء کہتے ہیں کہ میت کو کلی کرانے اور ناک میں پانی دینے کے لئے یہ کافی ہے کہ کپڑا لپیٹ کر اس کے مسوڑھوں اور دانتوں اور لبوں کو مل دیا جائے اور ناک کے نتھنوں میں انگلی پھیر دی جائے شافعی فقہاء کے نزدیک میت کو کلی کرا کے اور ناک میں پانی دے کر وضو کرایا جائے۔ اہلحدیث علماء کے نزدیک بھی میت کو کلی کرا کے اور ناک میں پانی دے کر وضو کرانا چاہئے لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے تو حنفی فقہاء کے کہنے کے مطابق انگلی پر کپڑا لپیٹ کر میت کے مسوڑھوں اور دانتوں اور لبوں کو مل دینا چاہئے اور ناک کے نتھنوں میں انگلی پھیر دینی چاہئے۔ (مختصر از کتاب الجنائز ص ۲۸۔۲۹)

---

(۱) مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ اور عام محدثین کا یہی مسلک ہے۔

حنفیہ کے نزدیک عورت کے بالوں کو دونوں کندھوں کے اوپر سے لا کر سینے پر ڈال دینا مستحب ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اوپر کی روایت میں حضرت ام عطیہؓ کا اپنا عمل بیان ہوا ہے جس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ نبی ﷺ نے انہیں ایسا کرنے کا حکم دیا تھا" (بذل المجہود ج ۴، ص ۱۹۲)(الفتح الربانی ج ۷، ص ۱۶۸)

کفن کا حکم:

اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ مسلمان مر جائے تو اسے کفن پہنانا فرض کفایہ ہے۔ (المغنی ج ۲، ص ۳۰۹)

[illegible] یہ ہے جیسا کہ ہم آگے بیان کر رہے ہیں کہ مرد کے کفن میں [illegible]

عورت کے کفن میں پانچ کپڑے ہوں، لیکن اگر اتنے کپڑے نہ ہوں تو دو یا ایک کپڑے میں بھی میت کو کفنایا جا سکتا ہے،، جب کہ وہ اتنا لمبا ہو کہ اس سے میت کے پورے قد کو ڈھانپا جا سکتا ہو اور اگر ایک ہی کپڑا ہو اور وہ چھوٹا ہو تو اس سے میت کے اوپر کے حصے کو ڈھانپ دینا چاہئے اور پیروں کو گھاس وغیرہ سے ڈھانپ دینا چاہئے۔

حضرتِ عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی حجتہ الوداع کے موقع پر عرفات میں وقوف کر رہا تھا کہ وہ اپنی اونٹنی سے گر گیا اور اونٹنی نے اسے روند ڈالا۔ نبی ﷺ نے فرمایا "اس کو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دو اور اسے احرام ہی کے دونوں کپڑوں میں کفنا دو۔ اسے حنوط، خوشبو نہ لگاؤ اور نہ اس کا سر ڈھانکو اس لئے کہ یہ قیامت کے روز تلبیہ کہتا ہوا اٹھے گا"۔ (بخاری)

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے روایت ہے کہ جنگ احد میں حضرت مصعب بن عمیرؓ شہید ہوئے تو ان کے کفن کے لئے کوئی کپڑا نہ ملا۔ صرف ایک چادر ملی جو اتنی چھوٹی تھی کہ اگر اس سے ان کا سر چھپاتے تو ٹانگیں کھل جاتیں اور اگر ٹانگیں چھپاتے تو سر کھل جاتا۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ان کا سر ڈھانپ دیا جائے اور ٹانگوں پر اذخر (ایک خوشبودار گھاس جو سرزمین عرب میں پائی جاتی ہے) ڈال دی جائے"۔ (بخاری)

اسی طرح حضرت حمزہؓ بھی ایک ناکافی کپڑے میں کفنائے گئے۔ (بخاری، احمد وغیرہ)

ضرورت اور مجبوری کے وقت دو یا تین میتوں کو ایک ہی کپڑے میں کفنایا جا سکتا ہے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جنگِ اُحد کے موقع پر شہداء زیادہ تھے تو ایک یا دو یا تین

آدمیوں کو ایک ہی کپڑے میں کفنا کر انہیں ایک ہی قبر میں دفن کر دیا جاتا تھا"۔

(ابو داؤد، ترمذی)

۲۔ کفن کے مستحبات

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "تم میں سے اگر کوئی شخص اپنے بھائی کو کفن دے تو اسے چاہئے کہ اچھا کفن دے" (مسلم)

اسی طرح کی ایک اور روایت امام ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے بھی حضرت ابو قتادہؓ سے نقل کی ہے، لیکن واضح رہے کہ عمدہ کفن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بہت قیمتی ہو کیوں کہ قیمتی کفن سے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا۔ "کفن میں حد سے نہ بڑھو (یعنی بہت قیمتی کفن نہ دو) اس لئے کہ وہ بہت جلد چھن جائے گا۔ (یعنی گل سڑ جائے گا) (ابو داؤد)

کفن کے کپڑے کا نیا ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ پرانے اور مستعمل کپڑے میں بھی جب کہ اس کو دھو لیا گیا ہو، میت کو کفن دیا جا سکتا ہے۔ اس بارے میں اجماع ہے۔

(الفتح الربانی ج ۷، ص ۱۹۱)

حضرت اُمِ عطیہؓ کی یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ نبی ﷺ نے اپنی صاحبزادی حضرت زینبؓ کے کفن میں اپنا مستعمل تہبند دیا۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کی وفات کا وقت قریب ہوا، تو آپ نے اپنے اس کپڑے کی طرف اشارہ کر کے جسے آپ پہنے ہوئے تھے فرمایا۔ میرے اس کپڑے کو دھو لینا اور دو نئے کپڑے لے لینا اور مجھے ان ہی پرانے اور نئے کپڑوں میں کفن دے دینا۔ حضرت عائشہؓ کہنے لگیں "اے ابا جان! آپ کا یہ کپڑا تو پرانا ہو چکا ہے" فرمایا "مردے کی بہ نسبت زندہ آدمی نئے کپڑوں کا زیادہ مستحق ہے" (بخاری)

(ب) کفن کے کپڑوں کا سفید ہونا

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اپنے کپڑوں میں سے سفید کپڑے پہنو، اس لئے کہ یہ تمہارے بہترین کپڑے ہیں، اور ان ہی میں اپنے مردوں کو کفناؤ"۔ (احمد، ابو داؤد، ترمذی)

(ج) کفن کو خوشبو لگانا اور لوبان وغیرہ کی دھونی دینا

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میت کو دھونی دو، تو تین مرتبہ دھونی دو" (احمد، بزار) اسی حدیث کو امام بیہقی اور حاکم نے بھی نقل کیا ہے اور ان کی روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ "جب تم میت کو دھونی دو، تو طاق مرتبہ دھونی دو"۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میت کے سجدوں کی جگہوں دونوں ہتھیلیوں، ناک، پیشانی اور دونوں گھٹنوں اور دونوں پاؤں کے اگلے حصوں، پر کافور مل دینا چاہئے"۔ (بیہقی، ابن ابی شیبہ)

(د) مرد کے کفن کا تین بڑی چادروں پر مشتمل ہونا

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ تین کپڑوں میں کفنائے گئے جو سفید تھے اور مقام سحول کے بنے ہوئے تھے اور سوتی تھے جن میں نہ کرتہ تھا اور نہ عمامہ" (بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، احمد، نسائی، ابن ماجہ وغیرہ)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن ابی کا انتقال ہوا، تو اس کے بیٹے نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضور ﷺ مجھے اپنا کرتہ عنایت فرما دیں میں اس میں اپنے باپ کو دفناؤں گا" اور آپ نے انہیں اپنا کرتہ دے دیا۔" (بخاری و مسلم)

مرد کا تین لفافوں میں کفنانا افضل ہے یوں اس کو ایک کرتے اور دو چادروں میں بھی کفنایا جاسکتا ہے اور اس میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ فرماتے ہیں کہ میت کو کرتا اور تہبند پہنایا جائے اور ایک تیسرے کپڑے میں لپیٹا جائے(۱) (موطا امام مالکؒ، موطا امام محمدؒ)

---

(۱) یہ اکثر صحابہ اور بعد کے ائمہ (جن میں امام شافعیؒ، احمد بن حنبل، اور عام محدثین شامل ہیں) کا مسلک ہے (ترمذی) (الفتح الربانی ج ۷، ص ۱۷۷) امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مرد کا تین چادروں میں کفنانا صحیح ہے اور اس میں کوئی کراہت نہیں ہے۔ البتہ اس کا ایک کرتے (جس کے کف نہ ہوں) ایک تہبند اور ایک چادر میں کفنانا افضل ہے۔ کیوں کہ حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کو تین کپڑوں میں کفنایا گیا۔ ایک آپ ﷺ کا کرتہ جس میں آپ کی وفات ہوئی، اور ایک نجرانی حلہ اور حلہ دو کپڑوں (ایک چادر اور ایک تہبند) کا ہوتا ہے (احمد، ابو داؤد، ابن ماجہ، بیہقی) اس روایت کی مزید تائید حضرت انسؓ کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ نبی ﷺ

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

عورت کے کفن کا ایک تہبند ایک کرتے ایک اوڑھنی اور دو بڑی چادریں[1] کل پانچ کپڑوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

حضرت لیلیٰ ثقفیہؓ سے روایت ہے کہ جن عورتوں نے رسول ﷺ کی صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ کو ان کی وفات کے بعد غسل دیا ان میں میں بھی شامل تھی، رسول اللہ ﷺ نے پہلے تہبند دیا، پھر کرتہ، پھر اوڑھنی پھر چادر اور پھر ایک اور کپڑا[2] جس میں انہیں (یعنی حضرت ام کلثومؓ کو لپیٹا گیا) رسول اللہ ﷺ دروازے کے پاس تشریف فرما تھے۔ آپ کے پاس کفن تھا اور آپ ایک ایک کپڑا ہمیں دیتے جاتے تھے"۔ (احمد)

۳۔ محرم کا کفن (۳)

اگر کسی نے حج یا عمرہ کا احرام باندھ رکھا ہو اور اس کا اسی حال میں انتقال ہو جائے، تو اس کو غسل دے کر احرام ہی کے کپڑوں میں کفنایا جائے گا۔ اسے نہ خوشبو لگائی جائے گی اور نہ اس کا سر ڈھانکا جائے گا۔

(پچھلے صفحہ سے بقیہ) واضح رہے کہ اس بارے میں جو اختلاف ہے وہ افضلیت میں ہے، جواز میں نہیں ہے۔ وجہ اختلاف یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک حضرت عائشہؓ کی حدیث میں جو یہ کہا گیا ہے کہ حضور ﷺ کے کفن میں کوئی کرتہ نہیں تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کے کفن میں کوئی نیا کرتہ نہیں تھا یا اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کے کفن میں کوئی باقاعدہ سلا ہوا اور کفوں والا کرتہ نہیں تھا۔

(۱) امام شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور دوسرے ائمہ کے نزدیک حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت انسؓ کی روایات میں سند کے اعتبار سے کلام ہے، اس لئے وہ حضرت عائشہؓ کی روایات کو ان دونوں کی روایات پر ترجیح دیتے ہیں۔ امام مالکؒ کے نزدیک مرد کو پانچ کپڑوں، دو چادروں ایک تہبند ایک کرتے اور ایک عمامہ میں کفنانا مستحب ہے۔ ان کے نزدیک حضرت عائشہؓ کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کے کفن میں کرتہ بھی تھا اور عمامہ بھی لیکن وہ تین چادروں کے علاوہ تھا۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۱ ص ۱۳۲) (عرف الشذی ص ۳۴۴) (الفتح الربانی ج ۷ ص ۱۷۷) حنفیہ کے نزدیک ایک بڑی چادر ایک اور سینہ بند، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

(۲) اس کپڑے سے مراد حنفیہ کے نزدیک خرقہ یعنی سینہ بند ہے اور دوسرے کے نزدیک بڑی چادر، حنفیہ کے نزدیک بھی اس سینہ بند کا اتنا بڑا ہونا مستحب ہے کہ رانوں تک پہنچ جائے۔ (ردالمختار ج ۱ ص ۵۷۹)

(۳) یعنی وہ شخص جس نے حج یا عمرہ کے لئے احرام باندھ رکھا ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ ایک آدمی (حجتہ الوداع کے موقع پر) عرفات میں وقوف کر رہا تھا کہ وہ اپنی لونٹنی سے گر گیا اور لونٹنی نے اسے روند ڈالا۔ نبی ﷺ نے فرمایا "اس کو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دو اور اسے (احرام ہی کے) دونوں کپڑوں میں کفنا دو اسے حنوط (خوشبو) نہ لگاؤ اور نہ اس کا سر ڈھانکو۔ اس لئے کہ یہ قیامت کے روز تلبیہ کہتا ہوئے اٹھے گا"[1] (بخاری)

۴۔ شہید کا کفن

اگر کوئی مسلمان میدان جنگ میں جہاد کرتے ہوئے شہید ہو جائے تو اس کو ان ہی کپڑوں میں کفنایا جائے گا جو اس وقت اس کے بدن پر ہوں گے، اس کے ہتھیار اس سے الگ کر لئے جائیں گے۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (الفتح الربانی ج ۷' ص ۱۸۶)

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص کو (میدان جنگ میں جہاد کرتے ہوئے) سینے پر پیٹ میں تیر لگا، تو اس کو اس کے ان ہی کپڑوں میں کفنا دیا گیا جو اس کے بدن پر تھے۔ اس وقت ہم نبی ﷺ کے ساتھ تھے۔ (احمد، ابوداؤد، ترمذی، بیہقی)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ احد کے روز نبی ﷺ نے حکم دیا کہ شہداء کے ہتھیار الگ کر لئے جائیں اور ان کو ان کے خون آلود کپڑوں ہی میں دفنا دیا جائے۔

(احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، بیہقی)

---

(۱) یہ امام شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ، اسحاقؒ اور دوسرے اکثر ائمہ کا مسلک ہے امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ اور اوزاعیؒ کے نزدیک موت سے محرم کا احرام ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسے اسی طرح غسل اور کفن دیا جائے گا جس طرح غیر محرم کو دیا جاتا ہے اوپر کی حدیث کے متعلق ان کا کہنا یہ ہے کہ کہ اس میں ایک خاص شخص کا واقعہ بیان ہوا ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے اس کا حکم عام نہیں ہے (الفتح الربانی ج ۷' ص ۱۹۱)

جنازہ اٹھانا اور اس کے ساتھ چلنا

۱۔ حکم

میت کو غسل اور کفن دینے کی طرح اس کا جنازہ اٹھانا بھی تمام ائمہ کے نزدیک فرضِ کفایہ ہے۔ (الفتح الربانی ج ۸، ص ۱۱)

۲۔ ثواب و فضیلت

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں: سلام کا جواب دینا، مریض کی عیادت کرنا، جنازہ کے ساتھ جانا، دعوت قبول کرنا اور چھینک آنے پر رحمک اللہ (اللہ تم پر رحم کرے) کہنا"۔
(بخاری و مسلم)

حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس نے کسی میت کی نماز جنازہ پڑھی، اسے ایک قیراط ثواب ملے گا اور جس نے اس کی تدفین سے فارغ ہونے تک انتظار کیا، اسے دو قیراط ثواب ملے گا" صحابہ نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول! قیراط سے کیا مراد ہے؟" فرمایا "دو بڑے پہاڑوں کے برابر" (بخاری، مسلم، احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ وغیرہ) مسلم کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں "ان دونوں میں سے چھوٹا پہاڑ کوہِ اُحد کے برابر ہے۔"

۳۔ جنازہ کو جلد لے جانے کا استحباب

جنازہ لے جانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے بلکہ اس کو عام رفتار کی بہ نسبت تیزی سے لے کر چلنا چاہیے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اپنے جنازوں کو تیزی سے لے کر چلو۔ اگر وہ نیک ہوں گے تو تم اسے خیر تک جلد پہنچا دو گے اور اگر وہ برے ہوں گے تو تم ان سے جلد چھٹکارا حاصل کر لو گے اور انہیں جلد اپنے کندھوں سے اتار لو گے"۔ (بخاری،

مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بیہقی)

اس بارے میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے (الفتح الربانی ج ۸ ص ۱۰)

۴۔ جنازہ کا اکرام واحترام

جنازہ اٹھانے اور لے جانے میں اس بات کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ جنازہ کی بے حرمتی نہ ہو۔ اس کو سکون واطمینان کے ساتھ اٹھانا چاہئے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے سرف کے مقام پر حضرت میمونہؓ (امّ المؤمنین) کی نماز جنازہ پڑھائی اور فرمایا کہ "دیکھو یہ (حضرت) میمونہ کا جنازہ ہے اسے جھٹکے اور ہچکولے نہ آنے پائیں" (مسلم، احمد وغیرہم)

۵۔ جنازہ صرف مرد اٹھائیں

اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جنازہ خواہ مرد کا ہو یا عورت کا اسے صرف مرد اٹھائیں گے عورتیں نہیں اٹھائیں گی۔ (الفتح الربانی ج ۸ ص ۱۰)

۶۔ جنازہ اٹھانے کا طریقہ

جنازہ اٹھانے کی دو صورتیں ہیں:

(۱) چارپائی کو اس کے چاروں کونوں سے اٹھایا جائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کو جو شخص جنازہ کے ساتھ چلے اسے چاہئے کہ چارپائی کے چاروں کونوں کو اٹھائے، کیونکہ یہ سنت ہے، پھر چاہے تو (اور اٹھا کر) ثواب حاصل کرے اور چاہے تو چھوڑ دے (ابن ماجہ)

(۲) چارپائی کے اگلے حصے کو دونوں کندھوں کے درمیان رکھ کر اٹھایا جائے۔

ابراہیم بن سعدؒ اپنے دلوا سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت سعد بن وقاصؓ کو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا جنازہ اٹھائے دیکھا۔ آپ نے پلنگ کے اگلے حصے کو اپنے دونوں کندھوں کے درمیان اٹھا رکھا تھا۔

امام شافعیؒ نے اسی طرح کی روایات حضرت عثمانؓ، ابوہریرہؓ، ابن زبیرؓ اور ابن عمرؓ کے

متعلق بھی نقل کی ہیں (بیہقی)(۱)

۷۔ جنازہ کو تین مرتبہ اٹھانے کا ثواب

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص جنازہ کے ساتھ چلا اور اس نے اسے تین بار اٹھایا، تو (میت کا) جو (حق) اس کے ذمہ تھا وہ اس نے ادا کر دیا"۔ (ترمذی)

۸۔ پیدل چلنے میں جنازہ کے آگے یا پیچھے رہنا

جنازہ کے ساتھ پیدل جانے میں اس سے قریب رہتے ہوئے اس کے آگے پیچھے دائیں اور بائیں ہر طرف چلا جا سکتا ہے۔ یہ تمام صورتیں تمام ائمہ کے نزدیک جائز ہیں کیونکہ نبی ﷺ اور صحابہ سے دونوں پر عمل کرنے کی روایات ملتی ہیں البتہ جمہور (امام مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ وغیرہ) کے نزدیک جنازہ سے آگے چلنا افضل ہے کیونکہ:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے صاجزادے سالمؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جنازے کے آگے چلا کرتے تھے اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ، ابو بکرؓ اور عمرؓ بھی جنازہ کے آگے چلا کرتے تھے"۔ دوسری روایت میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ ﷺ، ابو بکرؓ اور عمرؓ کو جنازے کے آگے چلتے دیکھا ہے"۔(۲)

(احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ وغیرہ)

---

(۱) اکثر ائمہ (امام ابو حنیفہؒ، احمد بن حنبلؒ، سفیان ثوریؒ، اسحاق وغیرہ کے نزدیک ان میں سے پہلی صورت بہتر ہے۔ امام شافعیؒ اور امام ابو ثورؒ کے نزدیک دوسری صورت بہتر ہے۔ امام مالکؒ ابو داؤد ظاہریؒ کے نزدیک دونوں صورتیں یکساں ہیں۔ (الفتح الربانی ج ۸ ص ۱۱)

اہلحدیث علماء نے بھی پہلی صورت کو بہتر قرار دیا ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ یہ سنت ہے یعنی نبی ﷺ کی سنت ہے۔ (کتاب الجنائز ص ۴۶)

فائدہ: حنفیہؒ کے نزدیک چارپائی کو چاروں طرف سے اٹھانے کی صورت یہ ہے کہ پہلے میت کی دائیں طرف والے کونے کو دائیں کندھے پر رکھا جائے اور کچھ دور چلا جائے پھر پائتانہ کی دائیں طرف والے کونے کو دائیں کندھے پر اٹھایا جائے اور کچھ دور چلا جائے پھر جنازہ کی بائیں طرف والے کونے کو بائیں کندھے پر اٹھایا جائے اور کچھ دور چلا جائے پھر پائتانہ کی بائیں طرف والے کونے کو بائیں کندھے پر اٹھایا جائے اور کچھ دور چلا جائے (کتاب الآثار از امام محمدؒ)

(۲) امام ابو حنیفہؒ، اور اسحاقؒ کے نزدیک جنازے سے قریب رہتے ہوئے اس کے پیچھے چلنا افضل ہے کیوں کہ: (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "سوار جنازہ کے پیچھے چلے گا اور پیدل اس کے آگے۔ اس کی دائیں یا بائیں جانب سے قریب"
(ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بیہقی، ابن ابی شیبہ)

۹۔ جنازہ کے ساتھ سوار ہو کر جانا

بعض احادیث میں جنازہ کے ساتھ سوار ہو کر جانے کی ممانعت آئی ہے جیسے:
حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک جنازہ میں چند آدمیوں کو دیکھا کہ وہ سوار ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا "کیا تم لوگوں کو شرم نہیں آتی کہ اللہ کے فرشتے پیدل چل رہے ہیں اور تم لوگ گھوڑوں کی پیٹھوں پر سوار ہو" (ترمذی۔ ابن ماجہ)
اور بعض دوسری احادیث میں اس کی اجازت دی گئی ہے جیسا کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ مذکورہ بالا حدیث میں اس کا ذکر ہے۔
ان دونوں قسم کی احادیث کے درمیان تطبیق دیتے ہوئے تمام ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ جنازہ کے ساتھ سوار ہو کر جانا اگرچہ جائز ہے لیکن پیدل جانا سوار ہو کر جانے کی بہ

---

*(پچھلے صفحہ سے بقیہ) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ہم نے نبی ﷺ سے جنازہ کے ساتھ چلنے کے متعلق دریافت کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا "جنازہ متبوع ہے تابع نہیں" (یعنی جنازہ کے پیچھے چلنا چاہئے آگے نہیں"۔ (احمد، ابو داؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی)
حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جنازہ کے ساتھ آواز (رونا دھونا یا باجہ وغیرہ) اور آگ نہ جائے اور نہ اس کے آگے چلا جائے"۔ (احمد، ابو داؤد، بیہقی، دار قطنی)
حضرت علیؓ فرماتے ہیں "جنازہ کے پیچھے چلنا اسکے آگے چلنے سے اتنا ہی افضل ہے جتنا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے افضل ہے"۔
(راوی نے عرض کیا کہ میں نے حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ کو جنازہ کے آگے چلتے دیکھا ہے"۔ تو حضرت علیؓ نے فرمایا "وہ (دراصل) یہ چاہتے تھے کہ لوگوں کو چلنے میں دقت نہ ہو"۔ (احمد، ہیثمی) (بیہقی اور ابن ابی شیبہ نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے اور اس میں حضرت علیؓ کے الفاظ یوں ہیں "وہ دونوں (یعنی حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ یہ جانتے تھے کہ جنازہ کے پیچھے چلنا اتنا افضل ہے جتنا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے افضل ہے، لیکن وہ چاہتے تھے کہ (آگے رہ کر) لوگوں کے لئے چلنے میں آسانی پیدا کریں"۔
اس بارے میں صحابہ میں سے حضرت انسؓ اور ائمہ میں سے امام سفیان ثوریؒ کے نزدیک جنازہ کے آگے پیچھے ہر طرف چلنا یکساں ہے۔ صحیح بخاری سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاریؒ کا بھی یہی مسلک تھا۔
(الفتح الربانی ج ۸، ص ۱۸) (بذل المجہود ج ۴، ص ۲۱۰) (کتاب الجنائز ص ۴۹) وغیرہ

نسبت افضل ہے البتہ واپسی کے وقت سوار ہو کر آنے میں بھی کوئی کراہت نہیں ہے۔(الفتح الربانی ج ۸، ص ۱۱۹) وغیرہ۔

ائمہ کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ سوار کے لئے جنازہ سے آگے چلنا افضل ہے یا اس سے پیچھے رہنا۔ جمہور ائمہ (امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ وغیرہ) کے نزدیک اس کا پیچھے رہنا افضل ہے۔(۱)

۱۰۔ جنازہ کو گزرتے دیکھ کر کھڑا ہونا یا بیٹھے رہنا

شروع میں نبی ﷺ کا حکم تھا کہ اگر کوئی شخص جنازہ کو گزرتا دیکھے اور وہ بیٹھا ہو تو اسے کھڑا ہو جانا چاہئے۔

حضرت عامر بن ربیعہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص جنازہ کو دیکھے اور وہ اس کے ساتھ چل نہ رہا ہو تو اسے چاہئے کہ کھڑا ہو جائے۔ یہاں تک کہ وہ اس کے پاس سے گزر جائے یا اسے رکھ دیا جائے"۔
(بخاری، مسلم، احمد، شافعی، بیہقی، ابو داؤد ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔ "ہم لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو (جنازہ کو دیکھ کر) کھڑے ہوتے دیکھا،، تو ہم بھی کھڑے ہوئے اور جب آپ بیٹھے (یعنی بعد میں آپ بیٹھنے لگے) تو ہم بھی بیٹھے" (مسلم) یہی روایت مسند امام احمدؒ مسند امام شافعیؒ، بیہقی، ابن حبان میں مختلف الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔ مسند امام شافعیؒ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں "نبی ﷺ جنازوں میں (جنازوں کو دیکھ کر) کھڑے ہوا کرتے تھے، پھر آپ بیٹھے (یعنی بیٹھنے لگے) مسند امام احمدؒ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں "نبی ﷺ نے ہمیں جنازہ میں (یعنی جنازہ کو دیکھ کر) کھڑے ہونے کا حکم دیا تھا اس کے بعد آپ بیٹھے (یعنی بیٹھنے لگے) اور ہمیں بیٹھنے کا حکم دیا"۔(۲)

---

(۱) امام شافعیؒ کے نزدیک اس کا پیدل کی طرح آگے رہنا افضل ہے۔ (الفتح الربانی ج ۸، ص ۱۱۹)

(۲) یہ امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ اور دوسرے اکثر ائمہ کا مسلک ہے۔
امام احمدؒ، اسحاقؒ، ابن حزمؒ اور بعض شافعی اور مالکی علماء کے نزدیک جنازہ کو دیکھ کر کھڑے ہونا مستحب ہے ان کا استدلال یہ ہے کہ جن احادیث میں نبی ﷺ کے بیٹھے رہنے اور بیٹھ جانے کا حکم آیا ہے ان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کھڑے ہونے کا حکم منسوخ ہو گیا بلکہ یہ معلوم ہوتا کہ نبی ﷺ نے کھڑے ہونے کا حکم استحباب کے لئے دیا تھا اگر کوئی شخص بیٹھا رہنا چاہے تو وہ بیٹھا بھی رہ سکتا ہے کھڑا ہونا مستحب ہے اور بیٹھا رہنا جائز۔
(الفتح الربانی ج ۸، ص ۳۴) وغیرہ

۱۱۔ جنازہ کے ساتھ آگ لے جانے اور آواز بلند کرنے کی ممانعت

جنازہ کے ساتھ آگ لے جانا (جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں اس کا رواج تھا) اور جنازہ کے ساتھ چلتے وقت آواز بلند کرنا (خواہ یہ آواز کلمہ یا دعا یا تلاوت قرآن ہی کی کیوں نہ ہو) مکروہ ہے۔ اس بارے میں تمام مذاہب کا اتفاق ہے۔ (الفتح الربانی ج ۸ ص ۲۴)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "جنازہ کے ساتھ نہ آگ جانی چاہئے اور نہ آواز"۔ (احمد، ابو داؤد، بیہقی)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ہمیں کسی ایسے جنازہ کے ساتھ جانے سے منع فرمایا ہے جس میں شور ہو"۔ (احمد، ابن ماجہ)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک جنازہ کے ساتھ چل رہے تھے کہ آپ نے ایک شخص کو یہ کہتے سنا کہ "میت کے لئے مغفرت کی دعا کرو، اللہ تمہاری مغفرت کرے گا" حضرت عبداللہ نے فرمایا "اللہ تمہاری مغفرت نہ کرے"۔ (سعید بحوالہ المغنی) اسی طرح کی روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق بھی آئی ہے۔ (الفتح الربانی)

امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ کے صحابہؓ تین موقعوں پر آواز کو پست رکھنا پسند کرتے تھے ایک جنازہ کے وقت، دوسرے اللہ تعالیٰ کے ذکر کے وقت اور تیسرے جنگ کے وقت"۔ کتاب المغنی کے مولف امام ابن قدامہؒ لکھتے ہیں "سعیدؒ بن مسیب، سعید بن جبیرؒ، ابراہیم نخعیؒ اور ہمارے امام (یعنی امام احمدؒ) بھی اس کو (یعنی آواز بلند کرنے کو) ناپسند کرتے تھے"۔ حنفی فقہ کی مشہور کتاب دُرِّ مختار میں ہے "جنازہ کے ساتھ جو لوگ ہوں، ان کے لئے کوئی دعا یا ذکر با آواز پڑھنا مکروہ ہے" علاوہ شامیؒ رَدّ المختار میں ابراہیم نخعیؒ کے متعلق روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں "جب بلند آواز سے دعا اور ذکر کرنے کا یہ حال ہے تو میت کے ساتھ گانے کا کیا حال ہو گا، جو آج ہمارے ہاں رواج پا گیا ہے"۔ مالکی اور شافعی علماء نے بھی جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے دعا یا ذکر کرنے سے سختی سے منع کیا ہے (الفتح الربانی وغیرہ)

۱۲۔ جنازہ کے ساتھ عورتوں کے جانے کی ممانعت

حضرت اُمِّ عطیہؓ سے روایت ہے کہ ہمیں (یعنی ہم عورتوں کو) جنازے کے ساتھ جانے سے منع کیا گیا ہے اگرچہ سختی بھی نہیں کی گئی۔ (بخاری و مسلم)

اس اور بعض دوسری احادیث (جن کی سند اگرچہ کمزور ہے) کی بنا پر تمام ائمہ کے

نزدیک عورتوں کا جنازے کے ساتھ جانا منع ہے اکثر ائمہ کے نزدیک یہ مکروہ ہے اور بعض کے نزدیک حرام(۱)(الفتح الربانی ج ۸'ص ۲۵)

(۱)حنفیہ کے نزدیک مکروہ تحریمی(ردالمختار)

نمازِ جنازہ

۱- حکم

میت کے غسل اور کفن کی طرح اس کی نماز جنازہ پڑھنا بھی فرض کفایہ ہے۔اس لئے کہ نبی ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے اور شروع سے اب تک ساری امت کا اس پر عمل ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب کسی ایسے شخص کا جنازہ آتا جس کے ذمہ قرض ہوتا تو نبی ﷺ دریافت فرماتے کہ آیا اس نے اتنا مال چھوڑا ہے کہ اس کا قرض ادا کیا جا سکے؟ اگر لوگ بتاتے کہ ہاں، اس نے اتنا مال چھوڑا ہے، تو آپ ﷺ اس کی نماز جنازہ پڑھاتے ورنہ لوگوں سے فرما دیتے کہ تم اس کی نماز جنازہ پڑھو۔ (بخاری و مسلم وغیرہ)

اس پر اجماع ہے۔ (فتح القدیر ج ۱ ص ۲۸۹) (۱)

۲- فضیلت اور ثواب

نماز جنازہ کی فضیلت اور ثواب میں متعدد احادیث ثابت ہیں۔اختصار کے خیال سے ہم ذیل میں صرف ایک حدیث نقل کرتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس نے کسی میت کی نماز جنازہ پڑھی، اسے ایک قیراط ثواب ملے گا اور جس نے اس کی تدفین سے فارغ ہونے تک انتظار کیا اسے دو قیراط ثواب ملے گا"۔ صحابہؓ نے عرض کیا۔"اے اللہ رسول ﷺ! قیراط سے کیا مراد ہے؟" فرمایا "دو بڑے پہاڑوں کے برابر" (بخاری، مسلم، احمد، ابو داؤد،

---

(۱) نماز جنازہ کے فرض کفایہ ہونے کا ذکر صاحب فتح القدیر اور بعض دوسرے علماء نے کیا ہے، اگرچہ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ بعض مالکیہ علماء کے نزدیک یہ سنت ہے۔(الفتح الربانی ج ۷ ص ۲۰۱)

ترمذی، نسائی، ابن ماجہ وغیرہ) مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں۔ "ان دونوں میں سے چھوٹا پہاڑ کوہ احد کے برابر ہے۔ نسائی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ "ان میں سے ہر ایک کوہ احد سے بڑا ہے"۔

۳۔ جگہ

نماز جنازہ میدان میں بھی پڑھی جا سکتی ہے اور اگر اس سے مسجد کے گندا ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو اس کے مسجد میں پڑھنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

جب حضرت سعد بن وقاصؓ کا انتقال ہوا تو حضرت عائشہؓ اور نبی ﷺ کی دوسری ازواج مطہرات نے ان کے ہاں پیغام بھیجا کہ ان کے جنازے کو ہمارے پاس مسجد سے گزارا جائے۔ نبی ﷺ کی ازواج مطہرات نے ان کی نماز جنازہ پڑھی۔ دوسرے صحابہ نے اس فعل کو غلط قرار دیا۔ حضرت عائشہؓ کو جب اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے فرمایا "کتنے تعجب کی بات ہے کہ لوگ ہمارے اس فعل کو غلط قرار دے رہے ہیں۔ اللہ کی قسم! نبی ﷺ نے بیضاءؓ (ایک صحابیہ) کے بیٹے سہلؓ کی نماز جنازہ مسجد ہی میں تو پڑھی تھی"۔

(مسلم، احمد، بیہقی، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن شیبہ)

مصنف ابن ابی شیبہؒ میں عروہؒ سے روایت ہے کہ "حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نماز جنازہ مسجد میں پڑھی گئی"۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ "حضرت عمرؓ کی نماز جنازہ مسجد میں پڑھی گئی"۔ (حوالہ الفتح الربانی ج ۷ ص ۴۸) (۱)

---

(۱) یہ جمہور (جن میں امام شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ، اسحاقؒ اور عام محدثین شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ (الفتح الربانی ج ۷، ص ۲۴۹)

امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک مسجد میں نماز جنازہ مکروہ ہے۔ ان کا استدلال حضرت ابوہریرہؓ سے مروی اس روایت سے ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس نے کسی میت کی نماز جنازہ مسجد میں پڑھی فلیس له شیئی (اس کے لئے کچھ نہیں یعنی کوئی اجر نہیں)"۔ (احمد، ابی داؤد، ابن ماجہ، بیہقی، ابن ماجہ، ابن ابی شیبہ)

حضرت عائشہؓ کی مذکورہ بالا روایت کا جواب حنفیہ (اور مالکیہ) یہ دیتے ہیں کہ نبی ﷺ کا مسجد میں نماز جنازہ پڑھانا عذر کی بناء پر تھا ایک تو بارش ہو رہی تھی اور دوسرے آپ مسجد میں معتکف تھے۔ عام صحابہ کرام نے جو حضرت عائشہؓ کے فعل کو غلط قرار دیا، اس سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ نبی ﷺ کا مسجد میں نماز جنازہ پڑھانا عذر کی بناء پر تھا"۔ (بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۱۹۱) (الکوکب الدری ج ۱ ص ۲۱۵) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

۴- وقت

نمازِ جنازہ کا کوئی متعین وقت نہیں ہے سوائے ان تین اوقات کے جن میں عام نمازوں کا پڑھنا مکروہ ہے، دن رات کے تمام اوقات میں اسے پڑھا جاسکتا ہے۔

حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ہمیں تین اوقات میں نماز پڑھنے اور میت کو دفن کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے ایک جب سورج طلوع ہو رہا ہو یہاں تک کہ وہ بلند ہو جائے، دوسرے جب کہ وہ نصف النہار پر ہو، اور تیسرے جب وہ غروب ہونے کے لئے جھکے، یہاں تک کہ غروب ہو جائے"۔ (۱) (مسلم، احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

(پچھلے صفحہ سے باقیہ) دوسری طرف حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی حدیث کے متعلق جمہور کا کہنا یہ ہے کہ ایک تو اس کی سند ضعیف ہے، اس لئے یہ حضرت عائشہؓ سے مروی حدیث کے مقابلے میں قابل حجت نہیں۔ دوسرے سنن ابو داؤد کے مشہور اور محقق نسخوں میں اس کے الفاظ یوں ہیں کہ جس نے کسی میت کی نماز جنازہ مسجد میں پڑھی فلا شیئی علیہ (تو اس پر کچھ نہیں یعنی کچھ حرج نہیں)۔ تیسرے اگر اس حدیث کو قابل حجت مان بھی لیا جائے تو اس میں فلا شیئی لہ کو فلا شیئی علیہ (اس پر کوئی ہرج نہیں) کے معنی لینا پڑے گا تاکہ دونوں روایتوں میں تطبیق ہو جائے۔ قرآن میں لہ کا لفظ "علیہ" کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ ارشاد ہے "ان اساتم فلہٗ" (اگر تم برائی کرو گے تو تمہارے اپنے اوپر ہی اس کا وبال ہو گا)۔ اس بارے میں حافظ ابن حجرؒ اور امام ابن قیمؒ وغیرہ نے جس مسلک کو صحیح قرار دیا ہے۔ یہ ہے کہ مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا اگرچہ جائز ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ اسے مسجد میں پڑھنے کے بجائے اس کے لئے مسجد سے باہر الگ جگہ مقرر کی جائے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کے زمانہ میں نمازِ جنازہ کے لئے مسجد سے باہر الگ جگہ مقرر تھی جسے موضع الجنائز کہا جاتا تھا۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک یہودی ایک مرد یا ایک عورت کو لے کر نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان دونوں نے زنا کا ارتکاب کیا تھا۔ حضور نے انہیں سنگسار کرنے کا حکم دیا اور انہیں موضع الجنائز کے قریب سنگسار کیا گیا"۔ ایک لمبی حدیث میں محمد بن عبداللہ بن جحشؓ کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ "ہم مسجد کے صحن میں جہاں جنازے رکھے جاتے تھے، بیٹھے ہوئے تھے"۔ (احمد بحوالہ مشکوۃ باب الافلاس والانذار) حضرت ابن عمرؓ کی حدیث کے تحت حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں "اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں نماز جنازہ کے لئے (مسجد کے علاوہ اور) جگہ مقرر کی گئی تھی اور اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسجد میں بعض اوقات جو نماز جنازہ پڑھی گئی ہے وہ کسی وقتی ضرورت کے تحت یا صرف جواز کو ظاہر کرنے کے لئے تھی"۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری ص ۶۸۸) (زاد المعاد ج ۱ ص ۲۹۱)۔ اہل حدیث علماء میں مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ نے اسی مسلک کو صحیح قرار دیا ہے۔ (کتاب الجنائز ۱۴۱ھ)

(۱) (حر ...) [illegible] (بقیہ اگلے صفحہ پر)

۵- شرائط

دوسری نمازوں کی طرح نماز جنازہ کے لئے استقبال قبلہ اور ستر پوشی تمام کے نزدیک ضروری ہے-وضو کے ضروری ہونے یانہ ہونے میں اختلاف ہے-اکثر ائمہ کے نزدیک یہ بھی ضروری ہے-صرف ان ہی صورتوں میں اس کے لئے تیمم کیا جاسکتا ہے جن میں دوسری نمازوں کے لئے تیمم کرنا جائز ہے-(۱)

۶- ارکان

نماز جنازہ کے مندرجہ ذیل ارکان (فرائض) ہیں اگر ان میں سے ایک بھی رہ جائے تو نماز نہیں ہوگی:

۱-نیت: تمام شرعی کاموں کے لئے نیت ضروری ہے جیساکہ ہم کتاب کے پہلے حصہ میں وضو اور نماز کے فرائض کے تحت بیان کر چکے ہیں-(۲)

۲- قیام: فرض نمازوں کی طرح نماز جنازہ کا بھی کھڑے ہو کر پڑھنا فرض ہے اسے کسی چیز پر سوار ہو کر پڑھنا بھی جائز نہیں ہے- اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے-

---

(پچھلے صفحہ سے بقیہ) کا مسلک ہے-امام ابو حنیفہؒ اور کوفہ کے دوسرے فقہاء کا بھی یہی مسلک ہے-البتہ ان کے نزدیک اگر جنازہ مکروہ وقت ہی میں آئے تو نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے-اگرچہ اس کا اس وقت سے موخر کرنا بہتر ہے-یہاں تک کہ وہ گزر جائے-(مرقاۃ علی قاریؒ حوالہ تحفۃ الاحوذی ج ۲،ص ۱۴۴)
شافعیہ کے نزدیک ان مکروہ اوقات میں چونکہ ہر وہ فرض یا سنت یا نفل نماز پڑھی جاسکتی ہے-جس کا کوئی سبب ہو،اس لئے ان کے نزدیک نماز جنازہ کا بھی ان مکروہ اوقات میں پڑھ لینا جائز ہے-اوپر کی حدیث کے متعلق ان کا کہنا یہ ہے کہ اس میں ایسی نماز کے پڑھنے سے منع کیا گیا ہے جس کا کوئی سبب نہ ہو یا پھر میت کو قبر میں اترنے سے منع کیا گیا"- (تحفۃ الاحوذی ایضا) امام مالک،شافعیؒ،احمد بن حنبلؒ اور عام محدثین کا بھی مسلک ہے--

(۱) امام ابو حنیفہؒ،سفیان ثوریؒ اور کوفہ کے دوسرے فقہاء کے نزدیک اگر نماز شروع ہو رہی ہو وقت کم ہو اور اس کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو تو تیمم بھی کیا جاسکتا ہے- تابعین میں سے عطاء،سالمؒ،زہریؒ،ابراہیم نخعیؒ،ربیعہؒ،لیث اور اوزاعیؒ کے نزدیک بھی یہ صورت صحیح ہے-ایک روایت میں امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے-اس بارے میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک مرفوع روایت بھی ہے لیکن اس کی سند ضعیف ہے-
(فتح الباری)(بدایۃ المجتہد ج ۱،ص ۱۹۷)

(۲) حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک نماز کے لئے نیت فرض نہیں شرط ہے-دوسروں کے نزدیک یہ فرض ہے لیکن جیساکہ ہم پہلے حصہ میں بیان کر چکے ہیں فرض اور شرط میں عملاً کوئی فرق نہیں ہے-

(المغنی ج ۲، ص ۴۷۶)

(فرض نماز میں قیام کے فرض ہونے کی دلیل اور تفصیلات کے لئے دیکھئے حصہ اول صفحہ ۱۲۵)

۲- تکبیر: (ا) نماز جنازہ میں تکبیر (اللہ اکبر کہنے) کے فرض ہونے میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جیسا کہ ہر نماز میں تکبیر تحریمہ سب کے نزدیک ضروری ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا ص، تفصیل اور دلیل کے لئے دیکھئے صفحہ ۱۲۵)

(ب) نبی ﷺ سے نماز جنازہ میں چار تکبیریں بھی ثابت ہیں اور پانچ بھی۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے صحابہؓ کرام کو مدینہ میں (حبشہ کے بادشاہ) نجاشیؒ کے انتقال کی خبر دی۔ صحابہؓ کرام نے حضور ﷺ کے پیچھے ان کی نماز جنازہ پڑھی اور حضور ﷺ نے اس نماز میں چار تکبیریں کہیں"۔

(بخاری، مسلم، ابو داؤد، احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

ابن ابی شیبہؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت زید بن ارقمؓ ہمارے جنازوں پر چار تکبیریں کہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے پانچ تکبیریں کہیں۔ لوگوں نے ان سے دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ "نبی ﷺ پانچ تکبیریں کہا کرتے تھے یا یہ کہ نبی ﷺ نے پانچ پانچ تکبیریں کہی ہیں (بعد کے راوی کا شک)"۔ بعض کم تر درجہ کی روایات میں نبی ﷺ کے سات، آٹھ اور نو تکبیروں کے کہنے کا بھی ذکر ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے (نماز جنازہ میں، سات تکبیریں بھی کہی ہیں، پانچ بھی اور چار بھی۔ (طبرانی)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے شہدائے احد پر نو نو تکبیریں کہیں۔ پھر آپ ﷺ سات تکبیریں کہنے لگے۔ پھر چار تکبیریں کہنے لگے، یہاں تک کہ آپ ﷺ اپنے رب کے پاس پہنچ گئے"۔ (طبرانی)

مختلف صحابہ سے تین سے لے کر نو تک تکبیریں ثابت ہیں لیکن اکثر صحابہؓ کا عمل چار ہی تکبیروں پر تھا۔ تقریباً تمام ائمہ کا مسلک بھی چار ہی تکبیروں پر ہے کیونکہ:

۱- جن صحابہ کرام سے چار تکبیریں ثابت ہیں، ان کی تعداد ان صحابہؓ کرام سے زیادہ ہے جن سے پانچ تکبیریں ثابت ہیں۔

۲- چار تکبیروں کی روایت بخاری و مسلم اور حدیث کی دوسری تمام کتابوں میں ہے،

حالانکہ پانچ تکبیروں کی روایت بخاری میں نہیں ہے۔

۳۔ چار تکبیروں پر تمام صحابہؓ کا عمل تھا، (جب کہ پانچ تکبیروں) پر بعض کا عمل تھا اور بعض کا نہیں تھا)۔

۴۔ نبی ﷺ کا آخری عمل چار ہی تکبیروں کا ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی مذکورہ بالا روایت میں اس کا ذکر ہے۔

(الفتح الربانی ج ۷، ص ۳-۲۳۲) (نیل الاوطار ج ۴، ص ۶۳)

(ج) ائمہ کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا چار سے زیادہ تکبیریں منسوخ ہیں یا ان پر بھی عمل کیا جا سکتا ہے۔ اکثر ائمہ (امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ اور شافعیؒ وغیرہ) کے نزدیک پانچ یا اس سے زیادہ تکبیریں کہے تو مقتدی چار تکبیروں سے زیادہ میں اس کی متابعت نہیں کریں گے۔ البتہ سلام اس کے ساتھ ہی پھیریں گے۔(۱) (ہدایہ ج ۱، ص ۶۴) (الفتح الربانی ج ۷، ص ۲۳۲) وغیرہ

۵۔ سورہ فاتحہ کا پڑھنا: نماز جنازہ میں پہلی تکبیر کے بعد سورہ فاتحہ کا پڑھنا فرض ہے کیونکہ نماز جنازہ بھی نماز ہے۔ اور نماز کے متعلق نبی ﷺ کا عام ارشاد ہے "لا صلوة الا بفاتحة الكتاب" (سورہ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں) پھر خاص طور پر نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا بھی نبی ﷺ سے ثابت ہے:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک جنازہ کی نماز پڑھائی۔ آپ ﷺ نے اس میں سورہ فاتحہ پڑھی اور پھر فرمایا لتعلموا انه من السنة (میں نے یہ اس لئے پڑھی ہے کہ تم جان لو کہ یہ سنت ہے) (بخاری، ابو داؤد، ترمذی)

فضالہ بن ابی امیہؒ سے روایت ہے کہ جس شخص نے حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کی نماز جنازہ پڑھائی اس نے سورہ فاتحہ پڑھی۔ (بخاری فی تاریخہ)

حضرت ابو امامہؓ فرماتے ہیں کہ نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ سورہ فاتحہ پڑھی جائے۔

---

(۱) امام احمدؒ اور اہل حدیث علماء کے نزدیک اگرچہ چار ہی تکبیروں پر اکتفا کرنا افضل ہے، لیکن پانچ تکبیروں پر بھی عمل کیا جا سکتا ہے کیونکہ پانچ تکبیروں کا کسی صحیح حدیث سے منسوخ ہونا ثابت نہیں ہے۔ (المغنی ج ۳، ص ۴۵۰) (نیل الاوطار) (کتاب الجنائز مولانا عبدالرحمن مبارکپوری ص ۶۳) امام احمدؒ کے نزدیک اگر امام سات تک تکبیریں کہے تو اس کی متابعت کی جائے گی۔ اس سے زیادہ تکبیروں پر اس کی متابعت نہیں کی جائے گی۔ (المغنی ایضا)

پھر رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجا جائے اور پھر میت کے لئے خلوص دل سے دعا کی جائے اور پھر سلام پھیر دیا جائے۔ (اسماعیل قاضی بحوالہ فتح الباری و نیل الاوطار)۔ (۱)

۲- میت کے لئے دعا: (۱) نماز جنازہ میں میت کے لئے دعا کرنا اکثر فقہاء کے نزدیک فرض ہے (۲)۔ امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں "نماز جنازہ سے اصل مقصود میت کے لئے دعا کرنا ہے اور اسی لئے نماز جنازہ میں دعا کی روایات نبی ﷺ سے اس کثرت سے آئی ہیں کہ سورہ فاتحہ اور درود پڑھنے کی روایات اتنی نہیں آئیں۔ (زاد المعاد ج ۹ ' ص ۲۹۲)

---

(۱) یہ امام شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور بعض دوسرے محدثین کا مسلک ہے۔ امام اسحاقؒ اور بعض دوسرے محدثین بھی نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کے قائل ہیں لیکن وہ اسے فرض نہیں بلکہ سنت مانتے ہیں جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا "تاکہ تم جان لو کہ یہ سنت ہے"۔ (ملاحظہ ہو نیل الاوطار ج ۴) (زاد المعاد وغیرہ)

امام ابو حنیفہؒ امام مالکؒ، ابو سفیان ثوریؒ نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کے قائل نہیں ہیں۔ حنفیہ کے نزدیک یہ مکروہ تحریمی ہے اور مالکیہ کے نزدیک مکروہ تنزیہی۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ) ان کا استدلال یہ ہے کہ نماز جنازہ دراصل میت کے لئے دعا ہے (اس کی حیثیت عام نمازوں کی نہیں ہے کہ اس میں لاصلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب کی رو سے سورہ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہو) نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ "جب تم کسی میت کی نماز جنازہ پڑھو، تو اس کے لئے خلوص دل سے دعا کرو"۔ (ابو داؤد، ابن ماجہ، بروایت حضرت ابو ہریرہؓ)

بعض احادیث میں نماز جنازہ کے پڑھنے کا طریقہ بیان ہوا ہے مگر ان میں سورہ فاتحہ پڑھنے کا ذکر نہیں ہے۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ سے جب دریافت کیا گیا کہ آپ نماز جنازہ کیونکر پڑھتے ہیں تو انہوں نے بتایا کہ میں جنازہ کے ساتھ اس کے گھر والوں کے ہاں چلا جاتا ہوں۔ پھر جب جنازہ رکھا جاتا ہے تو اللہ اکبر کہتا ہوں اور اللہ کی حمد کرتا ہوں اور اس کے نبی پر درود بھیجتا ہوں اور پھر کہتا ہوں اللھم عبدک ----- (موطا امام مالکؒ) لہذا جن صحابہؓ کرام سے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا ثابت ہے، انہوں نے اس کو بطور دعا کے پڑھا ہے نہ کہ بطور تلاوت۔ اس کو بطور دعا پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ (بذل المجہود ج ۴ ' ص ۲۰۶) (الکوکب الدری ج ۲ ' ص ۳۱۳) وغیرہ امام مالکؒ فرماتے ہیں۔ "ہمارے شہر (مدینہ) میں نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے پر ہرگز عمل نہیں ہے"۔ (ہدایۃ المجتہد ج ۱ ' ص ۱۸۶)

حنفی علماء کا عام مسلک یہی ہے لیکن بعض حنفی علماء (جیسے علامہ شرنبلالیؒ صاحب نور الایضاح اور مولانا عبدالحی لکھنویؒ) نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کے قائل ہیں اور اسے اولیٰ قرار دیتے ہیں۔ (کتاب الجنائز مولانا عبدالرحمن مبارکپوریؒ ص ۴۷)

(۲) مالکیہ، شافعیہ اور حنبلیہ کا یہی مسلک ہے، حنفی فقہاء میں سے بعض کے نزدیک نماز جنازہ میں میت کے لئے دعا رکن ہے اور بعض کے نزدیک سنت۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ' ص ۵۱۹ ' ۵۲۳)

(ب) میت پر دعا کرتے وقت خلوص دل سے دعا کرنی چاہئے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم کسی میت کی نماز جنازہ پڑھو، تو خلوص دل سے اس کے لئے دعا کرو"۔ (ابو داؤد، ابن ماجہ)

(ج) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نبی ﷺ کو ایک جنازہ پر یہ دعا فرماتے سنا ہے:-

أَنْتَ خَلَقْتَهَا، وَأَنْتَ رَزَقْتَهَا، وَأَنْتَ هَدَيْتَهَا لِلْإِسْلَامِ وَأَنْتَ قَبَضْتَ رُوْحَهَا، تَعْلَمُ سِرَّهَا وَ عَلَانِيَتَهَا، جِئْنَا شُفَعَاءَ فَاغْفِرْ لَهَا

اے اللہ! تو نے ہی اس میت کو پیدا کیا، تو نے ہی اسے رزق دیا، تو نے ہی اسے اسلام کے راستے کی ہدایت بخشی، تو نے ہی اس کی روح قبض کی۔ اس کے ظاہر و باطن سے باخبر ہے۔ ہم تیرے (حضور میں) اس کی سفارش لے کر حاضر ہوئے ہیں، پس تو اس کی مغفرت فرما۔

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک جنازہ کی نماز پڑھائی اور اس میں یہ دعا فرمائی:-

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَ مَيِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَ غَائِبِنَا وَ صَغِيْرِنَا وَ كَبِيْرِنَا وَذَكَرِنَا وَأُنْثَانَا، اَللّٰهُمَّ مَنْ أَحْيَيْتَهٗ مِنَّا فَأَحْيِهٖ عَلَى الْإِسْلَامِ، وَ مَنْ تَوَفَّيْتَهٗ مِنَّا فَتَوَفَّهٗ عَلَى الْإِيْمَانِ۔ (ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، احمد، ابن حبان، حاکم)

اے اللہ! ہمارے زندہ مردہ، ہمارے حاضر و غائب، ہمارے چھوٹے اور بڑے، ہمارے مرد و عورت (ہر ایک) کی مغفرت فرما۔ اے اللہ! ہم میں سے جس کو تو زندہ رکھے اسے اسلام پر زندہ رکھ اور جس کو موت دے اسے ایمان پر موت دے۔

(۳) حضرت واثلہ بن اسقعؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو (میت کے لئے) یہ دعا فرماتے سنا ہے:

(۱) اَلَا اِنَّ فُلَانَ بْنَ فُلَانٍ فِيْ ذِمَّتِكَ وَ

اے اللہ! فلاں بن فلاں (یہاں حضور ﷺ

(۱) الا کا لفظ امام احمدؒ اور ابن ماجہؒ کی روایت میں ہے۔ امام ابو داؤدؒ کی روایت میں اس کے بجائے "اللھم" کا لفظ ہے۔ (الفتح الربانی)

حَبْلِ جِوَارِکَ فَقِهِ[1] فِتْنَةَ الْقَبْرِ وَ عَذَابِ النَّارِ، اَنْتَ اَهْلُ الْوَفَاءِ وَالْحَقِّ، اَللّٰهُمَّ فَاغْفِرْلَهُ وَارْحَمْهُ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۔ (احمد، ابو داوٗد، ابن ماجہ)

نے میت کا نام اور اس کے باپ کا نام لیا، تیرے سپرد ہے، تیری پناہ میں ہے تو اسے قبر کی آزمائش اور دوزخ کے عذاب سے بچا تو اپنا وعدہ پورا کرنے والا اور حمد و ثنا کا مستحق ہے۔ اے اللہ! اس کی بخشش فرما اور اس پر رحم کر۔ یقیناً تو بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

(۴) حضرت عوف بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک مرتبہ نماز جنازہ پڑھائی، تو میں نے آپ کی دعائے جنازہ یاد رکھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهُ وَارْحَمْهُ وَعَافِهِ وَاعْفُ عَنْهُ، وَاَکْرِمْ نُزُلَهُ، وَوَسِّعْ مَدْخَلَهُ، وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ، وَ نَقِّهِ مِنَ الْخَطَا یَا کَمَا نَقَّیْتَ الثَّوْبَ الْاَبْیَضَ مِنَ الدَّنَسِ، وَاَبْدِلْهُ دَارًا خَیْرًا مِنْ دَارِهِ وَاَهْلاً خَیْرًا مِّنْ اَهْلِهِ وَزَوْجاً خَیْرًا مِنْ زَوْجِهِ[2]، وَاَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ وَ نَجِّهِ مِنَ النَّارِ

اے اللہ! اس کی مغفرت فرما اس کو اپنے دامن رحمت میں جگہ دے، اسے عافیت میں رکھ اور اس کو معاف فرما، اس کی عمدہ پذیرائی فرما۔ اس کے ٹھکانہ (قبر) کو کشادہ کر دے۔ اسے پانی، برف اور یخ سے غسل دے کر گناہوں سے اس طرح پاک و صاف کر دے جس طرح تو کپڑے کو میل کچیل سے پاک صاف کر دیتا ہے اس کو دنیا کے گھر سے بہتر گھر، دنیا کے رشتہ داروں سے بہتر رشتہ دار، اور دنیا کے رفیق زندگی سے اچھا رفیق زندگی دے۔ اسے جنت میں داخل فرما۔

---

(۱) حنفیہ اور دوسرے فقہا کے نزدیک اگر میت عورت ہو تو یہاں اور اگلی دعاؤں میں "ہ" کی ضمیر کو "ھا" سے بدل کر پڑھا جائے گا۔ اگر جنازہ ایک مرد اور عورت کا پڑھا جا رہا ہو تو "ھما" کی ضمیر استعمال کی جائے گی اور اگر جنازہ کئی افراد کا پڑھا جا رہا ہو اور وہ سب مرد ہوں یا ان میں سے بعض مرد ہوں اور بعض عورتیں، تو "ھم" کی ضمیر استعمال کی جائے گی اور اگر سب عورتیں ہوں تو "ھن" کی ضمیر استعمال کی جائے گی (الفقہ علی المذاہب الاربعہ)۔ اہل حدیث علماء کے نزدیک ہر حال میں دعا کا ان ہی الفاظ کے ساتھ پڑھنا مستحب ہے جو نبی ﷺ نے استعمال فرمائے ہیں خواہ میت مرد ہو یا عورت۔ (نیل الاوطار وغیرہ)

(۲) حنفیہ اور بعض دوسرے فقہا نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ اگر میت عورت ہو تو اس کے لئے دعا میں "وزوجا خیرا من زوجھا" کے الفاظ نہیں کہے جائیں گے۔ (الفقہ ---) (الفتح الربانی)

وَقِهِ عَذَابَ الْقَبْرِ (۱) — اسے آگ سے نجات دے اور اسے قبر کے عذاب سے پناہ میں رکھ۔

(احمد، مسلم، نسائی، ابن ماجہ)

مسلم و نسائی کی روایت میں حضرت عوف بن مالکؓ کے یہ الفاظ زیادہ ہیں "میں نے نبی ﷺ کی زبان مبارک سے یہ دعا سن کر کہا۔ 'کاش! یہ میرا جنازہ ہوتا اور رسول اللہ ﷺ کی یہ دعا مجھے نصیب ہوتی'۔"

(۵) حضرت یزید بن رکانہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب جنازہ کی نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوتے تو یہ دعا فرماتے:

اَللّٰهُمَّ اِنَّهُ عَبْدُكَ وَابْنُ اَمَتِكَ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ وَحْدَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ وَ يَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُكَ وَ رَسُوْلُكَ، اَصْبَحَ فَقِيْرًا اِلٰى رَحْمَتِكَ وَ اَصْبَحْتَ غَنِيًّا عَنْ عَذَابِهِ، تَخَلّٰى مِنَ الدُّنْيَا وَاَهْلِيْهَا، اِنْ كَانَ زَكِيًّا فَزَكِّهِ وَ اِنْ كَانَ مُخْطِئًا فَاغْفِرْلَهُ۔ اَللّٰهُمَّ لَاتَحْرِمْنَا اَجْرَهُ وَلَا تُضِلَّنَا بَعْدَهُ (۲) (حاکم باسناد صحیح)

اے اللہ! یہ تیرا بندہ اور تیری بندی کا بیٹا ہے۔ یہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں اور تیرا کوئی شریک نہیں، اور یہ کہ محمد ﷺ تیرے بندے اور رسول ہیں۔ یہ تیری رحمت کا محتاج ہے اور تو اس کے عذاب سے بے نیاز ہے۔ یہ شخص دنیا اور دنیا والوں سے الگ ہو گیا ہے۔ اگر یہ پاک ہے تو تو اس کو پاک کر (یعنی) پاکی کا اجر دے) اور اگر گناہ گار ہے تو اس کی مغفرت فرمادے۔ اے اللہ! اس کے ثواب سے ہم کو محروم نہ رکھ اور اس کے بعد ہم کو گمراہ نہ کر۔

اگر جنازہ نابالغ بچہ کا ہو تو اس کے لئے دعا میں ان الفاظ کا کہنا مستحب ہے۔

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک اس دعا کا پڑھنا دوسری دعاؤں کی بہ نسبت بہتر ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

(۲) موطا امام مالکؒ میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نماز جنازہ میں یہی دعا پڑھا کرتے تھے۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ تمام دوسری دعاؤں کی بہ نسبت امام شافعیؒ کو یہ دعا زیادہ پسند تھی اور آپ زیادہ تر اسی کو پڑھا کرتے تھے۔ (الفتح الربانی ج ۷ ص ۲۲۸)

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ لَنَا سَلَفاً وَّ فَرَطاً وَّ اَجْرًا۔ اے اللہ! اس بچے کو ہمارا ہراول بنا

(بیہقی بروایت حضرت ابو ہریرہؓ بحوالہ نیل الاوطار ج ۴ ص ۶۹۔ المغنی ہدایہ ص ۱۔۶۵)

فائدہ: جیساکہ ہم اوپر بتا چکے ہیں۔ بعض حنفی علماء کے نزدیک نماز جنازہ میں میت کے لئے دعا مسنون ہے، رکن نہیں۔ ان علماء کے نزدیک اگر کسی شخص کو جنازہ کی دعا یاد نہ ہو، تو اسے تین مرتبہ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ (اے اللہ! مومن مردوں اور مومن عورتوں کی مغفرت فرما) پڑھ لینا چاہئے۔ اور اگر یہ بھی یاد نہ ہو تو جنازہ کی چار تکبیروں پر اکتفا کر لینا چاہئے۔ (البحر الرائق)

(د) نماز جنازہ میں میت کے لئے دعا کب مانگی جائے؟ نبی ﷺ کی کسی حدیث سے اس کا تعین نہیں ہوتا۔ (نیل الاوطار ج ۲ ص ۷۰)۔ ائمہ کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے۔ (۱)

(۶) سلام: نماز جنازہ کے آخر میں سلام ضروری ہے۔ اس بارے میں ائمہ کے درمیان وہی اختلاف ہے۔ جو عام نمازوں کے سلام میں ہے یعنی دوسرے ائمہ کے نزدیک یہ فرض ہے اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک واجب۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے ص ۱۳۱)

نماز جنازہ میں سلام ایک طرف ہے یا دونوں طرف؟ اس بارے میں نبی ﷺ سے کوئی چیز ثابت نہیں ہے۔ ائمہ کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے۔ (۲)

فائدہ: شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک نبی ﷺ پر درود بھی نماز جنازہ کے ارکان میں شامل ہے۔ حنفیہ، مالکیہ اور اہل حدیث علماء کے نزدیک چونکہ یہ سنت ہے اس لئے ہم اسے آگے سنتوں اور مستحبات کے تحت درج کرتے ہیں۔

---

(۱) حنفیہ، شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک اس کا وقت تیسری تکبیر کے بعد ہے اور مالکیہ کے نزدیک ہر تکبیر کے بعد یہاں تک کہ چوتھی تکبیر کے بعد بھی۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۴۷۹۔۴۸۱) اہل حدیث علماء کا عمل اگرچہ حنفیہ، شافعیہ اور حنبلیہ کے مطابق ہے لیکن ان کے نزدیک تمام صورتیں جائز ہیں۔ دعا کو پہلی تکبیر کے بعد بھی مانگا جا سکتا ہے دوسری اور تیسری تکبیر کے بعد بھی اور ہر تکبیر کے بعد بھی۔ (نیل الاوطار ایضاً)

(۲) امام مالکؒ، احمد بن حنبلؒ اور دوسرے اکثر ائمہ کے نزدیک نماز جنازہ میں صرف ایک سلام یعنی دائیں طرف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ، شافعیؒ، سفیان ثوریؒ اور دوسرے ائمہ کے نزدیک (عام نمازوں کی طرح) دونوں طرف مختلف صحابہ سے دونوں طرح کی روایات ملتی ہیں۔ (الفتح الربانی ج ۷ ص ۲۴۴)

۷- سنتیں اور مستحبات

نماز جنازہ میں مندرجہ ذیل امور سنت ہیں :

(۱) حمد و ثنا: حضرت فضالہ بن عبیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دعا کرتے ہوئے سنا، جس نے دعا کرنے سے پہلے نہ اللہ کی ثناء کی تھی اور نہ رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجا تھا- آپ ﷺ نے فرمایا "اس نے جلدی کی"- (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

ائمہ کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ نماز جنازہ میں حمد و ثنا کب کی جائے اور کن الفاظ کے ساتھ کی جائے(۱)-

(۲) درود: (ا) نماز جنازہ میں نبی ﷺ پر درود سب کے نزدیک مشروع ہے-(نووی بحوالہ الفتح الربانی ج ۷، ص ۲۴۲) اختلاف صرف اس بارے میں ہے کہ آیا یہ نماز جنازہ کا رکن ہے یا سنت- امام شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ کے نزدیک یہ نماز جنازہ کا رکن ہے اور دوسرے ائمہ کے نزدیک سنت- جیسا کہ عام نمازوں میں یہ امام شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ کے نزدیک فرض ہے اور دوسروں کے نزدیک سنت-(تفصیل کے لئے دیکھئے ص ۱۵۷)

(ب) دعا کی طرح نبی ﷺ کی کسی حدیث سے اس بات کا تعین نہیں ہوتا کہ نماز جنازہ میں درود کس موقع پر پڑھا جائے-(نیل الاوطار) ائمہ کے نزدیک اس بارے میں اختلاف ہے-(۲)

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک پہلی تکبیر اور دوسری تکبیر کے درمیان اور سبحانك اللهم و بحمدك کے الفاظ کے ساتھ، شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک پہلی تکبیر کے بعد سورہ فاتحہ شروع کرنے سے پہلے اور صرف اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم اور بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم کے الفاظ ساتھ-(الفقہ علی المذاہب الاربعہ) اہل حدیث علماء کے نزدیک شافعیہ اور حنبلیہ کی طرح پہلی تکبیر کے بعد سورہ فاتحہ شروع کرنے سے پہلے (خواہ سبحانک اللھم --- کے الفاظ کے ساتھ یا انی وجهت وجھی --- کے الفاظ کے ساتھ یا اللهم باعدبيني --- کے الفاظ کے ساتھ)-(کتاب الجنائز ص ۵۹)

(۲) حنفیہ، شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک درود دوسری تکبیر کے بعد پڑھا جائے گا اور مالکیہ کے نزدیک ہر تکبیر کے بعد دعا شروع کرنے سے پہلے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ) واضح رہے کہ مالکیہ کے نزدیک دعا ہر تکبیر کے بعد ضروری ہے-

اہل حدیث علماء کا عمل درود کو دوسری تکبیر کے بعد ہی پڑھنے کا ہے لیکن ان کے نزدیک دونوں صورتیں صحیح ہیں- البتہ اس کو سورہ فاتحہ کے بعد ہونا چاہئے کیونکہ احادیث میں پہلے قرآت پھر درود کا ذکر آتا ہے-(دیکھئے نیل الاوطار ج ۴ ص ۶۷)

(۳) تکبیر اولیٰ کے وقت رفع الیدین: نماز جنازہ میں پہلی تکبیر کے وقت رفع الیدین کرنا تمام ائمہ کے نزدیک مسنون ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک جنازہ پر تکبیر کہتے ہوئے اپنے ہاتھ اٹھائے اور اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھا۔ (ترمذی)

دوسری تکبیروں کے وقت رفع الیدین کرنا نبی ﷺ کی کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، انسؓ، عبداللہ بن عباسؓ کے متعلق ثابت ہے کہ وہ نماز جنازہ کی چار تکبیروں کے وقت رفع الیدین کیا کرتے تھے"۔ (نیل الاوطار وغیرہ) ائمہ کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے۔ (۱)

فائدہ: (۱) بعض شافعیؒ اور اہل حدیث علماء نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ کے بعد کسی دوسری سورت کے پڑھنے کو بھی مستحب مانتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کے بعد اس کے بعد ساتھ ایک اور سورت بھی پڑھی۔ یہ روایت سنن نسائی میں ہے، لیکن اس کے معتبر ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف ہے۔ اہل حدیث علماء اس کو قابل حجت تسلیم کرتے ہیں۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۱۴۳) (نیل الاوطار ج ۴) (الفتح الربانی ج ۷، ص ۲۴۱)

(۲) امام شافعیؒ (اور ایک روایت میں امام احمدؒ بھی) چوتھی تکبیر کے بعد سلام پھیرنے سے پہلے کچھ دیر کے لئے رکنے اور اس میں میت کے لئے دعا کرنے کو مستحب مانتے ہیں۔ ان کا استدلال اس روایت سے ہے کہ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ کی ایک صاحبزادی کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے (اس کی نماز جنازہ پڑھاتے ہوئے) اس پر چار تکبیریں کہیں اور چوتھی تکبیر کے بعد اس قدر وقفہ کیا جتنا دوسری تکبیروں کے درمیان کیا جاتا ہے اور اس میں دعا کرتے رہے پھر آپ نے بتایا کہ "نبی ﷺ بھی نماز جنازہ میں ایسا کیا کرتے تھے"۔ (مسند امام احمدؒ) اس

---

(۱) امام ابو حنیفہؒ، احمد بن حنبلؒ، اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک ہر تکبیر کے وقت رفع الیدین کرنا مسنون ہے۔ حضرت ابن عمرؓ اور انسؓ وغیرہ کے عمل کے علاوہ ان کا استدلال قیاس سے بھی ہے کہ جس طرح عام نمازوں میں رکوع میں جاتے اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع الیدین کیا جاتا ہے اسی طرح نماز جنازہ کی تکبیروں کے وقت بھی رفع الیدین کرنا چاہئے۔ اس بارے میں نبی ﷺ کے متعلق بھی ایک روایت ہے اور وہ یہ کہ آپ ہر تکبیر کے وقت رفع الیدین کیا کرتے تھے (ابن ابی موسیٰ) لیکن یہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ) (نیل الاوطار ج ۴، ص ۶۷)

روایت کی سند میں اختلاف ہے۔امام شافعیؒ وغیرہ کے نزدیک یہ معتبر ہے اور اسی بنا پر اہل حدیث علماء بھی چوتھی تکبیر کے بعد سلام سے پہلے رکنا اور اس میں میت کے لئے دعا کرنا مستحب مانتے ہیں۔(نیل الاوطار ج ۴' ص ۷۰) (الفقہ علی المذاہب الاربعہ)۔

۸۔ نماز جنازہ پڑھنے کا طریقہ

اوپر نماز جنازہ کے ارکان اور "سنتیں و مستحبات" کے تحت جو احادیث گزر چکی ہیں اور ان سے استنباط و استخراج میں ائمہ کے درمیان جو اختلافات ہیں ان کی رو سے مختلف ائمہ کے نزدیک نماز جنازہ پڑھنے کی صورت کا ہم حاشیہ میں ذکر کرتے ہیں۔(۱)

---

(۱) حنفیہ کے نزدیک پہلے قبلہ رو ہو کر "اللہ اکبر" کہا جائے گا اور کانوں تک ہاتھ اٹھا کر ناف کے نیچے باندھے جائیں گے۔ پھر ثنا پڑھی جائے گی پھر دوسری تکبیر کہی جائے گی اور نبی ﷺ پر درود پڑھا جائے گا۔ پھر تیسری تکبیر کہی جائے گی اور میت کے لئے دعا کی جائے گی۔ پھر چوتھی تکبیر کہی جائے گی اور اس کے بعد دائیں اور بائیں دونوں طرف سلام پھیر دیا جائے گا۔دوسری، تیسری اور چوتھی تکبیر کے وقت ہاتھ نہیں اٹھائے جائیں گے۔

شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک پہلے قبلہ رخ ہو کر اللہ اکبر کہا جائے گا اور کانوں تک ہاتھ اٹھا کر (شافعیہ کے نزدیک سینے پر اور حنبلیہ کے نزدیک ناف کے نیچے) باندھ لئے جائیں گے۔ پھر اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھ کر سورہ فاتحہ پڑھی جائے گی۔ (شافعیہ کے نزدیک سورہ فاتحہ کے بعد کوئی دوسری سورت بھی پڑھی جا سکتی ہے)۔ پھر کانوں تک ہاتھ اٹھا کر دوسری تکبیر کہی جائے گی اور نبی ﷺ پر درود بھیجا جائے گا۔ پھر کانوں تک ہاتھ اٹھا کر تیسری تکبیر کہی جائے گی اور میت کے لئے دعا کی جائے گی۔ پھر کانوں تک ہاتھ اٹھا کر چوتھی تکبیر کہی جائے گی اور کچھ دیر ٹھہر کر میت اور عام مسلمانوں کے لئے دعا کر کے سلام پھیر دیا جائے گا۔ (شافعیہ کے نزدیک دونوں طرف اور حنبلیہ کے نزدیک صرف دائیں طرف)

مالکیہ کے نزدیک پہلے قبلہ رخ ہو کر "اللہ اکبر" کہا جائے گا اور کانوں تک ہاتھ اٹھا کر سیدھے چھوڑ دیئے جائیں گے۔ پھر ثنا اور درود پڑھ کر میت کے لئے دعا کی جائے گی پھر ہاتھ اٹھائے بغیر درود پڑھ کر میت کے لئے دعا کی جائے گی، پھر ہاتھ اٹھائے بغیر درود پڑھ کر میت کے لئے دعا کی جائے گی اور پھر صرف دائیں طرف ایک سلام پھیر دیا جائے گا۔

اہل حدیث علماء کے نزدیک بھی نماز جنازہ پڑھنے کی وہی صورت ہے جو شافعیہ کے نزدیک ہے۔البتہ پہلی تکبیر کے وقت تو ہاتھ اٹھائے ہی جائیں گے۔دوسری تیسری اور چوتھی تکبیر کے وقت بھی اٹھائے جا سکتے ہیں۔

۹- نماز جنازہ کا بسرا پڑھنا مستحب ہے

نماز جنازہ کا بسرا پڑھنا مستحب ہے کیونکہ نبی ﷺ اور صحابہؓ کا عام عمل یہی تھا- حضرت ابن عباسؓ اور ابو امامہؓ نے بعض موقعوں پر اسے جہراً پڑھا- لیکن وہ صرف لوگوں کو تعلیم کے لئے جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ خود فرماتے ہیں "میں نے جہراً اس لئے قرات کی ہے کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ قرات سنت ہے"- (۱) (الفتح الربانی ج ۷ ص ۲۴۲)

۱۰- امام کے کھڑے ہونے کی صورت

اگر میت مرد ہے تو نمازِ جنازہ میں امام کا اس کے سر کے سامنے اور اگر عورت ہے تو اس کی کمر کے سامنے یعنی اس کے اوسط میں کھڑا ہونا سنت ہے-

حضرت سمرہ بن جندبؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت اُمِّ کعبؓ نفاس کی حالت میں انتقال کر گئی- نبی ﷺ نے اُس کی نماز جنازہ پڑھائی اور اس کے وسط میں کھڑے ہوئے- (احمد، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بیہقی)

حضرت انسؓ نے ایک مرد کے جنازہ کی نماز پڑھائی اور اس کے سر کے پاس کھڑے ہوئے جب جنازہ اٹھایا گیا تو ایک عورت کا جنازہ آگیا- اس کی نماز جنازہ بھی حضرت انسؓ نے پڑھائی اور اس کی کمر کے پاس کھڑے ہوئے- دوسری روایت میں (اس کے بیچ میں کھڑے ہوئے) کے الفاظ ہیں جب نماز ہو چکی تو علاء بن زیادؒ نے ان سے دریافت کیا- "یا ابا حمزہ! کیا نبی ﷺ مرد اور عورت کے جنازہ میں اسی طرح کھڑے ہوا کرتے تھے جس طرح آپ کھڑے ہوئے ہیں"؟ حضرت انسؓ نے جواب دیا "ہاں"- (۲) (ترمذی، احمد، ابن شیبہ، طحاوی)

---

(۱) جمہور ائمہ کا مسلک یہی ہے اور یہی مسلک حنفیہ کا بھی ہے- اہل حدیث علماء کے نزدیک نماز جنازہ کا سراً یا جہراً پڑھنا دونوں یکساں ہیں- ان کا استدلال ان احادیث سے ہے جن میں بعض صحابہؓ نے نبی ﷺ سے نماز جنازہ کی بعض دعائیں روایت کی ہیں، یعنی یہ کہ نبی ﷺ نے ان دعاؤں کو جہراً پڑھا تب ہی تو ان صحابہؓ نے ان دعاؤں کو سنا اور انہیں یاد رکھا- (نیل الاوطار ج ۴ ص ۶۹-۷۰) بعض شافعی علماء کے نزدیک نماز جنازہ کا رات کے وقت جہراً اور دن کے وقت سراً پڑھنا مستحب ہے- (الفتح الربانی ایضاً)

(۲) یہ امام احمدؒ، اسحاقؒ اور عام محدثین کا مسلک ہے- امام شافعیؒ سے اس بارے میں کوئی روایت نہیں ہے لیکن شافعی علماء کا عمل اسی کے مطابق ہے- ایک روایت میں امام ابو حنیفہؒ کا بھی یہی مسلک ہے اور اسی کو امام ابو یوسفؒ اور طحاویؒ نے اختیار کیا ہے لیکن مشہور روایت میں امام ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ میت خواہ مرد ہو یا عورت- امام اس کے سینے کے سامنے کھڑا ہو گا- حضرت سمرہؓ کی مذکورہ بالا روایت (بقیہ اگلے صفحہ پر)

۱۱- نماز جنازہ میں نمازیوں کی کثرت کا استحباب

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اگر کسی مسلمان کا انتقال ہو جائے اور اس پر مسلمانوں کی اتنی بڑی جماعت نماز پڑھے جس کی تعداد سو تک پہنچ جائے اور پھر وہ اس کے حق میں شفاعت کریں تو ان کی شفاعت قبول کی جاتی ہے" ﷺ (مسلم، احمد، نسائی، ترمذی)

دوسری روایات میں سے بعض میں یہ تعداد چالیس اور بعض میں "تین صفیں" بتائی گئی ہے (تین صفوں کی روایت آگے آ رہی ہے)- مختلف صحابہؓ کے سوالات کے جواب میں نبی ﷺ نے اس کے حسب حال یہ تعداد مختلف بتائی ہے، مقصود لوگوں کو نماز جنازہ میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہونے کی ترغیب دینا ہے۔ (قاضی عیاض وغیرہ)

(پچھلے صفحہ سے بقیہ) کا حکم حنفیہ کے نزدیک صرف عورت کے لئے نہیں ہے بلکہ عورت اور مرد دونوں کے لئے ہے اور اس میں وسط سے مراد کمر نہیں بلکہ سینہ ہے کیونکہ اگر جسم میں ٹانگوں کو شمار نہ کیا جائے تو وسط میں سینہ ہی آتا ہے اور اگر ٹانگوں کو بھی شمار کیا جائے تو بازؤں کو بھی شمار کرنا ضروری ہے اور اس صورت میں بھی سینہ وسط قرار پاتا ہے- رہی حضرت انسؓ کی حدیث، تو یہ حنفیہ کے نزدیک قابل حجت نہیں ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ پہلی حدیث سے متعارض ہے اور قابل حجت ماننے پر بھی وہ اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ نبی ﷺ مرد اور عورت دونوں کے وسط یعنی سینہ کے سامنے کھڑے ہوئے تھے- مرد کے موقع پر آپ ذرا سر کی طرف اور عورت کے موقع پر ذرا کمر کی طرف ہٹ گئے اور راوی کو یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی کہ آپ مرد کے سر کے سامنے اور عورت کی کمر کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں-

(الکوکب الدری ج ۱ ص ۳۱۵) (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۳۲۴)

امام مالکؒ کے نزدیک امام ہر جگہ کھڑا ہو سکتا ہے کیونکہ اوپر کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ متعین طور پر کسی ایک جگہ کھڑے نہ ہوا کرتے تھے- البتہ مرد کے وسط میں کھڑا ہونا بہتر ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس کی روایت ہے اور عورت کے مونڈھے کے سامنے کھڑا ہونا بہتر ہے کیونکہ اس کے اوپر کے حصے کی طرف کھڑا ہونا اس کی شان کے موافق ہے- (بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۱۸۶)

واضح رہے کہ ائمہ کے درمیان یہ سارا اختلاف صرف اولیٰ و غیر اولیٰ ہونے میں ہے- جائز و ناجائز یا ضروری و غیر ضروری ہونے میں نہیں ہے- تمام ائمہ کے نزدیک یہ جائز ہے کہ امام جہاں کھڑا ہونا چاہے ہو سکتا ہے- (نیل الاوطار وغیرہ)

۱۲- تین صفیں بنانے کا استحباب

نماز جنازہ کی جماعت میں مقتدیوں کا تین صفیں بنانا مستحب ہے:

حضرت مالک بن ہبیرہؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ "جس میت پر تین صفوں نے نماز پڑھی اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت واجب کر لی"۔(۱)

(احمد، ابو داؤد، ابن ماجہ، ترمذی)

۱۳- ایک سے زائد میتوں کی ایک ساتھ نماز جنازہ پڑھنا

جب کئی جنازے ایک ساتھ جمع ہوں تو ہر ایک کے لئے الگ الگ نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں بلکہ سب کے لئے ایک ہی نماز پڑھ لینا کافی ہے۔ اگر مردوں اور عورتوں کے جنازے ایک ساتھ جمع ہوں تو مردوں کے جنازے کو امام کے قریب رکھنا چاہئے اور عورتوں کے جنازے کو ان کے آگے قبلہ کی طرف اور اگر لڑکوں اور عورتوں کے جنازے جمع ہوں تو لڑکوں کے جنازے امام کے قریب اور عورتوں کے جنازے ان کے آگے قبلہ کی طرف رکھنے چاہئیں اور اگر مردوں، لڑکوں اور عورتوں کے جنازے ایک ساتھ جمع ہوں تو مردوں کے جنازے امام کے قریب لڑکوں کے جنازے ان سے آگے اور عورتوں کے جنازے ان کے آگے قبلہ کی طرف رکھنے چاہئیں۔

حضرت عثمانؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ مدینہ میں مردوں اور عورتوں کی نماز جنازہ (ایک ساتھ) پڑھا کرتے تھے۔ مردوں کو امام کے قریب کرتے اور عورتوں کو قبلہ کی طرف۔ (موطا امام مالکؒ)

عمارؓ مولیٰ حارث سے روایت ہے کہ ایک لڑکے اور عورت کا جنازہ آیا، تو لڑکا لوگوں کے قریب رکھا گیا اور عورت اس لڑکے سے پیچھے (یعنی قبلہ کی طرف آگے) رکھی گئی اور دونوں کی ایک ساتھ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ لوگوں میں حضرت ابو سعید خدریؓ، ابن عباسؓ اور ابو قتادہؓ

---

(۱) امام احمدؒ اور بخاریؒ کے نزدیک اگر تین صفیں نہ بن سکتی ہوں تو دو صفیں بھی بنائی جا سکتی ہیں کیونکہ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ "نبی ﷺ نے جب نجاشی کی نماز جنازہ پڑھی، تو میں دوسری یا تیسری صف میں تھا"۔ دوسری روایت میں ان کے الفاظ یوں ہیں کہ "ہم نے دو یا تین صفیں بنائی تھیں۔ (یعنی اب مجھے یاد نہیں رہا کہ ہم نے دو صفیں بنائی تھیں یا تین")(المغنی)(الفتح الباری ج ۳، ص ۴۲۹) دوسرے ائمہ کے نزدیک کم از کم تین صفیں بنانا مستحب ہے۔

تھے - میں نے ان حضرات سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ "یہ سنت ہے" -
(ابو داؤد، نسائی)

اس ساری تفصیل پر جمہور ائمہ (جن میں ائمہ اربعہ اور عام محدثین شامل ہیں) کا اتفاق ہے - (مجموعہ شرح المہذب ج ۵ ص ۲۶۶)

۱۴- مسبوق کا نماز جنازہ میں شریک ہونا

اگر کوئی شخص ایسے وقت میں آئے جبکہ نماز جنازہ شروع ہو چکی ہو تو اسے تکبیر کہہ کر نماز میں شریک ہو جانا چاہئے - جتنی تکبیریں اسے امام کے ساتھ مل جائیں انہیں پڑھ لے اور بقیہ تکبیروں کو امام کے سلام پھیرنے کے بعد پورا کر لے، اس لئے کہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے "وما فاتکم فاتموا" (جتنا حصہ تم سے رہ جائے اسے پورا کر لو) دوسری روایت میں "فاتموا" کے بجائے "فاقضوا" (قضا کر لو) کے الفاظ ہیں -

اس بارے میں ائمہ اربعہ اور دوسرے اکثر ائمہ کا اتفاق ہے - اختلاف اس بارے میں ہے کہ آیا ایسے شخص کی شروع کی نماز وہ ہو گی، جسے وہ امام کے ساتھ پائے گا یا وہ جسے وہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد خود پڑھے گا - (۱)

۱۵- قبر پر نماز جنازہ

جس شخص نے کسی میت کی نماز جنازہ نہ پڑھی ہو اس کے لئے بعد میں اس کی قبر پر نماز جنازہ پڑھ لینا جائز ہے خواہ دوسرے لوگوں نے اس کی نماز جنازہ پڑھی ہو یا نہ پڑھی ہو -

---

(۱) اس بارے میں امام شافعیؒ اور عام محدثین کا مسلک ہے کہ اس کی شروع کی نماز وہ ہو گی جسے وہ امام کے ساتھ پائے گا - چنانچہ وہ اپنی نماز سورہ فاتحہ سے شروع کرے گا - دوسرے ائمہ کے نزدیک اس کی شروع کی نماز وہ ہو گی جسے وہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد پڑھے گا - چنانچہ وہ اپنی نماز میں وہی پڑھے گا جو امام پڑھ رہا ہو مثلاً اس نے امام کو تیسری تکبیر کے بعد پایا ہے تو وہ بھی دعا پڑھے گا اور جب امام سلام پھیرے تو پہلے ثنا اور پھر درود کی قضا کرے گا (المغنی وغیرہ) یہ سارا اختلاف "فاتموا" اور "فاقضوا" کے درمیان فرق کرنے یا نہ کرنے کی وجہ سے ہے -

حنفی کے نزدیک بعد میں آنے والے کو امام کی تکبیر کا انتظار کرنا چاہئے تھا اور اسے اس وقت جماعت میں شریک ہونا چاہئے جب امام تکبیر کہے - ہاں چوتھی تکبیر کے بعد انتظار نہیں کرنا چاہئے بلکہ فوراً تکبیر کہہ کر شریک جماعت ہو جانا چاہئے - (شامی وغیرہ)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک سیاہ فام آدمی یا عورت (راوی کا شک) مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا (یا دیا کرتی تھی) اسے نبی ﷺ نے نہ پایا اور دریافت فرمایا "اس شخص کو کیا ہوا جو مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا؟" صحابہؓ نے عرض کیا "اس کا انتقال ہو گیا"۔ آپ ﷺ نے فرمایا "مجھے اس کی قبر بتاؤ" اس کے بعد حضور ﷺ اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور اس کی نماز جنازہ پڑھی"۔ (بخاری و مسلم، احمد، ابن ماجہ، بیہقی، حاکم، ابن حبان وغیرہ)۔ امام مسلم وغیرہ کی روایت میں بعد کے ایک راوی ثابت کہتے ہیں کہ "اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ میں نے یہ جملہ حضرت ابو ہریرہؓ سے اسی حدیث کے ساتھ سنا ہے یا کسی اور حدیث کے ساتھ کہ نبی ﷺ نے فرمایا "یہ قبریں اپنے رہنے والوں پر تاریکی سے بھری ہوئی تھیں اور اب اللہ تعالیٰ انہیں میری نماز کی وجہ سے روشن کر دے گا"۔

شعبیؒ (مشہور تابعی) کہتے ہیں کہ مجھ سے ایک ایسے شخص نے روایت بیان کی ہے جو نبی ﷺ کے ساتھ ایک افتادہ قبر کے پاس سے گزرے۔ نبی ﷺ نے صحابہؓ کی جماعت کرائی اور انہوں نے آپ کے پیچھے صفیں باندھیں"۔ شعبیؒ سے جب دریافت کیا گیا کہ آپ سے یہ روایت کس صحابی نے بیان کی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا "حضرت ابن عباسؓ"۔(۱)

---

(۱) یہ جمہور (جن میں امام شافعیؒ، اسحاق اور دوسرے محدثین شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ البتہ ان کے نزدیک قبر پر نماز ایک ماہ کے اندر اندر پڑھی جا سکتی ہے، بعد میں نہیں۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ "ہم نے سعید بن مسیبؒ سے یہی سنا ہے کہ نبی ﷺ نے زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کے اندر اندر حضرت سعد بن عبادہؓ کی قبر پر نماز پڑھی ہے"۔ (الفتح ج ۷، ص ۲۲۸) وغیرہ

امام ابو حنیفہؒ، سفیان ثوریؒ اور کوفہ کے دوسرے فقہاء کے نزدیک صرف اس شخص کی قبر پر نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے جس کی نماز جنازہ پڑھی ہی نہ گئی ہو اور وہ بھی تین دن تک یعنی جب تک نعش کے پھٹ جانے کا گمان نہ ہو۔ امام مالکؒ کی ایک روایت میں قبر پر نماز جنازہ جائز نہیں ہے اور دوسری روایت میں ایسے شخص کی قبر پر نماز پڑھی جا سکتی ہے جس کی نماز جنازہ پڑھی نہ گئی ہو۔ اوپر کی احادیث کا جواب حنفیہ اور مالکیہ یہ دیتے ہیں کہ ان میں نبی ﷺ کا عمل بیان ہوا ہے جو آپ ﷺ ہی کے ساتھ مخصوص تھا، اس لئے کہ آپ کو اس کا حکم ملا تھا اور اسی لئے آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ "یہ قبریں اپنے رہنے والوں پر تاریکی سے بھری ہوئی تھیں اور اب اللہ تعالیٰ انہیں میری نماز کی وجہ سے روشن کر دے گا"۔ یہ چیز چونکہ نبی ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے کی نماز میں نہیں پائی جا سکتی" اس لئے دوسروں کے لئے قبر پر نماز جنازہ پڑھنا صحیح نہیں ہے۔ علاوہ ازیں حنفیہ کا استدلال یہ بھی ہے کہ جن روایات میں قبر پر نماز پڑھنے کا ذکر آیا ہے وہ سب اخبار احاد ہیں حالانکہ اگر قبر پر نبی ﷺ نے واقعی نماز پڑھی ہوتی تو اس کی روایات عام ہونی چاہئے تھیں"۔ امام مالکؒ کا استدلال یہ ہے کہ ہم نے مدینہ کے کسی صحابی یا تابعی کے متعلق یہ نہیں سنا کہ انہوں نے قبر پر نماز جنازہ پڑھی ہو"۔ (الکوکب الدری ج ۱، ص ۳۱۶) (الفتح الربانی ایضاً، بدایۃ المجتہد) وغیرہ

(مسلم، بخاری، ترمذی، بیہقی، احمد وغیرہ)

۱۶- نمازِ غائبانہ

کسی میت کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا صحیح ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جس روز (حبشہ کے مسلمان بادشاہ) نجاشیؒ کا (حبشہ میں) انتقال ہوا' اسی روز نبی ﷺ نے ہمیں (مدینہ میں) ان کے انتقال کی خبر دی۔ آپؐ صحابہؓ کو لے کر مصلی (عید گاہ پر جنازہ گاہ) کی طرف نکلے۔ صحابہؓ نے آپؐ کے پیچھے صفیں بنائیں اور آپؐ نے (نماز پڑھاتے ہوئے) چار تکبیریں کہیں"۔ (بخاری، مسلم، احمد، بیہقی، مسند، امام شافعی، موطا امام مالکؒ، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ وغیرہ)

نمازِ غائبانہ اسی طرح پڑھی جائے گی جس طرح سامنے رکھے ہوئے جنازہ کی نماز پڑھی جاتی ہے۔

حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "آج تمہارے بھائی نجاشیؒ کا انتقال ہو گیا، تم کھڑے ہو کر ان کی نماز جنازہ پڑھو، چنانچہ ہم کھڑے ہوئے اور ہم نے صفیں بنائیں جیسا کہ ہم میت پر صفیں بناتے ہیں، اور ہم نے ان کی نماز جنازہ پڑھی جیسا کہ میت پر نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے"۔ (۱) (ترمذی، احمد، نسائی)

---

(۱) یہ امام شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ، ابن حزمؒ اور عام محدثین کا مسلک ہے۔ امام ابن حزمؒ یہاں تک لکھتے ہیں کہ "کسی بھی صحابی کے متعلق یہ روایت نہیں ہے کہ وہ نماز غائبانہ سے منع کرتے ہوں"۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک نماز غائبانہ جائز نہیں ہے کیونکہ نماز جنازہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ میت سامنے موجود ہو، حنفیہ اور مالکیہ اوپر کی احادیث کے مندرجہ ذیل جوابات دیتے ہیں:

۱- نجاشیؒ کا انتقال ایسی جگہ میں ہوا تھا جہاں ان کی نماز جنازہ کسی نے نہیں پڑھی، اسی لئے نبی ﷺ نے ان کی نماز غائبانہ پڑھی۔ امام خطابیؒ اور بعض دوسرے شافعی علماء بھی اس دلیل کے قائل ہیں اور اسی لئے امام ابوداؤدؒ نے نماز غائبانہ کے لئے جو باب باندھا ہے اس کا نام انہوں نے باب الصلاة علی المسلم یلیه اهل الشرک (ایسے مسلمان کی نماز جنازہ پڑھنے کا باب جس کے پاس رہنے والے سب مشرک ہوں) لیکن دوسرے شافعی، حنبلی اور اہل حدیث علماء اس کو محض احتمال مانتے ہیں۔

۲- نبی ﷺ نے نجاشیؒ کی جو نماز جنازہ پڑھائی وہ غائبانہ تھی ہی نہیں کیونکہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "نجاشی کا پلنگ نبی ﷺ کے سامنے لا کر رکھ دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ آپ اسے دیکھ رہے تھے اور اسی طرح آپ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی"۔ اس کا اگرچہ احتمال ہی ہے لیکن حضرت عمران بن حصین کی (مذکورہ بالا) روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ (اگلے صفحے پر)

۱۷- شہید کی نمازِ جنازہ

جو شخص میدانِ جنگ میں کفار سے لڑتا ہوا شہید ہو جائے اس کی نمازِ جنازہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ اسے نمازِ جنازہ پڑھے بغیر دفن کیا جائے گا۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے شہدائے احد کے متعلق حکم دیا تھا کہ "انہیں غسل نہ دو، اس لئے کہ قیامت کے روز ان کے ہر زخم یا ان کے خون (راوی کا شک) سے مسک کی خوشبو آئے گی"۔ اور آپ ﷺ نے ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی"۔
(بخاری، احمد، ابو داوٗد، ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ شہدائے احد کو غسل نہیں دیا گیا بلکہ انہیں ان کے خون آلود کپڑوں ہی میں دفن کر دیا گیا اور نہ ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی (۱)"۔
(احمد، ابو داوٗد، ترمذی)

(پچھلے صفحہ سے بقیہ) دوسروں کے نزدیک حضرت ابن عباسؓ سے منسوب یہ روایت معتبر نہیں ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ اسے صرف ایک مصنف واحدی نے کسی سند کے بغیر نقل کیا ہے اور حضرت عمرانؓ کی حدیث سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے نجاشی کی نماز اس طرح پڑھائی، جیسے ان کا جنازہ سامنے پڑا ہو۔

۳- نبی ﷺ نے نجاشیؓ کے علاوہ کسی اور کی نماز غائبانہ نہیں پڑھائی۔ اس لئے اس کا حکم عام نہیں ہے۔ اس دلیل کا جواب حافظ ابن حجرؒ یہ دیتے ہیں کہ اس بارے میں بعض اور واقعات بھی ثابت ہیں، اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے۔ (فتح القدیر شرح ہدایہ ج ۱ ص ۲۸۹) (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۱۵۰) (فتح الباری ج ۳) (الکوکب الدری ج ۱ ص ۳۱۶) وغیرہ اس بارے میں امام خطابی اور امام ابن تیمیہؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ صرف اس شخص کی نمازِ غائبانہ پڑھی جا سکتی ہے جس کا انتقال ایسی جگہ ہوا ہو جہاں پر کسی مسلمان نے اس کی نماز جنازہ نہ پڑھی ہو
(معالم السنن بحوالہ احکام الجنائز للالبانی ص ۹۲ 'زاد المعاد ج ۱ ص ۵۲۰)

(۱) یہ امام مالکؒ، شافعیؒ، اسحاقؒ، داوٗد ظاہریؒ اور بعض دوسرے ائمہ کا مسلک ہے۔ امام ابو حنیفہؒ، سفیان ثوریؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک ہر میت کی طرح شہید کی نماز جنازہ پڑھنا بھی ضروری ہے۔ ان کا استدلال بعض ایسی احادیث سے ہے جن میں یہ ذکر ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے چچا حضرت حمزہؓ اور احد کے دوسرے شہداء کی نماز جنازہ پڑھی ہے مثلاً:

ابو مالک غفاریؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے شہدائے احد کی دس دس کر کے نماز جنازہ پڑھی اور ہر مرتبہ کے دس شہداء میں حضرت حمزہؓ بھی ہوتے تھے، یہاں تک کہ حضور ﷺ نے ان کی ستر مرتبہ نماز جنازہ پڑھی۔ (مراسیل ابو داوٗد)

حضرت شداد بن ہادؓ سے روایت ہے کہ ایک بدوی نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ پھر وہ جنگ میں شہید ہو گیا۔ نبی ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی"۔ (نسائی) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

۱۸- حد میں مارے جانے والے کی نماز جنازہ

اگر کوئی شخص کسی جرم کا ارتکاب کرے اور اس پر حد جاری کی جائے اور وہ اس میں مارا جائے تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ (احد کی طرف) تشریف لے گئے۔ فصلی علی قتلی احد صلاتہ علی المیت (آپ نے شہدائے احد پر اس طرح نماز پڑھی جس طرح میت پر آپ نماز جنازہ پڑھتے تھے۔ (بخاری و مسلم) (عمدۃ القاری شرح عینی للبخاری وغیرہ)

اختلاف کی وجہ: جن احادیث سے حنفیہ استدلال کرتے ہیں۔ پہلے مسلک والوں کے نزدیک ان میں سے ابو مالکؓ کی روایت مرسل جس میں صحابی کا ذکر نہیں۔ اب وہ حضرت شدادؓ کی روایت سند کے لحاظ سے ضعیف ہے۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت سند کے اعتبار سے صحیح ہے لیکن اس کے متعلق ان کا کہنا یہ ہے کہ اس میں فصلی علی قتلی احد صلاتہ علی المیت سے مراد یہ ہے کہ نبی ﷺ نے شہداء احد کے لئے دعا فرمائی جیسا کہ آپ نماز جنازہ میں میت کے لئے دعا فرمایا کرتے تھے۔ اس تاویل کو وہ اس لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ واقعہ غزوہ احد کے آٹھ سال بعد کا ہے جیسا کہ بخاری ہی کی دوسری روایت میں ہے "فصلی علیہم بعد ثمان سنین کا الوداع الاحیاء والاموات" اگر اس میں 'صلاۃ' سے مراد نماز جنازہ ہوتی تو نبی ﷺ اسے آٹھ سال تک ملتوی نہ فرماتے۔ ان کا مزید کہنا یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک قبر پر نماز پڑھنا تین دن کے بعد جائز ہی نہیں ہے۔ اس لئے حنفیہ کے لئے اس سے شہید کی نماز جنازہ پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ (الفتح الربانی ج ۷' ص ۱۶۱)

دوسری طرف جن احادیث سے پہلے مسلک والے استدلال کرتے ہیں ان کے متعلق حنفیہ کا کہنا یہ ہے کہ ان میں شہدائے احد پر نماز جنازہ پڑھنے کی نفی کی گئی ہے۔ دوسری احادیث میں چونکہ ان پر نماز جنازہ پڑھنے کا ذکر ہے، اس لئے اثبات کی موجودگی میں نفی کو قبول نہیں کیا جائے گا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ نبی ﷺ نے نماز پڑھی ہو اور راوی کو اس کا علم نہ ہو سکا ہو۔ حضرت جابرؓ کے والد جنگ میں شہید ہو گئے تھے اور ان پر غم واندوہ کی سخت کیفیت طاری تھی اس لئے ہو سکتا ہے کہ انہیں نبی ﷺ کے نماز پڑھنے کا علم ہوا ہی نہ ہو"۔ (الکوکب الدری ج ۱' ص ۳۱۶) وغیرہ

اس بارے میں امام ابن حزمؒ اور مشہور روایت میں امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ شہید کی نماز جنازہ نہ ضروری ہے۔ اور نہ ناجائز، بلکہ اس کا پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور نہ پڑھنا بھی۔ کیونکہ بعض دوسری روایات سے، جن کی سند قابل حجت ہے۔ یہ پتہ چلتا ہے کہ نبی ﷺ نے شہید کی نماز جنازہ پڑھی ہے۔ مثلاً ابو سلام صحابہ کرامؓ میں سے کسی ایک سے روایت کرتے ہیں کہ ہم نے قبیلہ جہینہ کی ایک بستی پر حملہ کیا۔ لیکن وہ شخص پہلو بچا گیا اور خود وہ مسلمان اپنی تلوار سے مارا گیا۔ نبی ﷺ (مدینہ منورہ میں) مسلمانوں کو بتایا۔ "اے مسلمانو! تمہارا بھائی زخمی ہو گیا" مسلمان جلدی سے وہاں پہنچے، لیکن جب تک وہ وہاں پہنچے، وہ شخص انتقال کر چکا تھا۔ نبی ﷺ نے اس کے پہنے ہوئے کپڑوں میں اسے لپیٹا، اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور اسے (اگلے صفحہ پر)

حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ قبیلہ جہینہ کی ایک عورت نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اعتراف کیا کہ میں نے زنا کا ارتکاب کیا ہے اور اس وقت حمل سے ہوں"۔ نبی ﷺ نے اس کے سرپرست کو بلایا اور اس سے فرمایا "اس کا خیال رکھو، جب اس کا وضع حمل ہو جائے تو مجھے اطلاع دو" اس شخص نے ایسا ہی کیا۔ نبی ﷺ نے حکم دیا کہ اس کے کپڑے اچھی طرح لپیٹ دیئے جائیں۔ پھر آپؐ نے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اسے سنگسار کیا گیا۔ پھر آپؐ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ نے اسے سنگسار فرمایا" پھر بھی آپؐ اس کی نماز جنازہ پڑھتے ہیں؟" آپؐ نے فرمایا "اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر مدینہ کے ستر لوگوں پر بھی بانٹ دی جائے تو ان کے لئے کافی ہو جائے۔ اس سے بہتر اور کیا چیز ہو سکتی تھی کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے لئے اپنی جان قربان کر دی؟(۱) (مسلم، احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بیہقی)

دفن کیا۔ لوگوں نے سوال کیا "یارسول اللہ ﷺ! یہ شخص شہید ہے؟"

فرمایا "ہاں، اور میں اس کے شہید ہونے پر گواہ ہوں"۔ (ابو داؤد)

امام ابن قیم، قاضی شوکانی اور دوسرے اہل حدیث علماء نے اسی مسلک کو ترجیح دی ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۲، ص ۱۴۸) (نیل الاوطار ج ۴، ص ۴۸) (المغنی ج ۳، ص ۴۳۴) (تهذیب ابن قیم علی معالم السنن ج ۴، ص ۲۹۵)

واضح رہے کہ یہ سارا اختلاف صرف اس شہید کے بارے میں ہے جو میدان جنگ میں لڑتا ہوا مارا جائے لیکن اگر کوئی شخص میدان جنگ میں زخمی تو ہو جائے لیکن زندہ رہے اور بعد میں اس کا انتقال ہو تو اس کا امام مالکؒ، شافعیؒ اور احمدؒ وغیرہ کے نزدیک بھی غسل بھی دیا جائے گا اور اس کی نماز جنازہ بھی پڑھائی جائے گی۔ اختلاف صرف اس بارے میں ہے کہ کتنی دیر زندہ رہے تو نماز نہیں پڑھائی جائے گی۔ امام مالکؒ اور احمدؒ کے نزدیک اگر وہ کھائے پئے اور وہ تین دن تک زندہ رہے تو اس کی نماز پڑھائی جائے گی ورنہ نہیں۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اگر وہ میدان جنگ سے زندہ آگیا تو اس کی نماز جنازہ پڑھائی جائے گی خواہ تھوڑی مدت زندہ رہے یا زیادہ مدت (مختصر از المغنی ج ۳، ص ۴۰۳)

(۱) امام زہریؒ اور امام مالکؒ کے علاوہ دوسرے تمام ائمہ کا یہی مسلک ہے۔ امام زہریؒ کے نزدیک جس شخص کو سنگسار کیا جائے اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔ امام مالکؒ کے نزدیک اس کی نماز جنازہ دوسرے تمام لوگ پڑھیں گے۔ لیکن حنفیہ نہیں پڑھیں گے۔ ان کا استدلال حضرت جابرؓ کی ایک دوسری روایت سے ہے جس میں وہ ماعز اسلمی کے سنگسار کئے جانے کا واقعہ بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ (بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) وغیرہ (اگلے صفحے پر)

۱۹- فاسق وبدکار کی نماز جنازہ

ہر کلمہ گو مسلمان کی، خواہ وہ فاسق وبدکار ہو، نماز جنازہ پڑھنا صحیح ہے، کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے "ہر لا الٰہ الا اللہ" کہنے والے کی نماز جنازہ پڑھو"-(۱)

دوسرے ائمہ اس روایت کی بخاری ہی کی ایک دوسری روایات سے تطبیق دیتے ہیں جس میں ہے کہ نبی ﷺ نے ان کی نماز جنازہ پڑھی اور وہ اس طرح کہ نبی ﷺ نے پہلے روز تو ماعز کی نماز جنازہ نہیں پڑھی لیکن اگلے روز آپ ان کی قبر پر گئے اور وہاں نماز پڑھی، جیسا کہ حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سے لوگوں سے دریافت کیا کہ "آپ ان کی (یعنی ماعز کی) نماز جنازہ پڑھیں گے؟" آپؐ نے فرمایا "نہیں" اگلے روز آپؐ نے فرمایا "اپنے آدمی (ماعز) کی نماز جنازہ پڑھو"- چنانچہ اس کے بعد حضور ﷺ صحابہؓ کو لے کر ان کی قبر پر تشریف لائے اور وہاں ان کی نماز جنازہ پڑھی- (مسند امام عبدالرزاق بحوالہ فتح الباری) (الفتح الربانی ج ۷، ص ۷ ۲۱) (بذل المجہود ج ۴، ص ۷ ۲۰) وغیرہ

(۱) اس پر جمہور ائمہ (جن میں امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ اور ابن حزمؒ شامل ہیں) کا اتفاق ہے- صرف بعض تفصیلات میں اختلاف ہے-

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک باغی اور محارب کی نماز پڑھی جائے گی- امام شافعی کے نزدیک رہزن اور ڈاکو کی نماز نہیں پڑھی جائے گی- امام مالکؒ کے نزدیک بدعتی کی نماز پڑھنا مکروہ ہے اگرچہ جائز ہے- امام ابن حزمؒ کے نزدیک کسی کی بھی نماز جنازہ چھوڑنا صحیح نہیں ہے بلکہ وہ لکھتے ہیں- "گناہگار آدمی تو دعا کا سب سے زیادہ حقدار ہے"- (بذل المجہود ج ۴، ص ۲۰۴) (ہدایۃ المجتہد ج ۱، ص ۱۸۹)

امام احمدؒ کے نزدیک فاسق وبدکار مسلمان کی نماز پڑھنی چاہئے لیکن اہل علم اور مقتداء لوگوں کو اس کی نماز نہیں پڑھنی چاہئے تاکہ لوگوں کو عبرت ہو- ان کا استدلال حضرت زید بن خالد جہنیؓ کی اس روایت سے ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک شخص خیبر میں مارا گیا- اس کی خبر جب رسول اللہ ﷺ کو دی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا "تم لوگ اس کی نماز جنازہ پڑھ لو (میں نہیں پڑھوں گا)" آپ ﷺ کے اس فرمانے سے لوگوں کے چہرے متغیر ہو گئے جب آپ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ "اس شخص نے اللہ کی راہ میں چوری کی ہے (یعنی مال غنیمت میں سے چوری کی ہے"- (ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ) اور حضرت جابر بن سمرہؓ کی اس حدیث سے بھی کہ ایک شخص نے تیر کے پھل سے خودکشی کر لی تو رسول اللہ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی)"- (مسلم)

جمہور ائمہ ان دونوں حدیثوں کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے نبی ﷺ نے چور اور خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ نہیں پڑھی، لیکن صحابہ نے پڑھی- اب جس شخص پر صحابہ کرام نماز پڑھ سکتے ہیں، اس پر دوسرے (بعد کے) لوگوں کو بھی نماز پڑھنی چاہئے- اہل حدیث علماء میں سے مولانا عبدالرحمن مبارکپوریؒ نے امام احمدؒ وغیرہ کے مسلک ہی کو ترجیح دی ہے- (کتاب الجنائز ص ۶۹-۷۰)

۲۰- سقط (اسقاط ہو جانے والے بچے) کی نماز جنازہ

سقط سے مراد وہ بچہ (لڑکا یا لڑکی) ہے جس کا شکم مادر میں اپنی طبعی مدت گزرنے سے پہلے اسقاط ہو جائے، اگر اسقاط کے وقت اس میں زندگی کے آثار پائے جائیں جیسے چھینکنا یا رونا یا حرکت کرنا اور بعد میں اس کا انتقال ہو جائے، تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "بچے پر نہ نماز پڑھی جائے گی اور نہ وہ میراث پائے گا اور نہ کوئی دوسرا اس کا وارث قرار پائے گا جب تک کہ وہ آواز دے" (یعنی اس میں زندگی کے آثار نہ پائے جائیں) (۱)

(ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم)

---

(۱) یہ امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ، اوزاعیؒ اور دوسرے اکثر ائمہ کا مسلک ہے اور اسی کو اہل حدیث علماء میں سے قاضی شوکانیؒ نے اختیار کیا۔ امام احمدؒ، اسحاقؒ اور داؤدؒ ظاہریؒ کے نزدیک اگر بچہ شکم مادر میں چار ماہ گزار چکا ہو تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ خواہ اسقاط کے وقت اس میں زندگی کے آثار پائے جائیں یا نہ پائے جائیں۔ مذکورہ بالا حدیث کی سند میں کلام ہونے کی وجہ سے ان کا استدلال اس سے نہیں ہے بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اس عام حدیث سے ہے جس میں نبی ﷺ نے بیان فرمایا ہے کہ انسان جب چار ماہ تک شکم مادر میں رہ لیتا ہے تو اس میں روح ڈالی جاتی ہے۔ (بخاری و مسلم)

(مختصر الفتح الربانی ج ۷ ص ۲۱۱) (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۱۴۵) (الکوکب الدری ج ۱ ص ۳۱۵)

تدفین

۱- حکم

اگر ممکن ہو تو مسلمان میت کا دفن کرنا تمام ائمہ کے نزدیک فرض کفایہ ہے۔
"اگر ممکن ہو" سے مراد ہے کہ میت خشکی پر ہو یا سمندر پر ہو لیکن وہاں سے میت کے خراب ہونے سے پہلے پہلے خشکی پر جلد پہنچنا ممکن ہو۔ اگر سمندر پر اتنی دور ہو کہ وہاں سے خشکی پر میت کے خراب ہونے سے پہلے پہنچنا ممکن نہ ہو تو اس کی نمازِ جنازہ پڑھ کر اور اسے کسی بھاری چیز سے باندھ کر سمندر میں ڈال دینا ضروری ہے۔ (ردّ المختار ج ص ۵۹۸-۵۹۹) وغیرہ

۲- وقت

میت کو دفن کرنے کا کوئی متعین وقت نہیں ہے، البتہ تین اوقات میں میت کو عمداً دفن کرنا مکروہ ہے اور یہ تین اوقات ہیں: (۱) جب کہ سورج نکل رہا ہو یہاں تک کہ وہ نکل آئے۔ (۲) جب وہ نصف النہار پر ہو یہاں تک کہ اس میں زوال ہو جائے اور (۳) جب وہ غروب ہونے کے لئے جھکے، یہاں تک کہ غروب ہو جائے۔ ان تین اوقات کا حضرت عقبہ بن عامر کی حدیث (ص ۸۴) میں ذکر ہو چکا ہے۔(۱)

---

(۱) یہ امام احمدؒ کے سوا دوسرے ائمہ کا مسلک ہے۔ امام ائمہ کے نزدیک ان اوقات میں میت کو دفن کرنا مطلقاً مکروہ ہے۔ (الفتح الربانی ج ۸، ص ۷۰) وغیرہ
قاضی شوکانیؒ نے امام احمدؒ ہی کے مسلک کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ عمداً کی شرط حدیث میں نہیں ہے۔ (نیل الاوطار)
یہ اختلاف صرف اس وقت ہے جبکہ نعش کے خراب ہونے کا اندیشہ نہ ہو، اور اگر اس کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو تمام ائمہ کے نزدیک اس کو ان اوقات میں بھی دفن کرنا صحیح ہے۔

۳- قبر کی گہرائی، لمبائی اور چوڑائی

قبر بنانے کا مقصد میت کو مٹی کے نیچے دفن کرنا ہے تاکہ ایک تو اس کے سڑنے سے بو نہ پھیلے اور دوسرے اس کی نعش درندوں وغیرہ سے محفوظ رہے اگرچہ مٹی کے نیچے دفن کر دینے سے ہی قبر کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے لیکن قبر کا گہرا اور کشادہ ہونا مستحب ہے۔ نبی ﷺ نے اس کی تاکید فرمائی ہے۔

ایک انصاری صحابی کہتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک جنازے میں گئے اور میں اپنے والد کے ساتھ لڑکا ہی تھا' میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ قبر کھودنے والے کو فرما رہے تھے کہ پیر کی طرف سے کشادہ کرو، سر کی طرف سے کشادہ کرو"۔

(ابوداؤد، نسائی، بیہقی)

لیکن حدیث میں اس کی تصریح نہیں آئی کہ قبر کو کتنا کشادہ ہونا چاہئے' ائمہ کی آراء اس بارے میں مختلف ہیں۔ (۱)

۴- قبر کی دو قسمیں اور ان میں سے افضل

قبر کی دو قسمیں ہیں:

ایک لحد (بغلی یا میانی) جس میں میت کے رکھنے کی جگہ قبلہ کی دیوار میں زمین سے ملا کر کھودی جاتی ہے۔

دوسری شق (صندوقی) جس میں میت کے رکھنے کی جگہ بیچ میں بنائی جاتی ہے۔

اس پر اجماع ہے کہ لحد اور شق دونوں قسم کی قبر بنانا صحیح ہے۔ البتہ لحد بنانا افضل (اولیٰ) ہے (۲) (نیل الاوطار ج ۴' ص ۸۵) (بذل المجہود ج ۴' ص ۲۰۹)

---

(۱) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے نزدیک قبر کا ناف تک، امام احمدؒ کے نزدیک سینے تک اور امام شافعیؒ کے نزدیک پورے قد تک گہرا ہونا مستحب ہے۔ صحابہؓ میں سے حضرت عمرؓ سے بھی ایک روایت میں قبر کا پورے قد گہرا ہونا مستحب ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک اس کی کوئی حد نہیں۔

(نیل الاوطار ج ۴' ص ۸۴) (المغنی ج ۳' ص ۲۰۳)

حنفیہ کے نزدیک قبر کا طول بقدر طول میت کے اور عرض بقدر نصف طول کے ہونا چاہئے۔ گہرائی کم از کم نصف قد کے برابر ہونی چاہئے۔ اس سے زیادہ سینے تک یا پورے قد تک ہو تو بہتر ہے۔ (ردالمحتار ج ۱' ص ۵۹۹)

(۲) مالکیہ اور شافعیہ کے نزدیک جہاں زمین نرم ہو وہاں شق کا بنانا لحد سے افضل ہے۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے اپنے مرض الموت میں وصیت فرمائی کہ میرے لئے لحد بنانا اور اس پر کچی اینٹیں نصب کرنا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر بنائی گئی تھی۔

(مسلم، احمد، نسائی، ابن ماجہ)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ مدینہ میں دو شخص قبر کھودنے والے تھے۔ایک لحد کھودتا تھا اور دوسرا شق۔جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا، تو صحابہؓ نے دونوں کے پاس آدمی بھیجا کہ جو پہلے آجائے گا، وہی آپ کے لئے قبر کھودے گا، لحد بنانے والا پہلے آیا۔لہذا آپ کی قبر لحد بنائی گئی۔(احمد، ابن ماجہ، ابن ابی شیبہ)

۵۔ میت کو قبر میں اتارنے کی سمت:

میت کو قبر میں اتارنے کی دو شکلیں ہیں:

(۱) قبر کے پائتانہ کی طرف سے داخل کرنا۔

(۲) قبلہ کی طرف سے داخل کرنا

یہ دونوں صورتیں تمام ائمہ کے نزدیک صحیح ہیں، کیونکہ نبی ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے دونوں عمل کرنے کی روایات ملتی ہیں۔البتہ اکثر ائمہ امام شافعیؒ، احمدؒ اور عام محدثین کے نزدیک پہلی صورت افضل ہے کیونکہ۔

حضرت عبداللہ بن یزیدؓ نے ایک میت کو قبر کے پائتانہ کی طرف سے داخل کیا اور فرمایا کہ "یہ سنت ہے"۔ (ابوداؤد، بیہقی)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کو سر کے بل (یعنی قبر کے پائتانے کی طرف سے) قبر میں اتارا گیا(۱)۔ (مسند امام شافعیؒ)

۶۔ میت کو قبر میں لٹانے کا طریقہ

تمام ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ میت کو قبر میں دائیں کروٹ پر لٹا کر اس کا چہرہ قبلہ کی

---

(۱) امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے اصحاب کے نزدیک دوسری صورت افضل ہے کیونکہ قبلہ کی سمت لائق تعظیم ہے۔نیز حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ رات کو ایک قبر میں داخل ہوئے اور آپ کے لئے چراغ جلایا گیا۔آپ نے میت کو قبلہ کی طرف سے لیا۔(ترمذی)

حضرت علیؓ نے یزید بن مکفف کو قبلہ کی طرف سے قبر میں اتارا۔(ابن ابی شیبہ)

امام مالکؒ کے نزدیک دونوں صورتیں یکساں ہیں۔(الفتح الربانی ج ۸ ص ۵۹) (بذل المجہود ج ۴ ص ۲۰۹)

طرف کرنا مستحب ہے- کیونکہ نبی ﷺ کا چہرہ مبارک بھی اسی طرح قبلہ کی طرف رکھا گیا تھا- (الفتح الربانی ج ۸' ص ۶۵)

۷- میت کو قبر میں لٹاتے وقت دعا

میت کو قبر میں لٹاتے وقت دعا کرنا تمام ائمہ کے نزدیک مستحب ہے- (الفتح الربانی ج ۸' ص ۶۴)

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جب میت کو قبر میں رکھو (اتارو یا لٹاؤ) تو یہ دعا کرو:

بِسْمِ اللّٰهِ وَ عَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ- اللہ کے نام کے ساتھ اور اللہ کے رسول ﷺ کی ملت پر (احمد، ابوداؤد، ترمذی)

(۲) عاصم بن ضمرہؒ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ سوتے وقت اور کسی میت کو قبر میں داخل کرتے وقت یہ دعا پڑھا کرتے تھے-

بِسْمِ اللّٰهِ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ عَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ اللہ کے نام سے اور اللہ کی راہ میں اور اللہ کے رسول کی ملت پر (ابن ابی شیبہ)

۸- میت کو قبر میں اتارتے اور لٹاتے وقت احتیاط

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "مردہ مومن کی ہڈی توڑنا ایسا ہے جیسا زندہ کی ہڈی توڑنا"- (ابوداؤد، احمد، ابن ماجہ، بیہقی)

فائدہ: امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ، احمد ابن حنبلؒ کے نزدیک عورت کو قبر میں اتارتے وقت قبر پر پردہ کرنا مستحب ہے-

امام شافعیؒ کے نزدیک مرد کو قبر میں اتارتے وقت بھی پردہ کرنا مستحب ہے- (الفتح الربانی ج ۸' ص ۶۵)

اس بارے میں بعض احادیث بھی آئی ہیں اگرچہ وہ سند کے لحاظ سے ضعیف ہیں- بعض صحابہؓ کا اس پر عمل کرنا ثابت ہے- (دیکھئے سبل السلام ج ۲' ص ۱۴۴)

۹- میت کے کفن کی گرہیں کھولنا

قبر میں لٹانے کے بعد سر اور پاؤں کی طرف سے میت کے کفن کی گرہیں کو

مستحب ہے۔

نبی ﷺ نے جب نعیم بن مسعود اشجعیؓ کو قبر میں اتارا، تو آپ ﷺ نے اپنے دہن مبارک سے ان کے کفن کی گرہیں کھولیں۔ (المغنی ج ۲، ص ۳۸۳)

حضرت سمرہؓ بن جندب کا لڑکا فوت ہو گیا تو انہوں نے اپنے غلام کو حکم دیا کہ اسے لے جا کر دفن کرو اور جب اس کو رکھو تو بسم اللہ و علی سنۃ رسول اللہ کہو اور پھر اس کے سر اور پیر کی گرہیں کھول دو"۔ (طحاوی فی شرح معانی الآثار ج ۱، ص ۲۹۲)

۱۰۔ لحد کو بند کرنے کے لئے کچی اینٹیں استعمال کرنا

لحد کو بند کرنے کے لئے کچی اینٹیں استعمال کرنی چاہئیں کیونکہ نبی ﷺ کی قبر میں بھی کچی اینٹیں استعمال کی گئی تھیں جن کی تعداد نو تھی۔ (نووی)

(تمام) ائمہ نے قبر میں پختہ اینٹوں اور لکڑی کے استعمال کو مکروہ قرار دیا ہے۔ (ہدایہ ج ۱، ص ۶۶) (المغنی ج ۲، ص ۳۸۴)

۱۱۔ قبر میں مٹی ڈالنا

لحد بند ہو جانے کے بعد تمام لوگوں کا دونوں ہاتھوں سے قبر میں تین بار مٹی ڈالنا مستحب ہے۔

حضرت عامر بن ربیعہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے عثمان بن مظعونؓ کے جنازہ کی نماز پڑھی۔ پر ان کی قبر پر آئے اور کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں سے تین بار مٹی ڈالی (بزار، دار قطنی، بیہقی)۔ بزار کی روایت میں "سرہانے کی طرف کھڑے ہو کر مٹی ڈالی" کے الفاظ ہیں۔

فائدہ: حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک قبر میں مٹی ڈالتے وقت پہلی بار "مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ" دوسری بار "وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ" اور تیسری بار "وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ" کہنا مستحب ہے۔ ان کا استدلال حضرت ابو امامہؓ کی اس روایت سے ہے کہ نبی ﷺ کی صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ کو قبر میں اتارا گیا، تو نبی ﷺ نے فرمایا "مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ ---" (احمد، بیہقی، حاکم) (الفتح الربانی ج ۸، ص ۲۴) (رد المحتار ج ۱، ص ۶۰۰) امام احمدؒ اور دوسرے ائمہ کے نزدیک اس

موقع پر اس آیت کا پڑھنا مستحب نہیں ہے کیونکہ ان کے نزدیک مذکورہ حدیث کی سند ضعیف ہے۔(المغنی)

۱۲- قبر کی بلندی اور شکل

(ا) اس بارے میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ قبر کو زمین سے نہ بہت اونچا ہونا چاہئے اور نہ زمین سے بالکل ملا ہوا، بلکہ ایک بالشت کے برابر اونچا ہونا چاہئے زیادہ اونچی قبر کو نبی ﷺ نے ناپسند فرمایا ہے۔

حضرت علیؓ نے حیانؒ (ایک تابعی) سے فرمایا" میں تمہیں ایک ایسی مہم پر بھیج رہا ہوں جس پر نبی ﷺ نے مجھے روانہ فرمایا تھا؟ یہ کہ ہر قبر کو ہموار کردوں اور ہر مجسمہ کا نشان مٹادوں ؟" (مسلم، احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

اس اور بعض دوسری احادیث میں قبر کو ہموار کر دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کو بالکل زمین کے برابر رکھا جائے بلکہ یہ ہے کہ اس کو ایک بالشت کے برابر اونچا رکھا جائے اس سے زیادہ نہیں، کیونکہ :

جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ہمیں قبر پکی بنانے 'قبر پر پکی اینٹوں سے کچھ تعمیر کرنے اور قبروں پر (مستقل مجاور بن کر یا حصول برکت کے لئے وقتی طور پر) بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔(صحیح مسلم)

(ب) اس بارے میں بھی ائمہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قبر کی شکل ہموار (مسطح) بھی ہو سکتی ہے اور اونٹ کے کوہان (مسنم) جیسی بھی۔ جمہور (امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ، احمد بن حنبلؒ، عام محدثین اور بہت سے شافعی علماء کے نزدیک اس کی شکل کا مسنم ہونا مستحب ہے۔

سفیان تمار سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو قبر کو مسنم (یعنی اونٹ کے کوہان کی طرح) بنا ہوا دیکھا۔(بخاری، ابن ابی شیبہ) ابن ابی شیبہ کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں "اور اسی طرح ابو بکرؓ و عمرؓ کی قبر کو بھی"۔(۱)

---

(۱) امام شافعیؒ کے نزدیک قبر کا مسطح (ہموار) ہونا مستحب ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ نبی ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ کی قبریں شروع میں مسنم نہ ہوں لیکن بعد میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی امارت مدینہ کے زمانہ میں انہیں مسنم کر دیا گیا ہو کیونکہ حضرت ابو بکرؓ کے پوتے قاسمؒ سے روایت ہے کہ میں حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے ان سے عرض کیا کہ مجھے نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے دونوں ساتھیوںؓ کی قبروں کی زیارت کرائیں 'میں نے دیکھا کہ قبریں نہ بہت اونچی تھیں اور نہ بالکل زمین سے ملی ہوئیں بلکہ ہموار تھیں اور ان پر سرخ کنکریاں بچھائی ہوئی تھیں"۔ (ابوداؤد، حاکم)

۱۳- قبر پر کوئی علامت رکھنا

قبر کے پہچاننے اور اس کے معلوم کرنے کے لئے اس کے سرہانے کوئی بھاری پتھر رکھ دینا یا گاڑ دینا جائز درست ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے (حضرت، عثمان بن مظعونؓ کی قبر پر بطور علامت ایک بڑا پتھر رکھا۔ (ابن ماجہ، ابو داؤد)

۱۴- تدفین کے بعد ٹھہر کر میت کے لئے دعا کرنا

تدفین سے فارغ ہونے کے بعد میت کے لئے مغفرت و ثابت قدمی کی دعا کرنا مستحب ہے۔

حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب میت کی تدفین سے فارغ ہوتے تو قبر کے پاس ٹھہرتے اور لوگوں سے فرماتے کہ اپنے بھائی کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور ثابت قدم رہنے کی دعا کرو، اس لئے کہ اس وقت اس سے سوال ہوگا۔
(ابو داؤد، حاکم، بزار)

فائدہ: (۱) حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک دعا اور قرآن خوانی کے لئے قبر کے پاس اتنی دیر تک ٹھہرنا مستحب ہے، جتنی دیر میں اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا جا سکے۔ بعض اہل حدیث علماء نے بھی اس کو مستحب قرار دیا ہے۔ اس بارے میں نبی ﷺ سے کوئی حدیث نہیں آئی۔ البتہ حضرت عمرو بن عاصؓ نے اپنی وفات کے وقت اس کی وصیت فرمائی تھی۔
(الفتح الربانی ج ۸ ص ۶۵) (ردالمحتار ج ۱ ص ۶۰۱) (کتاب الجنائز ص ۹۲)

(۲) شافعیہ اور اکثر حنبلیہ کے نزدیک تدفین سے فارغ ہو کر میت کو مخاطب کر کے ایمان پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کرنا مستحب ہے۔ اس بارے میں بعض احادیث بھی آئی ہیں جن کے قابل حجت ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف ہے۔ دوسرے مذاہب کے علماء کا ان پر عمل نہیں ہے۔ (مختصر از الفتح الربانی ج ۸ ص ۶۶)

۱۵- قبر کو پختہ بنانے کی ممانعت

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ "میں نے نبی ﷺ کو قبر پر بیٹھنے، اسے پختہ بنانے اور اس پر کوئی عمارت بنانے سے منع فرماتے سنا ہے"۔ (احمد، مسلم، ابو داؤد، نسائی، بیہقی، ترمذی) ترمذی اور نسائی کی روایات میں "اور اس پر لکھنے (کتبہ لگانے)" کے الفاظ زیادہ ہیں۔

اس اور بعض دوسری احادیث میں نبی ﷺ نے قبر کو پختہ بنانے سے منع فرمایا ہے۔ امام ابن حزمؒ کے نزدیک یہ ممانعت حرام ہونے کے معنی میں ہے اور ائمہ اربعہ اور دوسرے ائمہ کے نزدیک مکروہ ہونے کے معنی میں۔ (جائز کسی کے نزدیک نہیں ہے)
(الفتح الربانی ج ۸ ص ۸۳)

۱۶- قبر پر مسجد یا کوئی عمارت بنانے کی ممانعت

متعدد احادیث میں نبی ﷺ نے قبر پر کوئی عمارت (مسجد یا قبہ وغیرہ) بنانے سے منع فرمایا ہے جیسا کہ حضرت جابرؓ کی مذکورہ حدیث میں اس کا ذکر ہے۔ یہ ممانعت امام ابن حزمؒ کے نزدیک حرام ہونے کے معنی میں ہے اور امام احمدؒ کے نزدیک مکروہ ہونے کے معنی ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ اور شافعیؒ وغیرہ کے نزدیک قبروں پر عمارت بنانا اگر زینت اور فخر کے لئے ہے تو یہ حرام ہے اور اگر اس کا مقصد قبر کو پختہ کرنا ہے تو یہ مکروہ ہے۔ یہ کراہت بھی صرف اس صورت میں ہے جبکہ قبرستان کی زمین وقف یا شاملات نہ ہو اور اگر وہ وقف یا شاملات ہو تو اس پر عمارت بنانا ہر حال میں حرام ہے۔ بعض حنفی علماء کے نزدیک علماء، مشائخ اور سادات کی قبر پر عمارت بنا لینے میں کوئی ہرج نہیں ہے لیکن صرف اس صورت میں جبکہ قبرستان کی زمین وقف یا شاملات نہ ہو۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۲۰۱) (الفتح الربانی ج ۸ ص ۸۴)

۱۷- قبر پر بیٹھنے کی ممانعت

نبی ﷺ نے قبر پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے جیسا کہ حضرت جابرؓ کی مذکورہ حدیث میں اس کا ذکر ہوا ہے۔ امام ابن حزمؒ نے اس ممانعت کو حرمت کے معنی میں لیا ہے۔
اور امام ابو حنیفہؒ، شافعیؒ، احمدؒ اور بہت سے دوسرے ائمہ نے کراہت کے معنی میں۔(۱)

---

(۱) امام مالکؒ کے نزدیک قبر پر مطلق بیٹھنا منع نہیں ہے۔ البتہ پیشاب و پاخانہ کے لئے بیٹھنا منع (بمعنی مکروہ) ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ نبی ﷺ نے قبروں پر بیٹھنے سے صرف اس لئے منع فرمایا تھا کہ لوگ ان پر بیٹھ کر پیشاب و پاخانہ کیا کرتے تھے۔ (الفتح الربانی ج ۸ ص ۸۳)

۱۸- قبر پر کتبہ لگانے کی ممانعت

نبی علیہ السلام نے قبر پر کتبہ لگانے سے بھی منع فرمایا ہے جیسا کہ حضرت جابرؓ کی مذکورہ حدیث (بروایت ترمذی و نسائی) میں اس کا ذکر ہوا ہے۔

مالکیہ کے نزدیک یہ ممانعت بعض صورتوں میں حرمت کے معنی ہیں اور بعض صورتوں میں کراہت کے معنی میں ہے۔ حرمت کے معنی میں اس وقت ہے جبکہ قبر پر قرآن کی کسی آیت یا کسی دوسری چیز (مثلاً اشعار) کا کتبہ لگایا جائے اور کراہت کے معنی میں اس وقت جب کہ قبر پر میت کے نام اور تاریخ وفات کا کتبہ لگایا جائے۔ حنفیہ، شافعیہ، حنبلیہ اور اہل حدیث علماء کے نزدیک یہ ممانعت مطلق کراہت کے معنی میں ہے۔ البتہ حنفیہ کے نزدیک اگر قبر کا نام و نشان مٹ جانے کا اندیشہ ہو تو (بطور علامت) نام کا کتبہ لگایا جا سکتا ہے۔ شافعیہ کے نزدیک عام لوگوں کی قبروں پر تو نہیں لیکن کسی عالم یا صالح آدمی کی قبر پر نام کا کتبہ لگایا جا سکتا ہے جیسا کہ نبی علیہ السلام نے حضرت عثمان بن مظعونؓ کی قبر پر بطور علامت پتھر رکھا تھا۔ حنبلی اور اہل حدیث علماء کے نزدیک کسی حالت میں قبر پر کتبہ نہیں لگایا جا سکتا۔ (مختصر از الفتح الربانی ج ۸، ص ۸۵) (کتاب الجنائز ص ۸۳) (رد المختار ج ۱، ص ۶۰۱)

۱۹- تابوت میں دفن کرنے کی ممانعت

حدیث میں میت کو تابوت میں بند کر کے دفن کرنے کی ممانعت یا جواز کا ذکر نہیں ہے۔ ائمہ کے درمیان اس بارے میں اتفاق ہے کہ میت کا تابوت میں دفن کرنا مکروہ ہے، خواہ وہ اس کی وصیت ہی کیوں نہ کر جائے البتہ اگر زمین نم دار ہو، تو اس کا تابوت میں دفن کرنا جائز ہے۔ (رد المختار ج ۱، ص ۵۹۹) (الفتح الربانی ج ۸، ص ۸۷)

۲۰- قبر اور تدفین سے متعلق بعض متفرق مسائل

(۱) جنازہ کے ساتھ قبرستان جانے کی صورت میں یہ مستحب ہے کہ جب تک جنازہ کو اتار کر زمین پر نہ رکھ دیا جائے بیٹھا نہ جائے کیونکہ کسی مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام فرمایا ـــ "اور جو شخص جنازہ کے ساتھ جائے، اسے چاہئے کہ جب تک جنازہ نہ رکھ دیا جائے، نہ بیٹھے"۔ (بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، بیہقی، احمد)

(۲) میت کی تدفین سے فارغ ہونے تک قبرستان میں بیٹھنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ قبلہ رخ ہو کر بیٹھنا مستحب ہے۔

حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ ایک انصاری کے جنازہ میں گئے۔ ہم قبرستان پہنچے تو ابھی لحد تیار نہیں ہوئی تھی۔ نبی ﷺ قبلہ رخ ہو کر بیٹھے اور ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ بیٹھے"۔ (ابوداؤد)

(۳) مجبوری اور عذر کے وقت ایک قبر میں دو یا تین میتوں کو بھی دفن کیا جا سکتا ہے۔ مجبوری کے بغیر ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

ہشام بن عامرؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگوں نے جنگ احد کے روز نبی ﷺ سے شکایت کی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! ہر شخص کے لئے ایک ایک قبر کھودنا ہمارے لئے مشکل ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "کشادہ اور گہری قبر کھودو اور دو دو تین تین میتوں کو ایک قبر میں دفن کر دو"۔ ہم نے پوچھا "پہلے کس کو قبر میں اتاریں؟" فرمایا "جس کو قرآن زیادہ یاد ہو اسے مقدم رکھو"۔ (نسائی، ابوداؤد، ترمذی، بیہقی، احمد)

(۴) رشتہ داروں کو ایک جگہ دفن کرنا مستحب ہے۔

جب حضرت عثمان بن مظعونؓ کا انتقال ہوا تو نبی ﷺ نے فرمایا "ان کے گھر والوں میں جن کا انتقال ہو گا اسے ان کے قریب دفن کروں گا"۔ (المغنی ج ۳ ص ۳۸۹)

(۵) شہید کو جہاں اس کی شہادت ہو وہیں دفن کرنا مستحب ہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "شہداء کو ان کی شہادت کی جگہوں میں دفن کرو"۔ (ابن ماجہ) وغیرہ

(۶) قبر کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا اور قبر پر دیا جلانا حرام ہے۔ نبی ﷺ نے ایسا کرنے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اللہ یہود کو تباہ کرے، انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مساجد بنا ڈالا"۔ (بخاری و مسلم)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ "نبی ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں اور ان پر مسجدیں بنانے اور چراغ جلانے والوں پر لعنت فرمائی ہے"۔ (مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی)

تعزیت

۱۔ ثواب وفضیلت

میت کے گھر والوں کی تعزیت کرنا یعنی ان کو صبر کی تلقین کرنا اور تسلی دینا سنت ہے۔

عمرو بن حزم اپنے والد کے واسطے سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا "جو مسلمان اپنے بھائی کی مصیبت میں اس کی تعزیت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو بزرگی کا لباس پہنائے گا"۔ (ابن ماجہ)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی مصیبت زدہ کی تعزیت کرتا ہے، اس کے لئے اتنا ہی اجر ہے جتنا اس مصیبت زدہ کے لئے (اپنی مصیبت پر صبر کرنے کا) ہے"۔ (ترمذی)

۲۔ الفاظ

تعزیت کے لئے کوئی الفاظ مقرر نہیں ہیں لیکن جن الفاظ کا حدیث میں ذکر ہے ان کے ذریعے تعزیت کرنا افضل ہے۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کی کسی صاحبزادیؓ کے ایک بچے کا انتقال ہو گیا' انہوں نے نبی ﷺ کے پاس پیغام بھیجا تو آپ ﷺ نے جواب میں انہیں سلام کہلا بھیجا اور فرمایا "اللہ نے جو دیا وہ بھی اس کا تھا اور جو اس نے واپس لیا وہ بھی اس کا تھا۔ ہر چیز کے لئے اس کے پاس ایک مقررہ مدت ہے' اس لئے (میری بیٹی) کو چاہئے کہ صبر کرے اور اجر کی نیت رکھے"۔ (احمد، بخاری، مسلم، ابن ماجہ، بیہقی وغیرہ)

حضرت ابو خالد والبیؒ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص کی تعزیت کرتے ہوئے فرمایا "اللہ اس پر رحم فرمائے اور تمہیں اجر عطا فرمائے"۔ (ابن ابی شیبہ)

حضرت معاذ بن جبلؓ (جب کہ وہ نبی ﷺ کی طرف سے یمن کے امیر تھے اور یمن میں مقیم تھے) کا ایک لڑکا فوت ہو گیا۔ نبی ﷺ نے انہیں خط لکھا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یہ خط ہے محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے معاذ بن جبلؓ کے نام، سلام علیک، میں اللہ کی حمد و ثنا

کرتا ہوں جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ امابعد اللہ تعالیٰ تمہیں اجر عظیم عطا فرمائے اور تمہیں صبر اور ہمیں تمہیں دونوں کو شکر کی توفیق دے۔ ہمارے مال، ہمارے گھر والے اور ہمارے بچے سب اللہ کی عمدہ نعمتیں ہیں جو اس نے ہمیں بطور امانت دے رکھی ہیں اور ہمیں ان کی حفاظت و نگہبانی کا حکم دیا ہے۔ ہم لوگ ان سے ایک مقررہ مدت تک فائدہ اٹھاتے ہیں اور وہ ایک مقررہ وقت پر انہیں ہم سے واپس لے لیتا ہے۔ جب ہمیں کوئی چیز ملے تو ہم پر اللہ کا شکر کرنا فرض ہے اور جب ہمیں کوئی مصیبت پہنچے تو ہم پر صبر کرنا فرض ہے۔ تمہارا لڑکا اللہ کی عمدہ نعمتوں میں سے تھا اور اس کی طرف سے تمہارے پاس امانت تھا جس کی حفاظت اور نگہبانی کا تمہیں حکم دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس لڑکے سے بہت خوشی اور مسرت کے ساتھ متمتع کیا اور تم سے اس کو اجر عظیم کے ساتھ واپس لے لیا، جو بخشش، رحمت اور ہدایت ہے اگر تم ثواب لینا چاہو تو صبر کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری بے صبری تمہارے اجر کو ختم کردے اور پھر تمہیں شرمندہ ہونا پڑے۔ یاد رکھو کہ بے صبری کسی چیز کو لوٹا نہیں سکتی اور نہ رنج و غم کو دور کرسکتی ہے جو ہونا تھا سو ہوگیا۔ والسلام" (حاکم، ابن مردویہ)

۳- دعا

تعزیت کے وقت میت کے لئے دعا کرنا بھی مستحب ہے۔

حضرت فاطمہؓ کسی صحابی کے گھر تعزیت کے لئے تشریف لے گئیں جب واپس آئیں تو رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ کہاں گئی تھیں؟ حضرت فاطمہؓ نے جواب دیا کہ اس گھر کے لوگوں کے پاس گئی تھی۔ وہاں میں نے ان کی میت کے لئے دعائے رحمت کی اور ان کی تعزیت کی۔ (ابوداؤد، نسائی)

۴- وقت

حدیث میں تعزیت کے وقت کا صریح الفاظ میں ذکر نہیں ہے۔ مختلف احادیث کے پیش نظر آئمہ کا اس بارے میں اختلاف ہے۔(۱)

---

(۱) مالکیہ کے نزدیک تعزیت کا وقت تدفین کے بعد ہے۔ شافعیہ، حنبلیہ اور اہل حدیث علماء کے نزدیک تعزیت کا وقت تدفین سے پہلے بھی ہے اور تدفین کے بعد تقریباً تین دن بھی ہے۔ حنفیہ کے نزدیک تعزیت کا وقت تدفین سے پہلے ہے کیونکہ تدفین کے بعد تعزیت کرنے سے غم اور تازہ ہو جاتا ہے۔ جب میت کی تدفین سے فراغت ہو جائے اور لوگ واپس آجائیں۔ تو لوگوں کو چاہئے کہ بکھر جائیں اور اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو جائیں۔ ہاں جو شخص موجود نہ ہو، وہ بعد میں آکر بھی تعزیت کرسکتا ہے۔
(الفتح الربانی ج ۸ ص ۹۱) (رد المختار ج ۱ ص ۴-۶) (کتاب الجنائز ص ۹۷)

۵۔ اجتماع

حضرتؓ جریر بن عبداللہ بجلیؓ سے روایت ہے کہ ہم (صحابہ کرام) تدفین کے بعد میت کے گھر والوں کے پاس جمع ہونے اور (ان کا لوگوں کے لیے) کھانا تیار کرنے کو ماتم (جس کی ممانعت نبی ﷺ نے فرمائی ہے) شمار کرتے تھے۔

(احمد' ابن ماجہ)

اس حدیث میں تدفین کے بعد میت کے گھر والوں کے پاس لوگوں کے بغرض تعزیت جمع ہونے کی ممانعت کا ذکر ہے۔ حنفیہ' مالکیہ' بعض شافعی' حنبلی (اور اہل حدیث) علماء کے نزدیک یہ ممانعت صرف اس وقت ہے جبکہ جمع ہو کر بعض ناجائز کاموں (جیسے جانوروں کا ذبح کرنا' خیمہ لگانا اور جشن منانے) کا ارتکاب کیا جائے۔ حنفیہ کے نزدیک تین دن تک جمع ہونے کی اجازت ہے۔ اکثر شافعی اور حنبلی علماء کے نزدیک یہ ممانعت مطلق ہے۔

(الفتح الربانی ج ۸ ص ۹۶)۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۶۰۴) وغیرہ۔

۶۔ میت کے گھر والوں کے لیے کھانا

جس گھر میں میت ہو جائے' اس کے پڑوسیوں اور رشتہ داروں کے لیے مستحب ہے کہ انہیں کھانا پکا کر بھیجیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس گھر والے غم کے مارے نہ کھانا پکائیں اور نہ کھائیں۔ اور اس طرح ان کی صحت پر برا اثر پڑے۔

حضرت عبداللہ بن جعفرؓ سے روایت ہے کہ جب (میرے والد) حضرت جعفرؓ کی شہادت کی اطلاع آئی تو نبی ﷺ نے فرمایا۔ "جعفرؓ کے گھر والوں کے لیے کھانا پکا کر بھیجو' اس لیے کہ انہیں ایسی مصیبت پہنچی ہے کہ انہیں خود کھانا پکانے اور کھانے کا ہوش نہیں ہے۔"

(ابو داؤد' ترمذی' ابن ماجہ' احمد)

لیکن خود میت کے گھر والوں کا لوگوں کے لیے کھانا تیار کرانا مکروہ ہے۔ جیسا کہ حضرت جریر بن عبداللہؓ کی مذکورہ احادیث میں اس کا ذکر ہے۔

اس بارے میں ائمہ اربعہ (اور دوسرے ائمہ) کا اتفاق ہے۔

(الفتح الربانی' ج ۸ ص ۹۵) (ملا علی قاریؒ ...

زیارت قبور

۱۔ استحباب و فضیلت

قبروں کی زیارت اگر اس غرض سے کی جائے کہ مردوں کے لیے استغفار اور توبہ کی جائے، قبروں کو دیکھ کر عبرت حاصل ہو، اپنی موت اور آخرت کی یاد تازہ ہو، دنیا سے انہماک کم ہو اور آخرت کے سامان کی فکر پیدا ہو، تو یہ تمام ائمہ کے نزدیک مشروع ہے۔ نبی ﷺ نے شروع میں اس سے منع فرمایا تھا لیکن بعد میں آپ ﷺ نے اس کی اجازت دے دی تھی۔ اس بارے میں متعدد احادیث ثابت ہیں۔ اختصار کے خیال سے ہم صرف دو حدیثیں نقل کرتے ہیں:

حضرت بریدہ اسلمی ؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا۔ فزوروها (اب تم ان کی زیارت کرو یا تم ان کی زیارت کر سکتے ہو۔){1} اس لیے کہ ان سے آخرت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔"

(مسلم، احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ۔)

حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا۔ اب مجھے خیال آیا کہ اس سے دل میں نرمی اور آنکھوں میں نمی پیدا ہوتی ہے اور آخرت کی یاد آتی ہے۔ لہٰذا تم قبروں کی زیارت کر سکتے ہو لیکن ناجائز و نازیبا کلمات زبان سے نہ نکالو۔"

(ابوداؤد، احمد، نسائی، موطا امام مالک ؒ)

ائمہ کے نزدیک اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا نبی ﷺ کی یہ اجازت صرف مردوں کے لیے ہے یا یہ مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ہے۔{2}

---

(۱) زیارت قبور امام ابن حزم ؒ کے نزدیک عمر میں کم از کم ایک مرتبہ فرض ہے۔ دوسرے تمام ائمہ اسے مستحب مانتے ہیں۔ (الفتح الربانی ج ۸ ص ۱۶۲)۔

(۲) بعض حنفیہ، شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک عورتوں کے لیے قبروں کی زیارت کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ "ان سب کا استدلال جن احادیث سے ہے، ان میں سے ایک حدیث یہ ہے: (بقیہ اگلے صفحہ پر)

۲۔ زیارت قبر کی دعائیں

زیارت قبر کے وقت مردوں کو سلام کہنا اور ان کے لیے استغفار و دعا کرنا مستحب ہے۔ اس بارے میں نبی ﷺ سے جو احادیث ثابت ہیں' ان میں سے چند احادیث مندرجہ ذیل ہیں:

(ا) حضرت بریدہ اسلمی ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ صحابہؓ کرام کو تعلیم دیا کرتے تھے کہ جب ان میں سے کوئی شخص قبرستان جائے تو یوں کہے:

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ اِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ۔ اَنْتُمْ فَرَطُنَا وَ نَحْنُ لَکُمْ تَبَعٌ۔ وَ نَسْاَلُ اللّٰہُ لَنَا وَ لَکُمُ الْعَافِیَۃَ

اے اس دیار کے مومن اور مسلمان باسیو! تم پر سلام ہو۔ انشاء اللہ ہم بھی تم سے آکر ملنے والے ہیں۔ تم ہم سے پہلے جاچکے اور ہم تمہارے بعد آ رہے ہیں۔ ہم اللہ سے اپنے اور تمہارے لئے آسائش و عافیت کا سوال کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں اور ان پر مساجد بنانے اور چراغ جلانے والوں کو لعنت فرمائی ہے۔ (احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ وغیرہ۔)

بعض حنفیہ' اکثر شافعیہ اور تمام حنبلیہ کے نزدیک عورتوں کے لیے قبروں کی زیارت مکروہ تنزیہی ہے۔ ان کا استدلال حضرت ام عطیہ ؓ کی اس حدیث سے ہے' کہ نبی ﷺ نے ہمیں (یعنی ہم عورتوں کو) جنازے کے ساتھ جانے سے منع فرمایا لیکن سختی نہیں فرمائی۔ (بخاری' مسلم' احمد' ابوداؤد' ابن ماجہ' بیہقی۔)

مالکیہ اور اکثر حنفیہ (اور ایک روایت میں امام احمدؒ) کے نزدیک عورتوں کے لیے قبروں کی زیارت کرنا جائز ہے۔ ان کے لیے ممانعت شروع میں تھی۔ بعد میں نبی ﷺ نے جب زیارت کی اجازت دے دی تو یہ جہاں مردوں کے لیے تھی' عورتوں کے لیے بھی تھی۔ ان کا استدلال جن احادیث سے ہے' ان میں سے ایک یہ ہے۔

حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ اگر میں قبروں کی زیارت کے لیے جاؤں تو کیا کہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "تم یہ کہو السلام علی اھل الدیار...." (مختصراً از الفتح الربانی ج ۸ ص ۱۶۲)

(۲) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ (زیارت قبر کے وقت میں) کیا کہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تم یہ کہو:

اَلسَّلَامُ عَلٰی اَھْلِ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ وَیَرْحَمُ اللّٰہُ الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنَّا وَ الْمُسْتَاخِرِیْنَ، وَ اِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ۔

اے اس دیار کے مومن اور مسلمان باسیو! تم پر سلام ہو۔ جو لوگ ہم سے پہلے پہلے گئے اور جو پیچھے رہ گئے سب پر اللہ رحم فرمائے اور انشاء اللہ ہم تم سے آکر ملنے والے ہیں۔

(مسلم، احمد، نسائی)

قبروں پر دعا کے وقت ہاتھ اٹھانا بھی صحیح ہے۔ حضرت عائشہؓ کی مذکورہ حدیث جو کافی لمبی ہے۔ اس میں یہ بھی کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ بقیع تشریف لے گئے اور دیر تک کھڑے رہے۔ پھر تین مرتبہ ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی۔

(حصہ دوم)

- کتاب الزکوٰۃ
- کتاب الصیام
- کتاب الحج والعمرہ

محمد عاصم الحداد

الفیصل
ناشران و تاجرانِ کتب
اردو بازار لاہور

فہرست مندرجات

(حصّہ دوم)

مقدمہ

کتابُ الزّکوٰۃ

کتابُ الصّیام

کتاب الحج والعمرۃ

☆-------------☆-------------☆

مقدمہ

"فقہ السنہ" کا دوسرا حصہ اپنے ملک کے اردو دان طبقہ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ پروگرام اور اعلام کے مطابق اس حصہ کو---------- زکوٰۃ' روزہ' حج اور دعا کے مسائل پر مشتمل ہونا چاہئے تھا' لیکن اختصار کا انتہائی خیال رکھنے کے باوجود حج کے مسائل تک پہنچتے پہنچتے یہ حصہ اس قدر ضخیم ہو گیا کہ مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ دعا کے مسائل اس میں شامل نہ کئے جائیں' اور انہیں بعد میں الگ کتابی شکل میں مرتب کر کے شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ **فقہ السنۃ** کا یہ حصہ---- جو آپ کے سامنے ہے۔ کتاب الزکوٰۃ' کتاب الصیام اور کتاب الحج و العمرہ پر مشتمل ہے۔

اس حصہ کی ترتیب بھی اسی طریق پر کی گئی ہے' جس طریق پر پہلے حصہ کی ترتیب کی گئی تھی' البتہ اس میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ ہر مسئلہ میں نہ صرف حنفیہ' مالکیہ' شافعیہ' حنبلیہ اور جمہور اہل حدیث علماء کا مسلک بیان کیا جائے' بلکہ ان کے علاوہ دوسرے فقہاء کے مسلک کا بھی ذکر کیا جائے جیسا کہ میں پہلے حصہ کے مقدمہ میں واضح کر چکا ہوں' اس کتاب کے شائع کرنے سے میرا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس کے پڑھنے والوں کو ان کے موجودہ فقہی مسالک سے ہٹا کر کسی---------- خاص مسلک کی طرف دعوت دی جائے' بلکہ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے اگر دوسرے مسالک اور ان کے دلائل سے سرسری واقفیت پیدا کر لیں' تو یہ علمی اعتبار سے بھی ایک بہتر چیز ہے اور مختلف مسالک کے افراد میں رواداری کے لحاظ سے بھی اس کے نتائج بہتر ہوں گے۔
ہر مسلک کی فقہی کتابیں الگ شائع کرنے کا فائدہ اپنی جگہ مسلم ہے لیکن اس طرح تمام فقہی مسالک کو یکجا کر کے شائع کرنا اپنی جگہ افادیت کا پہلو رکھتا ہے۔ اس سے کم

از کم لوگوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ائمہ سلف کے درمیان اگر دین کے بعض فروعی مسائل میں اختلاف ہوا ہے' تو وہ کن بنیادوں پر ہوا ہے اور ہر ایک نے اصول فقہ کے استعمال میں کیا طریقہ اختیار فرمایا ہے؟

پہلے حصہ کی اشاعت کے بعد اہل علم حضرات نے اس کی جس طرح قدر فرمائی' یقیناً وہ میری توقع سے بہت زیادہ تھی اور اس سے میرے اندر اس سلسلہ کو جاری رکھنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ جن حضرات نے اس میں بعض خامیوں کی نشاندہی فرمائی اور مفید مشورے دیئے' ان کا میں خاص طور پر ممنون ہوں۔ ان کے مفید مشوروں سے میں نے اس دوسرے حصہ میں بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ آئندہ حصوں کی تالیف میں بھی ان کو پیش نظر رکھوں گا' اور پہلے حصہ کی نظرثانی میں بھی ان سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں گا۔ امید ہے اس دوسرے حصہ کو پڑھ کر بھی وہ اپنے مفید مشوروں سے اس عاجز کو محروم نہ رکھیں گے۔

خیال تھا کہ اس حصہ کے آخر میں ان تمام کتابوں کا تفصیلی تعارف کرا دیا جائے گا' جن سے اس کی اور پہلے حصہ کی تالیف میں مدد لی گئی ہے لیکن بعض مجبوریوں کے باعث اس کو انجام نہ دے سکا' تاہم جہاں کہیں میں نے کسی کتاب سے مسئلہ نقل کیا ہے اس مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے اس کتاب کی جلد اور صفحہ کا حوالہ دے دیا ہے۔ اگر اللہ نے چاہا تو پہلے حصہ کی دوسری اشاعت کے ساتھ ان کتابوں کا تفصیلی تعارف کرا دیا جائے گا' البتہ ایک چیز کا ذکر ضروری ہے اور وہ یہ کہ کتاب کے نام سے بعض حضرات کو یہ شبہ ہوا ہے کہ یہ مصر کے مشہور عالم دین سید سابق کی کتاب "فقہ السنۃ" کا اردو ترجمہ ہے' حالانکہ نام کی یکسانیت کے باوجود دونوں کے موضوع میں فرق ہے۔ سید سابق نے حدیث و فقہ کی کتابوں سے جس مسئلہ کو جس طرح خود سمجھا ہے' اپنی کتاب میں نقل کر دیا ہے اور اختلافی مسائل میں عموماً صرف اس مسلک کو نقل کیا ہے' جسے انہوں نے دوسرے مسالک کی بہ نسبت صحیح تر سمجھا ہے' اور صرف اسی کے دلائل درج کئے ہیں۔ دوسرے مسالک کا

یا تو کوئی ذکر نہیں کیا ہے اور کیا ہے تو اس کے دلائل کی طرف صرف اشارہ کیا ہے۔ ان کی یہ کتاب ان لوگوں کے لئے یقیناً انتہائی مفید ہے جو مسائل کا پہلے سے علم رکھتے ہوں اور ان میں ایک عالم دین کی حیثیت سے سید سابق کی رائے اور ترجیح معلوم کرنا چاہتے ہوں۔ اس کے برعکس میں نے ان کی ترتیب مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے ساتھ نیل الاوطار (الشوکانی) اور الفتح الربانی (شرح مسند امام احمد "للشیخ احمد عبدالرحمٰن البناء والد الشیخ حسن البناء) کی ترتیب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسائل کو اس طریق پر مرتب کیا ہے جس کا پہلے حصہ کے مقدمہ میں ذکر کر چکا ہوں اور اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ تمام مسالک کو ان کی اپنی کتابوں سے پوری غیرجانبداری کے ساتھ نقل کیا جائے اور کسی مسئلہ میں اپنی کسی رائے کا اظہار نہ کیا جائے۔ کیونکہ نہ ہمارے ملک کے حالات وہ ہیں جو مصر کے ہیں اور نہ میری حیثیت ایک عالم دین کی ہے' تاہم سید سابق کی کتاب کا نام موضوع کے اعتبار سے اس قدر مناسب تھا کہ میں تیمناً اور تبرکاً اسی کو اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اگر دونوں کتابوں کا مقابلہ کر کے دیکھ لیا جائے' تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو جائے گی۔

آخر میں اللہ تعالیٰ کے حضور دعا ہے کہ اپنے دین کی خدمت کی اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے' اپنے بندوں کو اس سے فائدہ پہنچائے اور ہماری نیتوں کو شیطان کی دخل اندازی سے محفوظ رکھے۔

وللہ الحمد فی الاولی والاخرۃ

کتبہ العاجز
محمد عاصم

۷۔ ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ
۶۔ مئی ۱۹۶۳ء

کتاب الزکوٰۃ

زکوٰۃ کے عام مسائل

ا۔ زکوٰۃ کے لغوی اور شرعی معنی :

زکوٰۃ کے لغوی معنی "بڑھنے" اور "پاک ہونے" کے ہیں۔ شریعت میں زکوٰۃ اس مال کو کہتے ہیں جسے انسان اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے اس کے حق داروں کے لیے نکالتا ہے۔ اسے زکوٰۃ اسی لیے کہا گیا ہے کہ اس سے انسان کا مال پاک بھی ہوتا ہے اور مقدار و اجر میں بڑھتا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔ وہ شخص کامیاب ہو گیا' جس نے اپنے آپ کو پاک کیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

مَا نَقَصَ مَالٌ مِنْ صَدَقَةٍ۔ کسی صدقہ سے کوئی مال کم نہیں ہوا۔ (نیل الاوطار وغیرہ)۔

۲۔ زکوٰۃ کی فرضیت :

زکوٰۃ اسلام کے پانچ ستونوں میں سے ایک نہایت اہم ستون ہے' جس کی فرضیت قرآن' سنت اور اجماعِ اُمت تینوں سے ثابت ہے۔ قرآن میں بار بار ارشاد ہوا ہے۔ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت' نماز کا قائم کرنا' زکوٰۃ کا ادا کرنا' بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔" (بخاری و مسلم)۔

زکوٰۃ کے ارکانِ اسلام میں سے ہونے کا آج تک امت میں سے کسی نے انکار نہیں کیا۔

۳۔ زکوٰۃ کی ترغیب اور فضیلت :

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا (توبہ: ۱۰۳)

اے نبی! تم ان کے اموال میں سے صدقہ (فرض زکوٰۃ اور نفلی صدقہ) وصول کرو جس سے تم ان کو پاک و صاف کرو گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ (الحج: ۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر زمین میں اقتدار نصیب کریں تو یہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے لیے ہے۔

یعنی مسلمانوں کو زمین میں جو غلبہ و اقتدار بخشا جاتا ہے اس کا ایک بڑا مقصد زکوٰۃ کے نظام کو قائم کرنا بھی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو یمن کی طرف بھیجا، تو ان سے فرمایا۔ "تم اہل کتاب کی ایک قوم کے پاس جا رہے ہو۔ تم انھیں دعوت دو کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور کے الٰہ نہ ہونے اور میرے رسول اللہ ہونے کی شہادت دیں۔ اگر وہ تمھاری اطاعت قبول کر لیں، تو انھیں بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ پھر اگر وہ تمھاری اطاعت قبول کر لیں تو انھیں بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر صدقہ (زکوٰۃ) فرض کیا ہے، جو ان کے خوشحال لوگوں سے لیا جائے گا اور ان کے حاجت مندوں کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ اگر وہ تمھاری اطاعت قبول کر لیں تو تم ایسا نہ کرو کہ ان سے ان کا عمدہ عمدہ مال وصول کرو (بلکہ جو مال وصول کرو درمیانے درجے کا وصول کرو) اور مظلوم کی بددعا سے ڈرتے رہو، اس لیے کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہے۔" (بخاری، مسلم، احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)۔

حضرت ابی کبشہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں تین چیزوں پر قسم کھاتا ہوں اور تم سے ایک حدیث بیان کرتا ہوں، اسے یاد رکھو! ایک یہ کہ کسی صدقہ سے کسی مال میں کمی نہیں آتی، دوسرے یہ کہ کسی پر ظلم کیا جائے اور وہ اس پر صبر

کرے' تو اللہ تعالیٰ اس پر عزت کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ تیسرے یہ کہ جو شخص اپنے اوپر بھیک مانگنے کا دروازہ کھولتا ہے' اللہ تعالیٰ اس پر تنگدستی کا دروازہ کھول دیتا ہے۔" (ترمذی)

۴۔ زکوٰۃ نہ دینے پر وعید:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلاَ يُنفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ' فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ' فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَاكَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَاكُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ○ (توبہ: ۳۴' ۳۵)

ان لوگوں کو دردناک سزا کی خوشخبری دو جو سونے اور چاندی کو جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے اور چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہی ہے وہ خزانہ جسے تم اپنے لیے جمع کیا کرتے تھے' لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس شخص کو اللہ نے مال دیا اور پھر اس نے اس مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کی' قیامت کے روز اس کا یہی مال ایک ایسے گنجے اژدھے کی صورت میں اس کے سامنے آئے گا' جس کی آنکھوں کے اوپر دو سیاہ (خوفناک) دھبے ہوں گے۔ پھر وہ اسے اپنے دونوں جبڑوں سے پکڑے گا اور اس سے کہے گا۔ "میں ہی تیرا خزانہ ہوں' میں ہی تیرا مال ہوں۔" پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ "وَلاَ يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ' سَيُطَوَّقُوْنَ مَابَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے' اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں' وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لیے اچھی ہے۔ نہیں یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے' جو کچھ وہ کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں' وہ قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ (بخاری و مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "مجھے (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ جاری رکھوں جب تک وہ یہ شہادت نہ دے دیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ پھر وہ نماز قائم کریں' اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب وہ ایسا کر لیں گے' تو مجھ سے اپنے مال اور خون بچا لیں گے' الا یہ کہ اسلام کا حق ان کا طالب ہو اور ان کا حساب و کتاب اللہ کے ذمہ ہو گا۔" (بخاری و مسلم' احمد)۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب حضرت ابو بکرؓ کے کندھوں پر خلافت کا بار پڑا اور عرب کے کچھ لوگوں نے اسلام سے روگردانی کی تو (حضرت ابو بکرؓ نے ان سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا۔ اس پر) حضرت عمرؓ نے ان سے کہا۔ "آپ ان لوگوں سے جنگ کیسے کر سکتے ہیں جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے' مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے جنگ جاری رکھوں' جب تک وہ یہ شہادت نہ دے دیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ جس شخص نے یہ شہادت دے دی' اس نے مجھ سے اپنا مال اور اپنی جان بچالی' الا یہ کہ اسلام کا حق اس کا خون چاہتا ہو اور اس کا حساب کتاب اللہ کے ذمہ ہو گا۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا۔ "اللہ کی قسم! میں ان لوگوں سے ضرور جنگ کروں گا' جنھوں نے نماز اور زکوٰۃ کے درمیان تفریق کر دی' حالانکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے۔ اللہ کی قسم! اگر ان لوگوں نے مجھ سے اونٹ کی ایک رسی بھی' جسے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے' روکی۔ تو میں ان سے جنگ کروں گا۔" اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "اس کے بعد جلدی ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اللہ نے جنگ کے لیے حضرت ابو بکرؓ کا سینہ کھول دیا ہے اور میں سمجھ گیا کہ وہ حق بجانب ہیں۔" (بخاری' مسلم' ابو داؤد' احمد' نسائی' ابن ماجہ)۔

امام خطابیؒ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ نے جن لوگوں سے جنگ کی۔ وہ چار طرح کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو سرے سے اسلام ہی سے مرتد ہو گئے تھے' دوسرے وہ جنھوں نے پورے اسلام کا تو انکار نہیں کیا تھا' لیکن نماز اور زکوٰۃ کے منکر ہو گئے تھے' تیسرے وہ جو نماز تو پڑھتے تھے لیکن زکوٰۃ کے منکر ہو گئے تھے' چوتھے وہ جو زکوٰۃ بھی دیتے تھے' لیکن اس کے بیت المال میں ادا کرنے کے منکر ہو گئے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے

ان سب سے جنگ کی۔ (مختصراً از معالم السنن)۔

۵۔ زکوٰۃ فرض ہونے کی شرائط :

کسی مال پر زکوٰۃ کے فرض ہونے کی دو شرطیں ہیں :

(۱) وہ بقدر نصاب یا اس سے زیادہ ہو۔ نصاب سے مراد وہ کم سے کم مقدار ہے جو شریعت نے مختلف چیزوں کی زکوٰۃ کے لیے مقرر کی ہے۔ (مختلف چیزوں کے نصاب کی بحث آگے آرہی ہے)۔

(۲) اس پر ایک (ہجری) سال گزر چکا ہو۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "کسی مال پر اس وقت تک کوئی زکوٰۃ نہیں جب تک اس پر ایک سال نہ گزر چکا ہو۔"[۱] (ابوداؤد)

البتہ زمین کی پیداوار پر ایک سال کی شرط نہیں ہے۔ ان کی زکوٰۃ ان کے کاٹنے اور

ا۔ "ایک سال گزر جانے" کے متعلق مذاہب اربعہ میں مندرجہ ذیل تفصیل ہے :

حنفیہ کے نزدیک مال کا اپنے سال کے شروع اور آخر میں نصاب کے برابر یا اس سے زیادہ ہونا معتبر ہے' خواہ سال کے دوران نصاب سے کم ہی رہا ہو۔ اگر کوئی مال سال کے شروع میں نصاب کے برابر ہو اور پھر سارا سال نصاب کے برابر ہی رہے تو اس پر زکوٰۃ ضروری ہے' اور اگر وہ سال کے دوران کم ہو لیکن سال کے آخر تک پھر پورا ہو جائے' تب بھی اس پر زکوٰۃ ضروری ہے' لیکن اگر وہ سال کے آخری تک کم ہی رہے' تب اس پر زکوٰۃ ضروری نہیں۔

مالکیہ کے نزدیک بھی اگر مال سال کے شروع اور آخر میں نصاب کے برابر ہو تو اس پر زکوٰۃ ضروری ہے' خواہ دوران سال کم ہو کر نفع سے پھر پورا ہو جائے۔ اسی طرح اگر کوئی مال سال کے شروع میں نصاب سے کم ہو' لیکن سال کے دوران نفع سے پورا ہو جائے۔ یہاں تک کہ سال کے آخر تک پورا رہے' تب بھی اس پر زکوٰۃ ضروری ہے۔

شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک پورے نصاب پر سال کا گزرنا ضروری ہے۔ (شافعیہ کے نزدیک پورا سال اور حنبلیہ کے نزدیک تقریباً ایک سال) اگر کوئی مال سال کے شروع میں نصاب سے کم ہو' پھر دوران سال پورا ہو جائے' تو اس کا سال اس وقت سے شروع ہو گا' جب وہ نصاب کے برابر ہو گا۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

صاف کر لینے کے ساتھ ہی ادا کی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَاٰتُوا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (اور اس کے کاٹنے کے دن اللہ کا حق۔ یعنی زکوٰۃ۔ ادا کرو)۔

اس طرح کانوں اور دبے ہوئے خزانوں کی زکوٰۃ کے لیے بھی ایک سال کی شرط نہیں ہے' جیسا کہ آئندہ صفحات میں مفصل بحث آرہی ہے۔ اس پوری تفصیل کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

۶۔ زکوٰۃ کس پر فرض ہے؟

ہر آزاد مسلمان مرد و عورت پر (جبکہ اس کے مال پر مندرجہ بالا دو شرطیں پائی جائیں) زکوٰۃ فرض ہے۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اگر مال کا مالک نابالغ بچہ یا بے سمجھ آدمی ہو' تب بھی اس پر زکوٰۃ ضروری ہے' جسے اس کا سرپرست ادا کرے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص کسی یتیم کے مال کا سرپرست ہو' اسے چاہیے کہ اس کے مال سے تجارت کرے اور اسے بے کار نہ رہنے دے کہ اسے زکوٰۃ کھا جائے۔" (ترمذی دارقطنی)۔

دوسری حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "یتیموں کے مال کو تجارت میں لاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ اسے زکوٰۃ کھا جائے۔" (مسند امام شافعیؒ)

یہ دونوں روایتیں اگرچہ سند کے لحاظ سے قوی نہیں ہیں (پہلی روایت ضعیف ہے اور دوسری مرسل [1])' لیکن اکثر صحابہؓ (جن میں حضرت عمرؓ' علیؓ' عائشہؓ اور ابن عمرؓ شامل ہیں' کا عمل ان ہی کے مطابق ہے (ترمذی)

حضرت عائشہؓ کی سرپرستی میں چند یتیم بچے تھے۔ آپ ان کے مال کی زکوٰۃ ادا کیا کرتی تھیں۔ (موطا امام مالک) [2]

۱۔ مرسل سے مراد وہ حدیث ہے جس میں روایت کرنے والے صحابی کا ذکر نہ ہو۔

۲۔ ائمہ میں سے امام مالکؒ' شافعی' احمد بن حنبلؒ اور اسحاقؒ کا یہی مسلک ہے۔ صحابہؓ اور اہلِ علم کا ایک دوسرا گروہ یتیم (اور ناسمجھ دار آدمی) کے مال میں زکوٰۃ نہیں مانتا۔ یہ امام سفیان ثوریؒ اور عبداللہ بن

۷۔ مقروض کی زکوٰۃ:

اگر کسی شخص کے پاس نصاب سے زیادہ مال تو ہو اور اس پر ایک سال بھی گزر چکا ہو، لیکن اس پر اتنا قرض ہو، جسے ادا کرنے کے بعد وہ مال نصاب سے کم رہ جاتا ہو، تو اس پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے، اسے اپنا قرض ادا کرنا چاہیے۔ اس بارے میں اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی واضح حدیث ثابت نہیں ہے۔ لیکن حضرت عثمانؓ فرمایا کرتے تھے۔ "یہ زکوٰۃ کا مہینہ ہے۔ لہٰذا تم میں سے جس شخص پر قرض ہو، وہ اپنا قرض ادا کرے تاکہ جو مال بچے، تم اس کی زکوٰۃ ادا کر سکو (اگر وہ نصاب کے برابر یا اس سے زائد ہو")(موطا امام مالکؒ) اور صحابہؓ میں سے کسی نے حضرت عثمانؓ کے اس قول کی مخالفت نہیں کی۔[۳]

۸۔ قرض مال کی زکوٰۃ:

حنفیہ کے نزدیک قرض کی تین قسمیں ہیں:

ایک قوی، جو نقدی یا مالِ تجارت کی قیمت (ادھار) ہو اور ایسے شخص کے ذمہ ہو،

مبارکؒ کا مذہب ہے۔ (ترمذی)

یہی مذہب حنفیہ کا بھی ہے، ان کا استدلال یہ ہے کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے، اور بچہ اور بے سمجھ آدمی اس کے مخاطب اور مکلف نہیں ہیں، البتہ ان کے مال میں دوسرے مصارف ضروری ہیں کیونکہ وہ بندوں کا حق ہیں۔ اسی طرح ان کے مال میں عشر (زمین کی پیداوار کی زکوٰۃ) اور صدقہ فطر بھی ضروری ہیں۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۵۶۱)

۳۔ یہ امام حسن بصریؒ، ابراہیم نخعیؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، امام مالکؒ اور اکثر ائمہ سلف کا مسلک ہے۔ ان کا استدلال حضرت عثمانؓ کے ارشاد کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے بھی ہے۔ "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے اغنیاء سے زکوٰۃ وصول کروں اور فقراء کی طرف اسے لوٹا دوں۔"

امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے شاگردوں کے نزدیک اموال ظاہرہ (مویشیوں اور غلوں) کی زکوٰۃ بہر حال دی جائے گی۔ اموال باطنہ (نقدی، مال تجارت وغیرہ) اگر قرض ادا کرنے کے بعد نصاب سے کم رہ جائیں، تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہو گی۔ امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک مقروض اپنے پورے مال کی زکوٰۃ دے گا خواہ قرض ادا کرنے سے اس کا مال نصاب سے کم رہ جاتا ہو۔ (المغنی۔ ہدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۲۲۳)۔

جسے اس کا اعتراف ہو' خواہ وہ تنگدست ہو۔

دوسرا متوسط' جو کسی ایسی چیز کی قیمت ہو جو اگر اس کے مالک کے پاس ہوتی تو اس پر کوئی زکوٰۃ نہ ہوتی' جیسے رہائشی مکان' پہننے کے کپڑے یا استعمال کے برتن وغیرہ۔

تیسرا ضعیف' جو کسی چیز کی قیمت نہ ہو۔ جیسے عورت کا اپنے شوہر کے ذمہ مہر یا خلع کی رقم۔

قوی قرض میں سے جب تک اس کے مالک کو ۴۰ درہم (۱۰ تولہ چاندی کی قیمت) یا اس سے زائد رقم وصول نہ ہو' وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کرے گا۔ لیکن جونہی اسے چالیس درہم یا اس سے زائد رقم وصول ہو' وہ اس کی (پچھلے تمام سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔ اور اگر اسے ۴۰ درہم سے کم رقم وصول ہو' تو اس کے ذمہ اس کی زکوٰۃ نہیں ہے' خواہ اس کو ۴۰ درہم سے کم کی یہ رقم شروع میں وصول ہو یا بعد میں۔ ہر صورت میں اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

قوی قرض پر حولانِ حول یعنی سال گزرنے کا اعتبار اس وقت سے ہوگا جب کہ اس کا مالک (یعنی قرض خواہ) نصاب کا مالک ہوا ہو' اس وقت سے نہیں ہوگا جب کہ اسے یہ قرض وصول ہو۔ مثلاً ایک شخص کا کسی دوسرے شخص پر ۳۰۰ درہم (ساڑھے ۷۸ تولہ چاندی کی قیمت) قرض تھا' اور اس قرض پر تین سال گزر گئے۔ اب اگر اسے ۲۰۰ درہم (ساڑھے ۵۲ تولہ چاندی کی قیمت) وصول ہوں' تو وہ ان میں سے ۵ درہم پہلے سال کی زکوٰۃ کے طور پر ادا کرے گا۔ اس کے بعد اس کے پاس ۱۹۵ درہم رہ جائیں گے' جن کے چالیس چالیس درہم کے صرف چار ٹکڑے (۴۰ x ۴۰ = ۱۶۰) بن سکیں گے اور ۳۵ درہم (۱۹۵-۱۶۰ = ۳۵) مزید بچیں گے۔ اس کے ذمہ دوسرے سال کی زکوٰۃ صرف چار درہم ہوگی جو ۱۶۰ درہم کی زکوٰۃ ہو گی۔ بقیہ ۳۵ درہم کی زکوٰۃ اس کے ذمہ نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ ۴۰ درہم سے کم ہیں اور ۴۰ درہم سے کم پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ اسی طرح تیسرے سال کی زکوٰۃ بھی وہ چار درہم ہی ادا کرے گا۔ گویا تینوں سالوں کی زکوٰۃ ۵ + ۴ + ۴ = ۱۳ درہم ادا کرے گا۔

متوسط قرض میں جب تک اس کے مالک کو بقدر نصاب یا اس سے زائد رقم وصول نہ ہو' وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کرے گا۔ لیکن جونہی اسے بقدر نصاب یا اس سے زائد رقم وصول ہو تو وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔ اس قرض میں بھی حولانِ حول یعنی سال گزرنے کا اعتبار قوی قرض کی طرح نصاب کا مالک ہو جانے کے وقت سے ہوگا نہ کہ قرض کے وصول ہونے کے

وقت سے۔

ضعیف قرض کی زکوٰۃ اس کا مالک اس وقت تک ادا نہ کرے گا جب تک اسے اس میں سے بقدر نصاب یا اس سے زائد رقم وصول نہ ہو جائے اور وصول ہو جانے کے بعد اس پر ایک سال کی مدت نہ گزر جائے۔

واضح رہے کہ یہ سب کچھ اس صورت میں ہے جب کہ قرض خواہ کے پاس قرض کے سوا کوئی دوسرا مال بقدر نصاب موجود نہ ہو۔ اور اگر اس کے پاس ایسا مال موجود ہو اور پھر اسے قرض وصول ہو' تو خواہ یہ وصول ہونے والا قرض تھوڑا ہو یا زیادہ' اور خواہ وہ قوی قرض ہو یا متوسط یا ضعیف' تو اس کا پہلے سے موجود مال میں شامل کرنا اور پھر پورے مال کی زکوٰۃ دینا ضروری ہے۔ (مختصر از رد المحتار ج ۲ ص ۳۰۵) (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۵۷۵)۔

شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک قرض کی دو قسمیں ہیں: ایک ثابت اور دوسرا غیر ثابت۔ ثابت سے مراد وہ قرض ہے جو کسی ایسے شخص کے ذمے ہو جسے اس کا اعتراف ہو اور غیر ثابت سے مراد وہ قرض ہے جو کسی ایسے شخص کے ذمے ہو' جو اس کا انکار کر رہا ہو۔ ثابت قرض پر تمام سالوں کی زکوٰۃ ضروری ہے۔ حنابلہ کے نزدیک یہ زکوٰۃ اس وقت ادا کی جائے گی' جب کہ وہ وصول ہو۔ اور شافعیہ کے نزدیک اس وقت جبکہ وہ وصول ہو سکتا ہو۔ یعنی اگر وہ ہر وقت وصول ہو سکتا ہو' تو ہر سال اس کی زکوٰۃ کا ادا کرتے رہنا ضروری ہے۔ خواہ وہ خود بقدر نصاب ہو یا دوسرے مال سے مل کر بقدر نصاب بنتا ہو۔ غیر ثابت قرض پر اس وقت تک کوئی زکوٰۃ نہیں ہے' جب تک وہ وصول نہ ہو جائے اور اس وصول ہو جانے کے بعد اس پر ایک سال نہ گزر جائے۔ اگر قرض کسی مویشی یا کھانے کی چیز (جیسے کھجور یا انگور وغیرہ) کی قیمت ہو' تو حنابلہ کے نزدیک اس کی زکوٰۃ ہے اور شافعیہ کے نزدیک نہیں ہے۔

مالکیہ کے نزدیک جو مال وراثت' ھبہ' صدقہ' مہر یا خُلع میں ملے اس پر اس وقت تک کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔ جب تک اس میں سے بقدر نصاب وصول نہ ہو جائے' اور وصول ہو جانے کے بعد اس پر ایک سال نہ گزر جائے۔ اور اگر کسی شخص نے کسی دوسرے شخص کو مال قرض دیا ہو اور وہ مقروض کے پاس کئی سال تک رہے' تو اس پر وصول ہونے کے بعد صرف ایک سال کی زکوٰۃ ہے۔ اِلّا یہ کہ اس نے قرض وصول کرنے میں زکوٰۃ سے بچنے کے لیے قصداً تاخیر کی ہو' تو اس صورت میں اس کے ذمہ تمام سالوں کی زکوٰۃ ضروری ہے۔ (مختصر از الفقہ

علی المذاہب الاربعہ ج ا ص ۵۷۵)(المغنی ج ۲ ص ۴۴۲)۔

۹۔ عورت کے مہر کی زکوٰۃ :

حنفیہ کے نزدیک عورت کا مہر اس کے شوہر کے ذمہ "قرض ضعیف" کی حیثیت رکھتا ہے' لہٰذا اس پر اس وقت تک کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔ جب تک عورت کو اس میں سے بقدر نصاب یا اس سے زائد رقم وصول نہ ہو جائے۔ اور وصول ہو جانے کے بعد اس پر ایک سال نہ گزر جائے۔ یہی مسلک مالکیہ کا بھی ہے (جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے)۔

شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک عورت کا مہر اس کے شوہر کے ذمہ "قرض" کی حیثیت رکھتا ہے' لہٰذا اگر شوہر اس کا اعتراف کرتا ہے تو جب تک عورت اپنا یہ مہر وصول نہ کرے' اس کے ذمہ اس کی زکوٰۃ ضروری ہے۔ فرق یہ ہے کہ شافعیہ کے نزدیک وہ اس کی زکوٰۃ ہر سال ادا کرے گی (جبکہ وہ اسے خود وصول نہ کر رہی ہو حالانکہ وہ وصول ہو سکتا ہو) اور حنبلیہ کے نزدیک وہ اس پر تمام سالوں کی زکوٰۃ اس وقت ادا کرے گی جب کہ وہ اسے وصول کر لے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ایضاً)(المغنی ج ۲ ص ۷۴۴)۔

۱۰۔ بنک میں رکھی ہوئی امانتوں اور پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ :

یہ دونوں چیزیں قرض کی حیثیت رکھتی ہیں۔ قرض کی زکوٰۃ کے متعلق مذاہب اربعہ کے فقہاء کی جو آراء اوپر گزر چکی ہیں ان کی رو سے :

حنفیہ کے نزدیک یہ دونوں چیزیں قوی قرض کی حیثیت رکھتی ہیں' لہٰذا ان پر تمام سالوں کی زکوٰۃ ضروری ہے' اور وہ اس وقت ادا کی جائے گی' جب ان میں سے ساڑھے ۱۰ تولہ چاندی کی قیمت یا اس سے زائد رقم وصول ہو جائے۔

حنبلیہ کے نزدیک بھی ان دونوں پر تمام سالوں کی زکوٰۃ ضروری ہے اور وہ اس وقت ادا کی جائے گی' جبکہ ان میں سے بقدر نصاب یا اس سے زائد رقم وصول ہو جائے۔

مالکیہ کے نزدیک بنک کی امانتوں پر تمام سالوں کی زکوٰۃ ضروری ہے کیونکہ یہ امانتیں ہر وقت لی جا سکتی ہیں۔ انسان ان کے لینے میں اگر تاخیر کرتا ہے تو خود کرتا ہے' البتہ یہ زکوٰۃ ان کو واپس لینے کے بعد ادا کی جائے گی۔ پراویڈنٹ فنڈ کو چونکہ انسان خود نہیں لے سکتا' لہٰذا جب وہ ملے' تو اس پر صرف ایک سال کی زکوٰۃ ضروری ہے۔ اِلّا یہ کہ اسے لیا جا سکتا

ہو، مگر اس کے لینے میں قصداً تاخیر کی جائے، تو اس صورت میں اس پر آتنے سالوں کی زکوٰۃ ضروری ہوگی جتنے سال اسے لینے میں تاخیر کی جائے گی۔

شافعیہ کے نزدیک بنک میں رکھی ہوئی امانتوں کی زکوٰۃ ہر سال ادا کی جائے گی، خواہ انسان انھیں واپس لے یا نہ لے۔ کیونکہ وہ انھیں ہر وقت لے سکتا ہے، اگر وہ انھیں نہیں لیتا، تو خود نہیں لیتا۔ پراویڈنٹ فنڈ پر بھی تمام سالوں کی زکوٰۃ ضروری ہے۔ لیکن اس کو ادا اس وقت کیا جائے گا، جبکہ پراویڈنٹ فنڈ کا لینا ممکن ہو، خواہ اس وقت اسے لیا جائے یا نہ لیا جائے۔

۱۱۔ مشترک مال (کمپنی) کی زکوٰۃ:

اگر کسی مال میں دو یا دو سے زائد آدمی شریک ہوں تو امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک ان میں سے کسی پر زکوٰۃ اس وقت تک واجب نہیں ہے، جب تک ان میں سے ہر ایک کا حصہ بقدر نصاب نہ ہو۔ امام شافعیؒ کے نزدیک مشترک مال کا حکم ایک ہی شخص کے مال کا ہے۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۳۴) (بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۲۳۳)۔

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "پانچ اوقیہ (ساڑھے ۵۲) تولہ سے کم چاندی پر زکوٰۃ نہیں ہے" سے یہ چیز واضح نہیں ہوتی کہ آیا یہ حکم صرف اس وقت ہے جبکہ مال ایک ہی شخص کی ملکیت ہو یا اس وقت بھی یہی حکم ہے جبکہ مال میں کئی آدمی شریک ہوں۔ بعض ائمہ نے اس پر پہلی صورت کا حکم لگایا ہے اور بعض نے دوسری کا۔ (بدایۃ المجتہد ایضاً)۔ (نقدی کے نصاب کی بحث آگے آرہی ہے۔)

۱۲۔ زکوٰۃ کے فرض ہو جانے کے بعد لیکن اس کے ادا کرنے سے پہلے اگر مال ضائع ہو جائے؟

اگر کسی مال پر زکوٰۃ واجب ہو چکی ہو، لیکن اس سے پہلے کہ اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے، وہ مال ضائع ہو جائے، تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس کی زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی، اور اگر پورا مال ضائع نہیں ہوا بلکہ اس کا کچھ حصہ ضائع ہوا ہے، تو اس کی زکوٰۃ ضائع شدہ حصہ کے مطابق ساقط ہوگی۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور بعض دوسرے فقہاء کے نزدیک اگر مال اس وقت ضائع ہوا ہے جبکہ اس کا مالک زکوٰۃ ادا نہ کر سکتا تھا، تو اس کی زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی اور اگر وہ اس

وقت ضائع ہوا ہے جبکہ اس کا مالک زکوٰۃ ادا کر سکتا تھا تو اس کی زکوٰۃ ساقط نہ ہو گی۔ ایک روایت میں امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ لیکن دوسری روایت میں ان کا مسلک یہ ہے کہ مال کے ضائع ہو جانے سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہو گی' خواہ مال کوتاہی سے ضائع ہوا ہو یا بغیر کوتاہی کے۔ امام ابن حزمؒ نے بھی اسی مسلک کو ترجیح دی ہے۔

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ جن حضرات کے نزدیک زکوٰۃ مال پر ہے' ان کے نزدیک مال کے ضائع ہو جانے سے اس کی زکوٰۃ بھی ساقط ہو جاتی ہے اور جن حضرات کے نزدیک زکوٰۃ مال پر نہیں بلکہ اس کے مالک پر ہے' ان کے نزدیک زکوٰۃ اس شخص کے ذمہ بہر حال واجب ہے' خواہ اس کا مال ضائع ہو جائے۔ (المغنی ج ۲ ص ۵۳۹) (المحلی) (رد المختار ج ۲ ص ۴۰)۔

۱۳۔ اگر زکوٰۃ نکال لینے کے بعد لیکن ادا کرنے سے پہلے ضائع ہو جائے؟

اگر کسی شخص نے اپنے مال کی زکوٰۃ نکالی' لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے ادا کرے وہ ضائع ہو گئی' تو امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے شاگردوں کے نزدیک وہ شخص اپنے بقیہ مال کی دوبارہ زکوٰۃ نکالے گا' لیکن اگر بقیہ مال نصاب سے کم ہو چکا ہو' تو اس پر زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی۔ خواہ اس نے زکوٰۃ کی حفاظت میں کوتاہی کی ہو یا نہ کی ہو۔ امام مالکؒ کے نزدیک وہ اپنے بقیہ مال کی زکوٰۃ بالاقساط ادا کرے گا خواہ یہ بقیہ مال کم ہی رہ گیا ہو۔ امام احمدؒ' زہریؒ' حمادؒ' سفیان ثوریؒ اور ابو عبیدؒ کے نزدیک اس شخص سے زکوٰۃ کسی حال میں ساقط نہ ہو گی۔ یہی امام شافعیؒ کا بھی مذہب ہے' لیکن ان کے نزدیک اگر اس شخص نے زکوٰۃ کے نکالنے اور اس کی حفاظت کرنے میں کوتاہی نہ کی ہو' تو اس کے بقیہ مال کو دیکھا جائے گا۔ اگر وہ نصاب کے برابر ہو' تو اس سے زکوٰۃ لی جائے گی' ورنہ نہیں۔ (المغنی ج ۲ ص ۵۴۲)۔

۱۴۔ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے حیلہ بازی کی مذمت:

اگر کسی شخص پر زکوٰۃ واجب ہونے کے قریب ہو' لیکن اس سے پہلے کہ وہ واجب ہو' وہ کوئی ایسا حیلہ کرے جس سے بظاہر اس پر زکوٰۃ واجب نہ رہے (جیسے یہ کہ وہ اپنے مال میں سے اتنا حصہ ضائع کر دے کہ وہ نصاب سے کم رہ جائے' یا وہ اسے دوسرے کے نام ھبہ کر دے یا اسے فروخت کر دے) تو امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک اس سے زکوٰۃ نہیں لی

جائے گی۔ اگرچہ وہ گنہگار ہوگا۔ امام احمدؒ، مالکؒ، اوزاعیؒ، اسحاق اور ابو عبیدؒ کے نزدیک اس سے زکوٰۃ بہر حال وصول کی جائے، الا یہ کہ اس نے سال کے شروع ہی میں اسے فروخت کر دیا ہو، تو پھر اس سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جائے گی کیونکہ اس وقت ضروری نہیں کہ اس نے زکوٰۃ سے بچنے ہی کے لیے ایسا کیا ہو۔ (المغنی ج ۲ ص ۵۳۴)۔

۱۵۔ میت کے مال کی زکوٰۃ:

اگر کوئی شخص مر جائے حالانکہ اس پر زکوٰۃ واجب ہو چکی ہو لیکن اس نے ادا نہ کی ہو، تو امام عطاء، حسن بصریؒ، مالکؒ، شافعی، احمد بن حنبلؒ اور بعض دوسرے فقہاء کے نزدیک زکوٰۃ اس شخص کے ترکہ سے وصول کی جائے گی، خواہ اس نے اس کی وصیت کی ہو یا نہ کی ہو۔ ان کے نزدیک زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کا انسان کے ذمہ قرض ہے لہٰذا جس طرح قرض کا میت کے ترکہ سے ادا کرنا ضروری ہے اسی طرح زکوٰۃ کا ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

امام ابن سیرینؒ، شعبیؒ، ابراہیم نخعیؒ، سفیان ثوریؒ، امام ابو حنیفہؒ آپ کے شاگردوں اور بعض دوسرے فقہاء کے نزدیک میت کے ترکہ سے زکوٰۃ اس وقت وصول کی جائے گی، جبکہ اس نے اس کی وصیت کی ہو۔ اگر اس نے اس کی وصیت نہ کی ہو تو اسے اس کے ترکہ سے وصول نہ کیا جائے گا۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ زکوٰۃ قرض نہیں بلکہ عبادت ہے اور عبادت میں جب تک نیت نہ ہو، اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ (المغنی ج ۲ ص ۴۲۶)۔

۱۶۔ کیا زکوٰۃ کے فرض ہونے کے لیے شرط ہے کہ انسان اسے ادا کر سکتا ہو؟

امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک زکوٰۃ کے واجب ہونے کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ انسان اسے ادا کر سکتا ہو۔ امام مالکؒ کے نزدیک یہ شرط ہے۔ امام شافعیؒ سے ان دونوں مسلکوں کی دو مختلف روایتیں ہیں۔ (المغنی ج ۲ ص ۵۳۹)۔

وہ اموال جن پر زکوٰۃ فرض ہے

حدیث میں جن چیزوں کی زکوٰۃ کا ذکر ہے' ان کی پانچ قسمیں ہیں :

(۱) سونا اور چاندی (نقدی)

(۲) مال تجارت

(۳) زرعی پیداوار

(۴) مویشی

(۵) کان اور دبے ہوئے خزانے

ذیل میں ہم ان سب کا الگ الگ ذکر کریں گے :

ا۔ سونا چاندی (نقدی)

ا۔ چاندی کا نصاب اور شرح زکوٰۃ :

اس بارے میں اجماع ہے کہ چاندی کا نصاب پانچ اوقیہ (۲۰۰ درہم ساڑھے ۵۲ تولہ)[۱] اور شرح زکوٰۃ ساڑھے ۲ فیصد (چالیسواں حصہ) ہے۔ یعنی اگر کسی شخص کے پاس ساڑھے ۵۲ تولہ چاندی ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے' تو اس پر اس کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "پانچ اوقیہ سے کم چاندی پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔" (مسلم)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "میں نے تمہیں گھوڑوں اور غلاموں کی زکوٰۃ معاف کر دی ہے۔ لیکن چاندی کی زکوٰۃ ادا کرو۔ ہر چالیس درہموں پر ایک ایک درہم زکوٰۃ ہے۔ ایک سو نوے درہموں تک کوئی زکوٰۃ نہیں' لیکن جب وہ دو سو درہم ہو جائیں' تو ان پر پانچ درہم زکوٰۃ ہے۔" (احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)۔

ا۔ تمام علمائے حدیث و فقہ اور علمائے لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ ایک اوقیہ کا وزن چالیس درہم اور دس درہم کا وزن سات مثقال کے برابر ہے (شرح مسلم للنووی)۔ مثقال کا وزن ہمارے ہاں کے لحاظ سے ساڑھے ۴ ماشہ ہے۔ لہٰذا ۲۰۰ درہم کا وزن ساڑھے ۵۲ تولہ ہوا۔

اس بارے میں اجماع ہے کہ درہموں پر زکوٰۃ وزن کے لحاظ سے ہے نہ کہ تعداد کے لحاظ سے (نیل الاوطار ج ۴ ص ۱۷)۔

۲۔ سونے کا نصاب اور شرح زکوٰۃ :

جمہور (اکثریت سلف) کے نزدیک سونے کا نصاب بیس ۲۰ دینار (۲۰ مثقال = ساڑھے ۷ تولہ)[1] ہے اور شرح زکوٰۃ اڑھائی فیصد (چالیسواں حصہ) ہے۔ یعنی اگر کسی شخص کے پاس ساڑھے ۷ تولہ سونا ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے' تو اس پر اس کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم پر سونے میں اس وقت تک کوئی زکوٰۃ نہیں ہے' جب تک وہ بیس دینار (بیس مثقال) نہ ہو جائے۔ اگر تمھارے پاس بیس دینار سونا ہو اور اس پر ایک سال گزر چکا ہو' تو اس کی نصف دینار (یعنی چالیسواں حصہ) زکوٰۃ ادا کرو۔ " (ابو داؤد)

عمرو بن شعیب اپنے والد اور دادا کے ذریعے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "بیس مثقال سے کم سونے پر کوئی زکوٰۃ نہیں اور دو سو درہم سے کم چاندی پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ " (ابو عبید)

حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیس دینار اور اس سے زائد سونے پر نصف دینار اور چالیس دینار سونے پر ایک دینار زکوٰۃ وصول فرمایا کرتے تھے۔ (ابن ماجہ)

سونے کے نصاب کے متعلق یہ سب روایات سند کے لحاظ سے ضعیف ہیں (نیل الاوطار)۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں' جمہور کا مسلک ان ہی کے مطابق ہے۔ سونے کی زکوٰۃ میں اصل اعتبار اس کے وزن کا ہو گا نہ کہ اس کی قیمت کا۔[2]

۱۔ اس بارے میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ایک دینار کا وزن ایک مثقال ہے لہذا بیس دینار کا وزن بیس مثقال ہوا اور ۲۰ مثقال کا (حساب ایک مثقال = ساڑھے ۴ ماشہ) ساڑھے ۷ تولہ۔

۲۔ سونے کے نصاب کے متعلق یہ روایات چونکہ سب ضعیف ہیں' اس لیے سلف میں امام عطاءؒ' طاؤسؒ' زہریؒ' سلیمان بن حربؒ اور ایوب سختیانیؒ کا مسلک یہ ہے کہ سونے کا اپنا کوئی نصاب نہیں ہے۔ جب بھی سونا ساڑھے ۵۲ تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو جائے اس پر زکوٰۃ فرض ہو جائے گی۔ (المغنی ج ۲ ص ۵۹۹)

اس بارے میں اتفاق ہے کہ اگر سونا اور چاندی کسی دوسری دھات سے ملے ہوئے ہوں' تو زکوۃ ان کی خالص مقدار پر ہو گی۔ نیز اس بارے میں بھی اتفاق ہے کہ سونے اور چاندی میں ان کے مضروب (سکوں کی شکل میں) ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اصل اعتبار ان کے وزن کا ہو گا۔ (المغنی ج ۲ ص ۵۹۹)۔

۳۔ سونے اور چاندی میں مقدار نصاب سے زائد کی زکوۃ:

سونے اور چاندی کی جو مقدار نصاب سے زیادہ ہو' اس پر اڑھائی فیصد کے حساب سے زکوۃ وصول کی جائے گی' خواہ یہ مقدار کم ہو یا زیادہ۔

حضرت علیؓ کی اوپر والی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں "اور جو مقدار اس سے (یعنی نصاب سے) زیادہ ہو' اس پر اسی (یعنی ۲ ۱/۲ فیصد) حساب سے زکوۃ ہو گی۔" (دارقطنی' اثرم)۔

ان الفاظ کے متعلق اگرچہ یہ اختلاف ہے کہ آیا یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں یا حضرت علیؓ کے' لیکن سلف میں سے اکثر اہل علم کا عمل ان ہی کے مطابق ہے۔[۱] (معالم السنن ج ۲ ص ۱۷۳)۔

۴۔ جب کہ سونا اور چاندی الگ الگ ہوں اور ان میں سے ہر ایک اپنے نصاب سے کم ہو:

حدیث میں سونے اور چاندی کے نصاب کا اور زکوۃ کا الگ الگ بیان ہوا ہے۔ ائمہ

۱۔ علمائے سلف میں سے یہ مسلک حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ' ابراہیم نخعیؒ' مالکؒ' سفیان ثوریؒ' شافعیؒ' ابن ابی لیلیٰؒ' ابو یوسفؒ' محمدؒ' ابو ثورؒ' ابن منذرؒ' ابو عبیدؒ اور احمد بن حنبلؒ کا ہے۔ صحابہ میں سے یہی مسلک حضرت عمرؓ اور علیؓ سے مروی ہے اور کسی صحابی سے اس کی مخالفت ثابت نہیں ہے۔ اس کے برعکس سعید بن مسیبؒ' عطاءؒ' طاؤسؒ' حسن بصریؒ' شعبیؒ' مکحولؒ' زہریؒ' عمرو بن دینارؒ اور امام ابو حنیفہؒ اور زفرؒ کا مسلک یہ ہے کہ جو سونا اپنے نصاب (یعنی ۲۰ دینار = ساڑھے ۷ تولہ) سے زیادہ ہو' اس پر اس وقت تک کوئی زکوۃ نہیں' جب تک وہ چار دینار (ڈیڑھ تولہ) نہ ہو جائے' اور جو چاندی اپنے نصاب (۲۰۰ درہم = ساڑھے ۵۲ تولہ) سے زیادہ ہو اس پر اس وقت تک کوئی زکوۃ نہیں' جب تک وہ ۴۰ درہم (ساڑھے ۱۰ تولہ) نہ ہوئے۔

کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس چاندی بھی ہو اور سونا بھی' لیکن دونوں نصاب سے کم ہوں' تو وہ شخص دونوں کو ملا کر زکوٰۃ ادا کرے گا یا نہیں؟"[1]

۵۔ دھات اور کاغذ کے سکوں کی زکوٰۃ :

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نقدی کے طور پر سونا اور چاندی (بشکل دینار و درہم) استعمال ہوتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں دھات اور کاغذ کے سکے سونے اور چاندی کے قائم مقام ہو گئے ہیں اور انہیں ہر وقت سونے اور چاندی سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا جب کسی شخص کے پاس دھات یا کاغذ کے سکوں کی اتنی مقدار ہو جائے جس سے سونے یا چاندی کا نصاب پورا ہو جاتا ہو اور اس پر ایک سال گزر چکا ہو' تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔"[2]

ان کا استدلال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عام ارشاد سے ہے کہ "ہر چالیس درہم پر ایک درہم زکوٰۃ ہے۔" نیز حضرت معاذؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب چاندی دو سو درہم ہو جائے تو اس پر پانچ درہم زکوٰۃ ہے۔ اس کے بعد اس پر کوئی زکوٰۃ نہیں' یہاں تک کہ وہ ۴۰ درہم ہو جائے۔" (ردالمحتار)

پہلے مسلک والوں کے نزدیک یہ حدیث اس کے ایک راوی جراح بن منہال کی وجہ سے ضعیف اور ناقابل حجت ہے۔ امام مالکؒ اور دار قطنی فرماتے ہیں "یہ شخص انتہائی جھوٹا (دجال) تھا۔" (المغنی ج ۲ ص ۶۰۲) (معالم السنن ج ۲ ص ۱۷۳) (ہدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۲۳۲) (ردالمحتار ج ۲ ص ۳۱)۔

۱۔ امام شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ' ابن ابی لیلیٰؒ اور ابو عبیدؒ کے نزدیک سونا اور چاندی دو الگ الگ جنس ہیں' اس لیے زکوٰۃ کے لیے دونوں کا ملانا صحیح نہیں ہے۔ اس کے برعکس امام مالکؒ' اوزاعیؒ' سفیان ثوریؒ' امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے اصحاب کے نزدیک مندرجہ بالا صورت میں سونے اور چاندی کو ملایا جائے گا اور اس طرح ملا کر اگر دونوں میں سے ایک کا نصاب پورا ہو جائے' تو ان کی زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ سونا اور چاندی دراصل ایک ہی جنس ہیں اور دونوں مل کر نقدی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (معالم السنن ج ۲ ص ۱۷۴) (ہدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۲۳۳)۔

۲۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں حنابلہ کا یہ مسلک بیان کیا گیا ہے کہ "پہلے نوٹوں کا سونا یا چاندی حاصل کی جائے اور پھر اگر اس پر ایک سال گزر جائے' تو اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے"۔ لیکن غالباً اب حنبلی علماء بھی نوٹوں کی زکوٰۃ کے قائل ہو گئے ہیں۔ کیونکہ پہلے اسی وجہ سے سعودی عرب (جہاں کی حکومت حنبلی مذہب رکھتی ہے) میں نوٹ جاری نہ کیے جاتے تھے' اور اب وہاں بھی نوٹ جاری ہو گئے ہیں)۔

۶۔ عورت کے زیور کی زکوٰۃ :

موتی۔ یاقوت اور دوسرے تمام جواہر' کپڑوں اور دوسرے سامان (جیسے گھر کے برتن) پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے' جبکہ وہ محض استعمال اور زینت کے لیے ہوں۔ لیکن اگر وہ تجارت کے لیے ہوں' تو ان پر زکوٰۃ سب کے نزدیک ضروری ہے (نیل الاوطار' الفقہ علی المذاہب الاربعہ وغیرہ)۔

عورت کے سونے اور چاندی کے زیور پر زکوٰۃ ضروری ہے' جبکہ اس کا وزن بقدر نصاب یا اس سے زیادہ ہو اور اس پر ایک سال گزر چکا ہو۔

عمرو بن شعیب اپنے والد کے ذریعے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس کے ساتھ اس کی ایک لڑکی تھی' جس کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن تھے۔ آپ نے اس سے دریافت فرمایا۔ "تم اس کی زکوٰۃ دیتی ہو؟" اس نے کہا "نہیں"۔ فرمایا "کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ اللہ قیامت کے روز تمہیں ان کے بدلے آگ کے کنگن پہنائے؟" (ابو داؤد' ترمذی' نسائی)

حضرت اُمّ سلمہؓ سے روایت ہے کہ میں سونے کے کنگن پہنے ہوئے تھی۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ "اے اللہ کے رسولؐ! کیا یہ کنگن کنز (جمع کیا ہوا خزانہ جس کی زکوٰۃ نہ دینے والوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں وعید فرمائی ہے) کی تعریف میں آتے ہیں؟" فرمایا۔ "اگر تم نے ان کی زکوٰۃ دے دی تو یہ کنز نہیں ہیں۔" (ابو داؤد' دار قطنی)۔

اس بارے میں بعض دوسری احادیث بھی ہیں جن کی سند پر اگرچہ بعض محدثین نے کلام کیا ہے لیکن اکثر مُحَدِّثین نے انہیں قوی (قابل حجت) قرار دیا ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۱۱) [1]

---

[1] یہ اکثر صحابہؓ' تابعین' اور محدثین کا مسلک ہے۔ صحابہؓ میں سے حضرت عمرؓ' عائشہؓ' عبداللہ بن عمرؓ' عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ سے اس کی روایات ملتی ہیں' اور یہی مسلک عبداللہ بن مبارک' سفیان ثوریؒ' امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے شاگردوں کا ہے۔ (ترمذی' تحفۃ الاحوذی)

صحابہ میں سے حضرت عائشہؓ' عبداللہ بن عمرؓ (دوسری روایتوں میں) اور جابرؓ کے نزدیک

۲۔ مالِ تجارت

ا۔ مالِ تجارت پر زکوٰۃ کا حکم :

مال تجارت پر زکوٰۃ فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے " يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ (اے ایمان والو! اپنی نیک کمائی میں سے خرچ کرو۔")

حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حکم دیا کرتے تھے کہ جو مال ہم تجارت کے لیے تیار کریں' اس کی زکوٰۃ نکالیں۔ (ابوداؤد' بیہقی)

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اونٹوں پر زکوٰۃ ہے۔ بھیڑوں پر زکوٰۃ ہے گائیوں پر زکوٰۃ ہے' اور تجارت کے کپڑے پر زکوٰۃ ہے"۔

(ابوداؤد' بیہقی' دارقطنی)

عورت کے زیور پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اور یہی مسلک امام مالکؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ اور اسحاقؒ کا ہے۔ (ترمذی)

یہ حضرات عورت کے زیور کو موتی' یاقوت اور دوسرے جواہر کے حکم میں مانتے ہیں۔ اوپر جن احادیث میں زیور پر زکوٰۃ کے ضروری ہونے کا ذکر ہے' انھیں یہ سند کے لحاظ سے قابل حجت قرار نہیں دیتے' اور قابل حجت قرار دینے پر ان کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ ان میں نفل صدقہ کی ترغیب دی گئی ہے یا یہ کہ زیور کا حکم شروع زمانہ میں تو تھا لیکن بعد میں منسوخ ہو گیا یا یہ کہ ان میں زاید از ضرورت زیور پر زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے۔ نیز ان کا استدلال حضرت جابرؓ کی اس روایت سے بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "زیور پر زکوٰۃ نہیں ہے"۔ (ابن الجوزی)۔ لیکن امام بیہقیؒ اور دوسرے علمائے حدیث نے اس روایت کو انتہائی ضعیف اور بے بنیاد قرار دیا ہے۔

صحابہ میں سے حضرت انسؓ اور اسماء بنت ابی بکرؓ کے نزدیک عورت کے زیور پر صرف ایک مرتبہ زکوٰۃ واجب ہے۔ دوسری روایت میں حضرت انسؓ کے نزدیک عورت کے زیور کی زکوٰۃ یہ ہے کہ اسے پہننے کے لیے کسی دوسری عورت کو مستعار دے دیا جائے۔ (سبل السلام ج ۲)(تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۱۱)

واضح رہے کہ یہ سارا اختلاف صرف اس زیور کے متعلق ہے جس کا پہننا عورت کے لیے جائز ہو اور وہ اسے استعمال میں لاتی ہو۔ باقی رہا وہ زیور جس کا پہننا عورت کے لیے جائز ہی نہ ہو یا جسے اس نے مال جمع کرنے کی غرض سے بنا کر رکھ چھوڑا ہو' تو اس پر زکوٰۃ سب کے نزدیک ضروری ہے۔

(بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۲۲۲)۔

مال تجارت کی زکوٰۃ کے متعلق اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف یہی دو حدیثیں مروی ہیں اور ان کی سند کو بھی کسی محدث نے صحیح قرار نہیں دیا۔ اکثر اسے حسن (صحیح اور ضعیف کے درمیان) کہتے ہیں' اور حافظ ابن حجرؒ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے' لیکن سوائے ظاہریہ [1] کے سب کے نزدیک مال تجارت پر زکوٰۃ اڑھائی فیصد شرح کے ساتھ) واجب ہے۔ [2] اسی کی روایت حضرت عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ سے بھی ملتی ہے اور دوسرے صحابہ میں کسی سے اس بارے میں اختلاف ثابت نہیں ہے۔

عمرو بن حماس اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں چمڑا اور تیر فروخت کرتا تھا۔ (ایک دن) حضرت عمرؓ میرے پاس سے گزرے اور مجھ سے فرمایا "اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرو۔" میں نے کہا۔ "اے امیر المومنین! میرے پاس یا تو چمڑا ہے یا تیر۔" فرمایا۔ "ان کی قیمت لگاؤ [3] اور پھر ان کی زکوٰۃ ادا کرو۔" (مسند امام شافعیؒ' ابو عبیدؒ' دار قطنی' بیہقیؒ' عبدالرزاقؒ' احمد بن حنبلؒ (المغنی ج ۲ ص ۶۲۲)۔

۱۔ ظاہریہ چونکہ کسی حال میں ضعیف روایت کو قابل حجت نہیں مانتے' اس لیے ان کے نزدیک مال تجارت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اس کے برعکس ان کا استدلال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عام حدیث سے ہے۔ "میں نے تمہیں گھوڑوں اور غلاموں کی زکوٰۃ معاف کر دی ہے۔" یعنی خواہ وہ تجارت ہی کے لیے کیوں نہ ہوں۔ لیکن جمہور اس حدیث کا یہ مطلب نہیں لیتے۔ ان کے نزدیک گھوڑوں اور غلاموں پر زکوٰۃ اس وقت نہیں ہے جبکہ وہ استعمال کے لیے ہوں۔ لیکن اگر وہ تجارت کے لیے ہوں تو ان پر بھی زکوٰۃ واجب ہے (المغنی ج ۲ ص ۶۲۳)

۲۔ امام مالکؒ تاجر کی دو قسمیں کرتے ہیں۔ ایک مدیر جو اپنا مال فروخت کرتا اور پھر نیا مال خریدتا رہتا ہے۔ دوسرا محتکر جو اپنا مال روک کے رکھتا ہے' اور سالہا سال تک فروخت نہیں کرتا۔ پہلی قسم کے تاجر پر تو امام مالکؒ کے نزدیک ہر سال زکوٰۃ واجب ہے۔ لیکن دوسری قسم کے تاجر پر اس وقت تک زکوٰۃ نہیں ہے جب تک وہ اپنے مال میں سے کم از کم بقدر نصاب فروخت نہیں کرتا۔ جب وہ اس میں سے کم از کم بقدر نصاب فروخت کر لے' تو اس کے پورے مال پر صرف ایک سال کی زکوٰۃ واجب ہے۔"

دوسروں کے نزدیک تاجر کی یہ دو قسمیں نہیں ہیں۔ (کتاب الاموال لابی عبید' ص ۴۲۷) (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا ص ۵۸۲)۔

۳۔ قیمت لگاؤ کے ان الفاظ کی بنا پر حنبلیہ کے نزدیک مال تجارت کی زکوٰۃ میں قیمت ہی وصول کی جائے گی' نہ کہ مال۔ حنفیہ کے نزدیک قیمت بھی وصول کی جا سکتی ہے اور مال بھی۔ شافعیہ کے نزدیک مویشیوں اور پھلوں میں تو مال ہی لینا ضروری ہے۔ دوسری چیزوں میں مال لینا بہتر ہے' لیکن اگر قیمت ہی مل سکتی ہو' تو وہ بھی لی جا سکتی ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا ص ۵۸۰) (المغنی ج ۲ ص ۶۲۳)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مندرجہ بالا دو روایتوں کے علاوہ جمہور کا استدلال قیاس سے بھی ہے' کیونکہ قیاس کا تقاضا ہے کہ جس طرح ہر نامی (بڑھنے والے) مال جیسے سونا' چاندی اور مویشی وغیرہ پر زکوٰۃ فرض ہے' اسی طرح تجارت کے مال پر بھی زکوٰۃ فرض ہونی چاہیے۔" (ہدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۲۴۳)۔

۲۔ مال تجارت کا نصاب' شرح زکوٰۃ اور اس پر ایک سال گزرنے کی شرط:

جمہور (جو مال تجارت پر زکوٰۃ فرض مانتے ہیں' کے نزدیک اس کا نصاب اور شرح زکوٰۃ' نقدی ہی کا نصاب' اور شرح زکوٰۃ اڑھائی فیصد ہے۔ یعنی یہ کہ اس کی قیمت کم از کم ساڑھے ۵۲ تولہ چاندی یا ساڑھے ۷ تولہ سونا کی قیمت کے برابر ہو۔ نیز اس پر بھی ایک سال گزر جانے کی شرط ضروری ہے' جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ [1] (المغنی ج ۲ ص ۶۲۶)

۳۔ سال کے دوران نفع یا دوسرا اضافہ:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "من استفاد مالا فلا زكوٰة عليه حتى يحول عليه الحول" "جو شخص (سال کے دوران) کوئی مال پائے' اس پر اس وقت تک کوئی زکوٰۃ نہیں' جب تک اس پر ایک سال نہ گزر جائے۔ [2] (ترمذی)

۱۔ مذاہب اربعہ میں ایک سال گزر جانے" کی تفصیل کے لیے دیکھیے حاشیہ صفحہ ۲۹

۲۔ سال کے دوران حاصل ہونے والے مال کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ وہ اس مال کا ہم جنس ہو' جو پہلے سے موجود ہے۔ دوسری یہ کہ اس کی جنس پہلے سے موجود ہونے والے مال سے مختلف ہو۔ دوسری صورت میں سب کے نزدیک دونوں کو ملایا نہیں جائے گا۔ پہلی صورت کی پھر دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اصل مال ہی سے حاصل ہوا ہو جیسے نفع یا مویشیوں کے بچے۔ اس کو سب کے نزدیک اصل مال میں ملایا جائے گا۔ اور سال کے آخر میں پورے مال کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ دوسری یہ کہ وہ کسی دوسرے ذریعہ جیسے وراثت یا ہبہ وغیرہ سے حاصل ہوا ہو۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس صورت میں بھی اسے اصل مال سے ملایا جائے گا۔ اور سال کے آخر میں پورے مال کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ لیکن امام مالکؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ

۴۔مال تجارت کی زکوٰۃ کے لیے تجارت کی نیت :

کسی مال کا مال تجارت قرار پانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے مالک کی نیت اس سے تجارت کرنے کی ہو۔[۱] رہا وہ سامان جو ذاتی استعمال کے لیے ہو اور اس سے تجارت مقصود نہ ہو (جیسے گھر' کپڑے 'کتابیں' برتن وغیرہ) تو اس پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔

اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے (المغنی وغیرہ)

۳۔زرعی پیداوار

ا۔حکم :

زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ قرآن' سنت اور اجماع امت تینوں کی رو سے فرض ہے
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

کے نزدیک نہیں ملایا جائے گا۔ بلکہ اس کی زکوٰۃ اس وقت الگ دی جائے گی' جب اس پر ایک سال گزر جائے۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۸) (الکوکب الدری ج ۱ ص ۲۴۷) (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۵۸۴'۵۸۵)۔

۱۔ حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک نیت کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان اس سے عملاً تجارت شروع بھی کر دے۔ اگر کسی شخص نے کوئی مال تجارت کی نیت سے خریدا' تو اس کی نیت کا اصل اعتبار اس وقت سے ہو گا اور اسی وقت سے اس کے سال کی ابتدا بھی ہو گی جب وہ اس سے عملاً تجارت شروع کر دے گا۔ اور اگر ایسی صورت پیش آئے کہ وہ شخص اپنے مال کا تبادلہ کسی دوسرے مال سے کر لے تو اس کی نیت برقرار رہے گی خواہ تبادلہ کرتے وقت وہ نئے مال سے تجارت کی نیت کرے یا نہ کرے۔ ہاں اگر وہ یہ نیت کر لے کہ نئے مال سے تجارت نہیں کرے گا تب وہ تجارت کے لیے نہیں ہو گا۔
شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک تجارت کے عملاً شروع کرنے کی شرط ضروری نہیں' بلکہ جس وقت بھی کوئی شخص کسی مال سے تجارت کی نیت کر لے' اسی وقت سے اس کے سال کی ابتدا ہو جائے گی۔
(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۵۸۴۔۵۷۹)۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَنفِقُوا۟ مِن طَيِّبَٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ ٱلْأَرْضِ۔ (البقرۃ: ۲۶۷)

اے ایمان والو! جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمہارے لیے نکالا ہے' اس میں سے بہتر حصہ (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَءَاتُوا۟ حَقَّهُۥ يَوْمَ حَصَادِهِۦ۔ (الانعام: ۱۴۱)

اور فصل کٹنے کے روز (ان باغات کی پیداوار میں سے) اللہ کا حق ادا کرو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جو زمین آسمان یا قدرتی چشموں سے سیراب ہو یا وہ بعل ــــ (جو اوس اور اپنے اندر کے پانی سے خود بخود سیراب ہوتی ہو) ہو' اس پر عشر (دسواں حصہ) زکوٰۃ ہے اور جو زمین (مصنوعی ذریعوں سے) سیراب کی جاتی ہو' اس پر نصف عشر (بیسواں حصہ) زکوٰۃ ہے۔" (بخاری' ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ)

۲۔ زمین کی کس پیداوار پر زکوٰۃ فرض ہے:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زمین کی پیداوار میں سے صرف چار چیز "گندم' جو' کھجور' اور کشمش" پر زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی۔

عمرو بن شعیب اپنے والد کے ذریعے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت صرف چار چیزوں کی زکوٰۃ وصول کرنا ہے۔ گندم' جو' کھجور اور کشمش۔" (دارقطنی)۔

ابن ماجہ کی روایت میں ایک پانچویں چیز ذرہ کا بھی اضافہ ہے' لیکن یہ روایت سند کے لحاظ سے ضعیف ہے۔ چنانچہ گندم' جو' کھجور اور کشمش پر زکوٰۃ سب کے نزدیک واجب ہے (نیل الاوطار)۔

سبزیوں پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی زکوٰۃ وصول نہیں کی جاتی تھی۔

عطاء بن سائب سے روایت ہے کہ عبداللہ بن مغیرہؓ نے ابو موسیٰ بن طلحہؓ کی زمین سے اگی ہوئی سبزیوں پر زکوٰۃ وصول کرنا چاہی' تو موسیٰ بن طلحہؓ نے ان سے کہا کہ آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ ان پر (یعنی سبزیوں پر) کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔" (دارقطنی' حاکم' اثرم)

یہ روایت اگرچہ مُرسل ہے' لیکن بہت سی دوسری روایتوں سے مل کر قوی (قابل حجت) بن جاتی ہے۔ چنانچہ علمائے سلف کی اکثریت کے نزدیک سبزیوں پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔ [1] (نیل الاوطار ج ۴ ص ۱۲۱۔ المغنی)۔

۱۔ زمین کی پیداوار کے متعلق سلف میں جو اختلاف ہے' وہ صرف یہ ہے کہ آیا زکوٰۃ صرف ان چار چیزوں تک محدود ہے یا ان میں کوئی ایسی وجہ پائی جاتی ہے' جو اگر زمین کی کسی دوسری پیداوار میں بھی پائی جائے' تو اس پر بھی زکوٰۃ فرض ہو گی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ' موسیٰ بن طلحہؒ' حسن بصریؒ' ابن سیرینؒ' شعبیؒ' حسن بن صالحؒ' عبداللہ بن مبارکؒ' ابن ابی لیلیٰؒ' ابو عبیدؒ اور ابن حزمؒ کے نزدیک زمین کی پیداوار میں سے صرف ان ہی چار چیزوں پر زکوٰۃ فرض ہے۔ قاضی شوکانیؒ اور امیر محمد بن اسماعیل (صاحب سبل السلام) نے اسی مسلک کو ترجیح دی ہے۔ ان کا استدلال حضرت ابو موسیٰؓ اور معاذؓ کی اس روایت سے بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یمن کی طرف روانہ کیا تاکہ وہاں جا کر لوگوں کو دین کی باتیں سکھائیں اور انہیں حکم دیا کہ چار چیزوں "گندم' جو' کھجور اور کشمش" کے علاوہ کسی اور چیز پر زکوٰۃ وصول نہ کریں۔" (دار قطنی)۔ لیکن امام بخاریؒ اور دوسرے محدثین نے اسے نہایت ضعیف قرار دیا ہے۔ (التعلیقات السلفیہ علی سنن النسائی ج ۱ ص ۲۸۱)۔

دوسروں کے نزدیک زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ ان ہی چار چیزوں تک محدود نہیں ہے' کیونکہ ان میں ایسی وجہ پائی جاتی ہے' جو اگر دوسری چیزوں میں بھی پائی جائے تو ان پر بھی زکوٰۃ فرض ہو گی۔ (ہدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۲۳۱)۔ چنانچہ:

امام مالکؒ اور شافعیؒ کے نزدیک زمین کی اسی پیداوار پر زکوٰۃ فرض ہے جس کا خشک ہونے کے بعد خوراک کے لیے ذخیرہ کیا جاتا ہو چنانچہ ان کے نزدیک پھلوں میں سوائے کھجور اور کشمش کے کسی پھل پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔ سبزیوں پر بھی ان کے نزدیک زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

امام احمدؒ' ابو یوسفؒ اور محمدؒ کے نزدیک زمین کی اس پیداوار پر زکوٰۃ فرض ہے جس کا خشک ہونے کے بعد ذخیرہ کیا جاتا ہو' خواہ وہ غذا کے کام آتی ہو یا نہ آتی ہو۔ چنانچہ ان کے نزدیک تمام خشک میووں پر زکوٰۃ فرض ہے۔ سبزیوں پر زکوٰۃ ان کے نزدیک بھی فرض نہیں ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے اسی مسلک کو ترجیح دی ہے۔ (المغنی' نیل الاوطار' ہدایۃ المجتہد)۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک زمین کی ہر پیداوار پر زکوٰۃ واجب ہے۔ بشرطیکہ اس کی کاشت سے زمین کو ترقی دینے اور اسے مزید کاشت کے لیے مفید بنانے کا مقصد پیش نظر رہتا ہو۔ اس لحاظ سے زمین سے اگنے

۳۔ غلوں اور پھلوں کا نصاب :

جمہور کے نزدیک غلوں اور پھلوں کا نصاب پانچ وسق [1] ہے :

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "پانچ وسق (غلوں اور پھلوں) سے کم پر زکوٰۃ نہیں ہے۔" (بخاری' مسلم' ابو داؤد) ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' احمد)۔

امام احمد' مسلم اور نسائی کی ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ "پانچ وسق سے کم کھجوروں اور دانوں پر زکوٰۃ نہیں ہے۔" [2]

والی چیزوں میں سے صرف ایندھن بانس' گھاس اور وہ درخت زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں جو کوئی پھل نہ دیتے ہوں۔ ان کے نزدیک سبزیوں پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ ان کا استدلال قرآن کی مذکورہ بالا دونوں آیتوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ بالا حدیث سے ہے' جن کا حکم عام ہے۔ وہ احادیث جن میں سبزیوں کو زکوٰۃ سے معاف کیا گیا ہے' تو اول تو ان کی سند میں کلام ہے۔ لیکن اگر انہیں قابلِ حجت بھی مان لیا جائے' تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ان کا مطلب یہ ہے کہ سبزیوں کی زکوٰۃ حکومت وصول نہیں کرے گی' بلکہ ان کا مالک ان کی زکوٰۃ بطور خود مستحقین میں تقسیم کرے گا۔ (الکوکب الدری ج ا ص ۲۲۳)۔

۱۔ ایک وسق بالاتفاق ۶۰ صاع کے برابر ہے اور ایسا ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دوسری حدیث (بروایت امام احمدؒ و ابن ماجہ) میں بیان کیا گیا ہے۔

اہلِ مدینہ اور جمہور کے نزدیک صاع کا وزن ساڑھے ۵ رطل ہے اور ایک (رطل کا وزن ہمارے ہاں کے حساب سے ساڑھے ۷ چھٹانک ہے۔ لہٰذا پانچ وسق ہمارے ہاں کے حساب سے تقریباً ۹ من کے برابر ہوئے۔

صاع کے وزن میں حنفیہ کا اختلاف ہے' لیکن ہم یہاں اس اختلاف کو بیان نہیں کرتے' کیونکہ حنفیہ کے نزدیک زمین کی پیداوار کا کوئی نصاب نہیں ہے۔

۲۔ حضرت ابن عباسؓ' زید بن علیؒ' ابراہیم نخعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک زمین کی پیداوار کا کوئی نصاب نہیں' بلکہ اس کی ہر مقدار (خواہ وہ کم ہو یا زیادہ) پر زکوٰۃ فرض ہے۔ ان کا استدلال قرآن کی مذکورہ آیات "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ" اور "وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ" اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے ہے کہ "جو زمین آسمان اور قدرتی چشموں کے پانی سے سیراب ہو۔۔۔"

۴۔ غلوں اور پھلوں کی شرح زکوٰۃ:

غلوں اور پھلوں کی شرح زکوٰۃ زمین کے قدرتی یا مصنوعی ذرائع سے سیراب ہونے کے لحاظ سے مختلف ہے۔ جو زراعت قدرتی ذرائع سے سیراب ہونے والی زمین میں ہو اس پر عشر (دسواں حصہ) اور جو مصنوعی ذرائع سے سیراب ہو' اس پر نصف عشر (بیسواں حصہ) زکوٰۃ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ روایت پہلے گزر چکی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو زمین آسمان (بارش' برف' اوس اور اولے) یا قدرتی چشموں سے سیراب ہو یا وہ بعل (جو بارش کے پانی' اوس یا اپنے اندر کے پانی سے خود بخود سیراب ہوتی ہو) اس پر عشر ہے اور جو زمین (رہٹ اور دوسرے مصنوعی ذرائع سے) سیراب کی جاتی ہو اس پر نصف عشر ہے۔" (بخاری' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)۔

چشموں کے پانی سے سیراب ہو۔۔۔۔" کیونکہ ان آیات اور اس حدیث کا حکم عام ہے اور ان میں زکوٰۃ کے لیے مقدار کی کوئی شرط نہیں لگائی گئی۔ رہی اوپر کی حدیث تو امام ابو حنیفہؒ کا کہنا یہ ہے کہ اس سے نصاب کی تعیین کے لیے۔ استدلال کرنا اس لیے صحیح نہیں ہے کہ یہ خبر واحد ہے اور اس کا قرآن کی مذکورہ آیات اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ حدیث (جو مشہور ہے) سے تعارض ہوتا ہے۔ پھر اگر اس حدیث کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس سے مراد مال تجارت کی زکوٰۃ ہے' اس لیے کہ لوگ وسق کے ذریعے غلوں کی خرید و فروخت کیا کرتے تھے اور ایک وسق کی قیمت چالیس درہم (اور پانچ وسق کی قیمت ۲۰۰ درہم یعنی مال تجارت کا نصاب) ہوتی تھی۔" (نیل الاوطار ج ۴ ص ۱۲۰)۔

امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ کا مسلک بھی اس بارے میں جمہور کے مطابق ہے۔ (بذل المجہود ج ۲ جزا۔ ص ۷' ۲)۔

شافعیہ' مالکیہ اور حنابلہ کا اس پر اتفاق ہے کہ پھلوں اور غلوں کا نصاب پانچ وسق اس وقت ہے جب کہ وہ خشک ہو چکے ہوں اور انھیں چھلکوں وغیرہ سے صاف کر لیا گیا ہو۔ حنابلہ کے نزدیک اگر غلہ (جیسے چاول چھلکوں سمیت رکھ لیا گیا ہو' تو اس کا نصاب پانچ کے بجائے دس وسق ہو گا' یا جو بھی اصل غلے اور اس کے چھلکے کے وزن میں تناسب ہو۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا ص ۵۹۳' ۵۹۵)

اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (شرح مسلم للنووی)۔

اس بارے میں بھی اتفاق ہے کہ اگر کوئی فصل نصف مدت بارش سے سیراب ہوتی ہو اور نصف مدت مصنوعی ذرائع سے تو اس پر تین چوتھائی عشر ۵ افیصد زکوٰۃ) ہے۔

اور اگر کوئی فصل زیادہ مدت بارش سے سیراب ہوتی ہے اور کم مدت مصنوعی ذرائع سے' تو اکثر علمائے سلف کا مسلک یہ ہے کہ اس پر عشر ۱۰ فیصد زکوٰۃ ہو گی۔ اور اگر وہ زیادہ مدت مصنوعی ذرائع سے سیراب ہوتی ہے اور کم مدت بارش سے' تو اس پر نصف عشر ۵ فیصد زکوٰۃ ہو گی۔[1]

۵۔ پھلوں کا عشر بذریعہ خرص [2] :

جمہور کے نزدیک پھلوں کا عشر بذریعہ خرص وصول کیا جا سکتا ہے۔ خرص کا ثبوت نبی صلی اللہ علیہ وسلم' حضرت ابوبکرؓ' عمرؓ اور بعد کے خلفاء سے ملتا ہے :

حضرت ابو حمید ساعدیؓ سے روایت ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ جب حضورؐ وادی القریٰ آئے' تو ایک (یہودی) عورت اپنے کھجوروں کے باغ میں کھڑی تھی۔ آپ نے فرمایا "اخرصوا" (اندازہ لگاؤ)۔ (بخاری)

۱۔ یہ امام ابو حنیفہؒ' احمد بن حنبلؒ' عطاءؒ اور سفیان ثوریؒ کا مسلک ہے۔ ایک روایت میں امام شافعیؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ لیکن دوسری روایت میں ان کا مسلک یہ ہے کہ ایسی فصل کی زکوٰۃ۔۔۔۔ لی جائے گی۔ (المغنی حوالہ مذکورہ)۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں "اگر دونوں مدتیں الگ الگ معلوم ہو سکتی ہوں' تو ان کے لحاظ سے زکوٰۃ وصول کی جانی چاہیے"۔ (نیل الاوطار ج ۴ ص ۱۴۰)۔

مالکیہ میں سے بعض کا مسلک وہی ہے جو اوپر امام ابو حنیفہؒ اور دوسروں کا بیان کیا گیا ہے' اور بعض کا مسلک وہ ہے جو اوپر حافظ ابن حجرؒ کا بیان کیا گیا ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۵۹۶)۔

۲۔ خرص کے لفظی معنی اندازہ اور تخمینہ کرنے کے ہیں۔ اصطلاح میں خرص اس چیز کو کہتے ہیں کہ جب پھل پک جائیں اور ابھی توڑے نہ گئے ہوں تو حکومت کا عامل جا کر ان میں سے عشر کی مقدار کا اندازہ کرے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب کھجوریں پک جاتیں اور ابھی درختوں ہی پر ہوتیں' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن رواحہؓ کو یہود کے پاس بھیجتے' تاکہ وہ کھجوروں میں سے اپنے حصہ کی مقدار کا اندازہ لگائیں۔ وہ جاتے اور ان کی کھجوروں کی مقدار کا اندازہ لگاتے' قبل اس سے کہ انھیں کھایا جائے۔ پھر وہ یہودیوں کو اختیار دیتے کہ جتنی کھجوروں کا اندازہ تم نے لگایا ہے' وہ ہمیں دے دو' اور بقیہ خود رکھ لو یا وہ تم رکھ لو اور بقیہ ہمیں دے دو۔[1] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم اس لیے ہوتا تھا کہ زکوٰۃ کے پھلوں کی مقدار معلوم کی جائے قبل اس سے کہ انھیں کھایا جائے اور بانٹا جائے" (مسند امام احمد' ابو داؤد)۔ حضرت عتاب بن اسیدؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے پاس اپنے عامل بھیجا کرتے تھے جو ان کے انگوروں اور کھجوروں میں سے (عشر کی مقدار کا) اندازہ لگاتے تھے" (ترمذی' ابن ماجہ)۔

حضرت عائشہؓ اور عتاب بن اُسیدؓ کی یہ دونوں روایتیں اگرچہ مرسل[2] ہیں۔ لیکن اس بارے میں چونکہ بہت سی دوسری روایتیں بھی ہیں۔ اس لیے یہ قابل حجت ہیں۔ (نیل الاوطار ج ۴ ص ۱۲۳)۔

امام ترمذی لکھتے ہیں "(خرص کا مقصد یہ ہے) کہ اس کے بعد۔۔۔ لوگوں کو اختیار دے دیا جائے کہ وہ اپنے پھلوں میں سے جو چاہیں' کھائیں"۔[3] (کیونکہ حکومت کو

۱۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خیبر کے یہود کے درمیان بذریعہ معاہدہ یہ طے تھا کہ وہ اپنے باغات کی آدھی کھجوریں خود رکھیں گے اور آدھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ادا کریں گے۔

۲۔ دیکھیے مرسل کی تعریف صفحہ ۳۲۔

۳۔ خرص' پر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی اور آپ کے بعد حضرت ابو بکرؓ' عمرؓ اور بعد کے خلفاء کے زمانے میں بھی عمل جاری رہا' صحابہؓ میں سے کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ تابعین میں سے صرف امام شعبیؒ نے اسے بدعت قرار دیا ہے (معالم السنن ج ۲ ص ۲۱۲)۔

ائمہ اربعہ میں سے امام مالکؒ اور آپ کے شاگردوں کے نزدیک خرص' واجب ہے۔ امام احمدؒ اور شافعیؒ کے نزدیک یہ سنت ہے۔ ان سب کا اس چیز پر اتفاق ہے کہ خرص' کھجوروں اور انگوروں میں ہے' غلوں میں نہیں۔ (الفتح الربانی ج ۹ ص ۱۶)۔

اپنے عشر کی مقدار کا اندازہ ہو چکا ہے اور وہ بعد میں اس کے مطابق ان سے عشر وصول کرے گی)۔

۶۔ عشر وصول کرنے میں نرمی اور تخفیف :

حضرت سہل بن ابی حثمہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تم (پھلوں کے عشر کا) اندازہ (خرص) کر لو، تو (عشر لیتے وقت) تہائی مقدار چھوڑ دو اور اگر تہائی مقدار نہ چھوڑ سکو، تو چوتھائی مقدار چھوڑ دو" (احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی)۔

حضرت سہل بن ابی حثمہؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے والد ابو حثمہؓ کو خارص (عشر کے پھلوں کا اندازہ کرنے والا) بنا کر بھیجا۔ اس کے بعد حضورؐ کی خدمت میں ایک آدمی نے آکر عرض کیا کہ "ابو حثمہؓ مجھے زیادہ حصہ دے آئے۔" حضورؐ نے ابو حثمہؓ کو بلایا اور فرمایا "تمھارا بھائی سمجھتا ہے کہ تم اسے زیادہ حصہ دے آئے ہو۔" ابو حثمہؓ نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول! میں نے اسے صرف اس قدر زیادہ حصہ دیا ہے، جسے اس کے

امام شعبیؒ سفیان ثوریؒ، امام ابو حنیفہؒ، ابو یوسفؒ اور محمدؒ کے نزدیک خرص ناجائز ہے۔ ان کا استدلال حضرت جابرؓ کی اس روایت سے ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خرص (اندازہ) کے ذریعے پھلوں کی خرید و فروخت سے منع فرمایا ہے، حالانکہ سامنے موجود ہونے والے پھلوں کی مقدار کا اندازہ لگانا درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کی نسبت آسان ہے۔ ان کا استدلال یہ بھی ہے کہ پھلوں کا عشر بذریعہ خرص وصول کرنا ایسا ہی ہے جیسا غیر موجود غلوں کو موجود غلوں سے فروخت کرنا یا درخت پر لگے ہوئے پھلوں کو کٹے ہوئے پھلوں سے فروخت کرنا یا تر کھجوروں کو چھواروں سے ادھار فروخت کرنا۔ چونکہ یہ سب چیزیں شریعت میں حرام ہیں۔ اس لیے خرص کے ذریعے پھلوں کا عشر وصول کرنا بھی حرام ہوا۔ ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ خرص کا جواز سود کی حرمت کے ساتھ منسوخ ہو چکا ہے۔ رہی یہ بات کہ خرص پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی اور آپ کے بعد حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ اور بعد کے خلفاء کے زمانے میں بھی عمل جاری رہا تو یہ بات اگرچہ تسلیم ہے لیکن اس معنی میں کہ اس وقت صرف یہ اندازہ کرنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ لوگوں کے پاس پھلوں کی کتنی مقدار ہے تاکہ وہ بعد میں خیانت اور بے ایمانی نہ کر سکیں۔ اس معنی میں خرص جائز ہے، لیکن اس معنی میں جائز نہیں ہے کہ اس سے کوئی شرعی حکم (یعنی اس کے بعد اسی کے مطابق عشر وصول کرنا) بھی لازم آتا ہو۔ (مختصراً از بذل المجہود ج ۲ جز ۱، ص ۳۱)۔

گھر والے غریبوں کو دے سکیں اور مسکینوں کو کھلا سکیں یا جو ہوا اور آندھی کی وجہ سے گر سکتا ہو۔" حضورؐ نے اس شخص سے فرمایا۔ "تمہارے بھائی نے تمہیں اگر زیادہ حصہ دیا ہے تو اس نے تم سے انصاف کیا ہے۔"[1]

۷۔ غلوں اور پھلوں کا آپس میں ملانا :

عشر کے غلوں اور پھلوں کے آپس میں ملانے کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث ثابت نہیں ہے۔ لیکن تمام ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ ایک ہی پھل یا غلے کی عمدہ اور ردی قسمیں آپس میں ملائی جائیں گی اور پھر سب کا عشر ہر ایک کی الگ الگ مقدار کے لحاظ سے وصول کیا جائے گا اور اگر پھل یا غلے کی بہت سی قسمیں ہوں' تو متوسط قسم میں سے عشر وصول کیا جائے گا۔ (ہدایۃ المجتہد ج ا ص ۲۴۰)۔

مختلف جنسوں کے آپس میں ملانے میں اختلاف ہے[2]

۸۔ غلوں اور پھلوں پر عشر کس وقت فرض ہو جاتا ہے ؟

ا۔ ان احادیث کی بنا پر امام شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ اور ابن حزمؒ کا مسلک یہ ہے کہ پھلوں کا مالک اگر ان کے کٹنے سے پہلے ان میں سے کھائے' تو عشر وصول کرتے وقت اس کھائی ہوئی مقدار کا حساب نہیں کیا جائے گا' کیونکہ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ عشر وصول کرتے وقت اس کھائی ہوئی مقدار کا بھی حساب کیا جائے گا۔ ان کا استدلال قرآن کی آیت "كُلُوا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ" سے ہے۔ نیز ان کے نزدیک قیاس کا تقاضا ہے کہ کھائی ہوئی مقدار مال ہی کا حصہ ہو' اس لیے اس پر بھی عشر کا ہونا ضروری ہے (ہدایۃ المجتہد ج ا ص ۲۴۱' ۲۴۲)۔

۲۔ امام مالکؒ کے نزدیک روئی کی قسم کی تمام چیزیں ایک ہی قسم میں اور اس طرح گندم' جو اور باجرہ وغیرہ بھی ایک ہی جنس ہیں۔ اس لیے جن چیزوں کی جنس ایک ہو گی۔ انھیں آپس میں ملایا جائے گا۔ امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ کے نزدیک ہر چیز کی جنس دوسری سے الگ ہے۔ مثلاً گندم' جو اور باجرہ ایک نہیں بلکہ تین الگ الگ جنسیں ہیں۔ اس لیے ان کو آپس میں نہ ملایا جائے گا۔ بلکہ ان کی مقدار کا الگ الگ عشر وصول کیا جائے گا۔" (ہدایۃ المجتہد حوالہ مذکورہ)۔

واضح رہے کہ حنفیہ کے نزدیک غلوں اور پھلوں کا کوئی نصاب نہیں ہے' اس لیے مختلف پھلوں اور غلوں کو آپس میں ملانے یا نہ ملانے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ غلوں اور پھلوں کا عشر ان کے کٹنے اور صاف کیے جانے کے ساتھ ہی وصول کیا جائے گا' لیکن اس بارے میں اختلاف ہے کہ وہ وقت کونسا ہے' جبکہ کسی پھل یا غلے پر عشر واجب ہو جاتا ہے [1]

۹۔ شہد کی زکوٰۃ :

شہد کی زکوٰۃ کے متعلق متعدد روایات ملتی ہیں :

حضرت ابو سیارہ متعیؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسول! میرے پاس شہد کی مکھیوں (کے چھتے) ہیں۔" آپؐ نے فرمایا۔ "تو تم ان کا عشر ادا کرو۔" میں نے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسولؐ! تو آپؐ میرے لیے ان کا پہاڑ خاص کر دیجیے۔" تو آپؐ نے میرے لیے وہ پہاڑ خاص کر دیا۔ (احمد' ابن ماجہ)۔

حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد کے ذریعے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد کا عشر وصول فرمایا۔ (ابن ماجہ)

لیکن یہ تمام روایات سند کے لحاظ سے ضعیف ہیں۔ شہد کے متعلق کوئی صحیح حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں (بخاری لہذا جمہور (اکثریت سلف) کے نزدیک شہد پر کوئی عشر نہیں ہے۔ (نیل الاوطار ج ۴' ص ۱۴۴) [2]

۱۔ اس بارے میں جمہور (جن میں امام مالکؒ' شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ بھی شامل ہیں) کا مسلک یہ ہے کہ یہ وقت وہ ہے جب غلے یا پھل پک جائیں اور کٹنے کے قابل ہو جائیں۔ امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے شاگردوں کے نزدیک یہ وقت وہ ہے جب غلے یا پھل ظاہر ہو جائیں یعنی اگنا شروع ہو جائیں۔

اس وقت کا تعین اس لیے ضروری ہے کہ اگر کسی پھل یا غلے میں اس کا مالک کسی قسم کا تصرف کر لے (جیسے فروخت وغیرہ)۔ تو یہ دیکھا جا سکے کہ اس نے عشر کے مال میں تصرف کیا ہے یا ایسے مال میں تصرف کیا ہے جس پر ابھی عشر فرض نہیں ہوا تھا؟ اگر اس نے یہ تصرف عشر فرض ہونے سے پہلے کیا ہو' تو اس سے کوئی چیز وصول نہ کی جائے گی۔

۲۔ امام ابو حنیفہؒ' آپ کے شاگردوں اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک شہد پر زکوٰۃ واجب ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ شہد کی زکوٰۃ کے متعلق اگرچہ صحیح حدیث کوئی نہیں ہے لیکن یہ بہت سی ضعیف احادیث مل کر قوی بن جاتی ہیں۔ پھر شہد درختوں اور پھلوں سے حاصل ہوتا ہے اور یہ تولا جاتا ہے اور اس کا ذخیرہ ہو

۴۔ مویشی

۱۔ کن مویشیوں پر زکوٰۃ فرض ہے؟

حدیث میں زکوٰۃ کے لیے تین جانوروں کا ذکر ہے:

(۱) اونٹ

(۲) گائے[1]

(۳) بھیڑ اور بکری

۲۔ اونٹ کا نصاب:

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جب انہیں بحرین کا گورنر بنا کر بھیجا تو انہیں ایک خط لکھ کر دیا جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر تھی۔ اس خط کے مطابق اونٹوں کا نصاب یہ ہے:

چار اونٹوں تک کوئی زکوٰۃ نہیں، الاّ یہ کہ مالک از خود دینا چاہے۔

سکتا ہے۔ اس لیے قیاس کا تقاضا بھی یہ ہے کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہو۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک شہد پر زکوٰۃ کی شرط یہ ہے کہ وہ عشری زمین سے ہو۔ ان کے نزدیک اس کا نصاب کوئی نہیں۔ امام احمدؒ کے نزدیک اس کا عشری زمین سے ہونا شرط نہیں، لیکن اس میں نصاب ضروری ہے۔ جو دس فرق (۱۶۰ رطل = تقریباً دو من) امام ابو یوسف کے نزدیک اس کا نصاب دس رطل = تقریباً دو سیر ہے اور امام محمدؒ کے نزدیک پانچ فرق (۸۰ رطل تقریباً ایک من) ہے۔

(المغنی ج ۲، ص ۵۷۷)۔

۱۔ جمہور (جن میں امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ۔۔۔ شامل ہیں) کے نزدیک صرف ان مویشیوں پر زکوٰۃ واجب ہے جو سائمہ ہوں۔ یعنی ان کی پرورش گھروں میں نہیں بلکہ عموماً باہر جنگل یا چراگاہ میں چر کر ہوتی ہو۔ جن مویشیوں کی پرورش گھروں میں چارہ ڈال کر ہوتی ہو ان پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ امام مالکؒ مویشیوں کے درمیان یہ فرق نہیں کرتے (نیل الاوطار ج ۴، ص ۲۱۵) (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۵۶۸)۔

۲۔ ائمہ اربعہ کے نزدیک بھینس کا حکم بھی گائے ہی کا ہے۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۵۶۷)۔

۵ سے ۹ اونٹوں پر ایک بکری ۔ا

۱۰ سے ۱۴ اونٹوں پر دو بکریاں

۱۵ سے ۱۹ اونٹوں پر تین بکریاں

۲۰ سے ۲۴ اونٹوں پر چار بکریاں

۲۵ سے ۳۵ اونٹوں پر ایک سال کی ایک اونٹنی نہ ہو تو ایک سال کا ایک اونٹ

۳۶ سے ۴۵ اونٹوں پر دو سال کی ایک اونٹنی جو تیسرے سال میں لگ چکی ہو

۴۶ سے ۶۰ اونٹوں پر تین سال کی ایک اونٹنی جو چوتھے سال میں لگ چکی ہو

۶۱ سے ۷۵ اونٹوں پر چار سال کی ایک اونٹنی جو پانچویں سال میں لگ چکی ہو

۷۶ سے ۹۰ اونٹوں پر دو سال کی دو اونٹنیاں جو تیسرے سال میں لگ چکی ہوں

۹۱ سے ۱۲۰ اونٹوں پر تین سال کی دو اونٹنیاں جو چوتھے سال میں لگ چکی ہو

اور جب اونٹ ۱۲۰ سے زیادہ ہو جائیں تو ہر چالیس اونٹوں پر دو سال کی ایک اونٹنی اور ہر پچاس اونٹوں پر تین سال کی ایک اونٹنی زکوٰۃ ہو گی۔ (بخاری' ابوداؤد' ترمذی) [۲]

۱۔ حدیث کے اصل الفاظ یوں ہیں:

جس کے پاس ۲۴ سے کم اونٹ ہوں' تو ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری زکوٰۃ ہے جب اونٹ ۲۵ ہو جائیں تو ان پر ایک سال کی ایک اونٹنی جب وہ ۳۶ ہو جائیں تو اس کو ہم نے فلاں سے فلاں تعداد پر اتنی بکریاں یا اونٹنیاں زکوٰۃ ہے' لکھ کر ظاہر کیا ہے' کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اور اس بارے میں کوئی اختلاف بھی نہیں ہے کہ دو فرض تعدادوں کی درمیانی تعداد۔ جسے وقص کہتے ہیں۔ پر زکوٰۃ نہیں ہے یعنی اگر دو فرض تعداد ۵ اور ۱۰ یا ۲۵ اور ۳۶ ہوں' تو ۶ سے ۹ اور ۲۶ سے ۳۵ پر وہی زکوٰۃ ہو گی جو ۵ اور ۲۵ پر ہو گی۔

۲۔ اس روایت کے مطابق ۱۲۱ سے ۱۲۹ اونٹوں پر وہی زکوٰۃ ہو گی' جو ۱۲۰ اونٹوں پر ہے۔ ۱۳۰ سے ۱۳۹ اونٹوں تک دو دو سال کی دو اونٹنیاں اور تین سال کی ایک اونٹنی (۴۰x۲=۸۰+۵۰=۱۳۰) زکوٰۃ ہو گی۔ ۱۴۰ سے ۱۴۹ اونٹوں تک تین تین سال کی دو اونٹنیاں اور دو سال کی ایک اونٹنی (۵۰x۲=۱۰۰+۴۰=۱۴۰) زکوٰۃ ہو گی۔ ۱۵۰ سے ۱۵۹ اونٹوں تک تین تین سال کی تین اونٹنیاں (۵۰x۳=۱۵۰) زکوٰۃ ہو گی۔ ۱۶۰ سے ۱۶۹ اونٹوں تک دو دو سال کی چار اونٹنیاں (۴۰x۴=۱۶۰) زکوٰۃ ہو گی۔ ۱۷۰ سے ۱۷۹ اونٹوں تک تین تین سال کی دو اونٹنیاں اور دو دو سال کی تین اونٹنیاں اور تین سال کی ایک اونٹنی

۳۔ گائیوں (اور بھینسوں) کا نصاب :

گائیوں کے نصاب کے متعلق کوئی ایسی روایت نہیں ہے' جس کی صحت پر سب کا

(۴۰×۳=۱۲۰+۵۰=۱۷۰) زکوٰۃ ہوگی۔ ۱۸۰ سے ۱۸۹ اونٹوں تک تین تین سال کی دو اونٹنیاں اور دو دو سال کی دو اونٹنیاں (۵۰×۲=۱۰۰+۴۰×۲=۱۸۰) زکوٰۃ ہوگی۔ ۱۹۰ سے ۱۹۹ اونٹوں تک تین تین سال کی تین اونٹنیاں اور دو سال کی ایک اونٹنی (۵۰×۳=۱۵۰+۴۰=۱۹۰) زکوٰۃ ہوگی۔ ۲۰۰ اونٹوں پر تین تین سال کی چار اونٹنیاں یا دو دو سال کی پانچ اونٹنیاں (۴۰×۵=۲۰۰ یا ۵۰×۴=۲۰۰) زکوٰۃ ہوگی۔ (نیل الاوطار' ج ۴' ص ۱۹۰)۔

یہ شافعیہ' مالکیہ' حنابلہ اور جمہور کا مسلک ہے۔ حنفیہ کے نزدیک ۱۲۰ کے بعد فرض تعداد کو دوبارہ اسی طرح شروع کیا جائے گا جس طرح وہ پہلے شروع ہوئی تھیں چنانچہ ان کے نزدیک ۱۲۴ اونٹوں تک وہی زکوٰۃ ہوگی جو ۱۲۰ اونٹوں پر ہے۔ ۱۲۵ سے ۱۲۹ اونٹوں تک تین تین سال کی دو اونٹنیاں اور ایک بکری زکوٰۃ ہوگی۔ ۱۳۰ سے ۱۳۹ اونٹوں تک تین تین سال کی دو اونٹنیاں اور دو بکریاں زکوٰۃ ہوگی۔ ۱۴۰ سے ۱۴۴ اونٹوں تک تین تین سال کی دو اونٹنیاں اور چار بکریاں زکوٰۃ ہوگی۔ ۱۴۵ سے ۱۴۹ اونٹوں تک تین تین سال کی دو اونٹنیاں اور ایک سال کی ایک اونٹنی زکوٰۃ ہوگی۔ ۱۵۰ اونٹوں پر تین تین سال کی تین اونٹنیاں زکوٰۃ ہوگی۔ اس کے بعد فرض تعدادوں کو اسی طرح پھر دہرایا جائے گا۔ چنانچہ ہر پانچ کے اضافہ کے ساتھ ایک بکری کا اضافہ ہوگا۔ اس کے بعد ۱۷۵ سے ۱۸۵ اونٹوں تک تین تین سال کی تین اونٹنیاں اور ایک سال کی ایک اونٹنی زکوٰۃ ہوگی۔ ۱۸۲ سے ۱۹۵ اونٹوں تک تین تین سال کی تین اونٹنیاں اور دو سال کی ایک اونٹنی زکوٰۃ ہوگی۔ ۱۹۶ سے ۲۰۰ اونٹوں تک تین تین سال کی چار اونٹنیاں یا دو دو سال کی پانچ اونٹنیاں زکوٰۃ ہوگی۔ اس کے بعد پھر فرض تعداد کو دہرایا جائے گا۔

حضرت علیؓ' عبداللہ بن مسعودؓ اور امام نخعیؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ حنفیہ کا استدلال حضرت عمرو بن حزمؓ کی اس روایت سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خط میں یہ الفاظ تھے۔ "جب اونٹ ۱۲۰ سے زیادہ ہو جائیں تو فریضہ کو دوہرایا جائے گا۔" (بذل المجہود' ج ۳' ص ۱۰')

دوسروں کے نزدیک یہ روایت اوپر کی روایت کے مقابلے میں کمزور ہے اور قابل حجت ہونے کی صورت میں بھی ان کے نزدیک فریضہ کا دوہرانے کا مطلب یہ ہے کہ فریضہ کو اس طرح دوہرایا جائے جس طرح اوپر کی روایت میں بیان ہوا ہے۔ (نیل الاوطار ج ۴' ص ۱۰۹)۔

اتفاق ہو' لیکن اس بارے میں سب سے مشہور روایت جس پر سب کا عمل ہے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کی ہے۔ اس کی رو سے جس شخص کے پاس ۳۰ سے کم گائیں ہوں' اس پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ جب گائیں ۳۰ ہو جائیں تو ان پر ایک سال کا ایک بچھڑا یا بچھڑی زکوٰۃ[1] ہے۔ اور جب گائیں ۴۰ ہوں تو ان پر دو سال کی ایک بچھڑی زکوٰۃ ہے۔ (احمد' ترمذی' ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ)۔

طبرانی کی روایت میں الفاظ یہ ہیں "اور جب گائیں ۴۰ ہوں' تو ان پر دو سال کی ایک بچھڑی یا بچھڑا زکوٰۃ ہے۔" (نیل الاوطار ج ۴' ص ۱۱۴)۔

۴۔ بکریوں (اور بھیڑوں) کا نصاب :

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے مذکورہ خط کی رو سے بکریوں (اور بھیڑوں) کا نصاب مندرجہ ذیل ہے :

جس شخص کے پاس ۴۰ سے کم بکریاں ہوں' اس پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ الا یہ کہ وہ از خود دینا چاہے۔ جب بکریاں ۴۰ ہو جائیں تو ان پر ایک بکری زکوٰۃ ہے پھر ۱۲۰ بکریوں تک یہی زکوٰۃ ہے۔ ۱۲۱ بکریوں پر دو بکریاں زکوٰۃ ہے۔ ۲۰۰ بکریوں تک یہی زکوٰۃ ہے۔ جب بکریاں ۲۰۰ سے زیادہ ہو جائیں' تو ان پر تین بکریاں زکوٰۃ ہے۔ ۳۰۰ بکریوں تک یہی زکوٰۃ ہے۔ ۳۰۱ بکریوں پر چار بکریاں زکوٰۃ ہے۔ ۴۰۰ بکریوں تک یہی زکوٰۃ ہے۔ جب بکریاں ۴۰۰ سے زیادہ ہو جائیں' تو ہر ۱۰۰ بکریوں پر ایک بکری کے حساب سے زکوٰۃ ہے۔" (بخاری' دارقطنی' حاکم' ابوداؤد)۔

اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

۵۔ جانوروں کی زکوٰۃ کے متعلق بعض دوسرے احکام :

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے خط سے اور بعض دوسری روایات سے

۱۔ مالکیہ' شافعیہ' اور حنابلہ کے نزدیک بچھڑی ضروری ہے۔ حنفیہ کے نزدیک بچھڑے اور بچھڑی میں کوئی فرق نہیں۔ ائمہ اربعہ کے نزدیک ۴۰ کے بعد گائیوں کی زکوٰتیوں ہو گی کہ ہر ۳۰ گائیوں پر ایک سال کی ایک بچھڑی یا بچھڑا اور ہر ۴۰ گائیوں پر دو سال کی ایک بچھڑی۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۵۷۴)۔

جانوروں کی زکوٰۃ کے متعلق مندرجہ ذیل مزید ہدایات ملتی ہیں :

(۱) زکوٰۃ کے خوف سے الگ الگ جانوروں کا اکٹھا کرنا یا اکٹھے جانوروں کا الگ الگ کرنا جائز نہیں ہے۔

پہلی صورت یہ ہے کہ دو شخصوں کے پاس چالیس بکریاں ہوں' تو وہ اس خیال سے کہ اگر ان کی بکریاں الگ الگ رہیں گی تو دونوں کو ایک ایک بکری زکوٰۃ میں دینی پڑے گی۔ آپس میں اپنی بکریوں کو ملا لیں تاکہ پوری اسی ۸۰ بکریوں پر ایک ہی بکری زکوٰۃ میں دینی پڑے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص کے پاس ۱۲۰ بکریاں ہوں' تو زکوٰۃ لینے والا ان کو دو حصوں میں اس طرح بانٹ دے کہ ہر حصہ میں ۴۰ سے زائد بکریاں ہوں تاکہ اس طرح وہ بکریاں زکوٰۃ میں وصول کر سکے' حالانکہ اگر ساری بکریاں اکٹھی رہتیں' تو صرف ایک بکری زکوٰۃ ہوتی (معالم السنن وغیرہ)۔

(۲) زکوٰۃ میں اوسط درجہ کے جانور دینے اور لینے چاہئیں۔ نہ زکوٰۃ دینے والے کو یہ چاہیے کہ اپنے جانوروں میں سے ردی قسم کے (بوڑھے' مریض اور عیب دار' جانور چھانٹ کر زکوٰۃ میں دے' اور نہ زکوٰۃ وصول کرنے والے کو چاہیے کہ چھانٹ کر عمدہ قسم کے جانور زکوٰۃ میں لے۔ الّا یہ کہ زکوٰۃ دینے والا انہیں جو دینے کے لیے تیار ہو۔

۶۔ وہ جانور جن پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے :

گھوڑوں' خچروں اور گدھوں پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "مسلمان پر اس کے گھوڑوں اور غلاموں میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔[1] " (بخاری' مسلم' احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)۔

---

[1] امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر گھوڑوں میں نر اور مادہ دونوں ہوں' تو افزائش نسل کے پیش نظر ان پر زکوٰۃ واجب ہے۔ ان کا استدلال حضرت جابرؓ کی اس روایت سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہر سائمہ (باہر چراگاہ میں چر کر پلنے والے) گھوڑے پر ایک دینار یا دس درہم زکوٰۃ ہے۔" (دارقطنی' بیہقی)۔

نیز حضرت عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے اپنے عامل کو حکم دیا کہ گھوڑوں کی زکوٰۃ

لیکن اگر گھوڑے اور گدھے تجارت کے لیے ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اس پر سوائے ظاہریہ [1] کے سب کا اتفاق ہے۔

۵ : رکاز اور معادن

(برآمد شدہ دفینہ اور معدنیات)

ا۔ رکاز اور معادن کی تعریف :

جمہور (اکثریت سلف) کے نزدیک رکاز اور معدن (جمع معادن یا معدنیات) میں فرق ہے۔ رکاز سے مراد زمانہ قبل از اسلام کے لوگوں کی دبی ہوئی چیزیں ہیں اور معدن سے مراد وہ دھاتیں ہیں، جو بندوں کی دبائی ہوئی نہ ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ کی زمین میں پیدا کردہ ہوں۔ رکاز اور معدن کے درمیان اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ حدیث میں دونوں کو ایک ساتھ بیان کر کے دونوں کا حکم الگ الگ بتایا گیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اَلْعَجْمَاءُ جَرْحُهَا جُبَارٌ وَالْبِئْرُ جُبَارٌ وَالْمَعْدِنُ جُبَارٌ وَفِي الرِّكَازِ الْخُمُسُ" (جب کسی کا جانور کھل جائے اور کسی دوسرے شخص کا نقصان کر دے تو وہ معاف ہے۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے اجرت پر کان (معدن) کھدوائے اور وہ اس میں مارا جائے، تو وہ معاف ہے [2] اور رکاز میں خمس (۲۰ فیصد زکوٰۃ) ہے۔ [3] " (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن

وصول کرے"۔۔۔۔ لیکن امام بیہقی، دارقطنی اور دوسرے محدثین نے ان روایات کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اس لیے دوسرے ائمہ انہیں قابل حجت نہیں مانتے (نیل الاوطار ج ۴، ص ۱۱۶)۔

امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ کے نزدیک بھی گھوڑوں پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے، اور عام حنفی علماء نے اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔ (ردالمحتار ج ۲ ص ۱۹)

ا۔ کیوں کہ ظاہریہ کے نزدیک مال تجارت پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

۲۔ المعدن جبار کا دوسرا مطلب جیسا کہ امام ابن قیم نے لکھا ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "معدن پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔" لیکن چونکہ یہ کسی کا بھی مسلک نہیں، اس لیے اسے ہم نے اوپر بیان نہیں کیا۔ 3ا

۳۔ امام مالکؒ، شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ اور عام محدثین کا یہی مسلک ہے۔ ان کے نزدیک رکاز کی

ماجہ 'احمد)۔

۲۔ رکاز اور معدن کا نصاب اور شرح زکوٰۃ :

جہاں تک رکاز کا تعلق ہے' اس کے متعلق حدیث میں تصریح ہے کہ اس میں خمس (۲۰ فیصد زکوٰۃ) ہے' جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی مذکورہ روایت میں بیان ہوا ہے' لیکن معدن کی شرحِ زکوٰۃ کا حدیث میں ذکر نہیں ہے۔

ربیعہ بن عبد الرحمٰن نے متعدد راویوں کے ذریعے یہ روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بلالؓ بن حارث مزنی کو قبل (ایک جگہ کا نام) کی کانیں عطا کیں اور وہ فرع (ایک جگہ کا نام) کے ایک کنارے پر تھیں۔ ان کانوں پر آج تک سوائے زکوٰۃ کے کوئی چیز وصول نہیں کی جاتی۔ (ابو داؤد' موطا امام مالکؒ)۔

لیکن امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ "یہ روایت مرسل ہے اور مُحدِّثین اسے قابلِ حجت قرار نہیں دیتے۔ پھر اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف کانوں کے عطا کرنے کا ذکر ہے۔ رہی کانوں پر ۳۰ فیصد سے کم زکوٰۃ' تو یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے" امام بیہقیؒ نے بھی امام شافعی کے اس قول کی تائید کی ہے۔ نیل الاوطار ج ۴' ص ۱۲۵۔ الفتح الربانی ج ۹' ص ۷۲)[1]

پہچان یہ ہے کہ اس میں زمانہ قبل از اسلام کی کوئی علامت پائی جائے' ورنہ وہ رکاز نہیں بلکہ لقطہ ہوگا۔ اگر اس کا پہچاننا ممکن نہ ہو' تو امام مالکؒ کے نزدیک یہ رکاز ہوگا۔ اور امام شافعیؒ اور احمدؒ کے نزدیک لقطہ۔

امام ابو حنیفہؒ' سفیان ثوریؒ اور عراق کے دوسرے فقہاء کے نزدیک رکاز اور معدن ایک ہی چیز ہیں۔ رکاز کا مادہ رکز ہے اور اس کے معنی ہیں "گاڑنا"۔ لہٰذا ہر وہ چیز جو زمین سے نکلے (خواہ وہ بندوں کی دفن کردہ ہو یا اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی) وہ رکاز ہے۔ اس قیاس کے علاوہ ان کا استدلال اس حدیث سے بھی ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا "اگر کسی شخص کو کسی ویران جگہ میں کوئی چیز ملے' تو اس کا کیا حکم ہے؟" فرمایا "اس میں اور رکاز میں خمس ہے۔" گویا اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معدن کو رکاز فرمایا ہے اور برآمد شدہ دفینہ کو رکاز نہیں فرمایا۔ (التعلیق الصبیح ج ۲ ص ۳۰۲)۔

۱۔ شافعیہ' حنابلہ اور جمہور کے نزدیک رکاز کی زکوٰۃ ۲۰ فیصد اور معدن کی زکوٰۃ اڑھائی فیصد ہے۔ ان کا استدلال اوپر کی حدیث سے ہے کیونکہ اس میں معدن پر زکوٰۃ کا ذکر ہے۔ علاوہ ازیں ان کا استدلال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے بھی ہے کہ چاندی پر اڑھائی فیصد زکوٰۃ ہے۔" امام بخاریؒ اور ابو عبیدؒ نے

حدیث میں رکاز اور معدن کے لیے کسی نصاب کا ذکر نہیں ہے' لهذا بظاہر ان کا کوئی نصاب نہیں اور ان کی ہر کم یا زیادہ مقدار پر زکوٰۃ ضروری ہے۔ (نیل الاوطار ج ۴' ص ۱۲۵) [1]

اس بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ زکوٰۃ کے لیے رکاز اور معدن پر ایک سال گزرنے کی شرط نہیں ہے بلکہ ان کی زکوٰۃ ان کے پائے جانے یا نکلنے کے ساتھ ہی واجب ہو جاتی ہے [2]

یہی مسلک حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے بھی نقل کیا ہے۔ مالکیہ کا بھی یہی مسلک ہے' لیکن ان کے نزدیک اگر رکاز محنت اور مشقت سے حاصل ہو تو اس پر ۲۰ کے بجائے اڑھائی فیصد زکوٰۃ ہو گی۔ اسی طرح اگر معدن کے نکالنے میں مشقت نہ ہو' تو اس پر اڑھائی فیصد کے بجائے ۲۰ فیصد زکوٰۃ ہو گی۔

حنفیہ کے نزدیک معدن بھی رکاز ہی ہے' جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں' اس لیے ان کے نزدیک دونوں پر ۲۰ فیصد زکوٰۃ ہو گی۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ۔ المغنی)۔

۱۔ حنفیہ کا یہی مسلک ہے۔ شافعیہ' مالکیہ' حنبلیہ اور امام اسحاقؒ کے نزدیک معدن کا نصاب ہے یعنی وہی جو عام نقدی کا ہے۔ (الفتح الربانی)۔

۲۔ رکاز اور معدن کے متعلق ائمہ کے نزدیک مندرجہ ذیل مزید تفصیل ہے:

(۱) رکاز کی زکوٰۃ کا مصرف امام مالکؒ' ابو حنیفہ اور جمہور کے نزدیک مال غنیمت کا مصرف ہے' یعنی حکومت اسے اپنی ضروریات اور رفاہ عامہ کے کاموں میں صرف کرے گی۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اس کا مصرف عام زکوٰۃ کا مصرف ہے۔ امام احمدؒ سے دونوں قسم کی روایات ملتی ہیں۔ (الفتح الربانی)۔

(۲) جمہور کے نزدیک رکاز پر زکوٰۃ ہر شخص سے وصول کی جائے گی، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ امام شافعیؒ کے نزدیک غیر مسلم سے یہ وصول نہ کی جائے گی، کیونکہ غیر مسلم زکوٰۃ کا مکلف نہیں ہے۔ (ایضاً)

(۳) حنفیہ کے نزدیک معدن کی تین قسمیں ہیں: ایک وہ جسے گرم کر کے اس پر مہر لگائی جا سکتی ہو' جیسے سونا' چاندی' پیتل' تانبہ' لوہا' سکہ وغیرہ۔ دوسری مائع جیسے پٹرول اور مٹی کا تیل وغیرہ۔ تیسری وہ جو نہ مائع ہو اور نہ اس پر گرم کر کے مہر لگائی جا سکتی ہو' جیسے جواہر اور یاقوت وغیرہ۔ ان تین قسموں میں سے زکوٰۃ صرف پہلی قسم پر واجب ہے۔ دوسری اور تیسری قسم پر زکوٰۃ نہیں البتہ پارہ پر زکوٰۃ واجب ہے اگرچہ وہ مائع ہے۔

شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک زکوٰۃ صرف سونے اور چاندی پر ہے' دوسری کسی دھات پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

حنبلیہ کے نزدیک زمین سے ہر نکلنے والی معدن پر زکوٰۃ واجب ہے خواہ وہ جامد ہو یا مائع۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ)۔

زکوٰۃ کی ادائیگی اور تقسیم

۱۔ فرض ہو جانے کے بعد زکوٰۃ کا جلد سے جلد ادا کرنا ضروری ہے:

حضرت عقبہ بن حارثؓ سے روایت ہے کہ میں نے ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عصر کی نماز پڑھی۔ سلام پھیرنے کے بعد آپؐ فوراً اٹھے اور گھر تشریف لے گئے پھر باہر آئے اور جب آپ نے لوگوں کے چہروں پر تعجب کے آثار دیکھے' تو فرمایا۔ "مجھے نماز میں یاد آیا کہ ہمارے گھر میں سونے کا ایک ٹکڑا ہے۔ مجھے یہ بات پسند نہ آئی کہ اس حال میں رات ہو جائے کہ یہ ہمارے پاس رکھا ہو۔ لہذا میں نے اس کے تقسیم کرنے کا حکم دے دیا۔" (بخاری' احمد)۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے۔ "کوئی زکوٰۃ کسی مال سے نہیں ملتی' مگر اسے ہلاک کر دیتی ہے یعنی جب کسی مال پر زکوٰۃ واجب ہو جائے' تو اسے جلد از جلد ادا کر دینا چاہیے)[۱] (بخاری فی التاریخ، مسند شافعی)

۲۔ زکوٰۃ کا پیشگی ادا کرنا جائز ہے:

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ حضرت عباسؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی زکوٰۃ سال پورے ہونے سے پہلے پیشگی ادا کرنے کے متعلق دریافت کیا' تو آپ نے انہیں اجازت دے دی"۔[۲] (ابوداؤد' ترمذی' احمد)۔

۳۔ جس مقام سے زکوٰۃ لی جائے' اس کا وہیں تقسیم کرنا ضروری ہے:

اکثر علمائے سلف کے نزدیک زکوٰۃ جس مقام سے وصول کی جائے' اس کا وہیں

۱۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک زکوٰۃ کے ادا کرنے میں اس وقت تک تاخیر جائز ہے جب تک اس کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم مطلق ہے۔ اس کے لیے کسی مدت کی تعیین نہیں ہو سکتی (المغنی ج ۲ ص ۵۴۱)۔

۲۔ امام مالکؒ کے نزدیک زکوٰۃ کا پیشگی ادا کرنا صحیح نہیں ہے۔ ان کا استدلال ان احادیث سے ہے جن میں سال گزرنے کا ذکر ہے۔ (نیل الاوطار ج ۴' ص ۱۲۸)۔

تقسیم کرنا ضروری ہے۔ اس کا بلا وجہ دوسری جگہ منتقل کرنا مکروہ ہے۔ ہاں اگر وہ وہاں سے فالتو ہو اور دوسری جگہ اس کی ضرورت ہو' تو اس کا منتقل کرنا جائز ہے۔

حضرت ابی جحیفہؓ سے روایت ہے کہ ہمارے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقرر کردہ عامل زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے آیا۔ اس نے ہمارے اغنیاء سے زکوٰۃ وصول کی اور ہمارے فقراء میں تقسیم کر دی۔ میں بھی ایک یتیم لڑکا تھا' مجھے بھی اس نے ایک اونٹنی دی۔ (ترمذی)۔

حضرت عمران بن حصینؓ کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے عامل بنا کر بھیجا گیا۔ جب وہ واپس آئے' تو ان سے پوچھا گیا۔ "مال کہاں ہے؟" انہوں نے کہا۔ "مال کے لیے تم نے مجھے بھیجا تھا۔ میں نے اسے وصول کیا' جہاں سے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وصول کرتے تھے اور اسے وہیں تقسیم بھی کر دیا' جہاں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تقسیم کرتے تھے۔" (ابو داؤد۔ ابن ماجہ)۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عامل دوسری جگہوں سے زکوٰۃ کا مال مدینہ لایا کرتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے مہاجرین و انصار کے درمیان تقسیم فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن ہلال ثقفیؓ سے مرسل روایت ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا۔ "آپ کے بعد تو زکوٰۃ کی ایک ایک رسی اور ایک ایک بکری کے بارے میری جان ہی نکل جائے گی (یعنی آپ کے عامل جاتے ہیں اور ہم سے ایک ایک رسی اور ایک ایک بکری وصول کر کے مدینہ لے آتے ہیں) آپؐ نے فرمایا "اگر یہ (رسی اور بکری) مہاجرین کے نادار لوگوں کو نہ دی جاتی ہوتی' تو ہم اسے نہ لیتے۔" (نسائی)

عمرو بن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے دادا کے ذریعے روایت کرتے ہیں کہ حضرت معاذ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (زکوٰۃ و صدقات وصول کرنے کے لیے) یمن بھیجا تھا۔ آپ وہیں رہے' یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی۔ پھر حضرت عمرؓ کے زمانے میں واپس آ گئے' تو حضرت عمرؓ نے انہیں واپس کر دیا۔ حضرت معاذؓ نے پہلے سال لوگوں کی تہائی زکوٰۃ حضرت عمرؓ کے پاس بھیجی۔ حضرت عمرؓ نے (وصول کرنے سے) انکار کیا اور فرمایا "میں نے تمہیں صدقات یا جزیہ کا مال لانے والا بنا کر نہیں بھیجا تھا' بلکہ اس لیے بھیجا تھا کہ تم

خوش حال لوگوں سے وصول کرو اور حاجت مندوں میں تقسیم کرو۔" حضرت معاذؓ نے کہا۔ "میں نے آپ کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں بھیجی، جس کا لینے والا یہاں کوئی ہوتا۔" دوسرے سال حضرت معاذؓ نے آدھی زکوٰۃ بھیجی تو پھر ان میں اور حضرت عمرؓ میں یہی تکرار ہوئی۔ تیسرے سال حضرت معاذؓ نے پوری زکوٰۃ بھیجی تو پھر ان میں اور حضرت عمرؓ میں یہی تکرار ہوئی۔" (کتاب الاموال لابی عبید)[1]

۴۔ زکوٰۃ ادا کرتے وقت دعا:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جب تم زکوٰۃ ادا کرو، تو اس کا ثواب نہ بھولو (اور اس کا ثواب یہ ہے) کہ تم یہ کہو:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْھَا مَغْنَماً وَّلَا تَجْعَلْھَا مَغْرَماً۔ (ابن ماجہ) ؎

اے اللہ تو اسے فائدہ مند بنا، اسے جرمانہ نہ بنا۔

یہ حدیث ضعیف ہے۔

۵۔ زکوٰۃ وصول کرتے وقت دعا:

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی صدقہ (فرض زکوٰۃ یا نفل صدقہ) آتا، تو فرماتے:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی آلِ فُلَانٍ۔ (بخاری و مسلم)

اے اللہ! فلاں گھر والوں پر اپنی رحمت نازل فرما۔

۱۔ یہ اکثر علمائے سلف کا مسلک ہے جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ حنفی فقہ کی کتاب در مختار میں ہے: زکوٰۃ کا ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل کرنا مکروہ ہے، ہاں یہ کہ وہاں رشتہ داری ہو، یا وہاں ضرورت ہو، یا وہاں بھیجنا مسلمانوں کے حق میں زیادہ بہتر ہو، یا یہ کہ اسے دارالحرب سے دارالاسلام بھیجا جائے، یا اسے طالب علم یا پرہیزگار لوگوں کے لیے بھیجا جائے یا اسے سال پورا ہونے سے پہلے بھیجا جا رہا ہو، تو ایسی صورت میں زکوٰۃ کا منتقل کرنا مکروہ نہیں ہے (بذل المجہود مجلد ۳ ج ۱، ص ۳۹)۔

امام شافعیؒ، مالکؒ، سفیان ثوری اور بعض دوسرے ائمہ کے متعلق روایت ہے کہ ان کے نزدیک زکوٰۃ جس مقام سے وصول کی جائے، اس کے علاوہ کسی دوسرے مقام کے حاجت مندوں میں اس کا تقسیم کرنا جائز ہی نہیں ہے۔ "دوسروں کے نزدیک جائز تو ہے مگر مکروہ ہے۔ (نیل الاوطار ج ۴، ص ۱۲۹)۔

ب۔ زکوٰۃ کے مصارف

زکوٰۃ لینے کے حق دار آٹھ قسم کے لوگ ہیں۔ ان سب کا ذکر قرآن پاک کی اس آیت میں ہوا ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۝ (التوبہ: ٦٠)

یہ صدقات دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں، اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مقصود ہو۔ نیز یہ کہ گردنوں کے چھڑانے اور قرض داروں کی مدد کرنے میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کی امداد کرنے کے لیے ہیں۔

ذیل میں ہم ان سب کا الگ الگ ذکر کرتے ہیں:

ا۔ب: فقیر اور مسکین:

یہ دونوں لفظ تقریباً ہم معنی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا اطلاق دوسرے پر ہو سکتا ہے۔ فقیر کے لفظی معنی حاجت مند اور مسکین کے لفظی معنی عاجز اور بے چارہ کے ہیں۔ مسکین کی تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمائی ہے: "مسکین وہ ہے جو اپنی حاجت بھر مال نہ پاتا ہو اور نہ پہچانا جاتا ہو کہ اس کی مدد کی جا سکے اور نہ وہ کھڑا ہو کر لوگوں سے سوال کرتا ہو۔" (بخاری و مسلم)[1]

۱۔ جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا فقیر اور مسکین تقریباً ہم معنی لفظ ہیں اور ان سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو مدد کے محتاج ہوں۔ تاہم ائمہ کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ مسکین اور فقیر میں سے زیادہ تنگ دست اور خستہ حال کون ہے؟ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مسکین، فقیر کی نسبت زیادہ تنگ دست اور خستہ حال ہے۔ ان کے نزدیک مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو اور فقیر وہ جس کے پاس مال تو ہو لیکن وہ اسکی ضرورت کے لیے کافی نہ ہو۔ ان کا استدلال قرآن کی ان دو آیتوں سے ہے: اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ (البلد: ١٦) یعنی وہ مسکین جو اپنی تنگ دستی کی وجہ سے مٹی سے مل گیا ہو۔

غنی کی وہ حد کونسی ہے جس کے بعد کوئی شخص زکوٰۃ لینے کا مستحق نہیں رہتا' اس بارے میں کئی احادیث ہیں جنہیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں :

(۱) حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جس شخص نے سوال کیا حالانکہ اس کے پاس ایک اوقیہ ساڑھے ۱۰ تولہ چاندی یا اس کی قیمت) ہو' تو اس نے الحاف کیا۔" (یعنی پیچھے پڑ کر سوال کیا جس کی قرآن پاک میں مذمت کی گئی ہے)۔ (احمد' ابو داؤد' نسائی)۔

(۲) حضرت سہل بن حنظلہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو شخص سوال کرتا ہے حالانکہ اس کے پاس وہ چیز ہو جو اسے غنی (بے حاجت) بناتی ہو' تو گویا وہ جہنم کے انگارے سمیٹتا ہے۔" صحابہ نے پوچھا "اے اللہ کے رسول! وہ چیز کیا ہے جو اسے غنی بناتی ہے؟" فرمایا "اس کا دوپہر کا کھانا یا شام کا کھانا۔" دوسری روایت میں "یا" کے بجائے "اور" کا لفظ ہے۔ (احمد' ابو داؤد)۔

(۳) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو شخص سوال کرتا ہے' حالانکہ اس کے پاس وہ چیز ہو جو اسے غنی بناتی ہو' تو اس کا مانگا

---

(۲) لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ (خاص طور پر مدد کے مستحق وہ فقیر ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنی ذاتی کسب معاش کے لیے زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوشحال ہیں۔) (البقرہ : ۲۷۳)

امام شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ وغیرہ کے نزدیک فقیر کی تنگدستی اور خستہ حالی مسکین سے زیادہ ہے۔ ان کا استدلال قرآن کی اس آیت سے ہے : أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ (رہی کشتی تو وہ چند ایسے مسکینوں کی تھی جو سمندر میں کام کرتے تھے) نیز ان کا استدلال اوپر کی حدیث سے بھی ہے اور اس سے بھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فقر سے پناہ مانگتے تھے اور یہ دعا فرمایا کرتے تھے : "اے اللہ مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھ' مسکینی کی حالت میں موت دے اور مسکینوں کی جماعت کے ساتھ میرا حشر فرما۔" (حاکم روایت حضرت ابو سعیدؓ)۔

(الکہف : ۷۹)

امام مالکؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک فقیر اور مسکین یکساں ہیں۔ (احکام القرآن للجصاص۔ نیل الاوطار ج ۴' ص ۱۳۵)

ہوا صدقہ قیامت کے روز اس کے چہرے پر نوچ کا نشان بن کر آئے گا۔" صحابہ نے پوچھا "اے اللہ کے رسولؐ! اس کا غنی ہونا (بے حاجتی) کیا ہے؟" فرمایا "پچاس درہم ساڑھے ۱۳ تولہ چاندی) یا ان کے برابر سونا۔" (ابوداؤد' ترمذی' نسائی ابن ماجہ' احمد)۔ اس حدیث پر سند کے لحاظ سے بہت سے محدثین نے کلام کیا ہے۔

ان احادیث کی بنا پر مختلف ائمہ نے غنی کی مختلف حد مقرر کی ہے' جس کی تفصیل حاشیہ میں درج ہے۔[1]

۱۔ امام سفیان ثوریؒ' عبداللہ بن مبارکؒ' حسن بن صالحؒ اور اسحاق بن راہویہؒ کا مسلک تیسری حدیث کے مطابق ہے۔ یعنی جو شخص ۵۰ درہم ساڑھے ۱۳ تولہ چاندی) یا ان کے برابر سونے (نقدی) کا مالک ہو اسے زکوٰۃ نہیں دی جائے گی۔ قاضی شوکانیؒ نے بھی مندرجہ ذیل احادیث میں تطبیق دیتے ہوئے پچاس درہم کو غنی کی حد قرار دیا ہے' کیونکہ یہ مقدار سب سے زیادہ ہے (نیل الاوطار ج ۴ ص ۱۳۶۔ ۱۳۷)

امام مالکؒ اور شافعیؒ کے نزدیک پچاس درہموں سے غنی کی حد مقرر نہیں ہو جاتی بلکہ اصل چیز انسان کی حالت ہے۔ اگر اس کے پاس اتنا مال ہے جو اس کی ضرورت کی لیے کافی ہے تو اس پر زکوٰۃ کا لینا حرام ہے (خواہ یہ مال مقدار کے لحاظ سے کم ہو یا زیادہ) لیکن اگر اتنا مال نہ ہو جو اس کی ضرورت کے لیے کافی ہو (خواہ وہ مقدار کے لحاظ سے کم ہو یا زیادہ) تو اس کے لیے زکوٰۃ کا لینا جائز ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ "ایسا ہو سکتا ہے کہ آدمی درہموں کی تعداد اور اپنی آمدنی کے لحاظ سے غنی ہو لیکن اس کی ضرورت اپنی اور کثرت عیال کی وجہ سے ہزار درہم سے بھی پوری نہ ہوتی ہو۔" (معالم السنن ج ۲ ص ۲۲۷)

امام احمدؒ سے دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت میں ان کا مسلک امام شافعیؒ اور مالکؒ کے مطابق ہے اور دوسرا مسلک یہ ہے کہ انسان پچاس درہم نقدی کا مالک ہو یا وہ ہر روز اتنا کما لیتا ہو جو اس کی ضروریات کے لیے کافی ہو۔ (المغنی ج ۲ ص ۶۹۳)۔

امام ابو عبید بن سلامؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک غنی کی حد اوپر کی دوسری حدیث کے مطابق چالیس درہم ہے۔ پچاس درہم والی حدیث کو وہ ضعیف قرار دیتے ہیں یا یہ کہ اس سے سوال کرنا مکروہ ہو جاتا ہے حرام نہیں ہوتا۔ (معالم السنن ج ۲ ص ۲۲۶)۔

امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے شاگردوں کے نزدیک اوپر کی احادیث میں غنی کی اس حد کا ذکر نہیں ہے' جس کے بعد کسی شخص کو زکوٰۃ دینا یا اس کا زکوٰۃ قبول کرنا جائز نہ ہو بلکہ ان میں اس مقدار کا ذکر ہے جس کے بعد انسان کے لیے خود سوال کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ زکوٰۃ کے لینے اور اس کا خود سوال کرنے میں فرق

مانگنے اور سوال کرنے کی مذمت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی اور احادیث ثابت ہیں' جن میں سے ہم صرف دو کا ذیل میں ذکر کرتے ہیں :

(۱) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو شخص اپنا مال بڑھانے کے لیے لوگوں سے سوال کرتا ہے' وہ آگ کے انگارے مانگتا ہے۔ اسے اختیار ہے چاہے ان کی زیادہ مقدار جمع کر لے یا کم۔" (مسلم' احمد' ابن ماجہ)۔

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ: "اگر تم میں سے کوئی شخص صبح چلا جائے اور (جنگل سے) اپنی پیٹھ پر لکڑیاں کاٹ کر لے آئے اور پھر (انہیں فروخت کر کے) صدقہ و خیرات کرے اور لوگوں سے بے نیاز ہو جائے' تو یہ اس بات سے بہتر ہے کہ وہ کسی شخص سے سوال کرے خواہ وہ اسے دے یا نہ دے"

چاندی) یعنی نقدی کا نصاب ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "زکوۃ اغنیاء سے لی جائے گی اور فقراء میں لوٹا دی جائے گی۔ اب جب ایک شخص ۲۰۰ درہم سے غنی شمار ہوتا ہے تو یہ ضروری ہے کہ جو شخص ۲۰۰ درہم نہ رکھے اسے فقیر شمار کیا جائے۔ نیز ایک مرسل روایت میں نبیؐ کا ارشاد ہے کہ "جس شخص نے سوال کیا حالانکہ اس کے پاس پانچ اوقیہ (۲۰۰ درہم) کے برابر مال ہو تو اس نے الحاف کیا۔" (احکام القرآن للجصاص ج ۳' ص ۱۵۸' ۱۵۹) (بذل المجہود ج ۳ جزء ۱' ص ۳۹)

واضح رہے کہ یہ سارا اختلاف اس صورت میں ہے جبکہ انسان کے پاس نقدی ہو۔ اب رہی یہ صورت کہ اس کے پاس نقدی تو نہ ہو' لیکن وہ چیزیں ہوں' جن پر زکوۃ واجب نہیں ہے' جیسے مکان یا پہننے کے کپڑے وغیرہ' تو اس کے لیے زکوۃ لینا سب کے نزدیک جائز ہے جبکہ ان چیزوں سے اس کی ضرورت پوری نہ ہو رہی ہو۔ لیکن اگر یہ چیزیں وہ ہیں جن پر زکوۃ واجب ہے اور وہ نصاب کے برابر یا اس سے زیادہ ہیں' جیسے غلے اور جانور وغیرہ' تو امام احمدؒ' شافعیؒ کے نزدیک اس کے لیے پھر بھی زکوۃ لینا جائز ہے' جبکہ ان چیزوں سے اس کی ضرورت پوری ہو رہی ہو۔ امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے شاگردوں کے نزدیک اس کے لیے زکوۃ لینا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ خود صاحب نصاب ہے۔

اور اگر وہ کسی ایسی چیز کا مالک ہو جو نقدی تو نہ ہو لیکن اس سے اس کی ضرورت پوری ہو رہی ہو جیسے ضرورت بھر روزی یا مکان وغیرہ کا کرایہ' تو امام احمدؒ' شافعیؒ' مالکؒ اور بعض دوسروں کے نزدیک اسے زکوۃ دینا ناجائز ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے شاگردوں کے نزدیک جائز ہے۔ البتہ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں : "ایسے شخص کو زکوۃ دینا غیر مناسب ہے' لیکن اگر دے دی جائے تو وہ لگ جائے گی' کیونکہ وہ بہر حال

(بخاری و مسلم)۔

لیکن اگر کسی شخص کو کوئی مال سوال کیے بغیر ملے' تو اسے قبول کر لینا چاہیے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کچھ مال عنایت فرمایا کرتے تھے۔ میں آپؐ سے کہتا کہ اسے کسی ایسے شخص کو دے دیجیے جو مجھ سے زیادہ حاجتمند ہو۔ "آپ فرماتے" "اسے لے لو۔ اگر تمہیں کچھ ایسا مال ملے جس کے لینے کے تم درپے نہ ہو اور نہ اس کا سوال کر رہے ہو تو اسے لے لو اور جو مال تمہیں خود نہ مل رہا ہو' اس کے پیچھے نہ پڑو۔" (بخاری و مسلم)۔

یہ ہدایات سوال کرنے والے کے لیے ہیں' لیکن دوسری طرف دینے والے کے لیے یہ ہدایت ہے کہ مانگنے والے پر حسن ظن سے کام لیا جائے۔

حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "سوال کرنے والے کا حق ہے' خواہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔" (احمد' ابو داؤد)۔

ج : عاملین (وہ لوگ جو صدقات وصول کرنے پر مامور ہوں) :

جن لوگوں کو صدقات وصول کرنے اور وصول شدہ مال کی حفاظت کرنے اور ان کا حساب کتاب رکھنے اور انہیں تقسیم کرنے کے لیے مقرر کیا جائے' ان کی تنخواہ صدقات کی مد سے دی جا سکتی ہے' خواہ ایسے لوگ فقیر و مسکین نہ ہوں۔

بسر بن سعیدؓ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن سعدی مالکیؓ بیان کرتے ہیں کہ مجھے حضرت عمرؓ نے صدقہ وصول کرنے کے کام پر لگایا' جب میں کام سے فارغ ہوا اور میں نے مال ان کے حوالے کر دیا تو انہوں نے حکم دیا کہ مجھے اجرت دی جائے۔ میں نے عرض کیا۔ "میں نے اللہ کے لیے کام کیا ہے۔" فرمایا "جو کچھ تمہیں دیا جائے' اسے لے لو۔ اس لیے کہ میں نے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں (صدقات کے جمع کرنے کا) کا کام کیا تھا۔ آپؐ مجھے اجرت دینے لگے تو میں نے وہی بات کہی جو تم نے کہی ہے' اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔ اگر تمہیں کوئی چیز تمہارے سوال کرنے کے بغیر دی جائے تو اسے لے کر کھاؤ پیو اور اس میں سے خیرات کرو۔" (بخاری و مسلم)۔

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "زکوٰۃ کا لینا غنی

کے لیے جائز نہیں ہے' مگر پانچ قسم کے آدمی غنی ہونے کے باوجود اسے لے سکتے ہیں۔ ایک وہ جو اس پر مامور ہو' دوسرا وہ جس نے اسے اپنے مال سے خریدا ہو' تیسرا وہ جو مقروض ہو' چوتھا وہ جو اللہ کی راہ میں جنگ کرنے والا ہو اور پانچواں وہ جس کو کوئی فقیر زکوٰۃ لے کر ھدیہ کر دے۔" (احمد' ابوداؤد' ابن ماجہ' حاکم)۔

البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات اور اپنے خاندان (یعنی بنو ہاشم) پر اس مد میں بھی زکوٰۃ لینا حرام قرار دیا ہے۔

حضرت عباسؓ کے بیٹے فضل اور ان کے بھائی کے پوتے مطلب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دونوں میں سے ایک نے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسول! ہم آپؐ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ صدقات کے کام پر ہمیں مامور فرمادیں تاکہ جو فائدہ (اجرت) لوگ حاصل کرتے ہیں' ہم بھی حاصل کریں' اور جو (صدقہ و خیرات) لوگ آپؐ کو دیتے ہیں ہم بھی دیں۔" فرمایا' صدقہ[1] نہ محمدؐ کے لیے حلال ہے اور نہ اس کی آل (خاندان) کے لیے۔ یہ لوگوں کے ہاتھوں کا میل ہے۔" (احمد و مسلم)۔

د : مؤلفۃ القلوب۔ وہ لوگ جن کی تالیف قلب مقصود ہو :

تالیفِ قلب کے معنی ہیں دل موہنا۔ اس مد میں مسلمان اور کافر دونوں کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ اس بارے میں متعدد احادیث ثابت ہیں۔ جن میں سے ہم صرف دو کا ذکر کرتے ہیں :

حضرت عمرو بن تغلبؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ مال یا غلام آئے۔ آپ نے بعض لوگوں کو عطیے دیے اور بعض کو چھوڑ دیا۔ اس کے بعد آپ کو اطلاع ملی کہ جن لوگوں کو آپؐ نے چھوڑ دیا ہے' وہ خفا ہیں۔ اس پر آپؐ نے خطبہ دیا اور حمد و ثنا کے بعد فرمایا "اللہ کی قسم میں ایک آدمی کو دیتا ہوں اور دوسرے کو چھوڑ دیتا ہوں۔ جس شخص کو میں چھوڑتا ہوں' وہ مجھے اس شخص کی نسبت زیادہ عزیز ہے جسے میں دیتا ہوں۔ دراصل میں ایسے لوگوں کو دیتا ہوں' جو دل میں بے چینی اور بے صبری محسوس کرتے ہیں۔ جن لوگوں کو

---

[1] ۔ یہاں صدقہ سے مراد فرض زکوٰۃ ہے جس کے بنی ہاشم پر حرام ہونے پر سب کا اتفاق ہے نفلی صدقہ کے متعلق اختلاف ہے۔ مفصل بحث آئندہ صفحات پر آرہی ہے۔

میں نہیں دیتا' دراصل میں ان کے لیے ان کے دلوں کے غنا اور خیر ہی کو کافی سمجھتا ہوں۔ عمرو بن تغلب ایسے ہی لوگوں میں سے ہیں۔" (اس کے بعد راوی۔۔۔ حضرت عمرو بن تغلب کہتے ہیں) "اللہ کی قسم! نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ مبارک کے بدلے میں اگر مجھے سرخ اونٹ بھی دیے جائیں' تو مجھے یہ پسند نہیں۔" (احمد' بخاری)۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کی خاطر جو چیز بھی مانگی جاتی' آپؐ دے دیتے۔ ایک مرتبہ آپؐ کے پاس ایک آدمی آیا' تو آپؐ نے دو پہاڑوں کے درمیان جو زکوٰۃ کی بکریاں تھیں ان میں سے اس شخص کو بہت سی بکریاں دینے کا حکم دیا۔ پھر وہ شخص اپنے قبیلہ کی طرف لوٹ گیا اور لوگوں سے کہنے لگا۔ "اے لوگو! مسلمان ہو جاؤ' اس لیے کہ محمدؐ اس شخص کی طرح عطیہ دیتے ہیں جسے فاقہ کا کوئی اندیشہ نہ ہو" (احمد) [1]

---

[1] یہ امر متفق علیہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بہت سے لوگوں کو تالیف قلب کے لیے وظیفے اور عطیے دیے جاتے تھے' لیکن اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا آپ کے بعد بھی یہ مد باقی ہے کہ نہیں؟ امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے اصحاب کی رائے یہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ سے یہ مد ساقط ہو گئی اور اب مولفۃ القلوب کو کچھ دینا ناجائز ہے' یہی رائے امام اسحاقؒ' سفیان ثوریؒ اور کوفہ کے دوسرے فقہاء کی ہے (ترمذی)

ان کا استدلال اس واقعہ سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عیینہ بن حصین اور اقرع بن حابس حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے اور انہوں نے آپ سے ایک زمین طلب کی۔ حضرت ابو بکرؓ نے انہیں عطیہ کا فرمان لکھ دیا۔ انہوں نے چاہا کہ مزید پختگی کے لیے دوسرے بڑے بڑے صحابہ سے بھی اس فرمان پر گواہی حاصل کر لیں' چنانچہ گواہیاں بھی ہو گئیں۔ مگر جب یہ لوگ حضرت عمرؓ کے پاس آئے' تو انہوں نے فرمان کو پڑھ کر ان کے سامنے چاک کر دیا اور ان سے کہا "بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں کی تالیف قلب کے لیے تمہیں دیا کرتے تھے مگر وہ اسلام کی کمزوری کا زمانہ تھا۔ اب اللہ نے اسلام کو تم جیسے لوگوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔" اس پر وہ حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے اور ان سے کہا۔ "خلیفہ آپ ہیں یا عمرؓ؟" لیکن نہ تو حضرت ابو بکرؓ نے اس پر کوئی نوٹس لیا اور نہ دوسرے صحابہؓ میں سے کسی نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اختلاف کیا۔" (احکام القرآن الجصاص ج ۳ ص ۱۵۳)۔

امام شافعیؒ اور بعض مالکیہ کے نزدیک فاسق مسلمانوں کو تالیف قلب کے لیے زکوٰۃ کی مد سے دینا

ھ: فی الرقاب (غلاموں کی گردنیں چھڑانے یا ان کی گردنوں کو خرید کر آزاد کرنے کے لیے):

غلاموں کو آزاد کرانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ مکاتب کی آزادی حاصل کرنے میں مدد کی جائے۔ مکاتب سے مراد وہ غلام ہے جس نے اپنے مالک سے یہ معاہدہ کیا ہو کہ اگر میں اتنی رقم تمہیں دے دوں' تو تم مجھے آزاد کر دو گے۔ دوسرے یہ کہ غلام کو خرید کر آزاد کیا جائے۔ ان دونوں صورتوں میں خرچ کرنے کی فضیلت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تین شخص ایسے ہیں جن کی مدد کرنا اللہ پر حق ہے (یعنی اللہ ان کی ضرور مدد کرتا ہے) ایک اللہ کی راہ میں جنگ کرنے والا' دوسرا وہ مکاتب جو اپنی رقم ادا کرنا چاہتا ہے۔ تیسرا وہ شخص جو پاکدامنی حاصل کرنے کے لیے نکاح کرتا ہے۔"[1] (ترمذی' احمد' نسائی' ابن ماجہ)۔

جائز ہے' لیکن کفار کو نہیں۔

امام حسن بصریؒ' زھریؒ' احمد بن حنبلؒ اور سلف میں بعض دوسرے اہل علم کے نزدیک مولفۃ القلوب کا حصہ اب بھی کفار اور مسلمان دونوں کے لیے باقی ہے' اگر اس کی ضرورت ہو۔" (الفتح الربانی ج ۹ ص ۶۲)۔

۱۔ سلف کے درمیان اختلاف اس بارے میں ہے کہ قرآن کے لفظ "فِی الرِّقَاب" سے مراد دونوں میں سے کونسی صورت ہے؟ حضرت علیؓ' سعید بن جبیرؒ' لیثؒ' سفیان ثوریؒ' ابراہیم نخعیؒ' شعبیؒ' محمد بن سیرینؒ' حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک اس سے مراد گردنوں کو چھڑانا یعنی صرف پہلی صورت ہے۔ کیونکہ اوپر کی دوسری حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "گردن کے چھڑانے" کو جان کے آزاد کرانے سے الگ چیز فرمایا ہے اور قرآن میں صرف "گردن کے چھڑانے" کے لیے خرچ کرنے کا حکم ہے (احکام القرآن للجصاص ج ۳' ص ۱۰۵)۔

امام مالکؒ کے نزدیک اس سے صرف دوسری صورت یعنی "گردنوں کو خرید کر آزاد کرنا" ہے۔

حضرت ابن عباسؓ' حسن بصریؒ' اسحاقؒ' ابو عبیدؒ اور ابو ثورؒ کے نزدیک اس سے مراد دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔ امام احمدؒ سے دو روایتیں ہیں۔ ایک میں ان کے نزدیک صرف پہلی صورت جائز ہے اور دوسری میں دونوں۔ (المغنی والشرح الکبیر ج ۲ ص ۲۹۹)۔

د : غارمین (قرض داروں کی امداد کرنے میں) :

غارمین سے مراد وہ قرض دار ہیں' جو اگر اپنے مال سے پورا قرض ادا کر دیں' تو فقیر ہو جائیں اور ان کے لیے سوال کرنا جائز ہو جائے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "مانگنا صرف تین آدمیوں کے لیے جائز ہے لذی فقر مدقع (وہ فقیر جو اپنی تنگدستی کی وجہ سے زمین سے لگ گیا ہو) ولذی غُرم مُفظِع (حد سے زیادہ مقروض) اور لذی دم مُوجِع (جس کا کوئی رشتہ دار یا دوست قتل کر دے اور وہ اس کی طرف سے دیت ادا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لے) (احمد ابو داؤد)۔

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کچھ پھل خریدے اور ان کی وجہ سے مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ اس کا قرض بہت بڑھ گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا۔ "اس شخص کو صدقہ دو۔" لوگوں نے صدقہ دیا' لیکن وہ اتنا نہ ہوا کہ اس سے اس کا قرض ادا ہو سکتا۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قرض خواہوں سے فرمایا۔ "جو کچھ تمہیں مل رہا ہے' وہ لے لو' اس کے علاوہ تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔" (مسلم)[1]

ز : فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں) :

"اللہ کی راہ" کا لفظ قرآن مجید میں عام استعمال ہوا ہے' لیکن جمہور سلف کے نزدیک اس سے مراد اللہ کی راہ میں جہاد اور غزوہ (وہ جدوجہد جس سے مقصود نظام کفر کو مٹانا اور اس کی جگہ اسلامی نظام کو قائم کرنا ہو) ہے۔

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "زکوٰۃ کا لینا غنی کے لیے جائز نہیں ہے' مگر پانچ قسم کے آدمی غنی ہونے کے باوجود زکوٰۃ لے سکتے ہیں :

۱۔ قرض دار کو زکوٰۃ دینے کے متعلق امام حسن بصریؒ اور بعض دوسرے فقہاء کی رائے یہ ہے کہ جس آدمی نے بد اعمالیوں اور فضول خرچیوں میں اپنا مال اڑا کر اپنے آپ کو قرضداری میں مبتلا کر لیا ہو' اس کی مدد نہ کی جائے' جب تک کہ وہ توبہ نہ کر لے۔ ائمہ اربعہ اور دوسرے فقہا کے نزدیک یہ شرط نہیں ہے۔ (نیل الاوطار ج ۴' ص ۱۴۴)

(۱) وہ جو اس پر مامور ہو (۲) وہ جس نے اسے اپنے مال سے خریدا ہو (۳) وہ جو مقروض ہو (۴) وہ جو اللہ کی راہ میں غزوہ (جنگ) کرنے والا ہو اور (۵) یہ کہ کسی مسکین کو زکوٰۃ دی جائے اور وہ اسے کسی غنی کو بطور ھدیہ دے دے" (ابوداؤد' ابن ماجہ' احمد' مالک' بیہقی' حاکم)۔[1]

بعض احادیث میں حج کو بھی "اللہ کی راہ" میں سے بتایا گیا ہے۔

حضرت ابن لاس خزاعیؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حج کے سفر کے لیے زکوٰۃ کے اونٹوں پر سوار کرایا۔ (مسند امام احمد' بخاری تعلیقاً)۔

حضرت اُم معقلؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حجۃ الوداع کے موقع پر ہمارے پاس ایک اونٹ تھا' جسے (میرے شوہر) ابو معقلؓ نے "اللہ کی راہ میں" صدقہ کر دیا تھا۔ ہمیں بیماری پہنچی اور اس میں ابو معقلؓ کا انتقال ہو گیا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم حج سے فارغ ہوئے اور (مدینہ واپس تشریف لائے) تو میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپؐ نے مجھ سے دریافت فرمایا۔ "اے اُم معقل! تم ہمارے ساتھ حج پر کیوں نہیں گئیں؟" میں نے عرض کیا "ہم نے تیاری کی تھی کہ ابو معقل کا انتقال ہو گیا اور ہمارے پاس ایک اونٹ

---

[1] امام مالکؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ اور اسحاق بن راھویہ کے نزدیک اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہر شخص کے لیے' خواہ جہاد کے لیے اسے کسی مدد کی ضرورت نہ ہو' زکوٰۃ کا لینا جائز ہے۔ ان کا استدلال مذکورہ بالا حدیث کے ظاہری الفاظ سے ہے۔ (معالم السنن ج ۲' ص ۲۳۴)۔

حنفیہ کے نزدیک زکوٰۃ صرف حاجتمند مجاہدین کو دی جائے گی' کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام لوگوں کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک وہ جن سے زکوٰۃ لی جائے' یعنی اغنیاء' دوسرے وہ جن کو زکوٰۃ دی جائے' یعنی فقراء جیسا کہ آپؐ نے فرمایا "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے اغنیاء سے زکوٰۃ لوں اور تمہارے فقراء کی طرف اسے لوٹا دوں۔" لہذا کسی غنی کے لیے غنی ہوتے ہوئے زکوٰۃ لینا جائز نہیں۔ رہی اوپر کی حدیث جس میں غنی کے لیے زکوٰۃ لینا جائز قرار دیا گیا ہے جبکہ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کر رہا ہو' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اپنے گھر پر غنی ہو' لیکن جہاد پر نکلنے کے لیے اسے مدد کی ضرورت ہو' ایسی صورت میں اسے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ اسے غنی اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے گھر پر غنی ہے۔ (یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر اسے جہاد کے لیے بھی کسی مدد کی ضرورت نہ ہو' تب بھی اسے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔) (بذل المجہود ج ۸ جز ۱۶' ص ۱۷۲)۔

تھا' جس پر ہم حج کیا کرتے تھے لیکن ابو معقلؓ نے (وفات کے وقت) وصیت کر دی کہ یہ اونٹ "اللہ کی راہ میں" صدقہ ہے۔" فرمایا "تم نے اسے لے کر حج کا سفر کیوں نہ کر لیا اس لیے کہ حج "اللہ کی راہ" میں سے ہے" (ابو داؤد)۔

لیکن یہ روایات سند کے لحاظ سے ضعیف ہیں۔ (نیل الاوطار ج ۴ ص ۱۷۰) لہذا سلف میں اکثر اہلِ علم کے نزدیک حج اور عمرہ کے لیے زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی۔ (الفتح الربانی ج ۹ ص ۷۱)[1]

ج : اِبْنُ السَّبِيلِ (مسافر) :

مسافر خواہ غنی ہو' تب بھی اس کے لیے زکوٰۃ کا لینا جائز ہے :

حضرت ابو سعیدؓ کی مذکورہ بالا حدیث کے الفاظ دوسری روایت میں یوں ہیں : زکوٰۃ کا لینا غنی کے لیے جائز نہیں ہے مگر اللہ کی راہ میں' یا مسافر کے لیے یا یہ کہ تمہارا پڑوسی

۱۔ حضرت ابن عباسؓ' حسن بصریؒ' اسحاقؒ اور ایک روایت میں امام احمدؒ کے نزدیک زکوٰۃ کے مال سے حاجت مند لوگوں کی حج کے لیے امداد کرنا جائز ہے۔ حنفیہ میں سے امام محمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ ان حضرات کے نزدیک مندرجہ بالا روایات قابلِ حجت ہیں۔ (الفتح الربانی ایضا۔ بذل المجہود ایضا)۔

فائدہ : بعض لوگوں کے نزدیک "فی سبیل اللہ" کے حکم کی رو سے زکوٰۃ کا مال ہر قسم کے نیکی کے کاموں میں صرف کیا جا سکتا ہے۔ مصر کے مشہور عالم سید رشید رضا لکھتے ہیں۔ "سبیل اللہ سے مراد ہر وہ راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور جنت تک پہنچانے والا ہو اور وہ پورا اسلام ہے۔ جن آیات میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے' ان کے حکم میں وہ تمام جائز چیزیں آ جاتی ہیں جن میں مال صرف کیا جا سکتا ہے۔ قرآن میں "سبیل اللہ" کا لفظ صرف جہاد اور قتال کے ساتھ ہی استعمال نہیں ہوا بلکہ اس کے ساتھ بہت سی دوسری چیزیں مثلاً ہجرت' صد' اضلال کا بھی استعمال ہوا ہے (ومن یھاجر فی سبیل اللہ ---- یصدون عن سبیل اللہ ---- یضلون عن سبیل اللہ) لہذا انما الصدقت للفقراء ---- کی آیت میں سبیل اللہ کا لفظ شرعی جنگ کو بھی شامل ہے اور اس کے علاوہ ان تمام دوسرے امور کو بھی جن سے 'اسلام کو فائدہ پہنچ سکتا ہو۔ اس کو جنگ اور جہاد کے لیے مخصوص کرنے کی کوئی معقول اور صحیح وجہ نہیں ہے" (حاشیہ المغنی ج ۲ ص ۷۰۰)۔

فقیر ہو اور اسے زکوٰۃ ملے اور وہ تمہیں ہدیہ کرے یا تمہاری دعوت کرے" (ابو داؤد) [1]

۷۔ کیا زکوٰۃ کا تمام مصارف میں تقسیم کرنا ضروری ہے؟

قرآن میں زکوٰۃ کے مصارف کا ایک ساتھ ذکر ہوا ہے، لیکن ضروری نہیں ہے کہ زکوٰۃ کو ان تمام مصارف میں تقسیم کیا جائے، بلکہ اس کا ایک یا بعض مصارف میں تقسیم کر دینا جائز ہے، لیکن اگر تمام مصارف میں اس کا تقسیم کرنا ممکن ہو، تو یہ مستحب ہے۔

حضرت معاذؓ نے جب یمن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس زکوٰۃ کا مال بھیجا، تو آپؐ نے یہ سارا مال مؤلفۃ القلوب (وہ لوگ جن کی تالیفِ قلب مقصود ہو) میں تقسیم فرما دیا۔ پھر دوبارہ مال آیا، تو اسے غارمین (قرضداروں) میں تقسیم کر دیا۔ ایک صحابی قبیصہ بن مخارقؓ نے ایک مقتول کی دیت اپنے ذمہ لی تھی۔ حضورؐ نے ان سے فرمایا "اے قبیصہ ٹھہرو۔ ہمارے پاس صدقہ آجائے، تو ہم اس میں سے تمہیں دینے کا حکم دیں۔" اسی طرح حضورؐ نے ایک دوسرے صحابی سلمہ بن صخرؓ سے فرمایا۔ "قبیلہ بنی زریق کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ اپنی زکوٰۃ تمہیں دے دیں۔" (کتاب الاموال لابی عبید) وغیرہ [2]

۱۔ امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ کے نزدیک مسافر کا غنی ہونے کے باوجود زکوٰۃ لینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خواہ اپنے گھر پر غنی ہو، لیکن حالت سفر میں مدد کا محتاج ہو جائے ایسی صورت میں اس کی اتنی مدد کی جاسکتی ہے، جس سے کہ وہ اپنے گھر پہنچ جائے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک ضروری نہیں ہے کہ وہ سفر کی حالت میں ہو بلکہ اگر وہ کسی جگہ سے سفر شروع کر رہا ہے اور وہیں واپس بھی آنا چاہتا ہے، تب بھی اس کی مدد کی جاسکتی ہے، البتہ ان کے نزدیک یہ شرط ہے کہ اس کا سفر معصیت کے لیے نہ ہو۔ (المغنی ج ۲، ص ۷۰۲)۔

۲۔ یہ امام ابو حنیفہؒ آپ کے اصحاب، امام احمدؒ، ابراہیم نخعیؒ، سفیان ثوریؒ اور ابو عبیدؒ کا مسلک ہے اور اسی کی روایت حضرت عمرؓ، علیؓ، ابن عباسؓ، معاذؓ، حذیفہؓ اور بہت سے دوسرے صحابہؓ سے ملتی ہے۔ تابعین میں سے سعید بن جبیرؒ، حسن بصریؒ اور ضحاکؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام مالکؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ لیکن ان کے نزدیک جس مصرف میں ضرورت زیادہ ہو گی، اسے مقدم رکھا جائے گا۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، عکرمہ، زھریؒ، داؤد ظاہریؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک زکوٰۃ کا تمام مصارف میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔ امام ابو ثورؒ کے نزدیک امام (حاکم) زکوٰۃ کو تمام مصارف میں تقسیم

۸۔وہ لوگ جن کے لیے زکوٰۃ کا لینا حرام ہے :

ا۔ب : غنی اور قوی مُکتسِب :

غنی اور غنیٰ کا ذکر فقیر اور مسکین' کے بیان میں گزر چکا ہے۔ قوی مکتسب (کما سکنے والے تندرست آدمی) کے لیے بھی زکوٰۃ کا لینا اس طرح حرام ہے جس طرح غنی کے لیے۔

حضرت عبداللہ بن عدی خیارؓ سے روایت ہے کہ مجھے دو آدمیوں نے بتایا کہ حجتہ الوداع کے موقع پر ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ صدقہ (زکوٰۃ) تقسیم فرمارہے تھے۔ ہم نے بھی آپؐ سے سوال کیا' تو آپؐ نے ہماری طرف نگاہ اٹھائی اور پھر نیچی کرلی۔ آپؐ نے ہمیں تندرست اور قوی پایا اور فرمایا۔ "گر تم چاہو' تو میں تمہیں دے سکتا ہوں۔ (لیکن یہ سمجھ لو کہ) ان صدقات میں غنی اور قوی مکتسب کے لیے کوئی حصہ نہیں ہے۔" (ابو داؤد۔ نسائی)[1]

ج : نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان اور اس کے موالی :

کرے گا' لیکن افراد کے لیے ایسا کرنا ضروری نہیں۔

ان کا استدلال حضرت زیاد بن حارث صدائیؓ کی اس روایت سے ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے آپؐ سے بیعت کی۔ اتنے میں ایک شخص آیا' اور اس نے عرض کیا کہ "مجھے صدقہ (زکوٰۃ) دیجیے۔" حضورؐ نے اس سے فرمایا "اللہ نے صدقات (زکوٰۃ) کا فیصلہ کسی نبی یا غیر نبی پر نہیں چھوڑا' بلکہ اس کا فیصلہ خود کردیا اور انہیں آٹھ اجزاء میں تقسیم کردیا۔ اگر تم ان اجزاء میں سے ہو' تو میں تمہیں دے سکتا ہوں۔" (ابو داؤد)

دوسروں کے نزدیک اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو آٹھ مصارف کی اطلاع دی ہے۔ اس سے یہ ضروری نہیں قرار پاجاتا کہ زکوٰۃ کو ان تمام مصارف میں تقسیم بھی کیا جائے۔ شافعی علماء جمہور کے مسلک کے قائل ہیں (الفتح الربانی ج ۹ ص ۷۳)۔

[1] حنفیہ کے نزدیک قوی آدمی کے لیے صدقہ لینا جائز ہے' جبکہ اس کے پاس بقدر نصاب مال نہ ہو۔ اوپر کی حدیث میں صرف آل کی نفی کی گئی ہے (یعنی یہ کہ اس کے لیے لینا مناسب نہیں ہے)۔ (بذل المجہود ج ۲' جزء ۱' ص ۴۲)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے لیے زکوٰۃ کا لینا حرام ہے' اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضرت حسنؓ نے صدقہ کے پھلوں میں سے ایک پھل اٹھایا اور اسے کھانے لگے' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تھو کو تھو کو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ ہم صدقہ نہیں کھاتے؟" (بخاری، مسلم) دوسری روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "صدقہ آل محمدؐ کے لیے جائز نہیں ہے۔ یہ لوگوں (کے ہاتھوں) کا میل ہے۔" (مسلم)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے موالی (آزاد کردہ غلام اور ان کی اولاد) پر بھی زکوٰۃ کا لینا حرام ہے:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ابو رافعؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنی مخزوم کے ایک آدمی کو صدقہ وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ اس شخص نے مجھ سے کہا کہ تم بھی میرے ساتھ چلو تاکہ تمہیں بھی میرے ساتھ حصہ مل جائے۔ میں نے کہا "نہیں پہلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپؐ سے دریافت کر لوں۔" چنانچہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا۔ آپؐ نے فرمایا "صدقہ ہمارے لیے حلال نہیں ہے۔ اور لوگوں کے موالی خود ان ہی میں سے ہوتے ہیں۔[2] (ابو داؤد۔ ترمذی' نسائی' احمد' ابن خزیمہ' ابن حبان)۔

۱۔ "آل محمد سے کون مراد ہیں؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک ان سے مراد صرف بنو ہاشم (حضرت علیؓ، عقیلؓ، جعفرؓ، عباسؓ اور حارثؓ کی اولاد) ہیں۔ امام شافعیؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک ان میں بنو ہاشم کے ساتھ بنو مطلب بھی شامل ہیں۔ (ہاشم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا کا اور مطلب آپؐ کے پردادا کے بھائی کا نام ہے) امام احمدؒ کے نزدیک ایک روایت میں ان سے مراد صرف بنو ہاشم ہیں اور دوسری میں بنو مطلب بھی۔ (الفتح الربانی ج ۹' ص ۸۲)۔

۲۔ امام مالکؒ اور ایک روایت میں امام شافعیؒ کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے موالی پر زکوٰۃ کا لینا حرام نہیں ہے کیونکہ ان میں حرمت کی وجہ یعنی شرف و بزرگی نہیں پائی جاتی (نیل الاوطار ج ۴' ص ۱۴۹)۔

لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ خاندان کی بیویوں کے موالی پر زکوٰۃ کا لینا حرام نہیں ہے۔

حضرت جویریہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں داخل ہوئے اور آپؐ نے دریافت فرمایا۔ "کیا کھانے کے لیے کچھ ہے؟" میں نے عرض کیا "نہیں، کچھ نہیں ہے۔ البتہ بکری کی ایک ہڈی (ران) ہے جو میری آزاد کردہ لونڈی کو صدقہ میں دی گئی تھی اور اس نے وہ ہمیں ھدیہ کے طور پر دے دی ہے۔" فرمایا "لاؤ۔ اس ران کو جہاں پہنچنا تھا، پہنچ چکی۔" (مسلم، احمد)

نیز حدیث سے یہ حکم بھی نکلتا ہے کہ جن لوگوں کے لیے صدقہ لینا حرام ہے، ان کے لیے صدقہ کی کوئی چیز کھانا جائز ہے، جبکہ وہ کسی مستحق کو صدقہ میں دے دی گئی ہو اور اس نے وہ چیز انہیں بطور تحفہ یا ہدیہ دے دی ہو۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے (نیل الاوطار ج ۴، ص ۱۴۹)۔

حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان والوں پر زکوٰۃ مطلقاً حرام کی گئی ہے، اس لیے بظاہر ان کا آپس میں ایک دوسرے کی زکوٰۃ لینا بھی حرام ہے۔[1] (فتح الباری)۔

ائمہ کا اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ آیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان والوں کے لیے صرف فرض صدقہ (زکوٰۃ) کا لینا ناجائز ہے، یا نفلی صدقہ کا لینا بھی ناجائز ہے۔[2]

۱۔ امام ابو یوسفؒ، زید بن علیؒ، ابو العباسؒ اور امامیہ کے نزدیک بنو ہاشم کا آپس میں ایک دوسرے کی زکوٰۃ لینا جائز ہے۔ مالکیہ کے اس بارے میں چار مختلف اقوال ہیں: جواز، عدم جواز۔ صرف فرض۔ (زکوٰۃ کا جواز اور صرف نفلی صدقہ کا جواز۔" (الفتح الربانی ج ۹ ص ۸۲، ۸۳)۔

۲۔ اکثر حنفیہ، شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک بنو ہاشم کے لیے نفلی صدقہ کا لینا جائز ہے، اس لیے کہ ان پر لوگوں کے ہاتھوں کا میل حرام کیا گیا ہے اور وہ صرف فرض زکوٰۃ ہے نہ کہ نفلی صدقہ (الفتح الربانی ایضاً)۔

امام ابو یوسفؒ اور ابو العباسؒ کے نزدیک ان کے لیے زکوٰۃ اور نفلی صدقہ دونوں کا لینا ناجائز ہے، کیونکہ حدیث میں صدقے کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں۔ ان پر ---- یعنی بنو ہاشم پر ---- نفل صدقہ لینا بھی اس طرح حرام ہے، جس طرح فرض زکوٰۃ۔

د: غیر مسلم:

تمام اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ غیر مسلم کو زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی۔ زکوٰۃ صرف مسلمانوں کا حق ہے' کیونکہ حدیث میں ہے کہ زکوٰۃ مسلمانوں کے اغنیاء سے لی جائے گی اور ان کے فقراء کی طرف لوٹا دی جائے گی۔ (ابن المنذر۔ معالم السنن ج ۲ ص ۲۵۱)

البتہ مُؤَلَّفَۃِ الْقُلُوْب کی مد میں انہیں زکوٰۃ دی جا سکتی ہے' جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ نفلی صدقہ بھی انہیں دیا جا سکتا ہے۔

حضرت اسماءؓ سے روایت ہے کہ میری ماں میرے پاس آئیں اور میں قریش کے زمانہ میں۔ یعنی اسلام سے پہلے انہیں دیا کرتی تھی۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ "اے اللہ کے رسولؐ! میری ماں میرے پاس آئی ہیں اور وہ مشرک ہیں اور اسلام کو ناپسند کرتی ہیں۔ کیا میں ان سے صلہ رحمی کروں؟" فرمایا "ہاں اپنی ماں سے صلہ رحمی کرو۔" (ابو داؤد' بخاری' مسلم)۔

ھ: بیوی:

تمام اہل علم کا اس پر بھی اجماع ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا کیونکہ اس کا نفقہ اور اس کی ضروریات کو پورا کرنا اس پر فرض ہے۔" (ابن المنذر' المغنی ج ۲ ص ۷۱۰)۔

و۔ز: والدین اور اولاد:

تمام اہل علم کا اس پر بھی اجماع ہے کہ والدین اور ان کے والدین اور اولاد' لڑکے اور لڑکیاں' اور ان کی اولاد کو زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی' اس لیے کہ ان کا نفقہ بھی انسان پر فرض ہے۔[1] (ابن المنذر۔ المغنی ایضاً)۔

۱۰۔ وہ لوگ جن کو زکوٰۃ اور صدقہ دینا دوسروں کی نسبت افضل ہے

۱۔ یہ اجماع۔۔۔۔ امام ابن المنذر نے اپنے علم کی حد تک لکھا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ایک روایت میں امام مالکؒ کے نزدیک' پوتوں کو اور دادا اور دادی سے اوپر زکوٰۃ دینا جائز ہے (کیونکہ ان کا نفقہ امام مالکؒ کے نزدیک انسان پر فرض نہیں ہے) (نیل الاوطار ج ۴' ص ۱۵۲)۔

ا۔ شوہر :

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی حضرت زینبؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (عورتوں سے) فرمایا۔ "اے عورتو! صدقہ دو خواہ وہ تمہیں اپنے زیوروں ہی میں سے کیوں نہ دینا پڑے۔" میں گھر واپس آئی اور (اپنے شوہر) عبداللہ بن مسعودؓ سے کہا۔ "آپ تنگ دست آدمی ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صدقہ کا حکم دیا ہے۔ آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائیے اور ان سے دریافت کیجیے کہ آیا اگر میں آپ کو صدقہ دوں' تو وہ شمار ہو جائے گا؟ تاکہ اگر شمار نہ ہو تو میں دوسرے لوگوں کو دوں۔" اس پر عبداللہ بن مسعودؓ کہنے لگے کہ "تم خود جاؤ اور دریافت کر کے آؤ۔" لہذا میں گئی۔ دیکھا کہ انصار کی ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر موجود ہے۔ اس کی ضرورت بھی وہی تھی جو میری تھی۔ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آکر خود سوال کرنے سے جھجکیں۔ اتنے میں بلالؓ باہر آئے۔ ہم نے ان سے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر عرض کیجیے کہ دروازے پر دو عورتیں موجود ہیں اور وہ یہ دریافت کر رہی ہیں کہ آیا ان کا صدقہ ان کے شوہروں کو اور بعض ایسے یتیم بچوں کو جو ان کے پاس زیر پرورش ہیں' دینے سے شمار ہو جائے گا؟ آپؐ انہیں یہ نہ بتائیے کہ ہم کون ہیں؟ "بلالؓ اندر گئے اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سوال کیا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا۔ "یہ دونوں کونسی عورتیں ہیں؟" بلالؓ نے کہا۔ "ایک انصار کی عورت ہے اور ایک زینبؓ ہے"۔ دریافت فرمایا "کونسی زینب؟" بلالؓ نے کہا "عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی۔" فرمایا "ان کے لیے دو اجر ہیں۔ ایک رشتہ داری کا اور دوسرا صدقہ کا۔" (بخاری و مسلم)۔

اس واقعہ میں صدقہ سے مراد فرض زکوٰۃ ہے۔ اس کی تائید حضرت زینب اور انصار کی عورت کے اس سوال سے ہوتی ہے کہ "آیا ان کا صدقہ ان کے شوہروں کو دینے سے شمار ہو جائے گا کہ نہیں؟" [1]

---

[1] یہ امام شافعیؒ' سفیان ثوریؒ' ابو یوسفؒ' محمدؒ اور ایک روایت میں امام مالکؒ کا مسلک ہے۔ امام ابو حنیفہؒ' احمد بن حنبلؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک اس واقعہ میں صدقہ سے مراد نفلی صدقہ ہے۔ لہذا ان کے نزدیک عورت اپنے شوہر کو فرض زکوٰۃ نہیں دے سکتی' صرف نفلی صدقہ دے سکتی ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی حضرت زینبؓ ہاتھ کی محنت کیا کرتی تھیں اور اسی سے

ب: والدین اور اولاد کے سوا دوسرے رشتہ دار:

حضرت سلمان بن عامرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "مسکین پر صدقہ کرنا صدقہ ہے اور کسی (مسکین) رشتہ دار پر صدقہ کرنا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔" (احمد' ترمذی' ابن ماجہ)۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "سب سے افضل صدقہ وہ ہے جو کسی تنگ دست رشتہ دار پر کیا جائے۔"[1] (مسند امام احمد)۔

۱۱۔ زکوٰۃ یا نفلی صدقہ دے کر اسے خریدنا:

کسی چیز کو بطور زکوٰۃ یا نفلی صدقہ دے دینے کے بعد خریدنا اکثر علمائے سلف نے مکروہ (ناپسندیدہ) قرار دیا ہے۔[2] (الفتح الربانی ج ۹ ص ۱۳۳)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک گھوڑا اللہ کی راہ میں بطور صدقہ دیا۔ پھر اسی گھوڑے کو فروخت ہوتے دیکھا۔ انہوں نے اسے خرید لینا چاہا اور اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ آپؐ نے فرمایا۔ "اے عمر! اپنے صدقہ

اپنے شوہر اور یتیم بچوں پر خرچ کیا کرتی تھیں' ان کا استدلال بخاریؒ کی ایک دوسری روایت سے بھی ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینبؓ سے فرمایا: "تمہارا شوہر اور بیٹا اس چیز کے زیادہ حق دار ہیں کہ تم ان پر صدقہ کرو۔" اب چونکہ بیٹے کو زکوٰۃ دینا بالاجماع حرام ہے لہذا معلوم ہوا کہ اس واقعہ میں نفلی صدقہ ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن حضرات کے نزدیک اوپر کے واقعہ میں صدقہ سے مراد فرض زکوٰۃ ہے' وہ اس استدلال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ بیٹے کو زکوٰۃ دینا والد کے لیے حرام ہے کیونکہ اس پر اپنے بیٹے کا نفقہ فرض ہے۔ ماں پر چونکہ اپنے بیٹے کا نفقہ فرض نہیں ہے' للذا اس کے لیے اسے زکوٰۃ دینا بھی جائز ہے۔ (نیل الاوطار ج ۴' ص ۱۵۱)۔

[1] اس بارے میں امام شافعیؒ' مالکؒ اور بعض دوسرے ائمہ کا اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ ان تمام رشتہ داروں کو زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی جن کا خرچ انسان کے ذمہ ہو۔ (یعنی اس نے خود ان کا خرچ اپنے ذمہ لے رکھا ہو)۔ (نیل الاوطار ج ۴' ص ۱۵۲)۔

[2] امام ابو حنیفہ' ابو یوسفؒ' محمدؒ' مالکؒ اور شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔۔۔۔ (الفتح الربانی ایضاً)۔

کو نہ لوٹاؤ۔" (بخاری' مسلم' احمد' ابو داؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)۔ بخاری و مسلم کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا۔ "اپنے صدقہ کو نہ لوٹاؤ' اس لیے کہ اپنے صدقہ کو لوٹانے والا قے کر کے اسے لوٹانے والے کی طرح ہے۔"

اس نہی (ممانعت) کو حرمت کے بجائے کراہت پر محمول کیا جائے گا' کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسری حدیث میں یہ ارشاد ہے "غنی کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے مگر پانچ صورتوں میں۔۔۔۔ ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ انسان اپنے مال سے صدقہ کی چیز خرید لے۔" نیز حضرت ابن عمرؓ (جنہوں نے اوپر کی حدیث روایت کی ہے) کا عمل بھی یہ تھا کہ اگر وہ کوئی ایسی چیز خریدتے جسے انہوں نے صدقہ کیا تھا' وہ اسے اپنے پاس نہ رکھتے بلکہ اسے (پھر) فوراً صدقہ میں دے دیتے۔" (بخاری)

۱۲۔ زکوۃ یا نفلی صدقہ دے کر اسے وراثت میں پانا :

اگر کوئی شخص کسی چیز کو بطور زکوۃ یا نفلی صدقہ دے دے' لیکن پھر وہی چیز اسے وراثت میں مل جائے تو اس کے لیے اس کا لینا جائز ہے۔

ایک عورت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ میں نے ایک لونڈی اپنی ماں کو صدقہ میں دی تھی۔ پھر میری ماں کا انتقال ہو گیا وہ لونڈی چھوڑ گئیں۔ فرمایا "تمہیں تمہارا اجر تمہیں مل گیا اور یہ لونڈی تمہارے پاس میراث میں آئی ہے۔" (مسلم' احمد' ابو داؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)۔

اس بارے میں سب کا اتفاق ہے (الفتح الربانی ج ۹' ص ۱۳۳)

۱۳۔ اگر زکوۃ غلطی سے کسی غیر مستحق کو دے دی جائے ؟ :

حضرت معن بن یزیدؓ سے روایت ہے کہ میرے والد نے کچھ دینار صدقہ کے لیے نکالے اور وہ مسجد میں ایک آدمی کے ہاتھ میں دے دیے۔ میں آیا اور میں نے وہ دینار لے لیے۔ انہیں لے کر میں اپنے والد کے پاس آیا۔ انہوں نے کہا۔ میرا ارادہ تمہیں دینے کا نہیں تھا۔" فیصلہ کے لیے میں یہ معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گیا تو آپؐ نے میرے والد سے فرمایا۔ "اے یزید! تمہارے لیے وہ ہے جس کی تم نے نیت کی (یعنی تمہارا صدقہ لگ

گیا)۔" اور مجھ سے فرمایا۔ "اور اے معن! تمہارے لیے وہ ہے جس کی تم نے نیت کی۔"
(بخاری' احمد)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک آدمی[1] نے کہا کہ آج رات میں صدقہ کروں گا۔ چنانچہ وہ صدقہ لے کر گھر سے نکلا اور ایک چور کے ہاتھ میں اسے دے دیا۔ صبح کو لوگ باتیں کرنے لگے کہ آج رات ایک چور کو صدقہ دیا گیا ہے۔ اس شخص نے کہا۔ "اے اللہ تیرے ہی لیے حمد ہے (یعنی تو ہی غلطی سے پاک ہے) آج میں (پھر) صدقہ کروں گا۔" پھر وہ صدقہ لے کر نکلا' تو اسے ایک بدکار عورت کے ہاتھ میں دے دیا۔ صبح کو لوگ پھر باتیں کرنے لگے کہ آج ایک بدکار عورت کو صدقہ دیا گیا۔ اس شخص نے کہا "اے اللہ تیرے لیے ہی حمد ہے۔ آج رات میں (پھر) صدقہ کروں گا۔" پھر وہ صدقہ لے کر نکلا اور اسے ایک غنی کے ہاتھ میں دے دیا۔ صبح کو لوگ پھر باتیں کرنے لگے کہ آج رات ایک غنی کو صدقہ دیا گیا۔ اس شخص نے کہا۔ "اے اللہ! تیرے لیے ہی حمد ہے۔ (مجھ سے غلطی ہوئی اور) چور' بدکار عورت اور غنی کو صدقہ دے دیا گیا۔" پھر اس شخص کو خواب میں بتایا گیا کہ تم نے جو چور کو صدقہ دیا تو (وہ لگ گیا) شاید کہ وہ اپنی چوری سے باز آ جائے۔ تم نے جو بدکار عورت کو صدقہ دیا تو (وہ بھی لگ گیا) شاید وہ اپنی بدکاری سے باز آ جائے۔ تم نے جو غنی کو صدقہ دیا تو (وہ بھی لگ گیا) شاید اسے عبرت حاصل ہو اور وہ بھی اپنا مال اللہ کی راہ میں دینے لگے۔ (بخاری' مسلم' احمد' نسائی)۔

ان دونوں حدیثوں سے یہ چیز واضح نہیں ہوتی کہ ان میں صدقہ سے مراد صرف نفلی صدقہ ہے یا فرض زکوٰۃ بھی ہے۔ اسی لیے امام بخاریؒ نے ان دو حدیثوں کے لیے جو باب باندھا ہے۔ وہ استفہام کے ساتھ باندھا ہے اور کوئی قطعی رائے ظاہر نہیں کی۔ (نیل الاوطار ج ۴' ص ۱۳۲)۔

۱۴۔ زکوٰۃ کا علانیہ دینا افضل ہے :

زکوٰۃ کا علانیہ دینا بھی جائز ہے اور چھپا کر دینا بھی' قرآن پاک میں ہے :

---

[1] مسند امام احمد کی ایک روایت میں ہے کہ یہ بنی اسرائیل کا ایک آدمی تھا۔ (نیل الاوطار ج ۳' ص ۱۳۱)

إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ۔ (البقرہ: ۲۷۱)

کہ اگر اپنے صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے' لیکن اگر چھپا کر حاجتمندوں کو دو' تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔

لیکن امام طبریؒ اور دوسروں نے اس پر علمائے سلف کا اجماع نقل کیا ہے کہ زکوٰۃ کا علانیہ اور نفلی صدقہ کا چھپا کر دینا افضل ہے (فتح الباری ج ۶ ص ۲۲)۔ نفلی صدقہ کو چھپا کر دینے کی فضیلت میں بہت سی احادیث ثابت ہیں' جن میں سے چند کا ہم آئندہ "نفلی صدقہ" کے باب میں ذکر کریں گے۔

صدقۂ فطر

فطر کا لفظ افطار سے ہے۔ صدقۂ فطر کو اسی لیے زکوٰۃ فطر کہا جاتا ہے کہ وہ رمضان کے روزے پورے ہونے کے بعد دیا جاتا ہے۔ اس کا حکم پہلی بار عید سے دو روز پہلے رمضان ۲ھ میں دیا گیا۔ (المغنی وغیرہ)۔

ا۔ حکم:

صدقۂ فطر جمہور سلف کے نزدیک واجب (بمعنی فرض) ہے۔[1]

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کا ایک صاع یا جو کا ایک صاع صدقۂ فطر ہر غلام اور آزاد' مرد اور عورت اور چھوٹے بڑے مسلمان پر فرض کیا ہے" (بخاری 'مسلم 'ابو داؤد 'نسائی 'ترمذی 'ابن ماجہ 'احمد)۔

۲۔ حکمت:

صدقۂ فطر کی حکمت ذیل کی حدیث میں بیان ہوئی ہے:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر

ا۔ حنفیہ کے نزدیک صدقۂ فطر واجب ہے۔ ان کے نزدیک فرض اور واجب کے معنی میں فرق ہے 'تفصیل کے لئے دیکھئے (ص ۳۲)۔

علامہ ابن المنذرؒ نے صدقۂ فطر کے واجب ہونے پر سلف کا اجماع نقل کیا ہے 'لیکن حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس پر اجماع نقل کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ سلف میں بعض علماء صدقہ فطر کے وجوب کو منسوخ مانتے ہیں۔ ان کا استدلال حضرت سعد بن عبادہؓ کی اس روایت سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب تک زکوٰۃ کا حکم نہ آیا تھا 'ہمیں صدقہ فطر کا حکم دیا کرتے تھے اور جب زکوٰۃ کا حکم آ گیا تو آپ نے نہ ہمیں اس کا حکم دیا اور نہ اس سے منع فرمایا 'لیکن ہم اسے ادا کرتے رہے۔" (نسائی) حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں ایک راوی غیر معلوم ہے لیکن اگر اسے صحیح بھی مان لیا جائے 'پھر بھی اس میں صدقہ فطر کے منسوخ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ ایک فرض کے حکم کے بعد دوسرے فرض کا حکم آ جانے سے پہلا فرض ساقط نہیں ہو جاتا۔ (نیل الاوطار ج ۴ 'ص ۱۵۳)۔

فرض فرمایا تاکہ روزے دار فضول اور نازیبا قسم کی باتوں سے پاک ہو جائے اور مسکینوں کو (کم از کم عید کے روز خوب اچھی طرح) کھانا میسر آجائے۔ جس نے اسے (عید کی) نماز سے پہلے ادا کیا' تو وہ ایک قبول ہونے والا صدقہ ہے۔ اور جس نے اسے نماز کے بعد ادا کیا تو وہ صدقوں میں سے ایک صدقہ ہے۔" (ابو داؤد' ابن ماجہ' دار قطنی)۔

۳۔ صدقۂ فطر کس پر واجب ہے؟

جمہور کے نزدیک صدقۂ فطر ہر مسلمان پر واجب ہے' خواہ وہ آزاد ہو یا غلام' مرد ہو یا عورت' چھوٹا ہو یا بڑا[1]' امیر ہو یا غریب۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کا ایک صاع یا جو کا ایک صاع صدقۂ فطر ہر غلام اور آزاد' مرد اور عورت' چھوٹے اور بڑے مسلمان پر فرض کیا ہے۔" (بخاری' مسلم' ابو داؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' احمد)۔

یہ حکم عام ہے اور اس میں کسی غنیٰ (مالداری) کی شرط نہیں ہے۔ لہٰذا بظاہر

ا۔ یہ امام شعبیؒ' عطاءؒ' ابن سیرینؒ' زہریؒ' عبداللہ بن مبارکؒ' مالکؒ' شافعی' احمد بن حنبلؒ اور ابو ثورؒ کا مسلک ہے۔ اسی کی روایت مسند امام احمدؒ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی ثابت ہے۔ مالکیہ کے نزدیک اگر انسان کے پاس کچھ بھی نہ ہو' لیکن اسے قرض مل سکتا ہو۔' تو اس کے لیے قرض لے کر صدقہ فطر ادا کرنا ضروری ہے۔ شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک اگر صدقہ فطر اس کی اور اس کے گھر والوں کی ایک دن اور ایک رات (عید کا دن اور عید کی رات) کی خوراک سے فاضل ہو' تب اس کے لیے صدقہ فطر ادا کرنا ضروری ہے۔ (المغنی ج ۲ ص ۶۷۹) الفقہ علی المذاہب الاربعہ)۔

امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے اصحاب کے نزدیک صدقہ فطر کے لیے انسان کا صاحب نصاب (دو سو درہم چاندی یا اس کی قیمت کا ملک) ہونا ضروری ہے۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۷۳)۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ جس شخص کے لیے صدقہ لینا جائز ہے' اس پر صدقہ کا دینا واجب نہیں ہو سکتا۔ ان کا استدلال حضرت ابو ہریرہؓ کی اس روایت سے بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "سب سے اچھا صدقہ وہ ہے جو غنا کی حالت میں ہو۔" (بخاری' مسلم' ابو داؤد' احمد)

دوسروں کے نزدیک صدقہ فطر کے لیے نصاب اس لیے ضروری نہیں ہے کہ یہ ایک بدنی صدقہ ہے' مالی صدقہ نہیں ہے۔ (نیل الاوطار ج ۴ ص ۱۸۵)۔

ہر مسلمان پر خواہ وہ غنی ہو یا فقیر' صدقہ فطر واجب ہے۔[1]

۴۔ صدقہ فطر کی مقدار :

اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ گندم کے علاوہ باقی تمام چیزوں کے صدقہ فطر کی مقدار ایک صاع فی کس ہے' جیسا کہ اوپر حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں یہ گزر چکا ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کا ایک صاع[1] یا جو ایک صاع صدقہ فطر ہر غلام

۱۔ صاع ایک پیمانہ تھا جس میں ۴ مد ہوتے تھے۔ صاع دو طرح کا ہوتا تھا' ایک حجازی اور دوسرا عراقی۔ حجازی صاع کا وزن ساڑھے ۵ رطل اور عراقی صاع کا وزن ۸ رطل ہوتا ہے۔ ایک رطل کا وزن ہمارے ہاں کے لحاظ سے تقریباً آدھ سیر ہے لہٰذا حجازی صاع کا وزن ہمارے ہاں کے حساب سے تقریباً پونے تین سیر اور عراقی صاع کا وزن تقریباً ۴ سیر ہوا۔

امام ابو حنیفہؒ اور کوفہ کے دوسرے فقہاء عراقی صاع کے قائل ہیں اور امام مالکؒ' شافعیؒ احمد بن حنبلؒ اور دوسرے ائمہ حجازی صاع کے۔

امام مالکؒ اور عام محدثین کا استدلال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو صاع استعمال ہوتا تھا' اس کا وزن پونے ۵ رطل تھا اور پھر اسی صاع پر بعد میں صحابہؓ کے زمانہ میں بھی عمل جاری رہا۔ حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگ اس مد سے صدقہ فطر دیا کرتے تھے' جس سے اہل مدینہ اپنے غلے ناپا کرتے تھے (ابن خزیمہ' حاکم)۔ حضرت ابن عمرؓ سے اس بارے میں روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پہلے مد (یعنی حجازی) سے صدقہ فطر دیا جاتا تھا۔ (بخاری) اور مدینہ کے لوگوں میں صاع کے وزن کے متعلق کبھی اختلاف نہیں ہوا۔

امام ابو حنیفہؒ اور کوفہ کے دوسرے فقہاء کا استدلال حضرت انسؓ کی اس روایت سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مد یعنی دو رطل پانی سے وضو فرمایا کرتے تھے' اور ایک صاع یعنی ۸ رطل پانی سے غسل۔ (دارقطنی)۔ نیز ان کا استدلال حضرت عائشہؓ کی اس حدیث سے بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ ہے کہ آٹھ رطلوں کے ایک صاع سے غسل کیا جائے۔ (دارقطنی)۔ نیز ابراہیم نخعیؒ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صاع آٹھ رطل کا تھا۔ (ابو عبید)۔

اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک یہ احادیث قابل حجت ہیں' لیکن عام محدثین جن کے نزدیک صاع کا وزن پونے ۵ رطل ہے' ان احادیث کو ضعیف اور ناقابل حجت قرار دیتے ہیں۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۲' ص ۷)۔

اور آزاد' مرد اور عورتؑ' چھوٹے اور بڑے مسلمان پر فرض کیا ہے۔"

گندم کے صدقہ فطر کی مقدار کے متعلق کوئی ایسی واضح حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے' جس کی صحت پر سب کا اتفاق ہو۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی مرسل اور مستند روایات ایسی ملتی ہیں جن میں آپؐ نے گندم کے صدقہ فطر کی مقدار کو نصف صاع قرار دیا ہے۔ پھر صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں جب گندم کی فراوانی ہو گئی' تو بہت سے صحابہ کی یہ رائے ہوئی کہ اس کا نصف صاع جو کے ایک صاع کا قائم مقام ہو سکتا ہے۔ حضرت عثمانؓ' ابو ہریرہؓ' جابرؓ' عبداللہ بن عباسؓ' عبداللہ بن زبیرؓ' اسماء بنت ابی بکرؓ سے اس رائے کی صحیح اسناد ملتی ہیں۔ (حافظ ابن حجرؒ بحوالہ نیل الاوطار ج ۴' ص ۱۵۵)۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو فرض فرمایا۔ پھر لوگوں (یعنی صحابہ کرام) نے نصف صاع کو اختیار کر لیا۔ (بخاری و مسلم)۔

حضرت ابن عمرؓ ہی کی دوسری روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگ جو کھجور' کشمش یا پنیر کا ایک صاع صدقہ فطر دیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب گندم کی فراوانی ہو گئی تو ان چیزوں کی جگہ گندم کا نصف صاع صدقہ فطر دیا جانے لگا۔ (ابو داؤد)۔

لیکن بعض صحابہؓ (جیسے عبداللہ بن عمرؓ اور ابو سعید خدریؓ) نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ (نیل الاوطار)۔

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہم کھانے یا کھجور یا جو یا کشمش یا پنیر کا ایک صاع (فی کس) بطور صدقہ فطر دیا کرتے تھے۔ یہی حال رہا یہاں تک کہ معاویہؓ (جب کہ وہ خلیفہ تھے)۱ ہمارے پاس مدینہ آئے اور انہوں کہا۔ میری رائے ہے کہ شام کی گندم کے دو مد (نصف صاع) کھجور کے ایک صاع کے برابر ہو سکتے ہیں۔ لوگوں نے (یعنی صحابہؓ کرام نے) اس رائے کو اختیار کر لیا۔" (بخاری' مسلم' ابو داؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' احمد)۔ صحیح بخاریؒ کے علاوہ دوسری کتابوں میں یہ الفاظ زیادہ ہیں۔ "(لیکن) حضرت ابو سعیدؓ نے فرمایا۔ "میں تو اسی طرح ایک صاع صدقہ فطر دیتا رہوں گا' جس طرح

۱۔ یہ الفاظ صحیح ابن خزیمہ کی روایت میں ہیں۔

پہلے دیتا تھا۔"

صحیح بخاری کی روایت میں یہ الفاظ بھی زیادہ ہیں۔ "اور ہمارا کھانا' جو' کشمش' پنیر اور کھجور ہوا کرتا تھا۔"

اس بارے میں ائمہ کی آراء کا ہم حاشیہ میں ذکر کرتے ہیں۔ [1]

---

[1] جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ گندم کے علاوہ دوسری چیزوں کے صدقہ فطر کے متعلق اختلاف نہیں ہے۔ ان سب کا صدقہ فطر ایک صاع ہے۔ اختلاف صرف گندم کے صدقہ فطر میں ہے۔

امام مالکؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ' اسحاقؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک گندم کا صدقہ فطر بھی ایک صاع ہی ضروری ہے۔ ان کا استدلال حضرت ابو سعیدؓ کی مندرجہ بالا حدیث سے ہے۔ امام شافعیؒ نے حضرت ابو سعید کی اس روایت میں "کھانے" سے مراد گندم لی ہے گویا ان کا کہنا یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں گندم کا صدقہ فطر بھی دوسری چیزوں کی طرح ایک صاع ہی دیا جاتا ہے۔ ان کا استدلال اس حدیث سے بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر چھوٹے اور بڑے کی طرف سے گندم کا ایک صاع صدقہ فطر ادا کرو۔" (ابو اسحاق)۔ یہ حدیث حسن ہے۔ حنفیہ اسے قابل حجت نہیں مانتے' لیکن ان حضرات کے نزدیک یہ قابل حجت ہے۔ (المغنی ج ۲ ص ۶۵۰'۲۴۰)۔

امام سعید بن مسیبؒ' عطاءؒ' طاؤسؒ' مجاھدؒ' عمر بن عبدالعزیزؒ' عروہ بن زبیرؒ' ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن' سعید بن جبیر اور حنفیہ کے نزدیک گندم کے صدقہ فطر کی مقدار نصف صاع ہے۔ صحابہؓ کرام کے عمل کے علاوہ ان حضرات کا استدلال حضرت ابو سعیدؓ کی اس روایت سے بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "دو آدمیوں کے درمیان ایک صاع گندم صدقہ فطر ہے۔" (ابو داؤد) نیز عمرو بن شعیبؒ اپنے والد اور دادا کے ذریعے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی گلیوں میں ایک منادی کرنے والا آدمی بھیجا' جس نے یہ منادی کی کہ "صدقہ فطر ہر چھوٹے اور بڑے' مرد اور عورت مسلمان پر گندم کا نصف صاع یا کھانے کی دوسری چیزوں کا ایک صاع واجب ہے۔" (ترمذی) اس بارے میں کئی اور روایتیں بھی ہیں جن کی سند پر محدثین نے کلام کیا ہے۔ شافعیہ اور حنبلیہ انہیں قابل حجت نہیں مانتے' لیکن حنفیہ انہیں قابل حجت قرار دیتے ہیں۔

حنفیہ امام شافعیؒ کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے کہ حضرت ابو سعیدؓ کی روایت میں "کھانے" سے مراد گندم ہے' کیونکہ امام بخاریؒ کی روایت میں حضرت ابو سعیدؓ نے "کھانے" کے لفظ کی یوں تشریح فرمادی ہے کہ "ہمارا کھانا جو' کشمش' پنیر اور کھجور ہوا کرتا تھا۔"

۵۔صدقۂ فطر میں کونسی چیزیں دی جائیں:

مختلف احادیث میں صدقہ فطر کے لئے ان چیزوں کا ذکر ہوا ہے: گندم' جو' کھجور' کشمش' آٹا' ستو۔ ؎

۶۔صدقۂ فطر کے واجب ہونے کا وقت:

اس بارے میں اتفاق ہے کہ صدقہ فطر رمضان کے آخر میں واجب ہوتا ہے

حنفیہ نصف صاع کے مسلک پر تقریباً تمام صحابہؓ کرام کا اتفاق قرار دیتے ہیں' کیوں کہ جب حضرت معاویہؓ نے اپنی رائے کا اظہار کیا تو صحابہؓ میں سے سوائے حضرت ابو سعیدؓ کے کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی' بلکہ حضرت ابو سعیدؓ نے بھی صحابہؓ کی مخالفت نہیں کی اور یہ نہیں کہا کہ میں گندم کا بھی ایک صاع ہی دیا کروں گا' بلکہ ان کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ میں ان ہی چیزوں کو صدقہ فطر میں دیتا رہوں گا' جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیا کرتا تھا۔ (التعلیق الصبیح ج ۲ ص ۳۱۳) (المغنی ایضاً)۔

صدقۂ فطر کی مقدار کے متعلق امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی مرسل روایات ملتی ہیں جو آپس میں مل کر قوی (قابل حجت) ہو جاتی ہیں۔ پھر ان روایات کو نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "ہمارے شیخ (یعنی امام ابن تیمیہؒ) اس مسلک کو قوی قرار دیتے تھے۔" (الکوکب الدری ج ۱ ص ۲۴۴)۔

قاضی شوکانیؒ نے بھی نیل الاوطار میں ان روایات کو ان کی کثرت کی وجہ سے قابل حجت قرار دیا ہے' لیکن اس کے ساتھ وہ لکھتے ہیں کہ "پہلا مسلک (یعنی ایک صاع کا) زیادہ راجح ہے۔ (ج ۴ ص ۱۵۶)۔

مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ لکھتے ہیں۔ "میرے نزدیک ایک صاع کے مسلک میں احتیاط ہے۔" (تحفۃ الاحوذی ج ۲' ص ۲۷)۔

ا۔امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ان میں سے اس چیز کا صدقہ دینا افضل ہے' جو سب سے قیمتی ہو۔امام صاحب کے نزدیک صدقہ فطر میں قیمت بھی دی جا سکتی ہے' بلکہ قیمت کا دینا افضل ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک ہر اس چیز کا صدقہ فطر دیا جا سکتا ہے جس پر عشر ہو۔ جیسے چاول چنے' دال وغیرہ۔ گندم کا صدقہ فطر دینا افضل ہے۔ قیمت کا دینا جائز نہیں۔

امام مالکؒ کے نزدیک ہر اس چیز کا صدقہ فطر دینا جائز ہے جو لوگوں کی عام خوراک ہو۔ البتہ کھجور کا صدقہ دینا سب سے افضل ہے۔ قیمت کا دینا جائز ہے' مگر مکروہ ہے۔

امام احمدؒ کے نزدیک ہر پھل یا غلہ جو غذا کے کام آتا ہو' صدقۂ فطر میں دیا جا سکتا ہے' البتہ کھجور کا صدقہ دینا افضل ہے۔ قیمت کا دینا جائز نہیں۔ (الفتح الربانی ج ۹' ص ۱۴۷) (الفقہ علی المذاہب الاربعہ)

کیونکہ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ الفطر (رمضان پورا ہونے کی زکوٰۃ) فرض فرمائی ہے' لیکن اس کے وقت کے متعین کرنے میں اختلاف ہے۔ [1]

۷۔ صدقہ فطر کے ادا کرنے کا وقت :

صدقہ فطر کا عید کے روز صبح کی نماز کے بعد عید گاہ کی طرف جانے سے پہلے ادا کرنا مستحب ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ صدقہ فطر لوگوں کے عید گاہ کی طرف جانے سے پہلے ادا کر دیا جائے۔" (بخاری' مسلم' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' احمد)۔

اس حکم کو استحباب پر محمول کیا جائے گا' کیونکہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے یہ زکوٰۃ (صدقہ فطر) عید کی نماز سے پہلے ادا کی' تو وہ ایک قبول ہونے والی زکوٰۃ ہے' اور جس نے یہ نماز کے بعد ادا کی تو وہ صدقوں میں سے ایک صدقہ ہے۔" (ابوداؤد' ابن ماجہ' حاکم' دارقطنی)۔

اس حدیث کی رو سے صدقہ فطر کا نماز کے بعد ادا کرنا اگرچہ صحیح ہے' لیکن مکروہ ہے۔ [2]

۱۔ امام احمدؒ' اسحاق اور ثوریؒ کے نزدیک یہ وقت رمضان کے آخری دن کا سورج غروب ہونے کے بعد ہے۔ امام ابو حنیفہؒ' آپ کے اصحابؒ' ابو ثورؒ اور داؤد ظاہریؒ کے نزدیک یہ وقت عید کے روز طلوع فجر کے بعد ہے۔ امام مالکؒ اور شافعیؒ سے دونوں روایتیں ہیں۔

اس اختلاف کا اثر اس وقت پڑتا ہے جب کوئی بچہ عید کے روز طلوع فجر سے پہلے اور مغرب کے بعد پیدا ہو۔ پہلے مسلک کے لحاظ سے اس کا صدقہ فطر دینا ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ وہ صدقہ فطر کے واجب ہونے کے بعد پیدا ہوا ہے۔ دوسرے مسلک کے لحاظ سے اس کا صدقہ فطر دینا ضروری ہے' کیونکہ وہ صدقہ فطر واجب ہونے سے پہلے پیدا ہو چکا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص عید کے روز طلوع فجر سے پہلے اور مغرب کے بعد مر جائے' تو پہلے مسلک کے لحاظ سے اس کا صدقہ فطر دینا ضروری ہے اور دوسرے مسلک کے لحاظ سے ضروری نہیں ہے۔ (المغنی ج ۲ ص ۶۶۸)۔

۲۔ یہ جمہور (جن میں ائمہ اربعہ شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ ان کے نزدیک صدقہ فطر عید کے

۸۔ صدقۂ فطر کا پیشگی ادا کرنا :

صدقہ فطر رمضان کے آخر میں واجب ہوتا ہے' جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں' لیکن اس کا پیشگی ادا کرنا جائز ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے آخر میں صدقہ فطر فرض فرمایا۔۔۔اور لوگ یہ صدقہ عید سے ایک یا دو روز پہلے دے دیا کرتے تھے۔ [1] (بخاری)

۹۔ صدقۂ فطر کے مصارف :

صدقہ فطر کے مصارف بھی وہی ہیں جو زکوٰۃ کے ہیں۔ البتہ اس کا فقیروں اور محتاجوں کو دینا افضل ہے۔

حضرتِ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر کو فرض

روز مغرب سے پہلے پہلے دیا جا سکتا ہے۔ البتہ امام ابن سیرینؒ اور ابراہیم نخعیؒ کے نزدیک اس سے زیادہ تاخیر بھی جائز ہے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ "مجھے امید ہے کہ اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔"

امام ابن حزمؒ کے نزدیک صدقہ فطر کا عید کی نماز سے پہلے دینا واجب اور بعد میں دینا حرام ہے۔

قاضی شوکانیؒ نے بھی اسی مسلک کی تائید کی ہے۔ (المغنی' الفتح الربانی ۹ ص ۱۵۲) (نیل الاوطار ج ۴' ص ۱۵۷)۔

[1] دو دن تک پیشگی صدقۂ فطر دینے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ دو سے زیادہ دنوں میں اختلاف ہے۔ امام مالکؒ اور احمدؒ کے نزدیک دو دن سے پہلے صدقہ فطر دینا جائز نہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس کا رمضان سے بھی پہلے دینا جائز ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اس کا شروع رمضان سے دینا جائز ہے۔ (الفتح الربانی ج ۹' ص ۱۵۲)۔

امام بخاریؒ کے نزدیک صدقۂ فطر کا پیشگی جمع کرنا جائز ہے' غرباء کو دینا جائز نہیں ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کی روایت "اور لوگ یہ صدقہ عید سے ایک یا دو روز پہلے ہی دے دیا کرتے تھے" کے متعلق امام بخاریؒ لکھتے ہیں۔ "لوگ صدقہ فطر پیشگی اس لیے دیتے تھے کہ اسے جمع کیا جائے۔ وہ فقیروں کو نہیں دیا کرتے تھے۔" ایسا ہی موطا امام مالکؒ میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۲' ص ۲۹)۔

کیااور فرمایا۔ "اس روز ان کو غنی (آسودہ، غیر محتاج) کر دو۔ [1] (بیہقی، دار قطنی)۔

---

[1] اختلاف صرف اس بارے میں ہے کہ آیا زکوٰۃ کی طرح صدقہ فطر بھی صرف مسلمان فقیروں کو دیا جائے گا یا یہ کہ اسے غیر مسلم فقیروں کو بھی دیا جا سکتا ہے۔ امام مالکؒ، احمدؒ، شافعیؒ، ابو ثورؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک یہ زکوٰۃ کی طرح صرف مسلمانوں کا حق ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک اسے غیر مسلم فقیروں کو بھی دیا جا سکتا ہے، اگرچہ ایسا کرنا مکروہ ہے۔ (المغنی ج ۲ ص ۶۶۷) لیکن حنفی مذہب کا فتویٰ امام ابو یوسفؒ کے قول پر ہے اور وہ یہ ہے کہ غیر مسلم کو صدقہ فطر نہیں دیا جا سکتا (ردالمحتار: ج ۲، ص ۳۶۹)۔ گویا اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

نفلی صدقہ

ا۔ فضیلت :

قرآن اور حدیث دونوں میں صدقہ کی فضیلت بیان ہوئی ہے اور اس کی ترغیب دی گئی ہے۔ذیل میں ہم صرف دو آیتیں اور تین حدیثیں نقل کرتے ہیں :

۱۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ۔ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ (البقرہ :۲۶۱)

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں' ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے' فراوانی عطا کرتا ہے' وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔

۲۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ○ (آل عمران۔۹۲)

تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنے وہ چیزیں (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو جن کو تم عزیز رکھتے ہو اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے باخبر ہوگا۔

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "رشک صرف دو چیزوں پر ہو سکتا ہے۔ایک وہ آدمی جسے اللہ نے مال دیا اور اسے حق کی راہ میں خرچ کرنے کی توفیق دی۔ دوسرا وہ آدمی جسے اللہ نے حکمت (دین کا فہم) دی تو وہ اس کے ذریعے لوگوں کے درمیان فیصلے کرتا اور اسے دوسروں کو سکھاتا ہے۔" (بخاری و مسلم)۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "کوئی ایسا دن نہیں جو لوگوں پر آتا ہو' مگر اس میں دو فرشتے اترتے ہیں۔ان میں سے ایک کہتا ہے۔" اے اللہ! (اپنی راہ میں) خرچ کرنے والے کو نیک اولاد دے۔" اور دوسرا کہتا ہے۔"اے اللہ! کنجوس کو ایسی اولاد دے جو اس کے مال کو برباد کرے۔" (بخاری و مسلم)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی الہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''کسی صدقہ نے کسی مال کو کم نہیں کیا اور اللہ سے کسی نے معافی نہیں چاہی' مگر اللہ نے اس کی عزت میں اضافہ کر دیا۔ اور اللہ کے لیے کسی نے تواضع کا طریقہ اختیار نہیں کیا' مگر اللہ نے اسے بلندی عطا فرمائی۔'' (مسلم)

۲۔ نفلی صدقہ کی مختلف شکلیں :

صدقہ کی ایک ہی معین شکل نہیں ہے بلکہ اس کی بہت سی شکلیں ہو سکتی ہیں :

(۱) حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''ہر مسلمان پر صدقہ ہے۔'' میں نے عرض کیا۔ ''اے اللہ کے رسول! جس کے پاس کچھ نہ ہو؟'' فرمایا۔ ''اسے چاہیے کہ ہاتھ سے کام کرے' اپنے آپ کو بھی فائدہ پہنچائے اور صدقہ بھی کرے۔'' میں نے پھر عرض کیا۔ ''اگر وہ ایسا نہ کر سکے؟'' فرمایا ''کسی حاجتمند اور مصیبت زدہ انسان کو سہارا دے۔'' میں نے پھر عرض کیا۔ ''اگر وہ ایسا بھی نہ کر سکے؟'' فرمایا ''اسے چاہیے کہ نیکی کا یا عدل کا حکم دے میں نے کہا اگر وہ یہ بھی نہ کر سکے فرمایا ''اسے چاہئے کہ برائی سے رک جائے اور یہی (عادت) اس کا صدقہ ہے۔'' (بخاری' احمد)

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''نرم بات صدقہ ہے اور ہر وہ قدم جسے انسان نماز کی طرف (یا مسجد کی طرف) جانے کے لیے اٹھاتا ہے' صدقہ ہے۔'' (مسلم' احمد)

(۳) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''ہر نیکی کا کام صدقہ ہے اور نیکی کا ایک کام یہ ہے کہ تم اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے پیش آؤ اور اپنے ڈول میں سے اس کے ڈول میں پانی الٹا دو۔'' (احمد' ترمذی' حاکم)

(۴) حضرت بریدہ اسلمیؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔ ''انسان کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں اور ان میں سے ہر جوڑ کا صدقہ کرنا' اس کے لیے ضروری ہے۔'' صحابہ نے عرض نے کیا۔ 'اے اللہ کے رسولؐ! ایسا کون کر سکتا ہے؟'' فرمایا۔ ''مسجد میں اگر رینٹ (ناک کی رطوبت) پڑا ہو اور تم اسے دبا دو یا راستہ میں کوئی (تکلیف دہ) چیز پڑی ہو اور تم اسے ہٹا دو (تو یہ بھی صدقہ ہے) اگر تم یہ بھی نہ کر سکو تو چاشت کی دو رکعتیں تمہارے لیے کافی ہیں۔'' (احمد)

(۵) حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ "میں کہاں سے صدقہ کروں؟ ہمارے پاس کوئی مال نہیں ہے۔" فرمایا "صدقہ کے دروازوں میں سے ہے کہ تم اللہ اکبر' سبحان اللہ' الحمد للہ' لا الہ الا اللہ اور استغفر اللہ کہو' نیکی کا حکم دو' برائی سے منع کرو۔ لوگوں کے راستہ سے کانٹا یا ہڈی یا کنکر اٹھا دو' کسی نابینا کو راستہ بتا دو' کسی بہرے اور گونگے کو بات سمجھا دو' اگر کسی شخص کو کوئی چیز تلاش کرتا ہوا پاؤ اور تم اس کی جگہ جانتے ہو' تو اسے بتا دو' کسی مصیبت زدہ اور مدد کے محتاج کی امداد کے لیے جلدی کرو' کسی کمزور کو اپنے بازوؤں سے اٹھاؤ (اور اس کی مشکل آسان کرو)۔ یہ تمام چیزیں تمہارا اپنے آپ پر صدقہ ہیں' اور تمہارے لیے اپنی بیوی سے ملاپ میں بھی اجر ہے۔" (احمد' مسلم)

(۶) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر مسلمان کوئی درخت لگائے یا کھیتی بوئے اور اس میں سے کوئی چیز چوری ہو جائے یا اس میں سے کوئی آدمی یا جانور یا کوئی اور چیز کچھ کھا لے' تو وہ اس کے لیے صدقہ ہے۔" (بخاری)۔

۳۔ صدقہ دے کر تکلیف دینا یا احسان جتانا :

کسی شخص کو زکوٰۃ یا صدقہ دے کر اسے تکلیف دینے یا اس پر احسان جتانے سے صدقہ باطل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تُبْطِلُوا۟ صَدَقَـٰتِكُم بِٱلْمَنِّ وَٱلْأَذَىٰ۔ (البقرہ : ۲۶۴)

اے ایمان لانے والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر خاک میں نہ ملاؤ۔

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تین شخص ایسے ہیں کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ نہ ان سے کلام کرے گا' نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہو گا۔" میں نے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسول! ایسے لوگ تو تباہ و برباد ہو گئے۔ آخر یہ کونسے لوگ ہیں؟" فرمایا۔ "دے کر احسان جتانے والا' اپنے تہبند کو (غرور سے) زمین پر گھسیٹ کر چلنے والا اور جھوٹی قسم کھا کر اپنا سودا

پچنے والا۔" (مسلم)

۴۔ حرام مال کا صدقہ کرنا:

اگر صدقہ حرام مال کا ہو' تو اللہ تعالیٰ اسے قبول نہیں کرتا:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اے لوگو! اللہ پاک ہے اور وہ پاک ہی چیز قبول کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو بھی وہی حکم دیا ہے کہ جو اس نے رسولوں کو دیا ہے۔ (انبیاء کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا۔ "يَآ أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْم" (اے رسولو! پاک چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو' میں تمہارے اعمال کو جاننے والا ہوں)۔ اور پھر (مومنین کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا۔ "يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ۔" (اے ایمان لانے والو! جو پاک چیزیں ہم نے تم کو دی ہیں انہیں کھاؤ۔) پھر حضورؐ نے ایک شخص کا ذکر فرمایا جو ایک لمبا سفر طے کر رہا ہے۔ اس کی حالت سخت پراگندہ ہے اور اس پر گرد اٹی ہوئی ہے اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعا کرتا ہے۔ "اے اللہ! اے اللہ!" حالانکہ اس کا کھانا حرام کا ہے' اس کا پینا حرام کا ہے اور اس کا پہننا حرام کا ہے اور وہ حرام کھا کر پلا ہے تو اس کی دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے؟" (مسلم)

۵۔ عورت کا اپنے شوہر کے مال میں سے صدقہ کرنا:

اگر عورت کو اپنے خاوند کی رضامندی کا علم ہو' تو وہ اس کے مال میں سے صدقہ کر سکتی ہے' ورنہ نہیں۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اگر عورت کوئی خرابی کیے بغیر اپنے گھر کے کھانے میں سے خرچ کرے' تو اس کے لیے اس خرچ کرنے کا اجر ہے اور اس کے خاوند کے لیے اس کے کمانے کا اجر ہے۔ ایسا ہی اجر خزانچی (امانت دار) کے لیے ہے۔ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کا اجر کم نہیں کرتا۔" (بخاری' ترمذی)۔

روزہ کی فضیلت اور اس کی اقسام

الصیام یا الصوم (روزہ) کے لفظی معنی کسی چیز سے رکے رہنے کے ہیں۔ قرآن مجید میں حضرت مریم کے متعلق ارشاد ہے کہ انہوں نے کہا: "اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا۔ (میں نے رحمان کے لیے رکے رہنے یعنی بات چیت سے رکے رہنے کی نذر مانی ہے)۔" شریعت میں اس سے مراد مخصوص وقت میں مخصوص چیزوں سے مخصوص شرائط کے ساتھ رکے رہنا ہے۔ (نووی۔ ابن حجرؒ نقلاً از نیل الاوطار ج ۴ ص ۱۵۹)۔

ا۔ فضیلت :

روزہ اور روزے دار کی فضیلت میں متعدد احادیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ اختصار کے خیال سے ذیل میں ہم ان میں سے صرف چار کا ذکر کرتے ہیں :

(۱) حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جنت کا ایک دروازہ ہے' جس کا نام ریان (سیر ابی) ہے۔ قیامت کے روز آواز دی جائے گی۔ "روزے دار کہاں ہیں؟" جب آخری روزہ دار داخل ہو جائے گا' تو یہ دروازہ بند کر دیا جائے گا۔ (بخاری و مسلم)

(۲) حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو بھی بندہ اللہ کی راہ میں روزہ رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اس کے چہرے کو آگ سے ستر خریف (۲۱۰ میل) دور کر دیتا ہے۔" (بخاری' مسلم' ترمذی' نسائی' احمد' ابن ماجہ)۔

(۳) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابن آدم کا ہر عمل اس کے اپنے لیے ہے' سوائے روزہ کے' اس لیے کہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔" روزہ ڈھال ہے' لہذا جب تم میں سے کسی شخص کا روزہ ہو تو اسے چاہیے کہ نہ بد کلامی کرے' نہ شور کرے اور نہ جہالت کی باتیں کرے۔ اگر کوئی آدمی اس سے بد کلامی کرے یا اس سے لڑائی کرے' تو اس سے دو مرتبہ یہ کہہ دے کہ میرا روزہ ہے۔ اس ذات پاک کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے' روزے دار کے منہ کی بساند قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی بو سے زیادہ خوشبودار

ہو گی۔ روزے دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ ایک خوشی اس وقت جبکہ وہ اپنا روزہ افطار کرتا ہے' اور دوسری اس وقت ہو گی جبکہ وہ روزے کی حالت میں اپنے رب سے ملے گا' اور وہ اس سے خوش ہو گا۔" (احمد' مسلم' نسائی)۔

یہی حدیث بخاری و ابوداؤد میں بھی ہے اور ان کی روایت میں اس کے الفاظ یوں ہیں۔ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے)۔ "وہ اپنا کھانا پینا اور خواہش کو پورا کرنا میرے لیے چھوڑتا ہے' لہذا میں ہی اس کا بدلہ دوں گا اور نیکی کا بدلہ دس گنا ہے۔"

(۴) حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ روزہ اور قرآن قیامت کے روز بندے کی سفارش کریں گے۔ روزہ کہے گا۔ "اے رب! میں نے اس شخص کو دن کے وقت کھانا کھانے اور اپنی خواہشات پوری کرنے سے روکے رکھا' اس لیے اس کے معاملے میں میری سفارش منظور فرما۔" اور قرآن کہے گا۔ "اے رب! میں نے رات کے وقت اس شخص کو نیند سے بیدار رکھا' اس لیے اس کے معاملے میں میری سفارش منظور فرما۔" (مسند امام احمد)۔

۲۔ اقسام :

روزے کی چار قسمیں ہیں :

(۱) فرض یا واجب۔[1]

(۲) نفلی یا مستحب۔

(۳) مکروہ

(۴) حرام

کتاب کے آئندہ صفحات میں ہم ان سب کا الگ الگ ذکر کریں گے۔

۱۔ حنفیہ کے نزدیک فرض اور واجب چونکہ الگ الگ اصطلاحیں ہیں' اس لیے ان کے نزدیک روزے کی پانچ قسمیں ہیں۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۸۰۷)۔

فرض روزے

فرض روزہ کی تین قسمیں ہیں: (۱) رمضان کے روزے (۲) کفارہ کے روزے اور (۳) نذر مانے ہوئے روزے۔

اس باب میں ہم صرف رمضان کے روزوں کے مسائل بیان کریں گے۔ کفارہ اور نذر کے روزوں کے مسائل کا بیان ضمنی طور پر ہو گا۔

رمضان کے روزے

۱۔ حکم:

رمضان کے روزے قرآن' سنت اور اجماع امت تینوں کی رو سے فرض ہیں۔ (ہدایۃ المجتہد ج ا ص ۱۹۳)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ــــــــ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ۔ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ (البقرة : ۱۸۳۔ ۱۸۵)

اے ایمان لانے والو! تم پر روزہ فرض کر دیا گیا' جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا۔۔۔۔۔ رمضان وہ مہینہ ہے' جس میں قرآن نازل کیا گیا' جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں' لہذا اب تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے' اس کے روزے رکھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ (۱) لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دینا' (۲) نماز کا قائم کرنا (۳) زکوۃ کا ادا کرنا (۴) ماہ رمضان کے روزے رکھنا اور (استطاعت ہونے کی صورت میں) اللہ کے گھر کا حج کرنا۔"

۲۔ رمضان کی فضیلت :

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ جب رمضان آیا' تو) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم پر ایک ایسا بابرکت مہینہ سایہ افگن ہوا ہے' جس کے روزے اللہ نے تم پر فرض کیے ہیں۔ اس میں جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیطان قید کر دیے جاتے ہیں۔ اس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں کی رات سے بہتر ہے۔ جو شخص اس کی خیر سے محروم رہا بس وہ محروم ہی رہ گیا۔" (احمد' نسائی' بیہقی)۔

حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جس شخص نے اللہ پر ایمان اور اس کے اجر کی امید رکھتے ہوئے رمضان کے روزے رکھے' اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیے گئے۔" (احمد' ابو داؤد' ابن ماجہ)۔

۳۔ رمضان کے دنوں کی تعداد :

اس پر اجماع ہے کہ کوئی عربی مہینہ ۲۹ دن سے کم اور ۳۰ دن سے زیادہ نہیں ہو سکتا (بدایۃ المجتہد ج ا' ص ۱۹۴)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ہم ایک ان پڑھ قوم ہیں۔ مہینہ یوں ہے' یوں ہے اور یوں ہے۔" اس کے بعد حدیث کے راوی ابن حربؒ نے اپنی انگلیوں کو ۲۹' اور ۳۰ پر موڑا" (بخاری' مسلم' ابو داؤد' ابن ماجہ)۔

۴۔ رمضان کی ابتدا اور انتہا :

اس پر اجماع ہے کہ رمضان کی ابتدا اور انتہا کا حساب چاند کو دیکھ کر کیا جائے گا۔ (بدایۃ المجتہد ایضا)۔

۲۹ شعبان کی شام کو اگر چاند نظر آجائے' تو اگلا دن یکم رمضان ہو گا اور اس دن روزہ رکھا جائے گا' ورنہ ۳۰ دن کی گنتی پوری کی جائے گی اور اس سے اگلے دن روزہ رکھا جائے گا' خواہ ۳۰ شعبان کو چاند نظر آئے یا نہ آئے۔

اگر ۲۹ شعبان کو آسمان پر بادل ہوں اور چاند نظر نہ آئے' تو اگلے دن روزہ نہیں

رکھا جائے گا' اسی طرح اگر ۲۹ر مضان کی شام کو چاند نظر آجائے' تو اگلا دن یکم شوال ہو گا اور اس دن عید ہو گی' اور اگر اس دن چاند طلوع نہ ہو یا بادلوں کی وجہ سے نظر نہ آئے' تو ۳۰ دن کی گنتی پوری کی جائے گی اور اس سے اگلے دن عید کی جائے گی' خواہ ۳۰ رمضان کو چاند نظر آئے یا نہ آئے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جب تم اسے (یعنی چاند کو) دیکھو' تو روزہ رکھو' اور جب تم اسے دیکھو تو افطار کرو۔ (یعنی روزے ختم کرو) اور اگر بادل ہوں' فاقدروالہ (تو اس کا حساب کرو) (بخاری' مسلم' نسائی' ابن ماجہ)۔ دوسری روایت میں ہے۔ اگر بادل ہوں' فاکملوا العدة ثلاثین (تو تیس دن کی گنتی پوری کرو) (بخاری)۔ تیسری روایت میں ہے' اگر بادل ہوں' فَاقْدُرُوْا ثَلاَثِيْن (تو تیس دن کا حساب کرو) (مسلم)۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اسے دیکھ کر روزے رکھو اور اسے دیکھ کر افطار کرو (یعنی روزے ختم کرو) اور اگر بادل ہوں' فاکملواعدة شعبان ثلاثین (تو شعبان کی گنتی تیس دن پوری کرو) (بخاری)۔ یہی حدیث صحیح مسلم اور مسند امام احمدؒ میں بھی ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں "فعد وا ثلاثین" (تو تیس دن شمار کرو)[1]

---

[1] یہ جمہور (جن میں امام ابو حنیفہؒ' مالکؒ اور شافعیؒ اور عام محدثین شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ ایک روایت میں امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے' لیکن دوسری مشہور تر روایت میں ان کا مسلک یہ ہے کہ اگر ۲۹ شعبان کو آسمان پر بادل ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہ آئے۔ تو اگلے دن کو یکم رمضان شمار کر کے روزہ رکھا جائے گا۔ صحابہ میں سے حضرت عمرؓ' عبداللہ بن عمرؓ' علیؓ' عمرو بن عاصؓ' ابو ہریرہؓ' انسؓ' عائشہؓ اور اسماءؓ سے اس مسلک کی روایات ملتی ہیں۔

ان کے نزدیک حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں "فاقدروالہ" کا مطلب یہ ہے کہ اسے یعنی شعبان کو سکیڑو یعنی اس کے ۲۹ دن شمار کرو' کیونکہ قَدَرَ یَقْدِرُ کے معنی لغت میں سکیڑنے اور تنگ کرنے کے بھی آتے ہیں' جیسا کہ قرآن پاک میں ہے۔ "وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ" اور جس کا رزق تنگ کر دیا گیا۔" اور "فاکملوا العدة ثلاثین یعنی تیس دن کی گنتی پوری کرو" کا مطلب یہ ہے کہ رمضان کے تیس روزے رکھے جائیں۔ باقی رہی حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ حدیث کہ "فاکملوا العدة شعبان ثلاثین یعنی شعبان

۵۔ رمضان اور عید کے چاند کے لیے کم از کم کتنے آدمیوں کی شہادت معتبر ہے؟

اگر رمضان کا چاند صرف ایک قابلِ اعتبار مسلمان آدمی بھی دیکھ لے' تو اس کی شہادت قبول کی جائے گی اور اگلے دن روزہ رکھا جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ لوگوں نے چاند دیکھنے کی کوشش کی (مگر کسی کو نظر نہ آیا) میں نے (چاند دیکھ لیا' تو) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ مجھے چاند نظر آ گیا' تو آپؐ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ (ابو داؤد' حاکم' ابن حبان)۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک بدو نے آکر عرض کیا۔ "میں نے چاند دیکھ لیا۔" آپؐ نے اس سے فرمایا۔ کیا تم شہادت دیتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؟" اس نے کہا "جی ہاں۔" پھر آپؐ نے فرمایا۔ "کیا تم شہادت دیتے ہو کہ محمد اللہ کا رسول ہے؟" اس نے کہا "جی ہاں۔" فرمایا۔ "اے بلال! لوگوں میں اعلان کر دو کہ کل روزہ رکھیں۔" (ابو داؤد' ترمذی)[1]

کی گنتی تیس دن پوری کرو۔" تو اس کے متعلق ان کا کہنا یہ ہے کہ اس حدیث کی جو روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے سعید بن مسیبؒ (جو حضرت ابو ہریرہؓ کے داماد ہونے کی وجہ سے ان سے بہت زیادہ قریب تھے) کے ذریعے سے آئی ہے' اس میں عِدَّۃُ شعبان (شعبان کی گنتی) کے الفاظ نہیں ہیں۔ یہ الفاظ صرف بخاری کی روایت میں ہیں' جسے ایک دوسرے راوی نے نقل کیا ہے' اس لیے یہ الفاظ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں بلکہ راوی کے اپنے الفاظ ہیں جو اس نے اکملوا العدۃ ثلاثین (تیس دن کی گنتی پوری کرو) کا مطلب بیان کرتے ہوئے کہے ہیں (مختصر از المغنی ج ۳ ص ۵) (تہذیب ابن القیم فی ذیل معالم السنن ج ۳ ص ۲۱۵۔ ۲۱۶)۔

[1] یہ اکثر علمائے سلف کا مسلک ہے (ترمذی)۔ یہی امام احمدؒ اور عبداللہ بن مبارکؒ اور مشہور روایت میں امام شافعیؒ کا مسلک ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا بھی یہی مسلک ہے' لیکن ان کے نزدیک ایک آدمی کی شہادت صرف اس صورت میں قابلِ قبول ہے' جبکہ آسمان پر بادل ہوں' اگر آسمان صاف ہو' تو صرف ایک آدمی کی شہادت کافی نہیں' بلکہ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ بہت سے لوگ چاند دیکھنے کی شہادت دیں۔

لیکن شوال (عید) کے چاند کے لیے کم از کم دو قابل اعتبار مسلمان مردوں کی شہادت ضروری ہے۔

ربعی بن حراش صحابہؓ میں سے کسی ایک سے روایت کرتے ہیں کہ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں رمضان کی ۲۹ویں تاریخ کو چاند نظر نہ آیا' تو (لوگوں نے تیسواں روزہ رکھا۔ صبح کے وقت دو بدو آئے اور انہوں نے رات کو چاند دیکھ لینے کی شہادت دی' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ اپنا روزہ ختم کر دیں۔" (احمد' ابو داؤد' دار قطنی' نسائی) [1]

امام مالکؒ' سفیان ثوریؒ' اوزاعیؒ اور ایک روایت میں امام شافعیؒ کے نزدیک رمضان کے چاند کے لیے کم از کم دو قابل اعتبار آدمیوں کی شہادت ضروری ہے۔ ان کے مسلک کی بنیاد حضرت عبدالرحمٰنؒ بن زید بن خطاب کی اس روایت پر ہے کہ "مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے صحابہؓ نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم اسے (یعنی چاند کو) دیکھ کر روزے شروع کرو اور اسے دیکھ کر روزے ختم کرو اور اسی سے اپنی عبادتوں کے اوقات مقرر کرو۔ اگر بادل ہوں' تو تیس دن کی گنتی پوری کرو۔ اگر دو مسلمان شہادت دیں' تو روزے شروع کرو اور روزے ختم کرو۔" (مسند امام احمد)۔

اس بارے میں بعض اور روایتیں بھی ہیں' جن میں دو آدمیوں کی شہادت کا ذکر ہے۔ ان حضرات کے نزدیک حضرت عبداللہ بن عمرؓ' اور عبداللہ بن عباسؓ کی مذکورہ بالا روایتوں کی تاویل یہ ہے کہ ممکن ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اور لوگوں نے بھی شہادت دی ہو۔۔۔۔ اس کے مقابلہ میں جن حضرات کے نزدیک ایک آدمی کی شہادت کافی ہے۔ ان کا دو آدمیوں کی شہادت والی روایات کے متعلق کہنا یہ ہے کہ ان میں ایک آدمی کی شہادت قبول نہ کرنے کی تصریح نہیں ہے' صرف ان کے مفہوم سے یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جن روایات میں ایک آدمی کی شہادت کا ذکر ہے ان میں اس بات کی تصریح ہے کہ ایک آدمی کی شہادت قابل قبول ہے لہذا یہ روایات قابل ترجیح ہیں۔" (الفتح الربانی ج ۹ ص ۲۶۸)۔

[1] اس بارے میں سوائے امام ابو ثور کے کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ ان کے نزدیک رمضان کی طرح عید کے چاند کے لیے بھی صرف ایک آدمی کی شہادت قابل قبول ہے۔ ان کی تائید صرف عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ میں حضرت عمرؓ کے ساتھ تھا کہ ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کہ "میں نے شوال کا چاند دیکھ لیا ہے"۔ اس پر حضرت عمرؓ نے لوگوں سے فرمایا "اے لوگو! اپنا روزہ ختم کر دو۔" (مسند امام احمدؒ) لیکن جمہور علمائے سلف کے نزدیک یہ روایت ضعیف اور نا قابل حجت ہے (الفتح الربانی ج ۹ ص ۲۶۹)۔

٦۔ اگر ایک جگہ چاند نظر آجائے اور دوسری جگہ نظر نہ آئے :

اگر کسی ایک مقام پر چاند نظر آجائے' تو دوسرے مقامات پر بھی لوگوں کے لیے روزہ رکھنا (یا عید کا چاند ہونے کی صورت میں روزے ختم کرنا) ضروری ہے' کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "اسے (یعنی چاند کو) دیکھ کر روزے رکھو اور اسے دیکھ کر روزے ختم کرو' کا حکم عام ہے۔[1]

اہلحدیث علماء میں سے قاضی شوکانیؒ نے امام ابو ثورؒ ہی کے مسلک کو ترجیح دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "جب افطار (یعنی عید کے چاند) کی شہادت کے لیے دو آدمیوں کے ضروری ہونے پر کوئی صحیح دلیل نہیں ہے' تو رمضان کے چاند پر قیاس کرتے ہوئے اس کے لیے بھی ایک ہی آدمی کی شہادت کافی ہونی چاہیے۔" (مذکورہ بالا حدیث میں دو آدمیوں کی شہادت کا ذکر ہے۔ اس میں اس بات کی تصریح نہیں ہے کہ اگر ایک ہی آدمی شہادت دیتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے قبول نہ فرماتے) (نیل الاوطار)۔

۱۔ یہ امام ابو حنیفہؒ' مالکؒ' احمد بن حنبلؒ' لیث بن سعدؒ اور اکثر فقہاء کا مسلک ہے۔ بعض شافعیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ لیکن اکثر شافعی علماء کے نزدیک اگر چاند ایک جگہ نظر آجائے اور دوسری جگہ نظر نہ آئے' تو اس دوسری جگہ لوگوں پر رمضان کا چاند ہونے کی صورت میں روزہ رکھنا اور عید کا چاند ہونے کی صورت میں روزے ختم کرنا ضروری نہیں ـــــ اسی مسلک کی روایت حضرت ابن عباسؓ' عکرمہؒ' سالمؒ' اسحاق بن راھویہؒ سے بھی ملتی ہے۔ ان حضرات کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اسے دیکھ کر ـــــ" میں خطاب ہر جگہ کے لوگوں کے لیے الگ الگ ہے۔ البتہ اگر دونوں جگہیں قریب ہوں' تو دونوں کا ایک ہی حکم ہے۔

دو جگہوں کے درمیان وہ دوری کونسی ہے جس کے ہوتے ہوئے اگر ایک جگہ چاند نظر آئے اور دوسری جگہ نظر نہ آئے' تو اس دوسری جگہ والوں کے لیے روزہ رکھنا یا روزے ختم کرنا ضروری نہیں' اس کے متعلق مختلف شافعی علماء کی رائے مختلف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ دوری دونوں جگہوں کے درمیان مطلع (آسمان کا وہ حصہ جہاں چاند طلوع ہوتا ہے) کا مختلف ہونا ہے' جیسے حجاز' عراق اور خراسان وغیرہ۔ اس کے مقابلے میں قربت یہ ہے کہ دونوں کا مطلع ایک ہو' جیسے بغداد' کوفہ' قزوین وغیرہ۔ بعض کے نزدیک یہ دوری قصر کی مسافت ہے۔ بعض کے نزدیک یہ دوری ملک کے ایک یا الگ الگ ہونے کے لحاظ سے متعین کی جائے گی۔ بعض کے نزدیک اگر دونوں جگہیں اس طرح واقع ہوں کہ اگر چاند طلوع ہو' تو دوسری جگہ کسی رکاوٹ (جیسے بادل) کے بغیر اس کا نظر نہ آنا متصور نہ کیا جا سکتا ہو' تب تو وہ دونوں ایک مقام ہیں' ورنہ مختلف۔ (الفتح الربانی ج ۹ ص ۲۷۱)۔

۷۔ چاند دیکھنے کی دعا :

حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب ہلال (پہلی تاریخ کا چاند) دیکھتے تو فرماتے :

اَللّٰهُمَّ اَهِلَّهٗ عَلَيْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِيْمَانِ، وَالسَّلَامَةِ وَالْاِسْلَامِ، رَبِّيْ وَ رَبُّكَ اللّٰهُ هِلَالُ رُشْدٍ وَّخَيْرٍ۔ (ترمذی)۔

اے اللہ! ہم پر یہ چاند امن و ایمان، اور سلامتی و اسلام کے ساتھ طلوع فرما۔ (اے چاند!) میرا اور تیرا (دونوں کا) رب اللہ ہی ہے۔ (اس سے ہم دعا کرتے ہیں کہ یہ)۔ ہدایت و خیر کا چاند ہو۔

۸۔ روزہ کے لیے کونسی چیزیں ضروری ہیں؟

روزہ کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں، اگر یہ نہ ہوں، تو روزہ نہ ہوگا :

ا۔ نیت : ہر شرعی کام کے لیے نیت ضروری ہے، جیسا کہ ہم وضو، نماز اور زکوٰۃ کے ابواب میں بیان کر چکے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اعمال نیتوں ہی کے ساتھ ہیں۔" (بخاری وغیرہ)[۱]

حنفیہ میں سے بھی بعض علماء اختلاف مطلع کے قائل ہیں، لیکن اکثر کا مسلک وہی ہے جو ہم اوپر امام ابو حنیفہؒ کا بیان کر چکے ہیں۔ (العرف الشذی ص ۲۸۶۔ فتح الربانی ج ۳ ص ۱۱۲)۔

اہل حدیث علماء میں سے بعض اختلاف مطلع کے قائل ہیں اور بعض اس کے قائل نہیں ہیں۔

نیل الاوطار میں قاضی شوکانیؒ نے جمہور کے مسلک کی پرزور حمایت کی ہے۔

لیکن واضح رہے کہ یہ سارا اختلاف صرف اس صورت میں ہے جبکہ دو جگہوں کے درمیان غیر معمولی فاصلہ نہ ہو۔ اگر دونوں کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ ہو، جیسے حجاز اور اندلس، تو اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ان کا حکم الگ الگ ہے۔ (ہدایۃ المجتہد ج ا ص ۱۹۷)۔

ا۔ امام زہریؒ، عطاءؒ اور زفرؒ کے نزدیک رمضان کے روزہ کے لیے نیت کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ رمضان میں افطار (روزہ نہ رکھنا) ہو ہی نہیں سکتا۔ البتہ جن لوگوں پر رمضان کا روزہ ضروری نہیں ہے، جیسے مریض اور مسافر، ان کے لیے نیت ضروری ہے۔ (ہدایۃ المجتہد ج ا ص ۲۰۱)(نیل الاوطار ج ۴ ص ۱۶۷)۔

رمضان۔۔اور اسی طرح کفارہ' قضا اور نذر۔۔کے روزہ کی نیت کا ہر رات طلوعِ فجر کے وقت یا اس سے پہلے ہونا ضروری ہے۔

حضرت ابنِ عمرؓ حضرت حفصہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس شخص نے طلوع فجر کے ساتھ یا اس سے پہلے [1] پختہ ارادہ (یعنی روزہ کی نیت) نہیں کیا' فلا صیام لہ (اس کا کوئی روزہ نہیں) (احمد' ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ' نسائی' ابن خزیمہ' ابن حبان)۔ [2]

۱۔ "طلوع فجر کے ساتھ" کے الفاظ مسند امام احمدؒ کی روایت کے اور "طلوع فجر سے پہلے" کے الفاظ ترمذی وابوداؤد وغیرہ کی روایت کے ہیں۔

۲۔ یہ روایت صرف ایک سند سے بطور مرفوع (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد) آئی ہے اور بہت سی دوسری سندوں سے بطورِ موقوف (حضرت ابن عمرؓ کا اپنا قول) آئی ہے۔ لیکن تمام محدثین اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد قرار دیتے ہوئے معتبر مانتے ہیں۔ اسی لیے امام مالکؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ اور تمام محدثین کا مسلک وہی ہے جو ہم نے اوپر نقل کیا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جس روزہ کا دن متعین ہو' اس کی نیت زوال سے پہلے پہلے ہو سکتی ہے' لیکن جس روزہ کا دن متعین نہ ہو' اس کی نیت کا رات کو طلوعِ فجر سے پہلے ہونا ضروری ہے۔ اس لحاظ سے ان کے نزدیک رمضان اور متعین نذر کے روزہ کی نیت سحری سے زوال آفتاب سے پہلے تک ہو سکتی ہے' لیکن کفارہ' قضا اور مطلق نذر کے روزے کی نیت کا رات ہی سے ہونا ضروری ہے۔ ان کا استدلال حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت سے ہے کہ ایک بدو نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چاند دیکھنے کی شہادت دی' تو آپؐ نے اعلان فرمادیا کہ جس شخص نے کچھ کھالیا ہو وہ دن کے بقیہ حصہ میں کچھ نہ کھائے اور جس نے کچھ نہ کھایا ہو اسے روزہ رکھ لینا چاہیے۔ (ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ' نسائی)۔

رہی حضرت حفصہؓ کی مذکورہ بالا حدیث' تو اس کے متعلق حنفیہ کا کہنا یہ ہے کہ اول تو اس کے مرفوع یا موقوف ہونے میں اختلاف ہے' تاہم اگر اسے معتبر بھی مان لیا جائے' تو اس میں روزہ کی نہیں بلکہ روزہ کی فضیلت کی نفی کی گئی ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص رمضان کے روزے کی نیت رات سے نہیں بلکہ طلوع آفتاب سے پہلے تک کرے گا' تو اس کو روزہ کی فضیلت حاصل نہ ہوگی' اگرچہ اس کا روزہ ہو جائے گا اور اس کو اجر اس وقت سے ملے گا' جب کہ وہ نیت کرے گا۔۔۔۔ (الکوکب الدری ج ۱ ص ۵۵) (اللمعات بحوالہ تحفۃ الاحوذی ج ۲' ص ۳۹)۔

۲۔ طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک کھانے پینے اور دوسرے مفطرات (وہ چیزیں جن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے)[1] سے رکے رہنا۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (ہدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۱۹۹)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ۔ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ۔ (البقرۃ: ۱۸۷)

تم اپنی بیویوں کے ساتھ شب باشی کرو اور جو چیز اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اسے چاہو۔ نیز رات کو کھاؤ پیو' یہاں تک کہ تمہارے لیے فجر سے سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے نمایاں ہو جائے۔ تب یہ سب کام چھوڑ کر رات تک اپنا روزہ پورا کرو۔

حضرت عدی بن حاتمؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس سے (یعنی سفید دھاگے کا سیاہ دھاگے سے نمایاں نظر آجانے سے) مراد رات کی سیاہی اور دن کی سپیدی ہے۔" (بخاری و مسلم)

۹۔ رمضان کا روزہ کن پر فرض ہے؟

اس پر اجماع ہے کہ رمضان کا روزہ ہر عاقل' بالغ' تندرست' مقیم مرد و عورت مسلمان پر فرض ہے۔ (بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۱۹۳)۔

دوسروں کے نزدیک حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ حدیث پر عمل صرف اس وقت ہو سکتا ہے' جبکہ کسی شخص کو روزوں کے شروع ہو جانے کا علم ہی دن میں ہو کیونکہ ایسی صورت میں رات کی طرف پلٹنا ممکن ہی نہیں' بلکہ ـــــ جیسا کہ امام زیلعیؒ اور حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں ـــــ بدو کی شہادت کا واقعہ اور ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان کا واقعہ اور ہے۔ حضورؐ نے یہ اعلان رمضان کے روزہ کے متعلق نہیں بلکہ عاشورہ کے روزہ کے متعلق کرایا تھا۔ (خاصیۃ الکوکب الدری ج ۱ ص ۲۵۵) (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۳۹)

[1] دیکھیے صفحہ نمبر ۳۱۵۔۱

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ | تم میں سے جو بھی اس مہینے کو پائے' اس کے روزے رکھے۔

۱۰۔وہ لوگ جن پر روزہ فرض نہیں ہے :

نابالغ بچہ' مجنوں (بے سمجھ آدمی)' مریض' مسافر' حیض و نفاس والی عورت بوڑھے مرد یا بوڑھی عورت' حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت پر روزہ فرض نہیں ہے۔ ان میں سے بعض وہ ہیں' جن پر روزہ فرض نہیں ہے' لیکن ان کے لیے روزہ رکھنا مستحب ہے' بعض کو روزہ چھوڑنا اور اس کی قضا کرنا ضروری ہے۔ بعض کو روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے' لیکن اس کی قضا یا فدیہ ضروری ہے۔ ذیل میں ہم ان سب کا الگ الگ ذکر کرتے ہیں :

(الف) نابالغ بچہ : بچہ جب تک بالغ نہ ہو جائے' اس پر روزہ فرض نہیں ہے اور نہ اس کے ذمہ اس کی قضا ہے :

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تین قسم کے آدمی مرفوع القلم ہیں (یعنی شرعی لحاظ سے وہ کسی چیز کے مکلف نہیں ہیں) ایک مجنون' یہاں تک کہ اس کا جنون دور ہو جائے' دوسرا سونے والا یہاں تک کہ بیدار ہو جائے' اور تیسرا بچہ یہاں تک کہ وہ بلوغ کو پہنچ جائے"۔۔۔۔ (احمد' ابو داؤد' ترمذی)۔

لیکن اگر بچہ اس عمر میں ہو کہ وہ روزہ رکھ سکتا ہو' تو اس کے لیے روزہ رکھنا مستحب ہے۔ اس کے سرپرست کو چاہیے کہ اسے روزہ رکھنے کی ترغیب دے تاکہ وہ اس کا عادی بنے :

ربیع بنتِ معوذؓ سے روایت ہے کہ عاشورا کی صبح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کی بستیوں میں یہ اعلان کرایا کہ جس شخص نے روزہ کی حالت میں صبح کی ہو' اسے چاہیے کہ اپنا روزہ پورا کرلے اور جس شخص کا صبح کے وقت روزہ نہ ہو' اسے چاہیے کہ دن کے باقی حصہ کا روزہ رکھ لے۔ چنانچہ اس کے بعد ہم لوگ عاشورا کا روزہ رکھا کرتے تھے اور اپنے چھوٹے بچوں کو بھی روزہ رکھواتے تھے۔ ہم مسجد جاتے' تو انہیں (کھیلنے) کے لیے اون کا کھلونا بنا دیتے تھے۔ جب ان میں سے کوئی بچہ کھانے کے لیے روتا' تو اسے یہ کھلونا دے دیتے' یہاں تک کہ افطار کا وقت ہو جاتا۔" (بخاری مسلم) [1]

(ب) مجنون : مجنوں پر نہ روزہ فرض ہے اور نہ اس کے لیے روزہ رکھنا صحیح ہے۔
مجنوں کے مرفوع القلم ہونے کا ذکر حضرت علیؓ کی مذکورہ بالا حدیث میں ہو چکا ہے [۲]
(ج) حیض یا نفاس والی عورت : جو عورت حیض یا نفاس کی حالت میں ہو' اس کے لیے روزہ رکھنا جائز نہیں ہے۔ البتہ جتنے دن وہ روزہ چھوڑے بعد میں اس کے ذمہ ان کی قضا ضروری ہے۔
حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اگر ہم حیض کی حالت میں ہوتیں' تو ہمیں روزہ کی قضا کا تو حکم دیا جاتا تھا' نماز کی قضا کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔" (بخاری و مسلم)

۱۔ اس بارے میں اختلاف نہیں ہے۔ البتہ بچہ کو ترغیب دینے کی صورت میں اختلاف ہے۔
حنفیہ' شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک بچہ کو سات سال کی عمر میں روزہ کا حکم دینا اور اگر دس سال کی عمر تک روزہ نہ رکھے' تو مارنا مستحب ہے۔ مالکیہ کے نزدیک حکم دینا اور مارنا مستحب نہیں ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج اص ۵۰۹۔ ۵۱۳)۔

۲۔ اس بارے میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ جنون کی بعض حالتیں ایسی ہیں' جن میں روزہ کی قضا ضروری ہے۔
حنفیہ کے نزدیک اگر رمضان کا پورا مہینہ جنون کی حالت میں گزرے' تو کوئی قضا نہیں ہے۔ لیکن اگر رمضان کا کچھ حصہ جنون کی حالت میں گزرے اور کچھ حصہ ہوش کی حالت میں' تو جو حصہ ہوش کی حالت میں گزرے اس کے روزے رکھنا اور باقی دنوں کی بعد میں قضا کرنا ضروری ہے۔ (فتح القدیر ج اص ۴۰۸)۔
شافعیہ کے نزدیک اگر جنون اپنی شرارت کی وجہ سے ہے' تو روزوں کی قضا ضروری ہے اور اگر وہ اپنی شرارت کی وجہ سے نہیں ہے تو روزوں کی قضا ضروری نہیں ہے۔
حنابلہ کے نزدیک اگر پورا دن جنون کی حالت میں گزرے' تو اس دن کے روزہ کی قضا نہیں ہے' خواہ جنون کسی وجہ سے ہو اور اگر دن کے کسی حصہ میں ہوش آجائے' تو اس دن کی قضا ضروری ہے۔
مالکیہ کے نزدیک اگر دن کا نصف حصہ یا اس سے کم جنون کی حالت میں گزرے تو اس دن کی قضا ضروری ہے' لیکن اگر نصف دن سے زیادہ جنون رہے تو اس دن کی قضا نہیں ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج اص ۵۰۹۔ ۵۱۳' ۵۴۔ ۵۴۸)۔

اس بارے میں اجماع ہے۔(نووی نقلاً عن الکوکب الدری ج ۱ ص ۸۰)۔

(د) بوڑھا مرد یا بوڑھی عورت: اس بارے میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی مرد یا عورت اس قدر سن رسیدہ ہو جائے کہ اس کے لیے روزہ رکھنا مشکل ہو' تو اسے روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے۔(ہدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۲۰۲)۔۔۔۔(الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۱۲۹)۔

لیکن روزہ چھوڑنے کی صورت میں اگر وہ فدیہ (روزانہ ایک مسکین کا کھانا) ادا کر سکتا ہو' تو کیا اس پر فدیہ کا ادا کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ جمہور ائمہ (جن میں امام ابو حنیفہ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ اور بخاریؒ شامل ہیں) کے نزدیک اس پر فدیہ کا ادا کرنا ضروری ہے۔اس بارے میں اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حکم ثابت نہیں ہے' لیکن حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آیت "وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ (اگرچہ دوسروں کے لیے منسوخ ہے' لیکن) بوڑھے مرد یا بوڑھی عورت کے لیے منسوخ نہیں ہے۔اسے روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے' لیکن اس پر فدیہ کا ادا کرنا ضروری ہے۔نیز حضرت معاذ بن جبلؓ کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے آیت "فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ" پڑھی اور فرمایا "اللہ تعالیٰ نے رمضان کا روزہ تندرست اور مقیم کے لیے برقرار رکھا اور مریض اور مسافر کو اس کی رخصت دے دی (اور اس طرح اس آیت سے) اس بوڑھے مرد یا بوڑھی عورت پر بھی مسکین کو کھانا کھلانا ثابت ہوا' جو روزہ نہ رکھ سکتا ہو۔"[۱] (مسند امام احمدؒ)۔

(ھ۔و) حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت: حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو'

۱۔ امام مالکؒ' امام ابو ثورؒ اور امام داؤد ظاہریؒ کے نزدیک آیت "وعلی الذین۔۔۔۔" کا حکم ہر شخص کے لیے منسوخ ہے' اس لیے بوڑھے مرد یا بوڑھی عورت پر' جبکہ وہ روزہ نہ رکھ سکے' کوئی چیز ضروری نہیں ہے۔البتہ امام مالکؒ کے نزدیک فدیہ کا ادا کرنا مستحب ہے۔(موطا امام مالکؒ' نیل الاوطار ج ۴ ص ۱۹۷)۔

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ آیت کا مطلب حضرت ابن عباسؓ اور جمہور ائمہ یہ لیتے ہیں کہ "ان لوگوں پر جو مشقت سے روزہ رکھ سکتے ہوں' فدیہ یعنی ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے۔" اور امام مالکؒ وغیرہ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ ان لوگوں پر جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔۔۔۔"(ہدایۃ المجتہد۔ تفسیر ابن کثیر وغیرہ)۔

جب کہ روزہ سے خود اسے یا اس کے بچہ کو یا دونوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو' روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے۔

حضرت انسؓ بن مالکؓ (مشہور انسؓ بن مالک انصاری خادم رسول اللہ علیہ وسلم نہیں' بلکہ ایک دوسرے صحابی) سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ نے مسافر کو آدھی نماز معاف فرما دی اور مسافر حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو روزہ۔" (ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' احمد)۔

لیکن روزہ چھوڑنے کی صورت میں کیا اس کے ذمہ قضا ہے یا فدیہ یا دونوں؟ اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حکم ثابت نہیں ہے۔ ائمہ کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے' جس کا ہم حاشیہ میں ذکر کرتے ہیں۔[1]

(ج) مریض: مریض کو روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے' لیکن بعد میں اس پر قضا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْعَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔ (البقرة)

اور تم میں سے جو شخص مریض ہو یا وہ سفر پر ہو' تو اسے چاہیے کہ دوسرے دنوں میں روزے کی تعداد پوری کرے۔

یہ امر فقہاء کے مابین متفق علیہ ہے کہ مریض کے لیے روزہ چھوڑنے کی رخصت صرف اس صورت میں ہے جبکہ روزہ سے مرض کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو' اور اگر روزہ سے کسی نقصان کا اندیشہ نہ ہو' تو روزہ چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ (احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۲۰۳۔۲۰۴)۔

۱۔ حنفیہ کے نزدیک حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت پر جب وہ روزہ نہ رکھے' بعد میں چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا ضروری ہے' فدیہ ضروری نہیں ہے' خواہ نقصان کا اندیشہ صرف اسے ہو یا صرف بچے کو یا دونوں کو۔

شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک اگر نقصان کا اندیشہ صرف عورت کو یا عورت اور بچے دونوں کو ہو' تب تو صرف قضا ضروری ہے' لیکن اگر یہ اندیشہ صرف بچے کو ہو' تو پھر قضا اور فدیہ دونوں ضروری ہیں۔

مالکیہ کے نزدیک حاملہ کے ذمہ (صرف) فدیہ اور دودھ پلانے والی عورت کے ذمہ (صرف) قضا ضروری ہے خواہ نقصان کا اندیشہ صرف اسے ہو' یا بچے کو یا دونوں کو۔ (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۱۲۷) (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۵۴۴۔۵۴۵)۔

فائدہ: مذاہب اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص دائم المرض ہو' تو اس کے ذمہ روزہ کی قضا نہیں ہے' بلکہ فدیہ ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ)۔

(ح) مسافر: مسافر کے لیے روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے لیکن بعد میں اس پر اس کی قضا کے ضروری ہونے کا ذکر بھی مذکورہ بالا آیت میں واضح طور پر موجود ہے۔ نیز حضرت انس بن مالکؓ کی یہ حدیث بھی اوپر گزر چکی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ نے مسافر کو آدھی نماز معاف کر دی ہے اور مسافر' حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو روزہ۔' (ابو داؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' احمد)۔

سفر میں روزہ رکھنا بھی جائز ہے اور نہ رکھنا بھی۔

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ ایک صحابی حمزہ بن عمرو اسلمیؓ بہت روزے رکھا کرتے تھے۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ "کیا میں سفر میں روزہ رکھوں؟" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اگر چاہو' تو روزہ رکھو اور نہ چاہو' تو نہ رکھو۔" (بخاری' مسلم' ابو داؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)۔

نیز حضرت ابو سعیدؓ اور جابرؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ ایک سفر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ ہم میں سے کوئی روزہ رکھتا تھا اور کوئی نہ رکھتا تھا۔ اب نہ تو روزہ رکھنے والے نہ رکھنے والوں کو ملامت کرتے تھے اور نہ 'نہ رکھنے والوں کو۔" (مسلم)۔

اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف صرف اس بارے میں ہے کہ آیا سفر میں روزہ رکھنا افضل ہے یا نہ رکھنا؟ جمہور (جن میں امام ابو حنیفہؒ' امام مالکؒ اور امام شافعیؒ شامل ہیں) کے نزدیک جو شخص سفر میں روزہ رکھ سکتا ہو' اور اس سے اسے کوئی دشواری پیش نہ آتی ہو' اس کے لیے روزہ رکھنا افضل ہے۔[1] (نیل الاوطار)

مسافر کے لیے یہ جائز ہے کہ رات کو روزہ کی نیت کرنے کے باوجود اگر چاہے تو

1۔ امام احمد بن حنبلؒ' اوزاعیؒ اور اسحاقؒ کے نزدیک سفر میں روزہ نہ رکھنا افضل ہے' کیونکہ سفر میں روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے اور رخصت پر عمل کرنا افضل ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اور صحابہ میں سے حضرت ابن عباسؓ اور عبد اللہ بن عمرؓ کے نزدیک اگر سفر میں روزہ رکھنا آسان ہے۔ تو وہ افضل ہے ورنہ غیر افضل۔ سلف میں بعض کے نزدیک سفر میں روزہ رکھنا اور نہ رکھنا دونوں یکساں ہیں۔

دن میں روزہ توڑ لے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے سال جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی طرف نکلے' تو آپؐ نے روزہ رکھا' اور لوگوں نے بھی آپؐ کے ساتھ روزہ رکھا۔ (یعنی سفر کے دوران کسی دن)۔ یہاں تک کہ جب آپؐ (ایک مقام) کراع' الغمیم پر پہنچے' تو آپ کو اطلاع ملی کہ لوگوں پر روزہ رکھنا دشوار ہو رہا ہے اور وہ آپؐ کے عمل کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ آپؐ نے عصر کے بعد پانی کا ایک پیالہ منگایا اور اسے پیا۔ لوگ آپ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے بعض نے روزہ توڑ لیا اور بعض اسی طرح روزہ رکھے رہے' پھر آپ کو اطلاع ملی کہ کچھ لوگ ابھی تک سخت تکلیف کے باوجود' روزہ سے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ "یہی لوگ نافرمان ہیں۔" (مسلم' نسائی' ترمذی)۔

نیز حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ روزہ کی حالت میں لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ حضورؐ ایک خچر پر سوار تھے اور لوگ پیدل تھے۔ موسم گرما کا دن تھا۔ چلتے چلتے آسمان سے برسے ہوئے پانی کا ایک جوہڑ آیا۔ آپؐ نے لوگوں سے فرمایا "لوگو! پانی پی لو۔" لوگوں نے انکار کیا' تو آپؐ نے فرمایا۔ "میں تمہاری طرح نہیں ہوں' مجھے تمہاری نسبت آسانی حاصل ہے۔ (میں سوار ہوں اور تم پیدل ہو)۔" لوگوں نے پھر بھی پانی نہ پیا۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری سے اترے اور آپؐ نے پانی پیا۔ اس پر لوگوں نے بھی پانی پی لیا۔ حضورؐ خود پانی پینا نہ چاہتے تھے (لیکن آپؐ نے لوگوں کی وجہ سے پانی پیا۔) (احمد)۔

فائدہ: اس بارے میں قاضی شوکانیؒ اپنی رائے یوں ظاہر کرتے ہیں کہ جس شخص پر سفر میں روزہ رکھنا دشوار ہو اور اس سے اسے نقصان پہنچتا ہو' اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی رخصت کو قبول کرنے سے قصداً اعراض کرتا ہو' اس کے لیے روزہ نہ رکھنا افضل ہے۔ اسی طرح اس شخص کے لیے بھی روزہ نہ رکھنا افضل ہے جسے روزہ رکھنے سے ریا اور خود پسندی میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو۔ طبرانی میں حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول منقول ہے کہ جب تم سفر کرو' تو روزہ نہ رکھو' اس لیے کہ اگر تم روزہ رکھو گے تو تمہارے ساتھی آپس میں یہ کہیں گے کہ دیکھو اس شخص کا روزہ ہے۔ اس لیے اس کا خیال رکھو اور اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دو۔ پھر وہ تمہارے کام بھی کریں گے یہاں تک کہ تمہارے روزہ کا اجر ہی ضائع ہو جائے گا۔" (نیل الاوطار ج ۴ ص ۱۹۲)۔

لیکن مسافر کے لیے یہ رخصت صرف اس صورت میں ہے جبکہ وہ سفر میں ہو' اور سفر ہی کے دوران رات کو روزہ کی نیت کرے۔ اگر وہ مقیم ہونے کی صورت میں رات کو روزہ کی نیت کرے اور پھر دن میں سفر شروع کرے' تو جمہور (جن میں امام ابو حنیفہ' مالک' شافعی اور اوزاعی شامل ہیں) کے نزدیک اس کے لیے روزہ توڑنا جائز نہیں ہے' کیونکہ روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس کا حکم سفر اور حضر کے لحاظ سے مختلف ہے' لہٰذا جب سفر اور حضر جمع ہو جائیں تو نماز کی طرح حضر کا حکم غالب ہو گا۔ (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۱۱۶)[1]

نوٹ: سفر کی وہ مسافت جس کے بعد روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے' وہی ہے جس کے بعد نماز

۱۔ امام احمد' اسحاق اور حسن بصریؒ کے نزدیک اس صورت میں بھی انسان کے لیے روزہ توڑ لینا جائز ہے' بلکہ امام حسن بصریؒ اور اسحاق کے نزدیک یہ بھی جائز ہے کہ انسان جب اپنے گھر سے سفر شروع کرنے لگے اور وہ روزہ سے ہو' تو اپنے گھر ہی پر روزہ توڑ لے ان کا استدلال مندرجہ ذیل دو حدیثوں سے ہے:

(۱) محمد بن کعبؒ سے روایت ہے کہ میں رمضان میں حضرت انس بن مالکؓ کے پاس آیا۔ دیکھا کہ آپ سفر پر روانہ ہو رہے ہیں اور آپ کی سواری تیار کھڑی ہے اور آپ نے سفر کا لباس پہن لیا ہے۔ آپ نے کھانا منگوایا اور اسے کھایا۔ میں نے دریافت کیا۔ "کیا یہ سنت ہے؟" فرمایا "ہاں سنت ہے" پھر آپ سوار ہو گئے (ترمذی)۔

(۲) عبید بن جبرؒ سے روایت ہے کہ میں (ایک صحابی) حضرت ابو بصرہ غفاریؓ کے ساتھ فسطاط سے کشتی میں سوار ہوا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ جب کشتی چلنے لگی تو آپ نے کھانا اپنے قریب کیا اور مجھ سے فرمایا۔ "قریب آؤ۔" میں نے کہا "کیا آپ ابھی گھروں کے درمیان نہیں ہیں؟" فرمایا "کیا تم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے منہ موڑ رہے ہو؟" (احمد' ابو داؤد)۔

مالکیہ میں سے علامہ ابن العربیؒ نے اسی مسلک کو صحیح قرار دیا ہے اور اسی کی تائید علامہ شوکانیؒ نے کی ہے (نیل الاوطار ج ۴ ص ۱۹۵)۔

جمہور (جن کا مسلک ہم نے اوپر بیان کیا ہے) کے نزدیک حضرت انسؓ کی حدیث میں "سنت" کا لفظ واضح نہیں ہے (یعنی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت قرار دیا ہو یا یہ ان کی اپنی رائے ہو)۔ اسی طرح حضرت ابو بصرہؓ کی روایت کے متعلق بھی ان کا کہنا یہ ہے کہ ممکن ہے حضرت ابو بصرہؓ اپنے اجتہاد سے یہ سمجھے ہوں کہ مسافر کے لیے خواہ وہ سفر کے دوران میں ہو یا اپنے گھر سے سفر شروع کر رہا ہو' روزہ توڑنا جائز ہے۔ ورنہ اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نص ثابت نہیں ہے

میں قصر جائز ہے۔ اور اس بارے میں ائمہ کے درمیان وہی اختلاف ہے' جو وہاں ہے۔ (نیل الاوطار ج ۴ ص ۱۹۲)۔ ملاحظہ ہو: باب "نماز میں قصر" حصہ اول صفحہ ۳۵۷

۱۱۔ رمضان کے روزوں کی قضا:

رمضان کی قضا کے لیے روزوں کا لگاتار رکھنا ضروری نہیں ہے' بلکہ انہیں لگاتار بھی رکھا جاسکتا ہے اور الگ الگ کر کے بھی۔ قرآن پاک کی آیت میں "عِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ" (یعنی دوسرے دنوں میں روزوں کی گنتی) پوری کرنے کا ذکر ہے" انہیں لگاتار یا الگ الگ کر کے رکھنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔ نیز:

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "رمضان کی قضا (دونوں طرح صحیح ہے) کوئی چاہے تو لگاتار روزے رکھ لے اور کوئی چاہے انہیں الگ الگ کر کے رکھ لے۔" (دار قطنی)

اس بارے میں اور بھی کئی احادیث آئی ہیں' جن میں اگرچہ سند کے لحاظ سے کلام کیا گیا ہے' لیکن وہ سب مل کر قابل حجت بن جاتی ہیں۔[1]

اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ حضرت ابو بصرہؓ طلوع فجر سے پہلے فسطاط سے نکلے ہوں اور ابھی انہوں نے روزہ کی نیت نہ کی ہو اس صورت میں وہ مسافر تھے۔ اور ان کے لیے روزہ رکھنا جائز تھا۔ (بذل المجهود الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۱۲۵)۔

۱۔ یہ جمہور کا عام مسلک ہے۔ صحابہؓ میں سے حضرت ابن عمرؓ اور عائشہؓ اور تابعین میں سے حسن بصریؒ' عروہ بن زبیرؒ' ابراہیم نخعیؒ' اور داؤد طاہریؒ کے نزدیک رمضان کی قضا میں روزوں کا لگاتار رکھنا ضروری ہے۔ ان کا استدلال دارِ قطنی کی اس روایت سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جس شخص کے ذمہ رمضان کے روزے ہوں' وہ انہیں لگاتار رکھے' الگ الگ کر کے نہ رکھے۔"

اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ جمہور کے نزدیک یہ روایت سند کے لحاظ سے بھی ضعیف ہے اور کسی دوسری حدیث سے اس کی تائید بھی نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ قابلِ حجت نہیں ہے۔ دوسرے مسلک والے حضرت ابن عمرؓ سے مروی مذکورہ بالا روایت کو سند کے لحاظ سے قابلِ حجت نہیں تسلیم کرتے۔" (الفتح الربانی)

۱۲۔ میت کے ذمہ روزوں کی قضا:

اگر کوئی شخص مر جائے‘ حالانکہ اس کے ذمہ روزوں کی قضا ہو‘ تو جمہور (جن میں امام ابو حنیفہؒ اور مالکؒ شامل ہیں) کے نزدیک اس کا ولی اس کے روزوں کی قضا نہیں کرے گا‘ البتہ وہ اس کی طرف سے مسکینوں کو کھانا کھلائے گا (بذل المجہود ج ۳ ص ۱۶۰) نیل الاوطار ج ۴ ص ۲۰۱)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جو شخص مر جائے اور اس کے ذمہ ایک مہینے کے روزے ہوں تو اس کی طرف سے ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلانا چاہیے۔“ (ترمذی)

نیز بعض صحابہ کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ میت کی طرف سے روزوں کی قضا نہیں کی جا سکتی۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔ ”کوئی شخص دوسرے شخص کی طرف سے نماز نہیں پڑھ سکتا اور نہ اس کی طرف سے روزہ رکھ سکتا ہے۔“ (نسائی)

حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا گیا کہ ایک عورت مر گئی‘ حالانکہ اس کے ذمہ روزے تھے (تو کیا کیا جائے؟) انہوں نے جواب دیا ”اس کی طرف سے کھانا کھلایا جائے۔“

حضرت عائشہؓ سے یہ روایت بھی ہے کہ انہوں نے فرمایا ”اپنے مردوں کی طرف سے روزے نہ رکھو‘ بلکہ ان کی طرف سے کھانا کھلاؤ۔“ (بیہقی)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے جب دریافت کیا جاتا کہ کیا کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی طرف سے روزہ رکھ سکتا ہے یا نماز پڑھ سکتا ہے؟ تو آپ فرماتے ”کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی طرف سے نہ روزہ رکھ سکتا ہے اور نہ نماز پڑھ سکتا ہے۔“ (موطا امام مالکؒ)۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ میں نے مدینہ میں کسی صحابی یا تابعی کے متعلق یہ نہیں سنا کہ انہوں نے یہ فرمایا ہو کہ ”کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی طرف سے روزہ رکھ سکتا ہے یا نماز پڑھ سکتا ہے“[1] (موطا امام مالکؒ)۔

۱۔ اس بارے میں دوسرا مسلک امام ابو ثورؒ اور عام محدثین کا ہے‘ اور وہ یہ کہ میت کی طرف سے اس کا ولی روزہ کی قضا کر سکتا ہے۔ خواہ یہ قضا رمضان کے روزوں کی ہو یا نذر مانے ہوئے روزوں کی۔ ان کا استدلال ایک تو حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جو شخص مر

جائے اور اس کے ذمے روزے ہوں' تو اس کی طرف سے کا ولی روزے رکھ سکتا ہے۔" (بخاری' مسلم' ابوداؤد' احمد)۔ دوسرے حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت سے کہ ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے عرض کیا۔ "میری ماں کا انتقال ہو گیا حالانکہ اس کے ذمہ لگاتار دو ماہ کے روزے تھے' تو کیا میں اس کی طرف سے ان روزوں کی قضا کر سکتی ہوں؟" فرمایا "تم یہ بتاؤ کہ اگر تمہاری ماں مر جاتی اور اس کے ذمہ قرض ہوتا' تو کیا تم وہ قرض ادا کرتیں؟" اس نے جواب دیا "جی ہاں۔" فرمایا "تو اللہ کا قرض تو ادائیگی کا زیادہ حق دار ہے۔" (بخاری' مسلم' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)۔

امام شافعیؒ سے اس مسئلہ میں دو روایتیں ہیں۔ مشہور روایت میں ان کا مسلک جمہور کے مطابق ہے اور دوسری روایت میں امام ابو ثورؒ کے مطابق۔ محدث شافعی علماء کا مسلک اسی دوسری روایت کے مطابق ہے۔

اس بارے میں تیسرا مسلک امام احمد بن حنبلؒ' لیث و ابن سعدؒ اور ابو عبیدؒ کا ہے اور وہ یہ کہ میت کی طرف سے نذر مانے ہوئے روزوں کی قضا تو کی جا سکتی ہے' لیکن رمضان کے روزوں کی قضا نہیں کی جا سکتی' بلکہ اس کی طرف سے مسکینوں کو کھانا کھلانا چاہیے۔ ان کا استدلال حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا روایت ہی سے ہے' کیونکہ اس میں صرف نذر مانے ہوئے روزوں ہی کی قضا کا ذکر ہے۔ باقی رہے رمضان کے روزے' تو ان کی قضا اس لیے نہیں کی جا سکتی کہ حضرت ابن عباسؓ جنہوں نے اس حدیث کو روایت کیا ہے' ان کا خود فتویٰ یہی تھا (جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے)۔

اختلاف کی وجہ: جمہور کے نزدیک حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ کی دونوں حدیثیں (جن سے دوسرے مسلک والوں نے استدلال کیا ہے) اول تو منسوخ ہیں' کیونکہ خود ان دونوں حضرات کا فتویٰ ان کے خلاف ہے' تاہم اگر انہیں منسوخ نہ بھی مانا جائے' تو ان میں حضرت عائشہؓ کی حدیث کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مر جائے اور اس کے ذمہ روزے ہوں' تو اس کے ولی کو اس کی طرف سے روزے رکھنے چاہئیں کا مطلب قیاس اور صحابہؓ کے فتاویٰ کی روشنی میں یہ ہے کہ اس کا ولی ایسا کام کرے جو روزوں کا قائم مقام ہو اور وہ یہ کہ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کی سند میں اضطراب ہے' لہٰذا وہ قابل حجت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی بعض روایات میں "ایک عورت" کے بجائے "ایک مرد" کا ذکر ہے اور ماں کے متعلق سوال کرنے کے بجائے بہن کے متعلق سوال کرنے کا ذکر ہے (بذل المجہود ج ۳ ص ۱۶۰)۔

دوسرے مسلک والوں کے نزدیک حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ حدیث کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو شخص مر جائے اور اس کے ذمہ ایک مہینے کے روزے ہوں' تو اس کی طرف سے ہر روز ایک

مسکین کو کھانا کھلانا چاہیے۔" موقوف ہے یعنی اس کے الفاظ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ خود حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اپنے الفاظ ہیں' اور ان میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو میت کی طرف سے روزے رکھنے میں مانع ہو۔ رہے حضرت ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ کے فتاویٰ' تو ان سے یہ استدلال کرنا کہ میت کی طرف سے روزہ نہیں رکھا جا سکتا' دو وجہ سے صحیح نہیں ہے۔ ایک یہ کہ فقہ کا مسلمہ اصول ہے کہ اگر کسی صحابی کی روایت اور فتویٰ میں اختلاف پایا جائے' تو اس کی روایت پر عمل کیا جائے گا فتویٰ پر نہیں۔ دوسرے یہ کہ دوسری روایات میں خود حضرت ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ ہی کا یہ فتویٰ بیان ہوا ہے کہ میت کی طرف سے روزہ رکھنا اور نماز پڑھنا صحیح ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے ایک ایسے شخص کے متعلق دریافت کیا گیا' جس کا انتقال ہو گیا تھا' حالانکہ اس کے ذمہ نذر مانے ہوئے روزے باقی تھے۔ آپ نے فرمایا۔ "اس کی طرف سے نذر مانے ہوئے روزے رکھے جائیں۔" (مسند ابن ابی شیبہ)۔

حضرت ابن عمرؓ سے ایک عورت نے دریافت کیا کہ میری ماں نے اپنے اوپر نماز کی نذر مانی تھی (تو اب میں کیا کروں ؟)۔ آپ نے فرمایا "تم اس کی طرف سے نماز پڑھو۔" ان دونوں قسم کی روایات میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ "کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی طرف سے نہ روزہ رکھ سکتا ہے اور نہ نماز پڑھ سکتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی طرف سے اس کی زندگی میں نہ روزہ رکھ سکتا ہے اور نہ نماز پڑھ سکتا ہے۔ رہے حضرت عائشہؓ کے دونوں فتاویٰ' تو ان میں سے پہلے میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو میت کی طرف سے روزہ رکھنے کو مانع ہو۔ دوسرے فتویٰ کی سند انتہائی ضعیف ہے' لہٰذا اس سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ رہی حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع حدیث (جس میں جمہور اضطراب قرار دیتے ہیں اور اس وجہ سے اسے قابل حجت تسلیم نہیں کرتے) تو اس میں کوئی اضطراب نہیں ہے۔ بلکہ اس کی مختلف روایتوں میں مختلف لوگوں کے سوالات اور ان پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جوابات نقل کیے گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ حضورؐ سے کسی موقع پر ایک عورت نے اپنی ماں کے متعلق سوال کیا ہو اور دوسرے موقع پر اسی قسم کا سوال کسی مرد نے اپنی بہن کے متعلق دریافت کیا۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۴۲)۔

تیسرے مسلک والے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کو نذر مانے ہوئے روزوں کے متعلق قرار دیتے ہیں اور ان کے فتویٰ کو رمضان کے روزوں کے متعلق۔ رہی حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کہ جو شخص مر جائے' اور اس کے ذمہ روزے ہوں' تو اس کے ولی کو چاہیے کہ اس کی طرف سے روزے رکھے۔" تو اس کے متعلق وہ یہ کہتے ہیں کہ اس میں ایک عام حکم دیا گیا ہے' جسے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کی روشنی میں صرف نذر مانے ہوئے روزوں کے متعلق قرار دیا جائے گا۔ (تہذیب ابن قیم علی حاشیتہ معالم السنن ج ۳ ص ۲۷۹۔ ۲۸۲)۔

وہ دن جن کا روزہ رکھنا حرام ہے

۱'۲۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ:

اس پر اجماع ہے کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن روزہ رکھنا حرام ہے' خواہ یہ روزہ نذر کا ہو' یا نفلی یا کفارہ کا یا کوئی اور۔ (نووی بحوالہ الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۱۴۱)۔

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دنوں کے روزہ سے منع فرمایا ہے۔ عید الفطر تو تمہارا (رمضان کے) روزوں سے افطار ہے اور عید الاضحیٰ کے دن تم اپنی قربانیوں کا گوشت کھاؤ۔" (بخاری' مسلم' ابو داؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' احمد' بیہقی وغیرہ)۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے[1] (بخاری' مسلم' ابو داؤد' ترمذی' بیہقی)۔

۳۔ ایامِ تشریق:

ایامِ تشریق سے مراد عید الاضحیٰ کے بعد کے تین دن ہیں' یعنی ۱۱' ۱۲ اور ۱۳ ذی الحجہ۔

جمہور صحابہؓ' تابعین اور ائمہ کے نزدیک ان تین دنوں میں بھی روزہ رکھنا حرام ہے' خواہ وہ نذر کا روزہ ہو یا نفلی یا کفارہ کا یا کوئی اور۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن حذافہؓ کو بھیجا کہ منیٰ میں گھوم کر یہ اعلان کر دیں کہ "ان دنوں میں (یعنی تشریق کے دنوں میں) روزہ

---

[1] حنفیہ کے نزدیک عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن روزہ رکھنا مکروہ تحریمی ہے (یعنی ایسا مکروہ ہے جس کی کراہت حرمت کے قریب قریب ہے) (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۵۲۴)۔ چونکہ یہ اختلاف صرف اصطلاحی اور لفظی ہے' عملاً اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا' اس لیے اوپر ہم نے امام نووی کا قول نقل کر دیا ہے۔ اگرچہ اس میں ان دنوں کے روزے کی حرمت پر اجماع ظاہر کیا گیا ہے۔

نہ رکھو' اس لیے کہ یہ کھانے پینے اور اللہ کو یاد کرنے کے دن ہیں۔"[1] (احمد' دارقطنی)۔

حج میں ایسے شخص کے لیے جسے قربانی کا جانور نہ ملا ہو' تشریق کے دنوں میں روزہ رکھنے کے متعلق اختلاف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے (کتاب الحج: ۴۱۰)۔

۴۔ عورت کا اپنے شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر نفلی روزہ رکھنا:

جمہور (جن میں امام مالک' شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ شامل ہیں) کے نزدیک عورت کا اپنے شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر نفلی روزہ رکھنا حرام ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۰ص ۱۲۷)۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "عورت اپنے شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر ایک دن بھی روزہ نہ رکھے' سوائے رمضان کے"۔[2] (احمد بخاری' مسلم' ابوداؤد' بیہقی' دارمی)۔

۱۔ صحابہ میں سے حضرت ابن عمرؓ' ابو طلحہؓ اور زبیر بن عوامؓ اور تابعین میں سے اسود بن یزیدؒ اور ابن سیرینؒ کے نزدیک ایامِ تشریق میں روزہ رکھنا جائز ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان حضرات کو ممانعت کی احادیث نہیں ملیں۔

شافعیہ کے نزدیک ایامِ تشریق میں ایسا روزہ رکھا جاسکتا ہے' جس کا کوئی سبب ہو' جیسے نذر یا کفارہ یا قضا کا روزہ۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ جس طرح بعض ایسے اوقات میں جن میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ لیکن ان میں شافعیہ کے نزدیک ایسی نماز پڑھی جاسکتی ہے جس کا کوئی سبب ہو' اسی طرح ایامِ تشریق میں بھی ایسا روزہ رکھا جاسکتا ہے جس کا کوئی سبب ہو (الفتح الربانی ج ۱۰ص ۱۴۷)۔

حنفیہ کے نزدیک ایامِ تشریق میں روزہ مکروہ تحریمی ہے' حرام نہیں ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ص ۵۲۴)۔ لیکن واضح رہے کہ یہ اختلاف صرف اصطلاحی اور نظری ہے جیسا کہ اوپر بیان کر چکے ہیں۔

۲۔ حنفیہ کے نزدیک مکروہ ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ص ۵۲۲)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ بالا حدیث میں ممانعت کو حنفیہ کراہت پر محمول کرتے ہیں اور دوسرے حرمت پر' اور یہی اختلاف کی وجہ ہے۔

۵۔ وصال کے روزے :

وصال سے مراد یہ ہے کہ اس طرح دن رات مسلسل روزہ رکھا جائے کہ درمیان میں نہ سحری کھائی جائے اور نہ افطاری کی جائے۔

اکثر ائمہ (جن میں امام مالکؒ اور امام شافعیؒ شامل ہیں) کے نزدیک وصال کا روزہ حرام ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ بعض اوقات روزے میں وصال فرمایا کرتے تھے، لیکن اپنی امت کو حضورؐ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ اس بارے میں متعدد احادیث ثابت ہیں جن میں سے اختصار کے خیال سے صرف ایک حدیث نقل کرتے ہیں :

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا۔ "روزے میں وصال سے بچو۔" لوگوں نے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسولؐ! مگر آپؐ خود تو وصال فرماتے ہیں؟" "اس بارے میں تم میری طرح نہیں ہو۔ میں اس طرح رات بسر کرتا ہوں کہ میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔ لہذا تم اتنا ہی کام کرو، جس کی تم طاقت رکھتے ہو۔" [1] (بخاری، مسلم، احمد وغیرہ)

---

[1] حنفیہ کے نزدیک وصال مکروہ ہے، حرام نہیں (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۵۲۲)۔

امام احمدؒ، اسحاقؒ، ابن منذرؒ، ابن خزیمہؒ اور بعض، کئی علماء کے نزدیک بھی وصال مکروہ ہے، لیکن جو شخص طاقت رکھتا ہو، وہ سحری سے سحری تک وصال کر سکتا ہے۔ ان کا استدلال حضرت ابو سعید خدریؓ کی اس روایت سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وصال نہ کرو، لیکن اگر تم میں سے کوئی چاہے، تو سحری تک وصال کر سکتا ہے۔" (بخاری، ابو داؤد، احمد، مسلم)۔

وہ دن جن کا روزہ رکھنا مکروہ ہے :

ا۔ صرف جمعہ کا دن :

جمہور (جن میں امام شافعیؒ اور امام احمدؒ اور عام محدثین شامل ہیں) کے نزدیک ہفتہ بھر میں صرف جمعہ کے دن کا روزہ رکھنا مکروہ ہے' لیکن اگر کوئی شخص اس سے پہلے کا بھی یا اس کے بعد کا بھی روزہ رکھے' یا کوئی شخص اپنی عادت کے مطابق روزے رکھ رہا ہو اور ان میں جمعہ کا دن آجائے' یا جمعہ کے دن عرفہ یا عاشوراء آجائے' تو ان صورتوں میں جمعہ کے دن کا روزہ مکروہ نہیں ہے۔

حضرت ابوایوب ہجریؓ سے روایت ہے کہ ایک جمعہ کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم (امُّ المومنین) حضرتُ جویریہؓ کے ہاں تشریف لائے۔ اس دن حضرت جویریہؓ کا روزہ تھا۔ آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا۔ "کیا تم نے کل بھی روزہ رکھا تھا؟" انہوں نے جواب دیا "نہیں۔" پھر دریافت فرمایا "کیا تم کل بھی روزہ رکھو گی؟" انہوں نے جواب دیا "نہیں" فرمایا "تو روزہ توڑ لو۔" (بخاری' ابوداؤد' نسائی' احمد)۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جمعہ کے دن روزہ نہ رکھو' اِلّا یہ کہ تم اس سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد بھی روزہ رکھو[1] " (بخاری و

ا۔ امام ابن منذر اور ابن حزمؒ کے نزدیک صرف جمعہ کے دن روزہ رکھنا مکروہ نہیں بلکہ حرام ہے۔ انہوں نے یہی مسلک صحابہؓ میں سے حضرت ابوہریرہؓ' علیؓ' سلمان فارسیؓ اور ابوذرؓ سے نقل کیا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا روایات میں ممانعت کو یہ حضرات حرمت پر محمول کرتے ہیں اور دوسرے کراہت پر۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک صرف جمعہ کا روزہ مکروہ نہیں بلکہ جائز ہے۔ ان کا استدلال حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اس روایت سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر مہینے کے شروع میں تین روزے رکھا کرتے تھے اور کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ آپ جمعہ کا روزہ نہ رکھتے ہوں (نسائی' ابن ماجہ' ترمذی)۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ "میں نے کسی ایسے شخص کو جس کی اقتدا کی جاتی ہو' جمعہ کے دن روزہ رکھنے سے منع کرتے نہیں دیکھا بلکہ بہت سوں کو اس دن روزہ رکھتے دیکھا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ اس دن خاص طور پر روزہ رکھتے تھے۔" (موطا امام مالکؒ)۔

مسلم)۔

۲۔ صرف ہفتہ کا دن :

جمہور (جن میں امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ' اور احمد بن حنبلؒ شامل ہیں) کے نزدیک صرف ہفتہ کے دن روزہ رکھنا مکروہ ہے :

عبداللہ بن بسرؓ اپنی بہن حضرت صماءؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ہفتہ کے دن روزہ نہ رکھو' اِلَّا یہ کہ اس دن کوئی فرض روزہ آجائے (اِلَّا فِیْ مَاافْتَرَضَ عَلَیْکُمْ)۔ اگر تم میں سے کوئی شخص کھانے کے لیے انگور کی بیل کی ٹہنی یا کسی درخت کی چھال کے سوا کچھ نہ پائے' تو اس کو چبالے۔"[1] (ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' احمد' بیہقی' حاکم' طبرانی' ابن حبان)۔

لیکن متاخرین حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک صرف جمعہ کے دن روزہ رکھنا مذکورہ بالا احادیث کی روشنی میں مکروہ ہی ہے' چنانچہ الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں حنفیہ اور مالکیہ کا یہی مسلک بیان کیا گیا ہے۔ امام مالکؒ کے شاگرد داوریؒ کا کہنا ہے کہ امام مالکؒ کو ممانعت کی احادیث نہیں ملیں۔ اگر انہیں یہ احادیث مل جاتیں' تو ان کا مسلک ہرگز ان کے خلاف منقول نہ ہوتا۔ (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۱۵۵)۔ مشہور حنفی عالم امام طحاویؒ لکھتے ہیں "حدیث میں جمعہ کے روزے کے استحباب اور ممانعت دونوں کا ذکر ہے' لیکن دونوں میں سے بعد کا حکم ممانعت ہی کا ہے' جیسا کہ امام محمدؒ کی الجامع الصغیر کے اکثر شارحین نے اس کی تصریح کی ہے (بذل المجہود ج ۳ جزء ۲ ص ۱۶۰)۔

۱۔ امام مالکؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک صرف ہفتہ کے دن روزہ رکھنے میں کراہت نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت صماءؓ کی مذکورہ بالا حدیث کو وہ سند کے لحاظ سے معتبر نہیں مانتے اور معتبر ماننے کی صورت میں بھی' اس کا حکم ان احادیث سے منسوخ مانتے ہیں' جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہفتہ اور اتوار کو روزہ رکھنا مستحب قرار دیا ہے۔

دوسروں کے نزدیک حضرت صماءؓ کی حدیث کی سند معتبر ہے اور وہ اسے منسوخ بھی قرار نہیں دیتے۔ بلکہ وہ اس کے اور ان احادیث کے درمیان جن میں ہفتہ اور اتوار کے دن روزہ رکھنے کو مستحب قرار دیا گیا ہے' یوں تطبیق دیتے ہیں کہ اگر ہفتہ کے ساتھ جمعہ یا اتوار کا بھی روزہ رکھا جائے' تو اس دن روزہ رکھنا مکروہ نہیں ہے' لیکن اگر صرف ہفتہ کا روزہ رکھا جائے تو وہ مکروہ ہے (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۱۵۳)۔

۳۔ شک کے دن :

شک کے دن سے مراد ۳۰ شعبان ہے' اس صورت میں کہ ۲۹ شعبان کو چاند نظر نہ آئے اور یہ بات قطعی طور پر معلوم نہ ہو سکے کہ کل ۳۰ شعبان ہے یا یکم رمضان؟[1]

شک کے دن رمضان کے روزہ کی نیت کر کے روزہ رکھنا ممنوع ہے۔[2]

حضرت عمار بن یاسرؓ سے روایت ہے کہ جس شخص نے شک کے دن روزہ رکھا' اس نے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی۔" (ابو داؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)۔

لیکن اگر کوئی شخص روزہ رکھ لے اور اگلے دن یہ واضح ہو جائے کہ آج واقعی رمضان ہے' تو جمہور (جن میں مالکیہ' شافعیہ اور حنابلہ شامل ہیں) کے نزدیک اگرچہ اس شخص کے لیے ضروری ہے کہ کھانے پینے سے رکا رہے' لیکن اس کا وہ روزہ رمضان کا روزہ شمار نہ ہو گا اور بعد میں اس کے ذمہ اس دن کی قضا ضروری ہو گی[3] (نیل الاوطار)۔

۴۔ ہمیشہ روزہ رکھنا :

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس شخص نے ہمیشہ روزہ رکھا' (اللہ کرے) وہ کبھی روزہ نہ رکھے۔" (بخاری و مسلم)۔

۱۔ حنفیہ کے نزدیک اس وجہ سے کہ آسمان پر بادل ہوں یا اس وجہ سے کہ بعض لوگوں نے چاند تو دیکھا ہو مگر ان کی شہادت قبول نہ کی گئی ہو۔ مالکیہ کے نزدیک صرف اس وجہ سے کہ آسمان پر بادل ہوں۔

شافعیہ کے نزدیک اس وجہ سے کہ چاند کے دیکھنے کی ایسے لوگوں نے شہادت دی ہو' جن کی شہادت معتبر نہ ہو جیسے بچے اور عورتیں' خواہ آسمان پر بادل ہوں یا نہ ہوں۔

حنابلہ کے نزدیک صرف اس صورت میں جبکہ آسمان پر بادل نہ ہوں (یعنی اگر آسمان پر بادل ہوں' تو اگلے دن کو یکم رمضان تصور کر کے روزہ رکھا ہی جائے گا۔ اس بارے میں حنابلہ کے مسلک کے لیے دیکھئے صفحہ ۲۵۰۔۲۵۱) (الفقہ علی المذاہب الاربعہ)۔

۲۔ حنفیہ کے نزدیک مکروہ تحریمی' شافعیہ کے نزدیک حرام اور مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک مکروہ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ)۔

۳۔ حنفیہ کے نزدیک اگرچہ اس شخص کو شک کے دن روزہ رکھنے کا گناہ ہو گا' لیکن اس کا روزہ رمضان کا روزہ شمار ہو جائے گا اور اس پر بعد میں قضا ضروری نہیں ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ)۔

حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا۔ "اے اللہ کے رسولؐ! وہ شخص کیسا ہے (یعنی اس کا عمل کہاں تک درست ہے) جس نے ہمیشہ روزہ رکھا؟" فرمایا "وہ کبھی نہ روزہ رکھے اور نہ افطار کرے (یعنی آپ نے اس کے لیے یہ بددعا فرمائی) یا آپؐ نے فرمایا "اس نے نہ روزہ رکھا اور نہ افطار کیا۔" (مسلم' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' احمد)۔

حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس شخص نے ہمیشہ روزہ رکھا' اس پر اس طرح جہنم تنگ کر دی گئی اور یہ فرماتے ہوئے آپ نے اپنی ہتھیلی کو بھینچا۔" (احمد)

ان احادیث کی بنا پر ہمیشہ روزہ رکھنے کی ممانعت پر سب کا اتفاق ہے۔ جمہور (جن میں ائمہ اربعہ شامل ہیں) کے نزدیک یہ ممانعت صرف اس شخص کے لیے ہے' جو اس طرح سال بھر روزہ رکھے کہ عیدین اور تشریق کے دنوں میں بھی روزے کے بغیر نہ رہے' یا یہ کہ وہ لگاتار روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہو یا لگاتار روزہ رکھ کر دوسرے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہو۔ جو شخص ان چیزوں سے بچ کر ہمیشہ روزہ رکھے' اس کے لیے ایسا کرنا مستحب ہے' کیونکہ بعض صحابہؓ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پے در پے روزہ رکھنے کی اجازت دی تھی۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حمزہ اسلمیؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسولؐ! میں ایک ایسا آدمی ہوں' جو پے در پے روزے رکھتا ہوں' کیا میں سفر میں بھی روزہ رکھوں؟" فرمایا "اگر تم چاہو' تو رکھو اور اگر نہ چاہو تو نہ رکھو"[1] (بخاری' مسلم' ابوداؤد' بیہقی' دارمی' موطا امام مالکؒ' احمد)۔

---

[1] امام اسحاقؒ اور ایک روایت میں امام احمدؒ کے نزدیک ہمیشہ روزہ رکھنا مطلقاً مکروہ اور امام ابن حزمؒ کے نزدیک مطلقاً حرام ہے۔ مالکیہ میں سے ابن العربی کا بھی یہی مسلک ہے۔ حافظ ابن حجرؒ اور اکثر اہلحدیث علماء کا رحجان بھی اسی طرف ہے کیوں کہ "پے در پے روزے رکھنے" سے ان کے نزدیک یہ ضروری نہیں ہو جاتا کہ ہمیشہ روزے رکھے جائیں بلکہ اس کا مطلب کثرت سے روزے رکھنا ہے۔ حضرت حمزہ اسلمیؓ بھی کثرت سے روزے رکھا کرتے تھے اس لیے انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سفر میں بھی روزہ رکھنے کے متعلق دریافت کیا اور آپؐ نے انہیں اجازت دے دی۔ یہ کہ پے در پے روزے رکھنے سے مراد کثرت سے روزہ رکھنا ہے نہ کہ ہمیشہ روزہ رکھنا۔ اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت اسامہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پے در پے روزے رکھا کرتے تھے' حالانکہ دوسری احادیث سے یہ ثابت ہے کہ آپؐ نے سوائے رمضان کے کسی دوسرے مہینے کے پورے روزے نہیں رکھے۔ (نیل الاوطار ج ۴ ص ۲۱۷)

نفلی روزے

فرض روزوں کے علاوہ مندرجہ ذیل نفلی روزوں کا رکھنا سنت ہے :

۱۔ شوال کے چھ روزے :

حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے' پھر اس کے بعد شوال میں چھ دنوں کے روزے رکھے' گویا اس نے ہمیشہ (یعنی سال بھر) روزے رکھے۔" (مسلم' ابو داؤد' ترمذی' ابن ماجہ' احمد)۔

حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے اور پھر فطر (یعنی عید الفطر) کے بعد چھ روزے رکھے' اس نے سال بھر کے روزے رکھے' اس لیے کہ جو شخص ایک نیکی کرتا ہے اسے دس گنا اجر ملتا ہے۔"[1] (احمد' نسائی' ابن ماجہ' دارمی' بزار)۔

ان روزوں کو عید الفطر کے اگلے روز (یعنی ۲ شوال) سے لگاتار بھی رکھا جا سکتا ہے اور پورے ماہ شوال میں الگ الگ کر کے بھی۔ اس بارے میں اختلاف صرف افضل ہونے میں ہے جس کا ہم حاشیہ پر ذکر کرتے ہیں[2]

۲۔ ذی الحجہ کے ابتدائی نو دنوں کے روزے اور صرف غیر حاجی کے لیے ۹ تاریخ کے روزے کی تاکید :

۱۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ سے شوال کے ان چھ روزوں کے مکروہ ہونے کی روایات ملتی ہیں' لیکن متاخرین حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک یہ مکروہ نہیں ہیں' کیونکہ ہو سکتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کو یہ روایت نہ ملی ہوں' یا ملی ہوں لیکن صحیح سند سے نہ ملی ہوں۔ (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۲۲۲) (بذل المجہود ج ۳ ص ۱۷۵)۔

۲۔ حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک ان کا پورے ماہ شوال میں الگ الگ کر کے اور شافعیہ کے نزدیک ان کا عید کے بعد لگاتار رکھنا افضل ہے۔ حنبلیہ اور ظاہریہ کے نزدیک دونوں صورتیں یکساں ہیں۔ (الفتح الربانی ایضاً) (بذل المجہود ایضاً)

حضرت حفصہؓ سے روایت ہے کہ چار چیزیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ترک نہ فرماتے تھے۔ "ایک عاشوراء (۱۰ محرم) کے دن کا روزہ' دوسرے ذی الحجہ کے پہلے عشرے (یعنی پہلی تاریخ سے نو تاریخ) کے روزے' تیسرے ہر ماہ میں تین دن کے روزے اور چوتھے فجر کی نماز سے پہلے دو رکعتیں۔" (احمد' نسائی)

حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "عرفہ کے دن (یعنی ۹ ذی الحجہ) کا روزہ دو سالوں کے گناہ کا کفارہ کر دیتا ہے' ایک وہ سال جو گزرا اور دوسرا وہ سال جو آئندہ آرہا ہے۔۔۔" (مسلم' ابو داؤد' نسائی' ابن ماجہ' احمد)۔

لیکن عرفہ کے دن کا یہ روزہ اور اس کی یہ تاکید حاجیوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے ہے۔ (اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے) حاجیوں کے لیے اس روز عرفات کے میدان میں روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے کتاب الحج ص ۲۹۲)۔

۳۔ محرم خصوصاً اس کی ۱۰ تاریخ (عاشوراء) کے روزے کی تاکید:

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز کونسی ہے؟ آپ نے فرمایا "رات کے درمیانی حصہ کی نماز۔ پھر سوال کیا گیا کہ رمضان کے بعد سب سے افضل روزہ کون سا ہے؟" فرمایا اللہ کے اس مہینے کے روزے جسے تم محرم کہتے ہو۔" (احمد' مسلم' ابو داؤد)۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ اسلام سے پہلے قریش عاشوراء (۱۰ محرم) کا روزہ رکھا کرتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ روزہ رکھا کرتے تھے۔ جب آپ مدینہ تشریف لائے' تو وہاں بھی آپؐ نے یہ روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی اس کے رکھنے کا حکم دیا' لیکن جب رمضان کے روزے فرض ہو گئے' تو آپؐ نے فرمایا۔ "جو چاہے اس دن کا روزہ رکھے اور جو چاہے نہ رکھے۔" (بخاری و مسلم)۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو عاشوراء کے دن روزے رکھتے دیکھا' تو دریافت فرمایا "یہ کیا ہے؟ (یعنی تم اس دن کیوں روزہ رکھتے ہو؟") انھوں نے کہا "یہ ایک نیک دن ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور بنی اسرائیل کو ان کے دشمن سے نجات دی تھی اور اس پر موسیٰؑ نے روزہ رکھا تھا۔" فرمایا۔

"موسیٰ پر ہمارا حق تم سے زیادہ ہے۔" پھر آپؐ نے اس دن کا خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی اس کے رکھنے کا حکم دیا۔" (بخاری و مسلم)

۱۰ محرم کے ساتھ ۹ اور ۱۱ یا صرف ۹ محرم کا بھی روزہ رکھنا مسنون ہے :

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عاشوراء کے دن کا روزہ رکھو اور اس میں یہود (کے طریقہ) کی مخالفت کرو اور (وہ اس طرح کہ) اس سے ایک دن پہلے (بھی) روزہ رکھو اور اس کے ایک دن بعد (بھی) روزہ رکھو۔" (احمد' بیہقی)۔

حضرت ابن عباسؓ ہی سے روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشوراء کے دن روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی اس کے رکھنے کا حکم دیا۔ تو لوگوں نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول ﷺ! اس دن کی تو یہود و نصاریٰ تعظیم کرتے ہیں" فرمایا "اگر اگلا سال آیا اور ہم زندہ ہوئے) تو ہم ۹ تاریخ کا (بھی) روزہ رکھیں گے" لیکن اگلے سال کے آنے سے پہلے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا۔ (مسلم' ابو داؤد) دوسری روایت میں آپؐ کے الفاظ یوں ہیں "اگر میں اگلے سال تک باقی رہا' تو میں نویں تاریخ کا ضرور ہی روزہ رکھوں گا" [1] (احمد' مسلم)۔

۴۔ شعبان کے اکثر دنوں کے روزے :

نبی صلی اللہ علیہ وسلم شعبان میں رمضان کے علاوہ باقی تمام مہینوں کی نسبت زیادہ روزے رکھا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رمضان کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی مہینے کے پورے دن روزے رکھتے نہیں دیکھا اور میں نے شعبان کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی مہینے کے اکثر دن روزے رکھتے نہیں دیکھا۔" (بخاری و مسلم)

حضرت اُم سلمہؓ سے روایت ہے کہ شعبان کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سال کے کسی مہینے کے پورے روزے نہ رکھتے تھے۔ آپ شعبان کو رمضان سے ملا دیا کرتے تھے (یعنی اس کے آخر تک روزے رکھتے رہتے تھے)" (ابو داؤد' ترمذی' احمد' نسائی' ابن ماجہ)۔

---

[1] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی بنا پر حنفیہ کے نزدیک ۹ یا ۱۱ محرم کے بغیر صرف ۱۰ محرم کا روزہ رکھنا مکروہ تنزیہی ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۵۴۲)۔

حضرت اسامہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ "اے اللہ کے رسولؐ! (کیا بات ہے کہ) میں آپؐ کو جتنے دن شعبان میں روزے رکھتے ہوئے دیکھتا ہوں' کسی اور مہینے میں نہیں دیکھتا' فرمایا "رجب اور رمضان کے درمیان یہ ایک ایسا مہینہ ہے جس کی فضیلت سے لوگ غافل ہیں۔ یہ ایک ایسا مہینہ ہے جس میں اللہ رب العالمین کی طرف اعمال اٹھائے جاتے ہیں' اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میرا عمل اس حال میں اٹھایا جائے کہ میں روزہ سے ہوں۔" (ابوداؤد' نسائی' ابن خزیمہ)۔

۵۔ اشہر الحرم یعنی حرمت والے مہینوں (رجب' ذی القعدہ' ذی الحجہ اور محرم) کے روزے:

قبیلہ باھلہ کے ایک صحابیؓ سے روایت ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس سے اگلے سال پھر حاضر ہوئے اور اس وقت ان کی حالت اور شکل و صورت بدلی ہوئی تھی۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا "اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ مجھے نہیں پہچانتے؟" فرمایا "تم کون ہو؟ تم کون ہو؟" انہوں نے کہا "میں وہی باھلی (یعنی قبیلہ باہلہ کا آدمی) ہوں' جو گزشتہ سال آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔" آپؐ نے دریافت فرمایا "تو تم بدلے ہوئے کیوں ہو؟ حالانکہ پچھلے سال تمہاری شکل و صورت بہت اچھی تھی" انہوں نے کہا "جب سے میں آپؐ کے پاس سے گیا ہوں' میں نے دن کے وقت کبھی کھانا نہیں کھایا' صرف رات کو کھانا کھاتا رہا ہوں۔ یعنی برابر روزے رکھتا رہا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "تم نے اپنی جان کو یہ عذاب آخر کیوں دیا؟ پھر آپؐ نے فرمایا "صبر کے مہینے (یعنی رمضان) کے روزے رکھو اور پھر ہر مہینے میں ایک روزہ رکھو۔" انہوں نے کہا "زیادہ کر دیجیے اس لیے کہ مجھ میں طاقت ہے۔" فرمایا "دو روزے رکھ لو۔" انہوں نے کہا "زیادہ کر دیجیے" فرمایا "تین روزے رکھ لو۔" انہوں نے کہا "زیادہ کر دیجیے" فرمایا "حرمت والے مہینوں میں روزے رکھ لو اور چھوڑ دو۔ حرمت والے مہینوں میں روزے رکھو اور چھوڑ دو" اور آپؐ نے اپنی تین انگلیوں کو ملایا اور پھر انہیں چھوڑ دیا۔ (یعنی حرمت والے مہینوں میں بھی لگاتار روزے نہ رکھو' بلکہ تین دن روزہ رکھو اور تین دن نہ رکھو" (ابوداؤد)۔

فائدہ: اشہر الحرم میں نفلی روزوں کے صحیح ہونے پر اجماع ہے۔ بعض احادیث

میں رجب میں خصوصیت کے ساتھ نفلی روزے رکھنے کی فضیلت آئی ہے' لیکن یہ تمام کی تمام احادیث انتہائی ضعیف ہیں اور اسی لیے امام احمد' بخاری' مسلم' ابو داؤد' نسائی' ترمذی اور ابن ماجہؒ میں سے کسی نے ان کو اپنی کتاب میں نقل نہیں کیا۔ (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۱۹۶)۔

۶۔ ہفتہ اور اتوار کا روزہ :

حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے دنوں کی نسبت ہفتہ اور اتوار کو زیادہ روزے رکھا کرتے تھے' اور یہ فرماتے تھے "یہ دونوں دن مشرکین (یعنی یہود و نصاریٰ) کی عید ہیں' اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ان کے خلاف عمل کروں۔" (احمد' نسائی' بیہقی' حاکم' ابن حبان)۔

۷۔ پیر اور جمعرات کا روزہ :

حضرت عائشہؓ [1] سے روایت ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیر اور جمعرات کا روزہ انتظار کر کے رکھا کرتے تھے۔" (احمد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' ابو داؤد)۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہر پیر اور جمعرات کے دن اعمال پیش کیے جاتے ہیں' اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میرے اعمال اس حال میں پیش کیے جائیں کہ میں روزے سے ہوں۔" (احمد' ترمذی)۔

حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پیر کے دن روزہ رکھنے کے متعلق دریافت کیا گیا' تو آپؐ نے فرمایا "یہ وہ دن ہے جس میں میری پیدائش ہوئی اور مجھ پر وحی آنا شروع ہوئی۔" (احمد' مسلم' ابو داؤد)۔

۸۔ ہر ماہ میں تین دن کے روزے :

اس بارے میں کئی طرح کی احادیث آئی ہیں۔ بعض میں ان تین دنوں کی تخصیص کی گئی ہے اور بعض میں کوئی تخصیص نہیں کی گئی۔ اور جن میں تخصیص کی گئی ہے' ان میں سے بعض میں ہر عربی مہینے کی ۱۳' ۱۴ اور ۱۵ کا ذکر ہے' اور بعض میں ایک ماہ میں ہفتہ' اتوار اور پیر کا اور اگلے ماہ میں منگل' بدھ اور جمعرات کا ذکر ہے ان تینوں قسم کی احادیث میں سے ایک ایک

۱۔ ابو داؤد میں اس حدیث کے راوی حضرت عائشہؓ کے بجائے حضرت اسامہ بن زیدؓ ہیں۔

حدیث ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں:

حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہر ماہ تین روزے رمضان کے روزوں سے مل کر پورے سال کے روزے ہو جاتے ہیں۔" (احمد' مسلم' ابو داؤد)۔

حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اگر تم مہینے میں تین روزے رکھو' تو ۱۳' ۱۴' اور ۱۵ تاریخوں کے روزے رکھو۔" (احمد' نسائی' ترمذی)۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ماہ میں ہفتہ' اتوار' اور پیر کے روزے رکھتے تھے اور اس سے اگلے مہینے میں منگل' بدھ اور جمعرات کے۔" (ترمذی)۔

ان احادیث کی بنا پر ہر ماہ تین دن روزہ کے مستحب ہونے پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے' البتہ ان کی تعیین میں اختلاف ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۲۱۲)۔ جس کا ذکر ہم حاشیہ میں کرتے ہیں۔[1]

---

[1] اس بارے میں حافظ ابن حجرؒ نے سلف کے کل دس مسلک نقل کیے ہیں جن میں سے مشہور یہ ہیں:

شافعیہ کے نزدیک ان سے مراد ۱۳' ۱۴ اور ۱۵ تاریخیں ہیں' دوسری تاریخوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف جواز کو ظاہر کرنے کے لیے روزے رکھا کرتے تھے' یا آپ کو کوئی ایسا عذر پیش آجاتا تھا کہ اگر کبھی آپ ۱۳' ۱۴ اور ۱۵ کو روزے نہ رکھ سکتے' تو دوسرے دنوں میں یہ روزے رکھ لیا کرتے تھے۔ (الفتح الربانی)۔

حنفیہ کے نزدیک ان کا مہینہ بھر میں کسی تین دنوں میں رکھ لینا مستحب ہے' البتہ ان کا ۱۳' ۱۴' اور ۱۵ تاریخوں میں رکھنا دوہرا مستحب ہے (بذل المجہود جلد ۳ جزء ۲ ص ۱۸۱۔ ۱۸۲)۔

مالکیہ کے نزدیک ان کو مہینہ بھر کے کسی تین دن رکھ لینا مستحب ہے اور ان کے لیے خاص طور پر تاریخیں متعین کرنا مکروہ ہے۔ (الفتح الربانی۔ الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱)۔

سلف میں بعض ائمہ کے نزدیک ۱۳' ۱۴ اور ۱۵ تاریخوں کے روزوں کا استحباب ہر ماہ میں تین دن روزے رکھنے کے استحباب کے علاوہ ہے (فتح الباری)۔

قاضی شوکانیؒ نے اس مسلک کو ترجیح دی ہے بلکہ وہ لکھتے ہیں کہ ایک ماہ میں ہفتہ' اتوار اور پیر کا

۹۔ ہر دو دنوں میں سے ایک دن کا روزہ :

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (مجھ سے) فرمایا۔ "ہر مہینے میں تین دن روزے رکھو۔" میں نے عرض کیا "میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔" اسی طرح آپؐ مجھے زیادہ سے زیادہ دنوں کے روزے کی اجازت دیتے رہے' یہاں تک کہ آپؐ نے فرمایا۔ "ایک دن روزہ رکھو' اور ایک دن نہ رکھو' اس لیے کہ یہ سب سے افضل روزہ ہے اور یہ میرے بھائی داؤد (علیہ السلام) کا روزہ ہے۔" (بخاری و مسلم)۔

اور اگلے مہینے میں منگل' بدھ اور جمعرات کے روزوں کا استحباب بھی ان کے علاوہ ہے گویا اس طرح ان کے نزدیک ہر ماہ میں نو روزے مستحب ہیں۔ (نیل الاوطار ج ۴ ص ۲۱۶)۔

نفلی روزوں کے مسائل

۱۔ نفلی روزہ کی نیت:

نفلی روزہ کے لیے نیت کے ضروری ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔

جمہور ائمہ (جن میں امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ شامل ہیں) کے نزدیک نفلی روزہ کی نیت کا رات سے ہونا ضروری نہیں ہے' بلکہ دن میں بھی اس کی نیت کی جا سکتی ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے اور دریافت فرمایا۔ "کیا تمہارے پاس کھانے کے لیے کچھ ہے؟" ہم نے کہا "نہیں" فرمایا "تب میں روزہ سے ہوں[1] ۔۔۔۔" (مسلم' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)۔

اس چیز کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث میں نہیں ہے کہ دن میں نفلی روزے کی نیت کس وقت تک کی جا سکتی ہے۔ صحابہ اور ائمہ کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے' جس کا ذکر ہم حاشیہ میں کرتے ہیں[2]

۱۔ صحابہ میں سے حضرت ابن عمرؓ اور جابر بن یزیدؓ اور ائمہ میں سے امام مالکؒ' لیثؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک نفلی روزے میں بھی رات ہی سے نیت کا ہونا ضروری ہے۔ ان کا استدلال حضرت حفصہؓ کی اس عام حدیث سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس شخص نے فجر کے ساتھ یا فجر سے پہلے نیت نہیں کی' اس کا کوئی روزہ نہیں۔" (ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ وغیرہ)۔ دوسرے ائمہ اس حدیث کا حکم صرف فرض روزوں کے لیے مانتے ہیں' جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

حضرت عائشہؓ کی مذکورہ بالا حدیث کے متعلق مالکیہ اور دوسرے (جن کے نزدیک نفلی روزے میں بھی رات سے نیت کا ہونا ضروری ہے)۔ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رات ہی سے روزے کی نیت کر رکھی تھی۔ حضرت عائشہؓ سے کھانے کی کوئی چیز دریافت کرنے سے آپ کا مقصد اپنے روزے کو افطار کرنا تھا' لیکن جب کوئی چیز کھانے کی موجود نہ ہوئی' تو آپؐ نے اپنا روزہ برقرار رکھا۔ (الفتح الربانی ج ۹ ص ۲۸۱) وغیرہ۔

۲۔ حضرت علیؓ کے نزدیک نفلی روزے کی نیت زوال سے پہلے پہلے کی جا سکتی ہے' اس کے بعد نہیں امام ابو حنیفہؒ کا یہی مذہب ہے۔

۲۔ نفلی روزہ دن ہی میں افطار کیا جا سکتا ہے :

اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ جس شخص کا نفلی روزہ ہو' اس کے لیے جائز ہے کہ دن ہی میں اسے افطار کر لے۔ اگرچہ افضل یہ ہے کہ اسے پورا کیا جائے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے اور دریافت فرمایا۔ "کیا تمہارے پاس کھانے کے لیے کچھ ہے ؟" ہم نے کہا "نہیں" فرمایا "تب میں روزہ سے ہوں۔" پھر ایک دوسرے روز آپؐ تشریف لائے ہم نے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسولؐ! ہمیں کچھ حیس (ایک کھانے کی چیز جو کھجور' پنیر اور گھی سے تیار کی جاتی تھی) تحفہ میں ملی ہے۔" فرمایا "مجھے دکھاؤ۔ میں نے تو روزہ کی حالت میں صبح کی تھی۔" اس کے بعد آپؐ نے وہ حیس کھائی۔" (مسلم ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)۔ امام نسائی کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں : "نفلی روزہ رکھنے والے شخص کی مثال اس شخص کی ہے جو اپنے مال سے صدقہ نکالتا ہے۔ وہ چاہے تو یہ صدقہ دے دے اور چاہے تو اسے روک لے۔"

جو شخص نفلی روزہ دن ہی میں افطار کر لے' جمہور کے نزدیک اس کے ذمہ کوئی قضا نہیں ہے۔[۱]

حضرت عائشہؓ کے نزدیک نفلی روزے کی نیت زوال کے بعد بھی کی جا سکتی ہے۔ امام احمدؒ اور دوسرے ائمہ کا یہی مذہب ہے۔ امام شافعیؒ سے دونوں قسم کی روایات ملتی ہیں۔ امام مالکؒ کے نزدیک نفلی روزے کی نیت دن میں کی ہی نہیں جا سکتی' جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ (الفتح الربانی ایضاً)۔

۱۔ امام ابو حنیفہؒ' مالکؒ' حسن بصریؒ مکحولؒ اور نخعیؒ کے نزدیک ایسے شخص کے ذمہ قضا ضروری ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی مذکورہ بالا حدیث میں دار قطنی اور بیہقی کی روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ مزید ہیں کہ "اس کے بجائے ایک اور دن قضا کروں گا۔"

دوسروں کے نزدیک ان زائد الفاظ کی روایت معتبر نہیں ہے۔ کیونکہ امام بیہقی اور دار قطنی ان زائد الفاظ کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ غیر محفوظ ہیں۔ (الفتح الربانی ایضاً)۔

روزے کے آداب و مستحبات

روزہ دار کے لیے مندرجہ ذیل امور کا اہتمام کرنا مستحب ہے:

ا۔ سحری:

(الف) فضیلت: اس پر اجماع ہے کہ سحری کا کھانا مستحب ہے' اگرچہ ضروری نہیں (نووی و ابن منذر بحوالہ الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۱۸)۔ اس بارے میں متعدد احادیث ثابت ہیں' جن میں سے ہم صرف تین کا ذکر کرتے ہیں:

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "سحری کھاؤ' اس لیے کہ اس میں برکت ہے۔" (بخاری' مسلم' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "سحری کھانا (باعث) برکت ہے' اس لیے تم اسے ترک نہ کرو' خواہ تم میں سے کوئی شخص پانی کا ایک گھونٹ ہی کیوں نہ پی لے' اس لیے کہ اللہ اور اس کے فرشتے سحری کھانے والوں پر سلامتی بھیجتے ہیں۔" (مسند امام احمد)۔

حضرت عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں میں سحری کھانے کا فرق ہے۔" (احمد' مسلم' ابو داؤد' ترمذی' نسائی' ابن خزیمہ)۔

(ب) وقت: جمہور صحابہؓ اور ائمہ (جن میں ائمہ اربعہ شامل ہیں) کے نزدیک سحری کا آخری وقت طلوع فجر (صبح صادق) تک ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ۔	تو تم کھاؤ اور پیو' یہاں تک کہ تمہارے لیے رات کے سیاہ دھاگے سے صبح کا سپید دھاگا نمایاں ہو جائے۔

اس کی تشریح میں حضرت عدی بن حاتمؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کا طریقہ سمجھایا۔ آپؐ نے فرمایا۔ "اس طرح نماز پڑھو اور اس طرح روزہ رکھو' جب سورج غروب ہو جائے تو کھاؤ اور پیو' یہاں تک کہ تمہارے لیے

سپید دھاگا سیاہ دھاگے سے نمایاں ہو جائے اور تیس روزے رکھو' الاّ یہ کہ تم اس سے پہلے چاند دیکھ لو۔" (رات کو) میں نے ایک سپید دھاگا لیا اور دوسرے سیاہ۔ پھر انہیں دیکھتا رہا' لیکن مجھے سپید اور سیاہ دھاگے کا فرق معلوم نہ ہوا۔ میں نے اس کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا' آپؐ مسکرائے اور فرمایا "اے حاتم کے بیٹے۔ سپیدی اور سیاہی سے مراد دن کی سپیدی اور رات کی تاریکی ہے۔" (بخاری' مسلم' ابوداؤد' احمد وغیرہ) [1]

جمہور کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ انسان جونہی صبح کی اذان سنے' کھانے پینے سے رک جائے۔ [2] (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۲۳)۔

۱۔ بعض صحابہ مثلاً حضرت حذیفہؓ اور بعض تابعین مثلاً اعمشؒ' ابوبکر بن عیاشؒ اور مسروقؒ کے متعلق روایت ہے کہ ان کے نزدیک سحری کا وقت صبح کی روشنی پھیل جانے تک ہے۔ ان حضرات کے نزدیک دن کی سپیدی سے مراد یہ ہے کہ صبح کی روشنی راستوں' اور گھروں میں پھیل جائے۔ حضرت حذیفہؓ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ حضرت بلالؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا کرتے تھے۔ "جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سحری کھا رہے ہوتے تھے اور میں اس وقت اپنے تیروں کے گرنے کے نشانات دیکھ سکتا تھا۔" بعد کے راوی نے جنہیں حضرت حذیفہؓ یہ حدیث بیان کر رہے تھے' حضرت حذیفہؓ سے دریافت کیا "کیا طلوع فجر کے بعد تک؟" کہنے لگے "ہاں طلوع فجر کے بعد تک' اگرچہ اس وقت سورج نہ نکلا ہوتا تھا۔" دوسری روایت میں ہے کہ حضرت حذیفہؓ سے دریافت کیا گیا۔ "آپ لوگوں نے کس وقت تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی؟" انہوں نے جواب دیا۔ دن کے وقت' اگرچہ اس وقت تک سورج طلوع نہ ہوا تھا۔" (احمد' نسائی وغیرہ)۔

اس حدیث کی روایت اگرچہ صحیح ہے' لیکن جمہور اس کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ ابتداء میں ایسا ہی تھا' مگر بعد میں یہ منسوخ ہو گیا۔ (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۲۰۔ ۳۱)۔

۲۔ اہلحدیث علماء کے نزدیک اگر انسان پانی وغیرہ پی رہا ہو اور اذان ہو جائے' تو اس کے لیے یہ صحیح ہے کہ وہ اس وقت تک برتن کو اپنے منہ سے الگ نہ کرے جب تک پانی پی لے۔ ان کا استدلال اسی معنی کی بعض احادیث سے ہے جن میں سے ایک روایت حضرت ابوہریرہؓ سے یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص اذان سنے اور برتن اس کے ہاتھ پر ہو' تو وہ اس وقت تک برتن نہ رکھے جب تک اپنی ضرورت پوری نہ کر لے۔" (ابوداؤد) (حاشیہ شیخ احمد محمد شاکر علی معالم السنن ج ۳ ص ۲۳۳)۔

لیکن اگر طلوع فجر میں شک ہو' تو صحابہؓ اور جمہور ائمہ (جن میں امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ شامل ہیں) کے نزدیک یہ جائز ہے کہ انسان کھائے پیے یہاں تک کہ اسے طلوع فجر کا یقین ہو جائے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔ "تم کھاؤ اور پیو' یہاں تک کہ تمہیں صبح ہونے کا یقین ہو جائے" [1] (بیہقی)۔

اس بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ سحری کا آخری وقت تک مؤخر کرنا افضل ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۳۳)۔

حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لوگ اس وقت تک خیریت سے رہیں گے' جب تک وہ سحری میں تاخیر اور افطار میں جلدی کرتے رہیں گے (بخاری و مسلم)۔

حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی۔ اس کے بعد ہم آئے اور جماعت کھڑی ہوئی۔ "جب حضرت زیدؓ سے دریافت کیا گیا کہ دونوں (یعنی سحری کے ختم ہونے اور نماز کے شروع ہونے) میں کتنا وقفہ تھا؟ تو انہوں نے بتایا "اتنا جس میں ایک آدمی پچاس آیتیں تلاوت کر سکے۔" (بخاری' مسلم' ترمذی' نسائی' احمد)۔

لیکن جمہور کے نزدیک اس قسم کی احادیث میں اذان سے مراد حضرت بلالؓ کی اذان ہے' جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں طلوع فجر سے پہلے اذان دیا کرتے تھے۔ اور اس وقت تک لوگ کھایا پیا کرتے تھے اور اس وقت کھانے پینے سے رکا کرتے تھے جب حضرت ابن ام مکتومؓ اذان دیا کرتے تھے اور حضرت ابن ام مکتومؓ کی یہ اذان طلوع فجر کے وقت ہوتی تھی۔ یا ان احادیث کا مطلب جمہور کے نزدیک یہ ہے کہ جب تک انسان کو طلوع فجر میں شک ہو' وہ کھا پی سکتا ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۲۳) (معالم السنن ج ۲ ص ۲۳۲)۔

[1] امام مالکؒ کے نزدیک صبح ہو جانے کے بعد کھانا پینا بہر حال حرام ہے' خواہ انسان کو صبح ہونے کا یقین ہو یا نہ ہو۔ اگر کوئی شخص شک کی بنا پر صبح ہو جانے کے بعد بھی کھاتا پیتا رہے گا۔ اس کا روزہ نہ ہو گا اور اس کے ذمہ قضا ضروری ہو گی۔ (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۲۳)۔

واضح رہے کہ اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی چیز ثابت نہیں ہے۔

۲۔ افطار :

(الف) وقت : اس پر اجماع ہے کہ روزے کا وقت غروب آفتاب کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے' جونہی آفتاب کے غروب ہو جانے کا یقین ہو' روزہ افطار کر لینا چاہیے (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۵)۔

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب ادھر سے (یعنی مشرق سے) رات آجاتی ہے' اور ادھر سے (یعنی مغرب سے) رات چلی جاتی ہے' تو روزے دار اپنا روزہ افطار کر لیتا ہے۔" (بخاری' مسلم' ابو داؤد' ترمذی)۔

اس پر بھی اجماع ہے کہ روزے کے افطار کرنے میں جلدی کرنا (یعنی آفتاب کے غروب ہوتے ہی افطار کر لینا) مستحب ہے (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۸)۔

حضرت سہل بن سعدؓ کی یہ روایت اوپر گزر چکی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "لوگ اس وقت تک خیریت سے رہیں گے' جب تک وہ سحری میں تاخیر اور افطار میں جلدی کرتے رہیں گے۔" (بخاری و مسلم)۔

نیز حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "دین اسلام اس وقت تک غالب رہے گا' جب تک لوگ افطار میں جلدی کرتے رہیں گے' یہود و نصاریٰ اس میں تاخیر کرتے ہیں۔" (احمد' ابو داؤد' نسائی' حاکم)۔

(ب) وہ چیزیں جن سے روزہ افطار کرنا افضل ہے : حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نماز پڑھنے سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم چند تازہ کھجوروں سے روزہ افطار فرماتے تھے' اگر تازہ کھجوریں نہ ہوتیں' تو چھوہاروں سے افطار فرماتے اور اگر وہ بھی نہ ہوتے' تو پانی کے چند گھونٹ پی لیتے۔" (ابو داؤد' حاکم' ترمذی)۔

حضرت سلمانؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اگر تم میں سے کوئی شخص روزے سے ہو' تو اسے چاہیے کہ چھوہاروں سے اپنا روزہ افطار کرے' لیکن اگر چھوہارے نہ پائے تو پانی سے روزہ افطار کرے' اس لیے کہ پانی پاک کر دینے والی چیز ہے۔" (احمد' ترمذی)

(ج) روزے دار کا روزہ افطار کرانے کا ثواب : حضرت زید بن خالد جہنیؓ سے

روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے کسی روزے دار کا روزہ افطار کرایا' اس کے لیے روزے دار کے برابر ثواب لکھ دیا گیا' بغیر اس کے کہ خود روزے دار کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے۔" (احمد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' ابن خزیمہ' ابن حبان)۔

(د) افطار کے وقت دعا : حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "روزے دار کے لیے افطار کے وقت دعا ہے' جو کبھی رد نہیں کی جاتی۔" (ابن ماجہ)

افطار کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مندرجہ ذیل دعا ثابت ہے :

اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰے رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ' ذَھَبَ الظَّمَا وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ۔ (ابو داؤد' نسائی' دار قطنی' حاکم بروایت حضرت ابن عمرؓ)۔

اے اللہ میں نے تیرے لیے روزہ رکھا' اور تیرے ہی رزق پر اسے افطار کیا' پیاس دور ہو گئی' آنتیں تر ہو گئیں اور اللہ نے چاہا تو اجر بھی ثابت ہو گیا۔

۳۔ روزہ میں فضول اور لایعنی باتوں سے زبان کو روکے رکھنا :

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جس شخص نے (روزہ رکھ کر بھی) جھوٹ بولنے اور اس پر عمل کرنے کو ترک نہ کیا' تو اللہ تعالیٰ کو اس بات کو کوئی حاجت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑے۔ (بخاری' ابو داؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)۔

حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "روزہ کھانا اور پینا چھوڑنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ فضول اور گندی باتوں سے رکے رہنے کا نام ہے۔ اگر کوئی شخص تمہیں (روزہ کی حالت میں) گالی دے' یا تم سے جہالت کا سلوک کرے' تو تم اس سے کہہ دو "بھئی میں روزے سے ہوں۔" (حاکم' ابن خزیمہ' ابن حبان)۔

۴۔ صدقہ و خیرات' تلاوت قرآن پاک' ذکر الٰہی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کی کثرت :

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور آپ سب سے زیادہ سخی اس وقت ہوتے' جب جبرئیل آپؐ کی ملاقات کے لیے آتے۔ وہ رمضان کی ہر رات آپؐ کے پاس آتے اور آپ کے ساتھ قرآن پاک کی مدارست (باہمی تلاوت) کرتے۔ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم تیز ہوا سے بھی زیادہ سخی ہوا کرتے تھے۔" (بخاری)۔

۵۔ رمضان کے آخری دنوں میں خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں انہماک :

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب رمضان کے آخری دس دن شروع ہوتے' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلمؐ خود بھی راتوں کو جاگتے' اور اپنے گھر والوں کو بھی جگاتے' اور آپؐ (پوری طرح) کمربستہ ہو جاتے۔" (بخاری و مسلم)۔

مسلم کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ رمضان کے آخری دس دنوں میں (عبادت الٰہی میں) اس قدر انہماک فرماتے جتنا آپ پہلے دنوں میں نہ فرماتے تھے۔"

نوٹ : رمضان کی راتوں میں تراویح کی فضیلت' حکم' تعداد رکعات وغیرہ کا بیان ہم کتاب کے پہلے حصہ میں کر چکے ہیں۔

روزہ کے مباحات

روزہ کے دوران مندرجہ ذیل امور جائز[1] ہیں :

ا۔ مسواک :

جمہور (جن میں امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ شامل ہیں) کے نزدیک روزے دار کے لیے مسواک کرنے میں کوئی حرج نہیں' بلکہ یہ اسی طرح مسنون و مستحب ہے جس طرح روزہ نہ ہونے کی صورت میں' خواہ اسے دن کے شروع کے حصہ میں کیا جائے یا آخری حصہ میں اور خواہ وہ تر ہو یا خشک۔

حضرت عامر بن ربیعہؓ سے روایت ہے کہ میں شمار نہیں کر سکتا کہ میں نے کتنی مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو روزے کی حالت میں مسواک کرتے دیکھا ہے۔[2] (احمد' ترمذی)۔

ا۔ اس باب میں جائز سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کے متعلق بظاہر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ان سے روزہ فاسد یا مکروہ ہو جاتا ہے' حالانکہ ان سے نہ روزہ فاسد ہوتا ہے اور نہ مکروہ' یوں جائز سے مراد ہر وہ چیز ہو سکتی ہے' جس کی حرمت یا کراہت شریعت سے ثابت نہیں ہے۔

۲۔ امام مالکؒ اور شعبیؒ کے نزدیک روزے کی حالت میں تر مسواک کرنا مکروہ ہے۔ امام احمدؒ اور اسحاقؒ کے نزدیک روزے کی حالت میں زوال آفتاب کے بعد مسواک کرنا مکروہ ہے۔ ان کا استدلال ایک تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے ہے کہ روزے دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ محبوب ہے۔" (بخاری) اور دوسرے حضرت علیؓ اور خبابؓ کی اس روایت سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تم روزہ رکھو' صبح کے وقت (تو) مسواک کر لو' لیکن شام کو مسواک نہ کرو' اس لیے کہ کوئی روزہ دار ایسا نہیں کہ شام کے وقت اس کے ہونٹ خشک ہوتے ہوں' مگر اس کے ہونٹوں کی یہ خشکی قیامت کے دن اس کے سامنے نور ہو گی۔" (طبرانی)

دوسروں کے نزدیک پہلی حدیث سے استدلال کا جواب یہ ہے کہ روزے دار کے منہ کی خوشبو اس کے معدے کے خالی ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے جو مسواک کرنے سے زائل نہیں ہو جاتی۔ دوسری حدیث چونکہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہے اس لیے قابلِ حجت نہیں۔ (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۴۸)۔

۲۔ نہانا اور سر وغیرہ پر گرمی یا پیاس کی وجہ سے پانی ڈالنا:

روزہ کی حالت میں نہانا (خواہ وہ واجب ہو یا مسنون یا مباح) اور گرمی یا پیاس کی وجہ سے سر وغیرہ پر پانی ڈالنا جائز ہے۔ اس بارے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۴۹)۔

ابو بکر بن عبد الرحمٰن کسی صحابی سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو روزے کی حالت میں گرمی یا پیاس کی وجہ سے سر پر پانی ڈالتے دیکھا ہے۔" (بخاری' مسلم' احمد' مالک' ابو داؤد)۔

حضرتِ عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنابت کی حالت میں صبح کرتے تھے اور آپؐ روزہ سے ہوتے تھے اور پھر آپؐ غسل فرماتے تھے۔" (بخاری' مسلم' احمد وغیرہ)۔

۳۔ کلی کرنا اور ناک میں پانی دینا:

روزے کی حالت میں کلی کرنے اور ناک میں پانی دینے میں کوئی ہرج نہیں' البتہ ناک میں پانی دینے میں مبالغہ کرنا صحیح نہیں ہے' حالانکہ روزہ نہ ہونے کی صورت میں ایسا کرنا مستحب ہے۔

حضرت لقیطؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تم (وضو کرتے ہوئے) ناک میں پانی دو' تو اس میں مبالغہ کرو' اِلاَّ یہ کہ تم روزے سے ہو۔" (ابو داؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' ابن خزیمہ' حاکم)۔

اس بارے میں ائمہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے' لیکن اختلاف اس صورت میں ہے جبکہ ناک میں پانی دینے سے پانی پیٹ میں چلا جائے۔ اکثر ائمہ (جن میں امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ شامل ہیں) کے نزدیک ایسی صورت میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے [1]

۴۔ سرمہ لگانا:

اگرچہ روزہ کی حالت میں سرمہ لگانے یا اس سے ممانعت کی کوئی حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے (ترمذی) لیکن چونکہ روزہ نہ ہونے کی صورت میں سرمہ کا لگانا مستحب ہے' اس لیے صحابہ میں سے حضرت عائشہؓ' انسؓ' ابن عمرؓ' ابن ابی اوفیؓ اور جمہور

تابعین و ائمہ (جن میں امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ' ابراہیم نخعیؒ' حسن بصریؒ' داؤد ظاہریؒ اور ابو ثورؒ شامل ہیں) کے نزدیک روزہ کی حالت میں بھی سرمہ لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ان کا استدلال بعض ایسی احادیث سے بھی ہے' جن کی سند اگرچہ ضعیف ہے' لیکن ان سے روزہ کی حالت میں سرمہ لگانے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ "ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میری آنکھ آرہی ہے اور میرا روزہ ہے' کیا میں سرمہ لگا سکتا ہوں؟" فرمایا "ہاں۔" (ترمذی)۔

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں روزہ کی حالت میں سرمہ لگایا۔ (ابن ماجہ)[2]

۵۔ بوسہ:

اکثر صحابہؓ اور ائمہ (جن میں امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ شامل ہیں) کے نزدیک روزے دار کے لیے روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لینا یا اس سے لپٹنا جائز ہے۔ لیکن اگر اسے یہ اندیشہ ہو کہ وہ اس سے اپنے آپ کو جماع یا انزال سے قابو میں نہ رکھ سکے گا' تو اس کے لیے ایسا کرنا مکروہ ہے۔

حضرت اُمّ سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کا بوسہ لیا کرتے تھے'

۱۔ امام احمد' اوزاعیؒ اور شافعیہ کے نزدیک ایسی صورت میں روزہ نہیں ٹوٹتا' کیونکہ اس کا حکم روزے میں بھول کر کھا لینے کا ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۴۹)۔

۲۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک روزہ کی حالت میں سرمہ لگانا مکروہ ہے' ان کے نزدیک اوپر کی احادیث سند کے ضعیف ہونے کی وجہ سے قابل حجت نہیں ہیں۔ اس کے برعکس ان کا استدلال حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو چیز جسم میں جائے اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے' اور جو اس سے نکلے اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔" (بیہقی' دارقطنی' ابن ابی شیبہ' بخاری فی التعلیقات)۔ اس حدیث کی سند بھی روایت کے لحاظ سے ضعیف ہے۔ امام بیہقی' ابن عدی اور بعض دوسرے محدثین نے اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے حضرت ابن عباسؓ کا اپنا قول قرار دیا ہے' اس لیے جمہور ائمہ کے نزدیک یہ قابل حجت نہیں ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۵۰)

حالانکہ آپؐ روزہ سے ہوتے تھے۔" (بخاری' مسلم' احمد)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بوسہ لیا کرتے تھے' حالانکہ آپؐ روزہ سے ہوتے تھے۔ اور آپؐ لپٹا کرتے تھے' حالانکہ آپؐ روزہ سے ہوتے تھے۔ لیکن آپ کو اپنی خواہش پر تم سب کی نسبت زیادہ قابو تھا۔ (بخاری' مسلم' ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ)۔ مسلم واحمد کی ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ "آپؐ رمضان میں بوسہ لیا کرتے تھے' حالانکہ آپؐ روزہ سے ہوتے تھے۔"

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روزے کی حالت میں بیوی سے لپٹنے کے متعلق دریافت کیا' تو آپؐ نے اسے اجازت دے دی۔ پھر ایک دوسرے شخص نے آکر یہی سوال کیا' تو آپؐ نے اسے منع فرمادیا۔ جس شخص کو آپؐ نے اجازت دی تھی' وہ بوڑھا تھا' اور جس کو منع فرمایا تھا' وہ جوان تھا۔"[1] (ابوداؤد)۔

۶۔ فصد[2]:

۱۔ حنفیہ' شافعیہ' حنبلیہ اور اہلحدیث علماء کا یہی مسلک ہے (موطا امام محمدؒ) تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۴۸) نیل الاوطار ج ۴ ص ۱۸۰) الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۵۲۵۔ ۵۴۰)۔

مالکیہ کے نزدیک روزہ کی حالت میں بوسہ لینا یا لپٹنا مطلقاً مکروہ ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں۔ "حضرت عائشہؓ جن سے یہ روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم روزہ کی حالت میں بوسہ لیا کرتے تھے' وہی یہ فرماتی ہیں کہ کیا تم میں سے کوئی شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے آپ پر قابو پاسکنے والا ہے؟ عروہ بن زبیر فرماتے ہیں کہ میری رائے یہ ہے کہ روزہ دار کو بوسہ کسی خیر کی طرف نہیں بلاتا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی روزہ کی حالت میں بوسہ لینے اور لپٹنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔" (موطا' امام مالکؒ)۔

ظاہریہ کے نزدیک روزہ کی حالت میں بوسہ لینا اور لپٹنا مطلقاً جائز ہے' بلکہ ان کے نزدیک اگر ایسا کرنے سے انزال بھی ہو جائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا' حالانکہ ان کے علاوہ باقی سب کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر بوسہ لینے اور لپٹنے میں اتنی زیادتی کی جائے کہ انزال ہو جائے' تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ (نیل الاوطار ج ۴ ص ۱۸۰)۔

۲۔ اصل احادیث میں "حجامۃ" کا لفظ استعمال ہوا ہے' جس کے لفظی معنی کسی کے سر سے منہ کے ذریعے خون نکالنے کے ہیں لہٰذا اس جگہ فصد کو بھی اسی معنی میں لیا جائے۔ ہم فصد کے بجائے حجامت کا لفظ اختیار کرتے' لیکن اردو دان طبقہ کے لیے اس سے غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

اکثر صحابہؓ اور ائمہ (جن میں امام ابو حنیفہؒ' مالکؒ' شافعیؒ اور داؤد ظاہریؒ شامل ہیں) کے نزدیک روزہ کی حالت میں فصد کرانا۔ (یا کسی دوسرے طریقہ سے علاج کے طور پر جسم کا خون نکلوانا) جائز ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فصد کرائی' حالانکہ آپؐ احرام کی حالت میں تھے اور آپؐ نے فصد کرائی' حالانکہ آپؐ روزہ کی حالت میں تھے۔ (احمد' بخاری) دوسری روایت میں ہے کہ "آپؐ نے فصد کرائی' حالانکہ آپؐ احرام کی حالت میں روزہ رکھے ہوئے تھے۔" (ابو داؤد' ابن ماجہ' ترمذی)۔

حضرت انسؓ سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فصد کرانے کو ناپسند کرتے تھے؟" انہوں نے جواب دیا "نہیں۔ لیکن کمزوری کے ڈر سے اسے ضرور ناپسند کرتے تھے۔"[1] (بخاری)۔

---

[1] صحابہؓ میں سے حضرت علیؓ' ابو ہریرہؓ اور عائشہؓ اور ائمہ میں سے امام احمدؒ اور اسحاقؒ وغیرہ کے نزدیک فصد کرانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور اس کی قضا ضروری ہو جاتی ہے۔ ان کا استدلال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔ "فصد کرنے اور کرانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا"۔۔۔ یہ حدیث اگرچہ متعدد صحیح سندوں سے کئی صحابہؓ سے مروی ہے' لیکن جمہور کے نزدیک یہ منسوخ ہے' یعنی اس کا حکم شروع میں تھا بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کی حالت میں فصد کرانے کی اجازت دے دی۔ جیسا کہ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ "شروع میں فصد کرانا اس۔۔۔ واقعہ سے مکروہ قرار دیا گیا تھا کہ (حضرت) جعفر بن ابی طالبؓ نے فصد کرائی' حالانکہ وہ روزہ رکھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا تو آپؐ نے فرمایا "ان دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا" لیکن بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فصد کرانے کی اجازت دے دی۔" (دار قطنی)۔

اس کے خلاف جن حضرات کے نزدیک فصد کرانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے وہ حدیث "فصد کرنے اور کرانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا" کو نہ صرف منسوخ نہیں مانتے بلکہ حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا روایت کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب احرام اور روزہ کی حالت میں فصد کرائی تھا' تو آپ سفر کی حالت میں تھے' اور چونکہ مسافر کے لیے اجازت ہے کہ وہ کھانے پینے یا فصد کرانے سے روزہ توڑ سکتا ہے' لہذا حضورؐ کے فصد کرانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ دراصل آپؐ نے اس وقت فصد کرائی اور اپنا روزہ ختم کر لیا اور یہ جائز ہے" (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۴۰-۴۱)۔

۷۔ احتلام:

اس پر اجماع ہے کہ اگر روزے دار کو دن میں احتلام ہو جائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ (ہدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۲۱۲)۔

۸۔ جنابت کی حالت میں صبح کرنا:

جمہور صحابہؓ و تابعین اور ائمہ کے نزدیک روزہ دار کے لیے جنابت کی حالت میں صبح کرنا جائز ہے خواہ جنابت کی یہ حالت جماع کی وجہ سے ہو یا احتلام کی وجہ سے۔ اور خواہ روزہ فرض ہو یا نفلی (تہذیب ابن القیم حاشیہ علی معالم السنن ج ۳ ص ۲۶۵)۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنابت کی حالت میں صبح کرتے تھے حالانکہ آپؐ روزہ سے ہوتے تھے۔ پھر آپؐ غسل فرماتے"۔۔۔ (بخاری و مسلم)۔

اسی طرح کی ایک روایت حضرت اُمّ سلمہؓ سے بھی مروی ہے۔[1] (بخاری، مسلم، مالک، ابوداؤد، ترمذی)۔

(حجامۃ دراصل سر میں فصد کرانے کو کہتے ہیں، اس لیے) سر کے علاوہ جسم کے دوسرے حصوں سے خون نکلوانے سے حنابلہ کے نزدیک بھی روزہ نہیں ٹوٹتا۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۵۳۰)۔

۱۔ صحابہؓ میں سے صرف حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق روایت ہے کہ ان کے نزدیک جو شخص جنابت کی حالت میں صبح کرے، اس کا روزہ نہیں ہوتا۔ اس بارے میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھی بیان کرتے تھے کہ حضورؐ نے فرمایا، جو شخص جنابت کی حالت میں صبح کرے، وہ روزہ نہ رکھے"۔ یہی مسلک تابعین میں سے طاؤس اور عروہ بن زبیرؒ سے بھی مروی ہے۔ لیکن ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کو جب حضرت عائشہ و اُمّ سلمہؓ کی مذکورہ بالا روایات ملیں، تو انہوں نے اپنے مسلک سے رجوع کر لیا۔ ان کی اس روایت کے متعلق جمہور کا کہنا یہ ہے کہ شروع اسلام میں (جبکہ رات کو بیویوں کے پاس جانے کی ممانعت تھی) یہی حکم تھا، لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ امام طاؤسؒ اور عروہ بن زبیرؒ۔ جن کا یہ مسلک بعد تک رہا۔۔۔ کا حضرت عائشہؓ و اُمّ سلمہؓ کی مذکورہ بالا روایات کے متعلق کہنا یہ تھا کہ ان میں جنابت کی حالت میں صبح کرنے کا جو جواز بیان ہوا ہے، وہ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھا، دوسروں کو

اسی طرح اس پر بھی قریب اجماع ہے کہ اگر حیض یا نفاس والی عورت کا خون رات کے وقت بند ہو جائے تو وہ روزہ رکھ سکتی ہے اور غسل کو صبح تک مؤخر کر سکتی ہے [1]

۹۔ بھول کر کھا پی لینا :

بھول کر کھا پی لینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ تفصیل آگے آ رہی ہے۔

ایسا کرنا جائز نہیں۔ (الفتح الربانی وغیرہ)۔

ابراہیم نخعیؒ اور حسن بصریؒ فرض اور نفلی روزے میں فرق کرتے تھے' یعنی یہ کہ جو شخص جنابت کی حالت میں صبح کرے' وہ نفلی روزہ تو رکھ سکتا ہے مگر فرض روزہ نہیں رکھ سکتا۔ (تہذیب ابن قیم حوالہ مذکورہ)۔

[1] اس بارے میں اختلاف صرف امام اوزاعیؒ' حسن بن صالح اور بعض دوسرے علمائے سلف کا ہے۔ ان کے نزدیک ایسی حالت میں عورت روزہ نہیں رکھ سکتی بلکہ اس کے لیے رات ہی کو غسل کرنا ضروری ہے۔ (نووی بحوالہ الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۴۷)۔

روزے کے مُبطلات

جن چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے' وہ دو طرح کی ہیں :

ا۔ جن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور صرف قضا (یعنی بعد میں ایک روزہ کے بدلہ ایک روزہ رکھنا) واجب ہوتا ہے۔

۲۔ جن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور قضا اور کفارہ (یعنی ایک غلام آزاد کرنا یا دو ماہ کے لگاتار روزے رکھنا یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا) دونوں۔۔۔ واجب ہوتے ہیں۔

ذیل میں ہم ان سب چیزوں کا ان کی تفصیل کے ساتھ الگ الگ ذکر کرتے ہیں :

ا۔ جماع :

اس پر قریب قریب اجماع ہے کہ جو شخص رمضان میں دن کے وقت جان بوجھ کر جماع کرے' اس کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور اس پر قضا اور کفارہ دونوں۔۔۔ واجب ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسولؐ! میں ہلاک ہو گیا۔" حضورؐ نے دریافت فرمایا "کیا بات ہے' تم کیوں ہلاک ہو گئے ؟" کہنے لگا "میں رمضان میں اپنی بیوی سے جماع کر بیٹھا ؟" فرمایا "کیا تم ایک غلام آزاد کر سکتے ہو ؟" اس نے جواب دیا "نہیں"۔ فرمایا "تو کیا تم دو ماہ کے پے در پے روزے رکھ سکتے ہو ؟" اس نے جواب دیا "نہیں۔" فرمایا "تو کیا تم ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتے ہو ؟" اس نے جواب دیا "نہیں"۔ پھر وہ شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ دیر بیٹھا رہا کہ اتنے میں حضورؐ کے پاس ایک بوری آئی جس میں چھوہارے تھے' آپؐ نے اس شخص سے فرمایا۔ "دیکھو ان چھوہاروں کا صدقہ کر دو۔" اس نے کہا "کیا اپنے سے زیادہ تنگ دست پر صدقہ کروں ؟ مدینہ کی دونوں طرفوں کے درمیان (یعنی پورے مدینہ میں) کوئی گھر ہم سے زیادہ حاجت مند نہیں ہے"۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے' یہاں تک کہ آپؐ کے دندان مبارک نظر آنے لگے' اور آپؐ نے فرمایا "جاؤ' اسے اپنے گھر والوں کو کھلا دو"۔ [۱]

(بخاری' مسلم' ابو داؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ وغیرہ)۔

جمہور ائمہ کے نزدیک یہ کفارہ مرد اور عورت دونوں پر ضروری ہے۔ لیکن اگر مرد نے عورت کو اپنے ساتھ زبردستی شریک کیا ہو' تو اس کا کفارہ بھی مرد کے ذمہ ہوگا۔ (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۹۷)۔

جمہور ائمہ کے نزدیک کفارہ میں ترتیب ضروری ہے' یعنی یہ کہ ایک غلام آزاد کیا جائے' اگر اس کی طاقت نہ ہو تو لگاتار ساٹھ روزے رکھے' اور اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو' تو پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے۔ (الفتح الربانی ایضاً)۔

سوائے ابن ابی لیلیٰؒ کے تمام ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ کفارہ کے ان ساٹھ روزوں کا

ا۔ صرف شعبیؒ' سعید بن جبیرؒ' ابراہیم نخعیؒ اور قتادہؒ کے متعلق روایت ہے کہ ان کے نزدیک جان بوجھ کر جماع سے صرف قضا ضروری ہے' کفارہ ضروری نہیں۔ (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۹۶)۔۔۔۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو ان حضرات کو مذکورہ بالا حدیث نہیں ملی' یا ان کے نزدیک اس میں کفارہ کا حکم اس لیے نہیں دیا گیا ہے کہ یہ ضروری تھا' بلکہ اس لیے دیا گیا ہے کہ ایسا کرنا بہتر تھا۔ (بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۲۰۵ معالم السنن ج ۳ ص ۲۶۸)۔

۲۔ امام اوزاعیؒ' حسن بصریؒ' امام شافعیؒ (اور ایک روایت میں امام احمدؒ) کے نزدیک یہ کفارہ صرف مرد پر ضروری ہے عورت پر ضروری نہیں ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اوپر کی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف مرد کو کفارہ کا حکم دیا اور عورت کے متعلق کچھ دریافت نہیں فرمایا۔ لیکن جمہور ائمہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ممکن ہے عورت کسی عذر کی وجہ سے روزہ سے نہ ہو یا مرد نے اسے زبردستی اپنے ساتھ شریک کیا ہو' یا اسی طرح کی کوئی اور وجہ ہو اور اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی متعلق دریافت نہ فرمایا ہو۔'' (معالم السنن ج ۳ ص ۲۷۱)۔

۳۔ امام مالکؒ اور آپ کے اصحاب کے نزدیک (اور ایک روایت میں امام احمدؒ کے نزدیک بھی) تینوں چیزوں میں اختیار ہے۔ ان کا استدلال حضرت ابو ہریرہؓ کی اس روایت سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص نے روزہ توڑ لیا' تو اسے حضورؐ نے حکم دیا کہ ایک غلام آزاد کرے یا پے در پے ساٹھ روزے رکھے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے'' (مسند امام احمدؒ)۔۔۔۔ لیکن دوسروں کے نزدیک حضرت ابو ہریرہؓ کی مذکورہ بالا روایت اس روایت کی نسبت زیادہ معتبر ہے' کیونکہ اس میں پورا واقعہ بیان کیا گیا ہے' اس کے راویوں کی تعداد بھی زیادہ ہے اور پھر یہ کہ لفظ ''یا'' اگرچہ بظاہر دو چیزوں میں سے ایک کو اختیار کرنے کے لیے ہوتا ہے' لیکن ایسا ہونا ہمیشہ ضروری نہیں ہے۔ (معالم السنن ج ۲ ص ۲۷۲)۔

پے در پے رکھنا ضروری ہے' جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو ایسا کرنے کا حکم دیا اور یہ بھی ضروری ہے کہ انہیں ایسے دنوں میں رکھا جائے' جن میں نہ رمضان کا مہینہ آئے اور نہ ایسے دن آئیں' جن میں روزہ رکھنا جائز نہیں' جیسے عیدین وغیرہ[1]

۲۔ قے :

جو شخص روزے کی حالت میں قصداً قے کرے' اس کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے' لیکن اس کے ذمہ صرف قضا (یعنی بعد میں ایک دن کے بدلے ایک دن روزہ رکھنا) ضروری ہے' کفارہ ضروری نہیں۔ لیکن جو شخص قصداً قے نہ کرے' بلکہ اسے قے آجائے اور وہ اسے لوٹائے نہیں' تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا' لیکن اگر وہ اسے لوٹا لے' تو اس کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس شخص کو قے مغلوب کرلے (اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا اور) اس کے ذمہ کوئی قضا نہیں' لیکن جو شخص خود قے کرے (اس کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے) اسے چاہیے کہ قضا کرے۔"[2] (احمد' ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ وغیرہ)۔

۳۔ جان بوجھ کر کھانا پینا :

۱۔ ابن ابی لیلیٰ کے نزدیک ان کا وقفوں کے ساتھ رکھنا بھی جائز ہے۔ ان کا استدلال حضرت ابو ہریرہؓ کی مذکورہ اسی روایت سے ہے جس سے امام مالکؒ کفارہ کی تینوں چیزوں کو ضروری نہیں بلکہ اختیاری مانتے ہیں' کیونکہ اس میں روزوں کے ساتھ انہیں پے در پے رکھنے کا حکم نہیں دیا گیا۔۔۔۔ لیکن اس حدیث کے الفاظ مطلق ہیں' جن کو دوسرے تمام ائمہ حضرت ابو ہریرہؓ کی مذکورہ بالا حدیث کے الفاظ سے مقید کرتے ہیں۔ (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۹۸)۔

۲۔ تمام ائمہ اور اہل علم کا اس پر اتفاق ہے' صرف عطاءؒ اور ابو ثورؒ کے نزدیک قصداً قے کرنے سے قضا اور کفارہ دونوں ضروری ہو جاتے ہیں۔ (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۴۴۔۴۵)۔

قے کے متعلق مجمل طور پر حنفیہ کا مسلک وہی ہے' جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے' لیکن ان کے نزدیک جس قے سے روزہ ٹوٹتا ہے' اس سے مراد وہ قے ہے' جو منہ بھر ہو' اور اگر قے منہ بھر سے کم ہو' تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا' خواہ وہ قصداً کی جائے' یا خود بخود آجائے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۵۲۶)۔

جان بوجھ کر کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے' کیونکہ کھانے پینے سے رکے رہنا روزہ کا ایک رکن ہے (دیکھیے صفحہ ۲۵۷)۔ لیکن کیا اس سے قضا کے علاوہ کفارہ (ایک غلام آزاد کرنا یا پے در پے ساٹھ روزے رکھنا یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا) بھی واجب ہوتا ہے؟ اس بارے میں کوئی واضح حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے' لہذا اس میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے جس کا ہم حاشیہ میں ذکر کرتے ہیں [1]

روزے کی حالت میں بھول کر کھا پی لینے سے جمہور ائمہ کے نزدیک روزہ نہیں ٹوٹتا' خواہ یہ کھانا اور پینا کم مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں' اور خواہ روزہ فرض ہو یا نفلی۔ اس بارے میں متعدد احادیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ جن میں سے ہم صرف دو کا ذکر کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جس شخص

---

[1] امام ابو حنیفہؒ' امام مالکؒ' سفیان ثوریؒ' عبداللہ بن مبارکؒ اور اسحاقؒ کے نزدیک جان بوجھ کر کھانے پینے سے قضا اور کفارہ دونوں واجب ہو جاتے ہیں۔

امام شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ اور ظاہریہ کے نزدیک جان بوجھ کر کھانے پینے سے صرف قضا واجب ہوتی ہے' کفارہ واجب نہیں ہوتا۔

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ حدیث میں صرف جماع سے روزہ توڑنے پر کفارہ واجب ہونے کا ذکر ہے۔ امام ابو حنیفہؒ' امام مالکؒ' اور دوسرے ائمہ جان بوجھ کر کھانے پینے کو جان بوجھ کر جماع پر قیاس کرتے ہوئے اس پر بھی کفارہ کو واجب قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ امام مالکؒ نے اپنی کتاب' موطا' میں یہ حدیث بھی روایت کی ہے کہ ایک شخص نے روزہ توڑ لیا' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ "ایک غلام آزاد کرے یا دو ماہ کے پے در پے روزے رکھے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔" لیکن دوسرے محدثین کا کہنا یہ ہے کہ یہ حدیث عام ہے جس کی وضاحت متعدد راویوں کی روایت کردہ حدیث سے ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اس شخص کو روزہ توڑنے پر کفارہ کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے دیا تھا کہ اس نے روزے کی حالت میں جان بوجھ کر جماع کیا تھا اس کے برعکس امام شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ اور ظاہریہ جان بوجھ کر کھانے پینے کو جان بوجھ کر جماع کرنے پر قیاس نہیں کرتے' لہذا ان کے نزدیک جان بوجھ کر کھانے پینے سے روزہ توڑنے پر صرف قضا واجب ہوتی ہے' کفارہ واجب نہیں ہوتا۔ (ترمذی) (بدایۃ المجتہد ج ا ص ۲۰۹) (تہذیب ابن قیم علی معالم السنن ج ۳ ص ۲۷۰) بدایۃ ج ا ص ۸۹)۔

نے روزہ کی حالت میں بھول کر کھا پی لیا (اس کا روزہ نہیں ٹوٹا) اسے اپنا روزہ پورا کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا پلایا ہے۔" (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، احمد)۔

حضرت ابوہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا "میں نے روزے کی حالت میں بھول کر کھا پی لیا۔" تو آپؐ نے فرمایا۔ "تمہیں اللہ تعالیٰ نے کھلایا اور پلایا ہے۔" (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، دارقطنی، حاکم وغیرہ)[1]

۴۔ غلطی سے وقت سے پہلے روزہ افطار کر لینا یا طلوع فجر کے بعد تک کھاتے پیتے رہنا:

اگر کوئی شخص یہ سمجھ کر کھاتا پیتا رہے کہ ابھی صبح (فجر) نہیں ہوئی اور بعد میں اسے معلوم ہو کہ صبح ہو چکی تھی، یا وہ یہ سمجھ کر روزہ افطار کر لے کہ سورج غروب ہو چکا اور بعد میں اسے معلوم ہو کہ سورج غروب نہیں ہوا تھا۔ تو جمہور (جن میں ائمہ اربعہ شامل ہیں) کے نزدیک اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا اور اسے بعد میں اپنے روزہ کی قضا کرنی ہو گی، کیونکہ قرآن کی آیت "فَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ" کی رو سے طلوع فجر کے ساتھ ہی کھانے پینے سے رک جانا اور پھر غروب آفتاب تک کھانے پینے سے رکے رہنا ضروری ہے۔ بھول جانے والے کا معاملہ الگ ہے، کیونکہ وہ تو بھول ہی گیا۔ البتہ جو شخص محض اس خیال سے طلوع فجر کے بعد تک کھاتا پیتا ہے کہ ابھی صبح نہیں ہوئی یا اس خیال سے غروب آفتاب سے پہلے روزہ افطار کر لیتا ہے کہ سورج غروب ہو چکا، تو وہ اپنے آپ کو روک سکتا ہے۔ یہاں

---

[1] امام مالکؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک بھول کر کھا پی لینے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور قضا واجب ہو جاتی ہے۔ اوپر کی احادیث کو مالکی علماء نفلی روزہ کے لیے لیتے ہیں۔ یعنی یہ کہ بھول کر کھا پی لینے سے فرض روزہ ٹوٹ جاتا ہے، لیکن نفلی روزہ باقی رہتا ہے۔ جب کہ دوسرے تمام مذاہب کے علماء ان احادیث کو فرض اور نفلی دونوں قسم کے روزوں کے لیے لیتے ہیں۔ (مختصراز نیل الاوطار ج ۴ ص ۲۱۹) (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۴۴)۔

تک کہ اسے طلوعِ فجر یا غروبِ آفتاب کا یقین ہو جائے۔ نیز حضرتِ اسماءؓ سے۔ بروایت بخاری'احمد'ابوداؤد'ترمذی'ابن ماجہ'بیہقی۔۔۔۔روایت ہے کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک دن جب کہ آسمان پر بادل تھے'روزہ افطار کر لیا۔ پھر سورج نکل آیا"۔۔۔۔ خود اس روایت سے اگرچہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جن لوگوں نے روزہ وقت سے پہلے افطار کر لیا'انہیں بعد میں قضا کرنے کا حکم دیا گیا کہ نہیں'لیکن بعد کے ایک راوی ہشام بن عروہ سے جب دریافت کیا گیا کہ آیا لوگوں کو قضا کا حکم دیا گیا'تو انہوں نے جواب دیا"کیا قضا سے چھٹکارا تھا؟"

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں۔"ہشام بن عروہ نے یہ بات کسی دوسری سند کی بنا پر کہی ہو گی"۔[1] (فتح الباری) الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۶۵) المغنی ج ۳ ص ۴۷)وغیرہ۔

۱۔ امام اسحاقؒ بن راہویہ اور ظاہریہ کے نزدیک ایسے شخص کا روزہ نہیں ٹوٹتا'بلکہ اس کا حکم اس شخص ہی کا ہے جو روزے کی حالت میں بھول کر کھا پی لیتا ہے'کیونکہ غلطی اور بھول میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہی مسلک تابعین میں سے عطاءؒ'عروہ بن زبیرؒ'حسن بصریؒ اور مجاہدؒ سے بھی مروی ہے۔ ان حضرات کا استدلال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عام ارشاد سے ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے میری امت کی غلطی یا بھول یا مجبوری کو معاف فرما دیا ہے۔"(طبرانی'حاکم'بیہقی'ابن ماجہ)۔ رہا اوپر کی روایت میں ہشام بن عروہ کا یہ کہنا کہ "کیا قضا سے چھٹکارا تھا؟" تو اس کے متعلق امام ابن خزیمہؒ (جن کا مسلک عدم قضا کا ہے) فرماتے ہیں کہ "ہشام نے اپنے اس قول کی کوئی سند بیان نہیں کی۔"(یعنی یہ صرف ان کا اپنا قیاس ہے)(فتح الباری)۔

دوسری روایت۔ بروایت بخاری۔۔۔۔ میں ہے کہ جب ان ہی ہشام سے قضا کے متعلق دریافت کیا گیا'تو انہوں نے جواب دیا"مجھے نہیں معلوم کہ آیا اس کے بعد لوگوں نے قضا کی کہ نہیں۔"

اسی مسلک کو امام ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ نے بھی اختیار کیا ہے اور اس کے مفصل دلائل دیے ہیں (ملاحظہ ہو تہذیب ابن قیم علیٰ معالم السنن ج ۳ ص ۲۳۶)۔

اس بارے میں حضرت عمرؓ کے مسلک کے متعلق روایات کے مختلف ہونے کی وجہ سے اختلاف ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ صحابہؓ نے ایک مرتبہ غلطی سے غروب آفتاب سے پہلے روزہ افطار کر لیا'لیکن بعد میں سورج نکل آیا۔ لوگ کہنے لگے "ہم اس روزہ کی قضا کریں گے" حضرت عمرؓ نے فرمایا"اللہ کی قسم ہم قضا نہیں کریں گے" ہم نے کسی گناہ کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ (بیہقی وغیرہ)۔ اس روایت کو دوسرے مسلک والے اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ امام اثرمؒ اور بیہقیؒ کی روایت میں حضرت عمرؓ کے الفاظ یہ ہیں۔"جس

۵۔۶۔ حیض اور نفاس :

اس پر اجماع ہے کہ اگر عورت کو دن میں (خواہ کسی وقت) حیض یا نفاس شروع ہو جائے' تو اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا اور اس کے ذمہ اس دن کے روزہ کی قضا ضروری ہو جائے گی۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۵۴۷ وغیرہ)۔

۷۔ روزہ توڑ لینے کی نیت کر لینا :

اگر کوئی شخص روزے کی حالت میں نیت کر لے کہ میں نے روزہ توڑ لیا' تو اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا' اور اس کے ذمہ اس دن کی قضا ضروری ہو گی' کیونکہ نیت روزہ کے لیے ضروری ہے۔ جب نیت ختم ہو گئی تو روزہ بھی ختم ہو گیا[1]

۸۔ کوئی چیز نگل لینا' خواہ وہ غذا کے طور پر استعمال نہ ہوتی ہو :

اگر منہ کے ذریعے پیٹ میں کوئی چیز اتار لی جائے' خواہ وہ غذا کے طور پر استعمال نہ ہوتی ہو' تو اس سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس پر تقریباً تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ (المغنی ج ۳ ص ۳۶) (صرف حنفیہ کے مسلک کے لیے' بدایہ ج ۱ ص ۸۹)۔

فائدہ : (ا) حنفیہ کے نزدیک اگر پیٹ یا سر یا کان پر زخم ہو اور اس پر ایسی دوا

شخص نے روزہ افطار کیا' اسے چاہیے کہ قضا کرے"۔ اس روایت کو پہلے مسلک والے یعنی جمہور اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ خود امام بیہقیؒ نے اسے اپنی روایت پر ترجیح دی ہے' لیکن ابن قیمؒ نے ان کی اس ترجیح کو صحیح قرار نہیں دیا۔ موطا امام مالکؒ کی روایت میں حضرت عمرؓ کے الفاظ یہ ہیں۔ "معاملہ آسان ہے ہم نے اجتہاد ہی تو کیا تھا"۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ہماری سمجھ کے مطابق حضرتِ عمرؓ کے اس کہنے کا مطلب یہ ہے کہ "ہم بعد میں اس روزہ کی قضا کر لیں گے۔" امامِ شافعیؒ نے بھی اس کا یہی مطلب سمجھا ہے۔ لیکن ابنِ قیم کا کہنا ہے کہ ان الفاظ کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ "روزہ کی قضا ضروری نہیں ہے۔" (تہذیب ابنِ قیم حوالہ مذکورہ)۔

[1] یہ امام شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ اور اکثر ائمہ کا مسلک ہے۔ حنفیہ کا بھی یہی مسلک ہے' البتہ ان کے نزدیک اگر نیت آدھے دن سے پہلے ختم کر لی جائے تو آدھے دن تک دوبارہ پھر نیت کی جا سکتی ہے۔ (المغنی ج ۳ ص ۷۲ و ۵۳)۔

استعمال کی جائے' جو معدہ یا دماغ میں (خواہ کسی راستہ سے) پہنچ جائے' تو اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس صورت میں صرف قضا ضروری ہوتی ہے' کفارہ ضروری نہیں ہوتا۔ اس پر بعض جزئی تفصیلات کے ساتھ دوسرے مذاہب کے فقہاء کا بھی اتفاق ہے۔ (ہدایہ ج ۱ ص ۹۰)(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۵۲۱۔ ۵۳۸)۔

(۲) اس پر مذاہبِ اربعہ کے فقہاء کا اتفاق ہے کہ جس شخص کا رمضان کا روزہ کسی وجہ سے ٹوٹ جائے' اس کے لیے رمضان کے احترام میں غروبِ آفتاب تک کھانے پینے سے رکے رہنا ضروری ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۵۳۹)۔

لیلۃ القدر

ا۔ فضیلت :

شب قدر کی فضیلت سال بھر کی تمام دوسری راتوں سے زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ وَمَا اَدْرٰكَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ ○ لَیْلَةُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ○	ہم نے اسے (یعنی قرآن پاک کو) شب قدر میں نازل کیا ہے۔ آپ کو کیا معلوم کہ شبِ قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جس شخص نے ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے شب قدر کا قیام کیا' اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیے گئے۔" (بخاری' ابو داؤد' احمد' نسائی' ابن ماجہ)۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ "اے اللہ کے نبی! اگر میں شبِ قدر پالوں' تو کیا دعا کروں؟" فرمایا "تم یہ دعا کرو" :

اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّی (احمد' نسائی' ابن ماجہ' ترمذی)	اے اللہ! تو بخشنے والا ہے اور بخشش کو پسند فرماتا ہے لہٰذا مجھے بخش دے۔

اس بارے میں تمام امت کا اتفاق ہے (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۲۹۲)۔

۲۔ اسے کون سی راتوں میں تلاش کرنا چاہیے؟

اس بارے میں صحابہؓ کرام اور ائمہ کی مختلف رائیں ہیں کہ شب قدر کس رات ہوتی ہے؟ لیکن جو چیز زیادہ تر احادیث سے معلوم ہوتی ہے اور اس پر اکثریت سلف کا اتفاق ہے' وہ یہ کہ یہ رات آخری تہائی رمضان کی طاق راتوں میں سے کوئی ایک رات ہوتی ہے۔ اکثر ائمہ کے نزدیک اس کی سب سے زیادہ توقع رمضان کی ۲۷ ویں رات میں ہوتی ہے[1]

[1] امام شافعیؒ کے نزدیک اس کی سب سے زیادہ توقع رمضان کی ۲۱ ویں رات میں ہے۔ (الفتح الربانی حوالہ مذکور بالا)۔

(تفصیل کے لیے دیکھئے الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۲۹۷ تا)

۲۔ لیلۃ القدر کے مسائل جس تفصیل سے الفتح الربانی میں دیے گئے ہیں۔اس تفصیل سے کسی دوسری کتاب میں نہیں دیے گئے' جیسا کہ خود کتاب کے مولف ؒ فرماتے ہیں۔

اعتکاف

ا۔ معنی :

اعتکاف کے لغوی معنی اپنے آپ کو کسی چیز سے وابستہ کرنے اور روکے رکھنے کے ہیں' خواہ یہ چیز اچھی ہو یا بری۔ اچھی چیز کے لیے اس کا استعمال ذیل کی آیت میں ہوا ہے :

سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيهِ وَ الْبَادِ۔ (الحج : ۲۵) اس میں (یعنی مسجد حرام میں) رکے رہنے والا اور باہر سے آنے والا برابر ہے۔

اور بری چیز کے لیے اس کا استعمال ذیل کی آیت میں ہوا ہے :

فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰى اَصْنَامٍ لَّهُمْ۔ (الاعراف : ۱۳۸) تو وہ (یعنی بنی اسرائیل) ایسے لوگوں کے پاس آئے' جو اپنے بتوں پر اپنے آپ کو روکے ہوئے تھے (یعنی ان کی لگاتار عبادت کے لیے اُن کے پاس بیٹھے ہوئے تھے)۔

اور شریعت میں اعتکاف کے معنی "نیت کے ساتھ مسجد میں رکے رہنے" کے ہیں۔

۲۔ مشروعیّت و ثواب :

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "مسجدوں کے لیے کچھ کھونٹے ہیں (یعنی ایسے لوگ ہیں جو مسجدوں میں بیٹھے رہنا اور عبادت میں مشغول رہنا پسند کرتے ہیں) ایسے لوگوں کے ساتھی فرشتے ہوتے ہیں۔ اگر وہ مسجد میں موجود نہ ہوں' تو وہ (یعنی فرشتے) انہیں تلاش کرتے ہیں' اور اگر بیمار ہوں' تو ان کی عیادت کرتے ہیں اور اگر انہیں کوئی حاجت در پیش ہو' تو وہ اس کے پورا کرنے میں ان کی مدد کرتے ہیں۔" (احمد)

یہ حدیث اگرچہ سند کے لحاظ سے ضعیف ہے اور اعتکاف کی فضیلت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی دوسری قولی حدیث بھی صحیح سند کے ساتھ ثابت نہیں ہے' لیکن چونکہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری دس دنوں میں ہر سال مسجد میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے' جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ اسی طرح آپ کے صحابہ کرام اور ازواج مطہرات بھی برابر اعتکاف کرتے رہے۔ لہذا اس کی مشروعیت اور ثواب پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ (الفتح الربانی وغیرہ)۔

۳۔ وقت :

اعتکاف کے لیے کوئی وقت یا مدت متعین نہیں ہے' جس وقت اور جتنی مدت کے لیے کوئی چاہے' اعتکاف کر سکتا ہے' البتہ مسنون یہ ہے کہ رمضان کے آخری دس دنوں میں (۲۰ رمضان کو مغرب کے بعد سے عید کا چاند دیکھ لینے تک) اعتکاف کیا جائے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری دس دنوں میں (ہر سال) اعتکاف فرماتے رہے' یہاں تک کہ آپؐ اپنے رب سے جا ملے۔" (بخاری' مسلم' ابو داؤد' نسائی' احمد)۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری دس دنوں میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔" (مسلم' احمد' ابو داؤد' ابن ماجہ' بیہقی)۔

۴۔ وہ کام جو اعتکاف کے لیے ضروری (رکن یا شرط) ہیں :

(۱) نیت : نیت کے ضروری ہونے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۲۲۰)۔

(۲) مسجد : جمہور ائمہ (جن میں امام مالکؒ' شافعیؒ' احمدؒ' داؤد ظاہریؒ شامل ہیں) کے نزدیک اعتکاف خواہ مرد کرے یا عورت' اس کا مسجد میں ہونا ضروری ہے' گھر یا کسی دوسری جگہ اعتکاف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ۔ (البقرۃ : ۱۸۷)

اور جب تم مسجدوں میں معتکف ہو تو بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم (اعتکاف کی حالت میں) مسجد ہی سے اپنا سر مبارک میری طرف فرما دیتے اور میں اس میں کنگھی کرتی' اور آپؐ جب اعتکاف میں ہوتے تو ناگزیر انسانی ضرورت (یعنی پیشاب و پاخانہ) کے بغیر گھر میں داخل نہ

ہوتے' الا یہ کہ آپؐ وضو فرمانا چاہتے۔" (بخاری' مسلم' ابو داؤد' ترمذی' ابن ماجہ' احمد' نسائی)۔
دوسری تمام احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ کی ازواجِ مطہرّات اور صحابہؓ کرام نے مشقت کے باوجود ہمیشہ مسجد ہی میں اعتکاف فرمایا ہے۔ اگر گھروں میں اعتکاف جائز ہوتا' تو آپؐ کی ازواج اور صحابہؓ کرام ضرور گھروں میں اعتکاف کرتے۔[1] (المغنی ج ۳ ص ۱۲۳۔ ۱۲۴) الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۲۴۵)۔
جمہور ائمہ (جن میں امام مالکؒ اور شافعیؒ شامل ہیں) کے نزدیک اعتکاف ہر مسجد میں ہو سکتا ہے۔[2] (الفتح الربانی ایضاً)۔
(۳) روزہ: جمہور سلف (جن میں امام ابو حنیفہؒ' امام مالکؒ اور ایک روایت میں امام احمدؒ شامل ہیں) کے نزدیک اعتکاف کے لیے روزہ شرط ہے۔ اگر روزہ نہ ہو تو اعتکاف نہیں ہو سکتا' کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آپؐ نے روزے کے بغیر اعتکاف فرمایا ہو۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں "سنت یہ ہے۔۔۔ اور یہ کہ روزے کے بغیر اعتکاف نہیں۔" (ابو داؤد) خود اللہ تعالیٰ نے اعتکاف کا ذکر روزے کے ساتھ ہی فرمایا ہے۔[3] (زاد المعاد ج ۱ ص ۳۵۵)

۱۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اعتکاف کے لیے مسجد کی شرط صرف مرد کے لیے ہے' عورت اپنے گھر کی مسجد میں اعتکاف کرے گی' کیونکہ وہی اس کی نماز کی جگہ ہے۔ اسی جگہ ٹھہرے رہنے سے اعتکاف کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے گھر میں مسجد نہ ہو' تو وہ اس میں کوئی جگہ متعین کر لے اور اسی میں اعتکاف کرے (ہدایۃ ج ۱ ص ۹۵)

۲۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک اعتکاف صرف اس مسجد میں ہو سکتا ہے جس میں تمام نمازیں پڑھی جاتی ہوں (ہدایۃ۔ الفتح الربانی)۔

۳۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ' امام حسن بصریؒ' شافعیؒ' (مشہور روایت میں) احمد بن حنبلؒ اور اسحاقؒ کے نزدیک اعتکاف کے لیے روزہ شرط نہیں مستحب ہے۔ ان کا استدلال مندرجہ ذیل تین حدیثوں سے ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا "میں نے جاہلیت میں یہ نذر مانی تھی کہ ایک رات مسجد میں اعتکاف کروں گا۔" آپؐ نے فرمایا "اپنی نذر پوری

۵۔وہ کام جو اعتکاف میں مستحب ہیں :

اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ اعتکاف کے دوران نفل نماز' تلاوت اور اللہ تعالیٰ کے ذکر' تسبیح' تحمید (الحمد للہ کہنا)' تکبیر (اللہ اکبر کہنا)' استغفار اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر

کرو۔" (بخاری و مسلم) صحیح بخاری میں یہ الفاظ زیادہ ہیں "تو ایک رات اعتکاف کرو۔" رات کو چونکہ روزہ ہوتا ہی نہیں۔ اس لیے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ روزے کے بغیر بھی اعتکاف ہو سکتا ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ "ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے آخری دس دنوں میں اعتکاف کرنے کا ارادہ فرمایا۔ آپؐ نے (مسجد میں) خیمہ لگانے کا حکم دیا جو لگا دیا گیا۔ آپ کی دوسری ازواج مطہرات نے بھی خیمے لگانے کا حکم دیا' جو لگا دیے گئے۔ جب آپؐ نے صبح کی نماز پڑھی' تو آپؐ نے خیموں کی طرف دیکھ کر فرمایا "کیا تم عورتوں کا ارادہ نیکی کا ہے؟ (یعنی تمہارا ارادہ نیکی کا نہیں' بلکہ آپس میں فخر کرنے کا ہے) تو آپؐ نے حکم دیا اور آپ کا خیمہ اٹھا دیا گیا۔ آپؐ کی ازواجِ مطہرات نے بھی حکم دیا' تو ان کے خیمے بھی اٹھا دیے گئے۔ پھر آپؐ نے شوال کے پہلے دس دنوں تک اعتکاف ملتوی کر دیا۔" شوال کے پہلے دس دنوں میں چونکہ عید کا دن بھی شامل ہے اور اس میں روزہ ہوتا ہی نہیں۔ لہٰذا اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ روزے کے بغیر اعتکاف ہو سکتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "معتکف پر روزہ نہیں ہے الّا یہ کہ وہ خود اسے اپنے اوپر ضروری کر لے (یعنی اس کی نذر مان لے) (حاکم)۔

وجہ اختلاف : پہلے مسلک والوں کے نزدیک حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت اگرچہ صحیح ہے لیکن مختلف روایات میں اس کے الفاظ مختلف ہیں۔ بعض روایات میں حضرت عمرؓ کے الفاظ میں ایک رات کا ذکر ہے اور بعض میں ایک دن کا یہ واقعہ چونکہ ایک ہی مرتبہ پیش آیا ہے لہٰذا دونوں میں سے ایک ہی قسم کے الفاظ کو لیا جا سکتا ہے۔ اگر 'ایک دن' کے الفاظ کو لیا جائے' تو ان میں روزے کے ضروری ہونے کی دلیل نہیں ہے اور اگر 'ایک رات' کے الفاظ کو لیا جائے' تو عربی زبان کی رو سے "رات" کا لفظ دن اور رات کے مجموعہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے' اس لیے اس سے مراد یہاں بھی ایک دن اور رات ہی لیا جائے گا۔۔۔۔

حضرت عائشہؓ کی حدیث کے الفاظ تین طرح سے آئے ہیں۔ بعض روایات میں "شوال کے دس دن" کا ذکر ہے۔ بعض میں "شوال کے پہلے دس دنوں کا اور بعض میں "پہلے دن کا۔۔۔۔ ان تینوں قسم کے الفاظ سے یہ ضروری نہیں ہے کہ عید کا دن بھی اعتکاف کے دنوں میں شامل ہو۔ کیونکہ اس روز تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو

درود میں مشغول رہنا مستحب ہے۔ جمہور ائمہ (جن میں امام ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ شامل ہیں) کے نزدیک حدیث اور فقہ کی کتابوں کے پڑھنے میں مشغولیت بھی مستحب ہے [1] (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۲۵۸) وغیرہ۔

۶۔ وہ کام جو اعتکاف میں مکروہ ہیں :

(۱) فضول باتوں یا کاموں میں مشغولیت۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "انسان کے اسلام کے اچھا ہونے میں سے یہ ہے کہ وہ ہر فضول (بات یا کام) کو ترک کر دے (ترمذی' ابن ماجہ)۔

(۲) نیکی کے خیال سے چپ رہنا :

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے

نماز اور خطبہ اور بہت سی مصروفیتیں ہوتی تھیں' اس دن آپؐ اعتکاف کیسے فرما سکتے تھے۔۔۔۔ تیسری' یعنی حضرت ابن عباسؓ کی روایت سند کے لحاظ سے صحیح نہیں ہے۔ (مختصر از تہذیب ابن قیم ج ۳ ص ۳۴۴)۔

دوسرے مسلک والوں کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمیشہ روزے کے ساتھ اعتکاف کرنے سے روزے کو اعتکاف کے لیے شرط قرار نہیں دیا جا سکتا' اسے مستحب اور سنت قرار دیا جا سکتا ہے۔ رہی حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث کہ "سنت یہ ہے۔۔۔۔ اور یہ کہ روزے کے بغیر اعتکاف نہیں۔" تو ان کی جو روایت صحیح مسلم وغیرہ میں آئی ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے۔ یعنی روزے کے بغیر اعتکاف نہ ہونے کا مسلک خود حضرت عائشہؓ کا تھا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ الفاظ ثابت نہیں ہیں۔ (مختصر از نیل الاوطار ج ۴ ص ۲۸۲) (سبل السلام)۔

فائدہ : زاد المعاد اور تہذیب السنن میں امام ابن قیمؒ نے پہلے مسلک کو ترجیح دی ہے اور اسی کو امام ابن تیمیہ کا مسلک بیان کیا ہے' لیکن نیل الاوطار میں قاضی شوکانیؒ نے ان کے استدلال سے اتفاق نہ کرتے ہوئے دوسرے مسلک کو صحیح قرار دیا ہے۔

[1] امام مالکؒ اور احمدؒ کے نزدیک حدیث اور فقہ کی کتابوں کے پڑھنے میں مشغولیت مستحب نہیں ہے' اس لیے کہ اعتکاف کا مقصد اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم رکھنا اور لو لگائے رکھنا ہے۔ لہٰذا ہر وہ چیز جس سے اس میں کمی آئے' مستحب نہیں ہے۔ (الفتح الربانی حوالہ مذکور بالا)۔

کہ آپؐ نے ایک آدمی کو کھڑے دیکھا۔ آپؐ نے اس کے متعلق دریافت فرمایا' تو لوگوں نے بتایا کہ اس شخص کا نام ابو اسرائیل ہے اور اس نے یہ نذر مانی ہے کہ وہ کھڑا رہے گا' بیٹھے گا نہیں۔ نہ سایہ کرے گا' نہ بات چیت کرے گا اور یہ کہ روزہ سے رہے گا۔ آپؐ نے فرمایا۔ "اسے حکم دو کہ بات چیت کرے' سایہ کرے' بیٹھے اور اپنا روزہ ختم کرے۔" (بخاری ابو داؤد' ابن ماجہ)۔

۷۔ وہ کام جو اعتکاف میں جائز یا ناجائز ہیں :

(۱) انسان کے لیے یہ جائز ہے کہ اعتکاف کی حالت میں اپنی بیوی سے اپنا سر دھلوائے' کنگھی کرائے اور اس غرض سے اپنا سر مسجد سے باہر نکالے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کے دوران میری طرف اپنا سر بڑھاتے اور میں آپؐ کا سر دھوتی۔ حالانکہ میں حیض کی حالت میں ہوتی تھی۔" دوسری روایت میں ہے کہ "میں آپؐ کے سر میں کنگھی کیا کرتی تھی۔" (بخاری' مسلم' ابو داؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' احمد)۔

(۲) اگر اعتکاف کی حالت میں معتکف کے گھر کا کوئی آدمی اسے ملنے آئے' تو وہ اسے الوداع کہنے کے لیے اپنے اعتکاف کی جگہ سے نکل سکتا ہے۔

اُمُّ المؤمنین حضرت صفیہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف میں تھے کہ میں ایک رات آپؐ سے ملنے آئی۔ میں نے آپؐ سے بات چیت کی' پھر میں کھڑی ہوئی اور پلٹی' تو آپؐ بھی مجھے الوداع کہنے کے لیے کھڑے ہوئے۔" (بخاری' مسلم' ابو داؤد)۔

۳۔ معتکف کے لیے یہ جائز ہے کہ مسجد میں اپنے لیے ایک خاص جگہ متعین کر لے اور اس پر پردہ ڈال لے' تاکہ اسے تنہائی اور خلوت میسر ہو۔ بشرطیکہ اس سے مسجد میں جگہ تنگ نہ ہو جاتی ہو اور نمازیوں کو تکلیف نہ ہوتی ہو۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب اعتکاف فرماتے تو اسطوانۃ التوبہ (توبہ کا ستون)[1] کے پاس آپؐ کا بستر ڈال دیا جاتا۔ یا چارپائی رکھ دی جاتی (ابن ماجہ)۔

۱۔ یہ مسجد نبوی میں ایک ستون ہے جسے توبہ کا ستون اس لیے کہا جاتا ہے کہ ایک صحابیؓ نے اپنے آپ کو اس سے باندھ لیا تھا' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول فرمائی۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ترکی خیمہ میں اعتکاف فرمایا جس کے دروازے پر چٹائی کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا تھا۔ (ابن ماجہ)۔

(۴) اس پر اجماع ہے کہ مُعتکِف کے لیے پیشاب و پاخانہ کے لیے مسجد سے نکلنا اور اپنے گھر میں داخل ہونا جائز ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم (جب) معتکف ہوتے تھے تو انسانی ضرورت (پیشاب و پاخانہ) کے سوا آپؐ کسی دوسری ضرورت کے لیے گھر میں داخل نہ ہوتے تھے۔ (بخاری' مسلم' احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)۔

دوسری ضروریات۔۔۔۔ جیسے مریض کی عیادت' اور جنازہ میں شرکت۔۔۔۔ کے بارے میں اختلاف ہے۔[۱]

(۵) اس پر بھی اجماع ہے کہ اگر انسان ایسی مسجد میں معتکف ہو' جہاں جمعہ نہ ہوتا ہو' تو جمعہ میں شرکت کے لیے اسے مسجد سے نکلنا ضروری ہے البتہ اس بارے میں اختلاف یہ ہے کہ آیا اس کا اعتکاف باقی رہے گا' یا ختم ہو جائے گا؟ اکثر ائمہ (امام ابو حنیفہؒ' مالکؒ اور احمدؒ) کے نزدیک اس کا اعتکاف باقی رہے گا۔[۲]

(۶) اس بارے میں اجماع ہے کہ معتکف کے لیے اپنی بیوی سے تعلق ناجائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ۔ (البقرہ: ۱۸۷)	اور جب تم مسجدوں میں معتکف ہو' تو عورتوں سے مباشرت نہ کرو۔

۱۔ امام ابو حنیفہؒ' مالکؒ اور مجاہدؒ کے نزدیک مریض کی عیادت اور جنازہ میں شرکت کی غرض سے معتکف مسجد سے نہیں نکل سکتا۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب اعتکاف میں ہوتے اور آپؐ مریض کے پاس سے گزرتے تو آپ چلتے رہتے اور ٹھہر کر اس کا حال دریافت نہ فرماتے۔ (ابوداؤد)۔

امام شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ' سفیان ثوریؒ اور اسحاقؒ کے نزدیک اگر انسان شروع میں شرط لگالے' تو اعتکاف میں ان کاموں کے لیے مسجد سے نکل سکتا ہے' ورنہ نہیں۔

۲۔ مشہور روایت کے مطابق امام شافعیؒ کے نزدیک اس کا اعتکاف ختم ہو جائے گا۔

(۷) اس پر بھی اجماع ہے کہ معتکف تجارت یا کوئی بھی دوسرا کاروبار نہیں کر سکتا۔ (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۲۴۹۔۲۵۶۔۲۵۸)۔

۸۔ اعتکاف کی قضا:

اس بارے میں اختلاف ہے کہ اگر مُعتکِف اپنا اعتکاف پورا کیے بغیر درمیان میں اسے چھوڑ دے' تو کیا بعد میں اس کے ذمہ اس کی قضا ضروری ہے یا نہیں؟[1]

۹۔ عورتوں کا اعتکاف:

ا۔ حضرت عائشہؓ کی حدیث ۔۔۔۔ کی بنا پر اگر عورت اعتکاف کرنا چاہے' تو اس کے لیے اپنے شوہر سے اجازت لینا ضروری ہے' اگر وہ اس کی اجازت کے بغیر اعتکاف کرے گی' تو اسے روکنے کا اختیار ہے۔ جمہور ائمہ (جن میں امام شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ شامل ہیں) کے نزدیک وہ اسے اجازت دے کر بھی اپنی اجازت واپس لے سکتا ہے[2]

ا۔ امام مالکؒ اور حنفیہ کے نزدیک اعتکاف کی قضا واجب ہے۔ ان کا استدلال حضرت عائشہؓ کی اس حدیث ۔۔۔۔ بروایت بخاری' مسلم' ابو داؤد وغیرہ ۔۔۔۔ سے ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں اعتکاف شروع فرمایا' لیکن پھر آپ اس سے نکل گئے (یعنی درمیان میں اسے ترک کر دیا' تو پھر آپؐ نے شوال میں دس دن اعتکاف فرمایا۔

امام شافعیؒ اور حنابلہ کے نزدیک اعتکاف کی قضا واجب نہیں مستحب ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ ہر وہ کام جسے انسان نفلی طور پر شروع کرے اور پھر اسے درمیان میں چھوڑ دے تو اس کی قضا کا اسے اختیار ہے' اس کے ذمہ ضروری نہیں۔ حضرت عائشہؓ کی اس حدیث کے متعلق ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر انسان کوئی کام نفلی طور پر شروع کرے' تو اسے اختیار ہے کہ چاہے تو اسے پورا کر لے اور چاہے تو اسے درمیان میں ترک کر دے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہراتؓ نے بھی اعتکاف درمیان میں ترک کیا' لیکن انہیں قضا کا حکم نہیں دیا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خود قضا فرمائی' تو یہ بطور استحباب تھی نہ کہ بطور وجوب (مختصر از الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۲۵۰)۔

۲۔ حنفیہ کے نزدیک شوہر کے لیے اجازت دینے کے بعد اپنی اجازت واپس لینا گناہ ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک شوہر ایک مرتبہ اجازت دے کر اجازت واپس نہیں لے سکتا۔ (الفتح الربانی ج ۱۰ ص ۲۶۲)۔

۲۔ عورت حیض کی حالت میں اعتکاف نہیں کر سکتی' لیکن استحاضہ کی حالت میں اعتکاف کر سکتی ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہراتؓ میں سے کسی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اعتکاف کیا' حالانکہ وہ استحاضہ کی حالت میں تھیں۔ وہ زردی اور سرخی دیکھتی تھیں اور بعض اوقات ہم ان کے نماز پڑھنے کے دوران ان کے نیچے تشت رکھ دیتے تھے۔" (بخاری' ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ)۔

كتاب الحج والعمرة

حج کے متعلق عام احکام

ا۔ لغوی اور شرعی معنی :

حَجّ یا حِج (اسی طرح حَجہ یا حِجہ) کے لفظی معنی کسی جگہ کا قصد کرنے اور اس کی طرف آنے کے ہیں' لیکن اس کے شرعی (یا اصطلاحی) معنی مخصوص افعال کے ساتھ تعظیم کی نیت سے خانہ کعبہ کا قصد کرنے اور اس کی طرف آنے کے ہیں۔ (مختصراً از الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۲) (فتح الباری ج ۴ ص ۱۲۱) وغیرہ۔

۲۔ فضیلت اور ثواب :

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا۔ (آل عمران ۹۶-۹۷)

بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی' وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی۔ اور تمام جہان' والوں کے لیے مرکز ہدایت بنایا گیا۔ اس میں کھلی ہوئی' نشانیاں ہیں اور اسُ کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا' مامون ہو گیا۔

حج کی فضیلت اور ثواب میں متعدد احادیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ اختصار کے خیال سے ہم ان میں سے چند کا ذکر کرتے ہیں :

ا۔ حج افضل ترین اعمال میں سے ہے : نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ "سب سے افضل عمل کون سا ہے ؟" فرمایا "اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان"۔ سوال کیا گیا۔ "پھر ؟" فرمایا "حِج مبرُور"۔ [1] (بخاری و مسلم)۔

ا۔ حِج مبرُور سے مراد وہ حج ہے جس میں کوئی گناہ نہ کیا جائے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد ایسا حج ہے جو قبول کر لیا جائے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد ایسا حج ہے جس کے کرنے میں کوئی ریاء' شہرت کا جذبہ' شہوانی فعل' بدکاری یا لڑائی جھگڑا نہ ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ حج مبرور کی علامت یہ ہے کہ اس سے آدمی

۲۔ حج گناہوں کا کفارہ ہے: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص حج کرتا ہے اور اس میں شہوانی فعل نہیں کرتا اور نہ بدکاری کرتا ہے' تو وہ (گناہوں سے پاک ہو کر) اس طرح لوٹتا ہے' جیسا کہ وہ اس وقت تھا' جب کہ اس کی ماں نے اسے جنم دیا۔" (بخاری' مسلم' احمد' نسائی' ابن ماجہ)۔

حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "عمرہ ان گناہوں کا کفارہ ہے' جو اس کے اور اس سے پہلے عمرہ کے درمیان کیے گئے' اور حج مبرور کا ثواب تو جنت ہی ہے۔" (بخاری و مسلم)۔

حضرت عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام ڈالا' تو میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ "ہاتھ پھیلایئے میں آپ سے بیعت کروں گا۔" آپ نے ہاتھ پھیلا دیا' لیکن میں نے اپنے ہاتھ کھینچ لیا۔ آپؐ نے فرمایا "اے عمرو! یہ کیا؟" میں نے عرض کیا "میں ایک شرط کرنا چاہتا ہوں۔" فرمایا "وہ کیا؟" میں نے عرض کیا "وہ یہ کہ میرے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔" آپؐ نے فرمایا "کیا تمہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اسلام پچھلے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔ ہجرت پچھلے گناہوں کو ختم کر دیتی ہے اور حج پچھلے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔" (مسلم)۔

۳۔ حج عورتوں اور کمزوروں کا جہاد ہے: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ "ہم لوگ جہاد کو سب سے بہتر عمل سمجھتے ہیں' تو کیا ہم (عورتیں) بھی جہاد نہ کریں؟" فرمایا "تمہارے لیے سب سے افضل جہاد حج مبرور ہے۔" (بخاری و مسلم)۔

دوسری حدیث میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں "جب سے میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے۔ میں کبھی حج ترک نہیں کرتی۔" (بخاری و مسلم)۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بوڑھے'

پہلے کی نسبت بہتر ہو کر لوٹے اور گناہ کی کوشش نہ کرے۔ امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ایسا حج ہے کہ اس کے بعد انسان دنیا سے بے رغبت ہو جائے اور آخرت کا طلبگار بن جائے۔ (بہر حال حج مبرور کے مفہوم میں یہ تمام ہی باتیں شامل ہیں)۔ (القریٰ لقاصد ام القریٰ ص ۸)۔

کمزور اور عورت کا جہاد حج ہے" (نسائی)۔

۴۔ حاجی اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حج اور عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے وفد (مہمان) ہیں۔ اگر وہ اس سے دعا کرتے ہیں، تو وہ ان کی دعا قبول فرماتا ہے۔ اگر اس سے بخشش طلب کرتے ہیں تو وہ انھیں بخش دیتا ہے۔" (نسائی، ابن ماجہ)۔

۵۔ حاجی کی دعا قبول ہوتی ہے: اوپر کی حدیث کے علاوہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "پانچ دعائیں ایسی ہیں جو رد نہیں کی جاتیں۔ ایک حاجی کی دعا، یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے۔ دوسری مجاہد کی دعا یہاں تک کہ وہ واپس آ جائے۔ تیسری مظلوم کی دعا یہاں تک کہ اس کی فریاد رسی کر دی جائے۔ چوتھی مریض کی دعا یہاں تک کہ وہ شفایاب ہو جائے۔ پانچویں بھائی کی دعا اپنے بھائی کے لئے اس کی عدم موجودگی میں۔ ان میں سب سے جلد قبول ہونے والی دعا بھائی کی اپنے بھائی کے لیے دعا ہے۔" (ابو منصور عبداللہ بن محمد فی کتابہ "الجامع الدعاء الصحیح" بسند صحیح)۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تم کسی حاجی سے ملو تو اسے سلام کرو اور اس سے مصافحہ کرو اور پھر اس سے یہ درخواست کرو کہ تمہارے لیے استغفار کرے، اس سے پہلے کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہو جائے، اس لیے کہ وہ بخشا ہوا ہے۔" (مسند امام احمدؒ)

حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ عرفات کی رات اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے بطور فخر فرماتا ہے۔ "میرے بندوں کی طرف دیکھو، میرے حضور کس طرح بال بکھیرے ہوئے اور غبار سے اٹے ہوئے حاضر ہوئے ہیں۔" (احمد، طبرانی)۔

۶۔ حج پر خرچ کیے ہوئے مال کا اجر: حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حج میں خرچ کرنا اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ ایک درہم کا ثواب ۷۰۰ گنا ملتا ہے۔" (احمد، ابن ابی شیبہ)۔

۳۔ فرضیت اور اہمیت:

حج اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک ہے' جس کی فرضیت قرآن' سنت اور اجماع امت تینوں سے ثابت ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ○ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ ○ (آل عمران : ۹۷)

لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس کے گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو' وہ اس کا حج کرے' اور جو اس حکم کی پیروی سے انکار کرے' اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے "اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے (۱) لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت (۲) نماز کا قائم کرنا (۳) زکوٰۃ کا ادا کرنا (۴) خانہ کعبہ کا حج کرنا اور (۵) رمضان کے روزے رکھنا۔" (بخاری و مسلم)۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے لہذا تم حج کرو۔" (بخاری و مسلم)۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اسلام میں صَرُوْرَة (استطاعت کے باوجود حج کیے بغیر مر جانا) نہیں ہے۔" (ابو داؤد)

حضرت عبد الرحمن بن سابطؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو شخص حج کیے بغیر مر گیا' حالانکہ اس کے راستے میں نہ کوئی مرض' نہ کوئی ظالم حکمران اور نہ کوئی واضح ضرورت حائل ہوئی' تو وہ چاہے یہودی ہو کر یا نصرانی ہو کر جس طرح چاہے مر جائے۔" (سعید بن منصور)۔

حج کی فرضیت پر شروع سے اب تک پوری امت کا اتفاق ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۱۹) وغیرہ

۴۔ حج عمر میں صرف ایک مرتبہ فرض ہے :

اس پر اجماع ہے کہ حج عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ فرض ہے۔ ایک سے زیادہ

مرتبہ جو بھی حج کیا جائے گا وہ نفلی ہوگا۔ ہاں اگر انسان دوبارہ حج کرنے کی نذر مان لے' تو اس کے لیے دوبارہ حج کرنا ضروری ہوگا۔ (نیل الاوطار ج ۴ ص ۲۹۵) وغیرہ۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ میں فرمایا۔ "اے لوگو! اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے' لہٰذا تم حج کرو۔" ایک آدمی نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول! کیا ہر سال؟" آپؐ خاموش رہے' یہاں تک کہ اس شخص نے تین مرتبہ اپنا سوال دہرایا۔ پھر آپؐ نے فرمایا "اگر میں ہاں کہہ دیتا' تو ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا' حالانکہ تم اس کی طاقت نہ رکھتے۔" (بخاری و مسلم)۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص اقرع بن حابسؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا "کیا حج ہر سال (فرض) ہے؟" آپؐ نے فرمایا "نہیں بلکہ عمر بھر میں) ایک ہی مرتبہ (فرض) ہے۔ جس نے اس کے بعد پھر حج کیا وہ تطوع (نفلی) ہوگا۔ اگر میں (تمہارے سوال کے جواب میں) ہاں کہہ دیتا' تو یہ (ہر سال) فرض ہو جاتا' تو تم سن کر حکم بجا نہ لاتے۔" (احمد' ابوداؤد' نسائی' بیہقی' حاکم)۔

۵۔ حج کا فوراً ادا کرنا ضروری ہے:

جس شخص پر حج فرض ہو جائے[1] اس کے لیے حج کا جلد از جلد ادا کرنا واجب ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اپنے بھائی حضرت فضلؓ سے یا حضرت فضلؓ اپنے بھائی حضرت عبداللہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو شخص حج کا ارادہ رکھتا ہو' اسے جلدی کرنی چاہیے اس لیے کہ اسے بیماری آ سکتی ہے' اس کی سواری گم ہو سکتی ہے یا اسے کوئی اور ضرورت پیش آ سکتی ہے۔" (احمد' ابن ماجہ' بیہقی' دارمی)۔

حضرت ابن عباسؓ ہی سے دوسری روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حج کی ادائیگی میں جلدی کرو' اس لیے کہ تم میں سے کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ اسے کب کوئی رکاوٹ پیش آ جائے۔" (احمد' ابوداؤد)۔[2]

۱۔ حج کے فرض ہونے کی شرائط کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

۲۔ یہ اکثر سلف (جن میں امام ابوحنیفہؒ' ابویوسفؒ' مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ امام شافعیؒ' اوزاعیؒ' سفیان ثوریؒ اور (حنفیہ میں سے) امام محمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ حج کا فوراً ادا کرنا اگرچہ بہتر ہے اور اس میں احتیاط بھی ہے' لیکن ایسا کرنا واجب نہیں ہے۔ ان کے بہت سے دلائل میں سے ایک یہ

۶۔ حج کے فرض ہونے کی شرائط :

اس پر تمام ائمہ کا اجماع ہے کہ کسی شخص (مرد یا عورت) پر حج اس وقت فرض ہوتا ہے جب اس میں مندرجہ ذیل پانچ شرائط پائی جائیں۔

ا۔ وہ مسلمان ہو۔ اس لیے کہ دین کے احکام کے مخاطب صرف مسلمان ہیں۔

۲۔ ۳۔ وہ عاقل اور بالغ ہو' اس لیے کہ نابالغ اور مجنون کسی شرعی حکم کے مکلف نہیں ہیں۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تین شخص مرفوع القلم ہیں (یعنی کسی شرعی حکم کے مکلف نہیں ہیں) ایک سویا ہوا یہاں تک کہ وہ بیدار ہو جائے' دوسرا بچہ یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائے' اور تیسرا مجنون یہاں تک کہ اس کا جنون زائل ہو جائے۔" (ابو داؤد' ترمذی' ابن ماجہ)۔

۴۔ وہ آزاد ہو یعنی کسی کا غلام نہ ہو۔ اس لیے کہ حج ایک ایسی عبادت ہے جو کافی وقت اور مال چاہتی ہے۔ اس میں سواری اور زاد راہ کی شرط ہے۔ حالانکہ غلام اس کی استطاعت نہیں رکھتا۔ پھر غلام اپنی مرضی کا خود مالک بھی نہیں ہوتا۔

۵۔ خانہ کعبہ تک پہنچنے کی استطاعت۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا۔" (جو اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھے) [1] (المغنی ج ۳ ص ۱۶۱)۔

۷۔ حج کے لیے استطاعت کا مفہوم :

حج کی فرضیت کے لیے استطاعت شرط ہے (جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے) اس استطاعت کے مفہوم میں مندرجہ ذیل امور شامل ہیں :

ہے کہ حج اگرچہ ۶ھ میں فرض ہو گیا تھا' اس کے بعد مکہ معظمہ بھی ۸ھ میں فتح ہو گیا تھا۔ یعنی حج کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ ۹ھ میں آپؐ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو اقامت حج کے لیے روانہ فرمایا۔ لیکن آپؐ نے خود اور آپ کی ازواج مطہراتؓ نے اور تمام صحابہؓ نے ۱۰ھ میں حج فرمایا۔ (مختصراً از الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۱۹۔۲۱)۔

[1] ا۔ حج کی فرضیت کی ان پانچ شرائط پر اجماع کا ذکر المغنی کے مصنف نے اپنے علم کی حد تک کیا ہے۔ المحلّی (ج ۷ ص ۴۳) اور بدایۃ المجتہد (ج ۱ ص ۲۵۵) میں ہے کہ بعض ظاہریہ کے نزدیک غلام پر بھی (جب کہ اس میں بقیہ چار شرطیں پائی جاتی ہوں) حج فرض ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ حج کی فرضیت میں آزاد اور غلام کے درمیان تفریق کرنے کی قرآن یا حدیث سے براہ راست کوئی دلیل نہیں ہے۔

ا۔ ۲۔ زادراہ اور سواری : حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس نے سوال کیا۔ "اے اللہ کے رسول! (اللہ تعالیٰ کے ارشاد مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيلًا میں) سبیل سے کیا مراد ہے؟" آپؐ نے فرمایا "زادراہ اور سواری۔" (ترمذی)

یہی حدیث امام دارقطنیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ ابن عباسؓ انسؓ اور عائشہؓ سے بھی روایت کی ہے۔ (القریٰ لقاصد ام القریٰ ص ۴۰)۔

زادراہ سے مراد یہ ہے کہ انسان کے پاس (رہنے کے گھر اور ضرورت کے سامان کو چھوڑ کر) اتنا مال ہو جو اسکی مکہ معظمہ تک آمدورفت اور وہاں کے مصارف کے علاوہ اس کے پیچھے گھر والوں کی گزر اوقات کے لیے کافی ہو۔ سواری سے مراد آمدورفت کا ذریعہ ہے' خواہ یہ سواری اسکی اپنی ہو یا کرایہ کی۔ سواری کی یہ شرط صرف اس وقت ہے جب کہ مکہ معظمہ سے مسافت دور ہو۔ اگر مسافت کم ہو اور پیدل چل کر مکہ معظمہ پہنچنا ممکن ہو تو سواری کی شرط نہیں ہے۔[1]

۳۔ حاجی کو راستے میں کسی جانی یا مالی نقصان کا خطرہ نہ ہو' خواہ سفر خشکی کا ہو یا سمندر کا۔ اگر راستے میں خطرہ ہو تو حج فرض نہیں ہوتا۔[2]

۸۔ عورت کا حج :

عورت پر بھی حج اگرچہ اسی طرح فرض ہے جس طرح مرد پر' لیکن اس کے لیے استطاعت کے مفہوم میں (مذکورہ بالا امور کے علاوہ) ایک چیز یہ بھی شامل ہے کہ حج کے سفر میں اس کا خاوند یا کوئی محرم رشتہ دار (جیسے بھائی' بیٹا' چچا' ماموں وغیرہ) اس کے ساتھ ہو

ا۔ یہ امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ اور دوسرے اکثر ائمہ کا مسلک ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک لمبی مسافت کے باوجود اگر انسان پیدل چل کر مکہ معظمہ پہنچ سکتا ہو اور وہ مانگ کر کھا لینے کا عادی ہو' تو بھی اس پر حج فرض ہے۔ کیونکہ جب اسے یہ دو چیزیں میسر ہیں تو گویا وہ سواری بھی رکھتا ہے اور زاد راہ بھی' لیکن دوسرے ائمہ کا اس پر اتفاق نہیں ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۴۲)۔

۲۔ اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ البتہ امام ابو حنیفہؒ' مالکؒ اور احمد کے نزدیک حج سے رکنا صرف اس صورت میں جائز ہے' جبکہ خطرہ کا گمان غالب ہو۔ اگر گمان غالب سلامت رہنے کا ہو تو سفر کرنا فرض ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۴۳)۔

اگر اس کے ساتھ اس کا خاوند یا کوئی بھی محرم رشتہ دار نہ ہو' تو اس پر خود حج کرنا فرض نہیں۔ یہ شرط اس وقت ہے جبکہ مکہ معظمہ کی مسافت تین دن یا اس سے زیادہ کی ہو۔ اگر مسافت تین دن سے کم کی ہو' تو خاوند یا محرم رشتہ دار کی شرط نہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "کسی عورت کے لیے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو' یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ایک دن اور ایک رات کا سفر اپنے گھر والوں میں سے کسی محرم رشتہ دار کے بغیر کرے۔" دوسری روایت میں صرف "ایک رات" کا' تیسری روایت میں "تین دن اور تین رات" کا ذکر ہے۔ (بخاری' مسلم' احمد' مالک' ترمذی' ابن ماجہ' ابن خزیمہ)۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کوئی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک آدمی نے حاضر ہو کر عرض کیا۔ "میں فلاں غزوہ میں اپنا نام پیش کر چکا ہوں اور میری بیوی حج پر جا رہی ہے۔" آپؐ نے فرمایا "لوٹ جاؤ اور اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو" [1] (بخاری' مسلم' احمد)۔

---

[1]۔ یہ جمہور (جن میں امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ شامل ہیں) کا مسلک ہے۔

امام مالکؒ اور شافعیؒ کے نزدیک حج کے سفر میں عورت کے لیے خاوند یا محرم رشتہ دار کے ساتھ ہونے کی شرط نہیں ہے۔ اصل شرط امن یعنی کسی خطرے کا نہ ہونا ہے۔ لہٰذا امام مالکؒ کے نزدیک اگر عورت عورتوں کی کسی جماعت کے ساتھ جا سکتی ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک اگر وہ کسی بھی شریف عورت کے ساتھ جا سکتی ہے' تو اس پر خود حج کرنا فرض ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۴۴) (المغنی ج ۳ ص ۱۶۰) (الھدایۃ ج ۱ ص ۹۷)۔

امام ابن تیمیہؒ بھی عورت کے لیے حج کے سفر میں خاوند یا محرم کی شرط کے قائل نہیں ہیں (سبل السلام ج ۲ ص ۲۵۵)۔

واضح رہے کہ یہ سارا اختلاف صرف سفر حج کے متعلق ہے۔ ورنہ دوسرے تمام سفروں میں عورت کا اپنے خاوند یا کسی محرم رشتہ دار کے بغیر نکلنا تمام ائمہ کے نزدیک ناجائز ہے (گویا اوپر کی احادیث کو جمہور ہر سفر کے لیے۔۔۔ خواہ وہ حج کا ہو یا غیر حج کا حکم لیتے ہیں اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ انہیں (احادیث بالا) دوسرے سفروں کے لیے کہتے ہیں لیکن حج کے سفر کے لیے نہیں لیتے)۔ (الفتح الربانی حوالہ مذکورہ)

۹۔ بچے کا حج :

اس پر اجماع ہے کہ بچے پر اگرچہ حج فرض نہیں ہے' لیکن اگر وہ حج کرے' تو اس کا نفلی حج ہو جائے گا اور اس کا اسے ثواب ملے گا[1] (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۳۱)۔

حضرت سائب بن یزیدؓ سے روایت ہے کہ جس سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع فرمایا' مجھے بھی حج کرایا گیا' حالانکہ میں اس وقت سات سال کا تھا۔" (بخاری' احمد' ترندی)۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا اور ہمارے ساتھ عورتیں اور بچے بھی تھے۔ ہم نے بچوں کی طرف سے خود تلبیہ اور رمی جمار کیا۔" (احمد' ابن ماجہ)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے ۳۲ میل کے فاصلہ پر ایک مقام 'روحا میں تھے کہ آپ کو راستے میں ایک قافلہ ملا۔ آپؐ نے ان لوگوں کو سلام کیا اور دریافت فرمایا "کون لوگ ہیں ؟" انہوں نے جواب دیا "مسلمان"۔ ان لوگوں نے دریافت کیا۔ "آپ لوگ کون ہیں ؟" آپؐ نے فرمایا "میں اللہ کا رسول ہوں۔" ایک عورت (اس خیال سے) ڈرتے ہوئے بھاگی آئی (کہ کہیں موقع ہاتھ سے نہ نکل جائے) اور اپنے ایک بچہ کا بازو پکڑ کر اسے اونٹ کے کجاوے سے باہر نکالتے ہوئے دریافت کرنے لگی۔ "اے اللہ کے رسول! کیا اس کے لیے بھی حج ہے ؟" فرمایا "ہاں اور تمہارے لیے اجر ہے (یعنی اس بچہ کو حج کرانے کا ثواب ملے گا اور تمہیں حج کرانے کا)" (احمد' مسلم' ابو داؤد' نسائی)۔

اس پر بھی ایک غیر معروف فرقہ کے سوا سب کا اتفاق ہے کہ اگر کسی بچے نے تحمّل

---

[1] اس بارے میں اختلاف صرف یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک اگر بچہ حج کرے تو اس کے لیے احرام باندھنا ضروری نہیں ہے۔ اور اگر احرام کی حالت میں اس سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جائے' جس کا احرام کی حالت میں کرنا ناجائز ہے (تفصیل آگے احرام کے باب میں آئے گی) تو اس کے ذمہ قربانی ضروری نہ ہو گی۔ دوسروں کے نزدیک بچہ اگر حج کرے گا' تو احرام بھی لازمی طور پر باندھے گا' اور اگر احرام کی حالت میں کوئی ایسا کام سرزد ہو جائے جس کا احرام کی حالت میں کرنا ناجائز ہے' تو اس کے ذمہ قربانی بھی ضروری ہو گی۔ (الفتح القدیر شرح ہدایہ) (الفتح الربانی حوالہ مذکور بالا)۔

میں حج کیا ہو اور بڑے ہو کر اس پر حج فرض ہو جائے' تو اس کے لیے دوبارہ حج کرنا ضروری ہے۔ اس کا بچپن کا حج کافی نہ ہو گا۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ص ۳۱)۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس بچے نے حج کیا اور پھر وہ بالغ ہو گیا' اسے دوسرا حج کرنا چاہیے۔" (طبرانی)

۱۰۔ حج میں نیابت [1]:

(الف) حج کی فرضیت کے لیے صحت اور تندرستی شرط نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص مالدار ہو مگر اتنا کمزور' بوڑھا' مفلوج یا دائمی مریض ہو کہ خود حج کی مشقت برداشت نہ کر سکتا ہو' تو اس کے لیے خود حج نہ کرنا صحیح ہے۔ مگر اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنی طرف سے کسی دوسرے شخص کو خواہ وہ اس کا بیٹا یا کوئی اور حج کرائے۔ مرد کی طرف سے عورت اور عورت کی طرف سے مرد بھی حج کر سکتا ہے۔

حضرت فضل بن عباسؓ سے روایت ہے کہ قبیلہ خثعم کی ایک عورت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ "یا رسول اللہ! ان فریضة اللہ علی عبادہ فی الحج ادرکت ابی شیخا کبیرا لا یستطیع ان یثبت علی الراحلة' اناء حج عنہ؟" (اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ فریضہ حج میرے باپ کو اس حال میں پہنچا ہے کہ وہ اتنا بوڑھا ہے کہ سواری پر بیٹھا نہیں رہ سکتا تو کیا میں اس کی طرف سے حج کر لوں؟ فرمایا "ہاں" یہ واقعہ حجۃ الوداع کے موقع کا ہے۔ (بخاری' مسلم' احمد' ترمذی' ابو داؤد' نسائی' ابن ماجہ)[2]

۱۔ یعنی ایک شخص کی طرف سے اس کی زندگی میں کسی دوسرے شخص کا حج کرنا۔

۲۔ یہ امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ' ابن حزمؒ اور دوسرے اکثر ائمہ کا مسلک ہے۔ (المحلی ج ۷) المغنی ج ۳ ص ۱۷۷) (ہدایۃ ج ۱ص ۹۷) وغیرہ۔

امام مالکؒ کے نزدیک جو شخص خود حج نہ کر سکتا ہو' اس پر نہ خود حج کرنا فرض ہے اور نہ کسی دوسرے سے کرانا۔ ان کا استدلال اللہ تعالیٰ کے عام ارشاد "مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً" سے یہ ہے کہ چونکہ وہ خود حج نہیں کر سکتا' اس لیے وہ حج کی استطاعت ہی نہیں رکھتا۔ اوپر کی حدیث کے متعلق مالکیہ کا کہنا ہے کہ اس میں سائل نے بطور تبرع سوال کیا تھا۔ یعنی میرے بوڑھے باپ پر اگرچہ حج فرض نہیں رہا'

(ب) اس حدیث کی بنا پر بوڑھے یا کمزور یا بیمار پر جب کہ وہ مالدار ہو' حج بہر حال فرض ہے۔ خواہ وہ مالدار اس وقت ہوا ہو' جبکہ وہ معذور ہو چکا تھا' یا اس وقت جبکہ وہ ابھی تندرست و صحت مند تھا[1]

(ج) فرض حج صرف اس مریض کی طرف سے کیا جا سکتا ہے۔ جس کے صحت مند ہونے کی کوئی امید نہ ہو۔ جس شخص کے صحت مند ہونے کی امید ہو' اس کی طرف سے حج نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح مجنون کی طرف سے بھی حج نہیں کیا جا سکتا' کیونکہ وہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ قیدی کی طرف سے بھی حج نہیں کیا جا سکتا' کیونکہ اس کی رہائی ہو سکتی ہے۔ فقیر کی طرف سے بھی حج نہیں کیا جا سکتا' کیوں کہ وہ مالدار ہو سکتا ہے[2]

لیکن اگر میں اس کی طرف سے حج کر لوں' تو اسے ثواب مل جائے گا؟ بعض مالکیہ کہتے ہیں کہ سوال کرنے والے کا مقصد یہ تھا کہ اگرچہ میرے باپ کو حج اس وقت پہنچا ہے جبکہ وہ اس پر فرض نہیں رہا' لیکن اگر میں اس کی طرف سے حج کرنا چاہوں' تو کیا یہ میرے لیے جائز ہے؟۔۔۔ دوسرے مذاہب والے حدیث کے اس مطلب کو صحیح نہیں سمجھتے کیوں کہ بعض روایات میں اس بات کی تصریح ہے کہ سائل نے یہ سوال کیا تھا کہ "اگر میں اپنے باپ کی طرف سے حج کر لوں' تو کیا وہ اس کی طرف سے ادا ہو جائے گا؟" صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ یوں ہیں۔ "میرے باپ کے ذمہ فریضہ حج باقی ہے"۔ امام احمدؒ کی روایت کے الفاظ یوں ہیں کہ "میرے باپ پر حج فرض ہے۔" (مختصراً از فتح الباری ج ۴ ص ۴۴۰)۔

۱۔ یہ جمہور (جن میں امام شافعیؒ' امام احمدؒ اور عام محدثین شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک معذور پر جبکہ وہ مالدار ہو' حج صرف اس صورت میں فرض ہے جبکہ اس پر تندرستی و صحت کی حالت میں حج فرض ہو چکا ہو' اگر وہ مالدار معذور ہونے کے بعد ہوا ہے' تو اس پر حج فرض نہیں ہے۔ وہ نہ خود حج کرے گا اور نہ کسی دوسرے سے کرائے گا (فتح القدیر ج ۱ ص ۴۳۶) الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۶۱۶)۔۔۔ یہ حنفیہ کا عام مسلک ہے' لیکن بعض حنفی علماء جیسے امام ابن ہمامؒ نے اس کے بجائے پہلے مسلک کو اختیار کیا ہے (مختصراً از بذل المجہود ج ۳ جز ۱ ص ۱۱۱)۔

اس بارے میں امام مالکؒ کا مسلک ہم اوپر حاشیہ صفحہ گزشتہ) بیان کر چکے ہیں۔ یعنی یہ کہ جو شخص معذور ہے' اس پر حج کسی حال میں فرض نہیں ہے۔

۲۔ اس پر ان تمام ائمہ کا اتفاق ہے جن کے نزدیک حج میں نیابت جائز ہے جیسے امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ اور ابن حزم وغیرہ۔ (فتح الباری)۔

(د) ایک شخص کی طرف سے دوسرا شخص صرف اس صورت میں حج کر سکتا ہے' جبکہ وہ پہلے اپنا حج ادا کر چکا ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو یہ کہتے سنا "لبیک عن شبرمہ" (شبرمہ کی طرف سے لبیک)۔ آپؐ نے اس سے دریافت فرمایا "یہ شبرمہ کون ہے؟" اس نے جواب دیا "میرا ایک بھائی یا رشتہ دار" آپؐ نے فرمایا "کیا تم نے اپنی طرف سے حج کر لیا؟" اس نے جواب دیا "نہیں۔" فرمایا "تو پہلے تم اپنی طرف سے حج کرو' پھر شبرمہ کی طرف سے بھی حج کر لینا۔"[1] (ابو داؤد' نسائی' ترمذی' ابن ماجہ' خزیمہ)۔

(ہ) اگر بیمار نے صحت سے مایوس ہو کر اپنا حج کسی دوسرے شخص سے کرا لیا ہو' لیکن بعد میں وہ خود بھی صحت یاب ہو جائے' تو اس کے لیے اپنا حج خود کرنا ضروری ہے' اس لیے کہ اس کے صحت یاب ہو جانے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس کی بیماری دائمی نہ تھی۔[2]

۱۔ یہ جمہور (جن میں امام شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ اور عام محدثین شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ حنفیہ کے نزدیک ایک شخص کا کسی دوسرے کی طرف سے حج کرنا' جبکہ اس نے ابھی اپنا حج نہ کیا ہو' ناجائز نہیں بلکہ مکروہ ہے۔ ان کا استدلال ان عام احادیث سے ہے (جیسے حضرت فضلؓ کی مذکورہ بالا حدیث) جن میں ایک شخص کو دوسرے شخص کی طرف سے حج کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کے متعلق ان کا کہنا یہ ہے کہ اول تو اس کی سند میں کلام کیا گیا ہے۔ اکثر محدثین نے اسے موقوف قرار دیا ہے یعنی یہ کہ اس میں حضرت ابن عباسؓ کا اپنا قول نقل کیا گیا ہے نہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث۔ پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اپنا حج کیے بغیر دوسرے کی طرف سے حج کرنا مکروہ ہے' نہ کہ ناجائز۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یا حضرت ابن عباسؓ نے اس شخص کو بہتر اور افضل طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا تھا۔" (مختصر الازہار المجبور ج ۳ جز ۳ ص ۱۱۔ ۱۱۲) نیل الاوطار ج ۴ ص ۳۔ ۳) (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۱۱۳)۔

اس بارے میں امام مالکؒ کا مسلک بھی امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کے مطابق ہے' جبکہ میت کی طرف سے حج کیا جائے۔ (رہا ایک شخص کی طرف سے کسی کا اس کی زندگی ہی میں حج کرنا' تو امام مالکؒ اس کے قائل ہی نہیں ہیں' جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔۔۔۔ (بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۲۵۴)۔

۲۔ یہ جمہور (جن میں امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ امام احمدؒ' امام اسحاقؒ اور امام ابن حزمؒ کے نزدیک اس شخص کے لیے دوبارہ حج کرنا ضروری نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح اس

۱۱۔ میت کے حج کی قضا :

اگر کسی شخص پر مالدار ہونے کی وجہ سے یا حج کی نذر مان لینے کی وجہ سے حج فرض ہو چکا ہو' لیکن وہ حج کیے بغیر مر جائے' تو اس کی طرف سے حج کیا جا سکتا ہے' خواہ وہ اس کی وصیت کر جائے یا نہ کر جائے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ قبیلہ جہینہ کی ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس سے سوال کیا "میری ماں نے نذر مانی تھی کہ حج کرے گی' لیکن وہ حج کیے بغیر مر گئی۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں ؟" فرمایا "ہاں تم اس کی طرف سے حج کرو۔ تم یہ بتاؤ کہ اگر تمہاری ماں کے ذمہ کچھ قرضہ ہوتا تو کیا تم اسے ادا کرتیں ؟ اللہ کا قرض ادا کرو' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ادائیگی کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔" (بخاری)۔

حضرت بریدہ اسلمیؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک عورت آئی اور اس نے سوال کیا۔ "میری ماں حج کیے بغیر مر گئی۔ کیا اگر میں اس کی طرف سے حج کروں' تو اس کی طرف سے ادا ہو جائے گا ؟" آپؐ نے فرمایا "ہاں"۔ (احمد' مسلم' ابو داؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک آدمی نے حاضر ہو کر سوال کیا میرے باپ نے اسلام کا (عائد کردہ) فریضہ حج ادا نہیں کیا تھا" آپؐ نے فرمایا "تم یہ بتاؤ کہ اگر تمہارے باپ کے ذمہ کچھ قرضہ ہوتا' تو کیا تم اسے ادا کرتے ؟" اس نے جواب دیا "جی ہاں" فرمایا "تو یہ بھی اس کے ذمہ قرضہ ہے' اسے ادا کرو"۔[1]

پہ دو حج فرض ہو جائیں گے' حالانکہ شریعت میں ایک شخص پر ایک ہی حج فرض ہے (نیل الاوطار ج ۴ ص ۳۶)(محلی ج ۷)

۱۔ یہ امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ' سفیان ثوریؒ' اسحاق' عبداللہ بن مبارکؒ اور دوسرے اکثر ائمہ کا مسلک ہے۔ (ترمذی)(موطا امام محمد بحوالہ تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۱۳)۔

امام مالکؒ کے نزدیک میت کی طرف سے حج نہیں کیا جا سکتا' ہاں اگر وہ وصیت کر جائے اور اس

۱۲۔ حج کے دوران تجارت و مزدوری کرنا:

اس پر اجماع ہے کہ حج کے دوران کسب معاش کے لیے تجارت یا مزدوری کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ (بذل المجہود ج ام ۳ ص ۸۲)۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ شروع میں لوگ حج کے دوران منیٰ‘ عرفات اور ذی المجاز میں خرید و فروخت کیا کرتے تھے۔ پھر وہ احرام کی حالت میں خرید و فروخت کرنے سے ڈر گئے‘ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (البقرہ۔ ۱۹۸) (بخاری‘ مسلم‘ نسائی)۔

اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ‘ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ابو امامہ تیمیؒ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ سے عرض کیا کہ میں اس علاقہ میں (یعنی حج کی جگہوں میں) کرایہ پر سواریاں دیتا ہوں اور بعض لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ تمہارا کوئی حج نہیں ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا۔ "کیا آخر تم احرام نہیں باندھتے؟ تلبیہ نہیں کرتے؟ کعبہ کا طواف نہیں کرتے؟ عرفات تک نہیں جاتے؟ اور رمی جمار نہیں کرتے؟" میں نے عرض کیا "کیوں نہیں؟" فرمایا "تو تمہارا حج ہے۔ ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہی سوال کیا‘ جیسا تم نے مجھ سے کیا۔ آپؐ خاموش رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آیت " لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ " نازل فرمائی۔ آپؐ نے اس شخص کو بلا بھیجا اور اسے یہ آیت پڑھ کر سنائی اور اس سے فرمایا "تمہارا حج ہے۔" (ابو داؤد‘ سعید بن منصور)۔

حضرت ابن عباسؓ سے ایک آدمی نے دریافت کیا۔ "میں حاجیوں کی مزدوری

کے ترکہ کا تہائی حصہ دوسرے مصارف کو نکال کر حج کے مصارف کے لیے کافی ہو‘ تو اس کی طرف سے حج کیا جا سکتا ہے۔ (ترمذی) (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا ص ۲۰۶) وغیرہ۔۔۔۔ امام مالکؒ کے اس مسلک کی بنیاد حضرت ابن عمرؓ کے اس قول پر ہے کہ "کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی طرف سے روزہ نہ رکھے‘ نہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی طرف سے نماز پڑھے اور نہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی طرف سے حج کرے۔ میرے نزدیک تو دوسرے شخص کی طرف سے غلام آزاد کر دینا یا صدقہ کر دینا زیادہ بہتر ہے۔"

کرتا ہوں اور ان کے ساتھ مناسکِ حج ادا کرتا ہوں کیا میرے لیے اجر ہے؟ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا "ہاں" اور پھر یہ آیت تلاوت کی:

أُولٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللّٰهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ (بیہقی، دار قطنی) (البقرہ: ۲۰۲)	ایسے لوگ اپنی کمائی کے مطابق (دونوں جگہ) حصہ پائیں گے، اور اللہ کو حساب چکاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔

عمرہ کے احکام

ا۔ لغوی اور شرعی معنی :

عمرہ کے لغوی معنی بھی کسی جگہ کا قصد کرنے کے ہیں' لیکن اس کے اصطلاحی یا شرعی معنی خانہ کعبہ کا قصد کرنے کے ہیں۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ص ۲)۔

۲۔ فضیلت اور ثواب (خصوصاً رمضان میں) :

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حج اور عمرہ کے درمیان متابعت کرو (یعنی انھیں بار بار کرو) اس لیے کہ یہ فقر اور گناہوں کو اس طرح دور کر دیتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے' سونے اور چاندی کے میل کو دور کر دیتی ہے۔" (احمد' ابوداؤد' ترمذی)۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حج مبرور کا اجر جنت سے کچھ کم نہیں اور دو عمرے ان گناہوں کا کفارہ ہیں جو ان کے درمیان کیے گئے ہوں۔" (مسلم' احمد' نسائی وغیرہ)۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کی ایک عورت سے فرمایا۔۔۔ (حضرت ابن عباسؓ نے اس عورت کا نام بھی بتایا لیکن بعد کا راوی بھول گیا)۔ "اس سال تم نے ہمارے ساتھ حج کیوں نہ کیا؟" اس نے جواب دیا "اے اللہ کے نبی! ہمارے پاس صرف دو اونٹ تھے۔ ایک اونٹ پر میرا بیٹا' اور اس کے والد چلے گئے اور ایک اونٹ ہمارے پاس رہ گیا' جس پر ہم (یہاں اپنی ضروریات کے لیے) سواری کرتے ہیں۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب رمضان آئے' تو اس میں عمرہ کر لو' اس لیے کہ اس میں عمرہ حج کے برابر ہے۔" (بخاری' مسلم' احمد وغیرہ)۔

۳۔ وقت :

حج متعین دنوں میں کیا جاتا ہے' لیکن عمرہ کے لیے کوئی متعین وقت نہیں ہے یہ سال کے ہر حصہ میں کیا جاسکتا ہے۔

(الف) حج سے پہلے : عکرمہ بن خالد کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ سے دریافت کیا کہ حج سے پہلے عمرہ کیسا ہے؟ انہوں نے جواب دیا "کوئی شخص اگر حج کرنے سے پہلے عمرہ کرتا ہے تو اس میں کوئی ہرج نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حج سے پہلے عمرہ کیا۔" (بخاری' احمد' بیہقی' ابو داؤد' ابن خزیمہ)۔

(ب) حج کے ساتھ : نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بھر میں چار عمرے فرمائے۔ ان میں سے پہلے تین ذی القعدہ میں تھے اور چوتھا آپ کے حج کے ساتھ۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ص ۷۳)۔

(ج) حج کے بعد : حضرت عائشہؓ سے حج کے بعد عمرہ کرنے کے متعلق دریافت کیا گیا' تو انہوں نے جواب دیا۔ "(حج کے بعد ہی تو) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ساتھ میرے بھائی (عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ) کو بھیجا' تو میں حدود حرم سے نکل گئی' پھر میں نے عمرہ کیا۔"[1] (احمد)

فائدہ : جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں' عمرہ سال کے ہر حصہ میں کیا جا سکتا ہے' لہذا رجب میں بھی عمرہ ہو سکتا ہے۔ لیکن' جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں' اس مہینے میں عمرہ کی خصوصی فضیلت نہیں ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کو یہ وہم تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب میں بھی عمرہ کیا' لیکن حضرت عائشہؓ نے جب اس کی تردید کی' تو حضرت ابن عمرؓ خاموش ہو گئے (احمدؒ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب میں کوئی عمرہ نہیں کیا۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں "اگر یہ کہا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے قریش کے ساتھ رجب میں عمرہ کیا' کیونکہ قریش رجب میں عمرہ کیا کرتے تھے' تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو قریش کا رجب میں عمرہ کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے اگر یہ مان لیا جائے' تو اس سے یہ ضروری نہیں کہ آپؐ نے ان کا ساتھ دیا ہو گا' اور اگر یہ بھی مان لیا جائے' تو آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ آپؐ نے ان کے ساتھ صرف ایک ہی مرتبہ عمرہ کیا اور پھر کبھی نہ کیا؟" (حوالہ الفتح الربانی ج ۱۱ص ۷۱)۔

---

[1] سال کے ہر حصہ میں عمرہ کے جواز پر جمہور کا اتفاق ہے۔ البتہ امام ابو یوسفؒ عرفہ کے دن (۹ ذی الحجہ' اور امام ابو حنیفہؒ عرفہ اور قربانی کے دن (۹ و ۱۰ ذی الحجہ) اور ایام تشریق (ذی الحج کی ۱۲' ۱۳' ۱۴ تاریخ) میں عمرہ کرنے کو صحیح نہیں سمجھتے۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ص ۵۷) (ہدایہ ج ۱ص ۹۸)۔

۴۔ حکم :

حج کی طرح عمرہ کا بھی عمر بھر میں ایک مرتبہ کرنا فرض اور بعد میں کرنا نفل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ۔ (البقرہ : ۱۹۶)

اور اللہ کے لیے حج اور عمرہ پورا کرو (یعنی انھیں قائم کرو)۔

اس آیت میں چونکہ حج کے ساتھ عمرہ کو بھی قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے لہٰذا جس طرح حج فرض ہے' اسی طرح عمرہ بھی فرض ہے۔ نیز :

حضرت ابو زرین عقیلیؓ سے روایت ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا "میرا باپ بہت بوڑھا ہو گیا ہے' نہ حج کر سکتا ہے' نہ عمرہ اور نہ سفر۔" فرمایا "تو تم اپنے باپ کی طرف سے حج اور عمرہ کرو۔" (ابو داؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' بیہقی)۔

حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حج اور عمرہ دونوں فرض ہیں' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم کس سے ابتدا کرتے ہو۔"[۱] (دارقطنی)۔

۱۔ یہ امام شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ' داؤد ظاہریؒ' اسحاقؒ' سفیان ثوریؒ اور بہت سے دوسرے فقہاء کا مسلک ہے۔ اس کی روایت صحابہؓ میں سے حضرت عمرؓ' عبد اللہ بن عباسؓ' عبد اللہ بن عمرؓ اور جابرؓ سے اور تابعین میں سے طاؤسؒ' سعید بن مسیبؒ' سعید بن جبیرؒ' ابن سیرینؒ' حسن بصریؒ' شعبیؒ اور مسروقؒ سے ملتی ہیں' اور اسی کو امام بخاریؒ اور دوسرے بہت سے محدثین نے اختیار کیا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ' مالکؒ اور ابو ثورؒ کے نزدیک عمرہ فرض نہیں سنت ہے۔ اسی کی روایت صحابہؓ میں سے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور تابعین میں سے ابراہیم نخعیؒ سے ہے۔ ان کا استدلال مندرجہ ذیل احادیث سے ہے :

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک بدو حاضر ہوا اور اس نے سوال کیا "اے اللہ کے رسول! مجھے بتایئے کہ کیا عمرہ فرض ہے؟" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "نہیں۔ ہاں اگر تم عمرہ کرو' تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے" (ترمذی' احمد' بیہقی' ابن ابی شیبہ)۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حج جہاد ہے اور عمرہ تطوع (نفل) ہے۔" (بیہقی' ہیثمی)۔

وجہ اختلاف: پہلے مذہب والوں کے نزدیک اللہ تعالی کے ارشاد "وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ" میں اتمام (پورا کرنے) کا مطلب قائم کرنا ہے۔ اس لیے یہ حکم ہر شخص کے لیے ہے' خواہ وہ عمرہ میں داخل ہو چکا ہو یا نہ ہو چکا ہو۔ دوسرے مذہب والوں کے نزدیک اتمام کا حکم صرف اس شخص کے لیے ہے جس نے احرام باندھ لیا ہو اور وہ عمرہ میں داخل ہو چکا ہو۔ اس وقت اسے یہی حکم ہے کہ وہ عمرہ کے مناسک پورے کرے اور انہیں ادھورا نہ چھوڑے' کیونکہ کوئی کام خواہ وہ نفلی ہو' جب شروع کر لیا جائے تو اسے پورا کرنا ضروری ہے۔

جن احادیث سے پہلے مذہب والے استدلال کرتے ہیں' ان میں سے حضرت ابو زرینؓ کی حدیث کے متعلق دوسرے مذہب والوں کا کہنا یہ ہے کہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف یہ بتایا ہے کہ بوڑھے اور کمزور شخص کی طرف سے کوئی دوسرا شخص عمرہ کر سکتا ہے' نہ یہ کہ اس پر عمرہ کرنا ضروری بھی ہے۔ کیونکہ کسی شخص کی طرف سے دوسرے شخص کا حج کرنا بھی صرف جائز ہے نہ کہ ضروری۔ دوسری حدیث (یعنی حضرت زید بن ثابتؓ کی حدیث) کے متعلق ان کا کہنا یہ ہے کہ اس کی سند کمزور ہے لہذا یہ قابلِ حجت نہیں (جب کہ پہلے مذہب والے اس کی سند کو صحیح قرار دیتے ہوئے اسے قابلِ حجت مانتے ہیں۔)

جن احادیث سے دوسرے مذہب والے استدلال کرتے ہیں' ان میں سے حضرت جابرؓ کی حدیث کی سند کے متعلق اختلاف ہے۔ امام ترمذیؒ نے اسے حسن صحیح اور دوسرے تمام محدثین نے کمزور قرار دیا ہے۔ اس وجہ سے دوسرے مذہب والے اسے قابلِ حجت سمجھتے ہیں اور پہلے مذہب والے اسے قابلِ حجت نہیں سمجھتے۔

دوسری حدیث (یعنی حضرت ابن عباسؓ کی حدیث' کی سند کمزور ہے۔ لہذا یہ پہلے مذہب والوں کے نزدیک قابل حجت نہیں۔ لیکن دوسرے مذہب والوں کے نزدیک یہ اس لیے قابلِ حجت ہے۔ کہ یہ اپنے مضمون میں تنہا نہیں۔ بلکہ حضرت جابرؓ کی مذکورہ حدیث اور بعض دوسری احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۶۰) (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۱۱۳) (الکوکب الدری ج ۱ ص ۲۹۵) وغیرہ۔

نوٹ: (۱) اس مسئلہ میں دونوں مذہب والے بعض اور احادیث سے بھی استدلال کرتے ہیں' لیکن اختصار کے خیال سے ہم نے دونوں طرف کی صرف دو دو احادیث کا ذکر کیا ہے۔ دوسری احادیث کے متعلق بھی اختلاف اسی طرح کا ہے۔

---

(۲) اکثر اہلحدیث علماء نے اگرچہ پہلے مسلک کو اختیار کیا ہے لیکن قاضی شوکانیؒ نے نیل الاوطار میں دوسرے مسلک کو صحیح قرار دیا ہے اور اس کی پر زور تائید کی ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے نیل الاوطار ج ۴ ص ۲۹۵۔۲۹۷)۔

مناسک حج و عمرہ کی ترتیب

حج و عمرہ کے مناسک کی ترتیب و کیفیت متعدد احادیث سے معلوم ہوتی ہے' لیکن اس بارے میں سب سے مفصل اور جامع حدیث حضرت جابر بن عبداللہؓ کی ہے جس میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حجۃ الوداع کی مفصل روداد بیان کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ حج فرض ہو جانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک ہی حج فرمایا ہے۔ یہی آپ کا آخری حج (حجۃ الوداع) تھا اور اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو بار بار تاکید فرماتے تھے خُذُوْا عَنِّیْ مَنَاسِکَکُمْ (مجھ سے۔۔۔ یعنی میرے عمل کو دیکھ کر۔۔۔ اپنے مناسک سیکھ لو)۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ کی اس حدیث کو امام احمدؒ' مسلمؒ' ابوداؤدؒ اور ابن ماجہ نے مفصل طور پر اور امام ترمذی اور نسائی نے مختصر طور پر روایت کیا ہے۔ (ذیل میں ہم اسے امام مسلمؒ کی روایت کے مطابق درج کرتے ہیں اور جہاں اس حدیث میں حج کے بعض مناسک کا ذکر رہ گیا ہے وہاں ہم بعض دوسرے صحابہؓ کی روایات کو نقل کریں گے۔

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نو سال (مدینہ منورہ میں) ٹھہرے رہے اور آپؐ نے اس عرصہ میں کوئی حج نہیں فرمایا۔ پھر دسویں سال آپؐ نے لوگوں میں یہ اعلان کرایا کہ آپؐ حج کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ (شرف ہمرکابی کے لیے) لوگوں کی ایک کثیر تعداد مدینہ پہنچ گئی۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو دیکھ کر اسی کے مطابق خود بھی عمل کرے۔ ہم آپؐ کے ساتھ (مدینہ منورہ سے) روانہ ہوئے۔ جب ہم (مدینہ منورہ سے پانچ میل کے فاصلہ پر ایک مقام) ذوالحلیفہ پہنچے' تو (حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیوی) حضرت اسماء بنت عمیسؓ کے ہاں محمد بن ابی بکرؓ پیدا ہوئے۔ حضرت اسماءؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پیغام بھیجا اور دریافت کیا کہ میں کیا کروں؟ آپؐ نے فرمایا "تم غسل کر لو اور پھر خون کی جگہ پر کپڑا باندھ کر احرام باندھ لو۔"

(اگلے روز) مسجد میں (ظہر کی) نماز پڑھ کر حضورؐ (اپنی اونٹنی) قصواء پر سوار ہوئے۔ جب آپؐ کی اونٹنی کھڑی ہو گئی' تو میں نے دیکھا کہ جہاں تک نگاہ جاتی تھی' آپؐ کے سامنے' آپؐ کے دائیں' آپؐ کے بائیں اور آپؐ کے پیچھے ہر طرف پیدل اور سوار لوگوں کا

ہجوم نظر آرہا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تھے۔ آپؐ پر قرآن نازل ہوتا تھا۔ آپؐ اس کی تفسیر جانتے (اور لوگوں کو سمجھاتے) تھے اور آپؐ جو بھی عمل فرماتے' ہم بھی وہی کرتے۔ (جب اونٹنی کھڑی ہو گئی) تو آپؐ نے بآواز بلند تلبیہ فرماتے ہوئے یہ الفاظ کہے :

لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ' لَبَّیْکَ	اے اللہ! ہم تیرے سامنے حاضر ہیں'
لَاشَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ' اِنَّ الْحَمْدَ	تیرا کوئی شریک نہیں ہے۔ ہم حاضر
وَالنِّعْمَۃَ لَکَ وَالْمُلْکَ'	ہیں' تعریف اور نعمت سب تیری ہے'
لَاشَرِیْکَ لَکَ۔	اور بادشاہت و سلطنت بھی تیری ہے۔
	تیرا کوئی شریک نہیں۔

لوگوں نے بھی تلبیہ کہا جیسا کہ وہ (آج) کہتے ہیں' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس کی کسی چیز سے منع نہیں فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برابر تلبیہ فرماتے رہے۔

ہماری نیت صرف حج کی تھی۔ عمرے کا ہمیں علم نہیں تھا۔ جب ہم آپؐ کے ساتھ (مکہ معظمہ پہنچے اور) مسجد حرام میں داخل ہوئے' تو آپؐ نے حجر اسود کا استلام فرمایا۔ پھر آپ نے (طواف شروع کیا) پہلے تین چکروں میں [1] رمل فرمایا اور باقی چار چکروں میں معمولی رفتار سے چلے۔ پھر آپ مقام ابراہیم کی طرف تشریف لائے اور یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاھِیْمَ مُصَلًّی۔ (البقرہ: ۱۲۵)	اور مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بناؤ۔

پھر آپ اس طرح کھڑے ہوئے کہ مقام ابراہیم آپؐ کے اور خانہ کعبہ کے درمیان تھا [2]

آپؐ دونوں رکعتوں میں سورۃ قل ھو اللہ احد اور قل یا ایھا الکافرون پڑھ رہے تھے۔ [3] پھر آپؐ حجر اسود کی طرف واپس آئے اور اس کا استلام فرمایا۔ پھر آپ

۱۔ رمل یعنی آہستہ آہستہ دوڑنا۔

۲۔ نسائی کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے دو رکعتیں نماز پڑھی اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔

۳۔ ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے سورہ قل یا ایھا الکافرون اور قل ھو اللہ احد پڑھیں۔

دروازے (بابِ صفا) سے صفا کی طرف روانہ ہوئے۔ جب صفا کے قریب پہنچے تو آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ۔ (البقرہ: ۱۵۸)

بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا۔ جس چیز کا ذکر اللہ تعالیٰ نے (اس آیت میں) پہلے فرمایا ہے' میں بھی اس سے ابتداء کروں گا۔[1] چنانچہ آپؐ نے صفا سے ابتداء فرمائی اور اس پر چڑھ گئے۔ جب آپؐ کو کعبہ نظر آنے لگا' تو قبلہ رخ ہو گئے۔ اور اللہ کی توحید اور بڑائی (اللہ اکبر) بیان کرتے رہے اور پھر یہ دعا پڑھی:

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ۔ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ أَنْجَزَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ ۔۔۔ الْأَحْزَابَ وَحْدَهٗ۔

اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کی بادشاہت ہے۔ اور اسی کو حمد و تعریف زیبا ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ صرف ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا' اسی نے اپنے بندے کی مدد فرمائی اور تمام قبائل کو صرف اسی نے شکست دی۔

ہر مرتبہ اس کے بعد کچھ ٹھہر کر دعا مانگتے تھے اور پھر یہی کلمات فرماتے تھے۔ پھر صفا سے اتر کر مروہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب نشیب میں پہنچے'[2] تو سعی فرمائی (یعنی دوڑ کر چلے) جب ہم چڑھے (یعنی نشیب ختم ہو گیا) تو (عام رفتار سے) چلنے لگے۔ جب مروہ پہنچے تو وہاں بھی اس قدر چڑھے کہ کعبہ نظر آنے لگا۔ یہاں بھی آپؐ نے اسی طرح دعا مانگی' جس طرح صفا پر مانگی تھی۔ اس طرح سات چکر پورے کرنے کے بعد جب آپ مروہ پر تھے۔ تو آپؐ نے فرمایا "اگر مجھے پہلے معلوم ہو جاتا' تو میں اپنے ساتھ ھدی (قربانی کا جانور) نہ لاتا' اور

---

[1] نسائی کی روایت میں امر کا صیغہ ہے۔ یعنی جس چیز کا ذکر اللہ تعالیٰ نے پہلے فرمایا ہے' تم بھی اسی سے ابتداء کرو۔

[2] یعنی اس جگہ جس کے دونوں طرف اب سبز رنگ کے ستون بنے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں جگہ نشیب وادی تھی۔

اپنے احرام کو (جو عمرہ اور حج کا ہے صرف) عمرہ کا بنا لیتا۔ لہٰذا جس شخص کے پاس ھدی نہیں ہے' اسے احرام کھول لینا چاہیے' اور اپنے احرام کو عمرہ کا احرام بنا لینا چاہیے۔" ایک شخص سراقہ بن مالکؓ کھڑا ہوا اور اس نے پوچھا' اے اللہ کے رسول! کیا یہ حکم صرف اسی سال کے لیے ہے یا ہمیشہ کے لیے ہے؟" حضورؐ نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے کے اندر ڈالا اور آپ نے دو مرتبہ فرمایا "نہیں' عمرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حج میں داخل ہو گیا"۔[1]

حضرت علیؓ یمن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اونٹ لے کر پہنچ گئے۔ انہوں نے حضرت فاطمہؓ کو دیکھا کہ انہوں نے احرام کھول لیا ہے' رنگین کپڑے پہن لیے ہیں اور سرمہ لگا لیا ہے۔ یہ چیز حضرت علیؓ کو ناگوار گزری' تو حضرت فاطمہؓ نے کہا "اس کا حکم مجھے میرے ابا جان (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دیا ہے۔"

(بعد میں) حضرت علیؓ (یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے) عراق میں کہا کرتے تھے کہ میں اس کے بعد فاطمہؓ کے خلاف غصہ میں بھرا ہوا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا' تاکہ آپؐ سے دریافت کروں کہ کیا واقعی آپؐ نے فاطمہؓ کو یہ حکم دیا ہے؟ میں نے آپ کو بتایا کہ فاطمہؓ کا یہ کام مجھے سخت ناگوار گزرا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "وہ سچ کہہ رہی ہے' وہ سچ کہہ رہی ہے۔ تم بتاؤ کہ جب تم نے حج کی نیت کی' تو تم نے کیا الفاظ کہے تھے؟" میں نے کہا "میں نے یہ الفاظ کہے تھے کہ اے اللہ! جو نیت تیرے رسول نے کی ہے' وہی میری بھی نیت ہے۔" آپؐ نے فرمایا "تو میرے ساتھ تو ھدی ہے۔ لہٰذا تم احرام نہ کھولو۔" جتنے اونٹ حضرت علیؓ یمن سے لائے تھے' اور جتنے اونٹ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے ساتھ لائے تھے' ان سب کی مجموعی تعداد سو تھی۔

چنانچہ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان لوگوں کے سوا جن کے ساتھ ھدی تھی' تمام لوگوں نے احرام کھول لیا اور تقصیر کر لی (یعنی اپنے سروں کے بال کٹوا لیے)۔

جب یوم الترویہ (یعنی ۸ ذی الحجہ) آیا' تو سب لوگ منیٰ کی طرف روانہ ہوئے اور انہوں نے حج کی نیت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (جو اپنے اسی احرام میں تھے) بھی سوار

1۔ عمرہ کے حج میں داخل ہونے کے ائمہ نے تین مطلب لیے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان حج کی نیت کرے لیکن پھر عمرہ کی نیت کر کے فارغ ہو جائے۔ دوسرا یہ کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کا کرنا جائز ہے۔ تیسرے یہ کہ عمرے کے افعال حج کے اعمال میں داخل ہیں۔

ہو کر منیٰ پہنچ گئے۔ وہاں آپؐ نے ظہر' عصر' مغرب' عشا اور فجر کی (پانچ) نمازیں ادا فرمائیں۔

فجر کی نماز کے بعد آپ کچھ دیر ٹھہرے رہے' جب سورج طلوع ہو گیا تو آپؐ نے حکم دیا۔ جس کے مطابق آپؐ کے لیے وادیِ نمرہ (عرفات سے قریب ایک وادی) میں خیمہ لگا دیا گیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہوئے۔ قریش کو یقین تھا کہ آپ مشعر حرام پر جا کر رک جائیں گے [1] جیسا کہ قریش جاہلیت میں کیا کرتے تھے' لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے' یہاں تک کہ عرفات پہنچ گئے۔ وہاں آپؐ نے وادیِ نمرہ میں اپنے لیے خیمہ لگا ہوا پایا۔ آپؐ نے اس میں قیام فرمایا۔ جب سورج ڈھل گیا' تو آپؐ نے اپنی اونٹنی' قصواء کو تیار کرنے کا حکم دیا' جو تیار کر دی گئی۔ آپؐ وادی کے نشیب (جہاں اب مسجد نمرہ بنی ہوئی ہے) میں تشریف لائے اور لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔

إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ حَرَامٌ عَلَيْكُمْ، كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا فِي شَهْرِكُمْ هَذَا فِي بَلَدِكُمْ هَذَا۔ أَلَا إِنَّ كُلَّ شَيْءٍ مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ تَحْتَ قَدَمَيَّ مَوْضُوعٌ، وَدِمَاءُ الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعَةٌ۔ وَإِنَّ أَوَّلَ دَمٍ

تمہاری جانیں' تمہارا مال' تمہاری عزت و آبرو ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں۔ جس طرح یہ دن' یہ شہر اور یہ مہینہ باحرمت ہیں۔ جاہلیت کے تمام دستور میں اپنے قدموں کے نیچے پامال کرتا ہوں۔ جاہلیت کے قتلوں کے تمام

---

[1] مشعر حرام سے مراد مزدلفہ میں وہ جگہ ہے جہاں اب مسجد مشعر حرام بنی ہوئی ہے۔ پورے مزدلفہ کو بھی مشعر حرام کہہ دیا جاتا ہے۔ اسلام سے پہلے قریش کی عادت تھی کہ وہ تمام عرب کے خلاف اپنی خصوصیت اور امتیاز ظاہر کرنے کے لئے مزدلفہ سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ کیونکہ مزدلفہ کے بعد حرم کی حدود ختم ہو جاتی ہیں اور قریش کہا کرتے تھے کہ ہم اہل حرم ہیں اس لیے حرم سے باہر نہ نکلیں گے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی ان کو یقین تھا کہ آپؐ بھی مزدلفہ سے آگے نہ بڑھیں گے' مگر آپؐ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ثم افیضوا من حیث افاض الناس (پھر جہاں سے اور لوگ پلٹتے ہیں' وہیں سے تم بھی پلٹو) کے مطابق عام مسلمانوں کے ساتھ عرفات تک گئے۔

اَضَعُ مِنْ دِمَائِنَا دَمُ ابْنِ رَبِيعَةَ بِنْ الْحَارِثِ' كَانَ مُسْتَرْضِعًا فِيْ بَنِيْ سَعْدٍ' فَقَتَلَتْهُ هُذَيْلٌ' وَرِبَا الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعَةٌ۔ وَاَوَّلَ رِبًا اَضَعُ مِنْ رِبَانَا رِبَا عَبَّاسِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ فَإِنَّهُ مَوْضُوعٌ كُلُّهُ۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ فِي النِّسَآءِ فَاِنَّكُمْ اَخَذْتُمُوهُنَّ بِاَمَانِ اللّٰهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوْجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللّٰهِ۔ وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ اَنْ لَّا يُوْطِئْنَ فُرُشَكُمْ اَحَدًا تَكْرَهُوْنَهُ' فَاِنْ فَعَلْنَ ذَالِكَ فَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ۔ وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ وَقَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهُ اِنْ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ كِتَابَ اللّٰهِ۔ وَاَنْتُمْ تُسْئَلُوْنَ عَنِّيْ فَمَا اَنْتُمْ قَائِلُوْنَ؟

جھگڑے ملیامیٹ کرتا ہوں اور سب سے پہلے اپنے خاندان کا خون یعنی ربیعہ بن حارث کے فرزند کا خون کالعدم کرتا ہوں جس کو قبیلہ ہذیل نے جب کہ وہ قبیلہ بنی سعد میں شیر خوار تھے' قتل کر دیا تھا۔ جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیے گئے۔ اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا سود (یعنی اپنے چچا) عباس بن عبدالمطلب کا سود چھوڑتا ہوں اس لیے کہ وہ سب باطل ہے۔ اپنی بیویوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو' کیونکہ اللہ کے عہد و پیمان کے بموجب تم نے ان کو اپنی بیویاں بنایا ہے اور اس کے بنائے ہوئے کلمہ ایجاب و قبول سے وہ تمہارے لیے حلال ہوئی ہیں۔ تمہارا حق عورتوں پر یہ ہے کہ تمہارے گھر میں وہ کسی کو جس کا آنا تم کو ناگوار ہو' نہ آنے دیں لیکن اگر وہ اس کے خلاف کریں' تو ایسی مار مارو جو زیادہ تکلیف دہ نہ ہو۔ عورتوں کا تم پر حق یہ ہے کہ ان کو اچھی طرح کھلاؤ اچھی طرح پہناؤ۔ میں تم میں وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر تم اسے مضبوط پکڑ لو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ وہ چیز اللہ کی کتاب ہے۔ لوگو! قیامت کے روز تم سے میرے متعلق دریافت کیا جائے گا' تو بتاؤ تم کیا جواب دو گے؟

صحابہؓ نے عرض کیا:

نُشْہَدُ اِنَّکَ بُلَّغْتَ اَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ	ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے سب احکام پہنچا دیے' اپنا فرض ادا کر دیا اور ہمارے لیے کھوٹا کھرا الگ کر کے دکھا دیا۔

آپؐ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے اور لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تین مرتبہ فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اَشْھَدُ اَللّٰھُمَّ اَشْھَدُ' اَللّٰھُمَّ اَشْھَدُ۔	اے اللہ تو گواہ رہ' اے اللہ تو گواہ رہ' اے اللہ تو گواہ رہ۔

پھر آپؐ نے اذان دلوائی' پھر اقامت کہی اور ظہر کی نماز پڑھی۔ پھر اقامت کہی اور عصر کی نماز پڑھی۔ ان دونوں نمازوں کے درمیان آپؐ نے کوئی نماز (یعنی نفل نماز) نہیں پڑھی۔

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے اور موقف (یعنی عرفات میں جبل رحمت کے قریب وہ جگہ جہاں آپؐ نے وقوف عرفات فرمایا) پر تشریف لائے اور پھر پہاڑی کے نیچے چٹانوں پر اپنی اونٹنی کو کھڑا کیا اور آپ اس پر سوار رہے۔ پیدل لوگوں کا مجمع آپؐ کے سامنے تھا۔ آپؐ قبلہ رخ ہوئے۔ اسی طرح آپ کھڑے رہے یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ کچھ زردی ختم ہو گئی' اور سورج کی ٹکیا ڈوب گئی۔ حضرت اسامہؓ کو آپؐ نے اپنے ساتھ اونٹنی پر سوار کیا اور (مزدلفہ کے لیے) روانہ ہو گئے۔ اونٹنی کی لگام آپؐ نے کھینچ رکھی تھی۔ یہاں تک کہ اس کا سر آپ کے کجاوہ سے لگ رہا تھا اور آپؐ اپنے ہاتھوں سے اشارہ فرما رہے تھے کہ اے لوگو! اطمینان و سکون سے چلو۔ جب کبھی ریت کا کوئی ٹیلا آتا تو آپؐ اونٹنی کی لگام قدرے ڈھیلی فرما دیتے تاکہ وہ چڑھ سکے' یہاں تک کہ مزدلفہ پہنچ گئے۔ وہاں آپؐ نے ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا فرمائیں۔ دونوں کے درمیان آپؐ نے کوئی نفل نماز نہیں پڑھی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیٹ گئے' یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ جب صبح ظاہر ہو گئی' تو آپؐ نے ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ صبح کی نماز ادا فرمائی پھر آپؐ قصواء پر سوار ہوئے اور مشعر حرام پر تشریف لائے۔ آپ قبلہ رخ ہوئے اور دعا فرمائی۔ تکبیر (اللہ اکبر کہنا)' تہلیل (لا الہ الا اللہ کہنا) اور توحید (اللہ

تعالیٰ کی وحدانیت کا ذکر کرنا) کی۔ آپؐ کھڑے رہے یہاں تک کہ روشنی خوب پھیل گئی۔ پھر سورج نکلنے سے پہلے آپ روانہ ہو گئے۔ اب آپؐ نے حضرت عباسؓ کے بیٹے فضل کو اپنے ساتھ سوار فرمایا۔ فضلؓ سفید رنگ کے نہایت خوب رو آدمی تھے اور ان کے بال نہایت خوبصورت تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہوئے' تو کچھ عورتیں جا رہی تھیں۔ فضلؓ ان کی طرف دیکھنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ فضلؓ کے چہرے پر رکھ دیا۔ فضلؓ نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا اور (ان عورتوں کی طرف) دیکھنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری طرف سے اپنا ہاتھ گھما کر فضلؓ کے چہرے پر رکھ دیا فضلؓ نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا اور (ان عورتوں کی طرف) دیکھنے لگے۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وادیِ محسر (جہاں اصحاب فیل ہلاک ہوئے تھے) پہنچے۔ وہاں آپؐ نے اپنی اونٹنی کو تیز کر دیا۔ آپؐ نے درمیان کا وہ راستہ اختیار فرمایا جو جمرہ کبریٰ (جمرہ عقبہ [1]) پر آکر نکلتا ہے' یہاں تک کہ اس جمرہ کے پاس آئے (یعنی جمرہ عقبہ ہی کے پاس) جو (اس) درخت کے پاس ہے (جس کے نیچے بیعت عقبہ ہوئی تھی)۔ آپؐ نے اس پر سات کنکریاں پھینکیں۔ ہر مرتبہ کنکری پھینکتے وقت آپؐ اللہ اکبر کہتے جاتے تھے۔ آپؐ کی کنکریاں چھوٹی تھیں' اتنی چھوٹی کہ انہیں دو انگلیوں کے درمیان رکھ کر پھینکا جا سکتا تھا۔ آپؐ وادی کے نشیب میں کھڑے تھے۔ پھر آپؐ پلٹے اور قربانی کی جگہ تشریف لائے۔ آپؐ نے اپنے مبارک ہاتھ سے تریسٹھ اونٹ ذبح فرمائے اور جو باقی بچ گئے انہیں حضرت علیؓ کے حوالہ کیا اور حضرت علیؓ نے انہیں ذبح کیا۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو قربانی میں اپنے ساتھ شریک فرمایا۔ پھر آپؐ نے ہر اونٹ میں سے ایک ایک بوٹی لینے کا حکم دیا۔ انہیں پکایا گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ دونوں نے ان کا گوشت کھایا اور ان کا شوربا پیا۔ (اس کے بعد آپؐ نے حجامت کرائی۔ [2])

۱۔ منیٰ میں تین جمرے ہیں جن پر کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ ایک جمرۂ عقبہ جو مکہ کی طرف ہے اور سب سے بڑا ہے اور اسی لیے اسے جمرۂ کبریٰ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے قریب ہجرت سے پہلے مدینہ منورہ کے انصار نے حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی جسے بیعت عقبہ کہا جاتا ہے۔ دوسرا جمرۂ وسطیٰ اور تیسرا جمرۂ ثالثہ جو مسجد خیف کے قریب ہے۔

۲۔ ابوداؤد بروایت حضرت انسؓ۔

اس کے بعد آپ سوار ہو کر مکہ معظمہ تشریف لائے اور طواف افاضہ کیا۔ آپ نے مکہ معظمہ میں ظہر کی نماز ادا فرمائی۔ پھر آپ بئیر زمزم پر تشریف لائے۔ خاندانِ عبدالمطلب کے چند افراد لوگوں کو آب زمزم پلا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ "اے عبدالمطلب کے بیٹو! پانی نکال نکال کر لوگوں کو پلاتے رہو۔ اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ (میری اقتداء کرتے ہوئے) تم سے ڈول چھین لیں گے' تو میں بھی تمہارے ساتھ پانی نکالتا۔" انہوں نے حضور کو پانی کا ایک ڈول دیا اور آپ نے اس سے پانی پیا۔"

پھر آپ منیٰ واپس آ گئے اور تشریق ۱۱' ۱۲' اور ۱۳ تاریخ کی راتیں وہیں گزاریں۔ ہر روز جب سورج ڈھل جاتا' تو آپ ہر جمرہ پر سات کنکریاں پھینکتے۔ ہر کنکری کے ساتھ آپ اللہ اکبر کہتے۔ آپ پہلے اور دوسرے جمرہ کے پاس کافی دیر تک ٹھہرے رہتے اور اللہ کے حضور دعا فرماتے۔ تیسرے جمرہ پر آپ کنکریاں پھینکتے مگر وہاں نہ ٹھہرتے۔[1]

(۱۳ منیٰ سے پلٹنے کے بعد)' آپ نے وادیٔ محصّب (مکہ معظمہ کا میدان جو جبل حرا کے راستے میں ہے) میں قیام فرمایا۔ ظہر' عصر' مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھیں۔ پھر آپ تھوڑی دیر کے لیے سو گئے۔ پھر (آخر رات میں مکہ معظمہ میں) داخل ہوئے اور طواف (یعنی طواف وداع) فرمایا۔[2]

ان احادیث سے مناسک حج و عمرہ کی جو ترتیب معلوم ہوئی وہ یہ ہے:

میقات پر پہنچ کر غسل کر کے احرام باندھنا (جو حج کی نیت کرنے کی علامت ہے اور تلبیہ (لبیک اللّٰھم۔۔۔۔) کہنا۔

مکہ معظمہ پہنچ کر سب سے پہلے طواف القدوم کرنا۔ اس طواف کے شروع میں حجر اسود کا استلام کرنا پہلے تین چکروں میں رمل کرنا اور باقی چار چکروں میں معمولی چال سے چلنا۔

طواف کے بعد مقام ابراہیم پر آنا اور وہاں دو رکعت نماز پڑھنا۔

پھر حجر اسود کا استلام کرتے ہوئے صفا کی طرف روانہ ہونا' اور پھر صفا پر چڑھ کر

۱۔ احمد' ابو داؤد' ابن حبان' حاکم علیہ بیہقی بروایت حضرت عائشہؓ۔

۲۔ احمد' مسلم' مالک علیہ بیہقی بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔

قبلہ رخ ہونا اور اللہ تعالٰی کا ذکر کرنا اور تین مرتبہ "لا الہ الا اللہ وحدہ۔۔۔" کہتے ہوئے دعا کرنا۔

پھر مروہ کی طرف جانا اور اس پر بھی چڑھ کر قبلہ رخ ہو کر اسی طرح ذکر و دعا کرنا۔

اس طرح صفا اور مروہ کے درمیان سات مرتبہ سعی کرنا اور ہر سعی میں وادی کے نشیب۔۔۔ جسے اب بین المیلین الاخضرین (دو سبز کھمبوں کے درمیان کا فاصلہ) کہا جاتا ہے۔۔۔ میں دوڑ کر چلنا۔

یہ سب کچھ کر لینے کے بعد عمرہ کے مناسک پورے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اگر سر منڈوا لیا جائے یا سر کے بال کٹوا لیے جائیں تو احرام کی پابندی ختم ہو جاتی ہے' چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو صحابہؓ تھے انہیں آپؐ نے اسی طرح اپنا احرام حج کے بجائے عمرے کا کر لینے کا حکم دیا تھا۔ انہوں نے احرام کھول لیا تھا۔ جو شخص ایسا کرے اسے متمتع کہا جاتا ہے' لیکن جو شخص اپنا احرام حج ہی کا رکھے' وہ سر کے بال نہ منڈوائیگا اور نہ کٹوائے گا اور نہ احرام کھولے گا۔ ایسے شخص کو قارن کہا جاتا ہے۔ اگر اس کی نیت عمرہ اور حج کو ایک ساتھ کرنے کی ہے۔ اور اگر صرف حج کی نیت ہے' تو اسے مفرد کہا جاتا ہے۔

پھر ترویہ کے دن یعنی ۸ ذی الحجہ کو مفرد اور قارن کا اپنے اسی احرام کے ساتھ اور متمتع کا نئے سرے سے احرام باندھ کر منیٰ کی طرف روانہ ہونا۔

منیٰ میں پانچ نمازیں ادا کرنا اور ۸ و ۹ ذی الحجہ کی درمیانی شب وہیں گزارنا۔

۹ ذی الحجہ (جسے عرفہ کا دن کہا جاتا ہے) کو سورج نکلنے کے بعد عرفات کے لیے روانہ ہونا۔

عرفات پہنچ کر ظہر و عصر کی نمازیں ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ جمع کر کے پڑھنا۔ ان دونوں نمازوں کے درمیان کوئی نماز نہ پڑھنا اور امام کا ان سے پہلے خطبہ دینا۔

دونوں نمازوں سے فارغ ہو کر عرفات آنا اور غروبِ آفتاب تک وہاں کھڑے ہو کر اللہ تعالٰی کا ذکر اور اس سے دعا کرنا۔

سورج غروب ہو جانے کے بعد مغرب کی نماز پڑھے بغیر مزدلفہ کے لیے روانہ ہونا۔

مزدلفہ پہنچ کر مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کر کے پڑھنا اور ان دونوں نمازوں کے درمیان کوئی نماز نہ پڑھنا۔

یہ رات مزدلفہ ہی میں گزارنا۔

۱۰ ذی الحجہ (جسے قربانی کا دن کہا جاتا ہے) کو صبح کی نماز مزدلفہ ہی میں پڑھ کر مشعر الحرام کے مقام پر آنا اور وہاں قبلہ رخ ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہو کر دعا کرنا۔

صبح کی روشنی اچھی طرح پھیل جانے کے بعد وادیِ محسر کے راستے منیٰ کی طرف روانہ ہونا۔

منیٰ پہنچ کر جمرہ عقبہ۔۔۔ جسے جمرہ کبریٰ کہا جاتا ہے۔۔۔ پر سات چھوٹی کنکریاں پھینکنا۔

پھر قربانی کی جگہ آکر قربانی کرنا۔

پھر سر کے بال منڈوانا یا کترانا۔

پھر مکہ معظمہ آکر طوافِ افاضہ (جسے طواف زیارت بھی کہا جاتا ہے) کرنا۔

یہ سب کچھ کر لینے کے بعد حاجی سے احرام کے سلسلے کی تمام پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ طوافِ افاضہ سے پہلے دوسری تمام پابندیاں۔۔۔ جیسے نہانا' کپڑے بدلنا' اور خوشبو لگانا۔۔۔ تو ختم ہو جاتی ہیں لیکن زن و شو کے تعلقات پر پابندی باقی رہتی ہے طوافِ افاضہ کے بعد یہ پابندی بھی ختم ہو جاتی ہے۔

طواف سے فارغ ہو کر پھر منیٰ آنا اور وہاں ۱۲ اور ۱۳ ذی الحجہ کی دوپہر تک قیام کرنا۔

۱۲ یا ۱۳ کو منیٰ سے مکہ معظمہ واپس آنا۔

مکہ معظمہ سے واپس ہوتے وقت طوافِ وداع (الوداعی طواف) کرنا۔

مناسکِ حج و عمرہ کی اس ترتیب پر۔۔۔ جیسا کہ آپ کو کتاب کے آئندہ صفحات سے معلوم ہو گا۔۔۔ تمام ائمہ سلف کا اتفاق ہے۔ صرف دو چیزوں کے متعلق اختلاف ہے۔ ایک یہ کہ حنفیہ کے نزدیک قارن پہلی مرتبہ مکہ معظمہ پہنچ کر دو طواف اور دو سعی کرے گا۔ دوسروں کے نزدیک وہ صرف ایک طواف اور ایک سعی کرے گا۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے صفحہ ۲۵۵)۔ دوسرے یہ کہ جمہور (جن میں ائمہ اربعہ شامل ہیں) کے نزدیک متمتع طواف

افاضہ کے بعد سعی بھی کرے گا۔ اور امام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگردوں کے نزدیک وہ طواف افاضہ کے بعد کوئی سعی نہیں کرے گا۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے صفحہ ۲۵۶)۔

حج و عمرہ کے ان اعمال میں سے بعض چیزیں فرض یا رکن ہیں۔ یعنی ان میں سے کوئی چیز اگر نہ کی جائے گی' تو حج یا عمرہ نہ ہو گا۔ بعض چیزیں واجب[1] ہیں۔ یعنی ان کا کرنا ضروری ہے۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی چیز رہ جائے' تو فدیہ (ایک جانور کی قربانی) سے اس کی تلافی ہو سکتی ہے۔ اور بعض چیزیں سنت ہیں' یعنی ان میں سے اگر کوئی چیز رہ جائے' تو اگرچہ انسان ثواب سے محروم ہو جائے گا' لیکن اس کا حج یا عمرہ ہو جائے گا' بغیر اس کے کہ اس پر کوئی فدیہ لازم ہو۔۔۔۔ کتاب کے اگلے صفحات میں ہم حج و عمرہ کے ان تمام اعمال کو ان کے تفصیلی احکام کے ساتھ الگ الگ بیان کریں گے۔

۱۔ حج کے مسائل میں مالکیہ' شافعیہ اور حنابلہ بھی حنفیہ کی طرح فرض اور واجب میں فرق کرتے ہیں۔

مواقیت

میقات (جمع مواقیت) کی دو قسمیں ہیں :

(۱) میقات مکانی

(۲) میقات زمانی

ا۔ میقاتِ مکانی

مکانی میقاتوں سے مراد وہ جگہیں ہیں' جہاں پہنچ کر حج یا عمرہ کرنے والا اپنے حج یا عمرہ یا دونوں کا احرام باندھتا ہے۔

الف۔ حکم :

میقات پر پہنچ کر احرام کا باندھنا واجب ہے' یعنی اگر کوئی شخص میقات سے احرام کے بغیر گزر جائے اور آگے بڑھ کر احرام باندھے' تو اسے گناہ ہو گا۔ اور اس کا حج یا عمرہ اس وقت صحیح ہو گا' جب وہ فدیہ۔۔۔ایک جانور کی قربانی۔۔۔ادا کرے گا[1]

ب۔ میقات کون کون سے ہیں ؟

(الف) باہر سے آنے والوں کے لیے مندرجہ ذیل پانچ میقات ہیں :

(۱) اہل مدینہ کے لیے ذوالحلیفہ (جسے آج کل ابیارِ علی کہا جاتا ہے اور یہ مدینہ منورہ سے پانچ میل اور مکہ معظمہ سے ۲۹۵ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔)

(۲) اہل شام کے لیے جحفہ (جو رابغ کے قریب ہے اور مکہ معظمہ سے تقریباً ڈیڑھ سو میل کے فاصلہ پر واقع ہے)۔

(۳) اہلِ نجد کے لیے قَرْنُ الْمَنَازِل (جسے آج کل سیل کہا جاتا ہے' اور مکہ معظمہ سے تقریباً ۵۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے)۔

(۴) اہل عراق کے لیے ذات عرق (جو سیل کے شمال کی طرف مکہ سے ۷۷ میل کے فاصلہ پر واقع ہے)۔

---

[1] ۱۔ یہ جمہور (جن میں ائمہ اربعہ شامل ہیں) کا مسلک ہے (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۱۱۳)۔

(۵) اہلِ یمن کے لیے یَلَمْلَمْ (جسے ان دنوں سعد یہ کہا جاتا ہے اور یہ مکہ معظمہ سے خشکی کے راستہ سے ۶۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ بحری جہاز سے آنے والوں کو یہ جزیرہ کامران سے ۳۸۰ میل چلنے کے بعد ملتا ہے اور جدہ یہاں سے ۷۵ میل رہ جاتا ہے)۔

یہ میقات نہ صرف مذکورہ بالا ملکوں کے لیے ہیں' بلکہ یہ ہر شخص کے لیے میقات ہیں جو ان کے راستہ سے حج و عمرہ کے لیے مکہ معظمہ آئے۔ چنانچہ مصر' لیبیا' الجزائر' تونس' مراکش اور مغرب کی طرف کے دوسرے تمام ممالک والوں کے لیے حجفہ' اور جاوہ' ہندوستان' پاکستان یا جنوب کی طرف کے دوسرے تمام ممالک کے لیے یلملم میقات ہے:

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کے لیے ذوالحلیفہ کو اہلِ شام کے لیے حجفہ کو اہل یمن کے لیے یلملم کو اور اہل نجد کے لیے قرن کو میقات مقرر کیا اور فرمایا "یہ ان اطراف والوں کے لیے اور جو بھی دوسرے لوگ بارادہ حج و عمرہ ان سے ہو کر گزریں' ان کے لیے میقات ہیں' اور جس شخص کا گھر میقات سے ورے (یعنی میقات اور مکہ معظمہ کے درمیان) ہو' تو اس کا میقات وہی جگہ ہے جہاں سے وہ چلے۔ حتیٰ کہ اہل مکہ کا میقات بھی ان کے گھر ہیں۔" (بخاری' مسلم' احمد وغیرہ)۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل عراق کے لیے ذات عرق کو میقات مقرر فرمایا۔ (ابو داؤد' نسائی)۔

(ب) جن لوگوں کا گھر میقات اور مکہ معظمہ کے درمیان ہو' ان کا میقات وہی ہے' جہاں سے وہ چلیں' جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا حدیث میں واضح طور پر اس کا ذکر ہے۔

(ج) مکہ والوں کے لیے حج کا میقات تو ان کے گھر ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا حدیث میں اس کا واضح طور پر ذکر ہے' لیکن ان کے لیے عمرہ کا میقات وہ جگہ ہے جہاں حرم کے حدود ختم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ پہلے حدود حرم سے باہر نکلیں گے اور پھر احرام باندھ کر عمرہ کے لیے مکہ معظمہ میں داخل ہوں گے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ سے روایت ہے کہ جس دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم (حجتہ الوداع کے بعد مدینہ منورہ) روانہ ہونے والے تھے' آپؐ نے مجھ سے فرمایا۔ "یہ اونٹنی لے جاؤ' اس پر اپنی بہن (حضرت عائشہؓ) کو بھی سوار کر لو۔ جب تم تنعیم (مکہ معظمہ سے

چار میل کے فاصلہ پر ایک جگہ جو حدود حرم سے باہر مکہ معظمہ کے سب سے قریب کی جگہ ہے) کے ٹیلے پر پہنچو' تو اتر کر احرام باندھو اور پھر (عمرہ کے لیے) آؤ اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول کیے جانے والا عمرہ ہے۔"[1] (بخاری' مسلم' احمد وغیرہ)

۲۔ میقاتِ زمانی

میقات زمانی سے مراد وہ زمانہ ہے جس کے اندر اندر حج کا کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ' قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ۔ (البقرۃ)

لوگ آپ سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ یہ لوگوں کے لیے تاریخوں کی تعین اور حج کی علامتیں (مواقیت) ہیں۔

حج کا احرام اشہر الحج (حج کے مہینوں) میں باندھنا مستحب اور ان کے علاوہ دوسرے مہینوں میں باندھنا مکروہ[2] ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

۱۔ اس بارے میں جمہور (جن میں ائمہ اربعہ اور تمام محدثین شامل ہیں) کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے' البتہ ائمہ اربعہ کے درمیان اختلاف اس بارے میں ہے۔ کہ حدِّ حرم سے باہر سب سے افضل جگہ کون سی ہے جہاں اہل مکہ آکر حرام باندھیں اور پھر عمرہ کریں۔ حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک یہ جگہ تنعیم ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کو وہاں بھیجا (جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث میں مذکور ہے) اور شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک یہ جگہ جعرانہ (طائف کے راستہ میں مکہ معظمہ سے تقریباً ۱۵ میل کے فاصلے پر ہے۔۔۔ کیونکہ غزوۂ طائف کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے یہیں سے عمرہ کے لیے احرام باندھا تھا۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۶۷۳) (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۱۱۵)۔

۲۔ یہ امام ابو حنیفہؒ' مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ اور بہت سے دوسرے ائمہ کا مسلک ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک "الحج اشہر معلومات" کا مطلب ہے "حج کا وقت چند معلوم مہینے ہے"۔ لہٰذا ان کے نزدیک حج کا احرام حج کے مہینوں ہی میں باندھنا ضروری اور ان کے علاوہ دوسرے مہینوں پر باندھنا ناجائز ہے۔ (مختصراً از الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۱۱۷)۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ   حج چند معلوم مہینوں کا حج ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ "سنت یہ ہے کہ حج کا احرام حج کے مہینوں ہی میں باندھا جائے۔" (بخاری)

حج کے مہینوں سے مراد شوال' ذی القعدہ اور ذی الحجہ کے دس دن ہیں۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا "حج کے مہینے شوال' ذی القعدہ اور ۱۰ تاریخ تک ذی الحجہ ہیں۔" (بخاری)

اسی قسم کی روایت حضرت ابن عباسؓ' ابن مسعودؓ اور ابن زبیرؓ سے بھی مروی ہے۔[1] (دارقطنی)۔

عمرہ کے لیے میقات زمانی نہیں ہے۔ اس کا احرام سال کے ہر حصہ میں باندھا جا سکتا ہے' جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔

۳۔ احرام کا میقات سے پہلے باندھنا:

جمہور ائمہ (جن میں ائمہ اربعہ اور عام محدثین شامل ہیں) کے نزدیک احرام کا میقات سے پہلے باندھ لینا جائز ہے۔[2] البتہ ان کے درمیان اس کے مستحب ہونے یا نہ

۱۔ یہ امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ' بخاریؒ اور دوسرے اکثر ائمہ کا مسلک ہے۔
امام مالکؒ اور ابن حزمؒ کے نزدیک حج کے مہینوں سے مراد شوال' ذی القعدہ اور پورا ذی الحجہ ہیں۔ ایک روایت میں حضرت ابن عمرؓ کا یہی مسلک ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ عربی زبان میں شہر (جمع شہر) کا اطلاق کم از کم تین ماہ پر ہو سکتا ہے۔ تین ماہ سے کم مدت (دو ماہ دس دن) پر اشہر کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ص ۱۱۷) (المحلی ج ۷ ص ۶۹)۔

۲۔ امام اسحاقؒ اور داوٗد ظاہریؒ کے نزدیک احرام کا میقات سے پہلے باندھنا جائز نہیں ہے۔ امام بخاریؒ کا بھی یہی مسلک معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اہل مدینہ کے میقات کے لیے انہوں نے جو باب باندھا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔ "اہل مدینہ کا میقات اور یہ کہ وہ ذوالحلیفہ سے پہلے احرام نہیں باندھیں گے۔"
اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات میقات مکانی کو میقات زمانی پر قیاس کرتے ہیں کہ جس طرح حج کا احرام حج کے مہینوں سے پہلے باندھنا صحیح نہیں ہے' اسی طرح اس کا میقات مکانی سے پہلے باندھنا بھی صحیح نہیں ہے۔ جمہور ائمہ میقات مکانی اور میقات زمانی میں فرق کرتے ہیں۔ (فتح الباری ج ۴ ص ۱۲۶)۔

ہونے میں اختلاف ہے۔[1]

1۔ امام مالکؒ، احمد بن حنبلؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک احرام کا میقات ہی پر باندھنا مستحب ہے۔ اس سے پہلے باندھنا مستحب نہیں ہے۔ ایک روایت میں امام شافعیؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک احرام کا میقات سے پہلے باندھنا مستحب ہے۔ ایک روایت میں امام شافعیؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ حضرت عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے بیت المقدس سے لوٹتے وقت وہیں سے احرام باندھ لیا تھا۔ (ہدایہ ج ۱ ص ۹۸) (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۱۱۶)۔

احرام

ا۔ تعریف :

احرام کے لفظی معنی کسی ایسی چیز میں داخل ہونے کے ہیں جو انسان پر بعض ایسے کام حرام کر دے' جو اس سے پہلے اس کے لیے حلال (جائز) تھے اور اصطلاح میں اس سے مراد حج یا عمرہ میں داخل ہونے (یعنی ان کی نیت کرنے) کے ہیں۔[1] (المصباح المنیر وغیرہ۔

۲۔ حکم :

حج یا عمرہ کے لیے احرام کے ضروری ہونے پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے (تفسیر ابن کثیر) اس اتفاق کی بنیاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "انما الاعمال بالنیات" (اعمال کا اعتبار نیتوں کے ساتھ ہے)[2]

۳۔ سنتیں اور آداب :

احرام کے لیے مندرجہ ذیل کام مسنون ہیں :

ا۔ غسل : اس پر اجماع ہے کہ حج یا عمرہ کے احرام سے پہلے مرد عورت کے لیے' خواہ وہ حیض یا نفاس ہی کی حالت میں کیوں نہ ہو غسل کرنا سنتِ موکدہ ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۱۳۱)۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب احرام کا ارادہ فرماتے تو خطمی (بیری کے پتوں جیسی ایک چیز) اور اشنان (ایک خوشبودار چیز جو کھجلی اور خارش کے

۱۔ حنفیہ کے نزدیک احرام کی تعریف "نیت اور تلبیہ کے ساتھ حج یا عمرہ میں داخل ہونا" ہے۔ (الفقہ۔۔۔) (ھدایہ ج ۱ ص ۹۹)۔ یعنی حنفیہ کے نزدیک احرام نیت اور تلبیہ کے مجموعہ کا نام ہے اور دوسروں کے نزدیک صرف نیت کا۔

۲۔ حنفیہ کے نزدیک یہ حج یا عمرہ کی شرط ہے اور دوسروں کے نزدیک رکن لیکن واضح رہے کہ شرط اور رکن میں عملاً کوئی فرق نہیں ہے' صرف نظری فرق ہے۔

علاج کے لیے استعمال کی جاتی ہے) سے اپنا سر مبارک دھوتے' اور اس میں تھوڑا سا تیل لگاتے" (احمد' دار قطنی)۔

حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے احرام کے لیے غسل فرمایا۔ (ترمذی)

حضرت جابرؓ کی یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیوی حضرت اسماء بنتِ عمیسؓ کے ہاں جب محمد بن ابی بکرؓ کی پیدائش ہوئی' تو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیغام بھیجا اور دریافت کیا کہ اب میں کیا کروں؟ حضورؐ نے انہیں جواب بھجوایا کہ "غسل کرو اور خون کی جگہ پر کپڑا رکھ کر احرام باندھ لو۔" (مسلم' احمد' ابو داؤد' ابن ماجہ' نسائی وغیرہ)۔

۲۔ خوشبو لگانا: احرام سے پہلے مرد و عورت کے لیے بدن پر ہر طرح کی خوشبو لگانا مسنون ہے' خواہ اس کا اثر احرام کے بعد بھی باقی رہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں "گویا مجھے اب تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مانگ میں خوشبو کی چمک نظر آ رہی ہے' حالانکہ آپؐ احرام کی حالت میں تھے۔" (بخاری' مسلم' احمد وغیرہ)۔

حضرتِ عائشہ ہی سے روایت ہے کہ "میں احرام کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن میں خوشبو لگایا کرتی تھی' اس سے پہلے کہ آپؐ احرام باندھیں اسی طرح میں آپؐ کے احرام کھولنے کے بعد بھی (آپؐ کے بدن میں خوشبو لگایا کرتی تھی) اس سے پہلے کہ آپؐ کعبہ کا طواف ـــــ طواف افاضہ ـــــ فرمائیں۔" (بخاری و مسلم)۔

حضرت عائشہؓ ہی سے تیسری روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب احرام کا ارادہ فرماتے' تو آپؐ کے پاس جو سب سے عمدہ خوشبو ہوتی' آپؐ اسے استعمال فرماتے یہاں تک کہ تیل کی چمک میں اس کے بعد (یعنی احرام کی حالت میں بھی آپؐ کے سر اور داڑھی میں دیکھتی۔" (بخاری و مسلم)۔[1]

۱۔ یہ جمہور (جن میں امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ' احمدؒ' سفیان ثوریؒ' اسحاقؒ' ابو ثورؒ' داؤد ظاہری وغیرہ شامل ہیں) کا مسلک ہے۔

امام مالکؒ' عطاءؒ' زہریؒ' سعید بن جبیرؒ' حسن بصریؒ' ابن سیرینؒ اور حنفیہ میں سے امام محمدؒ اور

۳۔ احرام کے کپڑوں کا سفید ہونا۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفید کپڑوں کو بہت پسند فرماتے تھے۔

طحاویؒ کے نزدیک احرام سے پہلے خوشبو لگانا جائز نہیں۔ بعض کے نزدیک یہ حرام ہے اور بعض کے نزدیک مکروہ۔ صحابہؓ میں سے بھی حضرت عمرؓ' عثمانؓ' عبداللہ بن عمرؓ' اور عثمان بن ابی عاصؓ کا یہی مسلک ہے۔ ان حضرات کا استدلال مندرجہ ذیل احادیث سے ہے:

(۱) صحیح بخاری میں ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواجِ مطہراتؓ کے پاس گئے اور پھر آپؐ نے احرام باندھا۔" یعنی یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر خوشبو لگائی تھی' تو اس کے بعد غسل کر کے اسے دھو لیا تھا۔۔۔ اس کا جواب جمہور صحیح بخاری ہی کی ایک دوسری روایت سے دیتے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں "۔۔۔ اور پھر آپؐ نے احرام باندھا' اس طرح کہ آپؐ کے بدن سے خوشبو آ رہی تھی"

(۲) حضرت یعلیٰؓ بن امیہؓ سے روایت ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے۔ جب کہ آپؐ جعرانہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کہ ایک آدمی آیا۔ اس نے جبہ پہن رکھا تھا' جس پر زعفران کا نشان تھا' اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ "آپؐ کا کیا حکم ہے؟ میں اپنا عمرہ کیوں کر کروں؟" آپؐ نے فرمایا "اپنا جبہ اتارو اور اپنے سے زعفران کا نشان دھو ڈالو اور پھر اپنے عمرہ میں وہی کرو جو تم حج میں کرتے ہو۔" (بخاری' مسلم' احمد)۔۔۔ اس کا جواب جمہور کئی طرح سے دیتے ہیں۔ ایک یہ کہ زعفران کا نشان جبہ پر تھا نہ کہ بدن پر' اور مرد کے لیے زعفران کا استعمال بہر حال ممنوع ہے (خواہ وہ احرام کی حالت میں ہو یا نہ ہو)۔ دوسرے یہ کہ یہ حدیث ۸ھ کی ہے اور حضرت عائشہؓ کی (مذکورہ بالا) احادیث بعد کی ہیں' یعنی حجۃ الوداع کے موقع کی جو بالاتفاق ۱۰ھ میں واقع ہوا۔ تیسرے یہ کہ اس بات کا امکان ہے کہ اس شخص نے خوشبو احرام باندھنے کے بعد استعمال کی ہو اور احرام کے بعد خوشبو کا استعمال سب ہی کے نزدیک حرام ہے۔

بعض مالکی علماء حضرت عائشہؓ کی مذکورہ بالا احادیث میں احرام سے پہلے خوشبو کے استعمال کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی خصوصیات میں شمار کرتے ہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک یہ استدلال اس لیے صحیح نہیں ہے کہ حضرت عائشہؓ ہی سے ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ثابت ہیں کہ "ہم احرام سے پہلے اپنے چہروں پر خوشبو لگایا کرتے تھے اور پھر احرام باندھا کرتے تھے۔ جب ہمیں پسینہ آتا تو خوشبو ہمارے چہروں پر بہتی' حالانکہ ہم اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے تھے اور آپؐ ہمیں منع نہ فرماتے تھے۔" (ابن ابی شیبہ)۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۱۳۲)۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمہارے (یعنی مردوں کے) سب سے بہتر کپڑے سفید رنگ کے ہیں۔ لہذا تم میں سے زندہ لوگوں کو بھی سفید کپڑے پہننے چاہئیں اور تمہارے مردوں کے کفن بھی سفید رنگ کے ہونے چاہئیں۔ (بیہقی وغیرہ)۔

اگرچہ احرام کی حالت میں رنگ دار کپڑوں کا پہننا بھی جائز ہے۔ اس بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف نہیں ہے۔ (رسالہ مناسک حج و عمرہ۔ ابن تیمیہ ص ۹)۔

۴۔ دو رکعت نماز: احرام کا لباس پہن کر تلبیہ (لبیک اللھم لبیک۔۔۔) کہنے سے پہلے دو رکعتیں نماز پڑھنا مسنون ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالحلیفہ میں دو رکعت نماز پڑھی اور جب آپ کی سواری کھڑی ہوئی، تو آپؐ نے تلبیہ فرمایا (بخاری و مسلم وغیرہ)۔

۴۔ اقسام:

احرام کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ افراد، یعنی یہ کہ صرف حج کی نیت سے احرام باندھا جائے۔

۲۔ تمتع، یعنی یہ کہ صرف عمرہ کی نیت سے احرام باندھا جائے۔ عمرہ سے فارغ ہو کر احرام کھول لیا جائے اور پھر ترویہ کے دن ۸ ذی الحجہ کو حج کی نیت سے دوبارہ احرام باندھا جائے۔

۳۔ قران، یعنی حج اور عمرہ دونوں کی نیت سے احرام باندھا جائے۔ یا یہ کہ احرام تو صرف عمرہ کی نیت سے باندھا جائے، لیکن عمرہ ختم کرنے سے پہلے پہلے [1] حج کی بھی نیت کر

---

[1] حنفیہ کے نزدیک طواف کے چار چکر پورے کرنے سے پہلے پہلے۔

شافعیہ کے نزدیک طواف شروع کرنے سے پہلے پہلے۔

مالکیہ کے نزدیک طواف کے بعد مقام ابراہیم پر دو رکعت پڑھنے سے پہلے پہلے۔

حنبلیہ کے نزدیک سعی کے بعد جب تک سر کے بال کٹوائے یا منڈوائے نہ جائیں (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۲۸۲۔۲۸۹)۔

لی جائے اور حج کے ختم ہونے تک احرام نہ کھولا جائے۔

احرام کی یہ تینوں قسمیں تمام ائمہ کے نزدیک صحیح ہیں۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۹۵) وغیرہ۔

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ حجتہ الوداع کے موقع پر ہم لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے۔ ہم میں سے بعض نے صرف عمرہ کا احرام باندھا۔ بعض نے حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھا اور بعض نے صرف حج کا احرام باندھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف حج کا احرام باندھا۔ جس شخص نے صرف عمرہ کا احرام باندھا اس نے پہنچ کر (یعنی عمرہ کے مناسک سے فارغ ہو کر) احرام کھول لیا۔ جس نے حج یا حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھا' اس نے قربانی کے دن (یعنی ۱۰ ذی الحجہ) تک احرام نہیں کھولا۔" (بخاری' مسلم' احمد' مالک وغیرہ)۔

اختلاف اس بارے میں ہے کہ تینوں قسموں میں سے افضل (سب سے بہتر) قسم کونسی ہے؟ ۱؎

۱۔ حنفیہ کے نزدیک سب سے بہتر قران ہے' پھر تمتع اور پھر افراد۔ لیکن قران صرف اسی صورت میں سب سے بہتر ہے جبکہ انسان کو یہ اندیشہ نہ ہو کہ احرام کی حالت میں اس سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جائے گا جس کا کرنا احرام کی حالت میں ناجائز ہے۔ کیوں کہ قران کی صورت میں اسے عمرہ کے بعد حج تک احرام ہی کی حالت میں رہنا ہوگا۔ اگر یہ اندیشہ ہو' تو تمتع سب سے بہتر ہے۔

شافعیہ کے نزدیک سب سے بہتر افراد ہے۔ پھر تمتع اور پھر قران۔ لیکن قران صرف اسی حالت میں سب سے بہتر ہے جبکہ انسان جس سال حج کرے' اسی سال عمرہ بھی کرے۔ اگر اسے خیال ہو کہ وہ اسی سال عمرہ نہ کر سکے گا' تو اس کے لیے افراد سب سے بہتر ہوگا۔

حنبلیہ کے نزدیک جو شخص اپنے ساتھ قربانی کا جانور نہ لائے اس کے لیے سب سے بہتر تمتع ہے' پھر افراد اور پھر قران۔ لیکن جو شخص قربانی کا جانور ساتھ لائے اس کے لیے سب سے بہتر قران ہے۔

مالکیہ کے نزدیک سب سے بہتر افراد ہے' پھر قران اور پھر تمتع۔

سلف میں بعض ائمہ کے نزدیک یہ تینوں صورتیں یکساں ہیں۔ حنفیہ میں سے امام ابو یوسفؒ کے نزدیک قران اور تمتع کی فضیلت یکساں اور افراد سے زیادہ ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۶۸۲۔۶۸۹) (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۹۷۔۹۸)۔

زیادہ تر اہلحدیث علماء کا رجحان حنابلہ کے مسلک کی طرف ہے۔ نیل الاوطار میں قاضی شوکانی نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ ابن حزمؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے قران کے سب سے بہتر ہونے کو ترجیح دی ہے۔

اس سارے اختلاف کی بنیاد اس بارے میں اس پر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا احرام کون سا تھا یا یہ کہ آپ نے کس قسم کو دوسرے لوگوں کے لیے افضل قرار دیا؟ صحابہ کرامؓ سے تینوں قسم کی روایات ملتی ہیں۔

قران: حضرت انسؓ جب حج کے لیے جا رہے تھے تو انہوں نے راستے میں فرمایا "میں نبی صلی اللہ علیہ ہی کے نقش قدم پر چل رہا ہوں۔ آپؐ حج اور عمرہ دونوں کا تلبیہ فرما رہے تھے۔" (بخاری، مسلم، احمد)۔

تمتع: حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت (مذکورہ باب حج کے مناسک) میں یہ گزر چکا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب صفا اور مروہ کے درمیان سعی سے فارغ ہوئے تو آپؐ نے فرمایا۔ "اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا تو میں اپنے ساتھ قربانی کا جانور نہ لاتا اور اپنے حج کے احرام کو عمرہ کا احرام بنا لیتا لہٰذا جس شخص کے پاس قربانی کا جانور نہیں ہے، اسے احرام کھول لینا چاہیے اور اپنے احرام کو عمرہ کا احرام بنا لینا چاہیے۔" (مسلم ابوداؤد وغیرہ)

ابوجمرہ ضبعی سے روایت ہے کہ میں نے تمتع کیا تو کچھ لوگوں نے مجھے منع کیا۔ میں حضرت ابن عباسؓ کے پاس آیا اور ان سے مسئلہ دریافت کیا۔ انہوں نے مجھے تمتع کرنے کا حکم دیا۔ پھر میں مسجد الحرام آیا۔ وہاں مجھے نیند آگئی۔ خواب میں میرے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے مجھ سے کہا "عمرہ اور حج دونوں قبول ہوں۔" میں حضرت ابن عباسؓ کے پاس آیا اور انہیں اپنے خواب کا واقعہ سنایا۔ آپؐ نے فرمایا "اللہ اکبر! یہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔" (بخاری، مسلم، احمد، بیہقی وغیرہ)۔

افراد: حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ جو شخص حج سے پہلے عمرہ کا احرام باندھنا چاہے، باندھ لے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف حج (افراد) کا احرام باندھا اور آپؐ نے عمرہ نہیں کیا (مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، احمد)۔

جو لوگ قران کے افضل ہونے کے قائل ہیں (حنفیہ، ظاہریہ اور دوسرے جن میں حافظ ابن حجرؒ بھی شامل ہیں) ان کے دلائل یہ ہیں:

(۱) قران کی روایات تمتع اور افراد دونوں سے زیادہ ہیں۔

(۲) قران کی روایات میں اضافہ ہے، جو افراد کی روایات میں نہیں ہے۔ اور اضافہ کی روایت جب صحیح ہو، تو وہ قابل قبول ہوتی ہے۔

(۳) قران کی روایات کی کوئی تاویل نہیں کرنی پڑتی' جبکہ افراد کی روایات کی تاویل کرنی پڑتی ہے۔ (مثلاً یہ کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف حج (افراد) کا احرام باندھا اور آپؐ نے عمرہ نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع میں صرف حج کا احرام باندھا تھا' بعد میں آپؐ نے حج کے ساتھ عمرہ بھی شامل فرمالیا)۔

(۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود قران فرمایا اور عمرہ کے بعد احرام کھولنے کا حکم صرف ان لوگوں کو دیا جو قربانی کا جانور نہیں لائے تھے۔

جو لوگ افراد کے افضل ہونے کے قائل ہیں (شافعیہ' مالکیہ) ان کے دلائل یہ ہیں :

(۱) افراد کی روایات حضرت جابرؓ' ابن عباسؓ اور عائشہؓ سے مروی ہیں اور یہ وہ صحابہ ہیں جن کو حجۃ الوداع کے موقع پر دوسرے صحابہ کی نسبت خصوصیت حاصل تھی۔

(۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ' عمرؓ اور عثمانؓ سب نے افراد فرمایا۔ حضرت علیؓ کے متعلق اختلاف ہے۔ اگر افراد افضل نہ ہوتا' تو یہ حضرات افراد نہ کرتے۔

(۳) افراد میں قربانی کے ضروری نہ ہونے پر اجماع ہے' حالانکہ قران اور تمتع میں قربانی واجب ہے۔

جو لوگ قربانی کا جانور نہ لانے والے کے لیے تمتع کے اور قربانی کا جانور لانے والے کے لیے قران کے افضل ہونے کے قائل ہیں' ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی تمنا' فرمائی اور فرمایا۔ "اگر میں قربانی کے جانور نہ لاتا' تو میں اپنا احرام کھول لیتا۔" (مختصراً از الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۹۵-۹۹)۔

نوٹ (۱) : یہ سارا اختلاف صرف اس صورت میں ہے جبکہ حج اور عمرہ کو حج ہی کے مہینوں میں کیا جائے۔ لیکن اگر کوئی شخص حج کے مہینے شروع ہونے سے پہلے پہلے (جیسے شعبان یا رمضان) مکہ معظمہ پہنچے اور اس وقت عمرہ کر کے احرام کھول لے اور پھر حج کے موقع پر ۸ ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھے تو اس کے لیے سب سے بہتر افراد (یعنی صرف حج کا احرام باندھنا) ہے۔ اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔ (رسالہ مناسک حج و عمرہ از امام ابن تیمیہ)۔

(۲) قران' تمتع اور افراد کے متعلق مذکورہ بالا روایات میں تضاد نہیں ہے۔ مختلف محدثین نے ان کے درمیان تطبیق دی ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں "نبی صلی اللہ علیہ وسلم شروع میں قران کی حالت میں تھے۔ اس لیے جس صحابی نے یہ روایت کی ہے کہ آپ کا احرام افراد کا تھا' اس نے دراصل یہ بتایا ہے کہ

شروع میں آپؐ نے صرف حج کی نیت کی تھی۔ جس صحابی نے یہ روایت کی ہے کہ آپ کا احرام قران کا تھا اس نے دراصل یہ بات کہی ہے کہ آپؐ نے بعد میں عمرہ اور حج دونوں کو جمع کر لیا تھا۔ جس صحابی نے یہ روایت کی ہے کہ آپ کا احرام تمتع کا تھا اس نے تمتع کو اس کے لغوی معنی میں استعمال کیا یعنی یہ کہ آپؐ نے حج اور عمرہ کو جمع کر کے فائدہ اٹھایا" (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۹۵)۔

احرام کے محرّمات

احرام کی حالت میں مندرجہ ذیل امور حرام ہیں:

ا۔ سر یا جسم کے بالوں کا کاٹنا یا مونڈنا یا نوچنا: اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ احرام کی حالت میں سر کے بالوں کا کاٹنا یا مونڈنا یا نوچنا جائز نہیں ہے۔ (المغنی ج ۳ ص ۲۶۲)۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ۔ (البقرۃ: ۱۹۶)

اور اپنے سر نہ مونڈو جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔

البتہ بیماری یا کسی دوسرے عذر کی وجہ سے سر کے بالوں کو کاٹنا یا مونڈنا جائز ہے' جبکہ فدیہ ادا کر دیا جائے گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْبِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْنُسُكٍ (بقرہ: ۱۹۶)

مگر تم میں سے جو شخص مریض ہو یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بنا پر اپنا سر منڈوا لے' تو اسے چاہیے کہ فدیے کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔

اس فدیہ کی مزید تشریح کا اس حدیث میں ذکر ہوا ہے:

حضرت کعب بن عجرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا "شاید جوئیں تمہیں تنگ کر رہی ہیں۔" میں نے عرض کیا "جی ہاں اے اللہ کے رسول!" فرمایا "تو تم اپنا سر منڈوا لو اور (فدیہ کے طور پر) تین دن کے روزے رکھو یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو یا ایک بکری کی قربانی دو۔" (بخاری' مسلم وغیرہ)۔

اس پر بھی تمام ائمہ کا اتفاق ہے (بدایۃ المجتہد ج ا ص ۲۹۱)۔

فائدہ: اس جگہ یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ حنفیہ کے نزدیک قارن (جس نے حج اور عمرہ کا اکٹھا احرام باندھا ہو) اس سے اگر کوئی ایسا کام سرزد ہو جائے جو احرام کی حالت میں ناجائز ہے' تو اس پر متمتع اور مفرد کی نسبت دوگنا فدیہ ہے۔ (ھدایہ ج ا ص) وغیرہ۔ لہٰذا

ہم نے ہر جگہ جو فدیہ درج کیا ہے' حنفیہ کے نزدیک قارن کے لیے اسے دوگنا سمجھا جائے۔

روزے یا صدقہ یا قربانی میں سے کسی ایک چیز کے اختیار کرنے کی اجازت اس شخص کو ہے جو کسی عذر کی بنا پر سر منڈوائے یا سر کے بال کٹوائے یا نوچے' لیکن اگر کوئی شخص کسی عذر کے بغیر سر کے بال کاٹ لے یا مونڈ لے یا نوچ لے' تو اس کے ذمہ بطور فدیہ ایک بکری کی قربانی لازمی ہے۔ وہ تین دن کے روزے یا چھ مسکینوں کو کھانا نہیں کھلا سکتا[1]

بالوں کی وہ کم سے کم مقدار کیا ہے' جس کے کاٹنے یا مونڈنے سے فدیہ لازم ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں مختلف ائمہ کی آراء مختلف ہیں' جن کا ہم حاشیہ میں ذکر کرتے ہیں[2]

جسم کے بالوں کا بھی وہی حکم ہے جو سر کے بالوں کا ہے[3]

۲۔ ناخن کاٹنا: اس پر بھی تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ احرام کی حالت میں ناخنوں کا

۱۔ یہ جمہور (جن میں امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ مالکیہ کے نزدیک ایسے شخص کو بھی تین دن کے روزے یا چھ مسکینوں کو کھانا یا ایک بکری کی قربانی میں سے کسی ایک چیز کا اختیار ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۲۲۵)۔

۲۔ حنفیہ کے نزدیک چوتھائی سر یا چوتھائی ڈاڑھی سے زیادہ بال کاٹنے یا مونڈنے پر فدیہ واجب ہوتا ہے۔ اس سے کم مقدار پر نصف صاع گیہوں یا اس کی قیمت کا صدقہ ہے۔

مالکیہ کے نزدیک بارہ بالوں تک کاٹنے یا مونڈنے پر ایک صاع گیہوں کا صدقہ ہے۔ بارہ بالوں سے زائد کاٹنے یا مونڈنے پر فدیہ ہے۔

شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک تین یا اس سے زائد بالوں کے کاٹنے یا مونڈنے پر فدیہ ہے۔ ایک بال کے کاٹنے پر ایک مد (۱/۴ صاع) اور دو بالوں کے کاٹنے پر دو مد (۱/۲ صاع) گیہوں کا صدقہ ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۶۵۷۔ ۶۶۳) (المغنی ج ۳ ص ۳۶۳۔ ۳۶۴)۔ (حنفیہ کے مسلک کے لیے ھدایہ ج ۱ ص ۱۱۶)۔

۳۔ یہ جمہور (جن میں ائمہ اربعہ شامل ہیں) کا مذہب ہے۔ ظاہریہ کے نزدیک فدیہ صرف سر کے بالوں کے کاٹنے پر ہے جسم کے بالوں کے کاٹنے پر نہیں ہے (کیونکہ قرآن کی آیت میں "ولا تحلقوا رؤوسکم" میں صرف سر کا ذکر ہے) (بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۲۹۲)۔

کاٹنا حرام ہے۔ ہاں اگر کوئی ناخن خود ٹوٹ جائے' تو اس کا الگ کر دینا جائز ہے (المغنی ج ۳ ص ۲۶۲)۔

الف۔ ناخن کاٹنا:

جو شخص احرام کی حالت میں ناخن کاٹ لے (خواہ عذر کی بنا پر یا بلا عذر) اس کے ذمہ فدیہ ضروری ہے۔ اس کی مقدار مختلف ائمہ کے نزدیک مختلف ہے' جس کا ذکر ہم حاشیہ میں کرتے ہیں [1]

۳۔ سلا ہوا کپڑا پہننا (یعنی ایسا کپڑا جو بدن کے مطابق سلوا کر پہنا جاتا ہے) جیسے قمیص' شلوار یا پاجامہ وغیرہ [2]

۴۔ سر پر پگڑی یا ٹوپی یا کوئی ایسی چیز اوڑھنا جس سے سر ڈھک جائے۔

۵۔ پاؤں میں موزے' جراب یا کوئی ایسا جوتا پہننا جس سے کعبین [3] (ٹخنے) چھپ جائیں۔

۶۔ بدن پر خوشبو لگانا یا کوئی ایسا کپڑا پہننا جس میں خوشبو لگی ہو۔

ان تمام چیزوں کی ممانعت کا ذکر اس حدیث میں ہوا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص احرام کی حالت میں ہو' وہ نہ قمیص پہنے' نہ پگڑی باندھے' نہ برنس (ایک قسم کا جبہ جس

۱۔ حنفیہ کے نزدیک اگر ناخن پانچ یا اس سے کم ہوں' تو ان پر فی ناخن نصف صاع گندم کا صدقہ ہے اور اگر وہ پانچ سے زیادہ ہوں' تو فدیہ ہے (ھدایہ ج ا ص ۲۱۷) شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک ایک یا دو ناخنوں پر صدقہ ہے۔ تین یا اس سے زیادہ ناخنوں پر فدیہ ہے۔ مالکیہ کے نزدیک ایک ناخن پر صدقہ اور اس سے زیادہ ناخنوں پر فدیہ ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا ص ۶۵۷۔ ۶۶۷)۔

۲۔ احرام کی چادر یا تہبند اگر سلا ہوا ہو' تو اس میں کوئی ہرج نہیں۔ اس پر بھی تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ (رسالہ مناسک حج و عمرہ و امام ابن تیمیہ)۔

۳۔ حنفیہ کے نزدیک کعب سے مراد پاؤں کے درمیان کی وہ ہڈی ہے' جس پر تسمہ باندھا جاتا ہے۔ دوسرے مذاہب والے اس سے اس کے معروف معنی یعنی ٹخنہ ہی مراد لیتے ہیں۔ (الکوکب الدری ج ا ص ۲۷۸)۔

میں ٹوپی لگی ہوتی ہے) پہنے۔ نہ پاجامہ پہنے' نہ کوئی ایسا کپڑا پہنے جس میں ورس (کمیلہ) یا زعفران لگا ہو۔ نہ موزے استعمال کرے' اِلّا یہ کہ اسے نعل (ایسا جوتا جو کعبین۔۔۔۔ ٹخنوں۔۔۔۔ سے نیچے تک رہے) نہ ملے۔ تو وہ موزے ہی استعمال کر سکتا ہے' جبکہ وہ انہیں کعبین (ٹخنوں) کے نیچے تک کاٹ لے۔" (بخاری' مسلم' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' احمد وغیرہ)۔

تمام ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اس حدیث میں جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے احرام کی حالت میں انہیں استعمال کرنا ناجائز ہے۔ قمیص سے مراد ہر سلا ہوا کپڑا ہے۔ پگڑی یا برنس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو سر پر اوڑھی جاتی ہے۔ موزوں سے مراد ہر وہ جوتا یا جراب ہے) جس سے کعبین (ٹخنے) چھپ جائیں۔ (قاضی عیاض بحوالہ الفتح الربانی ج ۱۱' ص ۲۰۲)۔

جو شخص ان میں سے کوئی چیز بھی استعمال کرے گا۔ اس کے ذمہ فدیہ (ایک جانور کی قربانی' یا چھ مسکینوں کو کھانا یا تین دن کے روزے) ضروری ہے۔ [1]

لیکن یہ ممانعت صرف مردوں کے لیے ہے' عورتیں یہ تمام چیزیں استعمال کر سکتی ہیں۔ یعنی سلا ہوا کپڑا (قمیض شلوار وغیرہ) پہن سکتی ہیں۔ دوپٹہ بھی اوڑھ سکتی ہیں۔ پاؤں میں موزے یا جراب بھی پہن سکتی ہیں۔ البتہ مردوں کی طرح وہ بھی خوشبو استعمال نہیں کر سکتیں۔ اس پر بھی تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۱' ص ۲۰۲۔ ۲۰۳)۔

خوشبو کے علاوہ عورت کو احرام کی حالت میں دو اور چیزوں کی ممانعت ہے:

۷۔ نقاب (یا برقعہ) اوڑھنا۔

۸۔ دستانے استعمال کرنا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی مذکورہ بالا حدیث کی ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں: "احرام کی حالت میں عورت چہرے پر نقاب نہ ڈالے اور نہ دستانے استعمال کرے" (بخاری' نسائی' ترمذی' احمد)۔

نقاب سے مراد کسی ایسی چیز سے چہرے کو ڈھانکنا ہے' جو چہرے کو چھوئے کسی ایسی چیز کو چہرے پر لٹکانا جائز ہے' جو چہرے کو ڈھانک تو لے مگر اسے چھوئے نہیں۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ سوار مرد ہمارے پاس سے گزرتے تھے اور ہم

۱۔ اس بارے میں موزوں کے استعمال کے متعلق اختلاف ہے۔ جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ احرام کی حالت میں ہوتی تھیں۔ جب لوگ ہمارے قریب آتے تو ہم سر سے چہرے پر پردہ ڈال لیتی تھیں' اور جب وہ گزر جاتے تو چہرے کھول لیتیں۔ (ابو داؤد' ابن ماجہ)۔[1]

جو شخص (مرد) ٹخنوں سے نیچے تک کا[2] جوتا نہ پائے اور اس کے پاس موزے ہی ہوں' وہ ان ہی کو ٹخنوں سے نیچے تک کاٹ کر استعمال کر سکتا ہے۔ جیسا کہ اوپر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی ہے۔ اس صورت میں اس کے ذمہ کوئی فدیہ نہ ہو گا۔ لیکن اگر وہ انہیں کاٹے بغیر پہنے گا' تو اس کے ذمہ فدیہ ضروری ہو گا۔[3]

۹۔ نکاح کرنا یا نکاح کرانا یا پیغام نکاح دینا: احرام کی حالت میں نکاح کرنا یا نکاح کرانا یا پیغام نکاح دینا حرام ہے۔ اگر کوئی نکاح کرے گا تو وہ نکاح باطل ہو گا۔

حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص احرام کی حالت میں ہو' وہ نکاح نہ کرے نہ نکاح کرائے اور نہ نکاح کا پیغام دے۔ (مسلم' احمد' ابو داؤد'

۱۔ ائمہ اربعہ اور دوسرے تمام ائمہ کا یہی مسلک ہے۔ صرف بعض تفصیلات کا اختلاف ہے' جن کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ (معالم السنن ج ۳ ص ۳۵۴) (الفتح الربانی ۱۱ ص ۳۰۴ و ۳۱۸) وغیرہ۔

۲۔ حنفیہ کے نزدیک پاؤں کے درمیان والی ہڈی سے نیچے تک۔

۳۔ حنابلہ کے سوا سب کا یہی مسلک ہے۔

حنابلہ کے نزدیک اس کے ذمہ کسی حال میں فدیہ نہیں ہے' خواہ وہ انہیں کاٹ کر پہنے یا کاٹے بغیر ان کا استدلال حضرت ابن عباسؓ اور جابرؓ کی اس حدیث سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص تہبند نہ پائے' وہ پاجامہ پہن لے اور جو شخص نعل (ٹخنوں کے نیچے تک کا جوتا) نہ پائے' وہ موزے استعمال کر لے۔" (بخاری و مسلم وغیرہ) یہ حدیث مطلق ہے۔ جس کے حکم کو جمہور کے نزدیک حضرت ابن عمرؓ کی مذکورہ بالا حدیث مقید کرتی ہے۔ لیکن حنابلہ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث کو حضرت ابن عباسؓ کی اس مطلق حدیث پر محمول کرتے ہیں یا اسے اس کی وجہ سے منسوخ قرار دیتے ہیں۔ اور یہی اختلاف کی وجہ ہے۔ حنابلہ کا عام مسلک یہی ہے جو ہم نے یہاں نقل کیا ہے۔ لیکن ابن قدامہ (صاحب المغنی) اور بعض دوسرے حنبلی علماء کا مسلک جمہور ہی کے مسلک کے مطابق ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۲۰۲۔ ۲۰۳)۔

ترمذی' نسائی' ابن ماجہ وغیرہ[1]

۱۰۔ خشکی کے جانوروں کا شکار: (الف) احرام کی حالت میں خشکی کے جانوروں کا شکار کرنا اور انہیں ذبح کرنا حرام ہے۔ اس بارے میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَ أَنتُمْ حُرُمٌ۔۔۔ (المائدۃ: ۹۵)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! حرام کی حالت میں شکار نہ مارو۔

۱۔ یہ جمہور (جن میں امام مالکؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور کوفہ کے دوسرے فقہاء کے نزدیک احرام کی حالت میں نکاح کرنا یا نکاح کرانا یا پیغام نکاح دینا جائز ہے۔ ان کا استدلال حضرت ابن عباسؓ کی اس حدیث سے ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کی حالت میں (مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان) سرف نامی ایک آبادی میں حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا حالانکہ آپؐ اس وقت احرام کی حالت میں تھے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم حج سے فارغ ہو کر پلٹے' تو واپسی میں اسی بستی میں آپؐ نے حضرت میمونہؓ سے خلوت فرمائی۔" (بخاری' مسلم' ابو داوٗد' نسائی' ابن ماجہ' ترمذی' بیہقی)۔ دوسری روایت میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کی حالت میں حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا اور احلال (عدم احرام) کی حالت میں آپؐ نے سرف کے مقام پر ان سے خلوت فرمائی اور سرف ہی کے مقام پر حضرت میمونہؓ کا انتقال ہوا (بخاری' احمد)۔ تیسری روایت میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا حالانکہ اس وقت آپؐ اور حضرت میمونہؓ دونوں احرام کی حالت میں تھے۔" (احمد' نسائی)۔

لیکن دوسرے ائمہ اسے حضرت ابن عباسؓ کا وہم قرار دیتے ہیں۔ جس پر کسی دوسرے صحابی کی ان سے موافقت نہ صرف ثابت نہیں ہے بلکہ اس کی روایت میں نہیں ہے۔ بعض صحابہؓ نے تو اس کی صاف طور پر تردید کی ہے خود حضرت میمونہؓ فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احلال (عدم احرام) کی حالت میں سرف میں نکاح کیا۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ابو رافعؓ بیان کرتے ہیں کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت میمونہؓ سے احلال کی حالت میں نکاح کیا اور احلال ہی کی حالت میں ان سے خلوت فرمائی اور میں ہی وہ شخص تھا جس نے دونوں کے درمیان پیام رسانی کی خدمت انجام دی۔" (احمد' ترمذی' بیہقی) (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۲۳۱)۔

اگلی آیت میں ہے:

وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا۔ (المائدة: ٩٦)

اور خشکی کا شکار' جب تک تم احرام کی حالت میں ہو' تم پر حرام کیا گیا ہے۔

اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (المغنی ج ۳ ص ۲۸۴) بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۲۶۲)۔

(ب) احرام کی حالت میں نہ صرف شکار کرنا حرام ہے' بلکہ کسی شکار کرنے والے کی مدد کرنا یا اسے شکار کا پتہ بتانا یا شکار کی طرف اشارہ کرنا بھی جائز نہیں۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے تو آپؐ نے اور اکثر صحابہؓ کرام نے احرام باندھا۔ ایک صحابی حضرت ابو قتادہؓ تھے۔ انہوں نے احرام نہ باندھا۔ کیونکہ نبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی تھی کہ راستہ میں ممکن ہے دشمن حملہ کر دے' تو آپؐ نے حضرت ابو قتادہؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ کو بلا احرام کے رہنے دیا تاکہ وہ دشمن کا پتہ لگاتے رہیں۔ انہی حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ میں نے راستے میں ایک گورخر دیکھا۔ میں اس کی طرف لپکا۔ میں نے اسے نیزہ مارا اور اس میں گاڑ دیا۔ میں نے لوگوں سے (یعنی صحابہؓ کرام سے جو احرام کی حالت میں تھے) مدد چاہی' مگر انہوں نے میری مدد کرنے سے انکار کر دیا۔" دوسری روایت میں وہ بیان کرتے ہیں۔ "میں نے اپنے ساتھیوں کو (جو کہ احرام کی حالت میں تھے) دیکھا کہ وہ کسی چیز کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ میں نے ادھر دیکھا تو ایک گورخر تھا۔ (میں اس کی طرف لپکا) میرا کوڑا گر گیا' تو ان لوگوں نے کہا کہ ہم احرام کی حالت میں ہیں' اس لیے تمہاری کوئی مدد نہیں کریں گے۔ میں نے اتر کر خود ہی کوڑا اٹھایا"۔۔۔۔ اسی حدیث کے آخر میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ سے دریافت فرمایا کیا تم میں سے کسی نے ان کو (یعنی حضرت ابو قتادہؓ کو) شکار پر حملہ کرنے کے لیے کہا تھا یا شکار کی طرف اشارہ کیا تھا؟" صحابۂ کرامؓ نے جواب دیا "نہیں۔" (بخاری و مسلم وغیرہ)۔

اس بارے میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے (المغنی ج ۳ ص ۲۸۴)۔

(ج) انسان احرام کی حالت میں خواہ خود شکار کرے یا اس کے لیے کوئی دوسرا شخص (جو احرام کی حالت میں نہ ہو) شکار کرے' اس کے لیے اس کا کھانا بہر حال ناجائز ہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "احرام کی حالت میں تمہارے لیے خشکی کا شکار (یعنی اس شکار میں سے کھانا) جائز ہے۔ مَالَمْ تَصِیْدُوْہُ اَوْیصدلکم (جبکہ یہ شکار تم نے خود نہ کیا ہو یا یہ تمہارے لیے نہ کیا گیا ہو)" (ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ وغیرہ) [1]

(د) لیکن اگر کوئی شخص جو احرام کی حالت میں نہ ہو' اپنے طور پر شکار کرے اور پھر محرم کو اس کا گوشت پیش کرے' بغیر اس کے کہ اس نے وہ شکار محرم کے لیے کیا ہو' تو محرم کے لیے ایسے شکار کا گوشت کھانا جائز ہے۔ جیسا کہ حضرت جابرؓ کی مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ نیز حضرت ابو قتادہؓ کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے شکار کا گوشت پیش کیا۔ تو آپؐ نے خود بھی اسے کھایا اور صحابہ کرامؓ نے بھی کھایا' حالانکہ اس وقت آپ احرام کی حالت میں تھے۔ (بخاری' مسلم وغیرہ) [2]

۱۔ یہ امام مالکؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ' داؤد ظاہریؒ کا مسلک ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک احرام کی حالت میں شکار کا گوشت کھانا صرف اس صورت میں حرام ہے۔ جب کہ انسان نے خود یہ شکار کیا ہو یا شکار کرنے والے کی مدد کی ہو یا شکار کی طرف اشارہ کیا ہو۔ اگر کوئی دوسرا شخص اس کے لیے شکار کر کے لائے' تو اس کے لیے اس کا گوشت کھانا جائز ہے۔ یہی مسلک صحابہؓ میں سے حضرت عمرؓ' ابو ہریرہؓ' زبیر بن عوامؓ اور تابعین میں سے مجاہد اور سعید بن جبیرؒ سے مروی ہے۔ ان کا استدلال ان احادیث سے ہے۔ جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کی حالت میں شکار کے گوشت کی حرمت کے لیے یہ وجہ بیان نہیں فرمائی کہ شکار محرم کے لیے کیا گیا ہو۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے صرف یہ دریافت کیا کہ "کیا تم میں سے کسی نے ان کو (یعنی ابو قتادہؓ کو) شکار کرنے کے لیے کہا تھا یا شکار کی طرف اشارہ کیا تھا؟" حضورؐ نے ان سے یہ دریافت نہیں فرمایا کہ کیا ابو قتادہؓ نے یہ شکار تمہارے لیے کیا؟ رہی حضرت جابرؓ کی مذکورہ بالا حدیث تو اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "مالم تصیدوہ اوء یصدلکم" کا مطلب حنفیہ یہ لیتے ہیں کہ "جب تک یہ شکار تمہارے کہنے پر نہ کیا گیا ہو۔" (الکوکب الدری ج ۱ ص ۲۸۰) (المغنی ج ۳ ص ۲۸۹) (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۲۵۰)۔

۲۔ یہ جمہور (جن میں امام مالکؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ اور داؤد ظاہریؒ شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ صحابہ میں سے حضرت عائشہؓ' ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ اور تابعین میں سے عطاءؒ کے متعلق روایت ہے کہ ان کے

(ھ) جو شخص احرام کی حالت میں شکار مار ڈالے' اس کے ذمہ شکار کے بقدر نذر ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَقْتُلُوا۟ ٱلصَّيْدَ وَأَنتُمْ حُرُمٌ ۚ وَمَن قَتَلَهُۥ مِنكُم مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ	اے لوگو جو ایمان لائے ہو! احرام کی حالت میں شکار نہ مارو' اور اگر تم میں سے کوئی جان بوجھ کر ایسا کر گزرے' تو جو

نزدیک احرام کی حالت میں انسان کے لیے شکار کا گوشت کھانا بہر حال حرام ہے خواہ وہ شکار اس نے خود کیا ہو یا کسی دوسرے نے کیا ہو' اس کے لیے کیا ہو یا اس نے اپنے طور پر کیا ہو اور پھر لا کر اسے پیش کر دیا ہو۔ اسی مسلک کو امام ابو حنیفہؒ نے اختیار کیا ہے۔ ان کا استدلال اللہ تعالیٰ کے ارشاد "حرم علیکم صیدالبر ما دمتم حرما۔" (جب تک تم احرام کی حالت میں ہو' تم پر شکار حرام کر دیا گیا ہے) کے ظاہری الفاظ سے ہے۔ اس آیت میں صید (شکار) کا مطلب ان کے نزدیک مصید (شکار کیا جانے والا جانور) ہے۔ نیز ان کا استدلال بعض ایسی احادیث سے بھی ہے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کی حالت میں شکار کا گوشت قبول کرنے سے انکار فرمایا۔ مثلاً حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ صعب بن جثامہ اسدیؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ صحابہ کرام کو جب کہ آپ احرام کی حالت میں تھے' ایک گورخر کا بازو بطور تحفہ پیش کیا۔ آپؐ نے اسے لوٹا دیا اور فرمایا "ہم لوگ احرام کی حالت میں ہیں۔" (احمد' مسلم' نسائی' بیہقی وغیرہ)۔

دوسری روایت میں حضرت صعب بن جثامہؓ فرماتے ہیں کہ "میں ابواء یا ودان کے مقام پر کھڑا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس سے گزرے۔ اس وقت آپ احرام کی حالت میں تھے۔ میں نے آپ کی خدمت میں گورخر کا گوشت پیش کیا۔ تو آپؐ نے اسے لوٹا دیا' اور جب میرے چہرے پر ناگواری کے آثار دیکھے تو فرمایا "ہم نے تمہارا تحفہ صرف اس لیے لوٹایا ہے کہ اس وقت ہم احرام کی حالت میں ہیں (ورنہ کبھی نہ لوٹاتے)" (احمد' بخاری' مسلم' مالک' نسائی' ترمذی' ابن ماجہ' بیہقی)۔

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آیت "حرم علیکم----" اور یہ احادیث مطلق ہیں جن کے مفہوم کو امام ابو حنیفہؒ ان احادیث سے مقید کرتے ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کی حالت میں شکاری کی مدد کرنے یا شکار کی طرف اشارہ کرنے سے منع فرمایا اور امام مالکؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ اور داؤد وغیرہ ان کے مفہوم کو حضرت جابرؓ کی مذکورہ بالا حدیث اور اسی معنی کی دوسری احادیث سے مقید کرتے ہیں (الفتح الربانی ج ۱۱' ص ۲۵۰)۔

النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسَاكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ۔ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ۔ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ۔ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُوانْتِقَامٍ۔ (المائدۃ: ۹۵)۔

جانور اس نے مارا ہو' اس کے مثل ایک جانور اسے مویشیوں میں سے نذر دینا ہو گا جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے اور یہ قربانی کعبہ (یعنی حرم تک) پہنچائی جائے گی یا اس کے ذمہ بطور کفارہ چند مساکین کا کھانا ہے یا اس کے برابر روزے رکھنا تاکہ وہ اپنے کیے کا مزہ چکھے۔ پہلے (یعنی زمانہ جاہلیت میں) جو ہو چکا' اسے اللہ نے معاف کر دیا' لیکن اب اگر کسی نے اس حرکت کا اعادہ کیا۔ تو اس سے اللہ تعالےٰ بدلہ لے گا۔ اللہ سب پر غالب ہے اور بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہے۔

اس آیت میں اگرچہ نذرانہ صرف اس شخص پر فرض کیا گیا ہے' جس نے جان بوجھ کر احرام کی حالت میں شکار مارا ہو' لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی رو سے جس شخص نے بھول کر بھی احرام کی حالت میں شکار کیا ہو اس پر بھی نذرانہ ضروری ہے۔ امام زہریؒ فرماتے ہیں "قرآن نے صرف اس شخص کا حکم بیان کیا ہے' جس نے جان بوجھ کر احرام کی حالت میں شکار مارا ہو۔ سنت میں یہی اس شخص کا بھی حکم بیان کیا گیا ہے۔ جس نے بھول کر احرام کی حالت میں شکار مار ڈالا ہو۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص احرام کی حالت میں شکار مار ڈالے' اس کے ذمہ ایک مینڈھے کی قربانی ہے۔" (ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' بیہقی' حاکم' ابن حبان)۔

اس طرح اور بھی بہت سی احادیث ہیں، جن میں نبی علیہ السلام نے جان بوجھ کر شکار کرنے والے اور بھول کر شکار کرنے والے کا الگ الگ حکم بیان نہیں فرمایا۔[1]

---

[1] یہ جمہور (جن ائمہ اربعہ شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ حضرت ابن عباسؓ' سعید بن جبیرؒ' طاؤسؒ' ابن المنذرؒ اور امام داؤد ظاہریؒ کے نزدیک نذرانہ صرف اس شخص پر واجب ہے' جو جان بوجھ کر (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس آیت میں "یہ قربانی کعبہ تک پہنچائی جائے گی" کا مطلب یہ ہے کہ نذرانہ کا جانور مکہ معظمہ میں ذبح کیا جائے گا اور اس کا گوشت وہیں مسکینوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (ابن کثیر)۔

نوٹ: اس کی مزید تشریح منیٰ میں قربانی کے مسائل کے باب میں آئے گی۔

۱۱۔ جماع اور وہ چیزیں جو اس کی طرف مائل کرنے والی ہوں' جیسے عورت کا بوسہ لینا' یا شہوت کے ساتھ اسے چھونا یا جماع سے متعلق اس سے بات چیت کرنا۔

۱۲۔ بدکاری و معصیت کے تمام کام۔

۱۳۔ لڑائی جھگڑا۔

ان سب چیزوں سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے۔

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلاَ رَفَثَ وَلاَ فُسُوقَ وَلاَ جِدَالَ فِي الْحَجِّ۔ (البقرۃ: ۱۹۷)

لہذا جو شخص (حج کے) ان مہینوں میں حج کی نیت کرے' اسے جان لینا چاہیے کہ حج میں کوئی شہوانی فعل' کوئی بدکاری اور کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہے۔

(الف) اس پر اجماع ہے کہ احرام کی حالت میں جماع سے حج یا عمرہ باطل ہو جاتا ہے۔ فدیہ یا کسی اور چیز سے اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ (المغنی ج ۳ ص ۳۱۵) (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۲۲۳)۔

یزید بن نعیم اسلمی (ایک تابعی) سے روایت ہے کہ قبیلہ جزام سے ایک آدمی نے اپنی بیوی سے جماع کر لیا' حالانکہ وہ دونوں احرام کی حالت میں تھے۔ اس آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مسئلہ دریافت کیا۔ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا "تم دونوں حج کے مناسک پورے کر لو اور قربانی دو۔ پھر تم دونوں واپس چلے جاؤ۔ جب تم اس جگہ پہنچو' جہاں تم نے یہ کام کیا' تو ایک دوسرے سے الگ ہو جاؤ۔ تم آپس میں ایک دوسرے کو نہ دیکھنے پاؤ' اور تمہارے دونوں کے ذمہ ایک اور حج ہے۔ (اگلے کسی سال) تم دونوں آؤ اور جب اس جگہ پہنچو جہاں تم نے یہ کام کیا' تو احرام باندھو اور اپنے مناسک حج پورے کرو اور قربانی دو۔" (بیہقی)

یہ روایت اگرچہ سند کے لحاظ سے منقطع ہے' لیکن حضرت عمرؓ' علیؓ' ابو ہریرہؓ

احرام کی حالت میں شکار کرے۔ ان کا استدلال آیت کے ظاہری الفاظ سے ہے (المغنی ج ۳ ص ۳۴۴)۔

عبداللہ بن عباسؓ اور بعض دوسرے صحابہ کرامؓ کے فتاویٰ اس کے مطابق ہیں (الفتح الربانی حوالہ مذکور)۔

(ب) جماع خواہ وقوف عرفات سے پہلے ہو یا بعد میں جب تک حج کے مناسک پورے نہ ہو لیں' اس سے حج بہر حال باطل ہو جائے گا[1]

(ج) اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس شخص کا حج احرام کی حالت میں جماع کرنے کی وجہ سے باطل ہو جائے' اس کے ذمہ ایک اونٹ کی قربانی ضروری ہے[2]

(د) احرام کی حالت میں عورت کو شہوت سے چھونے یا اس کا بوسہ لینے سے حج باطل نہیں ہوتا' لیکن اس کے بعد فدیہ ضروری ہے[3]

فائدہ: (۱) مذاہب اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ احرام کی حالت میں خوشبو کا سونگھنا اگرچہ حرام نہیں ہے یعنی اس سے حج یا عمرہ باطل نہیں ہوتا اور نہ اس سے فدیہ ضروری ہوتا ہے۔ لیکن یہ مکروہ ہے۔ اس سے بچنا بہتر ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۶۲۸)۔

(۲) مذاہب اربعہ میں سے حنفیہ' مالکیہ اور حنبلیہ کے نزدیک مرد یا عورت کا احرام کی حالت میں مہندی لگانا حرام اور شافعیہ کے نزدیک مکروہ ہے۔ (الفقہ۔۔۔۔ ص ۶۲۸)۔

۱۔ یہ امام مالکؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ اور دوسرے ائمہ کا مسلک ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے شاگردوں کے نزدیک اگر جماع وقوف عرفہ سے پہلے ہو' تو اس سے حج باطل ہو جائے گا' اور اگر وہ وقوف عرفہ کے بعد ہو' تو اس سے حج باطل نہیں ہو گا۔ کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اَلْحَجُّ عَرَفَۃُ یعنی حج وقوف عرفہ ہے۔" (ابو داود' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ) وغیرہ۔

دوسرے ائمہ کے نزدیک اس حدیث میں وقوف عرفہ کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جماع اگر اس کے بعد ہو' تو حج باطل نہیں ہو گا (کیونکہ وقوف عرفہ سے حج کے مناسک پورے نہیں ہو جاتے) (المغنی ج ۳ ص ۳۱۵) ہدایہ ج ۱ ص ۱۱۹)۔

۲۔ یہ امام مالکؒ' شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ وغیرہ کا مسلک ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ایک اونٹ کے بجائے ایک بکری کی قربانی بھی ہو سکتی ہے۔ اونٹ کی قربانی اس وقت ضروری ہے۔ جب کہ جماع وقوف عرفہ کے بعد ہونے کی وجہ سے حج باطل نہ ہو۔ (ہدایہ حوالہ مذکورہ) المغنی ج ۳ ص ۳۱۷)۔

۳۔ اس پر ائمہ اربعہ اور بہت سے دوسرے ائمہ کا اتفاق ہے (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۲۳۶) (ہدایہ ج ۱ ص ۱۱۸)۔

احرام کے مباحات [1]

ا۔ غسل کرنا' سر کا دھونا اور چادر و تہبند کا بدلنا :

عبداللہ بن حنین سے روایت ہے کہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور مسورؓ کے ساتھ ابواء (مکہ و مدینہ کے درمیان ایک جگہ) کے مقام پر تھا۔ احرام کی حالت میں سر دھونے کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ حضرت مسور کی رائے یہ تھی کہ احرام کی حالت میں سر نہیں دھویا جا سکتا۔ حضرت ابن عباسؓ کی رائے تھے کہ اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ اس پر حضرت ابن عباسؓ نے مجھے حضرت ابو ایوب (انصاری) کے پاس بھیجا کہ ان سے جا کر یہ عرض کروں کہ آپ کے بھتیجے عبداللہ بن عباسؓ آپ کو سلام کہتے ہیں اور یہ دریافت کرتے ہیں کہ احرام کی حالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سر مبارک کس طرح دھویا کرتے تھے؟ میں نے انہیں کنوئیں پر لگی ہوئی دو لکڑیوں کے درمیان غسل فرماتے دیکھا۔ انہوں نے ایک کپڑے سے پردہ کر رکھا تھا۔ جب انہیں میرے آنے کا پتہ چلا' تو انہوں نے کپڑا اپنے سینے کے قریب کر دیا' یہاں تک کہ مجھے ان کا چہرہ نظر آنے لگا۔ ایک آدمی کھڑا ان کے سر پر پانی ڈال رہا تھا۔ حضرت ابو ایوبؓ نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سارے سر پر پھیرے انہیں آگے لے گئے اور پیچھے لے گئے۔ (جب میں نے آکر حضرت ابن عباسؓ اور حضرت مسورؓ کو حضرت ابو ایوبؓ کا یہ جواب بتایا' تو حضرت مسورؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا۔ "آئندہ میں آپ سے کبھی بحث نہ کروں گا۔" (بخاری' مسلم' مالک' ابو داؤد' نسائی' ابن ماجہ' بیہقی)۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابو ایوبؓ نے ایک آدمی سے کہا کہ میرے سر پر پانی ڈالو' اس شخص نے پانی ڈالا' انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سر کو ملا۔ آپ ہاتھوں کو پیچھے لے گئے اور آگے لے گئے اور پھر فرمایا "اس طرح میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو (احرام کی حالت میں) کرتے دیکھا ہے۔" (بخاری و مسلم)۔

اس حدیث کی بنا پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ احرام کی حالت میں انسان کے لیے اپنا

---

[1] ا۔ احرام کے مباحات سے مراد وہ چیزیں ہیں' جن کے متعلق گذشتہ باب "احرام کے محرمات" کی وجہ سے یہ شک ہو سکتا ہے کہ وہ احرام کی حالت میں جائز نہیں ہیں' حالانکہ وہ جائز ہیں۔

سر دھونا' اس پر پانی ڈالنا اور اسے ملنا' جب کہ اسے بالوں کے ٹوٹنے کا اندیشہ نہ ہو' جائز ہے۔ جنابت کی وجہ سے غسل کرنا تو سب کے نزدیک نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے۔ گرمی میں محض ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے نہانے پر بھی جمہور ائمہ کا اتفاق ہے۔ سر کے دھونے میں اختلاف ہے۔ اکثر ائمہ (جن میں امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ' اوزاعیؒ' اسحاقؒ اور ثوریؒ شامل ہیں) کے نزدیک یہ بھی جائز ہے۔ [1]

فائدہ : حنفیہ' شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک غسل میں صابون (جب کہ اس میں خوشبو نہ ہو) استعمال کرنا بھی جائز ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۶۴۲)۔

۲۔ سر پر سایہ کرنا :

حضرت ام حصینؓ سے روایت ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج الوداع میں شریک تھی۔ میں نے اسامہ بن زیدؓ اور بلالؓ کو دیکھا کہ دونوں میں سے ایک نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کی لگام پکڑ رکھی ہے اور دوسرے نے اپنے ہاتھ پر کپڑا اٹھا رکھا ہے تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوپ سے سایہ کرے' یہاں تک کہ آپ رمی جمار سے فارغ ہو گئے۔" (احمد' مسلم وغیرہ)۔

اس حدیث کی رو سے انسان کے لیے احرام کی حالت میں خیمہ یا چھتری یا چھت سے اپنے سر پر سایہ کرنا جائز ہے خواہ وہ چل رہا ہو یا کسی جگہ ٹھہرا ہوا ہو۔ [2]

۱۔ امام مالکؒ کے نزدیک ایسا کرنا مکروہ ہے۔ ان کا استدلال حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے عمل سے ہے کہ وہ صرف احتلام کی وجہ سے اپنا سر دھویا کرتے تھے' کسی دوسری وجہ سے نہیں۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۲۱۳)۔ (موطا امام مالکؒ)۔

حضرت ابو ایوبؓ کی مذکورہ بالا حدیث میں غسل کو امام مالکؒ احتلام کی وجہ سے غسل پر محمول کرتے ہیں' عام غسل پر نہیں۔ (ہدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۲۶۲)۔

۲۔ یہ جمہور (جن میں امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک انسان کے لیے احرام کی حالت میں اس وقت تو سر پر سایہ کرنا جائز ہے جب وہ کسی جگہ ٹھہرا ہوا ہو' لیکن اگر وہ چل رہا ہو' تو اس کے لیے سایہ کرنا ناجائز ہے۔ اگر وہ سایہ کرے گا تو اس کے ذمہ فدیہ ضروری ہو گا۔ ان کا استدلال حضرت ابن عمرؓ کے اس عمل پر ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو احرام کی حالت میں اپنے اونٹ پر

۳۔ بطور علاج آنکھ میں سرمہ یا کوئی اور دوا ڈالنا جبکہ اس میں خوشبو نہ ہو۔

عمر بن عبید اللہ نے حضرت عثمانؓ کے بیٹے ابانؒ کے پاس اپنا ایک آدمی بھیج کر دریافت کیا کہ آیا احرام کی حالت میں آنکھ میں سرمہ لگایا جا سکتا ہے' اور اگر لگایا جا سکتا ہے تو کس چیز کا سرمہ لگایا جا سکتا ہے؟ ابان نے جواب میں کہلا بھیجا کہ ہاں احرام کی حالت میں "ان یضمدھا بالصبر آنکھ پر ایلوے کا لیپ کیا جا سکتا ہے یا ایلوا آنکھ پر رکھا جا سکتا ہے)۔ اس لیے کہ میں نے (اپنے والد) حضرت عثمانؓ کو اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرتے ہوئے سنا ہے۔" (مسلم' احمد' بیہقی' ابوداؤد' ترمذی' نسائی)۔ ابوداؤد کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں "ابان اس وقت امیر حج تھے۔"

اس حدیث کی بنیاد پر اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ بطور علاج آنکھ میں سرمہ یا کوئی اور دوا ڈالنا بغیر کسی فدیہ کے جائز ہے' جب کہ اس پر خوشبو نہ ہو' اور اگر اس میں خوشبو ہو تو

بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس نے دھوپ سے اپنے اوپر سایہ کر رکھا تھا تو آپ نے اس سے فرمایا۔ اس ہستی کے لیے دھوپ برداشت کرو' جس کے لیے تم نے احرام باندھا ہے۔" (بیہقی)۔ نیز ان کا استدلال اس سے بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کوئی شخص احرام کی حالت میں دھوپ برداشت نہیں کرتا یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے۔ مگر وہ سورج اس کے گناہوں کو لے کر غروب ہوتا ہے' یہاں تک کہ وہ گناہوں سے اس دن کی طرح پاک صاف ہو جاتا ہے جس دن اس کی ماں نے اسے جنا تھا" (بیہقی)۔

دوسرے ائمہ کے نزدیک حضرت ابن عمرؓ کا عمل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی موجودگی میں قابل حجت نہیں ہے۔ رہی دوسری حدیث تو اس کی سند کمزور ہے اور اگر اسے قابلِ حجت بھی مان لیا جائے۔ تو اس میں زیادہ سے زیادہ احرام کی حالت میں دھوپ میں رہنے کو افضل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر سایہ کرنا غیر افضل ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود کیوں سایہ فرماتے۔" (امام شوکانی حوالہ الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۲۱)۔

امام احمدؒ کے نزدیک حضرت اُمِ حصینؓ کی مذکورہ بالا حدیث قابلِ حجت ہے' لیکن چونکہ حضرت ابن عمرؓ نے احرام کی حالت میں سایہ کرنے سے منع فرمایا ہے' اس لیے ان کا مسلک یہ ہے کہ ٹھہرنے کی حالت میں تو ہر چیز سے سایہ کرنا جائز ہے' لیکن چلتے وقت کسی ایسی چیز سے تو سایہ کرنا جائز ہے' جو عارضی ہو' جیسے کپڑا۔ لیکن ایسی چیز سے سایہ کرنا مکروہ تنزیہی ہے جس سے سایہ کرنے میں آرام طلبی پائی جاتی ہو جیسے کجاوا وغیرہ۔ (المغنی ج ۳ ص ۲۶۹۔ ۲۷۰)۔

بھی اس کا ڈالنا صرف جائز ہے' لیکن اس صورت میں فدیہ ضروری ہے۔ (امام نوویؒ بحوالہ الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۲۶۳) تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۱۶۰)۔

لیکن زینت کے لیے سرمہ لگانا مکروہ ہے' اگرچہ اس کی وجہ سے بھی فدیہ ضروری نہیں ہے (جبکہ اس میں خوشبو نہ ہو) اس بارے میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے (المغنی ج ۳ ص ۳۰۷)۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ جب یمن سے واپس آئے' تو انہوں نے حضرت فاطمہؓ کو دیکھا کہ انہوں نے (احرام کھولنے کے بعد) رنگ دار کپڑے پہنے ہوئے تھے اور سرمہ لگا رکھا تھا۔ حضرت علیؓ کو یہ چیز پسند نہ آئی تو حضرت فاطمہؓ نے کہا کہ میرے ابا جان (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے اس کا (یعنی احرام کھولنے کا حکم دیا تھا۔ (احمد' مسلم' ابوداؤد وغیرہ)۔

اس حدیث سے وجہ استدلال یہ ہے کہ احرام کی حالت میں سرمہ لگانا مکروہ ہوگا۔ تب ہی تو حضرت علیؓ نے اس کا ان چیزوں میں ذکر کیا ہے جنہیں حضرت فاطمہؓ نے احرام کھولنے کے بعد استعمال کیا۔

۴۔ کوئی ایسا کپڑا استعمال کرنا' جس پر خوشبو لگی ہو' لیکن اسے دھولیا گیا ہو اور اس کی بُو دور ہو گئی ہو۔ :

حضرت یعلیٰ بن امیہؓ سے روایت ہے کہ ایک بدو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے ایک ایسا جبہ پہن رکھا تھا جس میں خوشبو لگی ہوئی تھی۔ اس نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول! میں نے اس حال میں جس میں آپ مجھے دیکھ رہے ہیں' احرام کیا ہے اور لوگ مجھ پر ہنس رہے ہیں۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (سوچتے ہوئے) تھوڑی دیر کے لیے سر جھکایا' اور اس شخص سے فرمایا "اپنا یہ جبہ اتار دو اور اپنے سے یہ زعفران (خوشبو) دھوڈالو۔" [1] (بخاری' مسلم' احمد' مالک' ابوداؤد' نسائی وغیرہ)۔

---

[1] اس بارے میں صرف اتنا اختلاف ہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک ضروری ہے کہ دھونے سے خوشبو کی نہ صرف بو دور ہو گئی ہو بلکہ اس کا نشان بھی زائل ہو گیا ہو' اگر نشان باقی ہو' تو یہ مکروہ ہے۔ دوسرے ائمہ کے نزدیک نشان کا رہ جانا مکروہ نہیں۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۲۰۵)۔

۵۔ سمندری جانور کا شکار کرنا :

اس پر اجماع ہے کہ احرام کی حالت میں سمندر کے جانور ۔۔۔ مچھلی کا شکار کرنا' اس کا گوشت کھانا اور اس کی خرید و فروخت کرنا جائز ہے۔ (المغنی ج ۳ ص)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ۔ (المائدہ : ۹۶)

تمہارے لیے (احرام کی حالت میں) سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا ہے۔ جہاں تم ٹھہرو وہاں بھی اسے کھا سکتے ہو اور اس کا زادِ راہ بھی لے سکتے ہو۔

۶۔ عورت کا چھونا :

احرام کی حالت میں عورت کا شہوت کے بغیر چھونا جائز ہے۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے [۱] (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۲۳۶)۔

۷۔ موذی جانور کا مارنا :

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "پانچ جانور ایسے ہیں' جن میں سے ہر ایک فاسق (نافرمان یعنی موذی) ہے۔ يُقْتَلْنَ فِي الْحَرَمِ" (انہیں حدود حرم میں یا احرام کی حالت میں قتل کیا جائے گا) چیرنے پھاڑنے والا کتا' بچھو' کوا' چیل اور چوہا۔" (بخاری' مسلم' احمد' نسائی' ترمذی' بیہقی وغیرہ)۔

ایک دوسری روایت میں سانپ کا بھی ذکر ہے۔ (مسلم، نسائی، احمد، ابن ماجہ، بیہقی)

اس حدیث میں جن چھ موذی جانوروں کا ذکر ہے' انہیں اور جو بھی دوسرے جانور ان کے حکم میں آتے ہوں' ان کے احرام کی حالت میں مارنے پر جمہور ۔۔۔۔ (ائمہ اربعہ اور دوسرے تمام معروف ائمہ) کا اتفاق ہے۔ اگر کوئی شخص احرام کی حالت میں انہیں مار ڈالے' تو اس کے ذمہ کوئی کفارہ نہیں ہے۔ (نووی بحوالہ الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۲۷۵)۔

۱۔ یہ اتفاق اس بارے میں ہے کہ عورت کو چھونے سے احرام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کتاب کے پہلے حصہ میں یہ گزر چکا ہے کہ شافعیہ کے نزدیک عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ دوسروں کے نزدیک وضو نہیں ٹوٹتا۔

۸۔ خادم کو برائے تادیب سرزنش کرنا :

احرام کی حالت میں اگرچہ لڑائی جھگڑا ممنوع ہے' لیکن اگر کسی کا خادم کوئی ایسا کام کرے جس پر وہ سزا یا ڈانٹ کا مستحق ہو' تو وہ احرام کی حالت ہی میں اسے مار یا ڈانٹ سکتا ہے' اگرچہ بہتر یہ ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے یا اس کی سزا کو احرام کھولنے تک موخر کر دیا جائے۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۲۱۶)۔

حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کے لیے نکلے (اور احرام باندھے ہوئے تھے)۔ جب ہم عروج (مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ایک جگہ) پہنچے' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں پڑاؤ ڈالا۔ حضرت عائشہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب اور میں اپنے والد (حضرت ابوبکر صدیقؓ) کے پاس بیٹھ گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کا سامان ایک ہی اونٹ پر تھا' جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ایک غلام کی نگرانی میں تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ بیٹھ کر اس غلام کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ آیا' تو اس کے ساتھ اونٹ نہ تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس سے دریافت فرمایا "اونٹ کہاں ہے ؟" اس نے جواب دیا "وہ تو گم ہو گیا۔" حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "ایک ہی تو اونٹ تھا اور اسی کو تم نے گم کر دیا۔" وہ اس غلام کو مارنے لگے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم انہیں مارتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور ہنس رہے تھے اور یہ فرما رہے تھے "اس محرم کی طرف دیکھو کہ یہ کیا کر رہا ہے۔" (احمد' ابوداؤد' بیہقی)۔

۹۔ فصد لگوانا (یعنی جسم کے کسی حصہ کا خون نکلوانا) :

علاج کے طور پر احرام کی حالت میں سر یا جسم کے کسی حصے میں فصد لگوائی جا سکتی ہے۔ اگر اس سے بال ٹوٹ جائیں (یعنی وہ سر یا جسم کے کسی ایسے حصے میں لگوائی جائے جس پر بال ہوتے ہیں) تو فدیہ ضروری ہے' اور اگر بال نہ ٹوٹیں' تو فدیہ ضروری نہیں' اس بارے میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۲۱۲)۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے درد کی وجہ سے اپنے سر میں فصد لگوائی' حالانکہ آپؐ اس وقت احرام کی حالت میں تھے۔" (بخاری' مسلم' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' احمد وغیرہ)۔

۱۰۔ سر یا بدن میں کھجلی کرنا :

اگر بال ٹوٹنے کا اندیشہ نہ ہو تو سر اور بدن میں کھجلی کی جا سکتی ہے۔ اس بارے میں اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث ثابت نہیں ہے' لیکن بہت سے صحابہ کرام کا عمل اور فتویٰ اسی کے مطابق ہے۔

حضرت عائشہؓ سے سوال کیا گیا کہ کیا احرام کی حالت میں بدن میں کھجلی کی جا سکتی ہے ؟ انہوں نے جواب دیا "ہاں' خوب زور سے کھجلی کی جا سکتی ہے۔" (بیہقی)۔

حضرت ابن عمرؓ اپنی انگلیوں کے کنارے سے سر میں کھجلی کیا کرتے تھے۔" [1] (بیہقی' سعید بن منصور)۔

۱۱۔ مرد کا چہرہ ڈھانپنا :

احرام کی حالت میں مرد کے لیے اپنا چہرہ ڈھانپنا جائز نہیں ہے' کیونکہ چہرہ ڈھانپنے کی ممانعت مرد کے لیے نہیں ہے۔ صرف عورت کے لیے ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص احرام کی حالت میں اپنی اونٹنی سے گر کر مر گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ نہلانے کے بعد اس کا سر نہ ڈھکا جائے' اس لیے کہ وہ قیامت کے دن تلبیہ کہتا ہوا اٹھے گا۔ [2] (بخاری' مسلم' ابو داؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ وغیرہ)۔

۱۔ حنفیہ' مالکیہ' حنابلہ اور عام اہلحدیث علماء) کا یہی مسلک ہے۔ شافعیہ کے نزدیک احرام کی حالت میں کھجلی کرنا مکروہ ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۶۴۲)۔

۲۔ یہ امام شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ' سفیان ثوریؒ' داؤد ظاہریؒ اور ابو ثورؒ وغیرہ کا مسلک ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عثمانؓ' عبد الرحمٰن بن عوفؓ' زید بن ثابتؓ' عبد اللہ بن زبیرؓ' سعد بن ابی وقاصؓ اور جابرؓ کا یہی مسلک تھا۔ (المغنی ج ۳ ص ۳۰۴)۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک احرام کی حالت میں مرد کے لیے سر کی طرح چہرے کا ڈھانپنا بھی جائز نہیں ہے۔ صحابہؓ میں سے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا یہی مسلک تھا ان کا استدلال حضرت ابن عباسؓ ہی کی مذکورہ بالا حدیث کی ایک دوسری روایت سے ہے' جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یوں

ہیں کہ "اس کا چہرہ اور سر نہ ڈھکو' اس لیے کہ وہ قیامت کے دن تلبیہ کہتا ہوا اٹھے گا۔" (مسلم' احمد)۔

پہلے مسلک والے اس روایت کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرے کو ڈھانپنے سے اس لیے منع نہیں فرمایا کہ احرام کی حالت میں اس کا ڈھانپنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ اس لیے منع فرمایا ہے کہ کہیں اس کے ڈھانپنے سے سر نہ ڈھک جائے۔ (شرح مسلم النووی ج'ا ص ۳۸۴)۔

تلبیہ

ا۔ تلبیہ کا حکم:

حج یا عمرہ کا احرام باندھنے یا نیت کرنے کے بعد تلبیہ (لبیک اللھم لبیک۔۔۔) کی مشروعیت (یعنی اس کے مناسک حج و عمرہ میں سے ہونے) پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۱۸۷)۔

حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے۔ "اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے لوگو! تم میں سے جو شخص حج کرے، اسے چاہیے کہ تلبیہ کرے۔" (احمد)

اختلاف اس بارے میں ہے کہ آیا یہ حج یا عمرہ کا رکن ہے یا واجب یا سنت [1]؟"

۲۔ تلبیہ کی فضیلت:

تلبیہ کی فضیلت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد احادیث مروی ہیں:

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو شخص دن کے چڑھنے کے ساتھ احرام باندھتا اور تلبیہ کہتا ہے، یہاں تک کہ سورج غروب ہو جاتا ہے، تو سورج اس کے گناہوں کو لے کر غروب ہو جاتا ہے، اور وہ گناہوں سے اس طرح نکل جاتا ہے، جس طرح اپنی پیدائش کے وقت تھا۔" (احمد، ابن ماجہ، بیہقی، طبرانی)۔

ا۔ مالکیہ کے نزدیک تلبیہ واجب ہے، یعنی اگر یہ رہ جائے، تو حج یا عمرہ ہو جاتا ہے لیکن فدیہ۔ ایک جانور کی قربانی۔ لازم آتا ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ص ۶۲۳۱)۔

حنفیہ کے نزدیک تلبیہ کا ایک مرتبہ احرام کے ساتھ کہنا فرض ہے۔ یعنی اگر احرام کی نیت کرتے ہوئے تلبیہ نہ کہا جائے گا، تو احرام نہ ہو گا۔ بعد میں اس کا کہنا مسنون ہے۔ یوں کوئی دوسرا ذکر، جس سے مقصود اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہو، جیسے سبحان اللہ وغیرہ، بھی اس کا قائم مقام ہو سکتا ہے، (ہدایہ) (ملا علی قاری بحوالہ بذل المجہود ج ۲ ص ۱۱۳)۔

امام شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ کے نزدیک تلبیہ سنت ہے، یعنی اگر یہ رہ جائے تو ایک جانور کی قربانی ضروری نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "سب سے بہتر حج وہ ہے جس میں عَجّ (آواز بلند کرنا) اور ثَجّ (خون بہانا) ہو۔ عج سے مراد تلبیہ اور ثج سے مراد قربانی ہے۔" (مسند ابی یعلیٰ)

ان احادیث کی سند اگرچہ ضعیف ہے، لیکن یہ تمام احادیث مل کر قابل حجت ہو جاتی ہیں۔ اس لیے تلبیہ کی فضیلت پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔۔۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۱۸۷)۔

۳۔ تلبیہ کے الفاظ:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تلبیہ میں یہ الفاظ کہتے سنا ہے:

لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ، لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَکَ وَالْمُلْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ۔

اے اللہ! میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں حاضر ہوں، حمد و ثنا تیرے ہی لیے ہے اور نعمت بھی تیری ہی ہے بادشاہت بھی تیری ہی ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔

آپ ان الفاظ سے زیادہ الفاظ نہ کہتے تھے۔" (بخاری، مسلم، احمد، بیہقی، حاکم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ وغیرہ)۔

تلبیہ کے ان الفاظ کے مسنون ہونے پر تمام امت کا اجماع ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۱۸۷)۔

اکثر ائمہ (جن میں امام ابوحنیفہؒ اور احمدؒ شامل ہیں) کے نزدیک ان پر دوسرے الفاظ، جن میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور تعظیم بیان کی گئی ہو کا بھی اضافہ کرنا مستحب ہے۔

نافع کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں حضور کے) تلبیہ پر ان الفاظ کا اضافہ کیا:

لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ وَ سَعْدَیْکَ، وَالْخَیْرُ فِیْ یَدَیْکَ، لَبَّیْکَ وَالرَّغْبَاءُ اِلَیْکَ وَالْعَمَلُ۔ (بخاری و مسلم وغیرہ)	(اے اللہ) میں حاضر ہوں' میں حاضر ہوں اور اس حاضر ہونے میں سعادت و کامیابی کا طلبگار ہوں۔ خیر تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ میں حاضر ہوں۔ میری لبیک تیری ہی طرف ہے اور عمل تیرے ہی لیے ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تلبیہ پر ان الفاظ کا اضافہ کیا:

لَبَّیْکَ عَدَدَ الْحَصٰی وَالتُّرَابِ۔	کنکریوں اور مٹی کے ذروں کی تعداد کے برابر لبیک [1] (کہتے ہوئے میں حاضر ہوں)

۴۔ تلبیہ کو باآواز بلند کہنا:

مرد کے لیے تلبیہ کا بلند آواز سے کہنا مستحب ہے [2]

اس پر اجماع ہے کہ عورت بلند آواز سے تلبیہ نہیں کہے گی بلکہ صرف اتنی آواز سے تلبیہ کہے گی' جسے وہ خود سن سکے (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۱۸۹)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "(نماز میں اگر امام بھول جائے' تو) مردوں کے لیے سبحان اللہ کہنا ہے اور عورتوں کے لیے تالی بجانا" سے استدلال کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں "عورت نہ صفا اور مروہ پر چڑھے گی اور نہ بلند آواز سے تلبیہ کہے

۱۔ امام مالکؒ کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تلبیہ پر اور الفاظ کا اضافہ کرنا مکروہ ہے۔ یہی مسلک حنفیہ میں سے امام ابو یوسفؒ اور طحاویؒ سے بھی یہی مروی ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ پر اکتفا کرنا افضل ہے' یوں ان پر دوسرے الفاظ کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ (مختصر از الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۱۸۷)۔

۲۔ یہ اکثر ائمہ (جن میں امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ امام مالکؒ کا بھی یہی مسلک ہے' البتہ ایک روایت میں ان کے نزدیک تلبیہ کا ہلکی آواز سے کہنا مستحب ہے۔

گی"۔(بیہقی)

۵۔ تلبیہ کے بعد اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرنا:

تلبیہ کے بعد اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرنا مستحب ہے۔

حضرت خزیمہ بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب تلبیہ سے فارغ ہوتے' تو اللہ تعالیٰ سے مغفرت' خوشنودی اور آگ سے نجات طلب فرماتے۔ (طبرانی)

۶۔ وہ جگہیں جن میں تلبیہ کا خاص طور پر کہنا مستحب ہے:

تلبیہ کا سواری پر سوار ہوتے اور اترتے' کسی بلند جگہ پر چڑھتے اور اترتے' کسی قافلہ سے ملتے وقت' نیز ہر نماز کے بعد اور رات کے آخری حصہ میں کہنا خاص طور پر مستحب ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تلبیہ فرماتے تھے جب آپ کسی قافلہ کو دیکھتے' جب کسی ٹیلے پر چڑھتے یا کسی وادی میں اترتے اور فرض نماز کے بعد اور رات کے آخری حصہ میں۔ (ابن عساکر)

حضرت ابن عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ وہ سوار ہوتے' اترتے اور لیٹتے وقت تلبیہ کہا کرتے تھے۔ (شافعیؒ)

صحابہ کرام چار موقعوں پر تلبیہ کہنا بہت پسند کرتے تھے۔ نمازوں کے بعد' کسی وادی میں اترتے یا چڑھتے وقت اور کسی قافلہ سے ملتے وقت۔" (ابن ابی شیبہؒ)

۷۔ تلبیہ کی مدت:

تلبیہ کی مدت حج میں قربانی کے دن جمرۂ عقبہ پر کنکریاں مارنے تک ہے۔

حضرت فضل بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے دن تلبیہ فرمایا یہاں تک کہ آپؐ نے جمرۂ عقبہ پر کنکریاں ماریں۔" [1]

---

[1] یہ جمہور (جن میں امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ' احمدؒ اور ظاہریہ شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ البتہ ان میں اختلاف اس بارے میں ہے کہ آیا پہلی کنکری مارنے کے ساتھ ہی تلبیہ کا کہنا ختم کر دیا جائے گا یا جب تک ساتوں کنکریاں نہ ماری جائیں' تلبیہ کا کہنا بند نہ کیا جائے گا۔ ظاہریہ اور امام احمدؒ کے سوا دوسروں کے نزدیک

(بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، احمد)۔

عمرہ میں تلبیہ کی مدت حجر اسود کے استلام تک ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ میں جب حجر اسود کا استلام فرما لیتے، تو تلبیہ کا سلسلہ ختم کر دیتے"۔[1]

پہلی کنکری کے ساتھ ہی تلبیہ کا کہنا ختم کر دیا جائے گا۔ امام احمدؒ، اسحاقؒ اور ظاہریہ کے نزدیک آخری کنکری تک تلبیہ کہا جائے گا۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ حضرت فضل بن عباس کی مذکورہ بالا حدیث کی ایک روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں۔ "آپ ہر کنکری مارتے وقت تلبیہ فرماتے تھے، پھر آخری کنکری مارنے کے بعد آپؐ نے تلبیہ کا سلسلہ ختم کر دیا۔" (ابن خزیمہ)۔۔۔۔ یہ زائد الفاظ، امام احمدؒ، اسحاقؒ اور ظاہریہ کے نزدیک قابل حجت ہیں اور دوسروں کے نزدیک قابل حجت نہیں ہیں۔ کیونکہ امام مسلمؒ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں "آپ تلبیہ فرماتے رہے، یہاں تک کہ آپ جمرہ عقبہ پہنچ گئے۔"

امام مالکؒ، اوزاعیؒ، لیثؒ اور حسن بصریؒ کے نزدیک تلبیہ صرف عرفات کے دن (۹ ذی الحجہ) زوالِ آفتاب تک کہا جائے گا۔ اسی مسلک کی روایت صحابہؓ میں سے حضرت عائشہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، علیؓ اور امّ سلمہؓ سے ملتی ہے اور اسی سے امام مالکؒ اور ان دوسرے ائمہ کا استدلال ہے۔ (مختصر از الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۱۸۹۔۱۹) (تحفۃ الاحوذی ج ۱۰ ص ۱۱۰)۔

۱۔ یہ امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور دوسرے اکثر ائمہ کا مسلک ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک اگرچہ حجر اسود کے استلام تک تلبیہ کہا جائے گا، لیکن مسجد الحرام میں داخل ہونے کے بعد سے آہستہ آواز سے کہا جائے گا۔ صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہی مسلک تھا (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۱۹۰)۔

مالکیہ کے نزدیک مکہ معظمہ میں داخل ہونے کے ساتھ تلبیہ کا سلسلہ ختم کر دیا جائے گا۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ص ۶۲۴)

مکہ معظّمہ میں داخلہ کے آداب

مکہ معظّمہ میں داخل ہوتے وقت مندرجہ ذیل امور مستحب ہیں :

ا۔ غسل کرنا :

مکہ معظّمہ میں داخل ہونے سے پہلے غسل کرنا تمام ائمہ کے نزدیک مستحب ہے۔

لہ (فتح الباری)(القریٰ لقاصد ام القریٰ ص ۲۲۰)۔

نافعؒ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ذی طویٰ (مکہ معظّمہ کے قریب ایک جگہ جسے اب آبارِ زاہد کہا جاتا ہے) پر رات گزارتے۔ جب صبح ہوتی تو آپ غسل فرماتے اور جو لوگ آپؓ کے ساتھ ہوتے انہیں بھی آپ غسل کرنے کا حکم دیتے۔ پھر آپ ثنیہ علیا (اونچی گھاٹی یعنی وہ راستہ جو مکہ معظّمہ کے قبرستان 'المعلی کے پاس نکلتا ہے اور جسے کدا کہا جاتا ہے) کے راستے مکہ معظّمہ میں داخل ہوتے' اور جب مکہ معظّمہ سے نکلتے تو ثنیہ سفلی (پست گھاٹی یعنی وہ راستہ جو محلّہ شامیہ میں باب الشبیکہ کے قریب ہے) کے راستے نکلتے۔ وہ کہتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح کیا کرتے تھے۔" (بخاری' مسلم' ابو داوٗد' بیہقی وغیرہ)۔

۲۔ ذی طویٰ میں رات گزارنا :

ذی طویٰ کے مقام پر رات گزارنا اور دن کے وقت مکہ معظّمہ میں داخل ہونا مستحب ہے' جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ کی اسی حدیث میں بیان ہوا ہے۔ نیز حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی ایک دوسری روایت میں فرماتے ہیں۔ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظّمہ میں دن کے

ا۔ البتہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا یہ غسل مکہ معظّمہ میں داخل ہونے کے لیے ہے یا خانہ کعبہ کے طواف کے لیے۔ امام مالکؒ کے نزدیک یہ خانہ کعبہ کے طواف کے لیے ہے۔ اس لیے ان کے نزدیک جو عورت حیض یا نفاس کی حالت میں ہو' اس کے لیے یہ غسل مستحب نہیں ہے۔ کیوں کہ ایسی عورت کے لیے خانہ کعبہ کا طواف کرنا منع ہے۔ دوسرے تمام ائمہ کے نزدیک یہ غسل مکہ معظّمہ میں داخل ہونے کے لیے ہے' اس لیے ان کے نزدیک یہ غسل جس طرح دوسروں کے لیے مستحب ہے' حیض و نفاس والی عورت کے لیے بھی مستحب ہے۔ (الکوکب الدری ج ا ص ۲۸۱)۔

وقت داخل ہوئے تھے۔" (احمد' ترمذی)[1]

۳۔ المعلّٰی کے راستہ سے داخل ہونا:

ثنیہ علیا (یعنی المعلی) کے راستے سے مکہ معظمہ میں داخل ہونا مستحب ہے' جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ کی اسی حدیث میں بیان ہوا ہے جس شخص کے لیے ایسا کرنا ممکن ہے' اس کے لیے ایسا کرنا مستحب ہے' اور جس شخص کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ ہو' اس کے ذمہ کوئی گناہ یا فدیہ نہیں ہے۔

۱۔ بعض شافعی علماء کے نزدیک مکہ معظمہ میں دن یا رات کے وقت داخل ہونا یکساں ہے' کیونکہ عمرہ کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تھے۔ دوسروں کے نزدیک چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے موقع پر دن ہی کے وقت مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تھے' اس لیے دن کے وقت داخل ہونا افضل ہے۔ (الفتح الربانی ۱۲ص ۹۰)۔

مسجدِ حرام میں داخلہ کے آداب

ا۔باب بنی شیبہ (باب السلام[1]) کے راستے سے داخل ہونا :

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ جب سورج کافی بلند ہو گیا' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں داخل ہوئے اور باب بنی شیبہ کے قریب اپنی اونٹنی بٹھائی اور مسجد میں داخل ہو گئے۔"(مسلم 'ابو داؤد وغیرہ)۔

۲۔خانہ کعبہ کو دیکھ کر ہاتھ اٹھانا اور دعا کرنا :

حضرت حذیفہ بن اسیدؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب خانہ کعبہ کی طرف دیکھتے تو یہ دعا فرماتے :

اَللّٰهُمَّ زِدْ بَيْتَكَ هٰذَا تَشْرِيْفًاوَّ تَكْرِيْمًا وَّ بِرًّا وَّ مَهَابَةً۔ (طبرانی)

اے اللہ! اپنے اس گھر کی عزت' شرف اور وقار میں اضافہ فرما۔

امام سعید بن مسیبؒ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمرؓ کو ایک ایسی دعا کرتے سنا ہے جسے سننے والوں میں سے میرے علاوہ کوئی شخص زندہ نہیں رہا۔ جب آپ خانہ کعبہ کو دیکھتے تو یہ دعا کرتے :

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَ مِنْكَ السَّلَامُ' فَحَيِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ۔ (بیہقی)

اے اللہ! تو ہی سلامتی والا ہے اور تیری ہی جانب سے سلامتی ہے' لہذا اے ہمارے پروردگار ہم کو سلامتی کے ساتھ زندہ رکھ۔

'ان دونوں رواتیوں کی سند اگرچہ ضعیف ہے' لیکن خانہ کعبہ کو دیکھ کر دعا کرنا تمام ائمہ کے نزدیک مستحب ہے۔(الفتح الربانی ج ۱۲ص ۱۰)

---

[1] باب بنی شیبہ دراصل اسی دروازے کا نام ہے' جو مسجد الحرام کے اندر محراب کی شکل میں اس وقت بھی موجود ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسجد الحرام کے حدود اس دروازے تک تھے۔ اب جبکہ مسجد وسیع ہو گئی ہے' تو اس دروازے کے عین سامنے باب السلام پڑتا ہے۔ لہذا اس وقت باب السلام سے داخل ہونا مستحب ہے۔(مؤلف)۔

خانہ کعبہ کو دیکھ کر ہاتھ اٹھانا بھی مستحب ہے :

مکحولؒ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے اور خانہ کعبہ پر آپؐ کی نگاہ پڑتی' تو آپ ہاتھ اٹھاتے اور اللہ اکبر کہتے ہوئے یہ دعا فرماتے :

اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَ مِنْكَ السَّلَامُ فَحَيِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ۔ اَللّٰهُمَّ زِدْ هٰذَا الْبَيْتَ تَشْرِيْفًا وَّ تَعْظِيْمًا وَّ مَهَابَةً وَزِدْ مَنْ حَجَّهُ' أَوِ اعْتَمَرَهُ' تَكْرِيْمًا وَّ تَشْرِيْفًا وَّ تَعْظِيْمًا وَّ بِرًّا۔ (بیہقی)

اے اللہ! تو ہی سلامتی والا ہے اور تیری ہی طرف سے سلامتی ہے' لہٰذا اے ہمارے رب! ہمیں سلامتی کے ساتھ زندہ رکھ۔ اے اللہ! اس گھر کے شرف' عظمت اور وقار میں اضافہ فرما اور جو شخص اس کا حج یا عمرہ کر لے' اس کی عزت' شرف اور نیکی میں اضافہ فرما۔

اسی حدیث کو امام شافعیؒ نے اپنے مسند میں ابن جریج کے حوالہ سے بھی نقل کیا ہے۔[1]

1۔ یہ روایت مرسل (وہ روایت جس میں تابعی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صحابی کا ذکر نہیں (ہوتا) ہے' اس لیے خانہ کعبہ کو دیکھ کر ہاتھ اٹھانے کے مستحب ہونے میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ' احمد بن حنبلؒ' سفیان ثوریؒ' عبداللہ بن مبارکؒ اور اسحاقؒ کے نزدیک ایسا کرنا مستحب ہے۔ صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کا یہی مسلک تھا۔ امام شافعیؒ جنہوں نے مذکورہ بالا حدیث کو اپنے مسند میں روایت کیا ہے' خانہ کعبہ کو دیکھ کر ہاتھ اٹھانے کو نہ مستحب قرار دیتے ہیں اور نہ مکروہ۔ لیکن بعد کے شافعی علماء اس کے مستحب ہونے کے قائل ہیں۔

امام مالکؒ کے نزدیک کعبہ کو دیکھ کر ہاتھ اٹھانا مکروہ ہے۔ ان کا استدلال اس حدیث سے ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے لوگوں نے سوال کیا کہ کعبہ کو دیکھ کر ہاتھ اٹھانا کیسا ہے؟ انہوں نے جواب دیا "میں نہیں سمجھتا کہ یہود کے سوا کوئی اور شخص ایسا کر سکتا ہے۔ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا' آپؐ ایسا نہ فرماتے تھے۔" (ابو داؤد' نسائی)۔۔۔۔ اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک، امام مکحولؒ کی مذکورہ بالا حدیث مرسل ہونے کی وجہ سے قابل حجت نہیں ہے۔ دوسرے ائمہ کے نزدیک حضرت جابرؓ والی حدیث قابل حجت نہیں ہے۔ کیونکہ ایک تو خود اس کی سند صحیح نہیں' دوسرے اس حدیث کے الفاظ دوسری روایت میں یوں ہیں "ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا' آپ ایسا فرمایا کرتے تھے۔" (ترمذی)۔

۲۔ حجر اسود کا استلام (چھونا) یا تقبیل (بوسہ دینا) اور خانہ کعبہ کا طواف :

مسجد حرام میں داخل ہو کر سب سے پہلے حجر اسود کا استلام کرنا اور اگر ہو سکے تو اس کی تقبیل بھی کرنا اور پھر طواف کرنا مستحب ہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ "۔۔۔۔۔جب ہم (مسجد حرام میں داخل ہوئے اور) خانہ کعبہ کے پاس آئے' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجر اسود کا استلام فرمایا اور آپؐ نے طواف میں تین مرتبہ رمل فرمایا اور چار مرتبہ معمولی رفتار سے چلے۔" (مسلم' نسائی وغیرہ)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ پہنچے' تو آپؐ نے وضو فرمایا اور پھر خانہ کعبہ کا طواف کیا۔" (بخاری و مسلم)

مسجد حرام میں داخل ہو کر تحیت المسجد کی دو رکعتیں نہیں پڑھی جائیں گی۔ کیونکہ مسجد حرام کی تحیۃ المسجد طواف ہی ہے۔ ہاں اگر مسجد حرام میں کسی فرض نماز کی جماعت ہو رہی ہو' تو سب سے پہلے جماعت میں شرکت کی جائے گی' پھر طواف کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی نے کوئی فرض نماز نہ پڑھی ہو اور اس کا وقت ختم ہو رہا ہو' تو پہلے یہ نماز پڑھی جائے گی' پھر طواف کیا جائے گا۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (المغنی ج ۳ ص ۳۸۲۔ ۳۸۳)

قاضی شوکانی اور دوسرے اہلحدیث علماء خانہ کعبہ کو دیکھ کر ہاتھ اٹھانے کو نہ مستحب مانتے ہیں اور نہ اسے مکروہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا عمل امام شافعیؒ کے قول کے مطابق ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۰ (نیل الاوطار) (بذل المجہود جلد ۳ جزو ۱ ص ۳۸)۔

فائدہ : الفتح الربانی اور حدیث کی بعض دوسری شرحوں میں اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہؒ کا مسلک امام مالکؒ کے مطابق نقل کیا گیا ہے۔

طواف القدوم اور طواف العمرہ

ا۔ حکم:

مکہ معظمہ پہنچ کر جس شخص کا احرام افراد یا قران کا ہو' وہ طواف القدوم [1] اور جس شخص کا احرام تمتع کا ہو' وہ طواف العمرہ کرے گا۔

طواف القدوم مسنون ہے' واجب نہیں ہے' اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ پہنچ کر اگرچہ طواف فرمایا' مگر آپؐ نے اس کا حکم نہیں دیا۔ لہذا اگر کوئی شخص ایسے تنگ وقت میں مکہ معظمہ پہنچے کہ اسے اندیشہ ہو کہ اگر وہ طواف القدوم کرے گا' تو اس سے عرفات کا وقوف (جو باجماع امت حج کا رکن اعظم ہے) فوت ہو جائے گا' تو وہ طواف القدوم کیے بغیر عرفات پہنچ سکتا ہے' بغیر اس کے کہ اس پر دم (ایک جانور کی قربانی) لازم آئے [2]۔

ا۔ طواف القدوم سے مراد وہ طواف ہے جو مکہ معظمہ پہنچ کر سب سے پہلی بار کیا جاتا ہے' اسے طواف الورود یا طواف التحیۃ بھی کہا جاتا ہے۔

۲۔ یہ امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ اور دوسرے ائمہ کا مسلک ہے۔ امام مالکؒ ابو ثورؒ اور بعض شافعی علماء کے نزدیک یہ واجب ہے۔ یعنی اگر یہ رہ جائے تو ایک جانور کی قربانی لازم آتی ہے۔ ان کا استدلال ایک تو قرآن کریم کی آیت "وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ (انہیں چاہیے کہ قدیم گھر یعنی کعبہ کا طواف کریں) سے ہے اور دوسرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عام ارشاد سے جو آپؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا۔ یعنی "خذوا عنی مناسککم (مجھ سے اپنے مناسک حج لو' یعنی جس طریق میں انہیں ادا کروں تم بھی ادا کرو)۔

پہلے مسلک والوں کے نزدیک قرآن کریم کی آیت سے طواف القدوم کے واجب ہونے پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ یہ آیت طواف الافاضہ (جو ۱۰ ذی الحجہ کو منیٰ سے آکر کیا جاتا ہے) سے متعلق ہے جو باجماع امت حج کا رکن ہے (الفتح الربانی ج ۱۲ص ۲۲)۔

قاضی شوکانیؒ اور دوسرے اہلحدیث علماء نے طواف القدوم کو واجب ہی قرار دیا ہے۔ قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں "اگرچہ اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہی ہے۔ لیکن آپ کا یہ عمل اس عملی

ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے دریافت کیا "میں نے صرف حج (افراد) کا احرام باندھا ہے۔ کیا میں خانہ کعبہ کا طواف کر سکتا ہوں؟" حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا۔ "اس میں کیا حرج ہے؟ اس شخص نے کہا" حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس سے منع فرمایا ہے۔" حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا احرام باندھا تھا۔ آپؐ نے خانہ کعبہ کا طواف (طواف القدوم) بھی فرمایا' اور صفا و مروہ کے درمیان سعی بھی فرمائی۔" (مسلم' احمد وغیرہ)

اس پر (یعنی مفرد کے لیے طواف القدوم کے مشروع ہونے پر) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سوا تمام صحابہؓ اور بعد کے ائمہ کا اتفاق ہے [1] (نووی بحوالہ الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۶۲)

طواف القدوم کی حیثیت تحیۃ المسجد کی دو رکعتوں ہی کی ہے' لہٰذا جس طرح فرض نماز پڑھ لینے کی صورت میں تحیۃ المسجد کی دو رکعتوں کے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس طرح تمتع کے ارادے سے عمرہ کا احرام باندھنے والے کے لیے طواف القدوم کی ضرورت نہیں' وہ اپنا پہلا طواف' طواف العمرہ ہی کی نیت سے کرے گا۔ کیوں کہ اس کے ذمہ دو طواف ضروری ہیں۔ ایک عمرہ کا' جسے وہ مکہ معظمہ پہنچتے ہی ادا کرے گا' اور دوسرا حج کا' جسے وہ ۱۰ ذی الحجہ کو منیٰ سے آکر ادا کرے گا [2]

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ "۔۔۔۔۔۔ جن لوگوں نے عمرہ کا احرام باندھا'

وجوب کی وضاحت کرتا ہے جو قرآن کی آیت "وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ (اور لوگوں پر فرض ہے کہ اللہ کے لیے اس کے گھر کا حج کریں) اور حضورؐ کے ارشاد "خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ" میں بیان ہوا ہے۔" (نیل الاوطار) (سبل السلام)۔

۱۔ بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی مفرد کے لیے طواف القدوم کے مشروع ہونے کے قائل تھے۔

۲۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نزدیک (متمتع پر حج اور عمرہ کے لیے صرف ایک طواف۔ طواف الافاضہ۔۔ کافی ہے' لہٰذا ان کے نزدیک متمتع کا پہلا طواف بھی طواف القدوم ہی ہو گا۔ ایک روایت میں امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے' اور اسی کو امام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگردوں نے اختیار کیا ہے لیکن مشہور اور صحیح روایات میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور

انہوں نے مکہ معظمہ پہنچ کر) خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ پھر صفا و مروہ کے درمیان سعی کر کے اپنا احرام کھول دیا (یہ ان کے عمرہ کا طواف تھا) پھر انہوں نے (۱۰ ذی الحجہ کو) منیٰ سے آکر اپنے حج کے لیے دوسرا طواف کیا۔" (بخاری و مسلم وغیرہ)

قارن (قران کرنے والے) کا پہلا طواف بھی مفرد (افراد کرنے والے) کی طرح طواف القدوم ہو گا۔ اس نے اگرچہ عمرہ اور حج کا اکٹھا احرام باندھا ہے اور اس لحاظ سے اس کے لیے عمرہ کا طواف بھی ضروری ہے اور حج کا بھی، لیکن اس کے لیے متمتع کی طرح عمرہ کا طواف حج کے طواف سے الگ کرنا ضروری نہیں ہے۔ قربانی کے دن (۱۰ ذی الحجہ) منیٰ سے آکر جب وہ طواف الافاضہ کرے گا تو وہ اس کے عمرہ کا طواف بھی ہو گا اور حج کا بھی۔

حضرت عائشہؓ کی مذکورہ بالا حدیث کے مزید الفاظ یہ ہیں "لیکن جن لوگوں نے حج کو جمع کیا (یعنی قران کیا) طافو لہما طوافاً واحداً (تو انہوں نے ان دونوں کے لیے ---- یعنی حج اور عمرہ کے لیے ---- ایک طواف ---- یعنی طواف الافاضہ ---- کیا۔" (بخاری و مسلم وغیرہ)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "من احرم بالحج و العمرہ (جو شخص حج اور عمرہ کا احرام باندھے یعنی قران کرے)۔ اس کے لیے ان دونوں کے لیے ایک طواف کافی ہے۔" (ترمذی، ابن ماجہ، احمد)

نیز متعدد صحابہ کی صحیح احادیث سے یہی ثابت ہے کہ مکہ معظمہ پہنچ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے صرف ایک طواف "طواف القدوم کیا۔ طواف القدوم کے علاوہ انہوں نے طواف العمرہ نہیں کیا[1]

امام احمدؒ کا مسلک بھی وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ (تہذیب امام ابن قیم علی معالم السنن ج ۲ ص ۳۸۳)۔

مفصل بحث طواف الافاضہ کے باب میں آئے گی۔

۱۔ یہ امام مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور عام محدثین کا مسلک ہے۔ امام ابو حنیفہؒ، اوزاعیؒ، ابراہیم نخعیؒ، مجاہدؒ اور سفیان ثوریؒ کے نزدیک قران کے لیے عمرہ کا طواف حج کے طواف (طواف الافاضہ) سے الگ کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا وہ مکہ معظمہ پہنچ کر متمتع کی طرح طواف

القدوم کرے گا اور پھر صفا و مروہ کے درمیان دوسری سعی کرے گا' جو اس کے حج کی سعی ہوگی۔ یا اگر وہ چاہے تو یوں بھی کر سکتا ہے کہ اگرچہ ایسا کرنا اچھا نہیں ہے کہ پہلے طواف العمرہ اور طواف القدوم کرلے اور پھر جا کر صفا و مروہ کے درمیان ایک مرتبہ عمرہ کی اور دوسری مرتبہ حج کی سعی کرلے (ہدایہ ج ۱ ص ۱۱۱) (الفقہ علی المذاہب الاربعہ)۔

ان حضرات کا استدلال اس روایت سے ہے کہ حضرت علیؓ نے حج اور عمرہ کو جمع کیا (یعنی قران کیا) تو آپ نے ان کے لیے الگ الگ دو طواف (طواف العمرہ اور طواف القدوم) کیے اور صفا و مروہ کے درمیان دو مرتبہ سعی کی اور پھر فرمایا "اسی طرح میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا ہے۔" (مسند عبدالرزاق۔ دار قطنی)۔ اسی طرح کی بعض اور روایات حضرت عبداللہ بن مسعودؓ' عبداللہ بن عمرؓ اور عمران بن حصینؓ سے بھی مروی ہیں (الکوکب الدری ج ۱ ص ۲۹۸)۔

وجہ اختلاف : حضرت علیؓ' عبداللہ بن مسعودؓ' عبداللہ بن عمرؓ اور عمران بن حصینؓ کے متعلق ان روایات کی سند کمزور ہے۔ لہذا یہ پہلے مسلک والوں کے نزدیک مذکورہ بالا روایات کے مقابلے میں قابل حجت نہیں ہیں' خصوصاً جب کہ صحیح روایات میں ان صحابۂ کرامؓ کا مسلک بھی وہی مذکور ہے جو اوپر کی احادیث میں بیان ہوا ہے۔

دوسرے مسلک والوں کے نزدیک حضرت علیؓ' عبداللہ بن مسعودؓ' عبداللہ بن عمرؓ اور عمران بن حصینؓ کے متعلق یہ روایات قابل حجت اور معتبر ہیں۔ رہیں اوپر کی احادیث (جن سے پہلے مسلک والے استدلال کرتے ہیں) تو ان میں سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کے متعلق ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ روایت مرفوعاً صحیح نہیں ہے۔ یعنی یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں ہے' اور اگر اسے مرفوع بھی مان لیا جائے' تو اس کے اندر "من احرم بالحج والعمرہ" میں 'و' (اور) دراصل "او" (یا) کے معنی میں ہے کیونکہ عربی زبان میں "و" کے معنی میں بہت استعمال ہوتا ہے۔ اس صورت میں من احرم بالحج والعمرۃ کا مطلب یہ ہوگا کہ "جو شخص حج یا عمرہ کا احرام باندھے' اس کے لیے ایک طواف کافی ہے۔۔۔ لیکن پہلے مسلک والے اس توجیہ کو اس لیے صحیح قرار نہیں دیتے کہ مسند امام احمدؒ اور ابن ماجہؒ کی روایت میں "من قرن بین حجہ وعمرتہ (جس نے اپنے حج اور عمرہ کے دریان قران کیا) کے واضح الفاظ موجود ہیں۔

رہی حضرت عائشہؓ کی حدیث تو اس کے متعلق دوسرے مسلک والے یہ کہتے ہیں کہ اس میں "طافوا لھما طوافا واحدا" کا مطلب یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ نے حج اور عمرہ کے لیے نہیں بلکہ حج اور عمرہ کا احرام کھولنے کے لیے ایک طواف کیا۔

۲۔ طواف کی شرائط :

طواف کے لیے مندرجہ ذیل امور شرط ہیں' یعنی اگر ان میں سے ایک بھی رہ جائے' تو طواف نہ ہوگا۔

(ا) طہارت (پاکی) : طواف کے لیے نہ صرف جنابت' حیض اور نفاس سے پاک ہونا شرط ہے' بلکہ اس کے لیے اسی طرح باوضو ہونا بھی شرط ہے جس طرح نماز کے لیے۔ کپڑوں کا بھی پاک ہونا ضروری ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ سب سے پہلا کام جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ پہنچ کر فرمایا' وہ کہ آپؐ نے وضو کر کے خانہ کعبہ کا طواف فرمایا۔" (بخاری و مسلم)

حضرت عائشہؓ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ معظمہ پہنچیں' تو انہیں حیض شروع ہو گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا۔ "تم ہر وہ کام کر سکتی ہو جو حاجی کرتا ہے' لیکن تم اس وقت تک طواف نہیں کر سکتیں' جب تک (حیض سے فارغ ہو کر) غسل نہیں کر لیتیں۔"[1] (بخاری و مسلم)

رہیں ان صحابہ کرامؓ کی روایات جنھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ پہنچ کر صرف ایک طواف (طواف القدوم) فرمایا' تو انہوں نے دراصل جیسا دیکھا' ویسا بیان کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ پہنچ کر دراصل دو طواف اور دو سعی فرمائی تھیں۔ صحابہ کرامؓ کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اکثر صحابہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دور تھے اور تھوڑی تھوڑی تعداد میں باری باری حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ لہذا صحابہ کرامؓ نے صرف ایک طواف اور ایک سعی کا ذکر کیا ہے' وہ غالباً حضورؐ کے پاس اس وقت آئے ہوں گے' جب آپؐ پہلے طواف اور پہلی سعی سے تو فارغ ہو چکے تھے' لیکن آپؐ نے ابھی دوسرا طواف اور دوسری سعی شروع نہیں کی تھی۔ ان کے مقابلے میں جن صحابہؓ نے یہ بیان کیا ہے کہ حضورؐ نے دو مرتبہ طواف اور دو مرتبہ سعی فرمائی۔ ان کے متعلق یہ وہم نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے محض اندازے اور قیاس سے یہ بات کہہ دی ہوگی۔ اگر ان کے اس بیان کو صرف اندازے اور قیاس پر محمول کیا جائے' تو ان کا بیان جھوٹا ہوگا۔ لہذا انہوں نے یہ بات اپنے مشاہدے ہی کی بنیاد پر کہی ہوگی (الکوکب الدری ج ۱ ص ۲۹۸۔ ۲۹۹)۔

[1] یہ امام مالکؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ اور دوسرے اکثر ائمہ کا مسلک ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے

جو عورت استحاضہ کی حالت میں ہو' اس کے لیے طواف کرنا جائز ہے۔ اس بارے میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے (الفتح الربانی ف ۱۲ اص ۱۵)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس ایک عورت نے آکر سوال کیا کہ میں طواف کے ارادے سے آئی' لیکن جب مسجد کے دروازے پر پہنچی' تو مجھے خون آگیا۔ میں لوٹ گئی۔ جب وہ بند ہو گیا' تو میں پھر طواف کے ارادے سے آئی' لیکن جب مسجد کے دروازے پر پہنچی' تو مجھے پھر خون آگیا۔ میں واپس چلی گئی۔ جب وہ بند ہو گیا' تو پھر میں طواف کے ارادے سے آئی۔ لیکن جب مسجد کے دروازے پر پہنچی' تو مجھے پھر خون آگیا۔"

حضرت عبداللہ نے فرمایا "یہ شیطان کی طرف سے ایک چوکا ہے (یعنی استحاضہ کا خون ہے)[1] تم غسل کرلو اور خون کی جگہ پر کپڑا باندھ کر طواف کرو"۔ (بیہقی)

(ب) ستر پوشی[2] : حضرت ابو بکرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سورہ برات دے کر مکہ معظمہ بھیجا کہ میں لوگوں میں یہ اعلان کروں کہ اس سال کے بعد نہ کوئی مشرک خانہ کعبہ کا طواف کرے اور نہ کوئی ننگا ہو کر طواف کرے اور یہ کہ جنت میں صرف وہ شخص داخل ہو گا' جو مسلمان ہو گا"[3] (بخاری' مسلم' ترمذی وغیرہ)

(ج) طواف کا حجر اسود سے شروع کرنا اور اسی پر ختم کرنا۔

(د) طواف میں دائیں طرف کو (یعنی اس طرح کہ خانہ کعبہ بائیں طرف رہے' چلنا؟ :

اصحاب کے نزدیک (اور ایک روایت میں امام احمدؒ کے نزدیک بھی) طواف کے لیے طہارت شرط نہیں بلکہ واجب ہے۔ یعنی اگر یہ رہ جائے تو ایک جانور کی قربانی سے اس کی تلافی ہو سکتی ہے۔ جو شخص وضو کے بغیر طواف کرے' اس کے ذمہ ایک بکری کی قربانی اور جو جنابت (یا حیض یا نفاس) کی حالت میں طواف کرے' اس کے ذمہ ایک اونٹ کی قربانی ضروری ہو گی' اگرچہ بہتر یہ ہے کہ اگر وہ مکہ معظمہ میں ہو' تو دوبارہ طواف کر لے۔ اس صورت میں اس کے ذمہ قربانی ضروری نہ ہو گی۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ص ۱۴) (ہدایہ ج اص ۱۱۹)۔

[1] استحاضہ کی تعریف کے لیے دیکھئے حصہ اول صفحہ ۱۰۶۔

[2] مرد اور عورت کی شرم گاہ کے حدود کے لیے دیکھیے حصہ اول۔

[3] حنفیہ کے نزدیک طواف کے لیے شرم گاہ کا چھپانا واجب ہے شرط نہیں۔ دوسروں کے نزدیک یہ شرط ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج اص ۶۴۸)۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ معظمہ پہنچے تو آپ حجر اسود کے پاس آئے اور اس کا استلام فرمایا۔ پھر اپنی دائیں طرف طواف شروع کیا۔" (مسلم' نسائی وغیرہ)[1]

(ہ) حطیم[2] سمیت پورے خانہ کعبہ کا طواف کرنا: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا "اگر تمہاری قوم کے لوگ نئے نئے مسلمان نہ ہوئے ہوتے' تو میں خانہ کعبہ کی عمارت کو گرا دیتا اور پھر اس کے دو دروازے بناتا۔ ایک دروازہ مشرق میں اور دوسرا مغرب میں' اور میں حجر (یعنی حطیم) میں سے چھ ہاتھ جگہ اس میں اور شامل کر دیتا۔ اس لیے کہ قریش والوں نے جب خانہ کعبہ کی تعمیر کی' تو انہوں نے یہ جگہ چھوڑ دی۔" (بخاری' مسلم وغیرہ)

اس حدیث سے معلوم ہوا ہے کہ حطیم بھی خانہ کعبہ ہی کا حصہ ہے۔ لہٰذا طواف کا خانہ کعبہ کے علاوہ حطیم کے گرد ہونا بھی ضروری ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں "جو شخص طواف کرے" "اسے چاہیے کہ حطیم کے پیچھے سے طواف کرے۔" (بخاری و مسلم)۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے " وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ " (انہیں چاہیے کہ خانہ کعبہ کا طواف کریں) کا حکم دیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حطیم کے پیچھے سے طواف فرمایا[3] (القریٰ لقاصدام القریٰ ص ۲۲۵)

(و) طواف میں پورے سات چکر لگانا: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی مکہ معظمہ پہنچ کر حج یا عمرہ کا پہلی مرتبہ طواف کرتے' تو تین چکروں میں آپ تیز چال چلتے اور چار چکروں میں معمول کے مطابق چلتے' پھر آپؐ دو رکعتیں

۱۔ یہ دونوں چیزیں حنفیہ کے نزدیک واجب ہیں' دوسروں کے نزدیک شرط۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ) (الفتح الربانی ج ۱۲ص ۵۴)۔

۲۔ وہ عمارت جو خانہ کعبہ کے ساتھ شمال کی جانب قوس کی شکل میں بنی ہوئی ہے۔

۳۔ حنفیہ کے نزدیک واجب اور دوسروں کے نزدیک شرط (الفقہ علی المذاہب الاربعہ) (الفتح الربانی ج ۱۲ص ۵۲)۔

نماز پڑھتے۔" (بخاری و مسلم)

(ی) موالات یعنی پورے طواف کا مسلسل کرنا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا طواف مسلسل فرمایا اور آپ کا عام ارشاد ہے "مجھ سے حج کے مناسک سیکھ لو (یعنی جیسا میں کروں' ویسا ہی تم کرو) اس لیے طواف میں موالات یعنی اس کا مسلسل کرنا شرط ہے [1]

۳۔ طواف کی سنتیں [2]:

(ا) ہر چکر کے شروع میں حجر اسود کا استلام کرنا یا اسے بوسہ دینا: اس کے مسنون ہونے پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔[3] (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۳۷)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کے پاس تشریف لائے اور آپؐ نے حجر اسود کا استلام فرمایا۔" (احمد)

حضرت سویدؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ آپؓ نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور اس کے ساتھ لگے رہے اور فرمایا "میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارا بہت زیادہ اہتمام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔" (مسلم' نسائی' بیہقی)

حجر اسود کا اگر صرف استلام کیا جائے' تو ہاتھ کو بوسہ دینا مسنون ہے:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حجر اسود کا استلام فرمایا اور پھر اپنے ہاتھ کو بوسہ دیا اور پھر فرمایا' جب سے میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کرتے دیکھا ہے میں نے کبھی اسے

۱۔ یہ مالکیہ' حنابلہ اور (اہلحدیث علماء) کا مسلک ہے۔ شافعیہ اور حنفیہ کے نزدیک موالات مسنون ہے' شرط نہیں۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ا ص ۶۴۳)۔

۲۔ طواف کی سنتوں سے مراد وہ کام ہیں جن کا طواف میں کرنا باعث اجر و سعادت ہے اور ان کا ترک کرنا مکروہ ہے' لیکن ان کے چھوڑنے سے طواف بہر حال ہو جاتا ہے اور جانور کی قربانی لازم نہیں آتی۔ جمہور کا یہی مسلک ہے۔ صرف امام حسن بصریؒ' سفیان ثوریؒ اور (ایک مالکی عالم) ابن الماحبشون کے نزدیک ان کے ترک کرنے سے بھی قربانی لازم آتی ہے (نیل الاوطار ج ۵ ص ۵۱)۔

۳۔ حنفیہ کے نزدیک طواف کے سات چکر پورے ہو جانے کے بعد بھی حجر اسود کا استلام کرنا یا اسے بوسہ دینا مستحب ہے۔ (ہدایہ ج ا ص ۱۰۱)۔

ترک نہیں کیا"۔[1] (بخاری و مسلم)

حجر اسود کو بوسہ دیتے ہوئے اس پر سجدہ کرنا اور اس پر رخسار رکھنا بھی مسنون ہے:

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے والد حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ آپ نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور اس پر سجدہ کیا۔ دوبارہ پھر آپ نے اسے بوسہ دیا اور اس پر سجدہ کیا۔ پھر فرمایا۔ "اسی طرح میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا ہے۔" (ابو یعلی)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حجر اسود کو بوسہ دیا کرتے تھے اور اس پر اپنا رخسار مبارک رکھا کرتے تھے۔"[2] (ابو یعلی)

اگر حجر اسود پر بھیڑ کی وجہ سے اس کا استلام کرنا یا اسے بوسہ دینا ممکن نہ ہو تو اس کے سامنے کھڑے ہو کر اللہ اکبر کہتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر لینا ہی مستحب ہے۔

حضرت ابن عباسؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ پر سوار ہو کر طواف فرمایا۔ جب آپ حجر اسود کے سامنے پہنچتے' تو ہاتھ میں پکڑی ہوئی کسی چیز سے اس کی طرف اشارہ فرماتے اور اللہ اکبر کہتے۔ (بخاری)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا۔ "اے عمرؓ! آپ ایک طاقتور آدمی ہیں' لہذا آپ مزاحمت نہ کریں' اس لیے کہ اس طرح آپ کمزوروں کی تکلیف کا باعث بنیں

۱۔ سلف میں سے صرف القاسم بن محمد (ایک تابعی) حجر اسود کے استلام کے بعد ہاتھ چومنے کو مسنون نہ سمجھتے تھے۔ ایک روایت میں امام مالکؒ کا بھی یہی مسلک ہے (الفتح الربانی ج ۱۲ص ۷۳)۔ (ممکن ہے کہ انھیں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ حدیث نہ پہنچی ہو۔)

۲۔ یہ امام مالکؒ کے سوا دوسرے تمام ائمہ کا مسلک ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک حجر اسود پر سجدہ کرنا اور اس پر رخسار رکھنا بدعت ہے۔ لیکن مشہور مالکی عالم قاضی عیاض نے اعتراف کیا ہے کہ اس بارے میں امام مالکؒ کی ---- رائے شاذ ہے (الفتح الربانی ج ۱۲ص ۷۳)۔ غالباً اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا احادیث کی سند میں کلام ہے۔ دوسرے ائمہ کے نزدیک یہ قابل قبول ہیں اور امام مالکؒ کے نزدیک قابل قبول نہیں ہیں۔ واللہ اعلم

گے۔ جب آپ جگہ پائیں' تو استلام کیجیے۔ ورنہ بسم اللہ واللہ اکبر کہئے اور گزر جایئے۔" (مسند امام احمدؒ)۔

اگر ہاتھ میں چھڑی ہو' تو اسی سے استلام کرنا اور چھڑی کو بوسہ دے لینا بھی مستحب ہے۔

حضرت ابو الطفیلؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو طواف کرتے دیکھا ہے۔ آپؐ کے پاس ایک چھڑی تھی۔ آپ اسی چھڑی سے حجر اسود کا استلام فرماتے اور پھر چھڑی کو بوسہ دے لیتے۔" (مسلم)

حجر اسود کا استلام کرتے وقت یا اسے بوسہ دیتے وقت 'اللہ اکبر' یا 'بسم اللہ واللہ اکبر' کہنا مسنون ہے' جیسا کہ اوپر متعدد احادیث میں اس کا ذکر ہوا ہے۔

عورتوں کے لیے حجر اسود کا استلام اور اس کو بوسہ دینا' صرف اس صورت میں مستحب ہے جبکہ حجر اسود پر بھیڑ نہ ہو' اگر بھیڑ ہو' تو ان کے لیے یہ مستحب نہیں ہے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے۔ (الفتح الربانی)

حضرت عائشہؓ نے ایک عورت سے فرمایا "حجر اسود پر دھینگا مشتی نہ کرو۔ اگر جگہ پاؤ تو استلام کر لو اور اگر بھیڑ پاؤ تو جب اس کے سامنے آؤ بسم اللہ اور اللہ اکبر کہو اور کسی کو تکلیف نہ دو۔" (سعید بن منصور)

حضرت عائشہؓ کے پاس ان کی ایک خادمہ آئی اور اس نے کہا۔ "اے اُمّ المؤمنین! میں نے خانہ کعبہ کا سات بار چکر لگایا اور دو یا تین مرتبہ حجر اسود کا استلام کیا۔" اس سے حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔ "اللہ تمہیں اجر نہ دے۔ تم مردوں سے دھینگا مشتی کرتی ہو تم نے بسم اللہ اور اللہ اکبر کیوں نہ کہہ لیا؟" (مسند امام شافعیؒ)۔

(ب) اضطباع: حج اور عمرہ کے طواف میں اضطباع (چادر کو دائیں مونڈھے کے نیچے سے نکال کر بائیں مونڈھے پر ڈالنا) مسنون ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحابؓ نے جعرانہ سے عمرہ کیا تو انہوں نے اپنی چادریں اپنے دائیں مونڈھوں کے نیچے سے نکال کر بائیں مونڈھوں پر ڈالیں۔" (احمد' ابو داؤد) [1]

---

[1] طواف میں اضطباع امام مالکؒ کے سوا سب کے نزدیک مستحب ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں

حضرت یعلیٰ بن امیہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سبز چادر میں اضطباع کرتے ہوئے طواف فرمایا۔ (ابو داؤد' ترمذی' ابن ماجہ)۔

اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ طواف کے بعد نماز میں اضطباع مسنون نہیں ہے۔

(ج) رمل : طواف العمرہ اور طواف القدوم کے پہلے تین چکروں میں حجر اسود سے حجر اسود تک رمل (مونڈھے ہلاتے ہوئے آہستہ آہستہ دوڑنا) مستحب ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجر اسود سے حجر اسود تک تین چکروں میں رمل فرمایا اور باقی چکروں میں آپ عام رفتار سے چلے (احمد' ابو داؤد' مسلم وغیرہ)[1]

رمل کے مقرر کیے جانے کا سبب یہ ہے کہ سنہ ۷ھ میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ عمرہ کے لیے مکہ معظمہ تشریف لائے' تو مشرکین نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے صحابیؓ کمزور ہیں۔ مدینہ کے بخار نے انہیں کمزور کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو' ان کے اس خیال سے باخبر کر دیا تو حضورؐ نے صحابۂ کرام کو حکم دیا کہ طواف کے پہلے تین چکروں میں رمل کریں اور حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان چلیں۔ جب مشرکین نے صحابہؓ کو رمل کرتے دیکھا تو (آپس میں) کہنے لگے کہ کیا یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق تم کہتے تھے کہ بخار نے انہیں کمزور کر دیا ہے؟ یہ تو ہم سے

اضطباع غیر معروف ہے۔ میں نے کسی کو اضطباع کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔" (الفتح الربانی ج ۱۲ص ۲۳ وغیرہ۔

[1] یہ جمہور (جن میں ائمہ اربعہ شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ بعض تابعین جیسے طاؤسؒ' عطاءؒ' حسن بصریؒ سعید بن جبیرؒ' قاسم اور سالم بن عبداللہؒ کے نزدیک رمل صرف حجر اسود سے رکن یمانی تک ہے اور رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان عام رفتار سے چلنا ہے۔ ان کا استدلال حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت سے ہے کہ ۷ھ میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام عمرہ کے لیے مکہ معظمہ تشریف لائے تو آپؐ نے صحابہ کو حکم دیا کہ پہلے تین چکروں میں رمل کریں اور رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان عام رفتار سے چلیں"۔۔۔۔ جمہور کے نزدیک یہ حکم شروع میں تھا۔ لیکن بعد میں حجۃ الوداع کے موقع پر حضورؐ نے بھی اور صحابہ کرام نے بھی حجر اسود سے حجر اسود تک رمل فرمایا۔" (المغنی ج ۳ص ۳۸۷)۔

زیادہ طاقت ور ہیں۔ (بخاری' مسلم' ابوداؤد' بروایت حضرت ابن عباسؓ)۔

اس کے بعد رمل طواف کی سنت قرار پائی گئی جس پر صحابہ کرامؓ عمل کرتے رہے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں اسے موقوف کرنا چاہا کیونکہ جس ضرورت سے اسے جاری کیا گیا تھا' اب وہ باقی نہ رہی تھی۔ لیکن پھر حضرت عمرؓ نے خود ہی فرمایا کہ جو کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ ہمیں اسے چھوڑنا نہیں چاہیے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔ رمل کی ہم کو کیا ضرورت ہے۔ وہ تو ہم نے مشرکین کو اپنی قوت دکھانے کے لیے کیا تھا اور وہ ہلاک ہو چکے۔ "لیکن پھر فرمایا" رمل ایک ایسی چیز ہے جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا لہذا اس کو ترک کرنا ہم پسند نہیں کرتے"۔ (بخاری)۔

اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ طواف میں رمل اور اضطباع صرف مردوں کے لیے مسنون ہے' عورتوں کے لیے مسنون نہیں ہے۔ ٥امام نووی بحوالہ الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۴۳)۔

(د) ہر چکر میں رکن یمانی کا استلام: اس پر اجماع ہے کہ طواف کرتے ہوئے رکن یمانی کا استلام مسنون ہے (المغنی ج ۳ ص ۳۹۴)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں "میں نے حجر اسود اور رکن یمانی کا استلام کبھی ترک نہیں کیا۔ جب سے میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سختی اور نرمی ہر حال میں ان کا استلام فرماتے دیکھا ہے۔" (بخاری' مسلم)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی دوسری روایت میں فرماتے ہیں "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی طواف میں حجر اسود اور رکن یمانی کا استلام ترک نہ فرماتے تھے۔" (ابوداؤد)۔

رکن یمانی کو بوسہ دینا سنت نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ چیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔ (المغنی ج ۳ ص ۳۹۴)۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ معظمہ پہنچے' تو آپ نے خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگائے۔ پھر آپؐ آیت " وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى " کی تلاوت فرماتے ہوئے مقام ابراہیم پر آئے اور اس کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھی۔ اس کے بعد آپؐ نے حجر اسود کا (پھر) استلام فرمایا۔" (ترمذی)

طواف میں بعض چیزیں شرط ہیں اور بعض مسنون۔

حجر اسود اور رکن یمانی کے علاوہ خانہ کعبہ کے جو دو کونے (رکن عراقی اور رکن شامی) ہیں۔ نہ ان کا استلام صحیح ہے اور نہ ان کو بوسہ دینا:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ صرف حجر اسود اور رکن یمانی کا استلام فرماتے تھے۔"[1] (بخاری و مسلم وغیرہ)

حواشی

(ھ) دعا' اللہ تعالیٰ کا ذکر اور تلاوت قرآن مجید: طواف کرتے وقت دعا اور اللہ تعالیٰ کا ذکر مسنون ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔" خانہ کعبہ کا طواف' صفا و مروہ کے درمیان سعی اور رمی جمار کو اللہ تعالیٰ کے ذکر کو قائم کرنے ہی کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔" (احمد' ابوداؤد' ترمذی)۔ لیکن حدیث میں کسی ایسی دعا کا ذکر نہیں ہے جو طواف کے لیے خاص ہو۔ اس لیے طواف میں ہر وہ دعا کی جا سکتی ہے جسے انسان اپنے مناسب حال و ضرورت خیال کرے۔ (ابن تیمیہؒ) تاہم حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے چند عام دعاؤں کی روایات ملتی ہیں' جن میں سے اکثر کی سند میں اگرچہ کلام کیا گیا ہے لیکن ان کا مانگنا دوسری دعاؤں کی نسبت مستحب ہے:

(۱) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس شخص نے خانہ کعبہ کا سات مرتبہ طواف کیا (یعنی سات چکر لگائے) اور اس میں اس نے " سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اللّٰهُ اَكْبَرُ وَ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" کہنے کے سوا کوئی اور بات نہیں کی' اس کے دس گناہ معاف کر دیے گئے اور اس کے لیے دس نیکیاں لکھ دی گئیں اور اس کے دس درجے بلند کر دیے گئے۔" (ابن ماجہ)۔

(۲) حضرت ابوہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ ۔۔۔۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم (طواف میں) یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

---

[1] اس پر اکثر صحابہ کرامؓ اور تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ صرف صحابہؓ میں سے حضرت معاویہؓ' جابرؓ' عبداللہ بن زبیرؓ' حسنؓ' حسینؓ' انسؓ اور عروہؓ سے متعلق روایت ہے کہ وہ خانہ کعبہ کے چاروں کونوں کا استلام کرتے تھے۔ (المغنی ج ۳ ص ۳۹۴)۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الشَّکِّ وَ الشِّرْکِ وَ النِّفَاقِ وَ الشِّقَاقِ وَ سُوْءِ الْاَخْلَاقِ۔ (البزار)

اے اللہ! میں تیرے ذریعے شک' شرک' نفاق' (اسلام اور مسلمانوں کی) مخالفت اور برے اخلاق سے پناہ مانگتا ہوں۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان یہ دعا فرماتے تھے :

اَللّٰھُمَّ قَنِّعْنِیْ بِمَا رَزَقْتَنِیْ وَبَارِکْ لِیْ فِیْهِ وَاخْلُفْ عَلٰی کُلِّ غَائِبَةٍ لِیْ بِخَیْرٍ۔ (حاکم' ابن ماجہ)

اے اللہ! مجھے تو نے جو رزق دیا ہے۔ اس پر قانع کر دے اور میرے لیے اس میں برکت عطا فرما دے اور میری جو چیز مجھ سے پیچھے ہے' اس پر میری طرف سے نگہبان بن جا۔

(۴) حضرت عبداللہؓ بن سائب سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے طواف کے شروع میں یہ دعا فرمایا کرتے تھے :

بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ' اَللّٰھُمَّ اِیْمَانًا بِکَ وَ تَصْدِیْقًا بِکِتَابِکَ وَوَفَاءً بِعَھْدِکَ وَاتِّبَاعًا لِسُنَّتِهٖ نَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ (صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ) (ابن عساکر)

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ اے اللہ (میں یہ طواف) تجھ پر ایمان رکھتے ہوئے' تیری کتاب کی تصدیق کرتے ہوئے' تجھ سے کیے ہوئے وعدے کو پورا کرتے ہوئے' تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہوئے (ادا کر رہا ہوں)۔

اس حدیث کی روایت اگرچہ کمزور ہی ہے' لیکن بہت سے صحابہ سے اس دعا کی روایات ملتی ہیں (نیل الاوطار ج ۵ ص ۵۱)۔

(۵) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "رکن یمانی پر ستر فرشتے مقرر کیے گئے ہیں۔ لہذا جو شخص (اس کا استلام کرتے ہوئے) یہ دعا کرتا ہے' اس کی دعا پر فرشتے آمین کہتے ہیں" :

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَالُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَۃَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ' رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔	اے اللہ! میں تجھ سے دنیا اور آخرت میں معافی اور عافیت طلب کرتا ہوں۔ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

(۶) حضرت عبداللہ بن سائبؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان یہ دعا فرماتے تھے :

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (احمد ابوداؤد' نسائی' حاکم ابن حبان)۔	اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی' اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

اس روایت کی سند صحیح ہے۔ (نیل الاوطار ج ۵ ص ۵۰)۔

قرآن مجید کی تلاوت بھی چونکہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے' اس لیے طواف کرتے ہوئے قرآن مجید کی تلاوت مستحب ہے [1]

فائدہ : امام شافعیؒ کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا "مجھے یہ پسند ہے کہ طواف کرنے والا جب حجر اسود کے سامنے آئے تو اللہ اکبر کہے اور رمل کرتے وقت یہ دعا مانگے :

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ حَجًّا مَّبْرُوْرًا وَ ذَنْبًا مَغْفُوْرًا وَسَعْیًا مَشْکُوْرًا۔	اے اللہ! اسے حج مبرور' معاف کردہ گناہ اور قبول کردہ سعی بنا۔

اور باقی چار چکروں میں جن میں رمل نہیں ہے' یہ دعا مانگے :

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَ تَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ وَاَنْتَ الْاَعَزُّ وَالْاَکْرَمُ۔	اے اللہ! تو بخش اور رحم فرما' اور (میرے جن قصوروں کو) تو جانتا ہے'

---

[1] یہ اکثر ائمہ سلف (جن میں امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ' عبداللہ بن مبارکؒ اور ابو ثور وغیرہ شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ عروہؒ' حسن بصریؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک یہ مکروہ ہے (کیونکہ وہ اسے اللہ تعالیٰ کا ذکر شمار نہیں کرتے) (المغنی ج ۳ ص ۳۹)۔

اَللّٰھُمَّ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (بیہقی)

ان سے درگزر فرما۔ تو ہی عزت و قوت والا اور تو ہی سخی و کریم ہے۔ اے اللہ! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

۴۔ وہ کام جو طواف کے بعد مسنون ہیں:

(ا) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب حج یا عمرہ کا طواف فرماتے تو آپ پہلے تین چکروں میں رمل فرماتے اور چار چکروں میں عام رفتار سے چلتے۔ پھر آپؐ (مقام ابراہیم پر) دو رکعت نماز پڑھتے۔ (بخاری' مسلم' ابو داؤد' نسائی) [1]

ان دو رکعتوں میں سے پہلی رکعت میں سورۂ قل یا ایہا الکافرون' اور دوسری میں سورۂ قل ہو اللہ احد کا پڑھنا مستحب ہے' جیسا کہ حضرت جابرؓ کی حدیث میں بیان ہوا ہے (دیکھیے صفحہ ۲۶۸)۔

مسجد حرام میں نماز پڑھنے کے لیے سُترہ ضروری نہیں ہے۔ لہذا مقام ابراہیم پر نماز پڑھتے ہوئے اگر انسان کے آگے سے طواف کرنے والے لوگ گزرتے رہیں' تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (فضل صف کے لیے دیکھیے حصہ اول ص ۲۱۳)۔

(ب) ان دو رکعتوں کے بعد صفا کی طرف جانے سے پہلے حجر اسود کا ..... استلام یا تقبیل: جیسا کہ حضرت جابرؓ کی حدیث میں بیان ہوا ہے۔

فائدہ: جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں حنفیہ کے نزدیک طواف کا حجر اسود کے

---

[1] طواف کے بعد یہ دو رکعت نماز امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے۔ یعنی اگر رہ جائے تو ایک جانور کی قربانی ضروری ہے۔ دوسرے ائمہ کے نزدیک یہ سنت ہے۔ امام شافعیؒ سے ایک دوسری روایت یہ ہے کہ اگر یہ نماز واجب طواف (طواف العمرہ' طواف الافاضہ یا طواف الوداع) کے بعد ہے' تو یہ واجب ہے اور اگر مسنون طواف (طواف القدوم یا عام نفل طواف کے بعد ہے تو یہ سنت ہے۔ (الہدایہ ج ا ص ۱۰۱ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۴) (المغنی ج ۲ ص ۴۰۱)۔

استلام سے ختم کرنا (یعنی ان دو رکعتوں کے شروع کرنے سے پہلے بھی حجر اسود کا استلام کرنا' مستحب ہے۔

(ہدایہ ج ا ص ۱۰۱)۔

۵۔ طواف کے متعلق بعض دوسرے ضروری مسائل :

(ا) طواف میں بات چیت کرنا اگرچہ جائز ہے' لیکن بہتر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر اور دعا کے سوا کوئی بات نہ کی جائے :

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "خانہ کعبہ کا طواف نماز ہی کی طرح ہے مگر (فرق یہ ہے کہ) تم اس میں بات چیت کرتے ہو۔ لہذا جو شخص بات کرے اسے چاہیے کہ کوئی بہتر بات کرے۔ (ترمذی وغیرہ)

(ب) طواف کرتے ہوئے پیاس لگ جائے تو پانی پیا جا سکتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کرتے ہوئے پانی پیا (ابو حاتم۔ مسند امام شافعی)۔

اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (المغنی ج ۳ ص ۳۹۲)۔

(ج) مسجد حرام میں دن رات کے تمام اوقات میں نفلی طواف کیا جا سکتا ہے اور نماز پڑھی جا سکتی ہے :

حضرت جبیر بن مطعمؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے عبد مناف کے خاندان کے لوگو! تم کسی شخص کو دن یا رات کی کسی گھڑی میں مسجد حرام کے اندر طواف کرنے اور نماز پڑھنے سے منع نہ کرو۔" (احمد' ابو داؤد' ابن ماجہ' ترمذی' نسائی' حاکم' بزار' ابن حبان وغیرہ)۔

حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عصر کی نماز کے بعد کوئی نماز نہیں یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے اور فجر کی نماز کے بعد کوئی نماز نہیں یہاں تک کہ سورج نکل آئے' مگر مکہ میں" [1] (دار قطنی' احمد' بیہقی' ابو یعلیٰ' طبرانی)۔

---

[1] ۔ یہ جمہور ائمہ (جن میں امام شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ' اسحاقؒ' ابو ثورؒ شامل ہیں) کا مسلک ہے یہی مسلک صحابہؓ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ' عبداللہ بن عباسؓ' حسنؓ' حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ سے اور تابعین

میں سے طاؤوسؒ' قاسم بن محمدؒ' عطاء' عروہؒ' مجاہدؒ اور شعبیؒ سے مروی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ' مالکؒ اور سفیان ثوریؒ کے نزدیک مسجد حرام میں طواف تو ہر وقت کیا جا سکتا ہے مگر نماز کا ان اوقات میں پڑھنا یہاں بھی ناجائز ہے جن میں مکہ کے علاوہ دوسری جگہوں میں پڑھنا جائز ہے۔ ان کا استدلال ان احادیث سے ہے جن میں دن رات کے بعض اوقات میں نماز پڑھنے سے مطلقاً منع کیا گیا ہے۔

یہی مسلک صحابہ میں سے حضرت عمرؓ اور عائشہؓ سے مروی ہے۔ بعض روایات میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ سے بھی یہی مسلک مروی ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۵۶ --- ۵۷)۔

سعی صفا و مروہ

۱۔ سعی کی کیفیت :

طواف القدوم یا طواف العمرہ سے فارغ ہونے کے بعد صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی جاتی ہے۔ سعی کی پوری کیفیت کا ذکر حضرت جابرؓ کی حدیث میں گزر چکا ہے۔

۲۔ سعی کے مقرر کیئے جانے کی وجہ :

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی اہلیہ محترمہ حضرت ہاجرہؓ اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو جب کہ وہ ابھی دودھ پی رہے تھے' لے کر (اس جگہ جہاں اب خانہ کعبہ بنا ہوا ہے) اور ان دونوں کو خانہ کعبہ سے قریب زمزم کے اوپر ایک بڑے درخت کے پاس بٹھادیا۔ اس زمانہ میں مکہ معظمہ میں کوئی آبادی نہ تھی اور نہ وہاں پانی (چشمہ یا کنواں) تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے ان دونوں کے پاس دو چھوٹے مشکیزے رکھ دیے۔ ایک میں کھجوریں تھیں' اور دوسرے میں پانی' پھر آپؑ واپس ہونے کے ارادے سے چل دیے۔ حضرت ہاجرہؓ آپ کے پیچھے پیچھے آئیں اور کہنے لگیں "اے ابراہیم! آپ ہمیں اس وادی میں جہاں نہ کوئی انسان ہے اور نہ کوئی اور چیز' چھوڑ کر کہاں جارہے ہیں ؟" حضرت ہاجرہؓ نے کئی مرتبہ سوال کیا' لیکن حضرت ابراہیمؑ نے ان کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ آخر کار حضرت ہاجرہؓ نے دریافت کیا "کیا اللہ نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے ؟" حضرت ابراہیمؑ نے (صرف اتنا) جواب دیا "ہاں"۔ اس پر حضرت ہاجرہؓ نے کہا "تب کوئی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں برباد نہ کرے گا۔" پھر حضرت ہاجرہؓ پلٹ گئیں اور حضرت ابراہیمؑ چل دیے۔ جب گھاٹی کے پاس پہنچے۔ جہاں سے آپ نظر نہ آرہے تھے' آپؑ نے کعبہ کی طرف رخ کر کے ہاتھ اٹھائے اور یہ دعا فرمائی :

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ۔ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ۔

اے اللہ! میں نے اپنی اولاد کو تیرے گھر کے پاس ایک ایسی وادی میں ٹھہرادیا ہے جس میں کوئی پیداوار نہیں۔

فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِىٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ۔

اے اللہ! یہ اس لیے کہ وہ صلوٰۃ قائم کریں۔ لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف لگا دے اور انہیں پھلوں کا رزق دے' تاکہ وہ شکر کریں۔

حضرت ہاجرہؓ درخت کے نیچے بیٹھ گئیں۔ بیٹے کو اپنے پہلو میں رکھا اور پانی کے مشکیزہ کو درخت سے لٹکا دیا۔ اس سے پانی پیتی اور بیٹے کو دودھ پلاتی رہیں۔ جب پانی ختم ہو گیا تو ان کے جسم سے دودھ بھی خشک ہو گیا۔ بیٹے کو سخت بھوک لگی اور وہ بھوک کے مارے زمین پر ایڑیاں مارنے لگے۔ حضرت ہاجرہؓ سے یہ منظر برداشت نہ ہو سکا' اس لیے وہاں سے چلیں اور آکر سب سے قریب کی پہاڑی صفا پر کھڑی ہو گئیں۔ پھر وادی کا رخ کیا کہ شاید کوئی انسان نظر آئے' لیکن کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ صفا سے نیچے اتر آئیں۔ جب وادی میں پہنچیں تو دوڑنے کے لیے اپنے کرتے کا دامن اٹھایا اور بے کل انسان کی طرح دوڑنا شروع کیا' یہاں تک کہ وادی طے کر کے (ایک دوسری پہاڑی) مروہ پر چڑھ گئیں اور کھڑی ہو کر دیکھنے لگیں کہ شاید کوئی انسان نظر آئے' لیکن کوئی انسان نظر نہ آیا۔ اس طرح (صفا اور مروہ کے درمیان) انہوں نے سات چکر لگائے۔" حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اسی لیے لوگ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں"۔ (بخاری)۔

۳۔ سعی کا حکم:

صفا مروہ کے درمیان سعی حج اور عمرہ کا رکن ہے' یعنی اگر یہ رہ جائے تو نہ حج ہو سکتا ہے اور نہ عمرہ۔ جب تک ایک قدم بھی باقی ہے' احرام نہیں کھولا جا سکتا۔

عروہؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ تو قرآن پاک میں یوں فرماتا ہے:

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا۔

صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ لہٰذا جو شخص حج یا عمرہ کرے' تو کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان کا طواف (یعنی ان کے درمیان سعی) کرے۔

اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص صفا و مروہ کے درمیان سعی نہ بھی کرے' تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے ؟" حضرت عائشہؓ نے فرمایا "اے میرے بھانجے تم نے کیا بری بات کہی ہے۔ اگر آیت کی تاویل وہی ہوتی جو تم کر رہے ہو تو واقعی جو شخص صفا مروہ کے درمیان سعی نہ کرتا' اس پر کوئی گناہ نہ ہوتا' مگر یہ آیت تو انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اسلام سے پہلے وہ 'مناۃ' کی پوجا کیا کرتے تھے اور مشلل (مدینہ اور مکہ کے درمیان ایک جگہ) پہنچ کر تلبیہ میں اسی کا نام لیا کرتے تھے۔ جو شخص تلبیہ کرتا' وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے میں بد دلی اور گناہ محسوس کرتا تھا۔ جب وہ اسلام لے آئے' تو انہوں نے اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ کہنے لگے۔ "اے اللہ کے رسولؐ! ہم لوگ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے میں بد دلی اور گناہ محسوس کرتے تھے۔" اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ حضرت عائشہؓ نے مزید فرمایا "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا و مروہ کے درمیان سعی کو جاری فرمایا' لہٰذا کسی شخص کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اسے ترک کرے۔" (بخاری' مالک' نسائی وغیرہ)۔

حضرت عائشہؓ ہی ایک دوسری روایت میں فرماتی ہیں "نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ) مسلمانوں (صحابۂ کرامؓ) نے سعی فرمائی' تو یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کا حج مکمل نہ کرے' جو صفا و مروہ کے درمیان سعی نہیں کرتا۔" (مسلم)

قبیلہ بنی عبدالدار کی ایک عورت (صحابیہ) حضرت حبیبہ بنت ابی مجراۃؓ سے روایت ہے کہ میں قریش کی چند عورتوں کے ساتھ آلِ ابی حسین کے گھر آئی۔ ہمارا مقصد تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صفا و مروہ کے درمیان طواف کرتے دیکھیں۔ آپ سعی فرما رہے تھے اور تیز دوڑنے کی وجہ سے آپ کا تہبند آپؐ کے بدن کے درمیان گھوم رہا تھا۔ یہاں تک کہ میں کہتی ہوں کہ مجھے آپؐ کے گھٹنے نظر آرہے تھے اور میں نے آپ کو یہ فرماتے سنا: "اِسْعَوْا' فَاِنَّ اللّٰہَ کَتَبَ عَلَیْکُمُ السَّعْیَ (سعی کرو' اس لیے کہ اللہ نے تم پر سعی کو ضروری قرار دیا ہے")[1] (شافعی' احمد' ابن ماجہ)

---

[1] یہ صحابہ میں سے حضرت عائشہؓ' ابن عمر اور جابرؓ کا اور ائمہ میں سے امام مالکؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ' داؤد ظاہریؒ اور ابو ثورؒ وغیرہ کا مسلک ہے۔

۴۔ سعی کی شرائط :

سعی میں مندرجہ ذیل اعمال ضروری ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو سعی نہ ہو گی :

(ا) سعی کا طواف کے بعد ہونا : کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کے بعد سعی فرمائی اور آپ کا یہ عام ارشاد ہے" خذوا عنی مناسککم " (مجھ سے اپنے حج کے مناسک لو۔ ا

(ب) ترتیب یعنی سعی کا صفا سے شروع کرنا اور مروہ پر ختم کرنا :

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب سعی کے لیے مسجد سے

امام ابو حنیفہؒ' سفیان ثوریؒ اور حسن بصری کے نزدیک سعی حج اور عمرہ کے لیے واجب ہے' رکن نہیں ہے۔ یعنی اگر یہ رہ جائے تو ایک جانور کی قربانی سے تلافی ہو سکتی ہے۔ ایک روایت میں امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ ان کا استدلال بھی حضرت عائشہؓ کی مذکورہ بالا پہلی حدیث اور اسی معنی کی دوسری احادیث ہی سے ہے۔ حنبلی فقہ کی مشہور کتاب المغنی کے مصنف ابن قدامہؒ نے اسی مسلک کو ترجیح دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سعی مطلق واجب ہے' نہ یہ کہ اس کے ترک کرنے سے حج اور عمرہ باطل ہو جاتا ہے۔ رہی حضرت حبیبہؓ کی حدیث تو اس کے متعلق امام ابن المنذر فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں ایک راوی عبداللہ بن مؤمل ہے' جس کی روایت میں کلام کیا گیا ہے۔

اس بارے میں تیسرا مسلک صحابہؓ میں سے حضرت ابن عباسؓ' ابی بن کعبؓ' عبداللہ بن مسعودؓ' ابن زبیرؓ' انسؓ اور تابعین میں سے ابن سیرینؒ کا ہے۔ اور وہ یہ کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی تطوع (سنت) ہے۔ نہ یہ رکن ہے۔ اور نہ واجب۔ ایک روایت میں امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ ان حضرات کا استدلال یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ جو شخص صفا و مروہ کے درمیان سعی نہ کرے' اس پر کوئی حرج نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سعی کرنا تطوع (سنت) ہے' جو چاہے سعی کرے اور جو نہ چاہے' نہ کرے۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۸۷۔۹۷) (القریٰ لقاصد ام القریٰ ص ۳۲۵۔۳۲۷) المغنی ج ۳ ص ۴۰۷) (ہدایہ ص ۱۰۲)۔

ا۔ یہ ائمہ اربعہ اور عام محدثین کا مسلک ہے۔ امام عطاء' داؤد ظاہری اور بعض محدثین کے نزدیک سعی طواف سے پہلے بھی ہو سکتی ہے۔ ان کا استدلال حضرت ابن شریکؓ کی اس روایت سے ہے کہ میں حج کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلا۔ آپؐ کے پاس لوگ آ رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا' اے اللہ کے رسول! میں نے طواف سے پہلے سعی کی" اور بعض کہہ رہے تھے کہ ہم نے فلاں کام پہلے کر لیا اور فلاں

صفا کی طرف نکلتے' تو میں نے آپؐ کو یہ فرماتے سنا "ہم بھی اسی سے ..... یعنی صفا سے ..... ابتدا کریں گے جس سے اللہ تعالیٰ نے ابتداء فرمائی۔" (احمدؒ' مالکؒ' ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ' ابن حبان' نسائی)۔ مسلم کی روایت میں "میں بھی اسی سے ابتدا کروں گا....." کے الفاظ ہیں۔

نسائی کی ایک روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں "کہ تم بھی اسی سے ابتدا کرو' جس ....."[1]

(ج) سعی میں سات چکر پورے کرنا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سعی میں سات چکر پورے کیے اور آپ کا یہ عام ارشاد ہے کہ "لتاخذوا عنی مناسککم۔"[2]

فائدہ: تمام ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ ایک چکر سے مراد صفا سے مروہ یا مروہ سے صفا تک کا فاصلہ ہے۔ اور اس پر ساری امت کا شروع سے اب تک عمل بھی ہے۔[3]

کام بعد میں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان سب سے فرما رہے تھے "کوئی حرج نہیں' البتہ جس شخص نے ظلم و زیادتی کرتے ہوئے کسی مسلمان کی عزت کو نقصان پہنچایا وہ تباہ ہو گیا اور وہ (حد) اعتدال سے نکل گیا۔" (ابو داؤد) ..... اس حدیث کا مطلب جمہور کے نزدیک ..... جیسا کہ معالم السنن میں امام خطابیؒ نے بیان کیا ہے۔ یہ ہے کہ جس شخص نے اپنی سعی طواف القدوم کے بعد لیکن طواف الافاضہ سے پہلے کی' اس پر کوئی حرج نہیں۔" (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۷۹)۔

۱۔ یہ امام مالکؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ' داؤد ظاہریؒ' حسن بصریؒ اور دوسرے اکثر ائمہ کا مسلک ہے۔ حنفیہ کے نزدیک سعی میں ترتیب 'شرط' نہیں بلکہ واجب ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص صفا کے بجائے مروہ سے سعی کی ابتداء کرلے تو ایک جانور کی قربانی سے اس کی تلافی ہو سکتی ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۸۰۔ ۸۲) (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۶۴۱)۔

۲۔ یہ مالکیہ' شافعیہ اور حنبلیہ کا مسلک ہے۔ حنفیہ کے نزدیک سعی میں سات چکروں کا پورا کرنا واجب ہے' شرط نہیں۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۶۴۰)

۳۔ صرف امام شافعیؒ کے نواسے اور امام ابن جریر طبریؒ اور شافعیہ میں سے ابوبکر صیرفیؒ کے متعلق روایت ہے کہ ان کے نزدیک ایک چکر سے مراد یہ ہے کہ صفا سے مروہ جایا جائے اور پھر مروہ سے صفا واپس لوٹا جائے۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۸۳)۔

۵۔ سعی کی سنتیں:

(ا) سعی کے لیے مسجد حرام سے باب صفا کے راستے باہر آنا:

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجر اسود کا استلام فرمایا' پھر آپ دروازے۔۔۔۔ یعنی باب صفا۔۔۔۔ سے صفا کی طرف تشریف لے گئے۔"
(مسلم' ابوداؤد' احمد وغیرہ)

اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے (المغنی ج ۳ ص ۴۰۳)

(ب) باوضو ہونا: طواف کی طرح سعی کے لیے باوضو ہونا سنت ہے' شرط یا واجب نہیں ہے۔ یعنی اگر وضو کے بغیر سعی ہو جائے تو ایک جانور کی قربانی ضروری نہیں۔

حضرت عائشہؓ کو مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد حیض شروع ہو گیا تو ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم وہ سب کام کرو' جو ایک حاجی کرتا ہے' مگر تم اس وقت تک خانہ کعبہ کا طواف نہ کرو' جب تک (حیض سے فارغ ہو کر) غسل نہ کر لو۔" (مسلم وغیرہ)۔ یعنی حضورؐ نے انہیں حیض کی حالت میں صرف طواف سے منع فرمایا' سعی سے منع نہیں فرمایا۔

نیز حضرت عائشہؓ اور امّ سلمہؓ فرمایا کرتی تھیں "اگر عورت خانہ کعبہ کا طواف کر لے اور پھر دو رکعت نماز پڑھ لے' پھر اسے حیض شروع ہو جائے' تو اسے صفا و مروہ کے درمیان سعی کر لینی چاہیے۔' (سعید بن منصور)

لیکن سعی چونکہ عبادت ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر اور دعا کی جاتی ہے۔ اس لیے جو شخص مجبور نہ ہو (جیسے حائضہ عورت)' اس کے لیے سعی کا وضو کرنا ہی مستحب ہے۔ اس بارے میں ائمہ اربعہ اور دوسرے تمام ائمہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے (المغنی ج ۳ ص ۴۰۷)۔

(ج) موالات (یعنی پوری سعی کا مسلسل کرنا): اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری سعی مسلسل فرمائی۔ لیکن صحابہؓ کے عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ سعی کا مسلسل کرنا سنت ہے' واجب یا شرط نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے صفا و مروہ کے درمیان سعی کی۔ (سعی کے دوران) آپ کو پیشاب آیا' تو آپ نے پیشاب کیا۔ پھر ایک طرف ہو کر وضو کیا' اور پھر جتنی سعی باقی

تھی'اسے مکمل کیا۔(سعید بن منصور)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی صاحبزادی سودہؓ نے اپنی سعی تین دن میں مکمل کی'کیونکہ موٹاپے کی وجہ سے وہ اسے مسلسل نہ کر سکتی تھیں'(سعید بن منصور)۔[1]

(و) صفا اور مروہ کے اوپر چڑھنا: جیسا کہ حضرت جابرؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم صفا اور مروہ پر چڑھے'لیکن آپؐ نے اسے ضروری قرار نہیں دیا۔ لہذا یہ سنت ہے'شرط یا واجب نہیں۔اگر کوئی شخص صفا یا مروہ تک۔۔۔ موجودہ زمانے میں سیڑھیوں تک۔۔۔ پہنچ کر رک جائے تو اس کی سعی ہو جائے گی'اگرچہ وہ فضیلت سے محروم رہے گا۔[2]

(ھ) صفا اور مروہ پر دعا اور اللہ تعالیٰ کا ذکر: صفا اور مروہ پر کھڑے ہو کر قبلہ رخ ہونا اور اللہ تعالیٰ کا ذکر'اور اس سے بار بار دعا کرنا سنت ہے۔

اس بارے میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ صفا اور مروہ پر کسی متعین دعا کا مانگنا ضروری نہیں ہے۔ضرورت اور حالات کے لحاظ سے جو دعا بھی انسان مانگنا چاہے مانگ سکتا ہے'البتہ مستحب یہ ہے کہ ان دعاؤں میں سے کوئی دعا مانگی جائے۔جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرامؓ سے ثابت ہیں۔(الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۸۷)

ذیل میں ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی بعض دعائیں نقل کرتے ہیں:

(۱) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب صفا پر کھڑے ہوتے'تو تین مرتبہ'اللہ اکبر'کہتے اور پھر تین مرتبہ یہ دعا فرماتے:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔	اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں۔صرف وہی ایک اللہ ہے'اس کا کوئی شریک نہیں۔ بادشاہت بھی اسی کی ہے اور حمد و ستائش بھی اسی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

۱۔ مالکیہ کے نزدیک موالات سعی کی شرائط میں داخل ہے۔ اگرچہ تھوڑا سا وقفہ ان کے نزدیک بھی جائز ہے۔(المغنی ج ۳ ص ۴۰۷) (الفقہ۔۔۔۔۔ ص ۶۴۱)۔

۲۔ تمام ائمہ کا یہی مسلک ہے۔صرف بعض شافعی علماء یہ کہتے ہیں کہ جب تک صفا یا مروہ کے اوپر چڑھا نہیں جائے گا'سعی صحیح نہیں ہوگی۔(الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۸۸)۔

پھر مروہ پر بھی آپؐ اسی طرح دعا فرماتے۔ (احمد ' مسلم' ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ' بیہقی)۔

حضرت جابرؓ کی ایک دوسری روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا میں یہ الفاظ زیادہ ہیں :

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَنْجَزَ وَعْدَهٗ وَصَدَقَ عَبْدَهٗ وَغَلَبَ ۔۔۔۔یا ھَزَمَ ۱؎ ۔۔۔الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ۔ (احمد' مسلم' ابوداؤد وغیرہ

اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں ہے۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور اپنے بندے کو سچی امید دلائی اور (کفار کے) تمام لشکروں کو صرف اسی نے شکست دی۔

(۲) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے طواف سے فارغ ہوئے' تو صفا پر آئے۔ آپؐ پہاڑی کے اوپر چڑھ گئے' یہاں تک کہ آپؐ کو خانہ کعبہ نظر آنے لگا۔ تو آپؐ نے ہاتھ اٹھائے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان فرمائی اور جو دعا فرمانا چاہی فرمائی۔" (مسلم' ابوداؤد' بیہقی)۔۔۔۔اس حدیث میں کسی متعین دعا کا ذکر نہیں ہے۔

(۳) حضرت عمرؓ نے مکہ معظمہ میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص جب حج کرنے کے لیے آئے۔ تو اسے چاہیے کہ خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگائے۔ پھر مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز پڑھے۔ پھر صفا سے اپنی سعی کی ابتدا کرے۔ قبلہ رخ ہو کر کھڑا ہو جائے۔ سات مرتبہ 'اللہ اکبر' کہے۔ ہر دو تکبیروں کے درمیان اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے اور اپنے لیے جو دعا مانگنا چاہے' مانگے۔ پھر مروہ پر بھی اسی طرح دعا مانگے۔" (بیہقی)

(۴) حضرت عبداللہ بن عمرؓ صفا پر یہ دعا کیا کرتے تھے :

اَللّٰهُمَّ اعْصِمْنَا بِدِيْنِكَ وَ طَوَاعِيَتِكَ وَطَوَاعِيَةِ رَسُوْلِكَ وَ جَنِّبْنَا حُدُوْدَكَ۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا نُحِبُّكَ وَ نُحِبُّ مَلَائِكَتَكَ وَ

اے اللہ! اپنے دین اور اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت کے ذریعے ہماری حفاظت فرما اور ہمیں اپنی مقرر کردہ حدود (خلاف ورزی) سے دور رکھ۔

۱۔ غَلَبَ کے الفاظ مسند امام احمدؒ کے اور ھَزَمَ کے الفاظ ابوداؤد اور مسلم کی روایت کے ہیں۔

اَنْبِیَائِکَ وَرُسُلِکَ وَنُحِبُّ عِبَادَکَ الصَّالِحِیْنَ۔ اَللّٰھُمَّ یَسِّرْنَا لِلْیُسْرٰی وَجَنِّبْنَا الْعُسْرٰی وَاغْفِرْلَنَا فِی الْاٰخِرَۃِ وَالْاُوْلٰی وَاجْعَلْنَا مِنْ اَئِمَّۃِ الْمُتَّقِیْنَ۔ (بیہقی)

۔اے اللہ! ہمارے دلوں میں اپنی' اپنے فرشتوں کی' اپنے نبیوں اور رسولوں کی اور اپنے نیک بندوں کی محبت ڈال دے۔ اے اللہ! ہمارے لیے (اپنے دین پر چلنا) آسان کر دے اور مشکل سے ہمیں بچا اور آخرت اور دنیا میں ہمارے گناہ معاف کر دے۔

اور ہمیں متقی لوگوں (یعنی اولاد) کا امام بنا۔

(۵) حضرت عبداللہ بن عمرؓ صفا پر یہ دعا بھی کیا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ قُلْتَ ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ وَاِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ' وَاِنِّیْ اَسْئَلُکَ کَمَا ھَدَیْتَنِیْ لِلْاِسْلَامِ اَنْ لَّا تَنْزِعَہٗ مِنِّیْ حَتّٰی تَتَوَفَّانِیْ وَاَنَا مُسْلِمٌ۔ (موطا امام مالکؒ' بیہقی)

اے اللہ! تو نے (اپنی کتاب پاک میں) فرمایا ہے کہ مجھے پکارو' میں تمہاری دعا قبول کروں گا اور تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ اس لیے تجھ سے سوال کرتا ہوں' کہ جس طرح تو نے مجھے اسلام کی راہ دکھائی ہے' اسی طرح تو اسلام کو میرے دل سے نہ نکال' یہاں تک کہ تو اسی پر مجھے موت دے دے۔

(۶) دونوں سبز ستونوں کے درمیان رمل: صفا کے قریب مسعٰی کے کنارے سبز رنگ کے دو ستون بنے ہوئے ہیں۔ ان دونوں ستونوں کے درمیان رمل یعنی دوڑ کر چلنا اور باقی سعی میں عام رفتار سے چلنا مسنون ہے۔ دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ جگہ نشیب تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دوڑ کر پار فرمایا تھا۔

حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے "کہ آپؐ (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم) جب نشیب میں پہنچے' تو آپؐ نے رمل فرمایا (یعنی دوڑ کر چلے)"۔ (مسلم' ابوداؤد' احمد' ابن ماجہ' نسائی)

سعی کا اس طرح کرنا (یعنی دونوں ستونوں کے درمیان دوڑ کر چلنا اور باقی سعی میں عام رفتار سے چلنا) افضل اور مسنون ہے' ورنہ پوری سعی کا عام رفتار سے کرنا بھی جائز ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے پوری سعی عام رفتار سے چل کر ادا کی اور پھر فرمایا۔ "اگر میں دوڑ کر چلوں' تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوڑ کر چلتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اور اگر عام رفتار سے چلوں' تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عام رفتار سے چلتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں اس لیے سعی عام رفتار سے چل کر ادا کر رہا ہوں۔" (ابوداؤد' ابن ماجہ)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں "والمشی والسعی افضل (یعنی سعی کا وادی میں دوڑ کر اور باقی جگہ میں عام رفتار سے چل کر ادا کرنا افضل ہے۔ (مسلم)۔

لیکن دونوں ستونوں کے درمیان یہ دوڑنا صرف مردوں کے لیے مسنون ہے' عورتوں کے لیے پوری سعی کا عام رفتار سے ہی چل کر کرنا مسنون ہے۔ اس بارے میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ (المغنی ج ۳ ص ۴۱۲)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں "عورتوں کے لیے نہ خانہ کعبہ میں داخل ہونا ہے اور نہ صفا و مروہ کے درمیان دوڑنا (ابوذر)۔

حضرت عائشہؓ نے چند عورتوں کو دوڑ کر سعی کرتے دیکھا تو ان سے فرمایا۔ "کیا تمہارے لیے کوئی اسوہ نہیں ہے؟ تمہارے لیے دوڑنا نہیں ہے"۔۔۔ (مسند امام شافعیؒ)۔

اس بارے میں بھی تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ طواف اور سعی کا چل کر ادا کرنا افضل ہے' اگرچہ عذر کی حالت میں سوار ہونا بھی جائز ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۸۴۔ ۸۵)۔

(ز) سعی کے دوران دعا اور اللہ تعالٰی کا ذکر :

حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سعی کرتے ہوئے یہ دعا فرماتے تھے :

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاهْدِنِي السَّبِيْلَ الْاَقْوَمَ۔	اے میرے رب! میری بخشش فرما' اور مجھ پر رحم کر اور مجھے سیدھے راستے کی ہدایت دے۔

دوسری روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سعی کے دوران یہ دعا فرمایا کرتے تھے :

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ، إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعَزُّ الْأَكْرَمُ۔	اے میرے رب! میری بخشش فرما' اور مجھ پر رحم کر' بیشک تو ہی قوت اور کرم والا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی سعی میں یہی دعا کیا کرتے تھے (القریٰ لقاصد ام القریٰ ص ۳۳۱)

۶۔ سعی کے بعد معتمر اور متمتع کا حلق (سر کے بال منڈوانا) یا تقصیر (سر کے بال کتروانا) کرا کے اپنا احرام کھول لینا۔ :

جس شخص کا احرام عمرہ یا تمتع کا ہو' اس کے لیے جائز ہے کہ وہ خانہ کعبہ کا طواف اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کر کے حلق یا تقصیر کرا لے اور اپنا احرام کھول لے۔ اس بارے میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے (المغنی ج ۳ ص ۴۱۰)۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حجتہ الوداع میں نکلے۔ ہم میں سے کچھ لوگوں نے صرف حج (افراد) کا احرام باندھا تھا۔ اور بعض نے صرف عمرہ کا' اور وہ اپنے ساتھ قربانی کا جانور لائے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جس شخص نے عمرہ کا احرام باندھا ہے اور اپنے ساتھ قربانی کا جانور لایا ہے' اسے اپنا احرام کھول لینا چاہیے"۔ حضرت عائشہؓ کی دوسری روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں۔ "جس شخص نے عمرہ کا احرام باندھا' پھر اس نے خانہ کعبہ کا طواف کیا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کی اور اس نے تقصیر کرا لیا (یعنی سر کے بال کتروا لیے) اس کے لیے وہ چیزیں حلال ہو گئیں جو احرام کی حالت میں اس پر حرام تھیں۔ یہاں تک کہ وہ حج کے لیے دوبارہ احرام باندھ لے۔" (بخاری و مسلم وغیرہ)۔

اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سعی کے بعد احرام حلق سے بھی کھولا جا سکتا ہے اور تقصیر سے بھی۔ (المغنی وغیرہ)۔

فائدہ: امام احمدؒ اور اکثر علماء۔۔۔۔ جیسے ابن حجرؒ' ابن قدامہ' شوکانی۔۔۔۔ نے اسے مستحب قرار دیا ہے کہ جو شخص تمتع کرے' اگر اسے یہ امید ہو کہ حج تک اس کے بال اگ آئیں گے' تو حلق کرائے اور اگر اسے یہ امید نہ ہو تو وہ تقصیر کرائے تاکہ حج کے بعد حلق کرا

سکے۔(فتح الباری ج ۴ ص ۳۱۲)(المغنی ج ۳ ص ۳۱۱)۔

اس پر اجماع ہے کہ عورت احرام کھولنے کے لیے تقصیر ہی کرائے گی' حلق کرانا اس کے لیے جائز نہیں ہے۔(معالم السنن ج ۲ ص ۴۲۰)۔۔۔۔(فتح الباری ج ۴ ص ۳۱۲)

فائدہ : حلق اور تقصیر سے متعلق دوسرے مسائل کا ذکر اعمال یوم النحر' کے باب کے تحت آرہا ہے۔

۷۔ مفرد اور قارن کا جب تک حج کے اعمال سے فارغ نہ ہولیں' اپنا احرام نہ کھولنا۔:

اس پر اجماع ہے کہ سعی کے بعد مفرد اور قارن اپنا احرام نہیں کھول سکتے وہ اس وقت تک احرام ہی کی حالت میں رہیں گے' جب تک وقوف عرفہ' رمی جمار اور حج کے دوسرے مناسک سے فارغ نہ ہولیں۔(الفتح الربانی' ج ۱۲ ص ۹۱)۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ "جن لوگوں نے صرف عمرہ کا احرام باندھا تھا' انہوں نے جب خانہ کعبہ کا طواف اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرلی' تو انہوں نے احرام کھول لیا۔ لیکن جن لوگوں نے صرف حج (افراد) یا حج اور عمرہ دونوں (قران) کا احرام باندھا تھا۔ انہوں نے قربانی کے دن (۱۰ ذی الحجہ) تک احرام نہیں کھولا۔" دوسری روایت میں حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا "اے اللہ کے رسول! کیا بات ہے کہ لوگوں نے اپنا احرام کھول لیا' مگر آپؐ نے عمرہ کر کے احرام نہیں کھولا؟" فرمایا "میں قربانی کا جانور اپنے ساتھ لایا ہوں (یعنی میں نے اپنا احرام قران کا کر لیا ہے)۔ احرام باندھتے وقت بالوں میں گوند ڈال لیا تھا (تاکہ وہ پراگندہ نہ ہوں)۔ لہذا میں اس وقت تک احرام نہ کھولوں گا' جب تک حج سے فارغ نہ ہو جاؤں"۔(احمد' بخاری' مسلم' بیہقی وغیرہ)۔

۸۔ سعی کے بعد مفرد اور قارن اپنا احرام عمرہ کا احرام بنا کر بھی نہیں کھول سکتے:

حضرت جابرؓ اور متعدد دوسرے صحابہ سے یہ روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے مکہ معظمہ پہنچ کر صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ جن لوگوں نے افراد یا قران کا احرام باندھا ہو اور وہ اپنے ساتھ قربانی کا جانور نہ لائے ہوں' وہ اپنا احرام عمرہ کا قرار دے کر کھول لیں' لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم صرف صحابہ کرام کے لیے اور صرف اسی سال کے لیے تھا۔ بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ لہٰذا اب یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی شخص جس نے افراد یا قران کا احرام باندھا ہو' سعی کے بعد اپنا احرام عمرہ کا قرار دے کر کھول لے۔

حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں "حج میں تمتع (یعنی حج کا تمتع سے بدل لینا) صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے لیے خاص تھا۔" (مسلم)

حضرت بلالؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا "اے اللہ کے رسول! حج کا فسخ کرنا (یعنی حج کا احرام باندھنا اور پھر اسے عمرہ کا قرار دے کر سعی کے بعد۔۔۔ کھول لینا) کیا ہمارے ہی لیے خاص ہے یا یہ تمام لوگوں کے لیئے ہے ؟" فرمایا۔ "یہ ہمارے ہی لیے خاص ہے۔" (نسائی) [1]

---

[1] ۔ یہ امام ابو حنیفہؒ' مالکؒ' شافعیؒ اور دوسرے اکثر ائمہ کا مسلک ہے۔

امام احمدؒ' مجاہد' حسن بصریؒ' ظاہریہ اور عام محدثین کے نزدیک حج کے احرام کا تمتع کے احرام سے بدل لینا صرف صحابہ کرامؓ کے لیے مخصوص نہ تھا بلکہ یہ قیامت تک ہر شخص کے لیے مستحب بلکہ ضروری ہے۔ ان کا استدلال ان متعدد احادیث سے ہے جن کو پندرہ صحابہ کرامؓ نے روایت کیا ہے اور جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے احرام کو عمرہ کے احرام سے بدلنے کی اجازت دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان احادیث میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے جس کی بنا پر اس اجازت کو صرف صحابہ کرامؓ کے لیے اور وہ بھی صرف اسی سال کے لیے مخصوص قرار دیا جا سکے۔ بلکہ ان احادیث میں سے بعض میں اس بات کی صراحت ہے کہ صحابہ کرام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آیا ایسا کرنا (یعنی حج کے احرام کا تمتع کے احرام سے بدل لینا) صرف ہمارے ہی لیے ہے یا ہمیشہ کے لیے ؟۔ تو آپؐ نے فرمایا "یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے۔" رہی ابوذرؓ کی حدیث' تو اس سے استدلال کرنا اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اس میں ایک صحابیؓ کی اپنی رائے کا ذکر کیا گیا ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اور ایک صحابیؓ کی یہ رائے بھی ایسی ہے جس کی مخالفت میں متعدد دوسرے صحابہؓ کی رائے موجود ہے۔ رہی حضرت بلالؓ کی روایت' تو اس میں اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل کیا گیا ہے' لیکن یہ ایک منفرد روایت ہے جو پندرہ صحابہ کرامؓ کی صحیح روایات کے مخالف پڑتی ہے اس لیے اس کی وجہ سے ان تمام صحیح احادیث کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔

۹۔ متمتع کے لیے یہ سعی صرف عمرہ کی' مفرد کے لیے صرف حج کی' اور قارن کیلیے عمرہ اور حج دونوں کی ہے

پہلے طواف (طواف العمرہ) کے بعد متمتع جو سعی کرے گا' وہ اس کے لیے صرف عمرہ کی سعی ہو گی۔ حج کی سعی اسے قربانی کے دن (۱۰ ذی الحجہ) طواف الافاضہ کے بعد پھر کرنی ہو گی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ ۔۔۔۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ترویہ کے روز (۸ ذی الحجہ) ہم لوگوں کو (یعنی ان لوگوں کو جنہوں نے تمتع کیا تھا اور سعی کے بعد احرام کھول لیا تھا) حکم دیا کہ ہم حج کا احرام باندھیں۔ جب ہم حج کے مناسک سے فارغ ہوئے' تو آکر ہم نے طواف (طواف الافاضہ) کیا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کی اور اس طرح ہمارا حج مکمل ہو گیا۔" (بخاری)۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جن لوگوں نے عمرہ کا احرام باندھا تھا (یعنی تمتع کیا تھا)۔ انہوں نے (مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد) خانہ کعبہ کا طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کی' پھر انہوں نے احرام کھول لیا' پھر انہوں نے منیٰ سے واپس آکر (۱۰ ذی الحجہ کو) اپنے حج کا طواف (یعنی خانہ کعبہ کا طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کی)" (احمد' بخاری' مسلم وغیرہ)۱

پہلے مسلک والوں کے نزدیک "یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے" کا مطلب یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جائز ہے نہ یہ کہ حج کا احرام باندھ کر بعد میں اسے تمتع کے احرام سے بدل لینا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جائز ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ص ۱۰۶) (مختصراً از زاد المعاد ج ا ص ۷ ۴۔ ۴۳۳)

۱۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ صرف ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ قول منقول ہے کہ "قارن' مفرد اور متمتع کے لیے خانہ کعبہ کا ایک طواف اور صفا و مروہ کے درمیان ایک سعی کافی ہے"۔ (احمد)۔۔۔۔ اس روایت کی بنا پر ایک روایت میں امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ لیکن دوسری روایت میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور امام احمدؒ کا مسلک وہی ہے۔ جو اوپر نقل کیا گیا ہے۔۔۔۔ امام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد تمتع کے لیے صرف ایک سعی ہی کے قائل ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ حضرت جابرؓ نے اپنی جس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کی روداد بیان کی ہے اس میں انہوں نے یہ ذکر نہیں

مفرد کے لیے یہ سعی حج کی اور قارن کے لیے عمرہ اور حج دونوں کی ہوگی لہذا ان کو طواف الافاضہ کے بعد دوبارہ سعی کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر طواف القدوم کے بعد سعی نہ کریں' تو طواف الافاضہ کے بعد انہیں سعی کرنی ہوگی۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صفاو مروہ کے درمیان صرف ایک سعی فرمائی اور وہ جو آپؐ نے پہلی مرتبہ (یعنی طواف القدوم کے بعد) فرمائی۔" (مسلم' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)۔ مسلم کی روایت میں "نبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے ساتھ "اور آپؐ کے اصحابؓ نے" کے الفاظ زیادہ ہیں۔

دوسری روایت میں حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ (یعنی جن لوگوں نے قران کا احرام باندھا تھا) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آئے۔ ہم نے خانہ کعبہ کا طواف کیا اور صفاو مروہ کے درمیان سعی کی۔ جب قربانی کا دن (۱۰ ذی الحجہ) آیا' تو ہم لوگ صفاو مروہ کے قریب تک نہیں گئے۔" (مسند امام احمدؒ)

قارن کے متعلق یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "من قرن بین حجه و عمرته" (جس نے اپنے حج اور عمرہ کے درمیان قران کیا) اس کے لیے ایک طواف اور ایک سعی کافی ہے۔" (ترمذی' ابن ماجہ)[1]

کیا کہ جن لوگوں نے سعی کرنے کے بعد اپنا احرام کھول لیا تھا' انہوں نے طواف الافاضہ کے بعد دوبارہ پھر سعی کی۔" (تہذیب ابن قیم علی معالم السنن ج ۲ ص ۳۸۲) (رسالہ مناسک حج و عمرہ از ابن تیمیہ ص ۲۹)۔

[1] یہ امام مالکؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ اور عام محدثین کا مسلک ہے۔

امام ابو حنیفہؒ' اوزاعیؒ' ابراہیم نخعیؒ اور سفیان ثوریؒ کے نزدیک مفرد کی سعی کا تو وہی حکم ہے' جو اوپر بیان کیا گیا ہے' لیکن قارن کے لیے ان کے نزدیک دو سعی ہیں۔ ایک عمرہ کی اور دوسری حج کی' اور ان کا الگ الگ کرنا ضروری ہے۔ مکہ معظمہ پہنچ کر سب سے پہلے وہ عمرہ کا طواف کرے گا اور پھر عمرہ کی سعی کرے گا۔ اس کے بعد واپس جا کر طواف القدوم کرے گا اور پھر حج کی سعی کرے گا۔ یا وہ یوں بھی کر سکتا ہے' اگرچہ ایسا کرنا اچھا نہیں ہے' کہ پہلے طواف العمرہ اور طواف القدوم کرے اور پھر آکر ایک مرتبہ عمرہ کی اور دوسری مرتبہ حج کی سعی کرے۔۔۔۔ اس بارے میں جن روایات سے ان حضرات کا استدلال ہے اور اس بارے میں ان کے اور پہلے مسلک والوں کے درمیان جو اختلاف ہے اس کی تفصیل کے لئے دیکھیے حاشیہ صفحہ ۸۰۔

اعمالِ یَوْمُ التَّرْوِیَۃ

(۸ ذی الحجہ)

ا۔ وقت اور حکم:

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد متمتع طواف اور سعی کے بعد اپنا احرام کھول لے گا اور قارن اور مفرد اپنا احرام نہیں کھولیں گے۔ ترویہ کے روز[1] (۸ ذی الحجہ) متمتع کا اور اس شخص کا جو اہل مکہ میں سے حج کرنا چاہے' نیا احرام باندھ کر اور قارن اور مفرد کا اپنے اسی احرام کے ساتھ[2] منیٰ جانا مسنون ہے' جیسا کہ حضرت جابرؓ کی حدیث میں بیان ہوا ہے۔ "جب ترویہ کا روز آیا اور لوگ منیٰ کی طرف روانہ ہوئے' تو انہوں نے (یعنی جن لوگوں نے سعی کے بعد احرام کھول لیا تھا) حج کا احرام باندھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم (اپنی اونٹنی پر) سوار ہوئے اور (منیٰ پہنچ کر) ظہر' عصر' مغرب اور عشاء اور اگلے دن کی فجر کی نمازیں ادا فرمائیں۔" (مسلم' داؤد' احمد' ابن ماجہ وغیرہ)۔

دوسری حدیث میں حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ جب عمرہ کے بعد ہم لوگوں نے احرام کھول لیا' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ جب ہم (حج کے لیے ترویہ کے روز) منیٰ جائیں' تو احرام باندھیں۔ تو ہم نے ابطح (مکہ معظمہ کی وادی جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے قیام فرمایا تھا) وہاں سے احرام باندھا۔" (مسلم)۔

سنت یہ ہے کہ احرام اسی جگہ سے باندھا جائے جہاں انسان مقیم ہو۔ اگر وہ مکہ معظمہ میں ہے تو مکہ معظمہ ہی سے احرام باندھے گا' اور اگر باہر ہے تو جہاں ہے وہیں سے

ا۔ ۸ ذی الحجہ کو یوم الترویہ کیوں کہا جاتا ہے؟ اس بارے میں سب سے مشہور قول یہ ہے یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور اس سے پہلے چونکہ منیٰ اور عرفات وغیرہ میں پانی نہ ملتا تھا۔ اس لیے جو لوگ حج کرنا چاہتے تھے' وہ اس روز اپنے اونٹوں کو پانی پلایا کرتے تھے تاکہ وہ حج کے چار پانچ روز پانی کے بغیر گزار سکیں۔ ترویہ کا مادہ رَوِیَ ہے' جس کے معنی سیراب کرنے کے ہیں۔

(الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۱۰)۔

۲۔ منیٰ کا فاصلہ مکہ معظمہ سے تقریباً چار میل ہے۔

احرام باندھے گا' جیسا کہ حضرت جابرؓ کی اس حدیث میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قیام گاہ سے احرام باندھا۔

ترویہ کے روز انسان جس روز چاہے منیٰ جا سکتا ہے۔ لیکن سنت یہ ہے کہ ظہر کی نماز منیٰ جا کر پڑھی جائے اور وہاں ایک رات گزار کر اگلے دن (۹ ذی الحجہ) سورج نکلنے کے بعد عرفات روانہ ہو جائے' جیسا کہ حضرت جابرؓ کی حدیث میں بیان ہوا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ وہ یہ پسند کرتے تھے کہ اگر ہو سکے' تو ترویہ کے روز ظہر کی نماز منیٰ جا کر ادا کریں' اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز منیٰ پہنچ کر ہی ادا فرمائی تھی۔" (مسند امام احمدؒ)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں پانچ نمازیں ادا فرمائیں۔ (مسند امام احمدؒ)

ترویہ کے روز ظہر کی نماز سے پہلے پہلے منیٰ پہنچ جانا اور وہاں پانچ نمازیں ادا کرنا سنت ہے۔ کسی کے نزدیک یہ واجب نہیں ہے۔

حضرت عائشہؓ اتنی دیر سے منیٰ پہنچیں کہ تہائی رات گزر گئی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بھی ظہر کی نماز مکہ میں ادا کی۔ اگر ضرورت یا مجبوری ہو' تو انسان ایسا کر سکتا ہے' اس کے ذمہ کوئی فدیہ ضروری نہ ہوگا۔ (طبرانی ج ۲، ص ۲۲۳-۲۲۴) (نیل الاوطار ج ۵، ص ۶۰) وغیرہ۔

اس پر بھی تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ منیٰ میں انسان جس جگہ چاہے قیام کر سکتا ہے (کسی خاص جگہ کی کوئی خصوصیت نہیں ہے) (الفتح الربانی ج ۱۲، ص ۱۱۲)۔

۲۔ نمازمیں قصر:

منیٰ' عرفات اور مزدلفہ میں آفاقی یعنی باہر سے آئے ہوئے حاجی اپنی نماز قصر کر کے پڑھیں گے اور جو لوگ مکہ معظمہ یا ان جگہوں کے رہنے والے ہوں جن کی مسافت قصر کی مسافت [1] سے کم ہو' وہ پوری نماز پڑھیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپؐ کے

۱۔ قصر کی مسافت اور اس میں مختلف مسالک کے لیے دیکھیے حصہ اول صفحہ ۲۲۵

۲۔ یہ جمہور (جن میں امام ابو حنیفہؒ' آپ کے اصحابؒ جن میں امام شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ' اور دوسرے شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ امام مالکؒ' اوزاعیؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک منیٰ' عرفات اور مزدلفہ میں تمام حاجی خواہ وہ باہر کے ہوں یا مکہ کے' قصر کر کے ہی نماز پڑھیں گے۔ اس اختلاف کی وجہ یہ

ساتھ جو صحابہ کرامؓ مدینہ سے آئے تھے' انہوں نے اگرچہ نماز میں قصر کیا' لیکن اہل مکہ کو آپؐ نے حکم دیا" اَتِمُّوْا فَاِنَّا سَفَرٌ (تم اپنی نماز پوری کر کے پڑھو۔ اس لیے کہ ہم تو مسافر ہیں)" [1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۹) :۔

ہے کہ جمہور کے نزدیک قصر کی وجہ سفر ہے اور امام مالکؒ اور اوزاعیؒ کے نزدیک اس کی وجہ اس کا حج کے مناسک میں سے ہونا ہے (المغنی ج ۳ ص ۲۷۴) (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۲۲۵)۔

امام ابن تیمیہؒ اور بعض دوسرے علماء نے جو سفر میں مسافت کے قائل نہیں ہیں' امام مالکؒ اور اوزاعیؒ ہی کے مسلک کو اختیار کیا ہے۔ اس کی تائید کرتے ہوئے امام ابن قیمؒ لکھتے ہیں۔ "(حج میں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کے لوگ بھی تھے۔ بلاشبہ انہوں نے بھی آپؐ کے ساتھ قصر کر کے نمازیں پڑھیں۔ آپؐ نے انہیں پوری نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپؐ نے انہیں 'اتمو افانا سفر' کا حکم دیا انہیں دراصل سخت غلط فہمی اور وہم ہوا ہے۔ آپؐ نے یہ حکم اہل مکہ کو شہر کے اندر فتح مکہ کے موقع پر دیا تھا۔ جب کہ وہ اپنے شہر میں مقیم تھے (نہ کہ حج میں) لہذا صحیح مسلک یہی ہے کہ اہل مکہ بھی دوسرے حاجیوں کی طرح قصر سے نماز پڑھیں گے۔ (زاد المعاد ج ا ص ۴۶۱۔ ۴۶۲)

اعمالِ یومِ عرفہ

(۹ذی الحجہ)

۹ذی الحجہ کو یوم عرفہ کہا جاتا ہے' کیونکہ اس دن حاجی منیٰ سے عرفات آجاتے اور وہاں وقوف کرتے ہیں' جو حج کا سب سے بڑا رکن ہے۔اس دن جو کام کیے جاتے ہیں' وہ مندرجہ ذیل ہیں :

۱۔ سورج نکلنے کے بعد منیٰ سے عرفات روانگی اور زوال آفتاب تک

وادیٔ نمرہ میں قیام :

۹ذی الحجہ کو سورج طلوع ہو جانے کے بعد منیٰ سے عرفات روانہ ہونا اور جب تک زوال آفتاب نہ ہو' وادی نمرہ میں ٹھہرنا مسنون ہے۔اس بارے میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے (الفتح الربانی ج ۱۲ص ۱۱۶)۔

حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے "(منیٰ میں) فجر کی نماز کے بعد حضورؐ کچھ دیر ٹھہرے رہے۔جب سورج طلوع ہو گیا' تو آپؐ نے حکم دیا' جس کے مطابق آپؐ کے لیے وادیٔ نمرہ (عرفات سے قریب ایک وادی جو عرفات کا حصہ نہیں ہے) میں خیمہ لگادیا گیا۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہوئے۔ قریش کے لوگوں کو یقین تھا کہ آپ مشعر حرام (مزدلفہ) پہنچ کر رک جائیں گے' جیسا کہ قریش جاہلیت کے زمانہ میں کیا کرتے تھے۔لیکن آپ آگے بڑھے' یہاں تک کہ عرفات پہنچ گئے۔آپؐ نے دیکھا کے آپ کے لیے وادی نمرہ میں خیمہ لگادیا گیا ہے۔" (مسلم' ابو داؤد' احمد' ابن ماجہ وغیرہ)

منیٰ سے عرفات جاتے ہوئے تلبیہ اور تکبیر (اللہ اکبر کہنا) دونوں مستحب ہیں۔

محمد ابن ابوبکر ثقفیؒ سے روایت ہے کہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ (عرفہ کے روز منیٰ سے) عرفات جارہا تھا۔میں نے ان سے دریافت کیا "آج عرفہ کے دن آپ لوگ (یعنی صحابۂ کرامؓ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں کونسا ذکر یا دعا کیا کرتے تھے ؟" انہوں نے جواب دیا "ہم میں سے بعض لوگ تلبیہ کہتے تھے" انہیں بھی نہ ٹوکا جاتا تھا

اور بعض تکبیر کہتے تھے' انہیں بھی نہ ٹوکا جاتا تھا۔" (بخاری' مسلم' احمد' نسائی' ابن ماجہ)۔

ابن سخرہؒ سے روایت ہے کہ ہم یوم عرفہ کی صبح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ساتھ منیٰ سے عرفات سے روانہ ہوئے۔ آپ تلبیہ فرما رہے تھے۔ آپ کا رنگ گندمی تھا اور آپ کے سر پر چٹیا تھی' اس لیے شکل و صورت میں دیہاتی نظر آ رہے تھے۔ لوگوں نے شور مچا دیا اور آپ سے کہنے لگے۔ "ارے دیہاتی! آج تلبیہ کا دن نہیں ہے۔ آج تو صرف تکبیر کہنے کا دن ہے"۔ اس پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے۔ "کیا لوگوں کو پتہ نہیں یا یہ لوگ بھول گئے؟ مجھے اس ذات پاک کی قسم جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دینِ حق دے کر مبعوث کیا۔ میں عرفہ کی صبح نبی کریمؐ کے ساتھ (منیٰ سے عرفاتؑ) روانہ ہوا۔ آپ نے تلبیہ اس وقت تک جاری رکھا جب تک آپؐ نے (۱۰ ہجری الحجہ کو) جمرہ عقبہ پر رمی نہ فرمالی۔ ہاں آپؐ تلبیہ کے دوران "اللہ اکبر" اور "لا الہ الا اللہ" بھی فرماتے تھے۔ (احمد' حاکم)

۲۔ زوال آفتاب کے بعد نمرہ کے مقام پر ظہر و عصر کی نمازیں جمع اور قصر کر کے پڑھنا اور ان سے پہلے امام کا خطبہ دینا۔ :

زوال آفتاب کے بعد نمرہ کے مقام پر (جہاں اب مسجد نمرہ بنی ہوئی ہے) ظہر و عصر کی نمازیں جمع کر کے باجماعت پڑھنا اور ان سے پہلے امام کا خطبہ دینا مسنون ہے۔ اس بارے میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۱۶)۔

حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے کہ حضورؐ وادی (یعنی وادی نمرہ) کے نشیب میں تشریف لائے اور لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے فرمایا "ان دماء کم۔۔۔۔۔[1]' پھر آپ نے اذان دلوائی' پھر اقامت کہی اور ظہر کی نماز پڑھی۔ پھر اقامت کہی' اور عصر کی نماز پڑھی۔ ان دونوں نمازوں کے درمیان آپ نے کوئی نماز (یعنی سنتیں اور نفل) نہیں پڑھی۔" (مسلم' ابوداؤد' احمد' ابن ماجہ وغیرہ)

اس پر اجماع ہے کہ ظہر و عصر کی ان دونوں نمازوں میں قراءت کا سری ہونا مسنون ہے۔ (الفتح الربانی حوالہ مذکورہ)۔

جیسا کہ حضرت جابرؓ کی اس حدیث میں مذکور ہے۔ ان دونوں نمازوں کے لیے ایک اذان اور

۱۔ اس خطبہ کا ذکر "حج کے مناسک اور ان کی ترتیب" کے باب میں گزر چکا ہے۔

دو اقامتیں کہی جائیں گی۔[1]

اگر کسی شخص کو باجماعت نماز نہ مل سکے' تب بھی وہ ظہر و عصر کی نمازوں کو جمع کر کے پڑھ سکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ایسا کرنا ثابت ہے" [2]

اہل مکہ کے علاوہ دوسرے حاجی ان دونوں نمازوں میں قصر کریں گے۔ اہل مکہ کے قصر کرنے یا نہ کرنے کے متعلق اختلاف ہے۔ جس کا ہم "اعمالِ یَوْمُ التَّرْوِیَۃ" کے باب میں ذکر کر چکے ہیں۔

۳۔ وقوف :

(ا) وقوف عرفات کا حکم : وقوف عرفات حج کا اہم ترین رکن ہے۔ اگر یہ رہ جائے' تو حج نہیں ہو سکتا اور نہ فدیہ وغیرہ سے اس کی تلافی ہو سکتی ہے۔ اس پر پوری امت کا اجماع ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۲۴)۔

حضرت عبدالرحمٰن بن یعمر دیلیؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عرفات میں وقوف فرما رہے تھے کہ آپ کی خدمت میں نجد کے چند آدمی حاضر ہوئے' اور انہوں نے دریافت کیا "اے اللہ کے رسول! حج کیسے ہے؟" فرمایا" اَلْحَجّ عَرَفَةُ (حج عرفہ ہے یعنی

۱۔ امام طحاویؒ نے اس بارے میں اجماع نقل کیا ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اس بارے میں امام مالکؒ کا اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک ان دونوں نمازوں کے لیے دو اذانیں اور دو اقامتیں کہی جائیں گی۔ (الفتح الربانی حوالہ مذکورہ)۔

۲۔ یہ جمہور (جن میں امام مالکؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ' عطاءؒ' اسحاقؒ اور حنفیہ میں سے امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ امام ابو حنیفہؒ' سفیان ثوریؒ' اور ابراہیم نخعیؒ کے نزدیک ایسے شخص کے لیے دونوں نمازوں کو جمع کر کے پڑھنا جائز نہیں ہے۔ (المغنی ج ۳ ص ۴۲۵)۔ امام ابو حنیفہؒ کے اس مسلک کی بنیاد یہ ہے کہ ہر نماز کا اس کے وقت پر ہی ادا کرنا فرض ہے۔ لہذا اس کا صرف اس وقت ترک کرنا جائز ہے جہاں شریعت نے اس کی اجازت دی ہو۔ عرفات میں ظہر و عصر کو امام کے ساتھ جمع کر کے پڑھنے کی تو شریعت نے اجازت دی ہے' اس لیے ظہر و عصر کی نماز جماعت کے ساتھ جمع کر کے پڑھنا تو صحیح ہے۔ (لیکن امام سے الگ تنہا نماز پڑھنے کی صورت میں بھی دونوں نمازوں کو جمع کر کے پڑھنے کا شریعت میں ذکر نہیں ہے۔ اس لیے یہ صحیح نہیں ہے۔ (ھدایہ ج ۱ ص ۱۰۳)۔

یعنی حج اس شخص کا صحیح ہے جو عرفات کا وقوف پالے) جو شخص جمع کی رات (یعنی مزدلفہ کی رات میں مغرب وعشاء کی نمازیں جمع کر کے پڑھی جاتی ہیں) کی صبح سے پہلے پہلے آ جائے' اس کا حج ہو جائے گا۔ (ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' احمد وغیرہ)

(ب) وقوف عرفات کا وقت : وقوف عرفات کا وقت زوال آفتاب کے بعد سے اگلے دن (۱۰ ذی الحجہ) کی صبح تک ہے۔ جیسا کہ عبدالرحمٰن بن یعمرؓ کی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مذکور ہے' لہٰذا جو شخص اس وقت کے اندر اندر عرفات پہنچ گیا اس کا وقوف شمار ہو جائے گا' لیکن جو شخص اس وقت کے اندر اندر عرفات نہیں پہنچ سکا' اس سے حج کا یہ رکن فوت ہو گیا۔[1]

جو شخص دن میں وقوف کرے' اس کا غروب آفتاب کے بعد تک وقوف کرنا مسنون ہے' کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غروب آفتاب کے بعد تک وقوف فرمایا۔ اور پھر مزدلفہ کے لیے روانہ ہو گئے۔[2]

۱۔ یہ امام ابو حنیفہؒ' امام مالکؒ' امام شافعیؒ اور دوسرے ائمہ کا مسلک ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک وقوف عرفات کا وقت عرفہ کے روز (۹ ذی الحجہ) صبح ہو جانے کے بعد شروع ہو جاتا ہے اور اگلے دن (۱۰ ذی الحجہ) کی صبح تک باقی رہتا ہے۔ ان کا استدلال حضرت عروہ بن مضرسؓ کی اس حدیث سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس شخص نے ہمارے ساتھ مزدلفہ کی رات صبح کی نماز پڑھی اور اس سے پہلے دن یا رات میں (ليلًا أو نهارًا) میں وہ عرفات گیا اور وہاں سے پلٹا' اس کا حج پورا ہو گیا۔ اور اس نے اپنے مناسک حج مکمل کر لیے۔ (احمد' ابو داؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ وغیرہ) اس حدیث سے امام احمدؒ کا استدلال یہ ہے کہ ليلًا أو نهارًا کے الفاظ مطلق ہیں۔ لہٰذا پورے دن کے ہر حصہ میں وقوف عرفات ہو سکتا ہے۔ اگرچہ افضل یہ ہے کہ وقوف زوال آفتاب کے بعد کیا جائے۔ دوسرے ائمہ اس حدیث کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس میں دن سے مراد زوال آفتاب کے بعد دن کا حصہ ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفائے راشدین نے زوال آفتاب کے بعد ہی وقوف فرمایا اور کسی کے متعلق یہ منقول نہیں ہے کہ انہوں نے زوال آفتاب سے پہلے وقوف کیا ہو۔ لہٰذا اس حدیث میں 'نہار' کے مطلق لفظ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے اس عمل سے مقید کیا جائے گا۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۲۱۔ ۱۲۵۔)

۲۔ یہ امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ اور دوسرے ائمہ کا مسلک ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک غروب آفتاب کے بعد تک وقوف کرنا واجب ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۲۵)۔

(ج) وقوف عرفات کی جگہ: عرفات کے جس حصے میں انسان چاہے وقوف کر سکتا ہے۔ اگرچہ مستحب یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے' جبل الآلال (جسے اب جبل رحمت کہا جاتا ہے' اور جس کے قریب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وقوف فرمایا تھا) کے قریب ہوا جائے۔

حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "میں نے یہاں (جبل الآلال کے قریب) وقوف کیا ہے' اور عرفات کا پورا میدان موقف' (وقوف کی جگہ) ہے۔" (احمد' مسلم' ابوداؤد' ابن ماجہ وغیرہ)۔

وقوف کا عرفات کے میدان کے اندر اندر ہونا ضروری ہے۔ جو شخص اس سے باہر وادی نمرہ یا وادی عرنہ (عرفات کے شمال میں ایک وادی) میں وقوف کرے گا' اس کا وقوف معتبر نہ ہوگا۔

حضرت جبیر بن مطعمؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عرفات کا پورا میدان موقف ہے اور تم وادی عرنہ سے بچو (یعنی اس میں وقوف نہ کرو)۔ (احمد' ہیثمی' بزار' طبرانی) [1]

(د) وقوف عرفات کے مستحبات: (۱) قبلہ رخ ہونا: وقوف میں انسان خواہ سوار ہو یا زمین پر کھڑا ہو' اس کا قبلہ رخ ہونا مسنون ہے۔

حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے۔ "آپ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) قبلہ رخ ہوئے اور پھر کھڑے رہے یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔" (احمد' ابوداؤد' مسلم' ابن ماجہ وغیرہ)۔

(۲) دعا اور اللہ تعالیٰ کا ذکر: وقوف عرفات میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا' ہاتھ اٹھا کر اپنے لیے اور دوسروں کے لیے دعا کرنا' اس کے حضور خشوع و خضوع کے ساتھ رو رو کر

۱۔ اس پر امام مالکؒ کے سوا تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک اگر کوئی شخص وادی عرنہ میں وقوف کرے' تو اس کا وقوف ہو جائے گا' جبکہ وہ بعد میں ایک جانور کی قربانی دے"۔ (یعنی وقوف کا عرفات میں ہونا امام مالکؒ کے نزدیک واجب ہے اور دوسرے ائمہ کے نزدیک شرط ہے۔ (المغنی ج ۳ ص ۴۲۸) (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۲۵)۔

گناہوں کی معافی چاہنا' اور قرآن کی تلاوت کرنا سب کام مسنون ہیں۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔" عرفہ کے روز اللہ تعالیٰ تمام دوسرے دنوں کی نسبت جہنم سے اپنے زیادہ بندوں کی گردنیں آزاد کرتا ہے۔ وہ اپنے بندوں سے قریب آتا ہے اور اپنے فرشتوں سے فخر کے طور پر فرماتا ہے۔" ان لوگوں کو (میری رحمت و خوشنودی کے سوا آخر) کس چیز کی طلب ہے؟" (مسلم)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرفہ کے روز دعا میں اپنے ہاتھ اپنے سینے سے قریب رکھے ہوئے دیکھا' جیسا کہ فقیر کسی سے کھانا مانگتا ہے۔ (بیہقی)

حضرت اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ میں عرفات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی پر آپؐ کے ساتھ سوار تھا۔ آپؐ نے دعا مانگنے کے لیے ہاتھ اٹھائے۔" (نسائی)۔

حضرت طلحہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔" عرفہ کے دن سے زیادہ شیطان کبھی غصے کے مارے لال پیلا ہو کر بھاگتا نہیں دیکھا گیا۔ یہ اس لیے کہ اس دن اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے گناہ معاف فرماتا ہے۔" (ترمذی)

وقوف عرفات کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعائیں مانگیں' ان میں سے چند دعائیں مندرجہ ذیل ہیں :

(۱) عمرو بن شعیبؒ اپنے والد کے ذریعے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ عرفہ کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ تر دعا یہ تھی :

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (احمد' ھیثمی)	اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کی بادشاہت ہے۔ اور اسی کے لیے حمد ہے۔ اس کے ہاتھ میں خیر ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس دعا کے متعلق امام ترمذیؒ کی روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔" سب سے بہتر دعا عرفہ کے دن کی دعا ہے۔ سب سے بہتر دعا جو میں نے اور مجھ سے پہلے انبیاء نے مانگی' وہ یہ ہے۔"

(۲) حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ حجتہ الوداع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا یہ تھی:

اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ تَسْمَعُ کَلَامِیْ وَ تَعْلَمُ سِرِّیْ وَعَلَانِیَتِیْ، لَا یَخْفٰی عَلَیْکَ شَیْءٌ مِّنْ اَمْرِیْ۔ اَنَا الْبَائِسُ الْفَقِیْرُ الْمُسْتَغِیْثُ الْمُسْتَجِیْرُ الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِہٖ، اَسْاَلُکَ مَسْئَلَۃَ الْمِسْکِیْنِ وَاَبْتَھِلُ اِلَیْکَ ابْتِھَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِیْلِ، وَاَدْعُوْکَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِیْرِ، مَنْ خَضَعَتْ لَکَ رَقَبَتُہٗ، وَفَاضَتْ لَکَ عَیْنَاہُ وَذَلَّ جَسَدُہٗ وَرَغِمَ لَکَ اَنْفُہٗ۔ اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْنِیْ بِدُعَائِکَ شَقِیًّا، وَکُنْ بِیْ رَؤُفًا رَحِیْمًا۔ یَا خَیْرَ الْمَسْئُوْلِیْنَ ! یَا خَیْرَ الْمُعْطِیْنَ ! (ھیثمی، طبرانی)۔

اے اللہ! تو میری بات کو سنتا اور میری حیثیت کو جانتا ہے۔ تجھے میرے ظاہر اور پوشیدہ ہر چیز کا علم ہے۔ میرے متعلق کوئی بات ایسی نہیں جو تجھ پر پوشیدہ ہو۔ میں بد نصیب مانگنے اور التجا کرنے والا ہوں۔ میں تجھ سے ڈرتا اور اپنے گناہ کا اعتراف کرنے والا ہوں۔ میں تجھ سے ایک مسکین کی طرح سوال کرتا ہوں اور ذلیل گنہگار کی طرح تیرے حضور گڑگڑاتا ہوں۔ ایک بھاگا ہوا مجرم جس طرح ڈر ڈر کر دعا کرتا ہو میں اسی طرح تجھ سے دعا کرتا ہوں۔ میں وہ ہوں جس کی گردن تیرے آگے جھکی ہوئی۔ جس کی آنکھیں تیرے سامنے اشکبار اور جس کا جسم تیرے حضور ذلیل و خوار ہے اور جس کی ناک تیرے سامنے روندی ہوئی ہے۔ اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں، تو مجھے بدبخت و ناکام نہ لوٹا۔ مجھ پر مہربان اور رحیم و کریم ہو جا۔ اے سب سے بہتر سوال کیے جانے والے! اور اے سب سے بہتر اکرام و عطا کی بارش کرنے والے!۔

(۳) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ وقوف عرفہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ تر دعا یہ تھی:

اَللّٰهُمَّ لَکَ الْحَمْدُ ' كَالَّذِیْ نَقُوْلُ وَخَيْرًا مِّمَّا نَقُوْلُ' اَللّٰهُمَّ لَکَ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ' وَاِلَيْکَ مَآبِیْ وَلَکَ رَبِّ تُرَاثِیْ' اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَ وَسْوَسَةِ الصَّدْرِ وَشَتَاتِ الْاَمْرِ' اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّمَا تَجِیْٓءُ بِهِ الرِّیْحُ۔(ترمذی)

اے اللہ! تیرے ہی لیے حمد و ثنا ہے۔ اس طرح جس طرح ہم تیری حمد کرتے ہیں' بلکہ اس سے بہتر جس طرح ہم کرتے ہیں۔اے اللہ! تیرے ہی لیے میری نماز' میری قربانی' میری زندگی اور میری موت ہے۔ تیری ہی طرف میرا پلٹنا ہے اور تو ہی میرا وارث ہے۔ اے اللہ! میں تیرے ذریعے قبر کے عذاب سے' سینے کے وسوسے سے اور آپس کی پھوٹ سے پناہ مانگتا ہوں۔اے اللہ! میں تیرے ذریعے ہر اس چیز سے پناہ مانگتا ہوں جسے چلتی ہوئی ہوا اپنے ساتھ لائے۔

(ج) غسل :وقوف عرفات کے لیے غسل کرنا مستحب ہے۔ اس بارے میں اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث ثابت نہیں ہے'لیکن حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ وہ اس کے لیے غسل فرمایا کرتے تھے(موطا امام مالکؒ)۔

نوٹ :کتاب الصیام میں یہ گزر چکا ہے کہ عرفہ کے روز غیر حاجیوں کے لیے روزہ رکھنا مسنون ہے۔لیکن حاجیوں کے لیے یہ صحیح نہیں ہے۔

اعمالِ لَیلَۃُ الجُمَع

(مزدلفہ کی رات کے اعمال)

ا۔ مغرب کے بعد عرفات سے مُزدَلفہ روانہ ہونا :

عرفہ کے روز جب سورج غروب ہو جائے' تو مغرب کی نماز پڑھے۔ بغیر مازمین کے ا۔ راستے عرفات سے مزدلفہ کے لیے روانہ ہونا مسنون ہے۔ روانہ ہوتے اور چلتے وقت اطمینان' وقار اور سنجیدگی کو ملحوظ رکھنا مسنون ہے۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ عرفہ کے روز میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپؐ کی اونٹنی پر سوار تھا۔ جب سورج غروب ہو گیا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم (مزدلفہ کے لیے) روانہ ہوئے۔ آپؐ نے اپنے پیچھے لوگوں کی بھیڑ اور اونٹوں کو تیزی سے ہانکنے کی آواز سنی۔ آپؐ نے فرمایا۔ "اے لوگو! آہستہ چلو' اطمینان اور سنجیدگی برقرار رکھو' اس لیے کہ نیکی جلدی کرنے میں نہیں ہے۔" جب حضورؐ کے پاس لوگ زیادہ ہو جاتے' تو آپؐ آہستہ رفتار سے چلتے اور جب راستہ کھل جاتا' آپؐ تیز رفتار سے چلتے۔ یہاں تک کہ آپؐ اس گھاٹی (یعنی مازمین کے راستے) سے گزرے۔ جس کے متعلق بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ آپؐ نے وہاں نماز پڑھی۔ آپؐ وہاں اونٹنی سے اترے۔ اور پیشاب فرمایا۔ پھر آپؐ کے لیے ایک برتن میں پانی لایا گیا۔ آپؐ نے اس سے وضو فرمایا۔ میں نے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسولؐ! کیا یہاں نماز پڑھیں گے؟" فرمایا "نماز آگے جا کر (یعنی مزدلفہ پہنچ کر) پڑھیں گے" (بخاری' مسلم' احمد وغیرہ)۔

روانہ ہوتے اور چلتے وقت تلبیہ اور تکبیر کا کہتے رہنا بھی مستحب ہے۔ جیسا کہ حضرت جابرؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں گزر چکا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم برابر

ا۔ منیٰ اور عرفات کے درمیان دو راستے ہیں۔ ایک ضب' جو منیٰ سے سیدھا عرفات جاتا ہے۔ عرفہ کے روز حاجی اسی راستے سے منیٰ سے عرفات جاتے ہیں۔ دوسرا مازمین' جو مزدلفہ سے ہو کر گزرتا ہے۔ حاجی عرفات سے مزدلفہ اسی راستے سے آتے ہیں۔

تلبیہ اور تکبیر فرماتے رہے' یہاں تک کہ آپؐ نے منیٰ پہنچ کر جمرہ عقبہ پر رمی فرمائی۔[1]

۲۔ مزدلفہ پہنچ کر مغرب اور عشاء کی نمازوں کو جمع کر کے پڑھنا :

مزدلفہ پہنچ کر مغرب اور عشاء کی نمازوں کو عشا کے وقت جمع کر کے پڑھنا مسنون ہے۔ اس بارے میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۴۹)۔

حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے۔ "۔۔۔۔ یہاں تک کہ آپؐ مزدلفہ پہنچ گئے۔ وہاں آپؐ نے ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ مغرب اور عشاء کی نمازیں (جمع کر کے) پڑھیں۔ (مسلم' احمد' ابو داؤد' ابن ماجہ وغیرہ)۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کر کے پڑھیں۔" (بخاری و مسلم) بخاری کی روایت میں "حجتہ الوداع کے موقع پر" کے الفاظ زیادہ ہیں۔

سنت یہی ہے کہ مغرب و عشاء کی نمازوں کو عشا کے وقت مزدلفہ میں جمع کر کے پڑھا جائے' جیسا کہ حضرت جابرؓ اور حضرت انصاریؓ کی ان احادیث میں مذکور ہے' لیکن اگر کوئی شخص انہیں مغرب کے وقت جمع کر کے یا مغرب کو مغرب کے وقت اور عشاء کو عشاء کے وقت پڑھ لے' تو یہ بھی جائز ہے۔ اگرچہ ایسا کرنا اچھا نہیں ہے۔[2]

۱۔ یہ امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ اور دوسرے ائمہ کا مسلک ہے۔ امام مالکؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک تلبیہ کا کہنا صرف عرفہ کے روز زوال آفتاب تک مسنون ہے۔ تفصیل آگے رمی جمرہ عقبہ کے باب میں آرہی ہے۔

۲۔ یہ امام مالکؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ' ابو یوسفؒ' اسحاقؒ' سعید بن جبیرؒ اور ابو ثورؒ وغیرہ کا مسلک ہے۔

امام ابو حنیفہؒ' سفیان ثوریؒ' محمدؒ' داؤد ظاہریؒ اور بعض مالکی علماء کے نزدیک مغرب و عشاء کی نمازوں کا مزدلفہ سے پہلے عشاء کے وقت سے پہلے پڑھنا جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی پڑھ لے تو اس کے لیے دونوں نمازوں کا سورج نکلنے سے پہلے پہلے دہرانا ضروری ہے۔

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آیا ان دونوں نمازوں کو سفر کی وجہ سے جمع کر کے پڑھا جاتا ہے یا یہ کہ ان کا جمع کرنا مناسک حج میں شامل ہے۔ پہلے مسلک والوں کے نزدیک ان کو سفر کی وجہ سے جمع کر کے

ان دونوں نمازوں میں سے عشاء کی نماز میں قصر بھی کیا جائے گا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے صفحہ ۲۸۴۔

ان دونوں نمازوں کا ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ادا کرنا مسنون ہے۔ جیسا کہ حضرت جابرؓ کی حدیث میں بیان ہوا ہے [1]

ان دونوں نمازوں کے درمیان وقفہ جائز ہے۔ لیکن مسنون یہ ہے کہ اس وقفہ

پڑھا جاتا ہے اور دوسرے مسلک والوں کے نزدیک اس وجہ سے کہ ان کا جمع کر کے پڑھنا مناسک حج میں شامل ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۴۹۔۱۵۰) المغنی ج ۳ ص ۴۲۰) (ھدایہ ج ۱ ص ۱۰۵)۔

۱۔ یہ امام شافعیؒ احمد بن حنبلؒ ابو ثورؒ ابن حزمؒ (اور اہلحدیث علماء) کا مسلک ہے۔ مالکیہ میں سے امام عبدالملک ماجشونؒ اور حنفیہ میں سے امام زفرؒ طحاویؒ اور بعض دوسرے علماء نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اور (امام زفرؒ کے سوا) آپ کے اصحابؒ کے نزدیک ان دونوں نمازوں کا ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ ادا کرنا مسنون ہے۔ ان کا استدلال حضرت جابرؓ ہی کی حدیث کی ایک اور سند سے ہے جسے امام ابن ابی شیبہؒ نے روایت کیا ہے۔ اس روایت میں "ایک اذان اور دو اقامتوں" کی جائے "ایک اذان اور ایک اقامت" کا ذکر ہے۔ نیز یہ کہ ابو شعثاء بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ عرفات سے مزدلفہ گیا۔ آپ نے اذان دی اور اقامت کہی یا یہ کہ آپ نے ایک آدمی کو اذان اور اقامت کہنے کا حکم دیا۔ آپ نے ہمیں یہ رکعتیں مغرب کی پڑھائیں۔ پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "چلو نماز پڑھو۔ پھر آپ نے ہمیں دو رکعتیں عشاء کی پڑھائیں۔ پھر آپ نے اپنا کھانا منگوایا۔ جب لوگوں نے آپ سے اس بارے میں دریافت کیا تو فرمایا۔ "میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسی طرح نماز پڑھی۔" (ابو داؤد)۔

حنفیہ کے نزدیک یہ روایات چونکہ متعدد ہیں اس لیے یہ حضرت جابرؓ کی مذکورہ بالا روایت (جس میں ایک اذان اور دو اقامتوں کا ذکر ہے) پر مقدم ہیں۔ (الکوکب الدری ج ۱ ص ۲۸۷) (التعلیق الصبیح ۳ ص ۲۲۶)

پہلے مسلک والوں کے نزدیک حضرت جابرؓ کی مذکورہ بالا روایت (جس میں ایک اذان اور دو اقامتوں کا ذکر ہے) چونکہ سند کے لحاظ سے بھی صحیح ہے اور اس میں ایک اقامت کا اضافہ ہے۔ اور جب تک کسی صحیح حدیث سے متعارض نہ ہو قابل قبول ہوتا ہے اس لیے یہ تمام دوسری روایت پر مقدم ہے۔ (تہذیب ابن قیم علی معالم السنن ج ۲ ص ۳۰۱)۔

میں کوئی سنت یا نفل نہ پڑھی جائے۔ عشاء کے فوراً بعد بھی کسی سنت یا نفل نماز کا پڑھنا صحیح نہیں ہے۔ البتہ کچھ دیر ٹھہر کر نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

حضرت جابرؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور اسامہ بن زیدؓ کی احادیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نمازوں کے درمیان کوئی نفل نماز نہیں پڑھی، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث ۔۔۔۔۔ بروایت بخاری ۔۔۔۔۔ میں یہ الفاظ زیادہ ہیں: "اور نہ آپؐ نے ان دونوں نمازوں میں سے کسی کے بعد نفل نماز پڑھی۔"[1]

حنفیہ کا عام مسلک 'ایک اذان اور ایک اقامت' ہی کا ہے، لیکن بعض حنفی علماء نے حضرت جابرؓ کی دونوں قسم کی روایات میں یوں بھی تطبیق دی ہے کہ ایک اقامت اس وقت کہی جائے جب مغرب اور عشاء کی نمازوں کے درمیان کوئی اور کام نہ کیا جائے، اور اگر دونوں کے درمیان کوئی اور کام (جیسے کھانا وغیرہ) کیا جائے، تو دو اقامتیں کہی جائیں (مختصراً از بذل المجہود مجلد سوم ج ۱ ص ۷ ۱۵)۔

اس بارے میں امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ ان دونوں نمازوں میں سے ہر ایک کے لیے اذان بھی دی جائے اور اقامت بھی کہی جائے۔

ان کا استدلال حضرت عمرؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کے عمل سے ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھیں۔ آپ نے ہر نماز کے لیے اذان بھی دی اور اقامت بھی کہی اور دونوں کے درمیان کھانا کھایا۔ (احمد، بخاری، نسائی)۔

یہ روایت سند کے لحاظ سے صحیح ہے اور اس میں ایک اور اذان کا اضافہ ہے، اور اسی وجہ سے امام مالکؒ نے اسے اختیار کیا ہے، لیکن دوسرے ائمہ کے نزدیک چونکہ اس میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا اپنا عمل بیان ہوا ہے، نہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا، اس لیے حضرت جابرؓ کی روایت اس پر مقدم ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۵۰)۔

[1] اس پر تقریباً تمام صحابہؓ اور بعد کے ائمہ کا اتفاق ہے۔ صرف سلف میں سے بعض (نامعلوم) ائمہ کے نزدیک ان دونوں نمازوں کے درمیان نماز پڑھنا مستحب ہے۔ ان کا استدلال حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے عمل سے ہے کہ انہوں نے مزدلفہ میں مغرب کی نماز پڑھی، اس کے بعد آپ نے دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر آپ نے اپنا کھانا منگوایا اور اسے کھایا۔ پھر آپ نے اذان اور اقامت کا حکم دیا اور عشاء کی نماز پڑھی۔ (بخاری، مسلم، احمد، ابوداؤد، نسائی، بیہقی)۔

۳۔ مزدلفہ میں رات بسر کرنا اور اس میں دعا اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا:

۹ ذی الحجہ کی درمیانی رات مزدلفہ میں بسر کرنا اور اس میں دعا، اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا مسنون ہے، [۱] جیساکہ حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ میں رات بسر فرمائی۔ ذکر کے متعلق اللہ تعالیٰ کا خود ارشاد ہے:

فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ۔ (بقرۃ: ۱۹۸)

پھر جب تم عرفات سے پلٹو، تو مشعرِ حرام کے پاس (یعنی مزدلفہ میں) ٹھہر کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، جس کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے، ورنہ اس سے پہلے تم بھٹکے ہوئے تھے۔

۴۔ مزدلفہ میں فجر کی نماز کا عام دنوں کی نسبت زیادہ اندھیرے میں

جمہور ائمہ کے نزدیک اس حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا اپنا عمل بیان ہوا ہے، نہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ ہوسکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی نیت مغرب و عشاء کو جمع کرنے کی نہ ہو یا کہ انہوں نے جمع کی نیت تو کی ہو، لیکن دونوں کے درمیان نفل نماز پڑھنے کو اس بنا پر صحیح سمجھا ہو کہ دونوں کے درمیان کسی کام کے کر لینے سے جمع میں انقطاع نہیں ہوتا۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۵۱)۔

۱۔ یہ جمہور یہ صحابہؓ، تابعین اور ائمہ کا مسلک ہے۔ صرف پانچ تابعی علماء علقمہؒ، اسودؒ، شعبیؒ، ابراہیم نخعیؒ اور حسن بصریؒ کا مسلک یہ ہے کہ مزدلفہ میں رات بسر کرنا حج کا رکن ہے ان کا استدلال یہ ہے کہ آیت "فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ" (تو مشعر حرام کے پاس ٹھہر کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو) میں مزدلفہ میں ٹھہرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جس شخص سے مزدلفہ میں رات بسر کرنا فوت ہوگیا اس سے حج فوت ہوگیا"۔

جمہور کے نزدیک آیت کا جواب یہ ہے کہ اس میں حکم اللہ تعالیٰ کے ذکر کا دیا گیا ہے، جو بالاجماع حج کا رکن نہیں ہے۔ تو مزدلفہ میں رات بسر کرنا کیسے حج کا رکن قرار پا جائے گا، جس کا آیت میں حکم ہی نہیں دیا گیا؟ رہی حدیث تو یہ ایک غیر معروف حدیث ہے اور اگر اسے صحیح بھی مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص سے مزدلفہ میں رات بسر کرنا فوت ہوگیا اس سے حج کا صحیح طریق پر ادا کرنا فوت ہوگیا نہ یہ کہ اس سے خود حج ہی فوت ہوگیا۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۵۱)۔

پڑھنا :

مزدلفہ میں فجر کی نماز کا عام دنوں کی نسبت زیادہ اندھیرے میں پڑھنا مسنون ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے عشاء کی نماز پڑھی۔ پھر آپ سو گئے۔ جب فجر ہو گئی تو آپ اٹھے اور فجر کی نماز پڑھی۔ بعد کے راوی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے عرض کیا۔ "پہلے تو آپ اس قدر سویرے نماز نہیں پڑھا کرتے تھے اور آپ صبح کی روشنی پھیل جانے کے بعد فجر کی نماز پڑھا کرتے تھے۔" کہنے لگے۔ "میں نے اس دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس جگہ اسی وقت نماز پڑھتے دیکھا۔" (بخاری' مسلم' احمد' داؤد' نسائی' بیہقی)۔

۵۔ مزدلفہ میں وقوف کرنا :

مزدلفہ میں وقوف واجب ہے۔ یعنی اگر یہ رہ جائے تو ایک جانور کی قربانی ضروری ہے [۱]

حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے "اور جب صبح ہو گئی' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ صبح کی نماز پڑھی۔ پھر آپؐ اپنی اونٹنی قصواء پر سوار ہوئے اور مشعر حرام کے مقام پر آئے۔ آپؐ نے قبلہ کی طرف رخ فرمایا اور اللہ تعالیٰ کے حضور دعا' تکبیر (اللہ اکبر کہنا)' تہلیل (لا الہ الا اللہ کہنا) اور توحید (اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرنا) کرتے رہے۔ آپ کھڑے رہے' یہاں تک کہ صبح کی روشنی خوب پھیل گئی۔ پھر آپ سورج نکلنے سے پہلے (منیٰ کے لیے) روانہ ہو گئے۔ (احمد' مسلم' ابو داؤد' ابن ماجہ وغیرہ)۔

یہ وقوف مزدلفہ کے پورے میدان میں ہو سکتا ہے۔ البتہ مشعر حرام (جہاں اب

۱۔ یہ امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ' اسحاقؒ' ابو ثورؒ' قتادہؒ' زہریؒ اور سفیان ثوریؒ کا مسلک ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک مزدلفہ کا وقوف صرف سنت ہے' یعنی اگر رہ جائے تو ایک جانور کی قربانی ضروری نہیں۔

علقمہؒ' ابراہیم نخعیؒ' شعبیؒ' ابن خزیمہؒ اور امام شافعیؒ کے نواسے کے نزدیک یہ حج کا رکن ہے۔ ان کا استدلال اور اس کے مقابلے میں جمہور کا جواب وہی ہے جو ہم اوپر "مزدلفہ میں رات بسر کرنا اور اس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا" کے تحت کر چکے ہیں۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۵۷)۔

مسجد بنی ہوئی ہے) کے پاس وقوف افضل ہے۔ وادیٔ محسّر (مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان ایک وادی جس میں اصحاب الفیل کی تباہی کا واقعہ پیش آیا تھا) میں وقوف نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت علیؓ کی ایک طویل روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مشعر حرام کے مقام پر وقوف کیا اور پھر فرمایا۔ "یہ موقف (وقوف کی جگہ) ہے۔ اور پورا مزدلفہ موقف ہے۔" (احمد' ترمذی)۔

حضرت جبیرؓ بن مطعم سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "پورا مزدلفہ موقف ہے مگر تم وادیٔ محسّر سے دور رہو"۔ (احمد' بزار' ھیثمی وغیرہ)۔

۲۔ مزدلفہ سے منیٰ کو روانہ ہونا :

صبح کی نماز کے بعد جب خوب روشنی پھیل جائے' تو سورج نکلنے سے پہلے مزدلفہ سے منیٰ کو روانگی مسنون ہے' جیسا کہ حضرت جابرؓ کی مذکورہ بالا حدیث اور بعض دوسری احادیث میں بیان ہوا ہے [1]

البتہ عورتوں بچوں اور بوڑھے مردوں کے لیے صبح کی نماز سے بھی پہلے روانہ ہونے کی اجازت ہے' لیکن رات کا تہائی حصہ گزرنے سے پہلے روانگی نہیں ہوسکتی' اس پر تمام ائمہ کا اجماع ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ص ۱۶۷)۔

حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ مزدلفہ میں ٹھہریں۔ پھر (عشاء کی یا تہجد کی) نماز پڑھنے کے بعد انہوں نے اپنے آزاد کردہ غلام عبداللہ سے کہا۔ "اے بیٹا! کیا چاند غروب ہو گیا؟" انہوں نے جواب دیا "نہیں" پھر انہوں نے کچھ دیر تک اور نماز پڑھی اور پھر عبداللہ سے فرمایا۔ "اے بیٹا! کیا چاند غروب ہو گیا؟" انہوں نے جواب دیا "جی ہاں" حضرت اسماءؓ نے فرمایا "تو اب چلو"۔ عبداللہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہم روانہ ہوئے' یہاں تک کہ (منیٰ پہنچ کر) جمرہ عقبہ پر رمی کی [1] پھر حضرت اسماءؓ منیٰ میں اپنی جائے قیام پر آئیں اور وہاں آکر صبح کی نماز پڑھی۔ میں نے ان سے عرض کیا "ہم اندھیرے ہی میں آگئے (یعنی ہم مسنون وقت سے

۱۔ یہ امام مالکؒ کے سوا دوسرے تمام ائمہ کا مسلک ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک مزدلفہ سے روانگی روشنی پھیل جانے سے پہلے مستحب ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ص ۱۵۸)۔

۱۔ فجر سے پہلے جمرہ عقبہ پر رمی کے جائز ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف ہے۔

پہلے ہی منیٰ آگئے)"۔ انہوں نے فرمایا "اے بیٹا! ہم ٹھیک وقت پر آئے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو اس کی اجازت دی ہے۔" (بخاری، مسلم، مالک، احمد، ابو داؤد، بیہقی، طبرانی)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔ "میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان کے کمزور افراد کے ساتھ پہلے ہی منیٰ بھیج دیا تھا۔" (بخاری، مسلم، احمد، ابو داؤد، بیہقی، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) واضح رہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس وقت گیارہ بارہ سال کی عمر کے بچے ہی تھے۔

مزدلفہ سے منیٰ آتے ہوئے بھی اطمینان اور سنجیدگی کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ البتہ وادیٔ مُحَسِّر میں تیزی سے گزر جانا چاہیے۔

حضرت فضل بن عباسؓ سے روایت ہے کہ عرفہ کی رات اور مزدلفہ کی صبح کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا۔ "اے لوگو! اطمینان اور سکون کا خیال رکھو"۔ اور آپؐ اپنی اونٹنی کی لگام کھینچے ہوئے تھے۔" (مسلم، احمد، ابو داؤد، ابن ماجہ وغیرہ)۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ (مزدلفہ سے منیٰ جاتے ہوئے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے فرما رہے تھے۔ "اے لوگو! اطمینان سے چلو"۔ جب آپ وادی محسر میں پہنچے تو آپؐ نے اونٹنی کو کوڑا لگایا اور وہ تیز چلنے لگی، یہاں تک کہ آپ اس وادی سے نکل گئے۔ پھر آپ اپنی پہلی رفتار سے چلنے لگے۔ یہاں تک کہ آپ نے جمرہ پر رمی فرمائی۔" (احمد، ابو داؤد، ترمذی)۔

اعمالِ یَوْمُ النَّحَرْ

(قربانی کے دن کے کام)

(۱۰ ذی الحجہ)

قربانی کے دن (۱۰ ذی الحجہ) مزدلفہ سے منیٰ آکر چار کام کیے جاتے ہیں:

۱۔ جمرہ عقبہ پر رمی۔

۲۔ پھر قربانی

۳۔ پھر حلق یا تقصیر

۴۔ پھر طواف الافاضہ جسے طواف الزیارۃ بھی کہا جاتا ہے۔

اس پر اجماع ہے کہ یہ چاروں کام اسی ترتیب سے انجام دیے جائیں گے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اسی ترتیب سے انجام دیا۔

امام ابن قیمؒ زاد المعاد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کی ترتیب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "منیٰ پہنچ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمرہ عقبہ پر رمی فرمائی۔ (ص ۴۷۴)۔۔۔۔ پھر آپؐ مَنْحَرْ (قربان گاہ) تشریف لائے اور اپنے دست مبارک سے تریسٹھ اونٹ ذبح فرمائے (ص ۴۷۵)۔۔۔۔ جب قربانی سے فارغ ہو گئے تو آپؐ نے حجام کو بلایا جس نے آپؐ کے سر کی حجامت کی (ص ۴۸۱)۔۔۔۔ پھر ظہر سے پہلے آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے' اور طواف الافاضہ فرمایا (ص ۴۸۳)۔

لیکن یہ ترتیب سنت ہے' واجب نہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص اسے الٹ دے اور جو کام پہلے کا ہے اسے بعد میں اور جو بعد کا ہے اسے پہلے کر لے' خواہ جان بوجھ کر یا بھول کر یا نہ جاننے کی وجہ سے' اس پر نہ کوئی گناہ ہے اور نہ کوئی قربانی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ اے اللہ کے رسولؐ! میں نے قربانی کرنے سے پہلے سر منڈا لیا۔ آپؐ نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "کوئی حرج نہیں"۔ اس دن آپؐ سے ان کاموں کے مقدم اور موخر ہو جانے سے متعلق جو بھی سوال کسی نے کیا' آپؐ نے اس کے جواب میں ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے یہی فرمایا "کوئی حرج

نہیں"۔ (بخاری، مسلم، ابو داؤد، احمد، نسائی، ابن ماجہ)ؔ1

1۔ یہ اکثر فقہاء محدثین (جن میں امام شافعیؒ، اسحاقؒ، طاؤوسؒ، عطاءؒ، مجاہدؒ، امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۲۰۹)

امام احمدؒ کے نزدیک بھی یہ ترتیب سنت ہے، لیکن اس معنی میں کہ اگر کوئی شخص اسے بھول یا ناواقفیت کی بنا پر الٹ دے، تو اس کے ذمہ کوئی قربانی نہیں۔ لیکن اگر وہ اسے جان بوجھ کر الٹے، تو اس بارے میں امام احمدؒ سے دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت میں ان کے نزدیک ایسے شخص کے ذمہ قربانی ضروری ہے اور دوسری روایت میں ضروری نہیں۔ (المغنی ج ۳ ص ۴۶۱۔ ۴۶۲)۔

سعید بن جبیرؒ، حسن بصریؒ، ابراہیم نخعیؒ، قتادہؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مفرد کے لیے ان تمام کاموں میں ترتیب سنت ہے، لیکن متمتع اور قارن کے لیے رمی، قربانی اور حلق یا تقصیر کے درمیان ترتیب واجب ہے۔ یعنی اس کے الٹ جانے کی صورت میں متمتع پر ایک اور قارن پر دو جانوروں کی قربانی ضروری ہے۔ اور ان تینوں کاموں اور طواف الافاضہ کے درمیان ترتیب سنت ہے۔ اس بارے میں ان کا استدلال حضرت مسورؓ کی اس روایت سے ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجامت کرانے سے پہلے قربانی کی اور صحابہؓ کو اس کا حکم دیا۔" نیز ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ جنھوں نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس شخص کو جس نے آپؐ سے ترتیب کے الٹ دینے کے متعلق سوال کیا، یہی جواب دیا کہ کوئی ہرج نہیں، خود ان ہی کا یہ کہنا ہے "جس شخص نے اپنے حج کے کاموں میں سے کوئی کام مقدم یا موخر کر دیا ہو اسے قربانی کرنی چاہیے۔" (ابن ابی شیبہ)۔

اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ پہلے مسلک والوں کے نزدیک جن احادیث سے حنفیہؒ نے استدلال کیا ہے، وہ سند کے لحاظ سے صحیح نہیں ہیں (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۲۰)۔ دوسری طرف حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی مذکورہ بالا روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "کوئی ہرج نہیں" کے متعلق حنفیہ کا کہنا یہ ہے کہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص سے متعلق جس نے ترتیب الٹ دی ہو یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں، نہ یہ کہ اس کے ذمہ کوئی قربانی بھی نہیں ہے۔ (الکوکب الدری ج ص ۲۸۶) (التعلیق الصبیح ج ۳ ص ۲۴۲)۔

اس بارے میں امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ جو شخص قربانی سے پہلے حجامت کرا لے، اس کے ذمہ کوئی قربانی نہیں۔ لیکن اگر وہ رمی سے پہلے حجامت کرا لے تو اس کے ذمہ قربانی ہے۔ اگر کوئی شخص رمی سے

آئندہ ابواب میں ہم اسی ترتیب سے ان چاروں کاموں کے تفصیلی مسائل کر ذکر کرتے ہیں۔

پہلے طواف الافاضہ کرلے' تو اس بارے میں امام مالکؒ سے دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت میں ایسے شخص کا طواف ہو جائیگا' مگر اس کے ذمہ قربانی ہوگی۔ دوسری روایت میں اس کا طواف نہیں ہوگا (یعنی اسے رمی وغیرہ سے فارغ ہو کر پھر طواف کرنا ضروری ہوگا) (الفتح الربانی ج ۱۲ص ۲۱۰)۔

ا۔ رمی جمرۂ عقبہ

ا۔ حکم:

جمرۂ عقبہ پر رمی کرنا واجب ہے' یعنی اگر یہ رہ جائے' تو ایک جانور کی قربانی ضروری ہے۔[1]

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے قربانی کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی اونٹنی پر سوار جمرہ پر رمی کرتے دیکھا۔ آپؐ فرما رہے تھے۔ "مجھ سے اپنے مناسک حج سیکھ لو' اس لیے کہ میں نہیں جانتا کہ اس سال کے بعد اگلے سال حج کروں گا یا نہیں" (احمد' ابوداؤد' مسلم وغیرہ)۔

۲۔ فضیلت:

بعض احادیث میں' جن کی سند اگرچہ کمزور ہے' رمی۔۔۔۔ کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رمی جمار کے متعلق سوال کیا کہ اس کا ہمیں کیا اجر ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا "یہ تمہیں اس وقت معلوم ہو گا' جب تم اپنے رب کے پاس ہو گے اور تمہیں (نیکیوں کی) زیادہ سے زیادہ ضرورت لاحق ہو گی" (طبرانی)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔" جب تم رمی جمار کرو گے' تو یہ تمہارے لیے قیامت کے روز نور ہو گی۔" (بزار)۔

۳۔ کنکریوں کی تعداد:

رمی کے لیے کم از کم سات کنکریوں کا ہونا واجب ہے' کیونکہ متعدد احادیث سے

ا۔ یہ جمہور (جن میں ائمہ اربعہ اور امام داؤد ظاہریؒ شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ صرف بعض مالکی علماء کے نزدیک جمرہ عقبہ پر رمی حج کا رکن ہے۔ یعنی اگر رہ جائے تو حج باطل ہو جاتا ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۷۱)۔

ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سات کنکریوں ہی سے رمی فرمائی [1]۔

۴۔ کنکریاں ہر جگہ سے لی جا سکتی ہیں :

کنکریوں کا کسی خاص جگہ سے لینا مستحب نہیں ہے۔ مزدلفہ یا منیٰ جہاں سے بھی انسان چاہے، کنکریاں لے سکتا ہے [2]۔

۱۔ یہ جمہور (جن میں امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ، اور شافعیؒ شامل ہیں) کا مسلک ہے۔

البتہ ان کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ سات سے کتنی کنکریوں کے کم ہونے سے کتنا فدیہ ضروری ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے اصحاب کے نزدیک ایک کنکری کے کم ہونے سے نصف صاع گندم کا فدیہ ہے۔ اگر تین سے زیادہ کنکریاں رہ گئی ہوں، تو ایک جانور کی قربانی ضروری ہے۔ امام مالکؒ اور اوزاعیؒ کے نزدیک فی کنکری ایک صاع گندم کا فدیہ ہے۔ امام شافعیؒ اور ابو ثورؒ کے نزدیک اگر ایک یا دو کنکریاں رہ جائیں تو فی کنکری پر صاع گندم کا فدیہ ہے اور اگر تین یا اس سے زائد کنکریاں رہ جائیں تو ایک جانور کی قربانی ضروری ہے۔

تابعین میں سے عطاءؒ اور ائمہ میں سے امام احمدؒ اور اسحاقؒ کے نزدیک رمی کے لیے سات کنکریوں کا ہونا مستحب ہے، واجب نہیں۔ ان کے نزدیک سات سے کم کنکریوں سے بھی رمی ہو سکتی ہے۔ ان کا استدلال حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی اس روایت سے ہے کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے حج میں جمروں یا جمرہ عقبہ پر رمی کی۔ پھر ہم بیٹھ کر آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ بعض کہنے لگے ہم نے پانچ کنکریاں پھینکیں۔ بعض کہنے لگے "ہم نے سات کنکریاں پھینکیں" بعض کہنے لگے کہ "ہم نے آٹھ کنکریاں پھینکیں اور بعض کہنے لگے کہ ہم نے نو کنکریاں پھینکیں۔ کسی تعداد میں انہوں نے حرج محسوس نہیں کیا۔" (احمد، نسائی)

اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ امام احمدؒ اور اسحاقؒ کے نزدیک یہ روایت صحیح اور قابل حجت ہے، جمہور کے نزدیک یہ حدیث مسند ـــ جس کی سند نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک مسلسل ہو ـــ نہیں ہے، اس لیے قابل حجت نہیں۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۷۲)۔

۲۔ یہ امام ابو حنیفہؒ، عطاءؒ، احمد بن حنبلؒ (اور غالباً امام مالکؒ کا بھی) مسلک ہے۔ امام شافعیؒ اور اہلحدیث علماء) کے نزدیک کنکریوں کا مزدلفہ سے لینا مستحب ہے۔ ان کا استدلال حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اس روایت سے ہے کہ "مزدلفہ کی صبح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔ "یہاں آؤ اور میرے لیے

۵۔ کنکریوں کا حجم :

رمی کے لیے کنکری اتنی ہونی چاہیے کہ دو انگلیوں کے درمیان رکھ کر پھینکی جا سکے، یعنی چنے کے دانے سے کچھ بڑی۔

حضرت اُمِّ جندب اُزد یہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جب تم رمی کرو، تو ایسی کنکری لو جسے دو انگلیوں کے درمیان رکھ کر پھینکا جا سکے۔" (احمد، ابو داؤد، ابن ماجہ بیہقی)۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ مزدلفہ کی صبح میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایسی کنکریاں اکٹھی کیں، جنہیں دو انگلیوں کے درمیان رکھ کر پھینکا جا سکے"۔ (احمد، نسائی، ابن ماجہ)۔

۶۔ رمی کرنے کا وقت

اس پر اجماع ہے کہ قربانی کے روز رمی کا مسنون وقت طلوع آفتاب سے زوال آفتاب تک ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رمی کرنے کا یہی وقت تھا۔ (علامہ ابن عبدالبر حوالہ المغنی ج ۳ ص ۴۴۹)۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قربانی کے دن چاشت کے وقت جمرۂ عقبہ پر رمی فرماتے دیکھا۔ بعد کے دنوں میں آپؐ نے زوال آفتاب کے بعد رمی فرمائی۔" (مسلم)۔

اس پر بھی اجماع ہے کہ رمی کا آخری وقت جس سے پہلے پہلے اگر رمی کر لی جائے تو

کنکریاں اکٹھی کر کے لاؤ۔" میں نے آپؐ کے لیے ایسی کنکریاں اکٹھی کیں، جنہیں دو انگلیوں کے درمیان رکھ کر پھینکا جا سکے۔ جب آپؐ نے انہیں اپنے ہاتھ میں رکھا تو فرمایا۔ "ہاں ٹھیک ہے۔ اتنی ہی کنکریاں اور لاؤ اور (یاد رکھو) تم دین میں شدت برتنے سے پرہیز کرو، اس لیے کہ جو لوگ تم سے پہلے گزر ہیں، انہیں دین کے معاملے میں شدت کرنے ہی نے تباہ کیا ہے۔" (احمد، نسائی، ابن ماجہ علیٰ شرط مسلم)۔۔۔۔ اس حدیث میں "مزدلفہ کی صبح" کے الفاظ سے امام شافعیؒ کا استدلال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباسؓ کو مزدلفہ ہی میں کنکریاں اکٹھی کرنے کا حکم دیا تھا۔ دوسرے ائمہ کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم مزدلفہ کی صبح لیکن منیٰ میں دیا تھا۔ (المغنی ج ۳ ص ۴۴۵) (ھدایہ ج ۱ ص ۱۰۶)

رمی ہو جائے گی' غروبِ آفتاب تک ہے۔ اگرچہ غروبِ آفتاب تک رمی کا موخر کرنا غیر مستحب ہے۔ (علامہ ابنِ عبدالبر حوالہ مذکورہ) لـه

البتہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ رمی کا وقت شروع کب سے ہوتا ہے۔ لـه

۷۔ رمی کی قضا:

غروب آفتاب تک رمی کا جائز وقت ہے۔ یعنی اگر اس سے پہلے پہلے رمی کر لی

ا۔ یہ اجماع علامہ ابن عبدالبرؒ نے اپنے علم کی حد تک نقل فرمایا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اس بارے میں امام ابو یوسفؒ کا اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک رمی کا وقت زوال آفتاب تک ہی ہے۔ اس کے بعد جو رمی ہو گی' تو وہ ادا نہیں بلکہ قضا ہو گی۔ (ھدایہ ج ۱ص ۱۰۸) (امام عینیؒ حوالہ الفتح الربانی' ج ۱۲ص ۱۷۸)۔

ا۔ امام ابو حنیفہؒ' مالکؒ' اسحاقؒ اور ایک روایت میں امام احمدؒ کے نزدیک یہ وقت فجر کے بعد اور طلوع آفتاب سے پہلے شروع ہو جاتا ہے۔ ان کا استدلال حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اس روایت سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ قربانی کے دن ان کے گھر والوں کے ساتھ مزدلفہ سے منیٰ جاؤں اور ہم نے فجر کے وقت رمی کی"۔ (احمد نسائی' طحاوی)۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں۔ "ایسی کوئی حدیث ہمیں نہیں ملی کہ فجر سے پہلے۔۔ رمی کرنے کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو اجازت دی ہو۔ ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص فجر سے پہلے رمی کر لے' اسے دوبارہ رمی کرنی پڑے گی۔" (بدایۃ المجتہد ج ۱ص ۲۷۹) (ھدایہ ج ۱ص ۱۰۸)

امام شافعیؒ' عطاءؒ' ابن ابی لیلیؒ' عکرمہ بن خالدؒ اور ایک روایت میں امام احمدؒ کے نزدیک رمی کا وقت آدھی رات سے شروع ہو جاتا ہے۔ ان کا استدلال حضرت عائشہؓ کی اس حدیث سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امِ سلمہؓ کو حکم دیا اور انہوں نے طلوعِ فجر سے پہلے جمرۂ عقبہ پر رمی کی (ابو داؤد)۔ اسی طرح حضرت اسماءؓ نے بھی طلوع فجر سے پہلے رمی کی۔ (بخاری' مسلم' احمد' ابو داؤد' وغیرہ)۔

(غالباً اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ دونوں طرف صحابہؓ کا اپنا عمل بیان ہوا ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یا عمل بیان نہیں ہوا ہے)۔

ا۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر طلوعِ فجر سے پہلے پہلے رمی کر لی جائے تو کوئی فدیہ نہیں اور اگر دن کے وقت رمی کی جائے گی تو ایک جانور کی قربانی ضروری ہے۔

امام احمدؒ کے نزدیک رات کے وقت رمی نہیں کی جائے گی۔ بلکہ دن میں زوال آفتاب کے بعد رمی کی جائے گی۔

امام شافعیؒ کے نزدیک (اور غالباً امامِ مالکؒ کے نزدیک) بھی رات کے وقت رمی کی جاسکتی ہے۔

جائے تو وہ ادا شمار ہو گی۔ اگر کوئی شخص غروب آفتاب تک رمی نہ کر سکے' تو بعد میں اس کی قضا کر سکتا ہے۔ کب ؟ اس بارے میں مختلف ائمہ کی آراء مختلف ہیں [1]۔

۸ ۔ رمی کی کیفیت اور آداب:

(ا) رمی کا زمین پر کھڑے ہو کر کرنا مسنون ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے زمین پر کھڑے ہو کر جمرہ عقبہ پر رمی کی۔ ہر کنکری کو پھینکتے وقت آپ "اللہ اکبر" کہتے جاتے تھے۔ آپ سے بعض لوگوں نے آکر کہا کہ بعض لوگ اوپر کھڑے ہو کر رمی کرتے ہیں (یعنی وہ اوپر کھڑے ہو کر رمی کرنے کو بہتر سمجھتے ہیں) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا" مجھے اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں، جس ذات مقدس (ﷺ) پر سورہ بقرہ نازل ہوئی، اس نے یہیں زمین پر کھڑے ہو کر رمی فرمائی تھی۔ (بخاری، مسلم، احمد وغیرہ)

یوں بھیڑ کے وقت کسی اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر بھی رمی کی جا سکتی ہے۔ (اگرچہ اب جمرۂ عقبہ کے پاس کوئی اونچی جگہ باقی ہی نہیں رہی ہے)۔

"حضرت عمرؓ جب رمی کے لیے آئے۔" تو جمرۂ عقبہ کے پاس بھیڑ تھی' آپ اوپر چڑھے اور وہاں سے رمی کی۔" (موطا امام مالکؒ)

(ب) رمی کرتے وقت مستحب یہ ہے کہ اس طرح کھڑا ہوا جائے کہ مکہ معظمہ بائیں طرف اور منیٰ دائیں طرف ہو۔

ا۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر طلوع فجر سے پہلے پہلے رمی کر لی جائے تو کوئی فدیہ نہیں اور اگر دن کے وقت رمی کی جائے گی تو ایک جانور کی قربانی ضروری ہے۔

امام احمدؒ کے نزدیک رات کے وقت رمی نہیں کی جائے گی۔ بلکہ دن میں زوال آفتاب کے بعد رمی کی جائے گی۔

امام شافعیؒ کے نزدیک (اور غالباً امام مالکؒ کے نزدیک بھی) رات کے وقت رمی کی جا سکتی ہے اور دن کے وقت بھی۔ (المغنی ج ۳، ص ۴۵۰)۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جمرہ کبریٰ (جمرہ عقبہ) پر سات کنکریوں سے رمی فرمائی۔ آپ نے اپنا رخ اس طرح رکھا کہ خانہ کعبہ آپ کی بائیں طرف اور منیٰ دائیں طرف تھا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ "یہ ہے اس ذات پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کھڑے ہونے کی جگہ جس پر سورہ بقرہ نازل ہوئی تھی۔ (بخاری' مسلم' احمد وغیرہ)۔

(ج) ہر کنکری پھینکتے وقت "اللہ اکبر" کا کہنا مسنون[1] ہے' جیسا کہ حضرت جابرؓ کی حدیث میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمرہ عقبہ پر رمی فرمائی آپؐ ہر کنکری پھینکتے وقت "اللہ اکبر" کہتے جاتے تھے۔ (مسلم' ابوداؤد' احمد' ابن ماجہ وغیرہ)۔

"اللہ اکبر' کے ساتھ ذیل کی دعا کرنا بھی مستحب ہے:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ حَجًّا مَّبْرُوْرًا وَّذَنْبًا مَّغْفُوْرًا وَّعَمَلًا مَّشْکُوْرًا۔

اے اللہ! اسے حج مبرور (وہ حج جس کے بعد تمام گناہ معاف ہو جائیں) معاف کردہ گناہ اور قبول کردہ عمل بنا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بیٹے سالمؒ نے وادی میں کھڑے ہو کر سات کنکریوں سے رمی کی۔ آپ ہر کنکری پھینکتے وقت "اللہ اکبر" اور "اللھم اجعلہ ــــ" کہتے جاتے تھے۔ ان سے جب لوگوں نے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا "میں نے اپنے والد ماجد ـــ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ـــ سے یہ سنا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ کھڑے ہو کر رمی کرتے وقت یہ دعا فرمایا کرتے تھے۔" (ابن ماجہ)

اس روایت کی سند اگرچہ کمزور ہے' لیکن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق صحیح روایت میں ہے کہ وہ رمی میں ہر کنکری پھینکتے وقت "اللہ اکبر' کہتے جاتے تھے اور پھر (آخر میں) آپ نے دعا کی" اللھم اجعلہ ــــ "(احمد' بیہقی' ابن ماجہ)۔

۹۔ رمی کا سوار ہو کر یا پیدل ہر طرح کرنا صحیح ہے:

اس پر اجماع ہے کہ رمی کے لیے نہ پیدل ہونا ضروری ہے اور نہ سوار ہونا۔ ہر حال میں رمی کی جا سکتی ہے۔ (ابن المنذر بحوالہ الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۸۵)۔

---

[1] اس پر امام سفیان ثوریؒ کے سوا تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ امام سفیان ثوریؒ کے نزدیک رمی میں ہر کنکری پھینکتے وقت 'اللہ اکبر' کہنا واجب ہے۔ یعنی اگر ایسا نہ کیا جائے گا۔ تو ایک مسکین کو کھانا کھلایا جائے گا۔ (حافظ ابن حجرؒ بحوالہ الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۷۲)۔

۱۰۔ رمی میں ہر کنکری کا مرمیٰ کے اندر گرنا ضروری ہے :

اس بارے میں بھی اجماع ہے کہ رمی میں ہر کنکری کا مرمیٰ (وہ دائرہ جو جمرہ کے گرد بنا ہوا ہے) کے اندر گرنا ضروری ہے۔ اگر کوئی کنکری اس سے باہر گرے گی' تو اس کا شمار نہیں ہوگا۔ (المغنی ج ۳ ص ۴۵۰)۔

۱۱۔ رمی کے بعد جمرہ کے پاس کھڑا ہونا مسنون نہیں ہے :

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب جمرہ عقبہ پر رمی فرما لیتے' تو آپؐ واپس ہو جاتے اور وہاں وقوف نہ فرماتے۔" (ابن ماجہ)۔

۱۲۔ کنکریوں کا الگ الگ گرنا ضروری ہے :

رمی کرتے وقت کنکریوں کا ایک ایک کر کے پھینکنا ضروری ہے۔ اگر سب کنکریوں کو ایک ساتھ پھینک دیا جائے گا۔ تو ان کا شمار نہ ہوگا۔[1]

۱۳۔ رمی شروع کرتے وقت تلبیہ کہنا بند کر دیا جائے :

جب جمرۂ عقبہ پر رمی شروع کی جائے' تو تلبیہ کہنا بند کر دیا جائے گا'

حضرت فضل بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تلبیہ فرماتے رہے' یہاں تک کہ آپؐ نے جمرہ عقبہ پر رمی فرمائی۔[2]

۱۔ اس پر ائمہ اربعہ اور دوسرے اکثر ائمہ کا اتفاق ہے (المغنی ج ۳ ص ۴۸)

۲۔ یہ اکثر صحابہؓ تابعین اور بعد کے ائمہ (جن میں امام ابو حنیفہؒ' شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ شامل ہیں کا مسلک ہے۔

امام ابن حزمؒ اور بعض شافعی اور اہلحدیث علماء کے نزدیک تلبیہ رمی شروع کرتے وقت نہیں' بلکہ اسے ختم کرتے وقت ختم کیا جائے گا۔ ایک روایت میں امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ حضرت فضل بن عباسؓ کی ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں :

"آپؐ (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم) ہر کنکری پھینکتے وقت "اللہ اکبر" کہتے جاتے تھے اور پھر آخری کنکری کے ساتھ آپؐ نے تلبیہ کہنا بند کر دیا"۔ (ابن خزیمہ) اور ایک اور روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تلبیہ فرماتے رہے' یہاں تک کہ آپؐ نے جمرہ عقبہ پر رمی فرمائی۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بخاری، مسلم، احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)۔

(پچھلے صفحہ سے بقیہ) جب آپؐ واپس ہوئے تو آپؐ نے تلبیہ کہنا بند کر دیا۔" (نسائی)۔۔۔۔ یہ زائد الفاظ امام ابن حزمؒ اور اہلحدیث علماء کے نزدیک صحیح اور قابل حجت ہیں۔ پہلے مسلک والوں کے نزدیک یہ قابل حجت نہیں ہیں۔ (سبل السلام ج ۲ ص ۲۹۷) (نیل الاوطار وغیرہ)۔

صحابہؓ میں سے حضرت عائشہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، علیؓ اور امّ سلمہؓ کی روایت ہے کہ وہ عرفہ کے دن زوال آفتاب کے بعد تلبیہ کہنا بند کر دیتے تھے (ابن المنذر)۔ صحابہؓ کے اس عمل کی وجہ سے امام اوزاعیؒ، حسن بصریؒ اور امام مالکؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ غالباً ان صحابہ کرامؓ کو یہ معلوم نہ ہو سکا ہو گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمی جمرۂ عقبہ تک تلبیہ فرماتے رہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۱۸۹)۔

۲۔ قربانی [1]

۱۔ قربانی کا حکم:

(۱) متمتع اور مفرد: اس پر اجماع ہے کہ متمتع کے لیے قربانی واجب اور مفرد کے لیے مسنون ہے۔ (المغنی ج ۳ ص ۴۹۹) (ہدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۲۹۹)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ. فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ۔ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔
(بقرہ: ۱۹۶)

پھر اگر تمہیں امن نصیب ہو تو جو شخص تم میں سے حج کا زمانہ آنے تک عمرہ کے ذریعے تمتع کرے (یعنی عمرہ کا فائدہ اٹھائے) تو جو قربانی کا جانور نہ پائے، تو تین دن کے روزے حج میں اور سات دن کے روزے اس وقت رکھے جب واپس آجائے۔ یہ پورے دس روزے ہیں۔ یہ رعایت ان لوگوں کے لیے ہے جن کے گھر مسجد حرام کے قریب نہ ہوں۔ (یعنی وہ مکہ معظمہ کے رہنے والے نہ ہوں)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں تمتع کا احرام باندھا۔ جب حضور مکہ معظمہ پہنچے، تو آپؐ نے لوگوں سے فرمایا "تم میں سے جو شخص قربانی کا جانور اپنے ساتھ نہ لایا ہو اسے چاہیے کہ خانہ کعبہ کا طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کر کے اور بال کتروا کر احرام کھول لے۔ پھر (ترویہ کے روز) حج کا احرام باندھے اور منیٰ میں قربانی دے۔ جو شخص قربانی کا جانور نہ پائے، اسے چاہیے کہ تین دن کے

---

[1] اس باب میں قربانی کے مسائل صرف اس حد تک بیان کیے گئے ہیں جس حد تک ان کا حج کے مسائل سے تعلق ہے۔

روزے حج میں اور سات دن کے روزے اپنے گھر واپس آکر رکھے۔" (بخاری و مسلم)

(ب) قارن : متمتع کی طرح قارن پر بھی قربانی واجب ہے۔ اوپر کی آیت اور حدیث میں تمتع کا لفظ اپنے لغوی اور عام معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اصطلاحی تمتع' جو احرام کی تین قسموں میں سے ایک قسم ہے' کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ لہٰذا یہ اصطلاحی تمتع' اور قران دونوں کے معنی کو شامل ہے۔ صحابہ کرامؓ تمتع کا لفظ اس کے لغوی اور عام معنی ہی میں استعمال کرتے تھے' چنانچہ بہت سے صحابہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کو تمتع بتایا ہے۔ حالانکہ اگر اصطلاحی معنی کے لحاظ سے دیکھا جائے' تو حضورؐ کا احرام قران ہی کا تھا' کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قربانی کا جانور اپنے ساتھ لائے تھے۔[1] (تفسیر ابن کثیر)' (المغنی ج ۳ ص ۴۹۷)۔

(ج) اگر متمتع یا قارن[1] کسی وجہ سے قربانی نہ کر سکے (مثلاً یہ کہ وہ قربانی کا جانور

۱۔ اس پر امام ابن حزمؒ کے سوا تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ امام ابن حزمؒ کے نزدیک قارن پر قربانی واجب نہیں ہے۔ ان کا استدلال حضرت عائشہؓ کی اس حدیث سے ہے کہ "ذی الحجہ کا چاند ہو جانے کے قریب ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کے لیے نکلے۔ میں ان لوگوں میں سے تھی' جنہوں نے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ ہم روانہ ہوئے۔ یہاں تک کہ مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ عرفہ کے روز تک میں حیض کی حالت میں تھی۔ میں نے اپنا عمرہ کا احرام نہیں کھولا تھا۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی اس شکایت کا ذکر کیا۔ تو آپؐ نے فرمایا۔ "اچھا عمرہ چھوڑ اور اپنے سر کے بال کھول کر ان میں کنگھی کرو اور حج کا احرام باندھ لو۔" چنانچہ میں نے یونہی کیا۔ (حج کے اعمال سے فارغ ہونے کے بعد) جب حصبہ کا دن (یعنی وہ دن جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں ٹھیرے تھے)۔ آیا اور اللہ نے ہمارا حج مکمل کرا دیا' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (میرے بھائی) عبد الرحمٰن بن ابی بکرؓ کو میرے ساتھ بھیجا اور وہ مجھے اپنے اونٹ پر بٹھا کر تنعیم لے گئے' میں نے عمرہ کا احرام باندھا۔ اس طرح اللہ نے ہمارا حج اور عمرہ دونوں پورے کرا دیے۔ اس میں نہ قربانی تھی' نہ صدقہ اور نہ روزہ"۔ (مسلم)

اس حدیث سے امام ابن حزمؒ یہ استدلال کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے حالانکہ حج اور عمرہ دونوں کیے' لیکن انہوں نے کوئی قربانی نہیں دی۔ دوسرے ائمہ کے نزدیک اس حدیث میں "اس میں قربانی نہ تھی' نہ صدقہ اور نہ روزہ" کے الفاظ حضرت عائشہؓ کے نہیں بلکہ بعد کے راوی حشام۔۔۔ جنہوں نے یہ حدیث حضرت عائشہؓ کے بھانجے عروہؓ سے سنی۔۔۔ کے ہیں۔ (مختصراً از زاد المعاد ج ۱ ص ۱۹۷)۔

۱۔ امام ابن حزمؒ کے نزدیک صرف متمتع' کیونکہ ان کے نزدیک قارن پر قربانی واجب نہیں ہے۔

نہ پائے' یا اس کے پاس اتنی رقم نہ ہو کہ وہ جانور کی قیمت ادا کر سکتا ہو' یا اس کے پاس اتنی رقم تو ہو' مگر اسے اندیشہ ہو کہ اگر صرف کر ڈالے گا تو بعد میں اسے تکلیف ہو گی اور اسے قرض بھی نہ مل سکتا ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ اس کے بدلے تین روزے حج [1] میں اور سات

---

[1] حنفیہ کے نزدیک یہ تین روزے الگ الگ کر کے بھی رکھے جا سکتے ہیں' البتہ ان کا لگاتار رکھنا بہتر ہے۔ ان کا عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد رکھنا جائز ہے۔ اس سے پہلے جائز نہیں۔ البتہ ان کا زیادہ سے زیادہ مؤخر کرنا یہاں تک کہ عید (۱۰ ذی الحجہ) میں صرف تین دن باقی رہ جائیں بہتر ہے۔ اس لیے کہ ممکن ہے کہ حاجی کو اس سے پہلے قربانی کا جانور میسر آ جائے اور اسے روزہ رکھنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اگر کسی نے یہ روزے نہ رکھے ہوں اور عید کا دن آ پہنچے' تو اس کے لیے قربانی ناگزیر ہے۔ اگر وہ قربانی کر ہی نہ سکتا ہو' تو وہ قربانی کیے بغیر اپنا احرام کھول لے گا۔ اور اس کے ذمہ دو قربانیاں واجب ہوں گی۔ ایک اپنے قران یا تمتع کی اور دوسرے قربانی کیے بغیر احرام کھولنے کی۔ اگر حلق (سر منڈوانا) یا تقصیر (بال چھوٹے کرانا) کے ذریعے احرام کھولنے سے پہلے کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ وہ قربانی کر سکتا ہو تو اس کا روزہ باطل ہو جائے گا اور اسے قربانی کرنا ضروری ہو گی۔

شافعیہ کے نزدیک یہ تین روزے حج کا احرام باندھ لینے کے بعد رکھے جائیں گے۔ اگر متمتع ان کو حج کا احرام باندھنے سے پہلے رکھ لے گا' تو ان کا اعتبار نہ ہو گا' اور مسنون یہ ہے کہ ان کو یوم عرفہ سے پہلے پہلے رکھ لیا جائے' اس لیے کہ حاجی کے لیے یوم عرفہ کا روزہ رکھنا مسنون ہے (اس لحاظ سے متمتع کو چاہیے کہ حج کے لیے اپنا احرام یوم الترویہ۔۔ ۸ ذی الحجہ۔۔۔ سے پہلے ہی باندھ لے) اور اگر انہیں ایام تشریق (۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ذی الحجہ) کے بعد رکھا جائے گا' تو گناہ ہو گا اور یہ روزے قضا ہوں گے' اگرچہ تاخیر کی وجہ سے پھر قربانی ضروری نہ رہے گی۔

مالکیہ کے نزدیک ان روزوں کا وقت حج کا احرام باندھ لینے کے بعد شروع ہوتا ہے اور عید کے دن (۱۰ ذی الحجہ) تک رہتا ہے۔ اگر عید سے پہلے انہیں نہ رکھا جا سکے' تو ان کا اشراق کے دنوں میں رکھنا واجب ہے۔ ایام تشریق تک انہیں مؤخر کرنا مکروہ ہے اگر ایام تشریق میں بھی یہ روزے نہ رکھے جا سکیں تو بعد میں انہیں رکھا جا سکتا ہے۔ خواہ بقیہ سات روزوں کے ساتھ یا ان سے الگ۔

حنابلہ کے نزدیک ان تین روزوں کے عمرہ کا احرام باندھ لینے کے بعد سے عید کے دن سے پہلے پہلے رکھنا جائز ہے۔ افضل یہ ہے کہ انہیں اس طرح رکھا جائے کہ آخری روزہ عرفہ کے دن (۹۔ ذی الحجہ) کا ہو اگر عید کے دن سے پہلے انہیں نہ رکھا جا سکے تو تشریق کے دنوں میں رکھ سکتے ہیں۔ اس صورت میں قربانی واجب۔

(بقیہ ۳۱۶ پر)

روزے [1] اپنے وطن واپس آکر رکھ لے جیساکہ اوپر کی آیت اور حدیث میں بیان ہوا ہے۔
نوٹ: تمتع یا قران حج میں قربانی کے واجب ہونے کی ایک وجہ ہے۔ نذر' جنایت (حج میں کوئی ایسا کام کر لینا جس کا کرنا جائز نہیں) اور کفارہ (حج کے اعمال میں سے کوئی واجب عمل ترک کر دینا) کی وجہ سے بھی قربانی واجب ہو جاتی ہے۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے (بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۲۹۹)۔۔۔۔۔

آئندہ واجب قربانی سے متعلق جن مسائل کا ذکر آرہا ہے' وہ ان قربانیوں سے بھی اسی طرح متعلق ہیں جس طرح تمتع اور قران کی قربانی سے۔۔۔۔

۲۔ قربانی کا وقت:

اس پر اجماع ہے کہ قربانی (خواہ وہ واجب ہو یا مسنون یا نفل) کا مسنون وقت ۱۰ ذی الحجہ کو جمرہ عقبہ پر رمی کرنے کے بعد ہے۔

قربانی کے جائز وقت (یعنی وہ وقت جس کے اندر اندر اگر قربانی کر لی جائے' تو وہ شمار ہو جائے گی) میں صحابہؓ اور ائمہ کے درمیان اختلاف ہے [2]

(بقیہ ۳۱۵):۔ نہ ہو گی اگر تشریق کے دنوں میں بھی انہیں نہ رکھا جا سکے تو بعد میں دس روزے لگاتار رکھ لیے جائیں۔ اس صورت میں واجب کی تاخیر کی وجہ سے ایک قربانی واجب ہو گی۔ عمرہ کا احرام باندھ لینے سے پہلے ان کا رکھنا جائز نہیں ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۶۸۲۔ ۶۹۲)۔
ان تین روزوں کے رکھنے میں اسی طرح کا اختلاف مختلف صحابہ کرامؓ میں بھی ہے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

۱۔ حنفیہ کے نزدیک ان سات روزوں کا حج کے اعمال سے فارغ ہونے کے بعد رکھنا بھی جائز ہے۔ انہیں الگ الگ بھی رکھا جا سکتا ہے بلکین ان کا لگاتار رکھنا افضل ہے۔
شافعیہ اور حنبلیہ کے نزدیک یہ سات روزے وطن واپس آکر رکھے جائیں گے' اِلّا یہ کہ انسان مکہ معظمہ ہی کو اپنا وطن بنا لے۔ اس صورت میں انہیں مکہ معظمہ میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔
مالکیہ کے نزدیک ان کا حج کے اعمال سے فارغ ہونے کے بعد رکھنا جائز ہے خواہ وطن واپس ہو جائے یا نہ ہو۔ قرآن کی آیت میں "اذا رجعتم" سے مراد حج کے اعمال سے فراغت ہے اگرچہ افضل یہ ہے کہ ان کو وطن واپس پہنچ کر رکھا جائے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ حوالہ مذکورہ)
۲۔ صحابہؓ میں سے حضرت علیؓ کے نزدیک قربانی کے چار دن ہیں۔ یعنی ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲ اور ۱۳ ذی الحجہ۔ یہی مسلک حسن بصریؒ' عطاؒ' اوزاعیؒ اور امام شافعیؒ کا ہے۔ (بقیہ ۳۱۷)

۳۔ قربانی کی جگہ :

حج یا عمرہ کرنے والا اپنی قربانی حدودِ حرم میں جس جگہ چاہے کر سکتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ — ایسی ھدی (قربانی) جو کعبہ (حدود حرم) تک پہنچنے والی ہو۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "منیٰ کا پورا میدان قربانی کی جگہ ہے اور مکہ کی ہر گلی اور راستہ قربانی کی جگہ ہے [1]" (ابو داؤد)

لیکن مسنون یہ ہے کہ حاجی اپنی قربانی (خواہ واجب ہو یا مسنون یا نفلی) منیٰ میں کرے اور عمرہ کرنے والا مکہ معظمہ میں مروہ کے قریب۔

حضرت جابرؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (منیٰ میں اپنی قربانی کے جانور ذبح کیے اور پھر) فرمایا۔ "میں نے یہاں قربانی کی ہے، اور منیٰ کا پورا میدان قربانی کی جگہ ہے۔" (ابو داؤد، مسلم، نسائی وغیرہ)

اس بارے میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ (بدایۃ المجتہد ج ا ص ۳۰۱)۔۔۔ (المغنی ج ۳ ص ۴۵۵)

۴۔ قربانی کے جانور :

حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ کے نزدیک قربانی کے تین دن ہیں۔ یعنی ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ذی الحجہ یہی مسلک امام مالکؒ، احمد بن حنبلؒ اور سفیان ثوریؒ کا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک متمتع اور قارن کے لیے قربانی کے تو تین ہی دن ہیں یعنی ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲ ذی الحجہ، لیکن مسنون یا نفل قربانی (جیسے مفرد کی قربانی) اور نذر یا کفارہ یا جنایت کی وجہ سے واجب قربانی ہر وقت کی جا سکتی ہے۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲ ذی الحجہ کو بھی۔ ان سے پہلے بھی اور ان کے بعد بھی۔ (فتح القدیر، شرح ھدایہ ج ا ص ۵۷۸)

[1] یہ امام ابو حنیفہؒ، شافعیؒ، احمد حنبلؒ (اور غالباً امام مالکؒ کے سوا تمام ائمہ) کا مسلک ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک قربانی پورے حرم میں نہیں بلکہ پورے مکہ معظمہ میں کی جا سکتی ہے 'بالغ الکعبۃ' سے مراد دوسرے ائمہ حدود حرم لیتے ہیں اور امام مالکؒ حدودِ مکہ معظمہ۔ (بدایۃ المجتہد ج ا ص ۲۹۹)۔

اس پر اجماع ہے کہ قربانی کے جانور کا نر یا مادہ اونٹ گائے' بھیڑ اور بکری میں سے ہونا ضروری ہے۔ ان کے علاوہ کسی دوسرے جانور کی قربانی نہیں کی جا سکتی۔ سب سے بہتر قربانی اونٹ کی' پھر گائے کی' پھر بھیڑ کی اور پھر بکری کی ہے۔ (ہدایۃ المجتہد ج ا ص ۲۹۹)۔

۵۔ قربانی کے جانور میں شرکت :

ایک اونٹ یا ایک گائے میں سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں' خواہ قربانی واجب ہو یا نفل اور خواہ تمام شریک ہونے والوں کا ارادہ قربانی ہی کرنے کا ہو یا ان میں سے بعض کا ارادہ محض گوشت حاصل کرنے کا ہو۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں تمتع کرتے تھے اور سات آدمیوں کی طرف سے ایک گائے ذبح کرتے تھے۔" دوسری روایت میں ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم میں سے سات آدمی اونٹ یا گائے میں شریک ہو سکتے ہیں [1] (مسلم' احمد)

اس بارے میں اجماع ہے کہ بکری یا بھیڑ کی قربانی میں ایک سے زیادہ آدمی شریک نہیں ہو سکتے۔ (شرح مسلم للنووی) (الفتح الربانی ج ۱۳ ص ۴۲)۔

۶۔ قربانی کا خود کرنا مستحب اور دوسرے سے کرانا جائز ہے :

مستحب یہ ہے کہ حاجی قربانی اپنے ہاتھ سے کرے' لیکن اگر وہ کسی دوسرے سے قربانی کرا دے' تو یہ جائز ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اگر وہ ایک سے زیادہ جانوروں کی قربانی کر رہا

ا۔ یہ امام شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ اور عام محدثین کا مسلک ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ایک اونٹ یا ایک گائے میں سات آدمیوں کی شرکت صرف اس صورت میں جائز ہے جب کہ سب کا ارادہ قربانی ہی کرنے کا ہو۔ اگر بعض کا ارادہ محض گوشت حاصل کرنے کا ہو' تو شرکت نہیں ہو سکتی۔ قربانی خواہ واجب ہو یا مسنون یا نفل۔

امام مالکؒ کے نزدیک قربانی میں شرکت جائز نہیں۔ ایک اونٹ یا ایک گائے کی قربانی صرف ایک آدمی کر سکتا ہے۔ اسی مسلک کی ایک روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی ہے' لیکن دوسری روایت میں ان سے رجوع ثابت ہے۔ غالباً امام مالکؒ کو ان کے رجوع کی حدیث نہیں ملی۔ (الفتح الربانی ج ۱۳ ص

ہو' توبعض جانوروں کی قربانی اپنے ہاتھ سے کرے اور بعض کی کسی دوسرے سے کرالے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تریسٹھ اونٹوں کی قربانی خود فرمائی اور جو اونٹ بچ گئے' انہیں ذبح کرنے کا حکم حضرت علیؓ کو دیا۔" (مسلم' احمد' ابو داؤد' ابن ماجہ)۔

۷۔ قربانی کا گوشت خود کھانا جائز ہے :

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيْرَ۔

تو تم اس میں سے (یعنی اپنی قربانی کے گوشت میں سے) کھاؤ اور تنگدست فقیر کو کھلاؤ۔

حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے اونٹ ذبح فرمائے' تو آپؐ نے حکم دیا کہ ہر اونٹ کی ایک ایک بوٹی لے کر پکائی جائے۔ چنانچہ انہیں ہنڈیا میں پکایا گیا اور آپؐ نے اور حضرت علیؓ نے وہ گوشت کھایا اور اس کا شوربا پیا۔" (مسلم' احمد' ابو داؤد' ابن ماجہ)۔

اس آیت اور حدیث کی بناء پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ حاجی اپنی مسنون یا نفلی قربانی کا گوشت کھا سکتا ہے۔ (نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۱۳) اکثر ائمہ کے نزدیک وہ تمتع اور قران کی قربانی کا گوشت بھی کھا سکتا ہے' البتہ کسی دوسری واجب قربانی کا گوشت نہیں کھا سکتا[1]

امام ابن حزمؒ کے نزدیک ایک اونٹ کی قربانی میں سات کی بجائے دس آدمی بھی شریک ہو سکتے ہیں۔ ان کا استدلال حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اس روایت سے ہے کہ "ایک سفر میں ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ عیدالاضحیٰ آگئی تو ہم نے گائے کو سات آدمیوں کی طرف سے اور اونٹ کو دس آدمیوں کی طرف سے ذبح کیا"۔ (ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' احمد' ج مسلم'۔۔۔ امام ابن حزمؒ اس حدیث کو عام مانتے ہیں اور دوسرے ائمہ اس کا حکم عام قربانیوں کے لیے تو مانتے ہیں لیکن حج میں قربانی کے لیے نہیں مانتے۔ کیونکہ اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم موجود ہے کہ ایک اونٹ سات آدمیوں ہی کی طرف سے ذبح کیا جائے جیسا کہ اوپر حضرت جابرؓ کی حدیث میں یہ حکم موجود ہے۔ (نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۰۷)۔

[1] یہ امام ابو حنیفہؒ' احمد بن حنبلؒ اور بعض جزئی اختلاف کے ساتھ امام مالکؒ کا مسلک ہے اور اسی کو اہلحدیث علماء نے اختیار کیا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک حاجی کسی بھی واجب قربانی کا گوشت نہیں کھا سکتا۔

(باقی صفحہ ۳۱۹): ۔الفتح الربانی ج ۱۳ص ۵۶)(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج اص ۵۹۵۔۵۹۸)۔

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ امام شافعیؒ ہر واجب قربانی کو کفارہ کی قربانی پر قیاس کرتے ہیں اور کفارہ کی قربانی کا گوشت خود کھانا سب کے نزدیک ناجائز ہے۔ امام ابو حنیفہؒ احمد بن حنبلؒ اور دوسرے ائمہ تمتع اور قران کی قربانی کو کفارہ کی قربانی پر قیاس نہیں کرتے بلکہ اسے عبادت (شکرانہ) کی قربانی دیتے ہیں۔ اس لیے ان کے نزدیک اس کے کھانے میں کوئی ہرج نہیں۔ (بدایۃ المجتہد ج اص ۳۰۲)

۳۔ حلق یا تقصیر

(سر کا منڈوانا یا بال کتروانا)

ا۔ مشروعیت :

حج یا عمرہ کا احرام کھولنے کے لیے حلق بھی کرایا جا سکتا ہے اور تقصیر بھی۔ ان دونوں کی مشروعیت قرآن' سنت اور اجماع امت تینوں سے ثابت ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۹۸)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ. (الفتح : ۲۷)

اللہ نے اپنے رسول کو (اس کا یہ) سچا خواب دکھایا کہ اگر اللہ نے چاہا' تو تم لوگ ضرور ہی مسجد حرام میں امن کے ساتھ اپنے سروں کو منڈواتے اور بال کترواتے داخل ہو گے اور تمہیں کوئی ڈر نہ ہو گا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے اللہ! حلق کرنے والوں کی مغفرت فرما۔" صحابہؓ نے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسولؐ! اور تقصیر کرنے والوں کی؟" آپؐ نے فرمایا "اے اللہ! حلق کرنے والوں کی مغفرت فرما۔" صحابہؓ نے عرض کیا "اے اللہ کے رسولؐ! اور تقصیر کرنے والوں کی؟" آپؐ نے فرمایا "اور تقصیر کرنے والوں کی بھی۔" (بخاری' مسلم' احمد وغیرہ)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ "(قربانی کے روز منیٰ میں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ نے حلق کرایا اور بعض صحابہ نے تقصیر کرایا"۔ (بخاری و مسلم)۔

۲۔ حکم :

احرام کھولنے کے لیے حلق یا تقصیر واجب ہے' یعنی اگر رہ جائے تو ایک جانور کی

قربانی ضروری ہے۔ اس بارے میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ صرف ایک روایت میں امام شافعیؒ اسے حج کا رکن قرار دیتے ہیں' یعنی اگر یہ رہ جائے' تو حج نہیں ہوگا۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۹۷)۔

سر کا کتنا حصہ منڈوائے یا سر کے کتنے بال کتروانے سے حلق یا تقصیر کا وجوب پورا ہو جاتا ہے؟ اس بارے میں مختلف ائمہ کی رائے مختلف ہے[1]۔

۳۔ حلق تقصیر سے افضل ہے:

اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ حلق تقصیر سے افضل ہے' کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق کرانے والوں کے لیے تین مرتبہ اور تقصیر کرانے والوں کے لیے ایک مرتبہ مغفرت کی دعا فرمائی' حدیث اوپر گزر چکی ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۹۷)۔

۴۔ عورتوں کے لیے صرف تقصیر ہے' ان کے لیے حلق مکروہ ہے:

اس پر اجماع ہے کہ احرام کھولتے وقت عورت صرف تقصیر کرا سکتی ہے۔ حلق کرانا اس کے لیے مکروہ ہے۔ (ابن المنذر بحوالہ الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۲۹۸)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "عورتوں کے لیے حلق نہیں ہے' ان کے لیے صرف تقصیر ہے۔" (ابوداؤد دارقطنی' طبرانی)۔

---

[1] امام مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ کے نزدیک سارے سر کا منڈوانا واجب ہے کیونکہ قرآن کی آیت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں سر کے منڈوانے کا ذکر ہے اور 'سر' سے مراد پورا سر ہی ہو سکتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ کے نزدیک یہ مستحب اور افضل ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مسح پر قیاس کرتے ہوئے چوتھائی سر کے منڈوانے سے اور امام شافعیؒ کے نزدیک سر کے کم از کم تین بال منڈوانے سے حلق کا وجوب پورا ہو جاتا ہے۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۹۸) (ھدایہ ج ۱ ص ۱۰۶)۔

تقصیر میں بالوں کی ہر مقدار کتروانے سے تقصیر کا وجوب پورا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ افضل یہ ہے کہ پورے سر کے بال کتروائے جائیں ورنہ کم سے کم اتنے بال کتروائے جائیں کہ جو ایک انگلی کے پورے کے نیچے آ جائیں۔ تمام ائمہ کا تقریباً یہی مسلک ہے۔ (الفتح الربانی ج ۴ ص ۳۱۲) (المغنی ج ۳ ص ۴۵۶) ھدایہ ج ۱ ص ۱۰۶)

حضرت عائشہؓ اور حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو حلق کرانے سے منع فرمایا ہے۔(بزار)۔

اسی معنی کی ایک حدیث امام ترمذیؒ نے حضرت علیؓ سے بھی روایت کی ہے۔

۵۔ حلق میں پہلے سر کے بائیں حصے کا منڈوانا مستحب ہے :

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمرہ عقبہ پر رمی کر لی اور اپنی قربانی کے اونٹ ذبح فرما لئے' تو آپؐ نے حجام کے سامنے پہلے اپنے سر کا دایاں حصہ پیش فرمایا۔ اس نے آپؐ کے سر کے دائیں حصہ کی حجامت کی۔ آپؐ نے دوبال حضرت ابو طلحہؓ کو دے دیے۔ پھر اس نے آپؐ کے سر کے بائیں حصے کی حجامت کی' آپؐ نے وہ بال صحابہ میں تقسیم فرما دیے۔"[1] (مسلم' احمد' ابو داؤد' بیہقی)۔

۶۔ حلق یا تقصیر کے بعد ناخنوں کا ترشوانا مستحب ہے :

حلق یا تقصیر کے بعد ناخنوں کا ترشوانا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ اس لیے یہ (سب کے نزدیک) مستحب ہے۔(ابن المنذر بحوالہ المغنی ج ۳ ص ۴۶۱) (زاد المعاد ج ۱ ص ۴۸۳)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ حج یا عمرہ میں حلق کرانے کے بعد اپنی مونچھوں' اور داڑھی کے بال بھی چھوٹے کرا لیا کرتے تھے۔ (مؤطا امام مالکؒ)۔

۷۔ حلق یا تقصیر کا وقت :

یہ پہلے گزر چکا ہے کہ تمام ائمہ کے نزدیک حلق یا تقصیر کا مسنون وقت ۱۰۔ ذی الحجہ کو قربانی کے بعد ہے۔

تمام ائمہ کے نزدیک اس کا قربانی کے دنوں[2] تک مؤخر کرنا جائز ہے۔ البتہ اس

۱۔ تمام ائمہ کا یہی مسلک ہے۔ صرف ایک روایت میں امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک سر کی بائیں طرف کا پہلے منڈوانا مستحب ہے۔ کیونکہ حجام کے لحاظ سے وہ دائیں طرف ہوتی ہے۔ لیکن۔۔۔۔ مشہور روایت میں امام ابو حنیفہؒ کا مسلک بھی دوسرے ائمہ ہی کے مطابق ہے۔ (العرف الشذی ص ۳۳۰)۔

۲۔ قربانی کے دنوں کی تعداد میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے۔

بارے میں اختلاف ہے کہ اگر کوئی شخص قربانی کے دنوں تک حلق یا تقصیر نہ کرائے' تو کیا بعد میں وہ صرف حلق یا تقصیر کرائے گا یا اس کے ذمہ ایک جانور کی قربانی بھی ضرور ہو گی ؟[1]

۸۔ حلق یا تقصیر کے بعد احرام کھولنا جائز ہے :

جمرۂ عقبہ پر رمی' پھر قربانی اور پھر حلق یا تقصیر کے بعد حاجی کے لیے احرام کا کھولنا' خوشبو لگانا اور ان تمام کاموں کا کرنا جائز ہے' جن کا احرام کی حالت میں کرنا جائز ہے۔ البتہ عورت سے متعلق اس وقت تک جائز نہیں' جب تک وہ طواف' افاضہ نہ کرے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جب تم (جمرہ عقبہ پر) رمی کر لو اور پھر حلق (یا تقصیر) کو لو' تو تمہارے لیے خوشبو' کپڑے اور سوائے عورتوں سے تعلق کے تمام کام جائز ہیں۔" (احمد' ابو داؤد' بیہقی' دارقطنی)۔

حضرت عائشہؓ ہی سے دوسری روایت ہے کہ میں اپنے ہاتھ سے حجتہ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا احرام کھولتے اور احرام باندھتے وقت آپؐ کے بدن پر خوشبو لگاتی ۔ میں نے اس وقت بھی آپؐ کے بدن پر خوشبو لگائی جب آپؐ نے احرام باندھا اور اس وقت بھی جب آپؐ نے جمرہ عقبہ پر رمی فرمائی' اس سے پہلے کہ آپؐ خانہ کعبہ کے طواف (طواف افاضہ) کے لیے تشریف لے جائیں۔"[2] (بخاری' مسلم' احمد' مالک' ابن ماجہ' بیہقی' ابو داؤد' ترمذی' نسائی)۔

۱۔ امام ابو حنیفہؒ' مالکؒ' سفیان ثوریؒ' اسحاقؒ اور محمدؒ کے نزدیک اس پر ایک جانور کی قربانی بھی ضروری ہو گی۔ امام شافعیؒ' عطاءؒ اور ابو ثورؒ کے نزدیک اس کے ذمہ کوئی قربانی نہیں ہو گی۔ امام احمدؒ کا مسلک ایک روایت میں امام ابو حنیفہؒ اور مالکؒ کے مطابق ہے۔ لیکن مشہور روایت میں ان کا مسلک امام شافعیؒ ہی کے مطابق ہے۔ (المغنی ج ۳ ص ۴۶۰)۔

۲۔ یہ امام مالکؒ کے سوا دوسرے تمام ائمہ کا مسلک ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک طواف افاضہ سے پہلے احرام کھولنے کے بعد نہ صرف عورتوں سے تعلق بلکہ خوشبو کا استعمال بھی جائز نہیں ہے۔ یہ صحابہؓ میں سے حضرت عمرؓ اور عبداللہ بن عمرؓ کا مسلک تھا' جسے امام مالکؒ نے اختیار کیا۔ دوسرے ائمہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے ہوتے ہوئے حضرت عمرؓ کے مسلک کو اختیار نہیں کیا۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۱۹۲) وغیرہ۔

۴۔ طواف افاضہ یا طواف زیارت

ا۔ طواف افاضہ کا حکم :

اس پر اجماع ہے کے طواف افاضہ یا طواف زیارت حج کا رکن ہے۔ یعنی اگر یہ نہ ہو گا' تو حج نہ ہو گا۔ کیونکہ تمام ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ آیت ' "وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ (اور انہیں چاہیے کہ اس قدیم گھر کا طواف کریں)" میں اسی طواف کا حکم دیا گیا ہے۔

نیز حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا۔ ہم نے قربانی کے روز طواف افاضہ کیا۔ (حضرت) صفیہؓ کو حیض شروع ہو گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اس چیز کا ارادہ کیا' جس کا ارادہ خاوند اپنی بیوی سے کرتا ہے۔ میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسولؐ! وہ حیض کی حالت میں ہیں۔" آپؐ نے فرمایا "کیا وہ ہمیں روکے رکھیں گی؟" لوگوں نے بتایا کہ انہوں نے (یعنی حضرت صفیہؓ نے) قربانی کے روز طواف افاضہ کر لیا ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا "تب چلو"۔ (بخاری و مسلم)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طواف افاضہ اس قدر ضروری ہے کہ جب تک حاجی اس سے فارغ نہ ہو لے' وہ مکہ معظمہ سے واپس نہیں لوٹ سکتا۔

(ابن عبدالبر بحوالہ المغنی ج ۳ ص ۴۶۵)۔

۲۔ طواف افاضہ کا وقت :

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے' طواف افاضہ کا مسنون وقت قربانی کے روز رمی' قربانی اور حلق یا تقصیر کے بعد ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے روز طواف افاضہ کیا۔ پھر آپؐ نے واپس آکر منیٰ میں ظہر کی نماز پڑھی۔

(احمد' بخاری' مسلم' بیہقی وغیرہ)۔

حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف افاضہ کیا۔ آپؐ نے ظہر کی نماز مکہ معظمہ میں پڑھی۔" (مسلم' ابوداؤد' ابن ماجہ)۔

فائدہ : حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت جابرؓ کی یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ لیکن ان میں سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز واپس آکر منیٰ میں پڑھی۔ اور حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ظہر کی نماز مکہ معظمہ ہی میں پڑھی۔ ان دونوں حدیثوں کے درمیان علماء نے مختلف طریقوں سے تطبیق دی ہے۔ امام ابن حزمؒ نے حضرت عبداللہؓ کے بیان کو اور امام ابن تیمیہؒ نے حضرت جابرؓ کے بیان کو وہم قرار دیا ہے اور اپنی اپنی رائے کے مفصل دلائل دیے ہیں (ملاحظہ ہو تہذیب ابن قیمؒ علی معالم السنن ج ۲ ص ۴۲۶)۔ امام نوویؒ اور شوکانیؒ نے ان کے درمیان یوں تطبیق دی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز مکہ معظمہ میں پڑھ لی' لیکن جب آپؐ منیٰ واپس تشریف لائے تو آپؐ نے لوگوں کو ظہر کی نماز پڑھتے دیکھا۔ آپؐ نے نفل کی نیت سے ان کے ساتھ بھی نماز پڑھ لی۔ (شرح مسلم للنووی ج ۱ ص) (نیل الاوطار ج ۵ ص) مولانا خلیل احمد' صاحب بذل المجہود بھی ان دونوں حدیثوں کے درمیان امام ابن تیمیہؒ کی طرح تطبیق دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں ظہر کے وقت طواف کی دو رکعتیں پڑھیں (جسے حضرت جابرؓ نے ظہر کی نماز سمجھ لیا) اور پھر منیٰ واپس آکر صحابہ کرامؓ کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی۔ (ج ۲ ص ۱۵۹)۔

ا۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک اس کا وقت قربانی کے روز طلوع فجر کے بعد شروع ہو جاتا ہے۔ اس کا آخری وقت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ۱۲۔ ذی الحجہ اور امام مالکؒ کے نزدیک ۱۳۔ ذی الحجہ ہے۔ اس سے زیادہ تاخیر کرنے پر ایک جانور کی قربانی ضروری ہے۔ دوسری روایت میں امام مالکؒ کے نزدیک تاخیر پر قربانی ضروری نہیں۔

امام شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ اور حنفیہ میں سے امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ کے نزدیک اس کا وقت قربانی کے روز آدھی رات سے شروع ہو جاتا ہے اور اس کے آخری وقت کی تعیین نہیں۔ جب تک انسان زندہ رہے' وہ اسے کر سکتا ہے۔ تاخیر کی وجہ سے اس کے ذمہ قربانی ضروری نہیں ہو گی۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۲۰۴)۔

اس بارے میں امام ابو حنیفہؒ کا استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے تو "فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ (تو تم اپنی قربانیوں کا گوشت خود کھاؤ اور تنگ حال فقیروں کو کھلاؤ) (باقی صفحہ ۳۲۷ پر

طواف افاضہ کے جائز وقت (یعنی وہ وقت جس کے اندر اندر اگر اسے کر لیا جائے، تو وہ ادا ہو جائے گا' قضا شمار نہیں ہوگا) کے بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے لے

۳۔ طواف افاضہ کے بعد حاجی سے احرام کے سلسلے کی ہر پابندی اٹھ جاتی ہے:

طواف افاضہ کے بعد (جب کہ اس سے پہلے رمی، قربانی، اور حلق یا تقصیر سے فراغت حاصل کر لی گئی ہو) حاجی سے ہر قسم کی پابندی اٹھ جاتی ہے حتّٰی کہ عورت سے تعلق بھی اس کے لئے جائز ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (المغنی ج ۳ ص ۴۶۷)

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت تک کوئی چیز، جسے آپؐ نے احرام باندھنے کے بعد حرام فرمایا تھا، اپنے اوپر حلال نہیں کی، جب تک کہ آپؐ نے اپنا حج مکمل نہ کر لیا۔ قربانی کے روز آپؐ نے قربانی کی پھر آپ نے طواف افاضہ کیا۔ پھر آپ نے ہر چیز حلال کر لی۔ (بخاری و مسلم)

اسی طرح کی ایک دوسری روایت حضرت عائشہؓ سے بھی ہے۔ (بخاری و مسلم)

اصطلاح میں حاجی سے اس پابندی کے اٹھ جانے کو تحلّل ثانی کہا جاتا ہے۔

۴۔ طواف افاضہ کے بعد زمزم پر آنا اور اس کا پانی پینا مستحب ہے:

طواف افاضہ اور اس کے بعد مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد زمزم پر

فرمایا اور اس کے بعد "ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ۝ (پھر انہیں چاہیے کہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور اس قدیم گھر کا طواف کریں)" کہہ کر طواف افاضہ کا حکم دیا' تو گویا قربانی اور طواف افاضہ کا ایک ہی وقت ہے۔ اس کے بعد اگر تاخیر ہو گی تو ایک جانور کی قربانی ضروری ہونی چاہیے (ہدایہ ج ۱ ص ۱۰۶۔ ۱۰۷)۔

امام شافعیؒ وغیرہ کا استدلال یہ ہے کہ طواف افاضہ کے آخری وقت اور اس سے تاخیر کرنے پر قربانی کے ضروری ہونے کا قرآن و سنت میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا نہ اس کے آخری وقت کی تعیین ہے اور نہ اس کے موخر کرنے پر قربانی ضروری ہے (المغنی ج ۳ ص ۴۶۶)۔

آنا اور اس کا پانی پینا مستحب ہے، جیسا کہ حضرت جابر کی حدیث میں ہے کہ طواف افاضہ سے فارغ ہونے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم بئر زمزم پر تشریف لائے۔ خاندان عبدالمطلب کے چند افراد لوگوں کو آب زمزم پلا رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا اے عبدالمطلب کے بیٹو! پانی نکال نکال کر لوگوں کو پلاتے رہو۔ اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ (میری اقتداء کرتے ہوئے) تم سے ڈول چھین لیں گے، تو میں بھی تمہارے ساتھ پانی نکالتا۔" انہوں نے حضورؐ کو پانی کا ایک ڈول دیا اور آپؐ نے اس سے پانی پیا۔" (مسلم، احمد، ابوداؤد ابن ماجہ)

آبِ زمزم کی فضیلت اور آداب میں متعدد احادیث مذکور ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ پانی برکت والا ہے (یہ پانی کا پانی ہے اور) کھانے کا کھانا۔" (مسلم، بیہقی)۔

حضرت ابوذرؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مَاءُ زَمْزَمَ لِمَا شُرِبَ لَهُ (آب زمزم پینے سے انسان کی جو نیت اور مرضی ہوگی، وہ اسی طرح پوری ہو جائے گی" (بیہقی)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پوتے محمد بن عبدالرحمٰن سے روایت ہے (میں حضرت عبداللہ بن عباس کے پاس بیٹھا تھا۔ ایک آدمی آیا۔ آپ نے اس سے دریافت فرمایا "کہاں سے آرہے ہو؟ اس نے جواب دیا۔ زمزم سے آرہا ہوں۔ میں نے اس کا پانی پیا جیسا کہ اسے پینا چاہیئے۔" پھر اس شخص نے حضرت عبداللہ بن عباس سے دریافت کیا کہ "آب زمزم کیونکر پینا چاہیئے؟" آپ نے فرمایا "جب تم اسے پیو، تو کعبہ کی طرف رخ کر لو اور اللہ کا نام لو اور (پیتے وقت) بسم اللہ پڑھو اور تین مرتبہ سانس لو اور خوب سیر ہو کر پیو، جب فارغ ہو لو، تو الحمد للہ کہو، اس لیے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔" ہمارے اور منافقین کے درمیان علامت یہ ہے کہ وہ زمزم کا پانی خوب سیر ہو کر نہیں پیتے"۔ (بیہقی، ابن ماجہ)۔

۵۔ متمتع کے لئے طواف افاضہ کے بعد صفا و مروہ کے درمیان سعی ضروری ہے۔

پہلی مرتبہ مکہ معظمہ پہنچ کر متمتع صفاو مروہ کے درمیان جو سعی کرتا ہے، وہ اس کے لئے صرف عمرہ کی سعی ہوتی ہے۔ طواف افاضہ کے بعد اس کے لئے حج کی سعی کرنا ضروری ہے[1]

مفرد اور قارن اگر طواف القدوم کے بعد سعی کر چکے ہوں، تو انہیں طواف افاضہ کے بعد سعی کرنے کی ضرورت نہیں، ہاں اگر انہوں نے طواف القدوم کے بعد سعی نہ کی ہو، تو طواف افاضہ کے بعد اس کے لئے بھی سعی کرنا ضروری ہے۔

ا۔ یہ ائمہ اربعہ اور دوسرے اکثر ائمہ کا مسلک ہے۔ امام ابن تیمیہؒ اور ان کے اصحاب کے نزدیک متمتع کے لیے یہ دوسری سعی کرنا ضروری نہیں۔

ایامِ تشریق

(منیٰ میں دو یا تین دن قیام)

ا۔ حکم:

(ا) طواف افاضہ سے فارغ ہونے کے بعد منیٰ واپس جانا اور وہاں دو یا تین راتیں بسر کرنا اور ہر روز تینوں جمروں پر رمی کرنا واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۗ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۔ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۗ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ (البقرۃ : ۲۰۰-۲۰۳)

پھر جب تم اپنے حج کے مناسک ادا کر چکو، تو جس طرح پہلے اپنے آباؤ واجداد کا ذکر کیا کرتے تھے، اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اب اللہ کا ذکر کرو (مگر اللہ کا ذکر کرنے والوں میں بھی فرق ہے) ان میں سے کوئی تو ایسا ہے جو کہتا ہے کہ ہمارے رب! ہمیں دنیا ہی میں ہمارے مطلب کی چیزیں دیدے، ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور کوئی کہتا ہے کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی، اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ ایسے لوگ اپنی کمائی کے مطابق (دونوں جگہ) حصہ پائیں گے، اور اللہ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی۔ یہ گنتی کے چند دن ہیں، جو تمہیں اللہ کے ذکر میں بسر کرنے چاہئیں۔ پھر جو شخص جلدی کر کے دو ہی

دن میں واپس آگیا، تو کوئی ہرج نہیں اور جو شخص کچھ زیادہ ٹھہر کر (یعنی تین دن ٹھہر کر) واپس ہوا، تو بھی کوئی ہرج نہیں، بشر طیکہ اس نے یہ دن تقویٰ کے ساتھ بسر کئے ہوں-اللہ کی نافرمانی سے بچو اور جان لو کہ ایک روز تم اس کے حضور پیش کئے جاؤ گے-

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور جابرؓ کی حدیثیں پہلے گزر چکی ہیں کہ طواف افاضہ کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ واپس تشریف لے گئے-

منیٰ میں دو یا تین راتیں بسر کرنا اس لئے واجب ہے کہ یہ حج کے مناسک میں سے ہے اور جب تک عام رخصت ثابت نہ ہو، حج کا ہر عمل واجب ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے" خذوا عنی مناسککم "(مجھ سے اپنے حج کے مناسک سیکھ لو")[1]

(ب) البتہ جس شخص کو عذر ہو، وہ مکہ معظمہ یا کسی دوسری جگہ بھی یہ راتیں بسر کر سکتا ہے-

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت عباسؓ نے لوگوں کو زمزم کا پانی پلانے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ معظمہ میں (تشریق کی) راتیں بسر کرنے کی اجازت چاہی، تو آپؐ نے انہیں اجازت دیدی" (بخاری، مسلم، احمد

ا- یہ امام مالکؒ' شافعیؒ' ایک روایت میں امام احمدؒ (اور اہلحدیث علماء) کا مسلک ہے' البتہ ان کے درمیان اختلاف اس بارے میں ہے کہ جو شخص منیٰ میں کسی عذر کے بغیر تشریق کی راتیں بسر نہ کرے' اس کے ذمہ قربانی ہے کہ صدقہ- امام مالکؒ کے نزدیک ہر رات کے بدلے ایک قربانی واجب ہے- بعض مالکی علماء کے نزدیک ایک درہم یا ایک مسکین کو کھانا کھلانے کا صدقہ بھی ہو سکتا ہے امام شافعیؒ اور احمدؒ کے نزدیک جو شخص منیٰ میں کوئی بھی رات بسر نہ کرے' اس کے ذمہ ایک قربانی واجب ہے- اس مسلک کی بنیاد حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اس قول پر ہے "جو شخص اپنے مناسک میں سے کوئی چیز ترک کر دے' اسے چاہیے کہ قربانی دے-"

امام ابو حنیفہؒ اور ایک روایت میں امام احمدؒ کے نزدیک منیٰ میں تشریق کی راتیں بسر کرنا سنت ہے- یعنی اگر کوئی شخص منیٰ میں یہ راتیں نہ گزارے' تو وہ اگرچہ سنت ترک کرے گا' لیکن اس کے ذمہ کوئی قربانی ضروری نہ ہوگی- ان کے مسلک کی بنیاد بھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ایک دوسرے قول پر ہے اور وہ یہ کہ "جب تم جمرہ عقبہ پر رمی کر لو' تو جہاں چاہو' رات بسر کرو-" (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۲۲۰)-

وغیرہ)۔

حضرت عدیؓ بن حاتم سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹوں کے چرواہوں کو (منیٰ سے باہر) رات بسر کرنے کی اجازت دی جبکہ وہ قربانی کے دن (جمرہ عقبہ پر) رمی کر لیں، پھر اگلے دنوں میں دو دن کی رمی ایک دن کر لیں اور پھر جس دن منیٰ سے واپس جانا ہو، اسی دن رمی کر لیں" (مسلم، احمد، ابو داؤد ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مؤطا امام مالک، مسند امام شافعی، ابن حبان، حاکم)[1]

۲- تینوں جمروں پر رمی کا وقت

منیٰ میں قیام کے دوران ہر روز تینوں جمروں پر رمی کی جائے گی- اس رمی کا وقت زوالِ آفتاب کے بعد ہے- زوالِ آفتاب سے پہلے جو شخص رمی کرے گا، اس کی رمی شمار نہ ہو گی-

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سوال کیا گیا کہ (ایامِ تشریق میں) جمروں پر رمی کب کی جائے؟ آپؓ نے فرمایا "جب تمہارا امام رمی کرے، تب تم بھی رمی کرو" جب آپؓ سے یہی سوال دوبارہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا "ہم (یعنی صحابہ کرامؓ) انتظار میں رہا کرتے تھے- جب زوال آفتاب ہو جاتا، تو ہم رمی کرتے"-- (بخاری، احمد، ابو داؤد)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمروں پر زوال آفتاب کے وقت یا زوالِ آفتاب کے بعد رمی فرمائی (احمد، ابو داؤد، حاکم، بیہقی، ابن حبان)[2]

۱۔ یہ جمہور (جن میں امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ اور شافعیؒ شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ امام احمدؒ اور بعض شافعیؒ علماء کے نزدیک یہ رخصت صرف زمزم کا پانی پلانے والوں اور اونٹوں کے چرواہوں کے لیے خاص ہے (المغنی) (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۲۲۴)۔

۲۔ یہ جمہور (جن میں امام مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور عام محدثین شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا بھی یہی مسلک ہے، البتہ ان کے نزدیک آخری دن (جب کہ انسان کو منیٰ سے واپس ہونا ہو) زوال آفتاب سے پہلے بھی رمی کی جا سکتی ہے۔ امام اسحاقؒ کے نزدیک اگر انسان تین دن ٹھہرے، تو تیسرے دن اس کے لیے زوالِ آفتاب سے پہلے رمی کر لینے کی اجازت ہے۔ (الفتح الربانی ج ۲ ص ۲۲۱)۔

۳- تینوں جمروں پر رمی کے آداب :

امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ حدیث ملی ہے کہ نبی ﷺ نے پہلے جمرہ پر، جو مسجد (یعنی مسجد خیف) سے قریب ہے، رمی کرتے ہوئے- سات کنکریاں پھینکیں- ہر کنکری پھینکتے وقت آپؐ اللہ اکبر کہتے جاتے تھے- پھر آپؐ بائیں طرف پلٹے اور وادی کے درمیان کھڑے ہو گئے اور ہاتھ اٹھا کر اور قبلہ رخ ہو کر دعا فرماتے رہے- آپؐ کافی دیر کھڑے رہے- پھر آپؐ نے دوسرے جمرہ پر بھی سات کنکریاں پھینکیں- آپؐ ہر کنکری پھینکتے وقت اللہ اکبر کہتے جاتے تھے- پھر آپؐ بائیں طرف پلٹے اور وادی کے درمیان کھڑے ہو گئے اور ہاتھ اٹھا کر اور قبلہ رخ ہو کر دعا فرماتے رہے- آپؐ (یہاں بھی) کافی دیر تک کھڑے رہے- پھر آپؐ تیسرے جمرہ پر، جو عقبہ کے پاس ہے (یعنی جمرہ عقبہ پر) تشریف لائے- اس پر بھی آپؐ نے سات کنکریاں پھینکیں- آپؐ ہر کنکری پھینکتے وقت 'اللہ اکبر' کہتے جاتے تھے- پھر آپؐ پلٹے اور کھڑے نہ ہوئے" امام زہریؒ بیان کرتے ہیں کہ مجھے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بیٹے سالم نے بھی اپنے والد حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ذریعے نبی ﷺ کے متعلق اسی طرح کی حدیث بیان کی ہے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ خود بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے" (بخاری، مسلم، احمد، بیہقی)

ا- یہ امام مالکؒ' احمد بن حنبلؒ اور دوسرے اکثر ائمہ کا مسلک ہے- حسن بصریؒ' عطاء اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ ترتیب سنت ہے۔ یعنی اگر یہ الٹ جائے' تو بہتر ہے کہ انسان پھر سے رمی کرے۔ لیکن اگر نہ کر سکے' تو اس پر کوئی قربانی لازم نہیں ہے۔ ان کا استدلال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر ہے کہ "جس شخص نے حج کے کسی عمل سے پہلے دوسرا عمل (جو اسے بعد میں کرنا چاہیے تھا) کر لیا تو کوئی حرج نہیں۔" اور یہ کہ یہ ایک دوسرے کے بعد آنے والے مناسک ہیں جو الگ الگ جگہوں پر کیے جاتے ہیں' لہذا ان میں ترتیب ضروری نہیں' جیسا کہ رمی اور قربانی کے درمیان ترتیب ضروری نہیں۔

پہلے مسلک والوں کے نزدیک اس حدیث سے ترتیب کے ضروری نہ ہونے پر استدلال اس وقت تو صحیح ہے جب حج کے کسی ایک کام کو دوسرے کام سے پہلے کر لیا جائے۔ لیکن یہ استدلال اس صورت میں صحیح نہیں ہے جبکہ ایک ہی کام کے مختلف حصوں کو آگے پیچھے کر لیا جائے' جیسا کہ ان اعمال کی ترتیب نہیں بدلی جا سکتی جو طواف یا سعی میں کیے جاتے ہیں۔ (المغنی ج ۳ ص ۴۷۷)۔

اس حدیث کی رو سے

۱۔ان دو یا تین دنوں میں ہر روز پہلے جمرہ اولیٰ (جو مسجد خیف سے قریب ہے) پر، پھر جمرہ ثانیہ پر اور پھر جمرہ عقبہ پر رمی کرنا، یہ ترتیب واجب ہے۔ یعنی اگر یہ ترتیب الٹ جائے، تو ایک جانور کی قربانی ضروری ہے[1]

۲۔ پہلے دو جمروں پر کنکریاں پھینکتے وقت 'اللہ اکبر' کہنا اور پھر ایک طرف کھڑے ہو کر قبلہ رخ ہونا اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا مسنون ہے[1] آخری جمرۂ عقبہ پر کنکریاں پھینکتے وقت 'اللہ اکبر' کہنا تو مسنون ہے، لیکن اس کے بعد کھڑے ہو کر دعا کرنا مسنون نہیں ہے[2]

۴۔ منیٰ سے واپسی:

جو شخص چاہے منیٰ میں دو راتیں قیام کر کے ۱۲ ذی الحجہ کو منیٰ سے لوٹ جائے اور جو شخص چاہے ایک رات اور قیام کر کے ۱۳ کو لوٹے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ۔ (البقرہ: ۲۰۳)

پھر جو شخص جلدی کر کے دو ہی دن میں واپس آگیا تو کوئی ہرج نہیں، اور جو شخص کچھ دیر زیادہ ٹھہر کر واپس ہوا، تو کوئی ہرج نہیں۔

اس بارے میں ائمہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں[3] (المغنی ج ۳ ص ۴۷۹)

۱۔ امام مالکؒ کے نزدیک دعا کرتے وقت ہاتھ اٹھانا صحیح نہیں۔ اس بارے میں امام ملکؒ کا استدلال وہی ہے جو ان کا کعبہ کو دیکھ کر ہاتھ نہ اٹھانے پر ہے۔ (المغنی ج ۳ ص ۴۷۵)۔

۲۔ دوسرے تمام ائمہ کے نزدیک یہ کام سنت ہیں۔ امام سفیان ثوریؒ کے نزدیک یہ واجب ہیں، یعنی اگر رہ جائیں تو قربانی ضروری ہے۔ (المغنی ایضا)۔

۳۔ البتہ امام مالکؒ کے نزدیک مکہ والوں کے لیے (جب تک انہیں معذوری نہ ہو) اور امام احمدؒ اور اسحاقؒ کے نزدیک ہر اس شخص کے لیے جو منیٰ سے واپسی کے بعد مکہ میں قیام کا ارادہ رکھتا ہو یہ مستحب ہے کہ وہ ۱۲ کے بجائے ۱۳ ہی کو واپس جائے کیونکہ حضرت عمرؓ مکہ والوں کو اس کا حکم دیا کرتے تھے۔ (المغنی ج ۳ ص ۴۷۹)۔

۴۔ یہ جمہور (جن میں امام مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور عام محدثین شامل ہیں) کا مسلک ہے

لیکن جو شخص ۱۲ کو لوٹنا چاہے، اسے چاہیے کہ غروب آفتاب سے پہلے پہلے لوٹ آئے۔ اگر وہ غروبِ آفتاب تک نہیں لوٹے گا تو اسے چاہیئے کہ ٹھہر جائے اور اگلے روز ۱۳ کو لوٹے کیونکہ غروبِ آفتاب کے بعد اگلی تاریخ شروع ہو جاتی ہے اور کسی دن زوالِ آفتاب سے پہلے لوٹنا جائز نہیں ہے[1]

۵- منیٰ سے واپسی کے بعد وادیٔ مُحَصَّب (مکہ معظّمہ) میں قیام :

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ ﷺ نے قربانی کے دن سے اگلے دن منیٰ میں فرمایا "ہم کل (مکہ معظمہ لوٹ کر) بنو کنانہ کی وادیٔ محصب میں، جہاں بنو کنانہ اور قریش نے بنو ہاشم کے بائیکاٹ پر ایک دوسرے سے معاہدہ کیا تھا، قیام کریں گے" (بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ)۔

اس اور بعض دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ منیٰ سے واپسی کے بعد نبی علیہ ﷺ نے وادیٔ مُحَصَّب میں قیام فرمایا تھا اور یہاں سے آپؐ مدینہ منورہ کے لئے واپس ہوئے تھے۔ نبی علیہ ﷺ کی اقتداء میں خلفائے راشدین اور دوسرے اکثر صحابۂ کرامؓ بھی یہاں قیام کیا کرتے تھے، لہذا یہاں قیام کرنا مسنون ہے[1]

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جب تک ۱۳ کی صبح طلوع نہ ہو، ایسا شخص منیٰ سے لوٹ سکتا ہے۔ کیونکہ صبح ہونے تک وہ "اگلے دن" میں داخل نہیں ہوا (اگرچہ اگلی تاریخ میں داخل ہو گیا)۔ (المغنی ج ۳ ص ۴۷۹)۔

۱۔ یہ جمہور (جن میں ائمہ اربعہ شامل ہیں) کا مسلک ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ وادیٔ مُحَصَّب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میری وجہ سے قیام کیا تھا تاکہ میں اپنے عمرہ سے فارغ ہو جاؤں، نہ کہ اس وجہ سے کہ یہاں قیام کرنا حج کے مناسک میں شامل ہے۔ سلف میں بہت سے ائمہ کی یہی رائے ہے (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۲۳۱)۔

طوافِ وداع

ا- طوافِ وداع کی تعریف اور حکم:

طوافِ وداع سے مراد وہ الوداعی طواف ہے، جسے حاجی مکہ معظمہ سے واپسی کے وقت کرتا ہے- یہ طواف واجب ہے، یعنی اگر کوئی شخص یہ طواف نہیں کرے گا، تو اس کے ذمہ ایک جانور کی قربانی ضروری ہو گی-

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ (حج سے فارغ ہونے کے بعد لوگ جس طرف جانا چاہتے، چلے جاتے- نبی علیہ ﷺ نے فرمایا "کوئی شخص اس وقت تک نہ لوٹے، جب تک وہ آخری مرتبہ خانہ کعبہ کا طواف نہ کر لے"(مسلم، احمد ابو داؤد، ابن ماجہ، بیہقی)

لیکن عورت کو اجازت ہے کہ اگر وہ حیض کی حالت میں ہے تو طوافِ وداع کئے بغیر مکہ معظمہ سے واپس ہو جائے، بغیر اس کے کہ اس کے ذمہ قربانی ضروری ہو-

حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے حائضہ کو اجازت دی ہے کہ اگر اس نے طواف افاضہ کر لیا ہو، تو وہ (طواف وداع کئے بغیر) روانہ ہو جائے- (بخاری، بیہقی) [1]

---

[1] یہ جمہور صحابہؓ و ائمہ (جن میں امام ابو حنیفہؒ، شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ شامل ہیں) کا مسلک ہے اور یہی مسلک اہلحدیث علماء کا بھی ہے۔ قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں۔ "طواف وداع کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم، اس کے ترک کرنے سے ممانعت اور آپؐ کے عمل سے تینوں چیزیں ثابت ہیں، لہذا یہ واجب ہی ہے۔"

صحابہ میں سے حضرت عمرؓ اور عبداللہ بن عمرؓ طواف وداع کو حائضہ کے لیے بھی ضروری قرار دیتے تھے۔ بعد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو جب رخصت کی حدیث مل گئی، تو ان کا مسلک بھی وہی ہو گیا، جو عام صحابہؓ کا تھا۔ حضرت عمرؓ کو غالباً یہ حدیث نہیں ملی۔

امام مالکؒ اور داؤد ظاہریؒ کے نزدیک طواف وداع سنت ہے۔ (غالباً ان کا استدلال یہ ہے کہ اگر یہ واجب ہوتا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم حائضہ کو اسے کیے بغیر مکہ معظمہ سے واپس ہو جانے کی اجازت نہ دیتے)۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۲۳۶)۔

۲- طوافِ وداع کے بعد ملتزم[1] پر آنا اور دعا کرنا مستحب ہے:

حضرت عبدالرحمٰن بن صفوانؓ سے روایت ہے کہ "میں نے نبی ﷺ کو خانہ کعبہ کے دروازے اور حجر اسود کے درمیان کعبہ کی دیوار سے چمٹے ہوئے دیکھا اور میں نے لوگوں کو (یعنی صحابۂ کرامؓ کو) بھی نبی ﷺ کے ساتھ خانہ کعبہ کی دیوار سے چمٹے ہوئے دیکھا" (احمد، ابو داؤد)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ اپنے بیٹے کے ساتھ طواف کر رہے تھے۔ ان کے بیٹے نے عرض کیا "کیا آپ اللہ کے ذریعے پناہ نہیں مانگیں گے؟" حضرت عبداللہؓ نے جواب دیا "ہم اللہ کے ذریعے آگ سے پناہ مانگتے ہیں۔ پھر آپ نے آگے بڑھ کر حجر اسود کا استلام کیا اور پھر حجر اسود اور خانہ کعبہ کے دروازے کے درمیان کھڑے ہو گئے۔ آپ نے اپنا سینہ، چہرہ اور ہتھیلیاں دیوار پر رکھیں اور انہیں خوب پھیلایا اور پھر کہنے لگے "میں نے اسی طرح نبی ﷺ کو بھی کرتے دیکھا" (ابو داؤد، ابن ماجہ، بیہقی)

ان روایات کی سند اگرچہ کمزور ہے، لیکن امام نوویؒ ان کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں "تمام ائمہ کا ایسی کمزور احادیث کے متعلق نرمی برتنے پر اتفاق ہے، جن میں اعمال کی فضیلت بیان کی گئی ہو اور جن کا تعلق احکام سے نہ ہو"۔ (الفتح الربانی ج ۱۲ ص ۲۳۶)

فائدہ: (۱) حدیث اور فقہ کی اکثر کتابوں میں ملتزم پر آنے اور دعا کرنے کا ذکر طواف الوداع کے بعد ہی کیا گیا ہے، اس لئے ہم نے بھی اسے یہیں نقل کیا ہے، لیکن ملتزم پر آنا اور دعا کرنا دوسرے تمام وقتوں میں بھی مستحب ہے۔ امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں ملتزم پر خواہ مکہ معظمہ سے رخصت ہوتے وقت آیا جائے یا کسی اور وقت، اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ صحابۂ کرامؓ جب مکہ معظمہ آتے، تو ایسا کیا کرتے تھے (یعنی تمام اوقات میں ملتزم پر آکر دعا کیا کرتے تھے) (مناسک حج، وعمرہ از امام ابن تیمیہ ص ۳۲)

(۲) مکہ معظمہ سے رخصت ہوتے وقت کسی متعین دعا کا کرنا ضروری نہیں ہے؟ البتہ انسان چاہے تو یہ دعا کر سکتا ہے، جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ثابت ہے (ابن تیمیہؒ):

---

[1] ملتزم کے لفظی معنی "چمٹنے کی جگہ" کے ہیں۔ اس سے مراد خانہ کعبہ کے دروازے اور حجر اسود کے درمیان خانہ کعبہ کی دیوار ہے' جیسا کہ آگے حدیث میں اس کا ذکر آرہا ہے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُکَ وَابْنُ عَبْدِکَ وَابْنُ اَمَتِکَ حَمَلْتَنِیْ عَلٰی مَا سَخَّرْتَ لِیْ مِنْ خَلْقِکَ وَیَسَّرْتَنِیْ فِیْ بِلَادِکَ حَتّٰی بَلَّغْتَنِیْ بِنِعْمَتِکَ اِلٰی بَیْتِکَ وَ اَعَنْتَنِیْ عَلٰی اَدَاءِ نُسُکِیْ" فَاِنْ کُنْتَ رَضِیْتَ عَنِّیْ فَازْدَدْ عَنِّیْ رِضًا" وَاِلَّا فَمِنَ الْآنَ ارْضَ عَنِّیْ قَبْلَ اَنْ تَنَایٰ عَنْ بَیْتِکَ۔۔۔ دَارِیْ۔ فَھٰذَا اَوَانُ انْصِرَافِیْ" اِنْ اَذِنْتَ لِیْ غَیْرَ مُسْتَبْدِلٍ بِکَ وَلَا بِبَیْتِکَ وَلَا رَاغِبًا عَنْکَ وَلَا عَنْ بَیْتِکَ" اَللّٰھُمَّ فَاَصْحِبْنِیْ الْعَافِیَةَ فِیْ بَدَنِیْ وَ الصِّحَّةَ فِیْ جِسْمِیْ وَا لْعِصْمَةَ فِیْ دِیْنِیْ وَاَحْسِنْ مُنْقَلَبِیْ وَارْزُقْنِیْ طَاعَتَکَ مَا اَبْقَیْتَنِیْ وَاجْمَعْ لِیْ بَیْنَ خَیْرَیِ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ" اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ O

اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں، تیرے بندے اور تیری بندی کا بیٹا ہوں۔ اپنی مخلوق میں سے جس جانور کو مسخر کیا، اس کے ذریعے تو مجھے اپنے گھر تک لے آیا۔ تو نے میرے لیے اپنی زمین میں (سفر کی) آسانی پیدا کی یہاں تک کہ تو نے مجھے اپنے گھر تک پہنچادیا اور حج کے مناسک کی ادائیگی میں تو نے میری مدد فرمائی۔ اگر تو مجھ سے راضی تھا تو اب اور زیادہ راضی ہو جا اور اگر راضی نہیں تھا تو اب راضی ہو جا قبل اس کے کہ میں تیرے گھر سے دور چلا جاؤں۔ اب میری واپسی کا وقت ہے، اگر تو مجھے اجازت دے۔ میں اس حال میں پلٹ رہا ہوں کہ میں نہ تیرے سوا کسی کو اپنا معبود اور نہ تیرے گھر کے سوا کسی کو اپنا آستانہ بناؤں گا۔ اے اللہ! تو میرے بدن میں عافیت و صحت اور دین میں عصمت عطا فرما۔ میرے پلٹنے میں خیر دے اور جب تک تو مجھے زندہ رکھے مجھے اپنی اطاعت کی توفیق دے اور میرے لئے دنیا و آخرت کی بھلائیاں جمع کر دے۔۔ بیشک تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

مکہ معظّمہ کی حرمت اور اس کے آداب

مکہ معظمہ امن، برکت اور حرمت والا شہر ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَّا اجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَعْبُدَ الْاَصْنَامَ۔ (ابراهيم:۳۵)۔

اور وہ وقت یاد کرو جب ابراہیم نے دعا کی تھی کہ اے میرے رب! تو اس شہر کو امن و سلامتی والا بنادے اور مجھے میری اولاد کو بتوں کی عبادت کرنے سے دور رکھ۔

دوسری آیت میں ہے :

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا آمِنًا يُّجْبٰى اِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْئٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

کیا ہم نے ان کو حرمت و امن والے شہر میں جگہ نہیں دی؟ کہ اس کی طرف ہر قسم کے میوے کھچے آتے ہیں، جو ہماری طرف سے رزق ہے، لیکن ان میں سے بہت سے لوگ علم نہیں رکھتے۔

تیسری آیت میں ہے :

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ۔ (العنكبوت : ۶۷)۔

کیا انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لئے (مکہ معظّمہ) کو حرمت اور امن والا شہر بنا دیا، حالانکہ ان کے ارد گرد (دوسری جگہوں میں) لوگ اچک لئے جاتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فتح مکہ کے روز (خطبہ دیتے ہوئے) فرمایا۔"اللہ تعالیٰ نے جب سے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے اس نے اس شہر کو حرمت والا شہر قرار دیا ہے۔لہذا یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حرمت کے تحت قیامت تک حرمت والا شہر ہے۔مجھ سے پہلے کسی انسان کے لئے اس میں جنگ کرنا جائز قرار نہیں دیا گیا، اور میرے لئے بھی اس میں ایک گھڑی کی گھڑی جنگ کرنا جائز قرار دیا گیا۔لہذا یہ اللہ تعالیٰ کی

مقرر کردہ حرمت کے تحت حرمت والا شہر ہے۔ نہ اس میں اگے ہوئے درخت کو توڑا جائے گا، نہ اس کی سبز و تازہ پیداوار کو کاٹا جائے گا۔ نہ اس میں کسی شکار کو ڈرایا اور اس کا پیچھا کیا جائے اور نہ اس میں کوئی گری ہوئی چیز اٹھائی جائے گی، سوائے اس شخص کے جو اس گری ہوئی چیز کو اٹھا کر اس کا اعلان کرے" حضرت عباسؓ نے عرض کیا لیکن اے اللہ کے رسولؐ! اذخر [1] (کے کاٹنے کی اجازت دے دیجیے) کیونکہ یہ ہمارے چولھوں، گھروں اور چھتوں کے کام آتی ہے" حضورؐ نے فرمایا "ہاں اذخر (کے کاٹنے کی اجازت ہے)" (بخاری و مسلم وغیرہ)

اس حدیث کی رو سے:

۱۔ اس پر اجماع ہے کہ حرم مکہ کے حدود میں کسی جانور کا شکار کرنا یا شکار کو ڈرانا اور اس کا پیچھا کرنا ہر شخص کے لئے ناجائز ہے، خواہ وہ احرام کی حالت میں ہو یا نہ ہو (المغنی ج ۳ ص ۳۵۸)

جمہور ائمہ کے نزدیک جو شخص حرم کی حدود کے اندر کسی جانور کا شکار کرے۔ اس کے ذمہ وہی فدیہ ہے، جو احرام کی حالت میں اس جانور کا شکار کرنے کی صورت میں اس پر عائد ہو سکتا ہے۔ بہت سے صحابہؓ کرام کے فتاویٰ اسی کے مطابق ہیں، اور جن صحابہ کرام سے اس بارے میں کوئی فتویٰ ثابت نہیں ہے، ان سے اس کی مخالفت بھی ثابت نہیں ہے۔

عطاء بیان کرتے ہیں کہ قریش کے ایک لڑکے نے مکہ معظمہ کے کبوتروں میں سے ایک کبوتر مار ڈالا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فتویٰ دیا کہ اس کے ذمہ ایک بکری کا فدیہ ہے (مسند امام شافعیؒ) اسی طرح کے فتاویٰ حضرت عمرؓ، علیؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عثمانؓ سے بھی ثابت ہیں (نیل الاوطار) [2]

۱۔ ایک قسم کی سوکھی گھاس جو مکہ معظمہ کی سرزمین پر پیدا ہوتی ہے۔

۲۔ اس بارے میں صرف ظاہریہ کا اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک حرم کے حدود میں شکار کر لینے پر (گناہ تو ہوگا مگر) کوئی فدیہ نہیں ہوگا۔ (جبکہ انسان احرام کی حالت میں نہ ہو) کیونکہ قرآن و حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ (المغنی ایضاً)۔

اس بارے میں ائمہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حرم کے حدود میں جوں کا مارنا جائز ہے (المغنی ایضا)۔

۲۔ اس پر بھی اجماع ہے کہ حرم کے حدود میں ہر اس درخت کا توڑنا اور کاٹنا جائز ہے' جو قدرتی طور پر خود اگا ہو۔ البتہ اذخر' سبزیاں اور ترکاریاں اور پھول جنھیں انسان اپنی محنت سے اگائے' انھیں کاٹنا اور توڑنا جائز ہے۔ (المغنی ج ۳ ص ۳۶۴)۔

جمہور ائمہ کے نزدیک ایسے درخت کا توڑنا اور کاٹنا بھی جائز ہے' جسے انسان نے اگایا ہو[1]

اس بارے میں مختلف ائمہ کی رائے مختلف ہے کہ اگر کوئی شخص حرم کے اندر کسی درخت کو کاٹ لے' تو اس کے ذمہ فدیہ ہے کہ نہیں اور اگر ہے تو کتنا؟[2]

۳۔ جو شخص باہر سے آئے' اس کے لیے حرم کی حدود میں احرام کے بغیر داخل ہونا جائز ہے' خواہ اس کا ارادہ حج یا عمرہ کا ہو یا نہ ہو[3] البتہ بعض استثنائی صورتوں میں احرام

۱۔ امام شافعیؒ کے نزدیک ایسے درخت کا کاٹنا بھی ناجائز ہے۔ البتہ اس سے مسواک کاٹی جا سکتی ہے۔ اسی مسلک کو حلبیہ میں سے امام ابن قدامہؒ نے بھی صحیح قرار دیا ہے۔ (نیل الاوطار ج ۵ ص ۲۶)۔

۲۔ امام مالکؒ' ابو ثورؒ اور داؤد ظاہریؒ کے نزدیک ایسا شخص گناہ گار تو ہو گا' مگر اس کے ذمہ کوئی فدیہ نہیں ہو گا۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ وہ اس درخت کی قیمت کے مطابق قربانی دے گا۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک اگر اس نے کوئی بڑا درخت کاٹا ہے تو ایک گائے کی قربانی دے گا اور اگر کوئی چھوٹا درخت کاٹا ہے' تو ایک بکری کی قربانی دے گا۔ (المغنی ج ۳ ص ۳۵۷)(نیل الاوطار ج ۵ ص ۲۷)۔

۳۔ علامہ ابن عبدالبرؒ نے اکثر صحابہؓ اور تابعینؒ کا یہی مسلک قرار دیا ہے۔ (فتح الباری) ائمہ میں سے امام ابو حنیفہؒ' آپ کے اصحابؒ اور سفیان ثوریؒ کا یہی مسلک ہے۔ صحیح اور مشہور روایت میں امام مالکؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔

امام زہریؒ' حسن بصریؒ' داؤد ظاہریؒ' امام بخاریؒ اور ایک روایت میں امام مالکؒ کے نزدیک جو شخص حج یا عمرہ کا ارادہ نہ رکھتا ہو' اس کے لیے حرم میں داخل ہونے کے لیے احرام ضروری نہیں ہے۔ صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بھی یہی مسلک تھا۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ حدیث میں احرام کے ساتھ مکہ معظمہ میں داخل ہونا صرف اس شخص کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے جو حج یا عمرہ کا ارادہ رکھتا ہو۔ نیز فتح مکہ

کے بغیر بھی داخل ہوا جا سکتا ہے۔ [1]

نوٹ: مختلف سمتوں میں حرم مکی کے حدود جہاں سے شروع ہوتے ہیں، وہاں علامت کے طور پر سفید رنگ کے ستون بنے ہوئے ہیں۔ شمال کی سمت میں حرم کی حد تنعیم سے شروع ہوتی ہے جو مکہ معظمہ سے ۴ میل کے قریب واقع ہے۔ مشرق کی سمت میں یہ حد جعرانہ سے شروع ہوتی ہے، جو مکہ معظمہ سے تقریباً دس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ شمال مشرقی سمت میں یہ حد وادی نخلہ سے شروع ہوتی ہے، جو مکہ معظمہ سے تقریباً ۹ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ مغرب کی سمت میں یہ حد شمیسی (ایک بستی جس کا قدیم نام حدیبیہ تھا اور جو اس سڑک پر واقع ہے جو جدہ سے مکہ معظمہ کو جاتی ہے) سے شروع ہوتی ہے اور مکہ

کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ احرام کے بغیر مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تھے۔ حنفیہ اور دوسرے جن کے نزدیک حرم میں داخلہ کے لیے احرام ضروری ہے، اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ فتح مکہ کے روز جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ احرام کے بغیر مکہ میں داخل ہوئے، تو اس وقت عارضی طور پر مکہ معظمہ کی حرمت باقی نہ رکھی گئی تھی، لیکن بعد میں یہ حرمت قیامت تک قائم کر دی گئی لہٰذا اس سے حرم میں احرام کے بغیر داخل ہونے پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔

امام شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ سے اس بارے میں دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت میں ان کا مسلک یہی ہے کہ جو شخص حج یا عمرہ کا ارادہ رکھتا ہو اس کے لیے حرم میں احرام کے بغیر داخل ہونا جائز نہیں ہے۔ دوسری روایت میں ان کے نزدیک حرم میں بغیر احرام کے بھی داخل ہوا جا سکتا ہے۔ امام نوویؒ نے اسی کو شافعیہ کا 'اصح' (زیادہ صحیح) مسلک قرار دیا ہے۔ حنبلیہ میں سے ابن قدامہؒ کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے۔ (المغنی ج ۳ ص ۲۱۷) (الفتح الربانی ج ۱۱ ص ۱۱۳)۔ (عمدۃ القاری ج ۹ ص ۲۲۴) وغیرہ۔

[1] امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جو شخص میقات کے اندر سے آئے، اس کے لیے حرم میں احرام کے بغیر داخلہ جائز ہے۔

امام مالکؒ، شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ کے نزدیک (جبکہ ان کا مسلک یہ قرار دیا جائے کہ حرم میں داخلہ کے لیے احرام ضروری ہے) جس شخص کو بار بار آنے کی ضرورت ہو (جیسے چرواہے اور ڈرائیور وغیرہ) اس کے لیے حرم میں احرام کے بغیر داخلہ جائز ہے۔ (ھدایہ ج ۱ ص ۹۹) (المغنی ایضاً) (بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۲۵۹)۔

معظمہ سے تقریباً ۸ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ حرم مکی کے حدود کے بارے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔

مدینہ منورہ کی حرمت اور اس کے آداب

مکہ معظمہ کی طرح مدینہ منورہ بھی حرمت اور برکت والا شہر ہے اور اس میں بھی کسی جانور کا شکار کرنا یا کسی خودرو درخت کو توڑنا اور کاٹنا اسی طرح ناجائز ہے جس طرح مکہ معظمہ میں۔ البتہ اونٹوں اور دوسرے جانوروں کو چارہ ڈالنے کے لیے بقدر ضرورت درخت کے پتے توڑے جا سکتے ہیں۔ جو شخص بلا ضرورت مدینہ منورہ میں کسی جانور کا شکار کرے گا یا درخت کو توڑے یا کاٹے گا' وہ گناہ گار ہوگا' اگرچہ اس کے ذمہ فدیہ ضروری نہ ہوگا۔

حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "(حضرت ابراہیمؑ نے مکہ کو حرمت والا شہر قرار دیا اور میں مدینہ کے دونوں حروں [1] کے درمیانی فاصلہ کو حرمت والا علاقہ قرار دیتا ہوں۔ نہ اس کے درخت کو کاٹا جائے گا اور نہ اس میں کسی جانور کا شکار کیا جائے گا۔" (مسلم)۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "عیر اور ثور [2] کے درمیان مدینہ حرمت والا شہر ہے۔" (بخاری و مسلم)۔

حضرت علیؓ ہی سے دوسری روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے متعلق فرمایا کہ "نہ اس کا سبز و تازہ درخت توڑا جائے گا۔ نہ اس کے شکار کو ڈرایا اور اس کا پیچھا کیا جائے گا اور نہ اس میں گری ہوئی چیز اٹھائی جائے گی' ہاں اس شخص کے لیے اس کا اٹھانا جائز ہے جو اس کا اعلان کرے' اس میں کسی شخص کے لیے لڑنے کے لیے ہتھیار اٹھانا بھی صحیح نہیں ہے اور نہ اس کے کسی درخت کو کاٹنا صحیح ہے' اِلاّ یہ کہ انسان اپنے اونٹ کو چارہ ڈالے۔" (احمد' ابوداؤد)۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے دونوں

1۔ حَرّہ سے مراد جلے ہوئے سیاہ رنگ کے پتھروں کی زمین ہے۔ مدینہ منورہ کے گرد دو حرّے ہیں۔ ایک مشرق میں جسے حَرّہ "واقم" کہا جاتا ہے اور دوسرا مغرب میں جسے حَرّہ وبرہ کہا جاتا ہے۔

2۔ مدینہ منورہ کے دو پہاڑوں کے نام جن میں سے پہلا جنوب کی سمت میں اور دوسرا شمال کی سمت میں واقع ہے۔

حرّوں کے درمیانی علاقہ کو حرمت والا علاقہ قرار دیا ہے اور مدینہ کے گرد بارہ میل کے علاقہ کو حمیٰ (ممنوعہ علاقہ جس میں نہ کوئی درخت کاٹا جا سکتا ہے اور نہ کسی جانور کا شکار کیا جا سکتا ہے) قرار دیا ہے۔" (بخاری و مسلم)[1]

۱۔ یہ اکثر ائمہ جن میں امام مالکؒ' شافعیؒ' احمد بن حنبلؒ' اسحاق' ظاہریہ اور عام محدثین شامل ہیں کا مسلک ہے۔

امام ابو حنیفہؒ' سفیان ثوریؒ اور عبداللہ بن مبارکؒ کے نزدیک' مدینہ منورہ اس معنی میں حرم نہیں ہے کہ اس میں شکار کرنا یا کسی درخت کا کاٹنا ناجائز ہو۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مذکورہ بالا حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں شکار کرنے اور درختوں کو کاٹنے سے اس لیے منع فرمایا ہے کہ مدینہ منورہ کی زینت قائم رہے اور جو مہاجرین وہاں پہنچے تھے' وہ درختوں کے سائے میں آرام حاصل کر سکیں' جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے آطام یعنی پرانے قلعوں کو ڈھانے سے اسی لیے منع فرمایا۔ (بروایت بزار)۔ اس مسلک کی دلیل امام طحاویؒ یہ دیتے ہیں کہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابو طلحہؓ کا ایک چھوٹا بچہ تھا' جسے ابو عمیر کہتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس بچے کو بہلایا کرتے تھے۔ اس بچے کے پاس ایک مولا (چڑیا کی طرح کا ایک چھوٹا جانور) ہوتا تھا (جسے انہوں نے قید کر رکھا تھا) ایک دن حضورؐ تشریف لائے تو ابو عمیر کو بہت غمگین پایا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا "ابو عمیر کو کیا ہوا ہے؟" لوگوں نے بتایا کہ ان کا مولا مر گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "یا ابا عمیر مافعل النغیر؟ (اے ابو عمیر! تمہارے مولے کو کیا ہوا؟)" (مسلم' نسائی' بزار وغیرہ) اس سے معلوم ہوا کہ مدینہ میں جانور کو قید کیا جا سکتا ہے لہٰذا مدینہ منورہ اس معنی میں حرم نہیں ہے' جس معنی میں مکہ معظمہ ہے۔

پہلے مسلک والے حضرت انسؓ کی اس حدیث کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ابو عمیر کا مولے کو قید رکھنا اس وقت کا واقعہ ہے' جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی مدینہ منورہ کو حرم قرار نہیں دیا تھا۔ (نیل الاوطار ج ۵ ص ۳۴) (عمدۃ القاری ج ۱۰ ص ۲۲۹۔۲۳۰)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد اور قبر شریف کی زیارت کا حکم اور آداب

ہر مسلمان کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کی زیارت کرنے کی نیت سے مدینہ منورہ کا سفر کرنا مشروع اور مستحب ہے۔ کیونکہ ایک تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں قبروں کی زیارت کو مستحب قرار دیا ہے اور آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو اس کی بار بار ترغیب دلائی ہے۔ (اس بارے میں جو احادیث ثابت ہیں' ان کے لیے دیکھیے کتاب الجنائز حصہ اول' جن میں بدرجہ اولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف بھی شامل ہے۔ پھر متعدد دوسری احادیث میں خاص طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قبر شریف کی زیارت کو مستحب قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو اس کی ترغیب دلائی ہے۔ مثلاً :

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس شخص نے میری وفات کے بعد میری زیارت کی' گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔" (دار قطنی)

تقریباً ان ہی الفاظ کی احادیث امام طبرانیؒ وغیرہ نے حضرت عائشہؓ اور عبداللہ بن عباسؓ سے بھی روایت کی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک دوسری روایت میں بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے میری قبر کی زیارت کی' اس کے لیے میری شفاعت واجب ہو گئی۔" (دار قطنی)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی سے ایک اور روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے حج کیا اور میری زیارت نہیں کی' اس نے میرے ساتھ جفا کی۔" (دار قطنی' ابن عدی' ابن حبان)۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے ثواب کی نیت سے مدینہ میں میری زیارت کی' قیامت کے روز میں اس کے شفاعت کرنے اور گواہی دینے والا ہوں گا۔" (ابن ابی الدنیا)

اسی طرح کی ایک روایت امام ابوداؤد طیالسیؒ نے حضرت عمرؓ سے بھی نقل کی ہے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں "جس شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت

کی وہ آپؐ کے جوار (پڑوس) میں ہوگا۔" (ابن عساکر)

یہ تمام روایات اگرچہ سند کے لحاظ سے ضعیف ہیں' لیکن ان کی کثرت تعداد کو دیکھتے ہوئے ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کی زیارت کے مستحب ہونے پر استدلال کیا جاسکتا ہے [1]

---

[1] یہ جمہور (جن میں مالکیہ' شافعیہ' حنبلیہ اور عام محدثین شامل ہیں) کا مسلک ہے۔ ظاہریہ اور بعض مالکی علماء کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کی زیارت واجب ہے۔ حنفیہ کے نزدیک واجب سے کم لیکن مستحب سے زیادہ ہے۔ اس اختلاف کی وجہ یہ اختلاف ہے کہ اوپر کی یہ احادیث کس حد تک قابل حجت ہیں۔

امام ابن تیمیہؒ اور بعض حنبلی علماء کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت کے ارادے سے مدینہ منورہ کا سفر کرنا صحیح نہیں ہے۔ ہاں اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے ساتھ مسجد کی زیارت کا بھی ارادہ کیا جائے' تو یہ صحیح ہے۔ ان کے نزدیک اوپر کی تمام احادیث ناقابل حجت ہیں۔ اس کے برعکس ان کا استدلال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دو احادیث سے ہے:

(۱) رخت سفر صرف تین مسجدوں کی زیارت کے لیے باندھا جائے گا۔ ایک مسجد حرام' دوسری میری یہ مسجد اور تیسری مسجد اقصیٰ۔

(۲) میری قبر کو عید نہ بناؤ (ابو داؤد)۔

یہ دونوں احادیث سند کے لحاظ سے صحیح ہیں۔ لیکن جمہور کے نزدیک ان میں سے پہلی حدیث میں رخت سفر باندھنے کو جو صرف تین مسجدوں کی زیارت کے لیے محدود قرار دیا گیا ہے۔ وہ مطلق اور حقیقی معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ مسجدوں کے اعتبار سے اضافی معنی میں ہے۔ یعنی ان تین مسجدوں کے علاوہ کوئی اور مسجد ایسی نہ ہونی چاہیے جس میں خاص طور پر نماز پڑھنے کے لیے رخت سفر باندھا جائے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ "ان مسجدوں میں نماز" کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے سفر کیا ہی نہ جائے۔ کیونکہ تجارت اور دوسرے مقاصد کے لیے آخر لوگ سفر کرتے ہی ہیں اور ایسا کرنا کسی کے نزدیک بھی ناجائز نہیں ہے۔ رہی دوسری حدیث تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کو اعتکاف کرنے اور اس کے قریب خاص طور نماز پڑھنے کی جگہ نہ بنایا جائے اور نہ کوئی ایسا دن متعین کیا جائے جس میں تمام لوگ حضورؐ کی قبر شریف پر جمع ہوا کریں جیسا کہ نصاریٰ نے اپنے انبیاء کی قبروں کو یہ حیثیت دے لی تھی (مختصراً از نیل الاوطار و الفتح الربانی ج ۱۳ ص ۷ ا۔۲۱)۔

مسجد نبوی میں داخلہ کے وہی آداب ہیں جو دوسری مسجدوں کے ہیں۔(دیکھئے حصہ اول صفحہ ۱۸۲)
تحیۃ المسجد کی دو رکعتوں کا منبر اور قبر شریف (جسے روضہ مبارک کہا جاتا ہے)
کے درمیان پڑھنا زیادہ مستحب ہے۔ تحیۃ المسجد کی دو رکعتوں سے فارغ ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف پر آنا اور "السلام علیک یا رسول اللہ" کے الفاظ کے ساتھ سلام کہنا مستحب ہے۔ پھر دائیں طرف ہٹ کر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور پھر کچھ اور ہٹ کر حضرت عمرؓ کو سلام کہنا مستحب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کو سلام کہتے ہوئے صرف "السلام علیک" کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ امام مالکؒ "السلام علیک ایہا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کے الفاظ استعمال کیا کرتے تھے۔ البتہ علمائے مذاہب اربعہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر انسان نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخینؓ کی تعریف میں مزید الفاظ استعمال کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ لیکن آواز کو بہر حال پست رکھنا چاہیے۔ بلند آواز سے سلام نہیں کہنا چاہیے۔ سلام سے فارغ ہونے کے بعد قبلہ رخ ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرنا بھی مستحب ہے۔(مختصراً از الفتح الربانی ج ۱۳ ص ۲۲۔ ۲۳)۔(الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۷۰۶۔ ۷۰۷)۔

الفیصل

ناشران و تاجران کتب

اردو بازار لاہور